ISSN-2249-636X
ماہنامہ
دربھنگہ
تمثیلِ نو
گوشۂ منظر شہاب
اور دیگر نگارشات
مدیر اعزازی : ڈاکٹر امام اعظم
Meer Zaheer Abass Rustmani

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

۱۰-۱۱ر نومبر ۲۰۱۸ء کو ایران سوسائٹی، کولکاتا میں مجلس ارزاں شاہی، کولکاتا کے زیر اہتمام دو روزہ سیمینار بعنوان ''اکیسویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ اور تصوف کی معنویت'' میں مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر امام اعظم۔ ڈاکٹر عمر غزالی (نقیب اجلاس)، پروفیسر سید شاہ حسین احمد، پروفیسر احسان اللہ شکر الٰہی، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، ڈاکٹر غلام سرور اور صحافی جناب احمد جاوید

۲۵ر دسمبر ۲۰۱۸ء کو معروف سماجی تنظیم 'فمن انڈیا'، دھنباد کے زیر اہتمام گیٹس کیمپس، دھنباد میں منعقدہ ایک اعزازی جلسہ میں ڈاکٹر امام اعظم خورشید طلب، جناب احمد نثار، امتیاز بن عزیز، ڈاکٹر معصوم عالم، ڈاکٹر حسن نظامی، جناب احمد فرمان، ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد، و دیگر افراد دیکھے جاسکتے ہیں۔

۲۳ر جنوری ۲۰۱۹ء کو اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کیبنٹ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے زیر اہتمام مظہر امام یادگاری تقریب کے افتتاح کے موقع پر شمع افروزی کرتے ہوئے (دائیں سے) ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر امام اعظم، پروفیسر علیم اللہ حالی، جناب امتیاز احمد کریمی، ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر اسلم جاوداں وغیرہ۔

۳۰ر مارچ ۲۰۱۹ء کو گورنمنٹ گرلس ڈگری کالج، اقبال پور، کولکاتا میں منعقدہ یک روزہ عالمی سیمینار بعنوان ''اردو فکشن کا آغاز و ارتقا'' باشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی میں (دائیں سے) ڈاکٹر دیبو پرساد بنرجی، ڈاکٹر نظام الدین شمس، جناب نشاط عالم، جناب ارمان شمسی (بنگلہ دیش)، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر سیدہ بشارت المولیٰ القادری، ڈاکٹر شبنم پروین اور ڈاکٹر نوشاد عالم (نقیب اجلاس)

جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان

اشاعت: اٹھارواں سال

ماہنامہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ

اجراء: مارچ ۲۰۰۱ء

جلد: ۱۸ — جولائی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۹ء — شمارہ: ۷۰-۷۳

زرتعاون

فی شمارہ: ۲۰۰ روپے، سالانہ ۴۰۰ روپے، خصوصی تعاون: ۲۰۰۰ روپے، تاحیات (بھارت) ۱۰۰۰۰ روپے
پاکستان و بنگلہ دیش (سالانہ): ۸۰۰ روپے، دیگر ممالک (سالانہ) ۶۰ امریکی ڈالر/۴۰ پونڈ

رابطہ: مدیر ''تمثیلِ نو''، ادبستان، محلہ: گنگواره، پوسٹ: سارا موہن پور، دربھنگہ-846007 (بہار)

Email: imamazam96@gmail.com / imamazam96@yahoo.com ; Blog: drimamazam.blogspot.com

پرنٹر، پبلشر و آنر ڈاکٹر امام اعظم نے دربھنگہ آفسیٹ پریس، دربھنگہ سے چھپوا کر
دفتر ''تمثیلِ نو'' اردو ادبی سرکل، محلہ: گنگواره، پوسٹ سارا موہن پور، دربھنگہ-846007 سے شائع کیا۔

گلیکسی کمپیوٹرس، محلہ رحم خاں، دربھنگہ Mob: 9431414808

ترتیب

مجھے کچھ کہنا ہے

''تمثیل نو'' گزشتہ ۱۸؍برسوں سے دربھنگہ جیسے مردم خیز خطے سے شائع ہو رہا ہے۔ اب تک اس کے ۶۹؍شمارے (بشمول مشترکہ شمارے) شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ اس وقت سیاسی اور ادبی منظر نامے پکار پکار کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ٹھہرو ٹھہرو۔ اب بہت کچھ بدلنے والا ہے۔

''تمثیل نو'' کے گزشتہ کئی شمارے مشترکہ ہیں جنھیں ترتیب دیتے وقت مشمولات کی فراہمی ایک مسئلے کی صورت میں سامنے آتی رہی ہے۔ زیرِ نظر شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں 'منظر شہاب' پر گوشہ شامل ہے۔ موصوف ترقی پسند شاعر اور ناقد مانے جاتے ہیں۔ فکر و احساس کو ماحول کی حفاظت اور کثافت کی صفائی پر خصوصی توجہ دے کر انھوں نے اپنی تخلیق کے ذریعہ خوشگوار فکر کی ضمانت دی ہے۔ شاعری ان کی پہلی ترجیح رہی ہے۔ اس کے باوجود ان پر توجہ کم دی گئی ہے۔ ان کے محاسن کو نظر انداز کیا گیا ہے اور انھوں نے ضمیر کی آواز کو جس طرح بلند رکھا، اس کی بازگشت ان کے انتقال کے بعد بھی سنائی نہیں دی ہے۔ ''تمثیل نو'' کے اس شمارے کے ذریعہ ان کے گلزارِ ادب کو معطر کرنے کی باضابطہ کوشش کی جا رہی ہے۔

اس رسالے کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ اصناف اور شخصیت پر مغزِ ادب پیش کرتا رہا ہے اور قلم کار کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھاتا رہا ہے۔ اسی سلسلے میں گوشہ کے ساتھ ساتھ تین خصوصی پیشکش 'مظہر امام'، 'سیّد منظر امام' اور 'مناظر عاشق ہرگانوی' اس شمارے کو وقار عطا کر رہی ہیں۔ اسی طرح دیگر تمام مستقل کالم کے تحت وافر مواد، احساسات کا پاسدار بنتا ہے اور بہت سے عناصر کو فن کے دائرے میں پروان چڑھانے میں مددگار ہے۔ تمام لکھنے والے مطالعہ کی وسعت، مشاہدے کی پختگی، خیالات کی گہرائی، زبان و بیان پر حاکمانہ قدرت اور ذہانت کے فن کارانہ تقاضے کو پیش کر کے زیرِ مطالعہ شمارہ کو دستاویزی بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں جن سے مضامین کی پرکاری، شگفتگی اور حسن کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں نے اس شمارے میں کئی نئی جہتوں کی طرف قدم بڑھایا ہے جس سے وسائل و ترسیل کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

حظ اندوزی کے بعد اس شمارہ پر بھی آپ کی تفصیلی رائے کا انتظار ہے کہ ہم نے قناعت پسندی کو راہ دے کر بہت سارا مواد قارئین کے روبرو کیا ہے۔ اس شمارہ کی تخلیقات وقت گزارنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ محبت اور رفیقِ صحبت کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔

ادبی و ثقافتی خبریں:

● (۲۲؍اپریل ۲۰۱۸ء) شعبۂ اردو، سریندر ناتھ ایوننگ کالج، کولکاتا کے زیرِ اہتمام ایک سہ روزہ ادبی سیمینار بعنوان ''جدید شاعری اور اس کے امکانات'' بہ اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ساہتیہ اکاڈمی، دہلی اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا کا انعقاد ۲۰ تا ۲۲؍اپریل ۲۰۱۸ء عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب ۲۰؍اپریل بمقام سریندر ناتھ کالج آڈیٹوریم میں شام ۵؍بجے منعقد کی گئی۔ تقریب کا آغاز شمشاد احمد کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

بعدازاں بدست مہمانان ذی وقار شمع فروزاں کی گئی۔ افتتاحی جلسے کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ (سری نگر) نے کی جب کہ ش.ک.نظام (کنوینر، ایڈوائسری بورڈ اردو، ساہتیہ اکاڈمی)، جناب جاوید دانش (کینیڈا)، پروفیسر خالد محمود (نئی دہلی)، ڈاکٹر محمد نعمان خان (نئی دہلی)، پروفیسر دیوان حنان خان (نئی دہلی)، پروفیسر فاروق بخشی (مانو، حیدرآباد)، ڈاکٹر جوہر سین مجمدار (ٹیچر انچارج، سریندر ناتھ ایوننگ کالج، کولکاتا) اور ڈاکٹر اندرانیل کور (پرنسپل، سریندر ناتھ کالج، کولکاتا) ڈائس پر تشریف فرما تھے۔ خیر مقدمی کلمات ٹیچر انچارج ڈاکٹر جوہر سین مجمدار نے ادا کیے۔ موصوف کا تعلق بنگلہ شعروادب سے ہے، اس کے باوجود انہوں نے اردو زبان کی عالمگیریت اور مقبولیت پر گفتگو کی۔ اپنے کلیدی خطبے میں جناب ش.ک.نظام نے جدید شاعری کے امکانات پر اپنی آراء کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہر شاعر اپنے اپنے انداز میں سوچنے اور سمجھنے قوت وحسیت رکھتا ہے لہٰذا اس لحاظ سے شاعری کو انہوں نت نئے انکشافات سے تعبیر کیا۔ بعدازاں کالج ہٰذا کی صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر نصرت جہاں کی کتاب ''مجاز کی شاعری اور اس کی میراث: ایک بازدید'' کا اجراء ہوا۔ تبصرہ نگاروں نے اپنی آراء کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں شامل تمام مقالے نہایت محنت، جانفشانی اور قلم کاروں کی مجاز شناسی کا روشن ثبوت ہے۔ اس کے بعد مشہور غزل گو سہیل رانا کی آواز میں محفل غزل سرائی منعقد کی گئی۔ افتتاحی جلسے کی نظامت محترمہ ڈاکٹر نصرت جہاں نے بحسن خوبی انجام دی۔

دوسرے دن ۲۱ر اپریل سیمینار کے پہلے سیشن کا آغاز صبح ۳۰-۱۰ بجے ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر محمد نعمان خان نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شبانہ آفرین جاوید نے انجام دیئے۔ اس دور میں چار مقالے ڈاکٹر امام اعظم (جدید شاعری میں آزاد غزل کا ہیئتی تجربہ)، ڈاکٹر فرحت آرا کہکشاں (منفرد لب لہجے کا شاعر شاد عارفی)، پروفیسر دیوان حنان خان (جدید غزل گو شعراء) اور جناب آصف پرویز (فہمیدہ ریاض: باغیانہ لب و لہجے کی شاعرہ) نے پیش کئے۔ تمام مقالے اپنے موضوع کے اعتبار سے متنوع اور پر مغز تھے۔ ڈاکٹر صوفیہ شیریں نے تمام مقالہ نگاروں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ چائے کے وقفے کے بعد دوسرے دور میں جناب جاوید دانش نے ''داستان ہجرتوں کی'' کے عنوان سے ایک داستان پیش کی جسے ناظرین نے نہ صرف پسند کیا بلکہ مختلف زبانوں پر ان کی قدرت پر متعجب بھی ہوئے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر نصرت جہاں نے کی جب کہ ڈاکٹر شبانہ آفرین جاوید نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ ظہرانہ کے بعد ۳۰-۲ بجے تیسرے دور کا آغاز ہوا جس کی صدارت پروفیسر خالد محمود اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے انجام دیے۔ اس سیشن میں چار مقالے ڈاکٹر فاروق بخشی (بشیر بدر کی شاعری)، ڈاکٹر دبیر احمد (ندا فاضلی کی شعری بوطیقا)، ڈاکٹر محمد امین عامر (جدید لب و لہجے کا شاعر: نقیب اکبر) اور جناب محمد سلیم (نئی غزل اور عصری مسائل) نے پیش کئے۔ ہدیۂ تشکر ڈاکٹر صوفیہ شیریں نے ادا کئے۔ چائے کے وقفے کے بعد چوتھا دور شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر دبیر احمد نے ادا کئے۔ اس دور میں پانچ مقالے ڈاکٹر شبانہ نسرین (جدید نظم کا پس منظر)، ڈاکٹر محمد نعمان خان (جدید شاعری روایت اور امکانات)، ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی (اپنے عہد کا سچا اور تازہ کار شاعر: فاروق شفق)، ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر (جدید اردو نظم امتیازات و امکانات) اور جناب ش.ک.نظام (بھیڑ میں اکیلا: مخمور سعیدی) پیش کئے۔

تیسرے دن ۲۲/اپریل بوقت ۱۱ بجے دن سمینار کے پانچویں سیشن کا آغاز ڈاکٹر فاروق بخشی کی صدارت میں ہوا۔اس دور کی نظامت کی ذمہ داری ڈاکٹر صوفیہ شیریں نے ادا کی ۔اس سیشن میں پانچ مقالے جناب محمد زہیب عالم (ناصر کاظمی کی شاعری اور امکانات)، ڈاکٹر عزیزہ عزیز (غزل پڑھیں تو وضو کر لیں)، جناب اشرف احمد جعفری (سرزمین بنگال کے جدید غزل گو شاعر احسن شفیق) ڈاکٹر ترنم مشتاق (شہود عالم آفاقی کی شاعری) اور ڈاکٹر جمشید احمد (ن.م .راشد کی نظمیہ شاعری) ۔سیشن کے اختتام پر ہدیۂ تشکر ڈاکٹر شبانہ آفرین جاوید نے ادا کئے ۔ظہرانہ کے بعد سیمینار کے چھٹے سیشن کا آغاز ہوا۔اس دور کی صدارت کی ذمہ داری جناب ش.ک.نظام نے انجام دی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد جمشید احمد نے ادا کئے ۔اس سیشن میں کل پانچ مقالے ڈاکٹر زماں آزردہ (ش.ک.نظام کی شاعری)، ڈاکٹر خالد محمود (مظفر حنفی کا رنگ سخن)، جناب ابوذر ہاشمی (جدید شاعری اور اس کے امکانات)، جناب مقصود دانش (جدید شاعری کا نسائی رنگ و آہنگ) اور ڈاکٹر مکرم علی (جدید شاعری اور اس کے امکانات) پیش کئے ۔ڈاکٹر شبانہ آفرین جاوید نے تمام مقالوں اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔اختتامی جلسہ چائے کے وقفے کے بعد شروع ہوا جس میں معزز مہمانوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر زماں آزردہ نے کی جبکہ نظامت کی ذمہ داری ڈاکٹر نصرت جہاں اور آر کیو اے سی کنوینر دیبو پریو سانیال نے مشترکہ طور پر انجام دی۔

....

● (۲۶/مئی ۲۰۱۸ء) انگلش اینڈ فارن لینگویج یونیورسٹی (EFLU)، حیدرآباد کے شعبۂ انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کی ریسرچ اسکالر انعم (دختر پروفیسر ایم نہال، ڈائریکٹر، ڈبلیو آئی ٹی، ایل این ایم یو، دربھنگہ) نے ۱۶-۱۴/مئی ۲۰۱۸ء کے دوران اسرائیل کی بین گورین یونیورسٹی کے نی گیو، سیڈ بوقر کیمپس میں منعقدہ سہ روزہ کانفرنس بعنوان ''اسرائیل: اے کیس اسٹڈی'' میں اسرائیل اور فلسطین کے درمیان امن باہمی کے قیام کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ان کا مقالہ اس نکتے پر گردش کر رہا تھا کہ دونوں ممالک میں قیامِ امن کے لئے باہمی گفت وشنید ہی واحد اور بہترین ذریعہ ہے۔اس گفت وشنید میں ادب بھی اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔انعم نے اپنے مقالہ میں سینڈی تو لان کی کتاب ''دی لیمن ٹری'' سے بھی چند اقتباسات بطور حوالہ پیش کئے جس کی بے حد پذیرائی کی گئی۔انھوں نے اپنی گفتگو میں اس نکتے پر زور دیا کہ جنگ کسی بھی مسئلہ کا حل نہیں، بلکہ ادب اس مسئلہ کا تصفیہ کن حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔کانفرنس میں اسرائیل کی وسعت پذیر معیشت، منظم مسلح افواج اور فلسطینی ریاست کے ساتھ تعلقات پر کئی اور بھی مقالے پیش کیے گئے۔دنیا کے مختلف خطوں شمالی افریقہ، اسپین، بعید یورپ اور مشرق وسطیٰ میں مقیم یہودی نسل کے نمائندوں نے بھی کانفرنس میں شرکت کی اور اپنی باتیں رکھیں۔کانفرنس کے خاتمہ کے بعد انعم کو دیگر مندوبین کے ساتھ قبلۂ اول مسجد اقصیٰ، دیوار گریہ (Wailing Wall)، قبۃ الصخرہ، کنیسۃ القیامۃ (Church of the Holy Sepulcher) وغیرہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا۔چار مذاہب کے ماننے والوں یعنی یہودیوں، عیسائیوں، مسلمانوں اور آرمینیوں کیلئے یکساں مقدس شہر یروشلم پہنچ کر انھیں روحانی سرشاری حاصل ہوئی اور یہیں انھوں نے رمضان المبارک کے آغاز پر چند روزے بھی رکھے۔قبلۂ اول مسجد اقصیٰ، بیت المقدس اور الصخرہ مسجد

میں مقامِ معراج پہنچنے پر ان مقامات کی تاریخی اور مذہبی اہمیت کو یاد کر کے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ خود کو بیحد خوش نصیب محسوس کرنے لگیں کہ حرمین شریفین کے بعد مسلمانوں کے مقدس ترین مقام پر اللہ نے انھیں پہنچایا۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد انعم نے اخبار سے گفتگو میں کہا کہ اسرائیل اور فلسطین دونوں ہی ریاست اپنے آپ میں بیحد مضبوط ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دونوں میں ٹکراؤ کی نوبت آتی رہتی ہے۔ میں نے مختلف مقامات کی تصویریں اور وہاں کی خوبصورت یادیں اپنے کیمرے اور ذہن دونوں میں قید کی ہیں۔ اسرائیل کا یہ سفر میرے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔ اس سفر کے دوران میں نے کئی تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی، تاریخی اور روحانی اسباق پڑھے، جو میری تعلیمی زندگی کا ایک اثاثہ بن چکے ہیں۔

....

● (۹/جون ۲۰۱۸ء) ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں شائع ہونے والے اردو جریدہ ''تمثیلِ نو'' کے مشترکہ شمارہ (جولائی ۱۷-جون ۱۸) کا اجراء مدیر کی رہائش گاہ ادبستان، محلّہ: گنگوارہ، دربھنگہ (بہار) میں الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام پروفیسر رئیس انور اور پروفیسر ایم نہال کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر موجود مہمانوں نے کہا کہ ''تمثیلِ نو'' گزشتہ ۱۷ برسوں سے ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے اور اردو دنیا میں اس کی شناخت مستحکم ہے۔ یہ اپنے نوع بہ نوع موضوعات اور خصوصی موضوعاتی شماروں کے سبب اردو حلقوں میں بے حد مقبول ہے۔ اس جریدہ کے حوالے سے شائع شدہ مضامین، آراء اور تبصروں کا مجموعہ ''تمثیلِ نو: ادبی صحافت کا نقش'' (مرتبہ: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی) گزشتہ برس شائع ہو چکا ہے جس میں ''تمثیلِ نو'' کے پہلے شمارہ سے گزشتہ شمارہ تک کے تمام مشمولات پر مشتمل ضخیم 'اشاریہ' بھی شامل ہے۔ اس شمارے میں تین اہم ادبی شخصیتوں پر گوشے شامل ہیں نیز اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت پر خصوصی مضامین بھی شامل ہیں۔ مدیرہ اور اعزازی مدیر کو جریدہ کی اشاعت پر بے حد مبارکباد۔'' دیگر حاضرین میں ڈاکٹر فیروز انصاری، حیدر وارثی، محمد کریم اللہ، انور آفاقی، سیّد متین اشرف، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر وکیل احمد، ڈاکٹر عبدالہادی صدیقی، محمد علاء الدین، ڈاکٹر ارمان عالم، محمد نصر اللہ اور مولانا عبدالصمد بھی شامل تھے۔ اسی دن ادارۂ ہذا کی جانب سے اجتماعی افطار اور پر تکلف عشائیہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔

....

● (۲۵/جون ۲۰۱۸ء) تنظیم ''اربابِ ادب''، ۲۸/میکلوڈ اسٹریٹ، کولکاتا-۱۷ کے زیرِ اہتمام معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر بدر محمدی (چاند پور، فتح پور، ویشالی، بہار) کے دوسرے شعری مجموعہ ''خوشبو کے حوالے'' کی رسم رونمائی جناب ف.س. اعجاز (مدیر ''انشاء'') کے ہاتھوں بھارتیہ بھاشا پریشد، ۳۶/اے، شیکسپیر سرانی، کولکاتا-۱۷ میں انجام پائی۔ تقریب کی صدارت جناب قیصر شمیم نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے انجام دیئے۔ مفتی محمد افتخار عالم کے تلاوتِ کلام سے تقریب کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد تقریری دور میں جناب فہیم انور، ڈاکٹر نوشاد مومن، پرویز عالم (لائبریرین، گورنمنٹ پبلک لائبریری، پٹنہ)، جناب حلیم صابر، ڈاکٹر امام اعظم، جناب ابوذر ہاشمی، جناب ف.س. اعجاز، احمد کمال حشمی، وغیرہ نے کتاب اور صاحبِ کتاب کے متعلق اظہار خیال کیا۔ منصور حسین آزاد نے منظوم تہنیت نامہ پیش کیا۔ جناب منظور عادل نے اظہار تشکر پیش کیا۔

● (۱۷رجولائی ۲۰۱۸ء) حکومت مدھیہ پردیش نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ ترسیل عامہ کے پروفیسر اور نقاد واسکالر پروفیسر شافع قدوائی کو اپنے باوقار ادبی ایوارڈ ''اقبال سمان'' سے نوازا ہے۔ یہ ایوارڈ دو لاکھ روپئے نقد انعام پر مشتمل ہے جو پروفیسر قدوائی کو اردو ادب کے فروغ کیلئے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دیا گیا ہے۔ اردو اور انگریزی میں پروفیسر شافع قدوائی کی ۱۲رکتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی کتاب ''اردو لٹریچر اینڈ جرنلزم: کریٹیکل پرسپیکٹیو'' کو کیمبرج یونیورسٹی پریس، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ ان کی کتاب ''سوانح سرسید'' نے سرسید مطالعات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا، کیونکہ اس سے ''حیاتِ جاوید'' میں شامل متعدد تاریخی غلطیوں کی تصحیح ہوئی۔ پروفیسر قدوائی کی ایک اہم کتاب ''سرسید: اے لائف ان ریزن'' کو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس شائع کر رہا ہے، جس کا مقدمہ نامور مؤرخ پروفیسر عرفان حبیب نے تحریر کیا ہے۔

....

● (۵راگست ۲۰۱۸ء) محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائریکٹوریٹ پٹنہ کے زیر اہتمام اور اردو مشاورتی کمیٹی پٹنہ کے زیر سرپرستی بمقام ڈان باسکو اسکول، دربھنگہ میں فروغ اردو سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت جناب شفیع مشہدی (صدر نشیں، اردو مشاورتی کمیٹی بہار، پٹنہ) نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر اسلم جاوداں (پروگرام افسر، اردو ڈائریکٹوریٹ، پٹنہ) نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اس سیمینار میں ۳رمقالے ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، جناب شکیل احمد سلفی (مدیر ''الہدیٰ'' دربھنگہ) اور ڈاکٹر امام اعظم (مدیر اعزازی ''تمثیل نو'' دربھنگہ وریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا) نے پیش کئے۔ مقالہ خوانی کے بعد تین مندوبین ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن ارشد، منصور خوشتر اور محمد ارشد حسین نے فروغ اردو کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ دیگر مہمانان یعنی پروفیسر اجیت کمار ورما، پروفیسر شاکر خلیق، میجر بلبیر سنگھ، پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر انیس صدری، ڈاکٹر مشتاق احمد (پرنسپل، سی ایم کالج، دربھنگہ)، ڈاکٹر ریحان غنی، ڈاکٹر نجیب اختر وغیرہ نے اردو کی ترقی وترویج کے حوالے سے اپنی باتیں رکھیں۔ اس سے قبل استقبالیہ تقریر اور خیر مقدمی کلمات جناب امتیاز احمد کریمی، ڈائریکٹر، اردو ڈائریکٹوریٹ، پٹنہ نے ادا کیے جب کہ آخر میں جناب مبین انصاری (اے ڈی ایم، دربھنگہ) نے کلماتِ تشکر ادا کیے۔ راج بھاشا کے اردو مترجمین نسیم احمد رفعت مکی، واصف جمال وغیرہ اس سیمینار کو کامیاب بنانے میں پیش پیش رہے۔ سیمینار کے اختتام پر معروف شاعر، ادیب اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم کی تازہ تصنیف ''گیسوئے اسلوب'' (ادبی مضامین) کی رونمائی پروفیسر انیس صدری، میجر بلبیر سنگھ، پروفیسر عبدالمنان طرزی، جناب مبین انصاری، جناب شفیع مشہدی، ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر شاکر خلیق، جناب امتیاز احمد کریمی، ڈاکٹر نجیب اختر اور ڈاکٹر اسلم جاوداں نے کی۔ ۲۸۸رصفحے کی اس کتاب میں ۴۳رمضامین ہیں، جنہیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ مضامین متنوع تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر مشتمل ہیں جو کتاب کی وقعت میں اضافہ کرتے ہیں۔

....

● (۵راگست ۲۰۱۸ء) عبدالقادر صدیقی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ ترسیل عامہ وصحافت سے اردو ذریعہ تعلیم سے ملک بھر میں پہلی پی ایچ ڈی کی ہے۔ ان کے تحقیقی مقالہ کا موضوع ''بالی ووڈ ہندی سنیما میں مسلم

زنانہ کردار کی تخلیق نو: ایک تنقیدی مطالعہ'' تھا۔ انہوں نے یہ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر محمد فریاد (ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ ترسیل عامہ وصحافت) کے زیرنگرانی مکمل کیا۔ ان کا وائیوا (زبانی امتحان) ۳۰ جولائی کو ۲۰۱۸ء کو منعقد ہوا جس کے بعد ۷ راگست کو یونیورسٹی ہٰذا نے انہیں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی۔

....

● (۶ راگست ۲۰۱۸ء) محترمہ نوشین بیگم (اہلیہ انصاری امتیاز، موضع و پوسٹ: سارا موہن پور، ضلع: دربھنگہ) نے ڈاکٹر آفتاب اشرف (صدر، شعبۂ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج، دربھنگہ) کے زیرِ نگرانی اپنا تحقیقی مقالہ ''اردو کی عشقیہ شاعری اور جوش ملیح آبادی'' ایل این متھلا یونیورسٹی میں ۲۰۱۷ء میں جمع کیا تھا جس کے بیرونی ممتحن پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (سابق صدر، شعبۂ اردو، تلکا مانجھی یونیورسٹی، بھاگل پور) اور پروفیسر منظر حسین (شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی) تھے۔ شعبۂ اردو، ایل این ایم یو میں صدر، شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد ظفیر الدین انصاری کی چیئر مین شپ میں اوپن وائیوا ہوا۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے زبانی امتحان لیا۔ ان کے علاوہ ڈین، فیکلٹی آف ہیومنٹیز ڈاکٹر منوج کمار جھا (شعبۂ فلسفہ، ایل این ایم یو، دربھنگہ) نے موضوع سے متعلق سوالات کیئے جن کا تشفی بخش جواب نوشین بیگم نے دیا۔

....

● (۱۴ راگست ۲۰۱۸ء) ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا اور مدیر اعزازی ''تمثیل نو'') اور ڈاکٹر زہرہ شمائل (معلمہ، مڈل اسکول، چاندپٹی، دربھنگہ) کے فرزند نوا امام (نبیرۂ جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقی مرحوم سابق پولیس افسر اور پروفیسر سیّد منظر امام، دھنباد) ''ادبستان'' محلہ: گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، ضلع: دربھنگہ-۷ نے دربھنگہ کے قدیم اور اولین ڈینٹل کالج ''سرجگ ڈینٹل کالج''، لہریا سرائے، دربھنگہ (ملحقہ ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ) سے ۲۰۱۸ء بی ڈی ایس (فائنل) کے امتحان میں نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ ان کا داخلہ ۲۰۱۴ء میں ہوا تھا۔ نوا امام نے پرائمری تعلیم ہولی کراس اسکول، دربھنگہ سے حاصل کی۔ درجہ پنجم تا ہفتم میں ہمدرد پبلک اسکول، نئی دہلی، ہشتم تا دہم میں جیسس اینڈ میری اکاڈمی، دربھنگہ اور ہائر سیکنڈری میں گوڈ سماریٹن اسکول، نئی دہلی کے متعلم رہے۔ اس کے بعد بی ایس سی (نباتات) آنرس سی ایم سائنس کالج دربھنگہ سے کیا۔ وہ بی ڈی ایس کورس کے دوران ممبئی، پٹنہ وغیرہ میں منعقدہ ڈینٹل کانفرنسوں میں شرکت بھی کرچکے ہیں۔ اپنی اس کامیابی کے بعد نوا امام نے بتایا کہ ''انھیں بچپن سے ہی ڈاکٹر بننے کی خواہش تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے والدین اور بزرگوں کی دعاؤں سے آج مجھے یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں کو سماج میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک معزز پیشہ ہے جس میں دوسروں کو سکون اور راحت پہنچا کر آپ کو بھی خوشی حاصل ہوسکتی ہے۔ میرے خیال میں انسان کی زندگی کا اہم مقصد یعنی دوسروں کی تکلیف اور درد کا مداوا اس پیشہ میں عملی طور پر کیا جاسکتا ہے۔ شفایاب ہونے پر مریض دعائیں بھی دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس شعبہ میں مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کروں تاکہ ہمارے اطراف خصوصاً ضلع دربھنگہ کے لوگوں کو امراضِ دندان کے لیے ملک کے دور دراز شہروں میں جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔'' ڈاکٹر نوا امام کی اس کامیابی پر ڈاکٹر شاہینہ امام (نانی)، محترمہ زرینہ آفتاب (دادی)، سیّد حلیم آل احمد اعظم (چچا)، سیّد ظفر الاسلام

ہاشمی (چچا)، سیّد خرم شہاب الدین (چچا)، سہیل احمد احسانی (پھوپھا)، شہلا فاروقی (پھوپھی)، اقلیمہ پروین (چچی) راحلہ نوشابہ (چچی)، نفیسہ خاتون (چچی)، فضا امام (بھائی)، حیا فاطمہ (بہن) وغیرہ نے مبارک باد پیش کی ہیں۔

....

● (۱۵ اگست ۲۰۱۸ء) ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم میں ملک کے ۷۲ ویں جشن آزادی کے موقع پر سالانہ مشاعرہ زیر صدارت جناب انجم عظیم آبادی منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ میں سامعین کی کثیر تعداد بشمول ایڈوکیٹ خواجہ جاوید یوسف (صدر، ادارہ ہذا)، جناب کوثر احمد اور جناب نیاز الدین احمد وغیرہ نے شرکت فرمائی اور شعرائے کرام کو داد و تحسین سے نوازا۔ مشاعرے کا باضابطہ آغاز ایاز احمد روہوی کے افتتاحی کلمات سے ہوا۔ مشاعرے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جمیل منظر اور مہمان ذی وقار ڈاکٹر امام اعظم ریجنل ڈائرکٹر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کولکاتا نے شرکت کی۔ نقابت ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے بحسن وخوبی ادا کی۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے نوازا ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: انجم عظیم آبادی، اچاریہ جمال احمد جمال، فراغ روہوی، اکبر حسین اکبر، ڈاکٹر امام اعظم، مبارک علی مبارکی، اشرف یعقوبی، مشتاق دربھنگوی، شاہد نور، نغمہ نور، شگفتہ یاسمین غزل، ارم انصاری، نظیر راہی، رونق افروز، احمد معراج، طاہر یونس بیگ۔ شکریہ کی رسم ادارہ کے سکریٹری جناب عزیز الحق نے ادا کی۔

....

● (۲۶ اگست ۲۰۱۸ء) معروف مجاہد آزادی آنجہانی شبھ کرن چوڑی والا کی یاد میں اردو، ہندی، انگیکا اور انگریزی میں ۲۳۵ کتابوں کے خالق ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو انکی ادبی خدمات کیلئے مہمان خصوصی شری گپتیشور پانڈے (آئی پی ایس، ڈائریکٹر جنرل، بہار پولیس اکاڈمی اور بہار مسلح پولیس) کے ہاتھوں آج ''تلکا مانجھی قومی اعزاز'' سے نوازا گیا کہ ڈاکٹر ہرگانوی 'انگ پردیش' اور قوم کی عظیم شخصیت ہیں۔ موصوف کی ادارت میں ''کوہسار جرنل'' بھی برسوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہوتا آرہا ہے اور ملک وغیر ملک کے درجنوں رسالوں کی مجلس ادارت میں شامل ہیں۔ ہندستان سمیت برطانیہ، امریکہ اور ڈنمارک میں اپنے ادبی خدمات کے لئے اعزاز سے نوازے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر ہرگانوی پر کئی رسالوں کے خصوصی گوشے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں پر درجنوں پی ایچ ڈی کی اسناد جاری کی جا چکی ہیں۔ پاکستان اور انگلینڈ سے بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ سیمینار اور مشاعرے میں ہندستان کے تمام بڑے شہروں کے ساتھ لندن کا سفر بھی کر چکے ہیں۔ اس موقع پر ان کو شال، سند اور میمنٹو پیش کئے گئے۔ موصوف کو یہ اعزاز ملنے پر ادبی حلقوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی نیز احباب نے انھیں مبارکباد پیش کی ہے۔

....

● (یکم ستمبر ۲۰۱۸ء) ''جدید اردو شاعری کی تاریخ مظہر امام کے ذکر کے بغیر نامکمل ہوگی۔ وہ اسم با مسمّٰی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مظہر بھی تھے اور امام بھی۔ انہوں نے آزاد غزل کی ایجاد کر کے دربھنگہ کا نام پوری دنیا میں متعارف کروایا۔ مظہر امام اپنے ہم عصر ادباء میں اس لئے ممتاز رہے کیونکہ وہ لفظوں کو نئے معانی کا پیکر عطا کرنے میں سبقت رکھتے تھے۔ انہوں نے موضوعی دائرے سے غزل کو بھی باہر نکال کر خون جگر کی بدولت اعتباریت بخشی تو نظم میں بھی تخیل کی دنیا کے ساتھ حقیقی عناصر کی پیشگی میں ہنرمندی دکھائی ہے۔'' مذکورہ خیالات کا اظہار اردو کے معروف ادیب

پروفیسر ارتضیٰ کریم (ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) نے مہاراجہ لکچھمیشور سنگھ میموریل کالج دربھنگہ میں مظہر امام توسیعی خطبہ کے دوران کیا۔ قومی کونسل کے تعاون سے پہلی بار کالج انتظامیہ نے توسیعی خطبہ منعقد کیا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ ''مظہر امام نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اس پر بحث ہونی چاہئے کیوں کہ اردو افسانہ نگاری کے باب میں ان کے چند افسانے ہی سہی مگر تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ مظہر امام کی شاعری نئی نسل کے لئے مشعل راہ ہے اور بہار سے تعلق رکھنے والے ادبا، وشعراء کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ مظہر امام کے تعلق سے اگر ایک تنقیدی رائے قائم کی جائے تو وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری نئے تجربوں اور معانی و بیان کے نئے راستے کی متلاشی ہے۔'' جلسہ کے مہمان خصوصی ڈاکٹر مشتاق احمد نے مظہر امام کی شاعری کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی اور کہا کہ ''انہوں نے نظمیہ اور غزلیہ شاعری کو نئے جہان معنی سے آشنا کیا۔ مظہر امام اپنے ہم عصروں میں نہ صرف اپنی بلند قامتی کی وجہ سے بلکہ اپنے اظہار بیان کے منفرد سلیقے کی وجہ سے ممتاز رہے۔ وہ اپنی شاعری میں خیالات کو معانی کا پیراہن عطا کرنے کے معاملے میں بھی اپنے ہم عصروں سے ممتاز تھے۔ جدید شاعری پر گفتگو کرتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مظہر امام کا پہلا مجموعہ ''زخم تمنا'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا جبکہ شہریار کا مجموعہ ''اسم اعظم'' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس لئے جدید شاعری کے ناقدوں کو اس نقطے پر بھی غور کرنا چاہئے۔ مظہر امام نے خود ہی کہا ہے کہ:

رات کے پچھلے پہر مانگ دعاؤں میں بھی مجھ کو پانا ہو تو ہر لحہ طلب کر نہ مجھے

بلاشبہ مظہر امام کی شاعری اردو شاعری کے باب میں مقبول دعا کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ خطبہ ایک تاریخی خطبہ ہے جو نئی نسل کو مظہر امام کے فکر وفن سے آشنا کرائے گی۔'' اس موقع پر پروفیسر انیس صدری، ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی نے بھی مظہر امام کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ سنڈیکیٹ ممبر اور بانی کالج ڈاکٹر بیدناتھ چودھری اور صدر جلسہ پرنسپل کالج ہذا ڈاکٹر ودیاناتھ جھا نے اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کے کلیدی خطبے کی تعریف کی اور کہا کہ مظہر امام کو اس خطبہ کے ذریعہ ایک نئی زندگی عطا ہوئی ہے۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر آفتاب اشرف صدر، شعبۂ اردو، کالج ہذا نے استقبالیہ پیش کرتے ہوئے مظہر امام کی حیات و خدمات اور دربھنگہ کی ادبی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر آفتاب اشرف نے کی جبکہ رسم شکریہ پروفیسر مادھو چودھری نے ادا کیا۔ اس علمی و ادبی جلسے میں شہر اور گردونواح کی نامور شخصیات موجود تھیں۔ ان میں ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر جمال اویسی، پروفیسر شاہد حسن، انور آفاقی، ڈاکٹر عبدالمتین قاسمی، منصور خوشتر، پروفیسر نسیم احمد، پروفیسر محمد جنید، پروفیسر محمد قاسم، منور عالم راہی، جنید عالم آروی، منظر صدیقی، ڈاکٹر ارشد حسین، ڈاکٹر احسان عالم اور ریحان قادری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

....

● (۲ر ستمبر ۲۰۱۸ء) الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام ادبستان، محلہ گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، ضلع دربھنگہ میں ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتاب ''نقوشِ علی نگر: تبصرے اور تجزیے'' کی رونمائی ڈاکٹر نجیب اختر (سکریٹری، فخرالدین علی احمد ٹیچرس ٹریننگ کالج، دربھنگہ) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مرتبِ کتاب نے اس کتاب کا پس منظر اور سببِ اشاعت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''جناب غلام فرید (علی نگر، دربھنگہ) نے بڑی کدوکاوش سے ''نقوشِ علی نگر''

نامی کتاب لکھی تھی، جس میں علی نگر کی تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی وراثتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔اس کتاب کی بڑی پذیرائی ادبی حلقوں میں ہوئی۔ کئی موقر رسائل اور جرائد میں تبصرے بھی شائع ہوئے۔ علی نگر سے متصل ایک گاؤں ڈھموارہ کے باشندہ نوازش کریم مقیم رسول پور، اسلام نگر (دربھنگہ) نے اس کتاب پر ایک طویل تبصرہ مصنف موصوف کو بھیجا جس کا مصنف نے بھرپور جواب دیا۔ یہ دونوں تحریریں راقم الحروف کی تحویل میں تھیں جو ضائع ہو جاتیں، لہٰذا میں نے ان تحریروں کو یکجا کر کے نیز پس تحریر پروفیسر ایم صدرالدین، راز سیوانی اور راقم الحروف (ڈاکٹر امام اعظم) کے تبصروں کو شامل کرتے ہوئے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔اس طرح یہ نگارشات اب محفوظ ہوگئی ہیں۔'' ماہرِ تعلیم ڈاکٹر نجیب اختر نے اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ''اب مجھے اصل کتاب ''نقوشِ علی نگر'' (مصنف: غلام فرید) پڑھنے کا اشتیاق ہے۔ مرتب موصوف نے ان دونوں تحریروں کو جمع کر کے ان تحریروں کو ضائع ہونے سے بچالیا۔ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔'' اس تقریبِ رونمائی میں سماجی کارکن محمد کریم اللہ، مولانا محمد مستقیم قاسمی (صدر مدرس، مدرسۃ البنات فاروقیہ، کنگوارہ، دربھنگہ)، مولانا عبدالصمد (استاد، مدرسہ ہذا)، ڈاکٹر نوا امام اور فضا امام بھی موجود تھے۔

● (۷؍ستمبر ۲۰۱۸ء) پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب ''ڈاکٹر امام اعظم کی بازآفرینی'' کا اجرا معروف علم دوست و سماجی شخصیت جناب بلال حسن (صدر، بزمِ شہرِ نشاط) کے ہاتھوں مانو ریجنل سینٹر، کولکاتا میں انجام پایا۔ کتاب کا اجراء کرتے ہوئے جناب بلال حسن نے کہا کہ ''ڈاکٹر امام اعظم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف، مرتب و مترجم ہیں۔ ان کی ادارت میں رسالہ ''تمثیل نو'' تقریباً ۱۷ برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ موصوف اردو کے خاموش خادم ہیں نیز کولکاتا میں تقریباً ۷ برسوں سے مانو کے ریجنل ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں اور اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے شہر کولکاتا کی منظوم و منثور تاریخ بعنوان ''یہی کولکاتا ہے!'' بھی لکھی ہے جو بہت جلد کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آئے گی۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اردو ادب کے قدآور ادیب ہیں۔ ان کی تقریباً ۲۳۵ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے ۹۶ صفحات کی یہ کتاب لکھی ہے جو ۱۸؍ابواب پر مشتمل ہے۔'' ڈاکٹر مظہر قادری (اے آر ڈی، مانو کولکاتا)، غلام محمد (چاپدانی)، ڈاکٹر سعیدہ امان (گیسٹ لیکچرر، عالیہ یونیورسٹی) اور سیّد ایاز احمد روہوی (لٹریری سکریٹری، ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ) نے بھی اس کتاب کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر مظہر قادری نے کلماتِ تشکر ادا کرتے ہوئے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی یہ تحریر پڑھی کہ ''ڈاکٹر امام اعظم اردو زبان و ادب کے فہم شناس ہیں۔ انھوں نے اپنے رسالہ ''تمثیل نو'' کے ذریعہ جہاں اردو کے فروغ میں حصہ لیا ہے، وہیں تنقید، تحقیق، صحافت اور شاعری میں وافر مواد دے کر اپنی شناخت قائم کی ہے۔ وہ حقائق سے رازداری کا پردہ ہٹانے کا ہنر جانتے ہیں اور ہم عصر مسائل کے روپ کا مطالعہ صرفی اور نحوی طریقے سے کرنا جانتے ہیں۔ ساتھ ہی نوعیت کو پہچانتے بھی ہیں اور قربت و یگانگت کا رشتہ قائم کرنا جانتے ہیں جس سے ان کی اپنی شخصیت اور تخلیقی کردار کی سچائی سامنے آتی ہے اور تحرک کو تقویت ملتی ہے۔'' محفل میں شریک دیگر حاضرین میں رحیل شاداب، شاہد اقبال، محمد اشتیاق، محمد ممتاز اور خورشید عالم وغیرہ شامل تھے۔

● (۱۳؍اکتوبر ۲۰۱۸ء) معروف سماجی خدمت گار خادم حسین (ساکن دیوارا بندھولی، دربھنگہ حال مقام دربھنگہ) نے ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی (شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ) کے زیرِ نگرانی اپنا تحقیقی مقالہ "اکبرالہ آبادی کی مزاحیہ شاعری کی عصری معنویت" جمع کیا تھا۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ظفیر الدین انصاری کی چیئر مین شپ میں اوپن وائیوا ہوا۔ پروفیسر احمد حسن دانش (سابق صدر، شعبۂ اردو، بی این منڈل یونیورسٹی، مدھے پورہ، بہار) نے زبانی امتحان لیا۔ اس کے علاوہ ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز و دیگر نے موضوع سے متعلق سوالات کئے جن کا تشفی بخش جواب خادم حسین نے دیا۔ اس موقع پر پروفیسر انیس صدری، ڈاکٹر آفتاب اشرف، ڈاکٹر امام اعظم، انور آفاقی، نظر عالم (آل انڈیا مسلم بیداری کارواں)، ڈاکٹر افروز الہدیٰ، منصور خوشتر وغیرہ کے علاوہ شعبہ کے طلبا و طالبات بھی موجود تھے۔

....

● (۲۷؍اکتوبر ۲۰۱۸ء) پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی تازہ ترین کتاب "مظہر امام کا اکلوتا افسانہ: تجزیہ" کی رونمائی کرتے ہوئے معروف ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور صحافی ف۔س۔ اعجاز (مدیر ماہنامہ "انشاء" کولکاتا) اور بزرگ شاعر اچاریہ جمال احمد جمال نے ماہنامہ "انشاء" کے دفتر واقع زکریا اسٹریٹ، کولکاتا میں کہا "مظہر امام کو دنیا شاعر، ادیب و صحافی کی حیثیت سے جانتی ہے تاہم انھوں نے افسانہ نگاری بھی کی ہے، اس کا انکشاف میرے ہاتھوں میں موجود کتاب سے ہوا، جس میں ان کے ستر سال قبل مطبوعہ افسانہ "آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟" کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے مناظر عاشق ہرگانوی صاحب نے اسے ایک کتاب کی شکل عطا کر دی اور اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اس افسانہ کی دریافت کے لیے ڈاکٹر امام اعظم بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک اہم تحقیقی فریضہ انجام دیا۔ کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ افسانہ ۱۹۴۸ء میں کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ "مضراب" کے مشمولات میں شامل تھا، جس کے مدیر ش۔ مظفر پوری تھے۔ ۴۸ صفحات کی یہ کتاب نہایت دیدہ زیب اور عمدہ طریقے سے شائع ہوئی ہے۔" اس موقع پر ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا)، جناب قمرالدین ملک اور ڈاکٹر احمد معراج بھی موجود تھے۔

....

● (۲۹؍اکتوبر ۲۰۱۸) ساہتیہ اکادمی ممبئی کے آڈیٹوریم میں "میرے جھروکے سے" عنوان کے تحت معروف نقاد، شاعر اور اسکالر شمیم طارق نے اردو کے ایک اہم نقاد وارث علوی کے افکار و احوال پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کے مطالعے کی وسعت کے علاوہ زبان پر قدرت قابلِ رشک تھی۔ انھوں نے اس الزام کی تردید کی کہ وارث علوی پھکڑپن کا مظاہرہ کرتے تھے یا جملہ بازی ان کا وطیرہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ مزاح سے پر سنجیدہ گفتگو اور تحریر ان کا خاصہ تھا۔ وہ فنکار اور فن پارے کی روح نچوڑ لیتے تھے۔ تنقید اور نقاد کو بھی انہوں نے بے لگام ہونے کی آزادی کبھی نہیں دی۔ ہاں، چند تحریروں میں ان کا ذاتی تعلق ان کے تنقیدی منصب پر غالب آ گیا ہے۔ اس لیے وہ جانبداری کے مرتکب نظر آتے ہیں مثلاً ان کا یہ لکھنا حقیقت پر مبنی نہیں ہے کہ اردو میں ماں پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں فراق کی نظم 'جگنو' اور ندا کی نظم نما غزل 'یادگار' رہ جائیں گی۔ اقبال کی نظم "والدہ محترمہ کی یاد میں" کلاسک کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ کوئی دوسری نظم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ عمومی حیثیت سے یہ کہنا درست ہے کہ وارث علوی نے خاکے لکھے، تنقیدی مباحث پر رائے زنی کی، شاعری کا تجزیہ کیا۔ فکشن کی تنقید لکھی نقادوں کے گلے ناپے مگر خود کسی سے

مرعوب ہوئے نہ کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ شمیم طارق نے اپنی ایک گھنٹے کی تقریر میں مثالوں اور حوالوں سے بتایا کہ وہ مست مولا قسم کے آدمی تھے اور عوام و خواص کے علاوہ لفظوں سے بھی بے تکلف سلوک کرتے تھے۔ اس پروگرام میں قرب و جوار کے محبان اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادیبوں نے بھی کثیر تعداد میں شرکت کی۔

....

● (۲ر نومبر ۲۰۱۸ء) پی جی شعبۂ اردو للت نارائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں راحت حسین اور نوشاد احمد کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ممتحن کے طور پر بنارس ہندو یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو آفتاب عالم آفاقی اور ڈاکٹر حسن دانش نے شرکت کی۔ راحت حسین کے تحقیقی مقالے کا عنوان 'مفتی ثناءالہدیٰ قاسمی کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ' اور نوشاد احمد کے تحقیقی مقالے کا عنوان 'احمد یوسف بحیثیت افسانہ نگار' تھا۔ دونوں مقالے کے نگراں سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر انیس صدری تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر ظہیر الدین انصاری، ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی، ڈاکٹر آفتاب اشرف، منصور خوشتر، انور آفاقی سمیت کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات بھی موجود تھے۔

....

● (۲ر نومبر ۲۰۱۸ء) "کچھ اساتذہ علم سے پہچانے جاتے ہیں اور کچھ علم کے ساتھ ساتھ اپنی محبت اور ہمدردانہ جذبہ کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ایسے اساتذہ طلبہ کے دل و دماغ میں بستے ہیں اور کبھی سبکدوش نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی بھی ایسے ہی استاذ تھے، جنہوں نے طلبہ کے دل و دماغ دونوں میں جگہ بنا رکھی ہے۔" مذکورہ باتیں پٹنہ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کہی۔ وہ پی جی شعبۂ اردو متھلا یونیورسٹی میں شعبہ کے استاد ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی کی سبکدوشی کے موقع پر طلبہ و طالبات کے ذریعہ منعقدہ الوداعیہ تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ اس موقع پر بہار یونیورسٹی کے پروفیسر حامد علی خاں نے کہا کہ سبکدوشی ملازمت کا دستور ہے۔ طلبا ایسے موقع پر جذباتی ہو جاتے ہیں لیکن استاد نے جو فکر اور علم دیا ہے اس کو بانٹنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ آپ کس طرح اچھے استاد بنیں اور اپنی آنے والی نسلوں سے کس طرح محبت سے پیش آئیں۔ ڈاکٹر ظفر سعید (صدر، شعبۂ اردو، سی ایم کالج، دربھنگہ) نے کہا کہ ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی ہمیشہ فعال رہے اور صدر شعبہ نہ رہ کر بھی ہمیشہ صدر شعبہ کی ذمہ داریوں کو ادا کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آج جو حالات ہیں، اس میں سبکدوشی غم نہیں شادیانہ کا موقع ہوتا ہے کیونکہ جو عزت سے چلا گیا وہ سرخرو ہو گیا۔ ڈاکٹر قیام نیر نے کہا کہ میں ان کا ایسا شاگرد تھا جو ان کی عمر سے ۳ر سال بڑا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ طلبا کی مدد کی۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب اشرف نے کہا کہ ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی نے ۲ر نومبر ۱۹۸۲ء کو اسی کلاس روم میں اپنی ملازمت شروع کی تھی اور آج اسی کلاس روم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد بدرالدین نے کہا کہ وہ دوست نما استاد تھے۔ ڈاکٹر احسان عالم اور احتشام الحق نے ان کی صحت و سلامتی کی دعائیں کیں۔ ڈاکٹر ظفیر الدین انصاری نے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ آپ ہمیشہ باصلاحیت اور مشفق استاد کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے۔ ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی نے کہا کہ سبکدوشی تو فطری بات ہے لیکن کام کرتے ہوئے ایسا فطری تعلق بن جاتا ہے کہ کچھ چھوٹ جانے کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا میں نے اپنی صلاحیت کے مطابق بچوں کو محبت، شفقت اور سختی سے علم دینے کی کوشش کی۔ ممکن ہے بحیثیت انسان

کچھ کوتاہیاں بھی ہوئی ہوں گی، جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اس موقع پر طلبہ و طالبات نے بھی اپنی محبت کا اظہار کیا اور استاد کی خدمت میں تحفے پیش کئے۔

....

● (۱۱ر نومبر ۲۰۱۸) ہر سال کی طرح امسال بھی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، کولکاتا ریجنل سینٹر (واقع ارائے-۱، چھاتو بابو لین، محسن ہال، تیسری منزل، کولکاتا-۱۴) میں مولانا آزاد کی یوم ولادت یعنی ''قومی یوم تعلیم'' کے موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر امام اعظم، ریجنل ڈائریکٹر نے کی جب کہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب احمد جاوید (ریذیڈنٹ ایڈیٹر، روزنامہ 'انقلاب' پٹنہ)، جناب عبدالوارث سفر (اسسٹنٹ ماسٹر، شعبۂ طبیعات، مدرسہ عالیہ، اینگلو پرشین ڈیپارٹمنٹ) اور سیّد ایاز احمد روہوی (لٹریری سکریٹری، ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا) موجود تھے۔ جناب شاہد اقبال نے نقابت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے تمام مہمانوں کا باہمی تعارف کراتے ہوئے تقریب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ مولانا آزاد ایک جلیل القدر عالم، ادیب، صحافی، دانشور، فلسفی، سیاست داں اور مجاہد آزادی تھے۔ مکہ معظمہ میں آج ہی کے روز ۱۸۸۸ء میں آزاد ہندوستان کے اولین وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش ہوئی تھی۔ حکومت ہند نے اس ماہرِ تعلیم اور مجاہد آزادی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے ۲۰۰۸ء میں اس دن کو 'قومی یوم تعلیم' قرار دیا۔ اس حوالے سے آج ملک بھر کے علمی، ادبی اور تہذیبی و ثقافتی اداروں میں سیمیناروں، اجلاس اور تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔'' سیّد ایاز احمد روہوی نے مولانا آزاد کی عبقری شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا اختصار سے جائزہ لیتے ہوئے انھیں آزاد ہندوستان کا معمار قرار دیا اور کہا کہ ان کے یوم ولادت کو قومی یوم تعلیم کے طور پر منانا انھیں موزوں ترین خراج عقیدت ہے۔ عبدالوارث سفر نے کہا کہ ''مولانا آزاد نے آزادی کے فوراً بعد بحیثیت وزیر تعلیم ساہتیہ اکیڈمی، للت کلا اکیڈمی، سنگیت ناٹیہ اکیڈمی، یو جی سی، انڈین کونسل فار ہسٹوریکل ریسرچ، انڈین کونسل فار سوشل سائنس ریسرچ، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، انسٹی ٹیوٹ آف انٹر نیشنل اسٹڈیز، نیشنل آرکائیوز اور نیشنل میوزیم نیز انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (کھڑگپور) جیسے ادارے قائم کئے جن کی بدولت آزاد ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا ڈھانچہ مضبوط ہوا۔'' جناب احمد جاوید نے مولانا آزاد کی شخصیت کی عظمت بیان کرتے ہوئے آنجہانی کلدیپ نیر کے حوالے سے کہا کہ ''ملک کا وزیر اعظم اور وزیر داخلہ بھی مولانا سے ملنے کی غرض سے ان کی رہائش گاہ جایا کرتے تھے اور نازک سیاسی و قومی مسائل پر ان سے رائے لیتے تھے۔'' انھوں نے مزید کہا کہ مولانا کی شخصیت کثیر الجہت اور تہہ دار تھی۔ اے آر ڈی ڈاکٹر مظہر قادری نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مولانا کے حق میں دعائے خیر بھی کی اور کہا کہ مولانا آزاد کو بعد از مرگ بھارت رتن ایوارڈ دیا گیا لیکن میری رائے میں وہ ان اعزازات سے بالاتر شخصیت کے حامل تھے۔ دیگر شرکا میں ریجنل سینٹر کے ملازمین راحیل شاداب اور محمد اشتیاق کے علاوہ ماسٹر پرویز احمد اور ابوالحسن وغیرہ موجود تھے۔

....

● (۲۳ر نومبر ۲۰۱۸ء) اردو کے نامور ادیب، نقاد اور شاعر عبدالرحمٰن بجنوری کی حیات و خدمات پر ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے زیر اہتمام دو روزہ سمینار کا افتتاحی اجلاس اکادمی آڈیٹوریم، منڈی ہاؤس، نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اجلاس

کی صدارت اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ جملہ کہ 'ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں؛ ایک وید مقدس اور دوسرا دیوانِ غالب' غالب ڈسکورس میں جتنا مشہور ہوا اتنا مشہور کوئی جملہ نہیں ہو سکا۔ جب تک اردو تنقید ہے تب تک یہ جملہ زندہ جاوید ہے۔ فلو کی زد میں آنے سے قبل صرف اکتیس سال کی عمر میں بجنوری نے غالب کی عظمت کا لوہا منوالیا۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ غالب ہمارا شیکسپیئر ہے۔ اس سے قبل کنیڈا سے تشریف لائے اردو کے ممتاز نقاد اور محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی نے سیمنار کا افتتاح کیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انھوں نے کہا کہ بجنوری کی تنقید کا کوئی جواب نہیں۔ گلشن دیوانِ غالب کا پہلا دروازہ کھولنے والا پہلا شخص عبدالرحمٰن بجنوری ہی ہے۔ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے تمام مقالہ نگاروں اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر جناب شین کاف نظام نے ابتدائی کلمات پیش کیے۔ انھوں نے بجنوری پر مختلف دانشوروں کی تقریروں کا حوالہ پیش کیا اور کہا کہ بجنوری ایک نقاد کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ ممبئی سے تشریف لائے اردو کے معروف نقاد اور صحافی جناب شمیم طارق نے اپنے مخصوص انداز میں جامع کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے بجنوری کی مشہور کتاب 'محاسن کلام غالب' کو شاہکار بتایا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ بجنوری نے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ پروگرام کی نظامت اکادمی کے افسر بکارِ خاص ڈاکٹر دویندر کمار دیویش نے کی۔ اس موقع پر کافی تعداد میں دہلی کی سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔ 24 نومبر کو سیمنار کے دوسرے دن مقالہ خوانی کے تین اجلاس عمل میں آئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے جناب ف س اعجاز نے کہا کہ جہاں شاعری اور فکشن برسوں اور صدیوں ٹھہرتے ہیں کسی کی تنقید سو برس کا استحکام پائے یہ غیر معمولی بات ہے۔ ڈاکٹر راشد انور راشد نے بجنوری کی شاعری پر اپنے مقالے میں کہا کہ عبدالرحمٰن بجنوری کی سخن فہمی قابلِ رشک تھی۔ لیکن ان کی سخن گوئی پر سوالیہ نشان قائم کیا جا سکتا ہے۔ جناب فاروقی ارگلی نے اپنے مبسوط مقالے میں کہا کہ عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ جملہ کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوانِ غالب، یہ محض انشا پردازی نہیں، اس ایک جملے میں ہندوستان کی قدیم تہذیب، فلسفہ، سماجی زندگی، تاریخ سب کچھ اس طرح سمایا ہوا ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ممتاز نقاد اور فکشن نگار پروفیسر انیس اشفاق نے کی۔ انھوں نے اردو ناقدین کے ذریعہ بجنوری پر اٹھائے گئے سوالات کا مدلل جواب کے ذریعہ انھیں کامیاب نقاد قرار دیا۔ اس اجلاس میں دو مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے اپنے مقالے میں محاسنِ کلام غالب کے حوالے سے بجنوری کی از سرِ نو دریافت کی سعی کی۔ جناب حقانی القاسمی نے اپنے پُر مغز مقالے میں ثابت کیا کہ بجنوری ایک نابغہ تھے اور غیر معمولی ذہن کے حامل بھی۔ اس کا اعتراف ان کے مخالفین بھی کرتے ہیں اور یہی اعتراف بجنوری کی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابن کنول نے کی۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بڑی بات کہنے یا کرنے کے لیے طویل عمر ہونا ضروری نہیں، بجنوری اس کی مثال ہیں۔ وہ غالب تنقید کے سکندر ہیں۔ جناب قاسم خورشید نے اپنے مقالے میں کہا کہ بجنوری نے محاسن کلام غالب کے مختلف نکات بیان کرنے کے عمل میں یہ خیال رکھا ہے کہ وہ لفظی سطح پر شعر کے مفاہیم یا معنی بیان کرنے سے گریز کریں بلکہ وہ تخلیقی بیانیہ کو زیادہ اہمیت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماہنامہ

'سبق اردو' کے مدیر ڈاکٹر دانش الہ آبادی نے 'عبدالرحمٰن بجنوری: حیات اور کارنامے' موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ بجنوری نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ جرمن زبان میں لکھا تھا جو کتابی شکل میں 1914ء میں لندن سے شائع ہوا۔ انھوں نے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے مسودہ ایکٹ اور ریگولیشن وغیرہ پر 92 صفحات پر مشتمل مفصل بحث لکھی جو 1915ء میں مرادآباد سے شائع ہوئی۔ پروگرام کے آخر میں اکادمی کے افسر بکار خاص ڈاکٹر دویندر کمار دیویش نے سمینار کو کامیابی سے ہمکنار کرانے کے لیے تمام شرکا، مندوبین اور جناب موسیٰ رضا(کا شکریہ ادا کیا۔

....

● (۲۴ر نومبر ۲۰۱۸ء) الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتبہ کتاب ''پروفیسر محمد حسن بنام پروفیسر عبدالواسع'' کی رونمائی 'ادبستان' محلّہ: گنگوارہ، پوسٹ: سارا موہن پور، ضلع دربھنگہ (بہار) میں انجام پائی، جس کی صدارت ٹرسٹ ہذا کے صدر ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے کی جب کہ نظامت ڈاکٹر نوا امام (بی ڈی ایس) نے کی۔ اس موقع پر مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب حیدر وارثی، ڈاکٹر عالمگیر شبنم اور مہمانانِ اعزازی کی حیثیت سے سیّد متین اشرف اور ڈاکٹر وکیل احمد (ایڈوکیٹ) شریک ہوئے۔ محمد کریم اللہ، ڈاکٹر امام اعظم، حافظ نازش نہال اور فضا امام بھی محفل میں موجود تھے۔ اجرا سے قبل اس کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر امام اعظم نے کہا کہ اردو ادب میں پروفیسر عبدالواسع کی حیثیت محقق اور ناقد کی ہے نیز بی آر امبیڈکر یونیورسٹی، مظفر پور کے سابق صدر، شعبۂ اردو اور ڈین، فیکلٹی آف ہیومنٹیز بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے نام ممتاز مارکسی نقاد اور دانشور پروفیسر محمد حسن کے چند خطوط کو ترتیب دے کر پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے کتابی شکل دی ہے۔ انھوں نے محمد حسن صاحب کا انٹرویو بھی شامل کر کے کتاب کی وقعت میں اضافہ کیا ہے۔ اس طرح یہ چیزیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ محفل میں موجود تمام لوگوں نے اس کتاب کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ حافظ نازش نہال نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

....

● (۲۸ر نومبر ۲۰۱۸ء) ''نذیر بنارسی کی شاعری حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے۔ بھارت کی مٹی کی خوشبو ان کی شاعری میں موجود ہے۔ میرے ڈائرکٹر بننے کے بعد یہ پہلا سمینار ہے جو بنارس میں ہو رہا ہے۔ یہ سمینار ہمارے وزیر اعظم عزت مآب جناب نریندر مودی کی ایما پر یہاں کیا جا رہا ہے۔ بنارس ہمارے وزیر اعظم کا حلقہ ہے اور ان کا پسندیدہ شہر ہے اور یہ گنگا جمنی تہذیب کا شہر ہے۔ مودی جی بنارس اور یہاں کی تہذیب و تمدن اور نذیر بنارسی سے کس قدر محبت رکھتے ہیں اور اردو کے فروغ کے لیے بے حد سنجیدہ ہیں اور وہ بنارس کی گلیوں میں اردو کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں قومی اردو کونسل کے اشتراک سے منعقدہ دوروزہ سمینار بعنوان 'نذیر بنارسی: حیات اور کارنامے' میں کہیں۔

اس موقعے پر معروف ناقد جناب شمیم طارق نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ ایک صدی میں قومیت اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ایسی کوئی شاعری وجود میں نہیں آئی جیسی نذیر بنارسی نے کی ہے۔ اس لیے انھیں یاد کرنا اور ان کی شخصیت اور شاعری پر گفتگو کرنا اپنے جذبۂ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کو نہ صرف تقویت پہنچانا ہے بلکہ اس سمینار کی مدد سے عوام و خواص میں اس جذبے کی تازگی پیدا کرنا بھی ہے۔ ہندی کے معروف فکشن

نگار دانشور پروفیسر کاشی ناتھ سنگھ نے نذیر بنارسی سے اپنے تعلقات اور ملاقاتوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی شخصیت کے بعض پوشیدہ گوشوں کو اجاگر کیا اور کہا کہ ان کی شاعری ہمارے عہد کے مشاعروں کی جان ہوا کرتی تھی۔ پروفیسر امیش چندر دوبے (ڈین فیکلٹی آف آرٹس) نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ نذیر بنارسی کی آواز کا جادو اور شعر پڑھنے کا فن انھیں مشاعروں میں ممتاز بناتا تھا۔ سیمینار کا آغاز پنڈت مدن موہن مالویہ کے مجسمے پر گل پوشی اور یونیورسٹی کے کل گیت سے ہوا۔ مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے نذیر بنارسی پر سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ بنارس ہی نہیں ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ ہم نذیر بنارسی جیسے قومی شاعر کو یاد کرنے کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔ افتتاحی اجلاس میں نذیر بنارسی کے بیٹے ظہیر بنارسی بھی شریک تھے۔ انھوں نے اپنے والد کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ نذیر بنارسی اپنے احباب میں ہر دل عزیز تھے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر مشرف علی نے کی۔ اس موقع پر شعبۂ اردو کے ششماہی ریسرچ جرنل 'دستک' کے دوسرے شمارے اور ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کی کتاب 'اردو۔ہندی محاورے' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد نذیر بنارسی کی یاد میں آل انڈیا مشاعرے (ایک شام نذیر بنارسی کے نام) کا انعقاد ہوا جس میں معتبر شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

....

● (۲ دسمبر ۲۰۱۸ء) "پروفیسر شارب ردولوی تہذیب کی ایک روشن علامت ہیں۔ وہ موجودہ عہد میں اردو ادب کا ایک معتبر دستخط ہیں۔ ان کی زندگی ہی میں اتنی شاندار اور باوقار جشن کا انعقاد خود ان کی شخصیت پر روشنی ڈالنے اور انہیں سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ریاستی گورنر رام نائک نے کیا۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں پروفیسر شارب ردولوی کی خدمات میں منعقدہ 'جشن شارب' میں بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ پروگرام کی صدارت جسٹس سید شبیہ الحسنین اور نظامت پروفیسر عباس رضا نیر نے کی۔ جسٹس سید شبیہ الحسنین نے کہا کہ پروفیسر شارب ردولوی نے اردو تنقید میں جتنا کام کیا ہے اگر وہ مغرب میں ہوتے تو ان کا شمار ٹی ایس ایلیٹ جیسے نقاد کے ساتھ کیا جاتا، لیکن یہ اردو کی زبوں حالی اور بدنصیبی ہے کہ پروفیسر شارب ردولوی کے قد کو صحیح طور پر پہچانا نہیں گیا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس پی سنگھ نے کہا کہ پروفیسر شارب ردولوی ایک بڑے آدمی ہونے کے باوجود نہایت سادگی پسند واقع ہوئے ہیں۔ وہ ایک ادیب ہیں نقاد ہیں شاعر ہیں۔ اتنی خصوصیات شارب ردولوی جیسی شخصیت میں ہی جمع ہو سکتی ہیں۔ سینئر صحافی اور شاعر حسن کمال نے پروفیسر شارب ردولوی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ میں اسی لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم رہا ہوں اور آج جس مقام پر بھی ہوں اس میں شارب ردولوی کا بڑا ہاتھ ہے، کیونکہ انہوں نے میرے ایک شعر پر کہا تھا کہ اب تم شاعر ہو گئے تبھی سے میں نے شاعری کو سنجیدگی کے ساتھ لینا شروع کر دیا۔ عارف نقوی (جرمنی) نے شارب ردولوی کے ساتھ گذرے دنوں کو سامعین کے ساتھ شیئر کیا۔ پروفیسر عباس رضا نیر نے کہا کہ جس نے بھی اردو میں ایم اے کیا ہے وہ شارب سر کا معنوی شاگرد ہے کیونکہ ان کی کتاب "جدید اردو تنقید اصول و نظریات" پڑھے بغیر ایم اے کی ڈگری نہیں لی جا سکتی۔ پروفیسر محمد ظفر الدین

(مانو، حیدرآباد) نے اپنے خطاب میں پروگرام کے محرکات کی تفصیل بیان کی اور ڈاکٹر ریشما پروین نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے مہمانوں اور سامعین کا استقبال کیا۔ اس موقع پر شارب ردولوی نے اپنے شاگردوں اور ''جشن شارب'' کے انعقاد میں شریک تنظیموں کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، میں آپ سب کی محبتوں کا شکریہ ادا کرسکوں لیکن میں خدا کا شکر گذار ہوں کہ جس ہال میں اور جس مائک پر میں نے اپنے اساتذہ کو بولتے سنا ہے وہیں آج مجھے یہ اعزاز بخشا گیا ہے۔ میرے اساتذہ نے مجھے سلیقہ اور شعور بخشا ہے۔ میں کل بھی طالب علم تھا اور آج بھی طالب علم ہوں اور ہمیشہ سیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر ایک مختصر فلم بھی دکھائی گئی، جس میں شارب ردولوی کی پوری زندگی کو پردے پر سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔

....

● (۴دسمبر ۲۰۱۸ء) ہگلی ضلع میں مزدوروں کی پسماندہ بستی رشڑا میں تعلیم کے فروغ کے لئے کمربستہ 'کولکاتا مسکان فاؤنڈیشن' نے اپنی کامیابیوں کی تاریخ میں ایک اور نئے باب کا اضافہ کرایا ہے۔ مادھیامک ۲۰۱۹ء کا امتحان دینے والے طلبا و طالبات کی کوچنگ اور ان کی صلاحیتوں میں نکھار کے لئے ادارہ کے سرپرست اور مغربی بنگال میں طلبا کی دست گیری کے لئے مشہور جناب بلال حسن (صدر، بزمِ شہر نشاط) کے تعاون سے 'بلال-۳۰' کا آغاز کیا گیا۔ ۲مہینہ تک ہونے والے اس خصوصی کوچنگ کے تحت ہر طالب علم پر انفرادی توجہ دی جائے گی اور امتحان میں بہتر نتائج کے لئے خصوصی کلاس، ماک ٹسٹ، ہفتہ واری جانچ شامل ہوگی۔ افتتاحی تقریب میں ادارہ کے سربراہ فیروز انجم نے کہا کہ بلال حسن کے تعاون سے یہ ادارہ گزشتہ چار برسوں سے تعلیمی محاذ پر اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ درجہ نہم اور دہم میں زیر تعلیم ضرورت مند طلبا و طالبات میں مفت کتابوں کی تقسیم، سردی کے موسم میں مستحقین اور غرباء میں کمبلوں اور چٹائیوں کی تقسیم، ڈیبیٹ کے علاوہ مادھیامک اور ہائر سکنڈری میں نمایاں نمبر سے کامیاب ہونے والے طلبا و طالبات میں وظائف کی تقسیم نیز ہائر سکنڈری میں اردو میڈیم سے رشڑا کے ۲ ٹاپر کو لیپ ٹاپ دینے جیسے تعلیمی کاز میں بلال حسن کا خصوصی تعاون رہتا ہے۔ بلال-۳۰ کا آغاز بھی ان کا رہین منت ہے اور اس کے تمام اخراجات بلال حسن ہی برداشت کرتے ہیں۔ بلال-۳۰ میں صرف ۳۰ ربچوں کو رکھنے کی بات تھی لیکن طلبہ کی کثیر تعداد اور دلچسپی کے پیش نظر اسے بڑھا کر ۴۰ کردیا گیا ہے۔ اس خصوصی کوچنگ کے تحت اگلے دو مہینے تک روزانہ ۲ رکلاس ہوں گے جن میں ۷ مضامین کے ۷ راساتذہ طلبہ کی رہنمائی کریں گے۔

....

● (۱۶ردسمبر ۲۰۱۸ء) اقراء اکیڈمی بی بی پاکر دربھنگہ کے کانفرنس ہال میں شاندار اردو بیداری کانفرنس اور محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو دربھنگہ کے سکریٹری انجینئر خورشید عالم نے مہمان خصوصی و بہار انجمن ترقی اردو کے سکریٹری عبدالقیوم انصاری، ایڈیشنل کلکٹر مبین علی انصاری کا گلدستہ اور چادر سے استقبال کیا۔ انجمن کے ضلعی صدر انجینئر عمر فاروق رحمانی کی صدارت اور ڈاکٹر عالمگیر شبنم کی نظامت میں منعقد کانفرنس کا افتتاح تلاوت قرآن اور نعت پاک سے ہوا۔ مہمانِ خصوصی عبدالقیوم انصاری نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کا ذکر کیا اور مایوسی کو چھوڑ مین اسٹریم میں آنے کی دعوت قوم و ملت کو دی۔ انہوں نے دوٹوک لہجہ میں کہا کہ ''قوم میں صرف کردار کے

بل بوتے اپنا مقصد حاصل کیا کرتی ہیں۔ وزیر اعلیٰ نتیش کمار اقلیت اور اردو کے تئیں پوری طرح سنجیدہ ہیں بس ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔'' اس موقع پر مہمان اعزازی وایڈیشنل کلکٹر مبین علی انصاری نے اردو زبان کی اہمیت وافادیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''ریاستی حکومت اقلیتوں کی بہتری کے لئے بہت سی اسکیمیں چلا رہی ہے۔ اس کی بھر پور جانکاری حاصل کرنا چاہئے اور اقلیتی طبقہ کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔'' ڈاکٹر نکہت افشاں نے کہا کہ ''اردو اپنے اندر بے پناہ حلاوت رکھتی ہے۔ ہمیں اس کی حفاظت اپنی جان کی طرح کرنا چاہئے کیوں کہ آج ہماری نسل اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔'' پروفیسر شاکر خلیق نے اردو کو ابتدائی اور زمینی سطح سے سینچنے اور سنوارنے پر زور دیا۔ حافظ ابوشمہ (ضلعی صدر جے ڈی یو اقلیتی سیل) نے کہا کہ اردو کی بہتری کے لئے ضروری ہے کہ ہر گھر میں اردو اخبار اور رسالے خریدے اور پڑھے جائیں۔ انجینئر خورشید عالم نے کہا کہ انجمن ترقی اردو دربھنگہ اردو کے فروغ میں ہمہ تن جٹی ہوئی ہے اور منزل تک پہنچنے سے پہلے دم نہیں لیں گے۔ ڈاکٹر عالم گیر شبنم نے کہا کہ اردو زبان پوری دنیا میں رائج ہے اور پرکشش زبانوں میں اہم ہے اور اس کی شیرینی اور حلاوت کے قائل اغیار بھی ہیں۔ انجینئر عمر فاروق رحمانی نے کہا کہ اردو میں نہ صرف ہماری تہذیب اور تاریخ محفوظ ہے بلکہ یہ ہماری ضرورت بھی ہے۔ اس موقع پر انجمن ترقی اردو کے سکریٹری عبد القیوم انصاری اور اے ڈی ایم مبین علی نے ۸۰ طلباء وطالبات کو توصیفی سند اور میڈل سے نوازا۔ کانفرنس میں سابق اے ڈی ایم نیاز احمد، ڈاکٹر وکیل احمد (ایڈوکیٹ)، نظیر احمد، قاری محمد عثمان، ایس ایم جاوید اقبال، ڈاکٹر آفتاب اشرف، ڈاکٹر عقیل صدیقی، نسیم احمد برداہوی، افلاک منظر، صفی الرحمٰن راعین، سید ممتاز راجن، ڈاکٹر احسان عالم، نسیم احمد رفعت مکی، اقبال حسن ریشو وغیرہ موجود تھے۔ دوسری نشست میں بزرگ شاعر زمان برداہوی کی صدارت اور ڈاکٹر منور راہی کی نظامت میں محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں شعرا نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو لطف اندوز کیا۔

....

● (۲۵ دسمبر ۲۰۱۸ء) معروف سماجی تنظیم 'ہمن انڈیا'، دھنباد کے زیر اہتمام ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا) اور جناب خورشید طلب (بیرمو، جھارکھنڈ) کی دھنباد آمد پر واسع پور بائی پاس روڈ کڈس کیمپس میں ایک اعزازی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر امام اعظم نے کی۔ ادارۂ ہٰذا کے صدر محمد پرویز اختر عرف پارو خاں نے مہمانانِ خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے ان کی شال پوشی کی۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا جس میں ڈاکٹر امام اعظم، خورشید طلب، احمد نثار، ڈاکٹر حسن نظامی، امتیاز بن عزیز، احمد فرمان، شاہ الہ آبادی، امتیاز دانش ندوی، ڈاکٹر عبد الرحمٰن عبد، نسیم اختر نسیم وغیرہ نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو لطف اندوز کیا۔ نظامت کے فرائض امتیاز بن عزیز نے انجام دیے جب کہ احمد نثار کے اظہار تشکر کے ساتھ تقریب کا اختتام ہوا۔ سامعین میں ڈاکٹر معصوم عالم، انجم پرویز، ببلو فریدی، اشرف خاں، فیروز خاں، شکیل خاں، دلشاد گدی، پرنس خاں، دانش خاں اور آصف خاں کے نام اہم ہیں۔

....

● (۳۱ دسمبر ۲۰۱۸ء) سینئر انڈین انفارمیشن سروس آفیسر حسیب الرحمٰن ملک نے وزارت اطلاعات ونشریات،

حکومت ہند کے محکمہ ڈائرکٹریٹ آف ایڈورٹائزنگ انڈ ویزیول پبلسٹی (DAVP) میں ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھال لیا۔ وہ اس باوقار عہدے تک پہنچنے والے ملک کے پہلے مسلم آفیسر بھی ہیں۔ بہار کے گیا ضلع سے تعلق رکھنے والے ۵۹ رسالہ حسیب الرحمٰن ملک نے ۱۹۸۳ء میں اپنی سروس کا آغاز کیا۔ وہ ملک کے ممتاز بیوروکریٹ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ حکومت ہند کے ریجنل پبلسٹی آفیسر کی حیثیت سے مگدھ، گیا ڈویژن میں ۲۰ سال تعینات رہے۔ اس کے علاوہ دوردرشن پٹنہ میں نیوز ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے، آل انڈیا ریڈیو کلکتہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر رہے، یو پی اے حکومت کی دوسری میعاد میں وزیر سیاحت جناب سلطان احمد کے OSD رہے اور ترجمان، وزارتِ داخلہ کے طور پر خدمات انجام دیں۔

....

● (یکم جنوری ۲۰۱۹ء) وزارتِ ثقافتِ ہند کے تحت دلی پبلک لائبریری ہندی، سنسکرت، اردو اور پنجابی کے پرائیویٹ ادبی رسالوں کو سالانہ ایوارڈز سے نوازتی ہے۔ یہ ایوارڈ دلی لائبریری بورڈ کی نامزد کردہ جیوری کے متفقہ فیصلے پر دیئے جاتے ہیں۔ ہندی پتریکاؤں کے لئے چار انعامات، پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا اور دیگر تین زبانوں کے رسالوں کیلئے دو ایوارڈ دیے جاتے ہیں، پہلا اور دوسرا۔ ۲۰۱۸ کے لئے ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ کے علاوہ ملک کے واحد مزاحیہ جریدہ ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ماہنامہ ''انشاء'' کولکاتا سے ۳۳ ربرسوں سے شاعر، افسانہ نگار، نقاد، مترجم اور ۲۶ رکتابوں کے مصنف ف۔س۔ اعجاز کی ادارت میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

....

● (۶ رجنوری ۲۰۱۹ء) الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ کے زیرِ اہتمام ادبستان محلّہ گنگوارہ دربھنگہ میں صبح بی الہام فاطمہ (بھاگلپور) کی مرتبہ کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی: خواتین قلمکار کی نظر میں'' کی رسم رونمائی ڈاکٹر ایم صلاح الدین، صدر ٹرسٹ ہٰذا محمد کریم اللہ حیاتی، ڈاکٹر امام اعظم، مولانا محمد مستقیم قاسمی، مولانا عبدالصمد، قاری سیف اللہ، حافظ نصر الحق وغیرہ کے ہاتھوں بحسن خوبی عمل میں آئی۔ حاضرین و شرکاء نے اس کتاب کی اہمیت پر اظہارِ خیال کیا۔ فضا امام نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ بعدہٗ ڈاکٹر نوا امام نے اظہارِ تشکر پیش کیا۔

....

● (۶ رجنوری ۲۰۱۹ء) الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ دربھنگہ کے زیرِ اہتمام ''ادبستان'' محلّہ: گنگوارہ، پوسٹ: سارا موہن پور، ضلع: دربھنگہ (بہار) میں محمد نہال الدین، بی بی امام باندی، محمد ظفر المنان ظفر فاروقی، بی بی مظہر النساء نرگس، بی بی شمع امام اور پروفیسر سید منظر امام کے ایصالِ ثواب کے لئے ہر سال کی طرح امسال بھی غریبوں، محتاجوں کے درمیان گرم چادروں اور کمبلوں کی تقسیم کی گئی۔ مولانا محمد مستقیم قاسمی (صدر مدرس، مدرسۃ البنات فاروقیہ، گنگوارہ، دربھنگہ) کی تلاوتِ کلام پاک کے بعد مولانا عبدالصمد (مدرّس، مدرسہ ہٰذا) نے مرحومین کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر ایم صلاح الدین، محمد کریم اللہ حیاتی، ڈاکٹر امام اعظم، قاری سیف اللہ، حافظ نصر الحق، ڈاکٹر نوا امام صاحبان کے ہاتھوں کمبلوں اور چادروں کی تقسیم عمل میں آئی۔ فضا امام نے شرکاء کا استقبال کیا۔

....

● (۱۰ رجنوری ۲۰۱۹ء) شاکر کلکتوی کے جانشیں صوفی شاعر سید سجاد حسن شاکری مجیدی کے دیوان ''رقصِ الہام'' کی رسم اجراء جناب انجم عظیم آبادی کے ہاتھوں شام ۶ ربجے مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے مولانا آزاد آڈیٹوریم میں

ہوئی۔تقریب کی صدارت جناب قیصر شمیم نے کی جب کہ نقابت نسیم عزیزی نے بحسن وخوبی انجام دی۔اس موقع پر انجم عظیم آبادی نے کہا کہ ''بزمِ شاکری'' کے بنیادی اراکین میں اس وقت سجادشاکری، سفیر الدین کمال اور میں زندہ ہوں۔شاکر کلکتوی نے اپنی زندگی میں ہی سجادشاکری کو اپنا جانشین بنالیا تھا جس کا حق انہوں نے واقعی ادا کیا۔ انہوں نے شاکر کلکتوی کے قصیدے لکھنے کی روایت کو مٹنے سے بچالیا۔سجادشاکری ابتدا میں غزلیں لکھتے رہے۔ اس کے بعد قصیدے لکھنے لگے۔اس دیوان میں نت نئی ردیفیں اور قوافی پر اشعار کہے گئے ہیں۔سجادشاکری کے بچپن کے دوست اجاریہ جمال احمد جمال نے کہا کہ ہم لوگوں نے ایک ساتھ تعلیم حاصل کی ہے تب سے آج تک سجادنہیں بدلے۔انھوں نے درج ذیل قطعہ بھی پیش کیا:

رقص الہام کی لکیروں میں شاد رہتے ہیں یہ بھی پیروں میں
نفس سے کر کے یہ جہاد جمالؔ جھومتے رہتے ہیں فقیروں میں

ڈاکٹر دبیر احمد نے 'رقص الہام' کے حوالے سے کہا کہ صرف ۴ر مہینے میں دیوان مکمل کر لینا غیر معمولی بات ہے۔ ہم سب انہیں سلام پیش کرتے ہیں۔ڈاکٹر عمر غزالی نے کہا کہ عشق مجازی سے ہوکر ہی عشق حقیقی تک سفر کیا جاسکتا ہے اور یہ خوبی 'رقص الہام' میں موجود ہے۔اس میں ان کا اپنا اسلوب ملتا ہے۔ڈاکٹر نوشادمومن نے کہا کہ ان کی شاعری میں روایتی اور کلاسیکی دونوں آہنگ موجود ہیں۔پورے دیوان میں عشق کا باوقار اظہار ملتا ہے۔ڈاکٹر امام اعظم نے کہا ''رقصِ الہام'' میں کسی واقعہ کا سطحی اظہار نہیں ہے بلکہ اس کی گہرائی میں ڈوب کر وہ اس کی تہہ میں کام کرنے والے سماجی اور نفسیاتی عوامل اور محرکات کو بروئے کار لاتے ہیں اور فنی وسائل کا استعمال پوری ایمان داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس میں نفسیات کا مطالعہ بھی ہے، واقعات کی کیفیت بھی ہے۔اشرف احمد جعفری نے کہا کہ ان کی شاعری انسانیت اور اتحاد کی تلقین کرتی ہے۔فہیم انور نے کہا کہ 'رقصِ الہام' کی شاعری میں شروع تا آخر سچ مچ رقص الہام ہی ہے۔ ان کی زبان کوثر وتسنیم سے دھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔نثار احمد (سابق اے سی پی اور اعزازی جنرل سکریٹری، مسلم انسٹی ٹیوٹ) نے بھی 'رقص الہام' کی شاعری کی تعریف کی کہ اسے پڑھ کر انسان اس میں کھوجاتا ہے۔دیگر مقررین میں جناب حفیظ الرحمٰن، شبیر ذوالمنان وغیرہ تھے۔نسیم فائق اور ارم انصاری نے ایک ایک قطعہ پیش کیا۔جناب مشتاق ہاشمی نے اظہار تشکر پیش کیا۔پروگرام کو کامیاب بنانے میں مشتاق ہاشمی، سیّد نفیس حسن اور سیّد مفید حسن وغیرہ کا اہم رول رہا۔

● (۲۴ر جنوری ۲۰۱۹ء) محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام بہار ریاستی انھیلیکھ بھون، بیلی روڈ، پٹنہ کے کانفرنس ہال میں اردو کے عظیم شعراء مظہر امام اور کیف عظیم آبادی کی خدمات کے اعتراف میں یادگاری تقریب منعقد ہوئی۔یہ تقریب دو اجلاس پر مشتمل تھی۔پہلے اجلاس میں مظہر امام پر پروفیسر منظر اعجاز، ڈاکٹر امام اعظم اور ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ڈاکٹر امام اعظم نے کہا کہ مظہر امام سرزمین متھلا کی پیداوار تھے۔ ان کا شمار اردو کے اہم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔وہ سارے برصغیر میں اپنے ڈکشن کی دلکشی، علامتوں اور پیکروں کی تازہ کاری اور زندگی کی بابت جدید نقطہ نظر کے لحاظ سے مشہور رہے ہیں۔مظہر امام ایک تسلیم شدہ ادبی نقاد بھی تھے

اور تخلیقی فن پاروں کی معنوی شناخت کے لئے معروف رہے ہیں۔ وہ آزاد غزل کے موجد تھے، انہوں نے افسانے لکھے، مکتوب لکھے، بچوں کے لئے نظمیں لکھیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کہا کہ مظہر امام جدید غزل کے معماروں میں شمار کئے جاتے ہیں مگر ان کی نظمیں بھی کم اہم نہیں ہیں۔ ان کی نظمیں کیف وکم کے اعتبار سے زبردست ہیں اور جدید نظموں کی فہرست میں نمایاں مقام کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔ پروفیسر منظر اعجاز شعبہ اردو اے این کالج، پٹنہ نے بھی ان کی ہمہ جہت شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ تقریب کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی اور پڑھے گئے تمام مقالوں پر اظہار خیال کیا۔ استقبالیہ و تعارفی کلمات اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے پیش کئے۔ انہوں نے عظیم المرتبت شاعر مظہر امام اور معروف سخن ور کیف عظیم آبادی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں آپ بھی عاشقان اردو اور محبان ادو کا دل کی گہرائیوں سے استقبال کرتا ہوں۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ اردو ڈائرکٹوریٹ سرکاری سطح پر پہلی بار مظہر امام کو خراج عقیدت پیش کررہا ہے۔ مظہر امام کی شاعری اور کیف عظیم آبادی کی شاعری پر دانشوران ادب گفتگو کریں گے۔ دوسری اجلاس میں کیف عظیم آبادی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ دبستان عظیم آباد کی کہنہ روایات کے امین اور جدید اقتدار کے پاسدار کیف عظیم آبادی اپنے وقت کے بے حد مقبول و مشہور شاعر تھے۔ ان کی سخن سرائی اور نغمہ سنجی کا اتنا شہرہ تھا کہ ان کی شرکت کے بغیر مشاعرے کی کوئی بھی محفل کامیاب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مقالہ خواں میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر جلال اصغر فریدی اور ڈاکٹر شفیع الزماں معظم نے مشترکہ طور پر کیف عظیم آبادی کی شخصیت اور شاعری پر مختلف جہتوں سے روشنی ڈالی۔

....

● (یکم رفروری ۲۰۱۹ء) دربھنگہ کے علمی وادبی حلقے کے لئے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ (صدر، شعبۂ اردو، ملت کالج، دربھنگہ) کو ایل این متھلا یونیورسٹی کے رجسٹرار کے جاری کردہ اعلامیہ کے مطابق یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا صدر مقرر کیا گیا ہے۔ موصوف نے آج اپنے عہدے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر موصوف کا تعلق دربھنگہ کے علمی خانوادے سے ہے۔ ان کے والد بزرگوار سیّد شاہ مسعود عالم شہر کے معروف وکیل تھے نیز انھیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے خاص عقیدت تھی۔ جب مولانا مودودی محلّہ رسول پور، دربھنگہ تشریف لائے تو ان کی ایما پر ایک درس گاہ اسلامی کا قیام عمل میں لایا گیا جس کی عمارت کے لئے مسعود عالم صاحب مرحوم نے اپنی ذاتی زمین عطیہ کی تھی اور اس کی ذمہ داری ان کے خویش اور شہر کی معروف شخصیت حسنین سیّد جامعی مرحوم نے بحسن وخوبی نبھائی۔ ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ کی پہلی تقرری ۱۹۸۳ء میں آر این اے آر کالج، سمستی پور میں ہوئی تھی۔ وہاں سے ان کا تبادلہ ملت کالج، دربھنگہ ہوا جہاں وہ تا حال اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ موصوف کی ایک اہم کتاب ''شہباز: بہار میں جدید نظم کا بانی'' (اشاعت: ۱۹۸۱ء) شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہے نیز ان کی تخلیقات معروف رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور سیمیناروں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ مطالعے کا خاصا ذوق ہے۔ ملّی وسماجی مسائل سے بھی سے ان کا گہرا رشتہ ہے۔ شعبۂ اردو کے موجودہ صدر ڈاکٹر محمد ظفیر الدین انصاری ۳۱ رجنوری ۲۰۱۹ء کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔

● (۲۸ر جنوری ۲۰۱۹ء) مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے ۱۲ویں کل ہند اردو کتاب میلے کے ۹ویں دن تین مصنفین کی کتابوں کا رسم اجرا ہوا۔ ۱-رضا علی وحشت کلکتوی، ترانۂ وحشت (مبصر: قیصر شمیم) ۲-شاہد اقبال کی مرتب کردہ کتاب مغربی بنگال میں اردو کا ایک اہم مرکز: مٹیا برج (مبصر: مقصود دانش) اور ۳-کوثر علی سعیدی کی کتاب اے پی جے عبدالکلام سیرت وبصیرت کے آئینے میں (مبصر: ممتاز انور) نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کوثر علی سعیدی نے اے پی جے عبدالکلام کی شخصیت اور فکر ونظر کے چار مختلف پہلوؤں کو اس کتاب میں شامل کر کے کتاب کو مطالعہ کرنے کے لائق بنا دیا ہے۔ اس کتاب میں میر کے شعر کا بھی حوالہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب نئی نسل کے مطالعہ کے لئے ہی نہیں بلکہ کتابوں کی الماری کے سجاوٹ میں بھی روشنی بکھیرے گی کیونکہ اے پی جے عبدالکلام درویش صفت سائنسداں تھے۔ جناب قیصر شمیم نے رضا علی وحشت کلکتوی کے ''ترانۂ وحشت'' (نئی اشاعت) پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ رضا علی وحشت کلکتوی کے نام اور کلام سے واقف ہیں ان کا پہلا دیوان ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ حالات سازگار نہیں ہونے کی وجہ سے وہ آخر کار مشرقی پاکستان چلے گئے۔ لاہور سے دوسرا دیوان ۱۹۵۳ء میں ترانۂ وحشت شائع ہونے کے بعد اس کی دوسری اشاعت رانچی سے ہوئی۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی جانب سے شائع ہونے والی یہ کتاب رضا علی وحشت کے تیسرے دیوان سے کم نہیں ہے۔ شاہد اقبال کی کتاب ''مغربی بنگال میں اردو کا ایک اہم مرکز مٹیا برج'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مقصود دانش نے کہا کہ شاہد اقبال نئی نسل کے قلم کار ہیں۔ ان کے قلم کی روانی ان دنوں عروج پر ہے۔ زیر نظر کتاب کولکاتا کے نواح میں قائم اردو بستی مٹیا برج کی ڈیڑھ سو سالہ ادبی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے، جس میں مختلف اصناف ادب کے علاوہ مختلف شعرا وادبا کا انفرادی طور پر جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے کارگزار وائس چیئرمین سید محمد شہاب الدین حیدر نے کہا کہ ''اے پی جے عبدالکلام پہلے صدر جمہوریہ گزرے ہیں جنہوں نے اپنے عہدے کا کبھی غلط استعمال نہیں کیا اور نہ ہی اس کا فائدہ اٹھایا۔ صدر جمہوریہ ہند ہونے کے باوجود وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔'' پروگرام کی نظامت ڈاکٹر دبیر احمد نے کی۔ اس دوران مغربی بنگال اسکول سروس کمیشن کے چیئرمین سومترا سرکار اور ٹیچروں کے درمیان کانفرنس ہال میں تبادلہ خیال کیا گیا اور فرسٹ فلور میں آفس کا افتتاح ایم پی ندیم الحق نے کیا۔ میلے کے آخری دن ایک شاندار قومی مشاعرہ بزرگ شاعر انجم عظیم آبادی کی صدارت میں منعقد ہوا جس کی نقابت ضمیر یوسف نے کی۔ مشاعرے میں نہ صرف کولکاتا بلکہ بنگال اور دوسری ریاست کے شعراء کرام بھی تشریف فرما تھے۔ شعراء کرام میں ممبئی سے ندیم صدیقی، اڈیشہ سے جعفر دانش، آسنسول سے معراج احمد معراج، طاہر یونس بیگ دہلوی، اچاریہ جمال احمد جمال، ڈاکٹر امام اعظم، امتیاز اظہر، ہمدم نعمانی، پرویز اختر، عرفان ظہیر، شکیل گونڈوی، سلطان ساحر، پرویز رضا، ثنا جبیں، حلیم صابر وغیرہ موجود تھے۔ واضح ہو کہ میلہ کا افتتاح ۲۰ر جنوری کو ہوا تھا۔ ۱۰ دنوں تک جاری رہنے والے اس کتاب میلے میں نیشنل بک ٹرسٹ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ساہتیہ اکاڈمی، اتر پردیش اردو اکاڈمی، رامپور رضا لائبریری سمیت ۲۸ر ناشرین کے اسٹال موجود تھے۔ میلہ کی خاصیت یہ تھی کہ ایک طرف جہاں ادبی پیاس بجھانے کے لئے سیکڑوں کتابیں موجود تھیں وہیں مختلف ادبی پروگراموں، کتابوں کی رسم اجرا، اردو اسکولوں کو ایوارڈ، مشاعرے،

مباحثے، داستان گوئی، غزل خوانی، نظم خوانی، ڈرامے، کوئز جیسی تقریبات بھی روزانہ منعقد ہوتی رہیں۔ میلے کے آخری دن ۱۲ر بجے ادبی کوئز ہوا جب کہ شام کو تقسیم اسناد و انعامات کی محفل تھی۔

....

● (۳۰ر جنوری ۲۰۱۹ء) حکومت بہار نے انجمن ترقی اردو ہند (بہار) کے سکریٹری جناب عبدالقیوم انصاری کو بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا نیا چیئر مین مقرر کیا ہے جس کا اعلامیہ ۳۰ر جنوری ۲۰۱۹ء کو جاری کیا گیا۔ بعدہٗ انھوں نے ۳۱ر جنوری کو بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے دفتر واقع پٹنہ میں اپنے عہدے کا چارج لیا۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ مدرسہ تعلیم کے نظام میں بنیادی اصلاحات اور معیار میں اضافہ ان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ساتھ ہی ان کی کوشش ہوگی کہ ہر وہ اقدام اٹھائیں جن سے مدرسوں کے طلباء خود کو اسکولوں اور کالجوں کے طلباء سے کم تر نہیں تصور کریں۔ الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ اور اراکین اردو جریدہ ''تمثیل نو'' گنگوارہ (دربھنگہ) کی جانب سے انھیں مبارکباد پیش کی گئی ہے۔

....

● (یکم مارچ ۲۰۱۹ء) نوجوان شاعر و ادیب احمد معراج (معراج الدین خاں ولد عبداللہ خاں، استاد، یتیم خانہ اسلامیہ پرائمری اسکول، کولکاتا، مقیم قصائی بستی فرسٹ لین، نارکل ڈانگہ، کولکاتا-۱۱) نے ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی (سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر، پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ) کے زیر نگرانی اپنا تحقیقی مقالہ ''سیّد منظر امام: شخصیت اور ادبی کارگزاریاں'' جنوری ۲۰۱۸ء میں ایل این متھلا یونیورسٹی میں جمع کیا تھا جس کے بیرونی ممتحنین ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی (صدر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی) اور ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بی آر اے بہار یونیورسٹی، مظفرپور) تھے۔ شعبۂ اردو، ایل این ایم یو میں کارگزار صدر، شعبۂ اردو ڈاکٹر افتخار احمد کی موجودگی میں وائیوا ہوا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی (بیرونی ممتحن) نے زبانی امتحان لیا۔ ان کے علاوہ ڈین، فیکلٹی آف ہیومنٹیز ڈاکٹر منوج کمار جھا (پی جی شعبۂ فلسفہ) و دیگر نے موضوع سے متعلق سوالات کئے جن کا تشفی بخش جواب احمد معراج نے دیا۔ اس موقع ڈاکٹر آفتاب اشرف، ڈاکٹر امام اعظم وغیرہ کے علاوہ شعبۂ اردو کے طلبا اور طالبات نیز تدریسی وغیر تدریسی ملازمین بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر احمد معراج کی کامیابی پر ان کی اہلیہ شہنشاہ جہاں، خسر محترم سیّد داؤد علی وارثی (سجادہ نشیں، دربار وارث، ٹیٹیا گڑھ) اور خویش و اقارب نے مسرت کا اظہار کیا ہے۔

....

● (یکم مارچ ۲۰۱۹ء) محمد اشرف الہدیٰ (ولد محمد فخر الہدیٰ)، موضوع بڑاہلیا، بیگوسرائے مقیم تاج پور روڈ، آزاد چوک سمستی پور، استاذ کریم سٹی بی ایڈ کالج، جمشید پور، جھارکھنڈ نے ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی (سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر، پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ) کے زیر نگرانی اپنا تحقیقی مقالہ ''شاکر خلیق کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ'' ایل این متھلا یونیورسٹی میں جمع کیا تھا جس کے بیرونی ممتحنین ڈاکٹر جاوید حیات (صدر، شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی) اور ڈاکٹر افسر کاظمی (صدر، شعبۂ اردو، کریم سٹی کالج) تھے۔ شعبۂ اردو، ایل این ایم یو میں کارگزار صدر، شعبۂ اردو ڈاکٹر افتخار احمد کی موجودگی میں وائیوا ہوا۔ ڈاکٹر جاوید حیات (بیرونی ممتحن) نے وائیوا لیا۔ ان کے علاوہ ڈین، فیکلٹی

آف ہیومنٹیز ڈاکٹر منوج کمار جھا (پی جی شعبۂ فلسفہ) و دیگر نے موضوع سے متعلق سوالات کیے جن کا تشفی بخش جواب محمد اشرف الہدیٰ نے دیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر آفتاب اشرف، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر انیس احمد، ڈاکٹر خالد سجاد اور محمد منہاج الدین وغیرہ کے علاوہ شعبۂ کے طلبا اور طالبات نیز تدریسی و غیر تدریسی ملازمین بھی موجود تھے۔

....

● (۸/مارچ ۲۰۱۹ء) پروفیسر محمد یونس حکیم (سابق صدر، شعبۂ حیوانیات، سمستی پور کالج، سمستی پور) کو بہار ریاستی اقلیتی کمیشن کا چیئرمین مقرر کیا گیا ہے۔ پروفیسر یونس حکیم عوام و خواص میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ موصوف جہاں ایک کامیاب، مشفق اور ہر دل عزیز استاد رہے ہیں وہیں ایک فعال سماجی کارکن کی حیثیت سے سماج کے ہر طبقہ کے دکھ درد میں ہمہ وقت شامل رہتے ہیں۔ پروفیسر موصوف ۲۰۰۳ء میں ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ سے ڈین فیکلٹی آف سائنسز کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ آپ دو میعاد بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیئرمین بھی رہ چکے ہیں۔ بحیثیت چیئرمین آپ کی انتظامی صلاحیتوں اور کارکردگی کا اعتراف ہر خاص و عام کرتا ہے۔ مدارس کے اساتذہ اس دور کو سنہری دور سے تعبیر کرتے ہیں جب تین ہزار مدارس کو منظوری ملی تھی جس کا ثمرہ آج بھی مدارس کے طلباء کو مل رہا ہے۔ ان کی اس نئی ذمہ داری پر اراکین "تمثیل نو" اور الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، گنگوارہ دربھنگہ نے مبارک باد پیش کی ہے۔

....

● (۱۰/مارچ ۲۰۱۹ء) کولکاتا کے قدیم اور معروف ادبی ادارہ "بزمِ شاکری" (شمس الہدیٰ روڈ) کی جانب سے شام ۷ بجے بزمِ شاکری کے سابق سکریٹری اور جدید لب و لہجے کے شاعر صادق گیاوی مرحوم کی یاد میں ایک محفلِ مشاعرہ زیرِ صدارت معروف ادیب اور محقق جناب نورالہدیٰ (صدر، بزمِ احباب، کولکاتا) اور زیرِ نظامت جناب اشرف احمد جعفری (نائب معتمد بزمِ شاکری) منعقد ہوئی۔ بطور مہمان مقبول شاعر رنا شاداورنگ آبادی (پھلواری شریف، پٹنہ) اور پی ایچ ڈی کی ڈگری سے سرفراز جواں سال شاعر احمد معراج شریک ہوئے۔ مشاعرے کا آغاز حضرت شاکر کلکتوی کی غزل سے ہوا جسے حلیم صابر نے پیش کیا۔ شاکر کلکتوی کے شاگرد اور بزرگ شاعر و صحافی انجم عظیم آبادی نے صادق گیاوی کے حوالے سے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مصطفےٰ اکبر (معتمد بزم شاکری) اور حلیم صابر نے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنے پر ڈاکٹر احمد معراج کی نذر قطعات کئے نیز ان کی خدمت میں اراکینِ بزم کی جانب سے تحائف بھی پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا) نے مہمان شاعر رنا شاداورنگ آبادی کا تعارف پیش کیا اور ان کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں مشاعرے کا آغاز ہوا جس میں احمد معراج، شوخ لطفی، اعجاز بلیاوی، نور اشرفی، ابوالکلام نامی، ممتاز عارفی، آصف مظفر پوری، انظار البشر، یوسف اختر، عبدالوارث سفر، جمیل حیدر شاد، مصطفےٰ اکبر، ضمیر احمد مضمر، امام اعظم، حلیم صابر، انجم عظیم آبادی، سفیر الدین کمال اور رنا شاداورنگ آبادی نے اپنی شعری تخلیقات پیش کیں۔ دیگر حاضرین میں غیاث الدین احمد، پرویز طاہر، محمد فضاالدین، غلام شبیر، ایس ایم آرزو، محمود یٰسین، عبدالستار فکر، افضال انصاری وغیرہ شریک تھے۔ مصطفےٰ اکبر کے اظہارِ تشکر کے ساتھ مشاعرے کا اختتام ہوا۔

● (۱۱/مارچ ۲۰۱۹ء) ماہر تعلیم اور صحافی ڈاکٹر محمد گوہر (چیف ایڈیٹر، روزنامہ ''تاثیر'') کی کتاب ''صدائے گوہر'' کی رسم رونمائی ہوٹل فارچون پارک، پنچ وتی (کونا ایکسپریس وے، ہوڑہ، مغربی بنگال) میں معروف شاعر، ادیب اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا) کے ہاتھوں انجام پائی۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اجرا کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر محمد گوہر محتاج تعارف نہیں۔ وہ پٹنہ کے باشندہ ہیں اور ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ ہیں نیز سائنس ونکنالوجی میں مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ۲۰۱۲ء میں پٹنہ سے ایک اردو اخبار ''تاثیر'' کا اجرا کیا، جو اس وقت ملک کی تقریباً ۸/ریاستوں سے شائع ہو رہا ہے اور قارئین کے درمیان مقبول بھی ہے۔ ''صدائے گوہر'' ۳۰۴/صفحات پر مشتمل کتاب ہے جس میں مصنف نے روزنامہ ''تاثیر'' میں شائع اداریوں اور مضامین کو شامل کیا ہے، جو بے حد معلوماتی اور دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ صحافت سے وابستہ حضرات کے لئے یہ کتاب ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ ڈاکٹر گوہر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے بے حد مسرت ہے کہ اس کتاب کی رونمائی آج اس سرزمین پر ہو رہی ہے جہاں سے اردو صحافت کی داغ بیل پڑی تھی۔ کتاب میں شامل اداریے اور مضامین وقتی حالات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں لیکن جن موضوعات، مسائل اور نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کی اہمیت وضرورت ہر دور میں محسوس کی جاتی رہے گی۔ میں اردو کے بے لوث خادم اور مدیر اعزازی اردو جریدہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ ڈاکٹر امام اعظم کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی رونمائی کی۔ روزنامہ ''تاثیر'' بہت جلد ہوڑہ سے بھی شائع ہونے والا ہے۔ پٹنہ ایڈیشن روزانہ کولکاتا اور اطراف میں پہنچتا رہتا ہے اور اردو قارئین کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ اخبار کے سلسلے میں اکثر کولکاتا اور ہوڑہ کا سفر کرتا رہتا ہوں۔ اس بار ایک نجی ضرورت کے تحت آیا ہوں۔'' نوجوان شاعر ڈاکٹر احمد معراج نے صاحبِ کتاب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس کے محتویات پر روشنی ڈالی اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ دیگر حاضرین میں محمد نعیم (صحافی) اور مقبول احمد (فوٹوگرافر) کے علاوہ ڈاکٹر محمد گوہر کے دو معصوم بچے بھی موجود تھے۔

....

● (۱۱/مارچ ۲۰۱۹ء) جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرہ کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی کے مطابق یونیورسٹی کے مختلف کالجوں میں اردو کے مہمان اساتذہ کی تقرری کے لیے ۱۲/فروری ۲۰۱۹ء کو امیدواروں کا مصاحبہ منعقد ہوا تھا۔ یونیورسٹی نے میمو نمبر ۱۸۰۲، مورخہ ۸/مارچ ۲۰۱۹ء کے ذریعہ منتخب امیدواروں کی فہرست جاری کر دی ہے جس کے مطابق چھپرہ، سیوان اور گوپال گنج کے کالجوں کے لیے کل تیرہ امیدواروں کی تقرری ہوئی ہے جن میں پانچ خواتین بھی شامل ہیں۔ پروفیسر ہاشمی نے کہا کہ یونیورسٹی اور اس کے کانسٹی ٹیوئنٹ کالجوں میں فی الحال اردو کے صرف چھ اساتذہ برسرکار ہیں۔ برسوں سے کالجوں میں اردو کے اساتذہ کی کمی کی وجہ سے اردو تعلیم وتدریس پہ بہت ہی خراب اثر پڑ رہا تھا۔ مہمان اساتذہ کی تقرری سے اب اس ضمن میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ منتخب امیدواروں کو مبارکباد دیتے ہوئے انھوں نے جے پرکاش یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ہری کیش سنگھ کے تئیں بھی شکریہ کا اظہار کیا۔ ان کی اردو دوستی اور اردو نوازی کو دیگر اصحاب اقتدار کے لیے قابل تقلید بتایا۔ اردو کے مہمان اساتذہ کی تقرری کے عمل کو مکمل کرنے والی بہار کی یونیورسٹیوں میں جے پرکاش یونیورسٹی کو اولیت بھی حاصل

ہوگئی۔اس لحاظ سے یہ پوری سارن کمشنری کی اردو آبادی کے لیے خوش آئند خبر ہے۔وائس چانسلر پروفیسر ہری کیش سنگھ نے کہا کہ یونیورسٹی اوراس سے ملحق کالجوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کو بہتر اور معیاری بنانے کے لیے وہ ہر ممکن تعاون کے لیے تیار ہیں۔انھوں نے امید ظاہر کی کہ ان ساتذہ کی تقرری سے سارن کے تینوں اضلاع میں اردو زبان وادب کی تدریس کے ضمن میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی نے مزید اطلاع دی ہے کہ یونیورسٹی کے اعلانیہ کے مطابق ان منتخب امیدواروں کو تین ہفتوں کے اندر اپنے نام سے وابستہ کالجوں میں تقرری کا عمل مکمل کر لینا ہے۔شعبۂ اردو کے اساتذہ پروفیسر نبی احمد، ڈاکٹر عبدالمالک اور ڈاکٹر مظہر کبریا نے بھی ان منتخب مہمان اساتذہ کیلئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔منتخب امیدواروں اور کالجوں کے نام اس طرح ہیں: ضیاء اللہ (راجندر کالج، چھپرہ)، سید ابوذر علی (جگدم کالج، چھپرہ)، عبدالرحمٰن (جے پرکاش مہیلا کالج، چھپرہ)، شگفتہ یاسمین (گنگا سنگھ کالج، چھپرہ)، یاسمین خاتون (جگ لال چودھری کالج، چھپرہ)، افشاں بانو (پربھوناتھ کالج، پرسا)، ارشد جمیل (یدونندن کالج، دیگھوارہ)، محمد فیروز عالم (ڈی اے وی کالج، سیوان)، شمس العارفین (راجہ سنگھ کالج، سیوان)، محمد کوثر علی (آر بی جی آر کالج، مہاراج گنج)، نسرین آرا (کملا رائے کالج، گوپال گنج)، عبدالباری (نارائن کالج، گوریا کوٹھی)، الفیہ نوری (گوپیشور کالج، ہتھوا)

● (۱۶رمارچ ۲۰۱۹ء) پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ کے ہاتھوں آج پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب ''اردو ادب میں جوتے'' کی رونمائی ہوئی۔دیگر حاضرین میں ڈاکٹر وصی احمد شمشاد، ڈاکٹر افتخار احمد، ڈاکٹر امتیاز احمد، سید محمود احمد کریمی (ایڈوکیٹ)، ڈاکٹر عالمگیر شبنم، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر آفتاب اشرف، حیدر وارثی، صفی الرحمٰن راعی (ایڈوکیٹ) اور ڈاکٹر حافظ نسیم اختر موجود تھے۔ان حضرات نے کتاب کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے ایک منفرد اور اچھوتے موضوع پر کام کیا ہے جو لائقِ تحسین ہے۔موصوف کی اب تک ۲۳۵ رکتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان کے فن کے حوالے سے بھی درجنوں کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔امید ہے کہ اردو ادب کے قارئین اس کتاب کو پسند کریں گے۔

● (۱۸رمارچ ۲۰۱۹ء) المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام الحراء پبلک اسکول رحم خاں، دربھنگہ میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے اعزاز میں تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف ادیب وشاعر خلیق الزماں نصرت نے کی۔نظامت کے فرائض ایم ایل ایس ایم کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف نے بحسن و خوبی انجام دیے۔مہمانانِ خصوصی کے طور پر ایل این ایم یو کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ تھے۔پروگرام کی سرپرستی ڈاکٹر حافظ عبدالمنان طرزی نے کی۔ڈاکٹر آفتاب اشرف نے پروفیسر ہرگانوی کی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی گفتگو کا انداز بڑا ہی دلچسپ ہوتا ہے۔پہلی ملاقات میں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان سے بڑی پرانی جان پہچان ہو۔بڑے پُرخلوص انداز میں مسکراتے ہوئے ملتے ہیں، اس وجہ سے ان سے بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔بڑوں کے ساتھ ساتھ چھوٹوں سے بھی وہ بڑے شفقت بھرے انداز میں ملتے ہیں اور انہیں آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔اس موقع پر مناظر عاشق ہرگانوی کی تین کتابیں ''۱۰۱ر

خواتین تنقید نگار"، "لندن یاترا–عہد کا البم" اور "بھٹکی ہوئی لڑکی" کا اجرا عمل میں آیا۔ اجرا کے بعد پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے کہا کہ بچوں کے ادب پر تخلیق کی وجہ سے مجھے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بی بی سی لندن سے ۲۹ رمنٹ کا لائیو انٹرویو لیا گیا۔ میٹرو چینل کراچی سے بھی پونے دو گھنٹے کا لائیو انٹرویو لیا گیا جسے ایشیا بھر میں دیکھا اور سنا گیا۔ ای ٹی وی اردو نے گھر جاکر چار گھنٹے کی شوٹنگ کی۔ اڑیا ٹی وی نے میرے گھر پر آ کر دو گھنٹے کا انٹرویو لیا۔ میں نے اردو تنقید کے حوالے سے ۱۱۵ رکتابیں قارئین ادب کو دی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اصناف پر میں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ خلیق الزماں نصرت نے اردو ادب کے حوالے سے کئی اہم باتیں پیش کیں۔ ڈاکٹر جمال اویسی (صدر، شعبہ اردو ایم آر ایم کالج، دربھنگہ) نے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی سے تنقید سے متعلق کئی اہم سوالات کئے جس کا جواب انہوں نے دیا۔ ڈاکٹر احسان عالم نے کہا کہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ایک ایسا بلند و بالا نام ہے جنھیں ہر کوئی جانتا ہے۔ اس ادیب نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جس کی وجہ سے ان کا نام لمبے عرصہ تک اردو ادب میں یاد کیا جائے گا۔ ۲۳۵ رکتابوں کے مصنف اور مرتب ہیں جس کا سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ انور آفاقی نے خلیق الزماں نصرت کے حوالے سے گفتگو کی۔ منصور خوشتر نے کہا کہ مناظر عاشق ہرگانوی علم کا ذخیرہ ہیں۔ علم و ادب اور فکر و فن کی کتنی زرخیزی ان کے اندر ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کی بیشتر اصناف میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور ہر موضوع پر کتابیں دینے کی کوشش کی ہے۔ صفی الرحمٰن راعی نے جاپان اور لندن کے حوالے سے اپنی گفتگو کو آگے بڑھایا۔ حیدر وارثی نے کہا کہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی سے میرے تعلقات بہت پرانے اور گہرے ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم نے انہیں ہمہ جہت فنکار بتایا۔ پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی نے مناظر عاشق ہرگانوی کے لئے چند دعائیہ کلمات کہے نیز ان کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ عمر فاروق کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام ہوا۔

● (۱۸ رمارچ ۲۰۱۹ء) جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں رفتار ادبی فورم کے تحت "محفل افسانہ خوانی" کا انعقاد کیا گیا جس میں تازہ کار نسل کے چھ نوجوانوں نے اپنے افسانے پیش کیے اور معاصر تخلیق و تنقید کے ممتاز ادیبوں نے معاصر افسانوں پر تبادلہ خیال کیا۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر انور پاشا نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے انجام دیے۔ اس "محفل افسانہ خوانی" میں سورج کمار 'داوری'، عمران عاکف خان 'نیا دور'، سلمان عبدالصمد 'نیا بجوکا'، ڈاکٹر ذاکر فیضی 'ٹی او ڈی' (جے این یو)۔ محمد عرفان 'گدھوں کے دیس میں' (دلی یونیورسٹی) اور صالحہ صدیقی 'رخصتی' (جامعہ ملیہ اسلامیہ) وغیرہ نے اپنے افسانے پیش کیے۔ پروگرام میں خصوصی طور پر ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر شیو پرکاش، ڈاکٹر ملکھان سنگھ، ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی، پرینکا سنگھ، محمد غفران، حفیظ الرحمٰن، فیضان الحق، عبدالعلیم، محمد اجمل، ابوبکر ایوب اور محمد فرقان عالم کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جے این یو کے متعدد اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے سفیر اردو پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ نئی نسل میں تخلیق و تنقید پر سنجیدگی سے غور کرنے والے نوجوان موجود ہیں، لیکن اس نسل کی تربیت ضروری ہے

تا کہ وہ قدیم اور معاصر فکشن کے ماہرین کی روایت کو بحسن وخوبی آگے بڑھا سکیں۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ نئی نسل کی آبیاری کے لیے مستند تخلیق کاروں اور ناقدوں کو سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نئی نسل تیار نہیں کرتے تو صحیح معنوں میں ہم ہی قصوروار ہیں۔ انھوں نے رتن سنگھ کے تخلیقی انہماک کا ذکر کیا اور انھیں کرناٹک حکومت کی طرف سے حالیہ دنوں ملنے والے ''کوئمپو ایوارڈ'' پر مبارکباد بھی پیش کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ سیمناروں میں ہمارے اسکالروں کو تنقید لکھنے کی کسی حد تک رہنمائی مل جاتی ہے، مگر ان کی تخلیقی تربیت نہیں ہو پاتی، اس لیے ''رفتار ادبی فورم'' نے ایک ایسا سلسلہ شروع کیا ہے جس سے ان کی تخلیقی تربیت بھی بہ آسانی ہوتی رہے گی۔ مہمان اعزازی ممتاز ادیب پروفیسر غضنفر نے کہا کہ ہمارے نوجوان اپنے افسانوں میں زندگی کے تئیں سنجیدہ ہیں۔ یہ نئی نسل گہرائی سے انسانی درد کو محسوس کر رہی ہے اور اس درد کو دور کرنے کی کوشش میں مصروف بھی ہے۔ البتہ بنت کے اسرار و رموز سے انھیں واقف ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے پروگرام میں پیش کیے گئے افسانوں پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے فنی باریکیوں کو بھی اجاگر کیا۔ مہمان خصوصی ممتاز فکشن نگار رتن سنگھ نے اپنے زمانے کے لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ ایک سے ایک بہترین قصے سنائے جن سے تقریباً گزشتہ پون صدی کا افسانوی منظر نامہ ہمارے سامنے آگیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو افسانہ مشکل دور سے گزر رہا ہے۔ کہانی لکھنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے نئی نسل کو افسانہ لکھنے کی رفتار بڑھانی چاہیے، تا کہ مشق کے دوران اچھے افسانے بھی سامنے آئیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ پروفیسر محمد حسن مجھ سے ہمیشہ پوچھتے تھے کہ کیا لکھا۔ اگر میں جواب دیتا کہ کچھ نہیں تو وہ کہتے تھے کہ پڑھنا شروع کر دیں۔ کیوں کہ پڑھنا خوراک ہے۔ پڑھنے کے بعد لکھنے کے لیے خود راہ ہموار ہوتی جاتی ہے۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ادب کو وقت کی آواز بنانے کے لیے فن کاری ضروری ہے۔ ڈاکٹر حافظ محمد عمران کے کلمات تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام ہوا۔

● (۱۸/مارچ ۲۰۱۹ء) حافظ نسیم اختر (موضع اسگاؤں، دربھنگہ) نے ڈاکٹر امتیاز احمد (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مہاتما گاندھی کالج، دربھنگہ) کے زیرِ نگرانی اپنا تحقیقی مقالہ ''مفتی محمد ظفیر الدین: شخصیت اور خدمات'' ایل این متھلا یونیورسٹی میں ۲۰۱۷ء میں جمع کیا تھا جس کے بیرونی ممتحنین ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (سابق پروفیسر، بی جی شعبۂ اردو، تلکا مانجھی یونیورسٹی، بھاگلپور، بہار) اور ڈاکٹر احمد سجاد (سابق صدر، شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، جھارکھنڈ) تھے۔ گزشتہ ۱۶/مارچ ۲۰۱۹ء کو شعبۂ اردو، ایل این ایم یو میں صدر، شعبۂ اردو ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ کی چیئر مین شپ میں وائیوا ہوا۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (بیرونی ممتحن) نے وائیوا لیا۔ ان کے علاوہ ڈین، فیکلٹی آف ہیومنٹیز ڈاکٹر منوج کمار جھا (پی جی شعبۂ فلسفہ) و دیگر نے موضوع سے متعلق سوالات کیے جن کا تشفی بخش جواب حافظ نسیم اختر نے دیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر آفتاب اشرف، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر افتخار احمد، سیّد محمود احمد کریمی، صفی الرحمٰن راعین، حیدر وارثی، ڈاکٹر عالمگیر شبنم، ڈاکٹر وصی احمد شمشاد، ڈاکٹر مولانا عبدالحیٔ قاسمی، فضا امام وغیرہ کے علاوہ شعبہ کے طلبا اور طالبات نیز تدریسی و غیر تدریسی ملازمین بھی موجود تھے۔

● (۲۰؍مارچ ۲۰۱۹ء) زبانیں مکالمے کے لیے ہوتی ہیں مجادلے کے لیے نہیں۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ مذہب کو زبانوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے اردو کو اسلام یا کسی بھی مذہب سے نہیں جوڑا جائے۔ اردو کے قاری آج مدارس کی بدولت موجود ہیں اور اردو اگر رابطے کی زبان ہے تو وہ ممبئی کی فلم اور تفریحی صنعت کی دین ہے۔ یہ باتیں مولانا آزاد اردو یونیورسٹی جودھپور کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے قومی اردو کونسل کی چھٹی عالمی اردو کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں کہیں۔ انھوں نے عالمی اردو کانفرنس کو ایک بے حد کامیاب کانفرنس بتایا اور کہا کہ یہاں موجود ہر شخص شیخ عقیل کا قتیل بن کر جارہا ہے۔ اس کانفرنس میں اردو کے حقیقی مسائل اور ان کے حل پر گفتگو کی گئی۔ انھوں نے تین روزہ عالمی اردو کانفرنس کی قرارداد بھی پیش کی۔ اس سے قبل چھٹی عالمی اردو کانفرنس کے تیسرے دن کا پہلا اجلاس 'ذرائع ابلاغ اور اردو' کے موضوع پر منعقد ہوا جس کی صدارت اے جے کے ماس کمیونی کیشن، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر افتخار احمد نے کی۔ اس سیشن میں مرزا عبدالباقی بیگ، صابر گوڈر، پروفیسر مرنال چٹرجی، عبدالسمیع بوہیرے اور پروفیسر غیاث الرحمٰن سید نے مقالے پڑھے۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر افتخار احمد نے مقالوں پر اظہار خیال کیا اور ذرائع ابلاغ میں اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر مرنال چٹرجی نے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو مذہبی زبان ہرگز نہیں ہے۔ اس سیشن کی نظامت روزنامہ 'انقلاب' کے بیورو چیف ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے کی۔ کانفرنس کا ساتواں اجلاس 'آئین اور دوسرے قوانین میں اردو کا مقام' کے موضوع پر ہوا جس کی صدارت جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے کی۔ اس میں پروفیسر شبیر احمد، ڈاکٹر محسن بھٹ، پروفیسر نزہت پروین، جناب خواجہ عبدالمنتقم نے مقالے پڑھے۔ صدارتی خطاب کرتے ہوئے جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے کہا کہ زبانوں کا کوئی ملک نہیں ہوتا۔ سرکار کی ذمے داری ہے کہ وہ شہریوں کو بنیادی حقوق فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوستان کے آئین میں اردو زبان کو اختیار کرنے کا بنیادی حق دیا گیا ہے۔ انھوں نے آرٹیکل 29 اور 30 کا حوالہ دیتے ہوئے مادری زبان اور بنیادی تعلیم کے متعلق تفصیلی گفتگو کی اور بتایا کہ آئین ہماری زبان میں بنیادی تعلیم حاصل کرنے کا حق دیتا ہے۔ اس سیشن کی نظامت کے فرائض معروف صحافی جناب تحسین منور نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ اختتامی جلسے کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ اس سیشن میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے عالمی اردو کانفرنس کے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں بے حد تحقیقی مقالے پڑھے گئے اور ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے تقریباً ۶۰؍ ریسرچ اسکالر نے بھی شرکت کی۔ ہم ان سبھی مقالوں کو کانفرنس کے مقالوں پر مبنی کتاب میں شامل کریں گے۔ انھوں نے سبھی حاضرین اور قومی اردو کونسل کے تمام اسٹاف کا بھی شکریہ ادا کیا۔ سہ روزہ کانفرنس میں دہلی کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ، طلبا کے ساتھ ساتھ اردو شیدائیوں کی بڑی تعداد موجود رہی۔

....

● (۲۱؍مارچ ۲۰۱۹ء) بزم احباب کا ماہانہ جلسہ معروف شاعرہ محترمہ کوثر پروین کوثر کی میزبانی میں ان کی رہائش گاہ ۲-بی، بکمبر اسٹریٹ (جان نگر روڈ) کولکاتا میں منعقد ہوا۔ جلسے کے آغاز میں معتمد بزم ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے

گزشتہ جلسے کی رپورٹ پیش کی جسے تمام اراکین بزم نے پسند کیا اور صدر بزم معروف ادیب جناب نورالہدیٰ نے اس کی توثیق کی۔ حسب روایت میزبانِ جلسہ کوثر صاحبہ نے اپنے کلام سے جلسے کا باضابطہ آغاز کیا۔ چونکہ ۲۱ر مارچ (۱۴ر رجب) حضرت علیؓ کی یوم ولادت تھی اس لئے اسی مناسبت سے کوثر صاحبہ نے سلام پیش کیا۔ نثری دور کا آغاز جناب انجم عظیم آبادی کی تقریر سے ہوا۔ راقم لکھنوی بزم کے دیرینہ ممبر تھے۔ گزشتہ ماہ ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ انجم صاحب نے راقم صاحب کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے بھرپور گفتگو کی اور انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ محمد نجیب پاشا نے ایک مختصر افسانہ 'کیرکٹر سرٹیفکیٹ' سنایا۔ جاوید ہمایوں نے آدھی غزلیں اور احمد کمال حشمی کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا۔ بعدازاں شعری دور کا آغاز ہوا۔ انجم عظیم آبادی، حلیم صابر، نیر اعظمی، ممتاز عارفی، جہانگیر کاظمی، جاوید ہمایوں، احمد کمال حشمی، ڈاکٹر امام اعظم، اشرف یعقوبی، خورشید ملک، مشتاق دربھنگوی، کوثر پروین کوثر، مبارک علی مبارکی، رونق افروز، جاوید مجیدی، مشتاق ہاشمی، محمد امتیاز قیصر، شکیل گونڈوی، شرر راسخ، آفتاب عالم، شاہدہ بشریٰ سحر، شبیر ذوالمنان، ڈاکٹر احمد معراج، سحر مجیدی، فرزانہ پروین، انتظار البشر بارکپوری، تاج محمد تاج اور اقبال عاقل سمیت ۳۰ر شعراء نے اپنے معیاری کلام سے جلسے کے وقار کو سند بخشی۔ اخیر میں صدر بزم جناب نورالہدیٰ نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا کہ اب احباب کثیر تعداد میں شریک ہو رہے ہیں اور اپنی دلچسپی بھی دکھا رہے ہیں۔ اس جلسے میں پروفیسر ابوبکر جیلانی، جمیل منظر، جمال الدین احمد صدیقی، کامل حمیدی، صالح احمد، سفیر الدین کمال، شاہد جمال، اشرف احمد جعفری، ڈاکٹر شاہد ساز، منظر احسن، مشتاق مشفق، شہواز بلال وغیرہ بھی موجود تھے۔

● (۲۷ر مارچ ۲۰۱۹ء) معروف ماہرِ تعلیم اور ریاضیات پروفیسر ایوب خاں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ موصوف اس سے قبل شعبۂ ریاضیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر تھے جبکہ دہلی یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں۔ آپ کا تدریسی کیریئر ۳۴ر برسوں پر محیط ہے۔ دہلی یونیورسٹی سے ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کرنے کے بعد آپ مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے، جس میں ذاکر حسین دہلی کالج کے چیف پروکٹر کا عہدہ بھی شامل ہے۔ آپ کی نگرانی میں ۱۵ر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ملک و بیرونِ ملک کے مقتدر و معتبر رسائل و جرائد میں ان کے کم و بیش ۱۲۶ر مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ درجنوں قومی و بین الاقوامی مذاکروں، سیمیناروں اور اجلاس میں آپ کی شرکت ہو چکی ہے جبکہ ۲۰۰۷ء میں آپ کی کتاب ''کیلکولس اینڈ جیومیٹر فار فزیکل اور اپلائیڈ فزیکل سائنس'' شائع ہو چکی ہے۔

● (۳۰ر مارچ ۲۰۱۹ء) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے شعبۂ اردو گورنمنٹ گرلس جنرل ڈگری کالج میں بعنوان 'اردو فکشن: آغاز و ارتقا' پر یک روزہ عالمی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا آغاز کالج کی طالبہ عفیفہ کے ذریعہ قرآن مجید کی تلاوت سے ہوا۔ سیمینار کی افتتاحی تقریب کی صدارت ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائرکٹر مانو، کولکاتا) نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر نوشاد عالم نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب ارمان شمسی (بنگلہ دیش) اور مہمانانِ اعزازی کے طور پر جناب نظام الدین شمس (کونسلر وارڈ 78)

اور جناب نشاط عالم (ڈپٹی انسپکٹر آف کالجز، کلکتہ یونیورسٹی) نے شرکت کی۔ اس موقع پر کالج کی آفیسر انچارج ڈاکٹر سیّدہ شارقتہ المولیٰ القادری، سمینار کنوینر ڈاکٹر شبنم پروین (صدر شعبۂ اردو، کالج ہٰذا) اور ڈاکٹر دیبو پرساد بنرجی (صدر شعبۂ انگریزی، کالج ہٰذا) اول تا آخر موجود رہے۔ ڈاکٹر شبنم پروین نے خیر مقدمی کلمات کے ساتھ تمام مہمانان اور مقالہ نگاروں کی گلپوشی کی، انہیں اتری، میمنٹو اور فائل وغیرہ پیش کیے۔ بعد ازاں تمام مہمانان نے موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ افتتاحی تقریب کے بعد سمینار کے پہلے سیشن کا باضابطہ آغاز ڈاکٹر محمد کاظم (دہلی یونیورسٹی) کی صدارت اور ڈاکٹر نوشاد عالم کی نظامت میں ہوا۔ مقالہ نگاروں میں محترمہ زاہدہ پروین (ریسرچ اسکالر بردوان یونیورسٹی) نے "اردو افسانہ: رومانیت سے حقیقت تک" محترمہ نکہت پروین (ریسرچ اسکالر بردوان یونیورسٹی) نے "اردو کے منتخب ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی"، جناب ایاز احمد روہوی نے "فسانۂ عجائب کی ادبی اہمیت: ایک جائزہ"، ڈاکٹر عمر غزالی نے "بنگال کی اولین افسانہ نگار: راحت آرا بیگم" اور ڈاکٹر سید اقبال شاہ القادری نے "اردو افسانہ ہمارے سماج کا آئینہ دار" کے موضوعات پر اپنے اپنے مقالے پیش کئے اور ثابت کیا کہ اردو فکشن ہنوز ترقی کے مراحل طے کر رہی ہے اور اس وقت اردو فکشن میں حقیقت نگاری سماجی مسائل سے مربوط نظر آتی ہے۔ صدر سیشن ڈاکٹر محمد کاظم نے تمام موضوعات کے حوالے سے تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مقالہ نگاروں کی فکری بصیرت کی تعریف کی اور فرمایا کہ قصہ گوئی یا داستان سے لے کر افسانے تک کا سفر یقینی طور پر اردو فکشن کے آغاز و ارتقا کا بین ثبوت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اردو فکشن کا ارتقا دراصل خیالی قصوں سے حقیقی کہانیوں کی طرح پرواز ہے۔ پہلے سیشن کے اختتام کے بعد ظہرانے سے مہمانان اور حاضرین کی ضیافت کی گئی۔ اس وقفے کے بعد دوسرے سیشن کی شروعات جناب ارمان شمسی (بنگلہ دیش) کی صدارت میں ہوا۔ اس سیشن کے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر شاہین سلطانہ (صدر شعبۂ اردو، عالیہ یونیورسٹی) نے "کشمیر کے تناظر میں ترنم ریاض کے افسانے"، ڈاکٹر دبیر احمد (صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج) نے "گئودان اور پریم چند"، ڈاکٹر محمد کاظم (دہلی یونیورسٹی) نے "انیسویں صدی کی پیش کردہ داستانیں"، ڈاکٹر شاہینہ تبسم (ذاکر حسین کالج، دہلی) نے "اردو افسانے میں رومانیت" محترمہ انا پنا انصاری (صحافی، ایران) نے "مشرقی ہند کے افسانے اور پریم چند"، ڈاکٹر امام اعظم نے "اکیسویں صدی میں اردو افسانے کی پیش رفت میں اضافہ: دخمہ" پیش کئے۔ ایک مقالہ پردیپ شرما خسرو نے "قصہ حاتم طائی اور امیر خسروؔ" کے عنوان سے ویڈیو، آڈیو کے سہارے پیش کیا۔ اس سمینار کی خوبی یہ رہی کہ شروع سے اخیر تک اہل علم و ادب کے علاوہ طالبات کی ایک بڑی تعداد موجود رہی۔ اس سمینار کے حاضرین میں جناب سیّد محمد شبر، جناب شکیل احمد نظامی، ڈاکٹر مظہر قادری (اے آر ڈی، آر سی مانو کولکاتا)، ڈاکٹر افتخار احمد (صدر شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج)، ڈاکٹر نور نبی انصاری، اشرف احمد جعفری، ڈاکٹر احمد معراج، محمد سلیم (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی)، محترمہ نسرین حسین، آفتاب عالم (ریسرچ اسکالر)، جلال احمد انصاری (ریسرچ اسکالر)، شاہین پروین، شبینہ فردوس، رعنا غزل وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اخیر میں ڈاکٹر شبنم پروین کے اظہار تشکر سے سمینار کا اختتام ہوا۔

● (۲؍اپریل ۲۰۱۹ء) کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر زرینہ خاتون (زرینہ زرّیں) کو یکم اپریل کو ۲۰۱۹ء شعبہ کا نیا سربراہ مقرر کیا گیا ہے۔انھوں نے باضابطہ اپنے عہدہ کا چارج اپنے پیش رو ڈاکٹر ندیم احمد سے لیا جو گزشتہ دو میقاتوں (تقریباً چار سال) سے شعبۂ اردو کے سربراہ تھے۔شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی اپنے قیام سے اب تک اردو میں اعلیٰ تعلیم اور معیاری ریسرچ کے لئے معروف ہے۔ملک کے طول وعرض بطور خاص مغربی بنگال میں اردو کی زمام کاریہاں کے تربیت یافتہ فارغین کے ہاتھوں میں ہے، جو اردو زبان، تعلیم اور کلچر کے فروغ میں منہمک ہیں۔ڈاکٹر زرینہ زرّیں کو نیا صدر شعبہ مقرر کئے جانے کا تعلیم و تعلم سے وابستہ افراد نے خیر مقدم کیا ہے اور انہیں مبارکباد دیتے ہوئے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ ان کی سربراہی میں شعبہ تشنگان علم وادب کی سیرابی کا سبب ہوگا۔

● (۴؍اپریل ۲۰۱۹ء) علی نگر بلاک حلقہ (ضلع دربھنگہ) کے لیل پور گاؤں باشندہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں عربی کے معاون پروفیسر ڈاکٹر محمد قطب الدین کو متعلقہ موضوع میں ریسرچ اور بہتر تحریر کیلئے سال ۱۸-۲۰۱۶ء کا صدر جمہوریہ ایوارڈ نائب صدر جمہوریہ ایم ونکیا نائیڈو کے ہاتھوں دیا گیا۔اعزاز حاصل کرنے کے لئے موصوف کے ساتھ ان کی اہلیہ اور بیٹیاں، جے این یو کے وائس چانسلر پروفیسر ایم جگدیش کمار، سینئر صحافی اور بھائی محمد وجیہ الدین (ٹائمز آف انڈیا، ممبئی)، بھائی قمر عالم نیر، احمد سمیع اور شہنواز احمد موجود تھے۔واضح ہو کہ ڈاکٹر محمد قطب الدین کی پیدائش ۲۹؍دسمبر ۱۹۷۷ء کو ایک تعلیم یافتہ خاندان میں ہوئی۔ان کے والد بدرالدین احمد ہائی اسکول میں انگریزی کے استاد تھے، والدہ سائرہ خاتون گھریلو خاتون تھیں۔۱۹۹۶ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ سے 'عالم' کورس مکمل کرنے کے بعد وہ دہلی چلے گئے جہاں جے این یو سے ۲۰۰۴ء میں ایم فل اور ۲۰۰۸ء میں عربی زبان میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال سے وہیں متعلقہ مضمون میں معاون استاد کی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔

● (۱۲؍اپریل ۲۰۱۹ء) معروف ماہر تعلیم پروفیسر (ڈاکٹر) نجمہ اختر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔انھوں نے اپنے عہدے کا چارج سنبھالا۔محترمہ جامعہ کی سولہویں شیخ الجامعہ ہیں جبکہ پہلی خاتون شیخ الجامعہ ہیں۔آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی میں طلائی تمغہ یافتہ ہیں جب کہ کروکشیتر یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر ۲۵ ؍سال خدمات انجام دے چکی ہیں جب کہ گزشتہ ۱۵؍برسوں سے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن (NIEPA) کی سربراہ بھی تھیں۔انھیں پانچ برسوں کے لئے جامعہ کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ اور اراکین اردو جریدہ "تمثیل نو" گنگوارہ (دربھنگہ) کی جانب سے انھیں مبارکباد پیش کی گئی ہے۔

● (۱۵؍اپریل ۲۰۱۹ء) ڈاکٹر شائستہ بیدار نے آج عظیم آباد (پٹنہ) کے تاریخ ساز کتب خانہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائریکٹر کے عہدے کا چارج لیا۔محترمہ اس سے قبل مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں

اسسٹنٹ لائبریرین کی ذمہ داریاں ادا کررہی تھیں۔انکے والد ڈاکٹر عابد رضا بیدار طویل عرصہ تک خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں اوران کادور لائبریری کی ترویج وترقی اور انتظامی امور کے حوالے سے سنہری دور تسلیم کیا جاتا ہے۔واضح ہو کہ لائبریری کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد کی سبکدوشی کے بعد تین برسوں سے یہ عہدہ خالی پڑا تھا اور پٹنہ ڈویژن کے کمشنر اس عہدے کی اضافی ذمہ داریاں نبھارہے تھے۔الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ اور اراکین اردو جریدہ ''تمثیل نو'' گنگوارہ (دربھنگہ) کی جانب سے انھیں مبارک باد پیش کی گئی ہے۔

....

● (۲۹؍اپریل ۲۰۱۹ء) ''قومی اردو کونسل پوری دنیا کا سب سے بڑا اردو ادارہ ہے جو اردو کی ترویج واشاعت کے لیے وقف ہے۔حکومت ہند کی نوڈل ایجنسی کے طور پر کام کررہے اس ادارے کا مرکز ومحور یوں تو ہندوستان ہے لیکن ہم کونسل کے دائرہ کار کو پوری دنیا تک پھیلانا چاہتے ہیں۔قومی اردو کونسل عالمی سطح پر اردو کا فروغ چاہتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جہاں جہاں اردو جاننے والے موجود ہوں وہاں کونسل کی سرگرمیاں اور پروگراموں کا انعقاد ہو۔ مشاعروں نے اردو زبان وادب کی ترقی میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔آج ہم نے ابوظہبی عالمی کتاب میلے میں بھی ایک اچھوتے موضوع پر ایک محفل شعر سخن کا انعقاد کیا ہے جس میں مہجری شعرا نے اپنے عمدہ کلام سے نوازا اور داد و تحسین وصول کی۔'' یہ الفاظ تھے قومی اردو کونسل کے ہردل عزیز اور فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے جو۲۴-۳۰؍ اپریل ۲۰۱۹ء کو ابوظہبی میں منعقدہ عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کی نمائندگی کررہے تھے۔ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کا تعارف بھی پیش کیا ساتھ ہی مختلف اسکیموں اور پروگراموں کی تفصیلات بھی بتائیں۔انھوں نے مزید کہا کہ اردو ہماری اور آپ سب کی زبان ہے۔ہم سب کو انفرادی طور پر بھی فروغ اردو کے لیے کوششیں کرنی ہوں گی۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت بھی اردو کی ترقی کے لیے پابند عہد ہے اور ہمیں ہر ممکن تعاون دیتی رہی ہے۔۲۶؍اپریل ۲۰۱۹ء کو منعقد کی گئی محفل شعر وسخن کی صدارت متحدہ عرب امارات کے مشہور شاعر جناب زبیر فاروق نے کی جب کہ نظامت کے فرائض شاداب الفت نے انجام دیے جب کہ جناب اعجاز شاہین، سرور نیپالی، جاوید صدیقی، احیا بھوجپوری، سروش آصف، ناصر نعیم، شہباز شمسی، نیہا شرما، مادھو نور، ترنم احمد وغیرہ نے اپنے اپنے کلام پیش کیے۔

۲۷؍اپریل کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے اشتراک سے ''شام افسانہ'' کا انعقاد کیا گیا۔ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے تمام افسانہ نگاروں اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔تقریب کی صدارت ڈاکٹر سلیم خان نے کی جب کہ نظامت جناب سید سروش آصف نے کی۔جن افسانہ نگاروں نے شام افسانہ میں شرکت کی ان میں ڈاکٹر سلیم خان، جناب شاداب الفت، جناب ملند ونود، جناب ڈاکٹر اصغر کمال، محترمہ نیہا شرما، تنن اُپادھیائے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس پروگرام میں ڈاکٹر سلیم خان کے افسانوی مجموعہ'' چوسر کا محور'' کا اجرا بھی عمل میں آیا جو قومی اردو کونسل کی مالی امداد سے شائع ہوا ہے۔پروگرام کے آخر میں صدر محفل ڈاکٹر سلیم خان نے اپنے صدارتی خطاب میں پڑھے گئے تمام افسانوں کا جائزہ پیش کیا۔شام افسانہ میں اردو کے تقریباً ایک سو ادیب موجود تھے۔آخر میں کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اور نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر

شمس اقبال نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ ۲۸ر اپریل کو منعقدہ سمپوزیم ''ہندی، اردو اور پنجابی: ساجھی وراثت'' میں متحدہ عرب امارات میں ہندوستان کے سفیر جناب نودیپ سنگھ سوری نے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''ہندوستان میں بہت ساری زبانیں اور تہذیبیں ہیں مگر الگ الگ زبانوں اور تہذیبوں کے باوجود یہ سب ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی ہیں۔ ان میں جو چیز مشترک ہے وہ ہندوستانی روح اور مشترکہ طرز احساس ہے۔ زبان چاہے اردو ہو، ہندی ہو یا پنجابی یا دیگر علاقائی زبانیں، تہذیب آریائی ہو یا دراوڑی سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور یہی ساجھی وراثت ہے۔ جس پر ہمیں ناز بھی ہے، فخر بھی ہے اور مسرت بھی۔ زبانیں جوڑنے کا کام کرتی ہیں۔ آج کا یہ مباحثہ ایک اچھا پلیٹ فارم ہے جہاں تین زبانوں کے ادیب ایک ساتھ بیٹھے ہیں اور زبانوں کے آپسی رشتوں اور ساجھی وراثت پر گفتگو کر رہے ہیں۔'' سمپوزیم کی صدارت کرتے ہوئے پنجابی کے مشہور ادیب پدم شری سردار سرجیت پاتر نے پنجابی کے کئی اشعار سنائے جن میں فارسی، عربی اور اردو کے کئی الفاظ تھے۔ ڈاکٹر لکھوندر جوہل نے شاہ مکھی اور گرمکھی رسم الخط پر اظہار خیال کیا اور کہا کہ شاہ مکھی اردو کی طرز پر دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے۔ سمپوزیم کی نظامت ڈاکٹر للت کشور منڈورا نے کی۔ سمپوزیم کے دیگر شرکا میں ڈاکٹر للت بہاری گوسوامی، نوجوت کور اور شری دھر پراکڑ کے نام قابل ذکر ہیں۔ سمپوزیم میں این بی ٹی کے چیئرمین پروفیسر گووند پرساد شرما، ڈائرکٹر ڈاکٹر ریتا چودھری، ڈاکٹر سرجیت جج، دیپک کمار شرما، ڈاکٹر سربجیت کور سوہل کے ساتھ ساتھ ابوظہبی کے درجنوں ادبا و شعرا موجود تھے۔

....

● (۷رمئی ۲۰۱۹ء) ۵رمئی ۲۰۱۹ء کو معروف سماجی اور ملّی شخصیت جناب بلال حسن (صدر، بزمِ شہر نشاط، کولکاتا اور سرپرست اردو جریدہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ) جو شہر کولکاتا و مضافات کے ۳۲ر اداروں سے وابستہ ہیں نیز اپنے ادارہ ''بزمِ شہر نشاط'' کے تحت ۶۸ر پروگرام کر چکے ہیں، نے اپنی رہائش گاہ زکریا اسٹریٹ میں معروف ادیب، شاعر اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا ریجنل سینٹر) کی تازہ ترین مرتبہ کتاب ''سہرے کی ادبی معنویت'' کا اجراء کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر امام اعظم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ کلکتہ میں سات برس سے اپنے عہدے کی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں نیز ادبی کاموں میں بھی سرگرم ہیں۔ وہ ایسے محقق ہیں کہ نئے نئے موضوعات تلاشتے رہتے ہیں۔ اسی کی ایک کڑی یہ کتاب ہے۔ میری دانست میں سہرے پر پورے برصغیر میں اپنی نوعیت کی یہ اولین کتاب ہے جب کہ سہرا ایک ایسا موضوع ہے جس پر ادیبوں کو توجہ دینی چاہیے تھی۔ شادی سے نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی افادیت مسلم ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا مقدمہ ''میں پیامِ نشاط لایا ہوں'' جامع اور تفصیلی ہے۔ شاہد جمیل کا دیباچہ، ڈاکٹر امتیاز وحید (شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) کا انٹرویو، ۱۲ر مضامین اور ۲۳۵ر شعرا کے سہرے/تہنیتی نظمیں ۳۲۰ر صفحات پر مشتمل اس کتاب کی وقعت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اردو دوست بلال حسن نے مزید کہا کہ اس کتاب سے سہرے کے فن کو تقویت ملے گی اور صنفی حیثیت کا تعین ہوگا۔ انشاء اللہ۔

....

وفیات:

● معروف شاعر حباب ہاشمی (اصل نام: سید سعید الحسن ہاشمی ولادت: ۲/اکتوبر ۱۹۳۶ء، فتح پور، اتر پردیش) کا انتقال طویل علالت کے باعث ۷/اگست ۲۰۱۷ء کو تقریباً ساڑھے ۹ بجے شب ان کی رہائش گاہ کریلی الہ آباد میں ہوگیا۔ تدفین دوسرے دن ۸/اگست ۲۰۱۷ء کو بعد نماز ظہر الہ آباد میں ہوئی۔ پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان کے دادا سید بدر الہدیٰ مختار عدالت تھے اور حکیم بھی۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور حکیم اجمل خاں کے شاگرد رشید تھے۔ والد محترم سید نور الہدیٰ بھی شاعر تھے اور فتح پور سے ایک رسالہ ''جام'' کا اجراء کیا تھا۔ حباب ہاشمی محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ سے سبکدوش ہوکر مستقل سکونت الہ آباد میں اختیار کرلی تھی۔ ان کے دو شعری مجموعے ''شکست حرف'' ۱۹۹۹ء اور ''نقد جاں'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ ان کا کلام ہندو پاک کے موقر ادبی جرائد میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ مرحوم انتہائی نیک، خلیق، وضعدار اور پرہیزگار انسان تھے۔ حج بیت اللہ کی سعادت سے سرفراز ہو چکے تھے۔ 'تمثیل نو' کے مستقل قاری تھے، ان کی تحریریں اکثر رسالے کی زینت بنتی تھیں۔

....

● انسانی حقوق کے ممتاز علمبردار اور دہلی ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس **راجندر سچر** (پیدائش: ۲۲/دسمبر ۱۹۲۳ء، لاہور) کا انتقال ۲۰/اپریل ۲۰۱۸ء کی صبح ۱۱ بجے ہوگیا۔ آخری رسومات اسی دن شام ۵:۳۰ بجے لودھی روڈ پر واقع شمشان میں ادا کی گئیں۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ ان کے دادا لاہور ہائی کورٹ کے ممتاز فوجداری وکیل تھے۔ جسٹس راجندر سچر ۱۹۷۰ء میں دلی ہائی کورٹ میں ایڈیشنل جسٹس مقرر ہوئے تھے۔ وہ واحد جج تھے جنہوں نے ایمرجنسی میں حکومت کی ایمرجنسی سے متعلق ہدایات کو ماننے سے انکار کردیا تھا۔ جسٹس سچر اس وقت سرخیوں میں آئے جب مارچ ۲۰۰۵ء میں یو پی اے حکومت نے ملک میں مسلمانوں کی حالت پر رپورٹ تیار کرنے کے لئے سچر کمیٹی تشکیل دی جس کی بنیاد پر مسلمانوں کی اقتصادی، سماجی اور تعلیمی صورتحال کی بنیاد پر سچر کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی تھی۔ نومبر ۲۰۰۶ء میں ان کی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کی گئی۔ اس رپورٹ کو سچر کمیٹی رپورٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ رپورٹ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ہر شعبہ میں بری طرح پسماندہ ہونے کی بات کہی گئی تھی۔ کمیٹی نے اقلیتوں کی صورتحال میں اصلاح کے لئے کئی اہم سفارشیں بھی کی تھیں۔ اس رپورٹ کو لے کر تنازعات بھی ہوئے۔ جب بھی مسلمانوں کی اقتصادی، تعلیمی اور سماجی حالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو سچر کمیٹی کا نام ضرور سامنے آتا ہے۔ جسٹس راجندر سچر اگست ۱۹۸۵ء سے دسمبر ۱۹۸۵ء تک دلی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے۔ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں شملہ میں وکیل کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ پھر وہ جج بنے۔ پہلے انہیں دو سال کیلئے دہلی ہائی کورٹ کا ایڈیشنل جج بنایا گیا پھر ان کی مدت کار میں دو سال کی توسیع کردی گئی۔ اس کے بعد وہ دہلی ہائی کورٹ کے مستقل جج منتخب کئے گئے۔ وہ سکم ہائی کورٹ اور راجستھان ہائی کورٹ کے کارگزار چیف جسٹس بھی رہے۔ وہ سوشلسٹ پارٹی کے بانی صدر اور اس کی مجلس عاملہ کے سب سے سینئر رکن تھے۔

....

● معروف شاعر مشکور حسن مشکور (ولادت یکم نومبر ۱۹۵۳ء، خلف جناب مسرور حسن مجو بابو مرحوم، نبیرۂ مولوی منظور حسن مرحوم موضع و پوسٹ: علی نگر، ضلع: دربھنگہ) کا ۲۸/ اپریل ۲۰۱۸ء کی صبح طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ مرحوم مدرسہ حسینیہ، پکڑیا، کوشیشور استھان سے بحیثیت استاد ۳۱/ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کی نماز جنازہ مولانا جمیل احمد نے علی نگر، ہاٹ گاچھی میں پڑھائی جہاں سیکڑوں لوگوں نے شرکت کی اور انہیں اشکبار آنکھوں سے علی نگر کے آبائی قبرستان میں مدفون کیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چھ بیٹے نادر حسنین، عندلیب، انجم فردوسی، عنبر، رہبر، خوشتر اور چار بیٹیاں ہیں۔ ان کے جنازے میں خویش و اقارب اور علاقہ کے لوگوں کے علاوہ پکڑیا کوشیشور استھان سے بھی کافی تعداد میں ان کے شاگردوں اور دیگر افراد نے شرکت کی۔ ڈاکٹر امام اعظم نے ان کی رحلت پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم مشکور حسن مشکور میرے والد مرحوم ظفر المنان ظفر فاروقی کے ماموں زاد بھائی کے فرزند تھے۔ کافی زود گو شاعر تھے اور برجستگی ان کے یہاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ خوش خط، خوش فکر اور خوش خوانسان تھے۔ منظوم خط نگاری پر بھی انہیں قدرت تھا۔ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی منظوم کتاب 'رفتگاں و قائماں' (دربھنگہ کی منظوم ادبی تاریخ) میں ان کا ذکر صفحہ: ۱۴۲ پر اس طرح ہے:

مشکور اک سخن داں — پروردۂ صدارماں
ہے گردو پیش طوفاں — اللہ بچائے ایماں

ان کی رحلت سے مجھے بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ ۱۹۶۹ء کے آس پاس جن دنوں میرے والد گوونڈ گنج تھانہ (مشرقی چمپارن) میں پولیس افسر تھے ان دنوں وہ مجھے اور میرے بھائی کو بڑی شفقت سے پڑھاتے تھے۔ حساب، انگریزی، اردو اور فارسی جیسے مضامین پر انہیں کامل عبور تھا۔ پھر میرے والد کا تبادلہ بتیا ٹاؤن تھانہ (مغربی چمپارن) ہوا تو میرے والد نے وہاں ان کا داخلہ ITI میں کرایا لیکن شومیٔ قسمت وہ کورس مکمل نہیں کر سکے۔ جب میں نے 'تمثیل نو' کا اجرا کیا تو اکثر اپنی منظوم تحریر بھیجتے۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

دو دن کی زندگی میں سکوں موت ہی تو ہے — اپنے لئے آرام کو بالکل حرام کر
دو دن کی زندگی کیا مشکور زندگی — اب محفل میں دوستوں کو جھک کر سلام کر

....

● جناب محمد متین اشرف (ولادت: ۱۳/ اکتوبر ۱۹۳۶ء، ڈاکٹر آفتاب اشرف، صدر شعبۂ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج دربھنگہ کے والد) کا ۱۳/ مئی ۲۰۱۸ء کو ان کی رہائش گاہ محلہ رحم خاں میں طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ جنازہ کی نماز اسی روز صبح ۹ / بجے خان صاحب کی ڈیوڑھی کے احاطے میں ادا کی گئی اور تدفین بعد نماز ظہر آبائی گاؤں شاہ پور (ضلع سیتامڑھی) میں ہوئی اور وہیں اشک بار آنکھوں کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔ وہ دربھنگہ سمیت بہار کے درجنوں اضلاع کے بلاک اور بلدیہ میں بی ایس ایس، جے ایس ایس اور ڈی ایس ایس رہے اور ۳۱/ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں مظفر پور سے بحیثیت ضلع اسٹیٹسٹیکل افسر سبکدوش ہوئے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چار بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔

....

● معروف ملی، ادبی اور سماجی شخصیت پروفیسر محمد سلیمان خورشید (ولادت ۲۸ر جولائی ۱۹۴۶ء) کا انتقال ۱۵رمئی ۲۰۱۸ء کی صبح ۸ر بجے مرسی اسپتال (اسمبلی آف گاڈ چرچ) میں حرکتِ قلب بند ہوجانے کے سبب ہوگیا۔ وہ عرصے سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ اسی روز بعد نماز عصر نماز جنازہ راجہ بازار جامع مسجد، کلکتہ میں ادا کی گئی اور باگماری قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ مرحوم مختلف علوم وفنون سے بہرہ ور تھے۔ فلسفہ ہو یا انشاپردازی، تاریخ ہو یا علم الکلام، تحریر ہو یا تقریر، قوم کی رہنمائی ہو یا ملت کی ترجمانی، سخن سرائی ہو یا سخن فہمی ہر میدان میں وہ بے نظیر تھے۔ مرحوم مولانا آزاد کالج کلکتہ سے ہائر سکنڈری کی تعلیم حاصل کی اور وہیں سے تاریخ میں آنرس کیا۔ پھر پریسیڈنسی کالج سے تاریخ میں ایم اے کیا۔ ۱۹۷۵ء میں سٹی کالج میں شعبۂ تاریخ کے لکچرار ہوئے اور ۱۹۷۸ء میں فل ٹائم لکچرار ہوگئے۔ انہوں نے جز وقتی طور پر کلکتہ یونیورسٹی اور عالیہ یونیورسٹی میں بھی بحیثیت لکچرر اپنی خدمات انجام دیں۔ مرحوم ۲۵ برس سے زائد عرصہ تک مسلم انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری رہے نیز کئی برسوں تک انجمن ترقی اردو کے سکریٹری بھی تھے۔ وہ باگمان انڈیا پیپلز فارم پیس اینڈ ڈیموکریسی کے نائب صدر بھی رہے۔ پروفیسر موصوف مختلف موقعوں پر محمڈن اسپورٹنگ کلب کے نائب جنرل سکریٹری، سکریٹری اور صدر بھی رہے۔ وہ مختلف ادوار میں مختلف سیاسی پارٹیوں سے بھی وابستہ رہے۔ اخیر میں انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔ بحیثیت اسپورٹس صحافی انہوں نے کئی برسوں تک ''اخبارِ مشرق'' کلکتہ کے لئے کام کیا۔ ان کے انتقال پر ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائرکٹر، مانو، کولکاتا) نے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اپریل ۲۰۱۲ء میں میرے کولکاتا آنے کے بعد مرحوم سے میرے مراسم خوشگوار تھے۔ جب بھی کسی تقریب میں ان سے ملاقات ہوئی ان کی شخصیت کے رموز کھل کر سامنے آتے گئے۔ مرحوم اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے شہر اور مضافات میں بلائے جاتے تھے۔ وہ اردو کے علاوہ انگریزی اور بنگلہ زبانوں سے بھی واقف تھے۔ بیحد اخلاق مند اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔

....

● معروف ڈراما نگار سید حیدر علی کا انتقال ۲۷رمئی ۲۰۱۸ء کی صبح ۷ بجے اپنی بڑی بہن کی رہائش گاہ واقع رابندر سرانی، کولکاتا میں طویل علالت کے بعد ہوگیا۔ انہیں گردوں کا عارضہ لاحق تھا۔ حیدر علی نے طالب علمی کے زمانے سے ہی ۱۳رسال کی عمر میں چارمنگ اسکول کے سالانہ جلسہ پر ہونے والے ڈرامے میں اپنی فنکاری کے جوہر پہلی مرتبہ دکھائے۔ پھر آکولہ، مہاراشٹر میں سادھنا آرٹس کے بینر تلے بے شمار ڈراموں میں کام کیا۔ وہاں ساگر سرحدی کے تحریر کردہ ڈراما ''بھوکے بھجن نا ہوئے گوپالا'' میں ان کے کردار کو بہترین فنکار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے بعد حیدر علی نے اپنی تمام توجہ ڈراما میں مرکوز کردی۔ ۱۹۸۷ء میں کلکتہ ایکشن گروپ کے نام سے انہوں نے ایک ڈراما گروپ قائم کیا اور بے شمار ڈرامے لکھے اور ان کی ہدایت کاری بھی کی۔ اس گروپ کے بیشتر ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جلوے بھی بکھیرے۔ ریاستی اور قومی سطح پر بہت سارے اعزازات وانعامات سے سرفراز کئے گئے۔ کولکاتا دوردرشن سے پروفیسر ظفر اوگانوی کا مشہور افسانہ ''بے وزنی'' حیدر علی کی ہدایت میں ٹیلی فلم کی صورت میں

نشر ہوا جس کی اسکرپٹ ڈاکٹر شہناز نبی نے لکھی تھی۔ حیدر علی "پیار اسی کو کہتے ہیں" کے نام سے ایک فلم بھی بنا رہے تھے جس کا مہورت جولائی ۱۹۹۴ء میں ممبئی میں پلے بیک سنگر محمد عزیز کے ہاتھوں ہوا تھا۔ ان کا آخری ڈراما "دلی جو اک شہر تھا" مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام منعقدہ اردو ڈراما فیسٹیول کے موقع پر آئی سی سی آر آڈیٹوریم میں اسٹیج کیا گیا۔

....

● شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق استاد **پروفیسر عظیم الشان صدیقی** (پیدائش: دہلی) ۴/جون ۲۰۱۸ء کو دتی کے دریا گنج میں مغرب کے وقت انتقال کر گئے۔ ۵/جون کی صبح ان کی تدفین دلی کے شیخ پیران قبرستان میں ہوئی۔ مرحوم ایک عرصے سے بیمار تھے۔ دلی کے ادبی جلسوں اور دیگر تقریبات میں ان کا آنا جانا تقریباً موقوف ہو گیا تھا۔ پسماندگان میں ایک بیٹا علی ارشد اور بیوہ شامل ہیں۔ انہوں نے شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اپنے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ شعبہ کے صدر بھی رہے۔ اچھے استاد کے ساتھ ساتھ انہوں نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں جو اردو نصاب کا اہم حصہ ہیں۔ پریم چند اور ڈپٹی نذیر احمد پر ان کی کتابیں اور تحریریں اہمیت کی حامل ہیں۔ فکشن کی تنقیدی زبان لکھنے کا خاص ہنر ان کے یہاں تھا۔ مرحوم نہایت مرنجا مرنج انسان تھے۔

....

● معروف شاعر اور بزم شہر نشاط کے سکریٹری **شمس افتخاری** (اصل نام: شمس الزماں انصاری ولادت: ۱۹۶۹ء) ۶/جون ۲۰۱۸ء کو بدھ کی شام اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ دوسرے روز ۷/جون بعد نماز تراویح بینٹرہ قبرستان، ہوڑہ میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم قریباً ۶/ماہ سے جگر کے عارضے میں مبتلا تھے اور بغرض علاج اپنی اہلیہ کے ساتھ کچھوچھہ شریف میں مقیم تھے اور وہیں انہوں نے آخری سانس لی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو کم عمر بیٹیاں ہیں۔ مرحوم تکیہ پاڑہ پرائمری اسکول میں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کی ترتیب دی ہوئی کتابوں میں "سرمایۂ سخنوراں" اور "ڈاکٹر الف انصاری: حیات اور کارنامے" اہم ہیں۔ وہ ادبی تنظیم "حلقۂ سخنوراں" ہوڑہ کے بانی معتمد تھے۔ ان کی رحلت پر روزنامہ "آبشار" کلکتہ میں انجم عظیم آبادی نے قطعہ پیش کیا ہے:

عمر تو نہ تھی اتنی ، ساتھ چھوڑ دیتے وہ مصلحت خدا کی ہے ، کیوں نجات ہو غم سے
محفل سخن داں میں ، پھر اداسی چھائی ہے شمس افتخاری بھی ہو گئے جدا ہم سے

....

● ممتاز طنز و مزاح نگار **مشتاق احمد یوسفی** (پیدائش: ۴/ستمبر ۱۹۲۳ء، ٹونک، جے پور، راجستھان) کا انتقال ۲۰/جون ۲۰۱۸ء کو کراچی میں ہو گیا۔ نماز جنازہ ۲۱/جون کو کراچی کے علاقے ڈیفنس فیز-۵ کی سلطان مسجد میں ادا کی گئی۔ وہ طویل عرصے سے علیل تھے اور نجی اسپتال میں زیر علاج تھے۔ پسماندگان میں ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم راجپوتانہ سے حاصل کی جب کہ آگرہ یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا۔ تقسیم کے بعد کراچی منتقل ہوئے۔ مشتاق احمد یوسفی ۱۹۵۰ء سے مختلف بینکوں سے وابستہ رہے، ۱۹۷۷ء میں وہ پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین کے عہدے پر فائز ہوئے، بینکنگ کے شعبے میں اعلیٰ خدمات پر

انہیں قائداعظم میموریل میڈل سے نوازا گیا۔ مشتاق یوسفی کو حکومت پاکستان کی جانب سے ادب کی نمایاں کارکردگی پر ستارۂ امتیاز (۱۹۹۹ء) اور ہلالِ امتیاز (۲۰۰۲ء) سے نوازا گیا تھا۔ ان کی مزاح پر ۵؍ کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ ان میں ''چراغ تلے'' (۱۹۶۱ء)، ''خاکم بدہن'' (۱۹۶۹ء)، ''زرگزشت'' (۱۹۷۶ء)، ''آب گم'' (۱۹۹۰ء) اور ''شامِ شعر یاراں'' (۲۰۱۴ء) شامل ہیں۔

....

● معروف صحافی اور ''مہکتا آنچل'' (ہندی)، ''پاکیزہ آنچل'' (اردو) اور اردو ڈائجسٹ ''ہما'' کے ایڈیٹر **خالد مصطفےٰ صدیقی** (خلف مولانا عبدالوحید صدیقی، بانی 'نئی دنیا'' عمر تقریباً ۷۸ برس) کا انتقال طویل علالت کے بعد یکم جولائی ۲۰۱۸ء کی صبح ۷:۵۰ بجے ہو گیا۔ نماز جنازہ ماجد پنج پیراں، حضرت نظام الدین اولیاء میں ادا کی گئی اور تدفین پنج پیراں قبرستان میں ہی عمل میں آئی۔ پسماندگان میں ۵؍ بیٹیاں، ۴؍ بہنیں اور ۲؍ بھائی بشمول شاہد صدیقی (ایڈیٹر ''نئی دنیا'') شامل ہیں۔

....

● عالمی شہرت یافتہ عالم اور مشہور تعلیمی ادارہ دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر گجرات کے شیخ الجامعہ **مولانا عبداللہ کاپودروی** (عمر تقریباً ۸۵ سال) کا طویل علالت کے بعد ۱۰؍ جولائی ۲۰۱۸ء کو گجرات میں ہو گیا۔ پسماندگان میں ۵؍ بیٹے اور ۷؍ بیٹیاں ہیں۔ مرحوم ملک کے بالغ نظر عالم دین تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے فضیلت مکمل کیا۔ مختلف موضوعات پر مبنی ایک درجن سے زائد کتابیں انہوں نے تحریر کیں۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے علمی و دعوتی اسفار کئے اور ان کے ہزاروں شاگرد مختلف ملکوں میں دین کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مرحوم ایک عظیم انسان تھے اور ہمیشہ خلوص و ہمدردی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مرحوم نے ملک کے مختلف نمائندہ تعلیمی اداروں اور رفاہی و فلاحی تنظیموں کے باہمی اختلافات کو دور کرنے میں بھی نمایاں اور اہم رول ادا کیا۔

....

● مشہور ادیب **تیجندر گگن** (چھتیس گڑھ) کا ۱۱؍ جولائی ۲۰۱۸ء کی رات حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ وہ ۶۷؍ برس کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ اور ایک بیٹی سمیرا ہیں۔ دوردرشن میں ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش مسٹر گگن کچھ وقت تک ایک اخبار کے لئے لکھتے رہے اور کافی سرگرم رہتے تھے نیز ادبی اور دیگر پروگراموں میں بھی باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ ان کے کئی ناول شائع ہوئے ہیں جن میں 'وہ میرا چہرہ، کالا پادری، سیڑھیوں پر چیتا، ہیلو سجیت کے علاوہ کہانیاں 'گھوڑا بادل اور مجموعہ شاعری' بچے الاؤ تاپ رہے ہیں' اہم ہیں۔ وہ انتہائی نرم اور سادہ مزاج کے تھے۔ انہوں انسانی احساسات پر مبنی اپنی تخلیقات کے ذریعے ملک اور معاشرے کے مختلف مسائل کو پیش کیا اور عوام کو ان پر غور و خوض کرنے اور معاشرے کو صحیح سمت میں چلنے کی ترغیب دی۔

....

● معروف ادیب اور صحافی ایم عالم (اصل نام: محمد عالم، ولادت ۲؍ نومبر ۱۹۳۱ء بمقام بتیا، مغربی چمپارن خلف الحاج محمود عالم) کا انتقال ۱۵؍ جولائی ۲۰۱۸ء کو مختصر علالت کے بعد ہو گیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں ۴؍ بیٹے اور

۲ ربیٹیاں ہیں۔ وہ ایم این ایم ویمنس کالج (بتیا) سے صدر، شعبۂ اردو کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہو چکے تھے۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز آسنسول، مغربی بنگال سے ہوا۔ ہفت وار اخبار ''اندھیر نگری چوپٹ راج'' اور ''محرک'' کے مستقل کالم نگار تھے۔ افسانے، انشائیے، مضامین، خاکے، محفلوں کی روداد، انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کرتے تھے۔ بچوں کے ادب پر بھی ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ جماعت اسلامی ہند، شاخ بتیا کے شعبۂ نشرواشاعت سے وابستہ تھے۔ وہ 'الفلاح اسکول' بتیا کے بانیوں میں سے تھے۔

....

● بالی ووڈ اور ڈراما انڈسٹری کی سینئر اداکارہ ریتا بہادری (پیدائش: ۴ر نومبر ۱۹۵۵ء) طویل علالت کے بعد ممبئی کے ایک اسپتال میں ۱۷ر جولائی ۲۰۱۸ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ آنجہانی نے آخری بار ڈراما 'نمکی مکھیا' میں میں امرتی دیوی کا کردار ادا کیا تھا۔ اُن کی آخری رسومات اسی دن ممبئی کے اندھیری میں ادا کی گئیں جس میں بالی ووڈ کی مشہور شخصیات نے شرکت کیں۔ ریتا بہادری ایک با صلاحیت اداکارہ تھیں، ان کے اندر مختلف طرح کے کرداروں کو ادا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی لیکن انہیں شروع سے ہی سائڈ رول کے لئے لیا جاتا رہا۔ گرچہ فلمی کیریئر کی شروعات سائڈ رول ادا کرتے ہوئے نہیں کی تھی۔ ان کی دوسری فلم ملیالم زبان کی تھی جس میں ۱۹ر سالہ ریتا نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اگلے ہی برس ان کی فلم 'جولی' ریلیز ہوئی جو سپر ہٹ رہی مگر اس میں ریتا کلیدی ہیروئن شری دیوی جو سری دیوی کی پہلی ہندی فلم تھی میں ہیروئن کی بہن کا کردار ادا کیا تھا۔ بعد کے دنوں میں ریتا نے چھوٹے پردے ٹی وی سے دلچسپی لینے لگیں۔ دوردرشن چینل پر سیریل 'چنوتی' کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔ 'مجرم حاضر' اور 'منزل' سیریل بھی کافی مقبول ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر آنجہانی نے شوبز کیریئر میں ۷۰ر سے زائد فلم و ڈراموں میں کام کیا۔ 'واضح رہے کہ ریتا بہادری نے راجا، جولی، بیٹا، دل ول پیار ویار فلموں اور ۳۰ر سے زائد ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔

....

● مشہور فلمی نغمہ نگار نیرج (اصل نام: گوپال داس سکسینہ۔ پیدائش: ۴ر جنوری ۱۹۲۵ء) کا ۱۹ر جولائی ۲۰۱۸ء کو انتقال ہو گیا۔ نیرج نے فلمی نغمے لکھنے کی طرف کبھی زیادہ توجہ نہیں دی بلکہ ان کی توجہ ہمیشہ اپنی شاعری پر رہی۔ اسی لئے انہوں نے زیادہ فلمی نغمے نہیں لکھے لیکن جو لکھے ان میں سے زیادہ تر مقبول تھے۔ ان کا 'شرمیلی' کا نغمہ 'آج مدہوش ہوا جائے رے، میرا من، میرا من' بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ اسی فلم کا نغمہ 'کھلتے ہیں گل یہاں، کھلنے کے بکھرنے کو' کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔ 'شرمیلی' کے بعد فلم 'گیمبلر' دوسری ایسی فلم ہے جس میں گوپال داس نیرج کے لکھے ایک سے زائد نغمے مقبول ہوئے۔ مثلاً 'دل آج شاعر ہے، غم آج نغمہ ہے'، 'میرا من تیرا پیا سا، میرا من تیرا پیاسا' آج بھی سنا جاتا ہے۔ نیرج کا لکھا نغمہ جسے محمد رفیع نے گایا' لکھے جو خط تجھے وہ تری یاد میں' سپر ہٹ رہا۔ ان نغموں کو سننے کے بعد اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے فلموں میں لکھنے اور پیسے کمانے کے لئے کبھی بھی اوٹ پٹانگ نغمے نہیں لکھے، اپنے معیار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، اس بات کا خیال ہمیشہ رکھا کہ ان کا تعلق ادب سے ہے اور وہ فلموں

میں بھی ادبی زبان کا ہی استعمال کریں، البتہ اس بات کی گنجائش ہمیشہ رکھی کہ ان کے الفاظ آسانی سے موسیقی کے ساتھ گنگنائے اور گائے جاسکیں۔

....

● معروف عالم دین، تاج الشریعہ حضرت مولانا **مفتی محمد اختر رضا خان** بریلوی عرف ازہری میاں (اصل نام محمد اسماعیل رضا ولادت ۲۲ر نومبر ۱۹۴۳ء خلف حضرت مولانا محمد ابراہیم رضا) ۲۰ر جولائی ۲۰۱۹ء کو جمعہ کی شام واصل حق ہو گئے۔ جنازے کی نماز اسلامیہ انٹر کالج بریلی میں ادا کی جانی تھی لیکن جگہ کم پڑ گئی۔ جنازے کی نماز ان کے اکلوتے صاحب زادے مولانا عسجد رضا نے پڑھائی۔ تدفین بریلی شریف بروز اتوار ۲۲ جولائی بعد نماز ظہر ازہری گیسٹ ہاؤس میں ہوئی جس میں عالمی وملکی عمائدین اور علمائے کرام نے شرکت کی۔ پسماندگان میں پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا مفتی محمد عسجد رضا خاں ہیں۔ ۲۰۱۴ء میں ایک ورلڈ سروے کے مطابق دنیا کے ۵۰۰ مسلم طاقتور قائدین میں ازہری میاں کا مقام ۲۲واں قرار پایا۔ جامعہ ازہر مصر نے آپ کی فقہی اور علمی بصیرت کی وجہ سے آپ کو 'سن آف ازہر' کا خطاب دیا۔ حرم شریف کے خدام نے آپ کے تقویٰ اور آپ کی علمیت کو اعزاز بخشنے کی غرض سے کلید کعبہ مرحمت فرمائی اور مہمانِ کعبہ کا اعزاز بخشا۔ آپ کے فتاویٰ انگریزی میں اظہر الفتاویٰ کے نام سے شائع ہو کر پوری دنیا میں چراغ ہدایت بن کر مشہور ہے۔ عربی، اردو، فارسی اور انگریزی میں تقریباً ۶۰ر کتابیں آپ نے تصنیف کی ہیں۔ اردو کتابوں میں آثار قیامت، متعدد فقہی مقالات، سعودی مظالم کی کہانی اختر رضا کی زبانی، سفینۂ بخشش (دیوان)، ایک غلط فہمی کا ازالہ، فضیلت صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حضرت مرحوم ادب سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور نعت گو شاعر بھی تھے۔ ان کا نعتیہ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے ۲۰۰۰ء میں جامعۃ الرضا بریلی (عربی یونیورسٹی) قائم کیا۔

....

● حضرت مولانا صوفی **عبدالواحد قمر قادری** (ولادت: ۱۹ر فروری ۱۹۳۴ء، نانیہال: دوگھرا، جالے، دربھنگہ) کا انتقال ۲۶ر جولائی ۲۰۱۸ء (جمعرات) کو ہالینڈ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے ہو گیا۔ مرحوم مغفور ۴ر جولائی ۲۰۱۸ء کو دربھنگہ سے ہالینڈ گئے تھے۔ وہ وہاں مفتیٔ اعظم کی حیثیت سے شرعی احکام انجام دیتے تھے۔ ان کی رحلت سے دینی و ادبی حلقہ سوگوار ہے۔ ان کا آبائی وطن موضع علیم آباد، ابیاری، وایا: کمتول، ضلع: دربھنگہ تھا اور عرصہ سے وہ قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں مقیم تھے۔ مرحوم جلیل القدر عالم دین، شعلہ بیان خطیب اور ایک اچھے شاعر تھے۔ شہر دربھنگہ کے موضع موسیٰ پور ترونی میں ان کا قائم کیا ہوا عالیشان مدرسہ ''الجامعۃ الواحدیہ'' موجود ہے جہاں کثیر تعداد میں طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مرحوم 'القرآن اسلامک فاؤنڈیشن' کے بانی اور مفتی اعظم ہالینڈ کے ساتھ ساتھ ادارہ شرعیہ، پٹنہ کے امین شریعت ثالث بھی تھے۔ دینی موضوعات پر ان کی درجنوں کتابیں فتاویٰ یورپ، قرآنی تعلیم (اوّل و دوم)، قرآنی علوم، ضیائے تصوف، فتاویٰ نویسی کے رہنما اصول، مکالمہ حق و باطل، مسائل حج و زیارات، حج و زیارت کی دعائیں، نیت نامہ، قرآنی عملیات، کتاب الدعوات، قادیانی دھرم، زیارت مقدسہ، سوانح غوث بنگالہ، حیات مفسر اعظم،

تعویذات سیفی، نقوش قادری، جبینِ امامت کا آخری سجدہ، تمہید ایمان، علم غیب، تین طلاقیں، شیخ عبدالقادر جیلانی، امام احمد رضا، حج کے مسائل مع زیارت حرمین، فتاویٰ شرعیہ (جلد سوم)، فتاویٰ واجدیہ، شیخ گنج ولایت، تسہیل فضائل درود شریف، تسہیل حجۃ اللہ، تسہیل نعمت اللہ، جدید حیات مفسر اعظم مختصر اذانِ ثانی، کتاب القضا، وصایا واجدیہ، کائناتِ آرزو (سفرنامہ) شامل ہیں جب کہ نقشِ دوام، تنویرِ نیر، تازیانہ اور پھلواری ان کی غزلوں و نظموں کے مجموعے ہیں۔ مولانا مرحوم کی حیات و خدمات پر مقالات و مضامین کا مجموعہ مولانا مرحوم کی حیات و خدمات پر مبنی مضامین کا مجموعہ 'تجلیاتِ نیر' (مرتب: مولانا فیضان الرحمٰن سبحانی) ۲۰۱۵ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ پسماندگان میں چار بیٹے اور سات بیٹیاں ہیں۔ ان کی رحلت پر مانو کولکاتا ریجنل سینٹر کے ریجنل ڈائریکٹر اور مدیر اعزازی ''تمثیل نو'' دربھنگہ ڈاکٹر امام اعظم نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ حضرت مولانا مرحوم سے میرے مراسم ۱۹۷۸ء سے تھے اور قلعہ گھاٹ میں قائم 'اردو ادبی سرکل' میں بھی ان کی آمد و رفت تھی۔ مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ میرے والد بزرگوار جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقی کی رحلت کے بعد چہلم پر میلاد شریف میں ان کی شرکت رہی اور انھوں نے اپنے تاثرات سے بھی نوازا تھا۔ میرا رسالہ 'تمثیل نو' وہ باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ ان کی امامت میں عیدین کی نمازیں پڑھنے کا شرف اکثر حاصل رہا ہے۔ امسال بھی عید الفطر کی نماز ۱۶؍جون ۲۰۱۸ء کو مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں ان کی امامت میں پڑھی۔ نہایت مخلص اور بزرگ شخصیت تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب عطا کرے۔ آمین!'' ان کا جسد خاکی ہالینڈ سے بذریعہ طیارہ سنیچر کو دہلی اور وہاں سے بذریعہ طیارہ پٹنہ ہوتے ہوئے دربھنگہ پہنچا۔ ۳۰؍جولائی کی صبح ان کی تدفین موئی پور ترونی، مدرسہ واجدیہ کے احاطے میں عمل میں آئی۔

....

● ماہر تعلیم، ممتاز شخصیت اور بانی ہیڈ ماسٹر آمنہ اردو ہائی اسکول، بتیا (مغربی چمپارن) **سید ہاشم رضا** (ولادت: یکم دسمبر ۱۹۳۵ء، محلہ: قلعہ، بتیا) کا انتقال ۳؍اگست ۲۰۱۸ء کو ۳؍بجے سہ پہر میں طویل علالت کے بعد ہو گیا اور ۴؍اگست ۲۰۱۸ء کو تکفین بعد نماز ظہر بڑی عیدگاہ قبرستان میں عمل میں آئی۔ جنازے میں خویش و اقارب کے علاوہ شہر کے معززین اور شاگردان کثیر تعداد میں شریک ہوئے اور مغفرت کی دعا کی۔ مرحوم شہر کے کئی تعلیمی اداروں ملت اکیڈمی، بسوریا، یتیم خانہ بدریہ وغیرہ کے علاوہ فٹ بال ایسوسی ایشن سے بھی وابستہ رہے۔ نہایت خلیق، ملنسار، دیندار انسان تھے۔ فٹ بالر بھی تھے۔ اخبار بینی اور کتب بینی سے بھی شغل تھا۔ کنبہ پروری کی بھی مثال تھے۔ ایک اچھے منتظم بھی تھے۔ ان کے دو بڑے بھائی سید اظہار الحق اور سید سعید الحق (سابق پروکٹر، رانچی یونیورسٹی) بہت پہلے دار فانی سے دار بقا کی طرف مراجعت فرما چکے ہیں۔ مرحوم کے والد بزرگوار بتیا رجسٹری آفس کے رجسٹرار تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹیاں نزہت جہاں (لوسی) اور نصرت جہاں (نوشی) اور ان کے خویش ڈاکٹر انصار الحق (سرجن) ہیں۔ ان کے ایک عزیز شاگرد مانو ریجنل سنٹر کولکاتا کے ریجنل ڈائریکٹر ڈاکٹر امام اعظم نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ''ان کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر نہیں ہو سکے گا۔ ایسی شخصیتیں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔ خاکسار کے والد محمد ظفر المنان ظفر فاروقی بتیا ٹاؤن تھانہ میں پولیس آفیسر (۱۹۷۰ء) تھے۔ انہوں نے میرا داخلہ آمنہ اردو مڈل

اسکول، امام باڑہ، محلہ: قلعہ، بتیا میں درجہ ہفتم میں کرایا۔ میرے والد کا تبادلہ جب دور دراز کے تھانوں میں ہونے لگا تو ہم دو بھائی سید اعجاز حسن امام اعظم (امام اعظم) اور سید حلیم آل احمد اعظم (شرفو) کو میرے والد نے مرحوم ہاشم رضا صاحب کے حوالے کیا۔ انہوں نے بالکل اپنے بچوں کی طرح اپنے گھر، اپنے لاج جہاں جیسی ضرورت پڑی رکھا اور خورد ونوش کا انتظام ان ہی کے یہاں رہا۔ مجھے کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ میں کسی دوسری جگہ ہوں۔ گھر جیسا ماحول ملا۔ وہ پرانی تہذیب اور پرانے اقدار کے حامل انسان تھے۔ ان کے کنبے کے تمام افراد خاکسار کو اعجاز کے نام سے پکارتے اور ان کے تمام رشتہ داروں سے میرے بھی روابط رہے۔ ان کی سسرال لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی و دیگر رشتہ داروں کے یہاں بھی آمدورفت رہی۔ ان کی اہلیہ اور گھر کے تمام لوگوں نے کافی پیار دیا۔ ۱۹۷۵ء میں میٹریکولیشن اور ۱۹۷۷ء میں آئی ایس سی ان کے یہاں رہ کر ہی کیا۔ اس کے بعد میرے والد کا تبادلہ بھوجپور ہوگیا۔ پھر ہم دربھنگہ اپنے وطن چلے آئے جہاں سے آگے کی تعلیم ہوئی۔ رسالہ ''تمثیل نو'' کا انہیں شدت سے انتظار رہتا اور گاہے گاہے اپنی رائے بھی دیتے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!'' ان کے دیگر اہم شاگردوں میں سیّد نیر حسنین، پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم وغیرہ ہیں۔

....

● DMK کے سربراہ اور تمل ناڈو کے سابق وزیر اعلیٰ **ایم کرونا ندھی** (ولادت: ۳؍جون ۱۹۲۴ء مقام: تروکوالائی، تمل ناڈو) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۷؍اگست ۲۰۱۸ء کی شام ۶ بج کر ۱۰ منٹ پر کاویری اسپتال میں ہوگیا۔ تمل ناڈو حکومت نے ان کے انتقال پر سات روزہ سوگ کا اعلان کیا۔ وہ ۱۴؍سال کی عمر سے دراوڑ تحریکوں میں حصہ لینے لگے تھے۔ جب ڈی ایم کے کے بانی سی ایم انادورئی نے ۱۹۴۹ء میں نئی پارٹی بنائی تب کرونا ندھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ وہ ہندوستان کے سینئر ترین لیڈروں میں سے تھے۔ ڈی ایم کے سربراہ کرونا ندھی ۵؍بار تمل ناڈو کے وزیر اعلیٰ اور ۱۲؍بار اسمبلی کے رکن رہے۔

....

● کولکاتا کے سینئر آرتھوپیڈک سرجن **ڈاکٹر پرویز اقبال** کا ۹؍اگست ۲۰۱۸ء کو سویڈن میں حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ انٹرنیشنل میڈیکل کانفرنس میں شرکت کے لئے سویڈن کی راجدھانی اسٹاک ہوم میں تھے۔ ان کے ہمراہ ان کی چھوٹی بہن بھی تھیں۔ پرویز اقبال کو فوراً سرجری کے لئے لے جایا گیا جہاں وہ جانبر نہ ہو سکے۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ دونوں بیٹیاں بھی ڈاکٹر ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس اور ایم ایس ڈگری حاصل کرنے والے ڈاکٹر پرویز اقبال کلکتہ میڈیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (سی ایم آر آئی) میں شعبۂ آرتھوپیڈک کے سربراہ بھی تھے۔

....

● ہندوستانی نژاد نوبل انعام یافتہ برطانوی مصنف **وی ایس نائپال** (پورا نام: ودیادھر سورج پرساد نائپال پیدائش: ۱۷؍اگست ۱۹۳۲ء، کیریبین جزائر ترنیداد چاگوناس) کا انتقال ۱۲؍اگست ۲۰۱۸ء کو دیر رات لندن میں واقع اپنے

گھر میں ہو گیا۔ ان کے دادا سال ۱۸۸۰ء میں ہندوستان سے جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے والد سور پرساد ترینید اد گارجین میں رپورٹر اور فکشن نگار تھے۔ ان کے آباؤ اجداد ضلع گورکھپور، اتر پردیش کے برہمن تھے۔ واضح رہے کہ نائپال نے ۱۹۵۵ء میں پیٹریکا ان ہالے سے شادی کی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۹۹۶ء میں انہوں نے دوسری شادی پاکستان کی مطلقہ خاتون صحافی نادرہ خانم علوی سے کی۔ مسٹر نائپال نے اپنی تحریری کریئر کی شروعات ۱۹۵۰ء کی دہائی میں کی۔ ان کے مشہور ناولوں میں 'اے ہاؤس فار مسٹر بسواس'، 'ان اے فری اسٹیٹ' اور 'اے بینڈ ان دی ریور' شامل ہیں۔ مسٹر نائپال کا بچپن انتہائی غربت میں گزرا۔ صرف ۱۸ رسال کی عمر میں اسکالرشپ حاصل کرنے کے بعد وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ چلے گئے۔ انہوں نے اپنا پہلا ناول آکسفورڈ یونیورسٹی میں طالب علمی کے دوران ہی لکھا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوا۔ انہوں نے ۱۹۵۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی چھوڑ دیا اور لندن کی نیشنل پورٹریٹ گیلری میں ایک کیٹلاگر کے طور پر کام شروع کر دیا۔ 'مسٹک میسر' ان کا پہلا ناول تھا جسے شائع کیا گیا۔ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ نے سال ۱۹۸۹ء میں انہیں نائٹ ہڈ کے خطاب سے نوازا۔ ادب کے میدان میں خدمات کے لئے بوکر پرائز اور ۲۰۰۱ء میں ادب کے نوبل انعام سے بھی انھیں نوازا گیا۔

……………………

● سابق لوک سبھا اسپیکر اور سینئر کمیونسٹ لیڈر سومناتھ چٹرجی (ولادت: ۲۵ رجولائی ۱۹۲۹ء بمقام تیزپور، آسام) ۱۳ راگست ۲۰۱۸ء کو کولکاتا کے بیل ویو اسپتال میں انتقال کر گئے۔ انھوں نے اپنے پیچھے بیوہ رینو چٹرجی، بیٹا پرتاپ اور دو لڑکیاں انورادھا اور انوشیلا کو چھوڑا ہے۔ ان کے والد ایک بڑے وکیل تھے اور ہندو قوم پرست نظریے کے حامل تھے اور شیاما پرساد مکھرجی کی قائم کردہ بھارتیہ جن سنگھ میں بہت فعال تھے لیکن وہ دوسری سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ والد کی طرح سومناتھ چٹرجی بھی پوری زندگی دوسری سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے بھی اچھے تعلقات رکھے اور سب کو یکساں نظر سے دیکھا۔ سومناتھ گرچہ آسام میں پیدا ہوئے تھے لیکن انہوں نے کالج کی پڑھائی کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج میں پوری کی۔ اس وقت پریسیڈنسی کلکتہ یونیورسٹی کے ماتحت تھا۔ وہ کیمبرج کے جیسس کالج گئے جہاں نے انہوں نے ۱۹۵۲ء میں گریجویشن کیا۔ انگلینڈ میں قانون کی پڑھائی کی اور کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دیا۔ ۲۰۰۴ء سے ۲۰۰۹ء تک سومناتھ چٹرجی نے اسپیکر کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں خدمات انجام دیں۔ چٹرجی نے پہلی مرتبہ لوک سبھا سیٹ کے لئے ۱۹۷۱ء میں چناؤ لڑا اور آزاد امیدوار کے طور پر جیت حاصل کی۔ بعد میں سومناتھ چٹرجی نے سی پی آئی ایم میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۱۹۶۸ء سے ۲۰۰۸ء تک وہ سی پی آئی ایم پارٹی کے ممبر رہے۔ ۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۹ء تک وہ دس مرتبہ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۹ء سے ۲۰۰۴ء تک وہ لوک سبھا میں اپنی پارٹی کے لیڈر رہے۔ جادوپور لوک سبھا سیٹ پر ۱۹۸۴ء میں سومناتھ چٹرجی کو ممتا بنرجی نے شکست دی۔ ہند امریکہ نیوکلیئر معاہدے پر کانگریس کی یو پی اے قیادت والی حکومت میں سی پی آئی ایم پارٹی کے ساتھ سومناتھ چٹرجی کے نظریاتی اختلاف ہونے پر انہیں پارٹی سے خارج کر دیا گیا۔

……………………

● ممتاز محقق، ناقد اور سابق صدر، شعبۂ اردو، شری وینکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی پروفیسر سلیمان اطہر جاوید (ولادت: ۹/اپریل ۱۹۳۶ء) کا ۱۵/اگست ۲۰۱۸ء کو حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ دوسرے روز ۱۶/اگست کو بعد نماز ظہر مسجد خدیجہ کے احاطے میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور تدفین درگاہ میر نواب صاحب، مستعد پورہ میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ ۳۰/اپریل ۱۹۹۶ء کو مرحوم اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کی ۲۲/کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں "رشید احمد صدیقی: حیات اور فن"، "تنقید شعر"، "ادب میں ابہام اور اس کے مسائل"، "تنقیدی افکار"، "تاریخ تیلگو"، "اقبال: ماورائے دیر و حرم"، "دیوانِ غالب کا پہلا شعر"، "ادبی ڈائری"، "ادیب کا بدلتا مزاج" اہم ہیں۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے وہ شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ "آنگن آنگن دکھ کے پیڑ" شائع ہو چکا ہے۔ روزنامہ "سیاست" میں 'ادبی ڈائری' کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ ان کی خدمات پر مختلف اردو اکاڈمیوں نے انعامات و اعزازات سے بھی نوازا تھا۔ "تمثیل نو" کے مستقل قاری تھے۔

....

● سابق وزیر اعظم اور بی جے پی کے سینئر لیڈر **اٹل بہاری واجپئی** (پیدائش: ۲۵/دسمبر ۱۹۲۴ء، گوالیار) کا ۱۶/اگست ۲۰۱۸ء کو انتقال ہوگیا۔ وہ آل انڈیا انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنس (ایمس) میں زیر علاج تھے۔ انہیں پیشاب کی نلی میں انفیکشن تھا، اس کے علاوہ گردہ میں بھی انفیکشن اور سینے میں جکڑن وغیرہ کی شکایت کے بعد ۱۱/جون کو ایمس میں داخل کرایا گیا تھا۔ شوگر کے شکار سابق وزیر اعظم کا صرف ایک ہی گردہ کام کر رہا تھا۔ آخری رسومات تمام سرکاری اعزازات کے ساتھ دوسرے روز ۱۷/اگست کو شام ۴ بجے اسمرتی استھل میں ادا کی گئیں۔ واجپئی مجرد تھے اور پسماندگان میں ان کی متبنّیٰ دختر نمیتا کول بھٹاچاریہ شامل ہیں۔ اٹل بہاری واجپئی تین بار ہندوستان کے وزیر اعظم رہے۔ ان کا پہلا دور ۱۹۹۶ء میں ۱۳/دن کا تھا۔ دوسری مرتبہ ۱۹۹۸ء سے ۱۹۹۹ء تک ۱۱/ماہ تک وہ وزیر اعظم رہے اور تیسری بار ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۴ء تک انہوں نے اپنی میعاد مکمل کی۔ وہ چار دہائیوں سے زیادہ عرصے تک بھارتی پارلیمان کے رکن رہے۔ دس مرتبہ لوک سبھا کے لیے منتخب ہوئے اور دو مرتبہ راجیہ سبھا کے لیے چنے گئے۔ ۲۰۰۹ء تک لکھنؤ سے رکن پارلیمان رہے اور اس کے بعد خرابیٔ صحت کی وجہ سے سیاست سے الگ ہوگئے۔ اٹل جی جن سنگھ کے بنیاد گزاروں میں سے تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۲ء تک جن سنگھ کی صدارت کی۔ وہ مرار جی دیسائی کی کابینہ میں وزیر برائے امور خارجہ تھے۔ جنتا حکومت کے گرنے کے بعد اٹل جی نے ۱۹۸۰ء میں جن سنگھ کی تعمیر نو کی اور اس کا نام بدل کر بھارتیہ جنتا پارٹی رکھ دیا۔ وزارتِ عظمیٰ کی ۵ سال کی میعاد مکمل کرنے والے پہلے غیر کانگریسی وزیر اعظم تھے۔ صدر جمہوریہ ہند نے ۲۰۱۵ء میں ان کو بھارت کے سب سے بڑے اعزاز بھارت رتن سے نوازا۔ واجپئی ملک کے صف اول کے سیاسی رہنما کے ساتھ وہ ہندی کے عمدہ شاعر بھی ہیں۔ سیاسی مصروفیات میں بھی انہوں نے شاعری کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ واجپئی نے اپنی شاعری میں بھی اپنے ان جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اپنے طویل سیاسی سفر میں واجپائی نے وقت کے ہر سلگتے مسئلے پر نظمیں کہی ہیں۔ 'ہم جنگ نہ ہونے دیں گے، ہم جنگ

نہ ہونے دیں گے' اور 'موت سے ٹھن گئی' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "میری اکیاون کویتائیں" کے نام سے شائع ہوا۔ ۲۰۰۴ء میں آنجہانی پر معروف ادیب، شاعر اور صحافی فاروق ارگلی نے ایک کتاب "اٹل بہاری واجپئی: شخص، شاعر اور سیاست داں" شائع کی، جس کی بے حد پذیرائی ہوئی۔

....

● کہنہ مشق شاعر **اظہار وارثی** (پیدائش: ۲۱ر نومبر ۱۹۴۰ء) ۲۱ر اگست ۲۰۱۸ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ وہ کافی دنوں سے علیل تھے۔ تقریباً ۳۰ سال وہ گوشہ نشینی کے عالم میں جی رہے تھے۔ انہوں نے جس صنف میں خامہ فرسائی کی اس صنف کے دامن کو عطر بیز کر دیا۔ خصوصی طور سے غزل اور نعت کی شاعری میں اضافے سے بڑے بڑے کہنہ مشق استاد شاعروں کو اپنے آگے جبیں خم کرنے پر مجبور کر دیا۔ واضح رہے کہ ڈی سی بہرائچ کے ڈاکٹر سعید رحمانی، مشہور و مقبول شاعر و ناظم مشاعرہ مرحوم جمال آذر اظہار وارثی کے ہی شاگردِ عزیز تھے۔ مرحوم ادبی و شعری خدمات کے باعث ادبی حلقے میں ہمیشہ ذی وقار انداز میں یاد کیے جائیں گے۔

....

● ممتاز صحافی، حقوق انسانی کے علمبردار، سماجی شخصیت، سفارت کار اور سیاستداں **کلدیپ نیر** (پیدائش: ۱۴ر اگست ۱۹۲۳ء مقام: سیالکوٹ، پاکستان) کا انتقال ۲۳ر اگست ۲۰۱۸ء کی رات ہو گیا۔ آخری رسومات دوسرے روز ۲۴ر اگست ۲۰۱۸ء دوپہر بعد تقریباً ایک بجے لودھی روڈ شمشان گھاٹ میں ادا کی گئیں۔ وہ کافی دنوں سے علیل اور اسپتال میں زیر علاج تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۲ ربیٹے ہیں۔ درجنوں اہم سیاسی، ملی، ادبی و علمی شخصیات نے آنجہانی کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور ان کے انتقال کو غیر معمولی نقصان قرار دیا ہے۔ کلدیپ نیر نے بی اے (آنرز) کرسچین کالج فارمین لاہور سے اور ایل ایل بی لا ء کالج لاہور سے اسناد لیں۔ پھر ۱۹۵۲ء میں، نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے میڈل Medill اسکول سے ایک اسکالرشپ پر صحافت کی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے ۸۰ر اخبارات کے لئے کالم لکھے۔ کلدیپ نیر نے پاکستان سے ہجرت کے بعد ۱۹۴۷ء میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز پرانی دہلی کے بلی ماران سے شائع ہونے والے ایک اردو روزنامہ 'انجام' سے کیا تھا۔ آنجہانی متعدد اردو، انگریزی اخبارات اور رسائل کے سرپرست و نگراں تھے۔ اپنے آخری وقت تک انگریزی اور اردو اخبارات میں ہفتہ وار کالم لکھتے رہے۔ 'اردو صحافت' سے 'جرنلزم' کی دنیا میں قدم رکھنے والے کلدیپ نیر ایک ایسے سیاسی تجزیہ نگار بنے کہ ان کے کالم "Between the lines" کے ترجمے ہندی اور اردو کے علاوہ بے شمار علاقائی زبانوں کے اخبارات میں چھپتے رہے۔ پاکستانی انگریزی اخبار 'ڈان' کے لئے کام کیا۔ دہلی میں The statesman کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر بنائے گئے۔ 'لندن ٹائمز' میں ۲۵ ر برس تک نامہ نگار رہے۔ ان کو میدان صحافت میں گراں قدر خدمات انجام دینے کی وجہ سے کئی ملکی و غیر ملکی ایوارڈوں سے بھی نوازا گیا تھا۔ لال بہادر شاستری اور یوپی کے پہلے وزیر اعلیٰ گووند بلبھ پنت کی وزارت داخلہ میں انفارمیشن آفیسر رہے۔ وی پی سنگھ وزیر اعظم بنے تو کلدیپ نیر کو ۱۹۹۰ء میں U.K میں ہندوستان کا ہائی کمشنر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۹۶ء میں ہندوستانی کی طرف سے اقوام متحدہ کے رکن بھی رہے۔

۱۹۹۷ء میں انھیں راجیہ سبھا کا رکن نامزد کیا گیا۔ ایمرجنسی کے دوران کلدیپ نیر نے جب پریس سنسر شپ کے خلاف آواز اٹھائی تو MISA کے تحت انہیں گرفتار کیا گیا۔ انہوں نے ہمیشہ حق کی آواز بلند کی اور حکومتوں کی غلط پالیسیوں کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھاتے رہے۔ ان کی آپ بیتی ''ایک زندگی نا کافی'' اردو میں شائع ہوئی تھی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں ''بیونڈ دی لائن: این آٹو بایوگرافی'' ایک عمدہ سوانح عمری ہے۔

....

● معروف افسانہ نگار، ادیب، شاعر اور صحافی **پروفیسر سیّد منظر امام** (سابق صدر شعبۂ اردو، گرونانک کالج دھنباد، جھارکھنڈ ولادت: ۱۰ راگست ۱۹۳۸ء مقیم فاطمہ ہاؤس، واسع پور، دھنباد) کا ۲۴ راگست ۲۰۱۸ء بروز جمعہ بوقت ۷ ربجے شام حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ ۲۵ راگست ۲۰۱۸ء کو بعد نمازِ عصر تدفین شمشیر نگر قبرستان میں عمل میں آئی جہاں خویش واقارب کے علاوہ سینکڑوں کی تعداد میں ان کے شاگرد اور معززینِ شہر نے شرکت کی اور مرحوم کو نم آنکھوں سے سپردِ خاک کیا۔ جنازہ کی نماز مولانا نوشاد عالم ندوی نے پڑھائی۔ ۲۶ راگست کو صبح سات بجے مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لئے رہائش گاہ پر قرآن خوانی ہوئی اور دس بجے دعا کی گئی۔ ان کی رحلت سے بہار و جھارکھنڈ کا ادبی حلقہ سوگوار ہے۔ مرحوم کی جائے ولادت دربھنگہ (بہار) اور جائے عمل دھنباد (جھارکھنڈ) تھی۔ وہ 'امیر منزل'، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ کے آخری ستون تھے۔ ان کے دو بڑے بھائی جناب حسن امام درد اور جناب مظہر امام پہلے ہی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کی رحلت پر تعزیت پیش کرتے ہوئے ان کے خویش ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا) نے کہا کہ ''پروفیسر مرحوم اگست ۱۹۹۹ء میں گرونانک کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ادبی سرگرمیوں میں منہمک ہو گئے تھے۔ انھوں نے کئی نسلوں کی علمی و ادبی آبیاری کی اور شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ پیچھے چھوڑ گئے۔ ان کے اندازِ گفتگو اور طرزِ تکلم نیز سلیقگی اور نفاست و زبان دانی کی نئی نسل قائل تھی۔ پروفیسر مرحوم کی رحلت کے بعد دھنباد شہر اور دربھنگہ جیسی جگہ میں صفِ ماتم کا صحیح منظر نظر آیا اور اندازہ ہوا کہ وہ عوام و خواص میں کتنے مقبول تھے۔ سادگی کی زندگی جینے والے سیّد منظر امام مفہوم انگیز شخصیت کے مالک تھے، جن کی سیرت میں صورت نظر آتی تھی۔ درس و تدریس کی وجہ سے وہ اردو کے فروغ میں ساری زندگی منہمک رہے۔ ادیب اور افسانہ نگار کی حیثیت سے عصری تقاضوں کو پورا کرتے رہے۔ فلموں سے بھی انھیں خاصی دلچسپی تھی۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء کے اوائل میں دربھنگہ سے ''رفتارِ نو'' کا اجراء کیا جس کے پانچ شمارے تواتر سے شائع ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں 'ٹسکو' جمشید پور میں ملازم ہو گئے۔ وہاں اپنے دوست اور معروف افسانہ نگار منظر کاظمی مرحوم (سابق پرنسپل، کریم سٹی کالج، جمشید پور) کے اشتراک سے چینی جارحیت کے خلاف لکھے گئے نمائندہ افسانوں کا انتخاب ''ہمالہ کے آنسو'' ترتیب دیا۔ ۱۹۷۳ء میں ایک خوب صورت رسالہ ''ترسیل'' کا جمشید پور سے اجراء کیا۔ ۱۹۷۶ء میں موصوف دھنباد آگئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ۲۰۰۰ء میں دھنباد سے سہ ماہی ''وقت'' نکالا جس کے آٹھ شمارے منظر عام پر آئے۔ ان میں سیّد امین اشرف، محمد سالم، سیّد احمد شمیم، اسلم بدر، علیم صبا نویدی وغیرہ پر خصوصی گوشے اہم ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں شائع ہونے والے اردو جریدہ ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ میں ان کی خودنوشت ''دربھنگہ دل

سے جاتی ہی نہیں یاد تری'' قسط وار شائع ہوتی رہی۔ اس کے حسنِ بیان اور الفاظ کی سحر کاری پر مشاہیر ادب اپنے مکتوبات میں رطب اللسان رہے۔ سیّد منظر امام نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی شخصیت، ان کی اہلیت اور ان کی بصیرت کا احاطہ کرتی ہے۔ دنیائے شعروادب میں کئی فن کار ایسے ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنی طویل عمر میں بہت کم لکھا لیکن شہرت دوام پائی۔ ان کا ایک مقبول شعر جو ان کی حیات ووفات کی ترجمانی کرتا ہے، یوں ہے:

جب تک جیئے مسیح کئی تھے مرے قریب　　مرنے لگے تو پاس کوئی چارہ گر نہ تھا

نوجوان قلم کار احمد معراج (معراج الدین خاں) پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی سے ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی کے زیرِ نگرانی بعنوان ''سیّد منظر امام: شخصیت اور ادبی کارگزاریاں'' پی ایچ ڈی کا مقالہ داخل کر چکے ہیں۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ ڈاکٹر شاہینہ امام (سابق ہیڈ مسٹریس، ملت گرلس ہائی اسکول، دھنباد)، اکلوتی بیٹی ڈاکٹر زہرا شمائل، دو بیٹے راشد امام اور خالد امام کے علاوہ کئی نواسے، نواسیاں اور پوتے، پوتیاں ہیں۔ تعزیت کرنے والوں میں ۲۸۳ افراد نے فیس بک پر اظہارِ افسوس کیا۔ جنازہ میں پروفیسر سیّد احمد شمیم، انجینئر انور امام، ڈاکٹر منظر حسنین، پروفیسر اختر حسنین، اطہر داؤدی، ڈاکٹر امام اعظم، سہیل احمد احسانی، محمد شکیل، شارب حسن، ڈاکٹر سروش جمیل، فضا امام وغیرہ کے علاوہ نجم عثمانی، شان بھارتی، احمد فرمان، ڈاکٹر سیّد معصوم عالم، ڈاکٹر سیف اللہ خالد، ڈاکٹر عبدالرحمن عبد، ڈاکٹر اقبال حسین، ڈاکٹر شمیم احمد، سیّد سرور حسین، ڈاکٹر موصوف احمد (صدر، شعبۂ اردو، پی کے رائے کالج، دھنباد)، طیب خان، قمر العارفین، ڈاکٹر حسن نظامی، امتیاز دانش، طیب خان وغیرہ شریک تھے۔ مرحوم کے گہرے دوست محمد سالم (امریکہ)، ڈاکٹر مظفر مہدی (امریکہ)، پروفیسر شاکر خلیق، نیاز احمد (سابق اے ڈی ایم)، انجینئر محمد صالح، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، آئی آر سَل ایڈوکیٹ، ڈاکٹر عالمگیر شبنم، ڈاکٹر ایم صلاح الدین، نسیم محمد جان، سیّد محمود احمد کریمی، ابواللیث جاوید، پروفیسر رئیس انور، پروفیسر ایم نہال، حیدر وارثی، سیّد محمد جمیل، عبدالعزیز، ایم اے صارم، قمر الہدیٰ، شہیر امام (ساؤتھ افریقہ)، اختر کاظمی، ڈاکٹر قاسم فریدی، شمیم قاسمی، ڈاکٹر مشتاق احمد (پرنسپل سی ایم کالج)، سیّد شاہد اقبال، ڈاکٹر سرور کریم، شکیل احمد سلفی، محمد آفتاب عالم، ڈاکٹر آفتاب اشرف، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر سیّد محمد احتشام الدین، ڈاکٹر جمال اویسی، آچاریہ جمال احمد جمال ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، معین الدین جہانگیر، سیّد متین اشرف، ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، ڈاکٹر عشرت بیتاب، سیّد ایاز احمد روہوی، راحیل شاداب، شاہد اقبال، احمد معراج، ڈاکٹر سیّد ندیم کمال، انجینئر سیّد ظفر اسلام ہاشمی، سیّد خرم شہاب الدین، سروش احسانی، احمر امام، ڈاکٹر نوا امام وغیرہ نے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ اور تمثیل نو کنبہ کے اراکین نے بھی ان کی رحلت پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم بے حد خلیق اور ملنسار تھے۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین۔

پروفیسر سیّد منظر امام مرحوم کی رسم چہلم ۳۰ رستمبر ۲۰۱۸ء کو فاطمہ ہاؤس، واسع پور، دھنباد میں ادا کی گئی۔ اس موقع پر میلاد شریف کی محفل بھی منعقد ہوئی جس سے مولانا افروز (خطیب، خیر النساء مسجد آزاد نگر، دھنباد) اور مولانا سرفراز (خطیب، نئی مسجد، واسع پور، دھنباد) نے خطاب فرمایا اور مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے منعقد کی جانے

والی محفلوں کی اہمیت کو بیان کیا۔ حافظ وسیم دستگیر نے نعت پاک پیش کی۔ اس سے قبل صبح میں مدرسہ تبلیغیہ (رحمت گنج، واسع پور، دھنباد) کے طلبا اور اہلِ خانہ نے قرآن خوانی بھی کی۔ اس موقع پر مرحوم کے اعزا و اقربا، احباب اور شاگردان بھی کثیر تعداد میں موجود تھے جن میں نجم عثمانی، ڈاکٹر منظر حسنین، پروفیسر اختر حسنین، شکیل احمد، ڈاکٹر ارشد رضا، ڈاکٹر امام اعظم، شارب حسن، فیض احمد خان، علی ناصر سلمان، ڈاکٹر معصوم عالم، ڈاکٹر سیف اللہ خالد، احمد فرمان، ڈاکٹر فیاض جہانگیر، ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد، ڈاکٹر اقبال حسین، ڈاکٹر موصوف احمد، ڈاکٹر حسن نظامی، امتیاز بن عزیز، سہیل احمد احسانی، راشد امام، خالد امام، سرفراز احمد احسانی، امتیاز دانش، تنویر احمد، ڈاکٹر عاصم ظفر، غلام مصطفےٰ، جلیل انصاری، راحت حسین، فضا امام وغیرہ شامل تھے۔ دن میں غربا و مساکین کو کھانا بھی کھلایا گیا۔ اس کے علاوہ ان کے عزیز جناب علی ناصر سلمان (ڈپٹی جنرل منیجر، بھارت پٹرولیم کارپوریشن، کرور، تمل ناڈو) جو چند ماہ کے لیے ان کے ساتھ رہے، بطورِ خاص اس رسم چہلم میں شرکت کی غرض سے دھنباد تشریف لائے۔ انھوں نے مرحوم کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ دھنباد، خصوصاً واسع پور میں علم و ادب کے فروغ دینے میں جو کردار ادا کیا تھا، اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

....

● ماہنامہ 'سخنور' کناڈا کے مدیر، کئی کتابوں کے مرتب **افضل امام** (عمر تقریباً ۶۷ سال) کا انتقال ۳؍ستمبر ۲۰۱۸ء کو صبح ۳؍بجے ٹورنٹو، کناڈا کے اسپتال میں ہوگیا۔ تدفین بعد نماز ظہر ٹورنٹو میں ہی کی گئی۔ انوار الہدیٰ (ناظم اردو کونسل ہند) کے بموجب وہ ہندوستان آئے ہوئے تھے اور یہیں ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس کے بعد وہ کناڈا چلے گئے۔ مرحوم کناڈا میں رہ کر بھی ہندوستان کو کبھی نہیں بھولے اور ٹورنٹو میں ہندوستان بسا رکھا تھا۔

....

● معروف شاعر و نغمہ نگار **قیصر صدیقی** سمستی پوری (تاریخی نام: افتخار احمد پیدائش: ۱۹؍مارچ ۱۹۳۷ء) کا انتقال ۴؍ستمبر ۲۰۱۸ء کو شہر کے ایک پرائیوٹ اسپتال میں تقریباً ۷:۱۵؍بجے ہوگیا۔ نماز جنازہ مرحوم کے بھتیجے حافظ تحسین احمد نے پڑھائی۔ تجہیز و تکفین ۵؍ستمبر کو بعد نماز ظہر سمستی پور میں ان کے آبائی گاؤں قیصر آباد، نوادہ میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کی غزل گوئی کا خاص وصف تھا کہ وہ سادہ لفظوں کا سہارا لے کر اسے معتبر بنا دیتے تھے اور ہر خاص و عام آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ ان کی مشہور قوالی "اپنے ماں باپ کا تو دل نہ دکھا" اور "مسلمانو! سنبھل جاؤ قیامت آنے والی ہے" کافی مشہور ہوئی۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جس میں "صحیفہ" (شعری مجموعہ، ۱۹۸۳ء)، "روشنی کی بات" (حمد و نعت کا مجموعہ)، "ڈوبتے سورج کا منظر" (غزلوں کا مجموعہ)، "سجدہ گاہِ فلک"، "یہ انجمن دل ہے"، "اجنبی خواب کا چہرہ" شامل ہیں۔ ان کی ایک نظم "عورت" ادبی دنیا میں بیحد مقبول ہوئی۔ ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر (شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی) نے "قیصر صدیقی: فنی جہات اور فکری امکانات" ترتیب دی ہے۔

....

● **مولانا طاہر حسین قاسمی** (عمر ۶۱؍سال) کا طویل علالت کے بعد ۱۲؍ستمبر ۲۰۱۸ء (بدھ) کی دوپہر انتقال ہوگیا۔

مولانا تقریباً ۶ر مہینے سے مہلک مرض میں مبتلا تھے۔ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۵ر بیٹے اور ۶ بیٹیاں ہیں۔ جنازے کی نماز ۱۳ر ستمبر ۲۰۱۸ء کو ان کے آبائی گاؤں دوگھرا ضلع دربھنگہ میں بعد نماز ظہر ادا کی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔مرحوم ۲۵ر دسمبر ۱۹۷۵ء سے ۳۱ر اکتوبر ۲۰۱۷ء تک مدرسہ اسلامیہ شاہ پور بگھونی ضلع سمستی پور میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز تھے اور اس علاقہ کو اپنے علم سے روشن کیا۔

....

● معروف افسانہ نگار، انشائیہ نگار، نقاد اور مترجم **سلیم آغا قزلباش** طویل علالت کے بعد ۴ر اکتوبر ۲۰۱۸ء کی دوپہر انتقال کر گئے۔وہ پھیپھڑوں کے کینسر میں مبتلا تھے۔انہیں علاج کے لئے لاہور لایا گیا تھا۔اسی روز رات ساڑھے ۹ر بجے کے قریب ان کے آبائی قصبے وزیر کوٹ جوان کے دادا نے آباد کیا تھا، سپرد خاک کئے گئے۔وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے،ان کے انشائیوں میں (سرگوشیاں اور آمنا سامنا)،افسانوں میں (انگور کی بیل اور صبح ہونے تک)، زخموں کے پرندے (نثری نظمیں)،مغرب کے انشائیے (تراجم)،جدید اردو افسانے کے رجحانات (تحقیق) اور اس کے علاوہ انہوں نے منتخب انشائیے اور نئے انشائیے کا انتخاب بھی مرتب کیا تھا۔

....

● بے لاگ مبصر اور سابق وزیر **فیاض بھاگلپوری** (ولادت: ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۶ء) کا انتقال ۱۰ر اکتوبر ۲۰۱۸ء کو ہو گیا۔ انھیں بھاگلپور کے چنبیلی چک قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔مرحوم آل انڈیا مسلم یوتھ کے صدر رہ چکے تھے۔۱۹۹۰ء میں جنتادل کے ٹکٹ پر گوڈا ضلع کے مہگاما اسمبلی حلقہ سے کانگریس کے اودھ بہاری سنگھ کو شکست دے کر انتخاب میں کامیاب ہوئے تھے۔مرحوم کو حکومت بہار کے محکمہ پارلیمانی امور، انکم ویسل ٹیکس اور راشٹریہ بچت کا وزیر بھی بنایا گیا تھا۔

....

● بزرگ ادیب و شاعر **پروفیسر حافظ محمد طاہر علی** (عمر تقریباً ۸۷ر سال سابق صدر، شعبۂ عربی، فارسی، اردو اور مطالعات اسلامی، وشوا بھارتی یونیورسٹی شانتی نکیتن) کا حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب ۱۴ر اکتوبر ۲۰۱۸ء کی شب انتقال ہو گیا۔وہ کئی دنوں سے بیمار تھے۔سبک دوشی کے بعد اپنی بیٹی کی رہائش گاہ پر مقیم تھے کہ دل کا دورہ پڑا۔جنازے کی نماز دوسرے روز ۱۵ر اکتوبر کو بنیا پوکھر تھانہ والی مسجد میں بعد نماز مغرب ادا کی گئی اور تدفین ایک نمبر گوبرا قبرستان میں عمل میں آئی۔پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہیں۔

....

● معروف شاعر **مظفر مجاز** (اصل نام: سیّد غلام حسین رضوی، ولادت: ۱۳ر فروری ۱۹۳۵ء بمقام حیدرآباد) کا ۱۹ر اکتوبر ۲۰۱۸ء کی شب انتقال ہو گیا۔پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۴ر بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔انھیں ماہر اقبالیات بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ان کے تین شعری مجموعے ''موسم سنگ''، ''ایک سخنور کے ساتھ'' اور ''نقش ہائے رنگ رنگ'' نیز ایک کلیات ''طلسم مجاز'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔وہ روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد سے وابستہ تھے اور اس کا ادبی صفحہ ایڈٹ کرتے تھے، جو ادبی حلقوں میں کافی پسند کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔انھیں متعدد انعامات بھی ملے، جن

میں ''غالب ایوارڈ'' بھی شامل ہیں۔ مرحوم سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے۔ ۱۹۹۳ء میں ڈپٹی رجسٹرار کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔

....

● ممتاز افسانہ نگار اور شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق استاذ پروفیسر **قاضی عبدالستار** (پیدائش: ۸/فروری ۱۹۳۳ء، مقام: مچھریٹہ، سیتاپور، یوپی) کا مختصر علالت کے بعد ۲۹/اکتوبر ۲۰۱۸ء کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ تدفین دہلی میں ہی ہوئی۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۵۰ء میں انٹرمیڈیٹ آر. جی. ڈی کالج سیتاپور سے کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی اے، ایم اے کی ڈگریاں امتیازی نمبروں سے حاصل کیں۔ قاضی صاحب نے ۱۹۵۷ء میں پی ایچ. ڈی. کے لئے 'اردو شاعری میں قنوطیت' کے موضوع پر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ قلم بند کیا۔ وہ ۱۹۵۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے بہ حیثیت لکچرر منسلک ہوگئے تھے، پھر وہ اسی شعبے میں ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبہ ہوکر ۱۴/جولائی ۱۹۹۳ء کو ملازمت سے سبک دوش ہوگئے۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ قاضی عبدالستار کا شمار اپنے عہد کے نمایاں اور ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے کئی اردو ناول تاریخی پس منظر میں تحریر کئے جن میں 'شب گزیدہ'، دارا شکوہ، صلاح الدین ایوبی، خالد بن ولید، غالب مقبول عام ہیں۔ اس کے علاوہ پیتل کا گھنٹہ، شکست کی آواز، بادل، مجو بھیا، غبار شب قابل ذکر ہیں۔ ان کو زبان و بیان پر جو غیر معمولی قدرت حاصل تھی اس کا اندازہ ان کی تحریروں سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ قاضی عبدالستار کو ۱۹۷۴ء میں حکومت ہند نے پدم شری ایوارڈ سے نوازا۔ اس سے قبل ۱۹۷۳ء میں غالب ایوارڈ بھی عطا کیا گیا نیز ۱۹۷۷ء میں میر ایوارڈ، یوپی اردو اکیڈمی ایوارڈ، ۱۹۸۷ء میں عالمی ایوارڈ، ۱۹۹۶ء میں پہلا نشان سرسید ایوارڈ، ۱۹۸۷ء میں حکومت اترپردیش کا راشٹریہ ایوارڈ، ۱۹۹۸ء میں گیا نیندر ایوارڈ، ۲۰۰۲ء میں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، ۲۰۰۵ء میں انٹرنیشنل ایوارڈ (دوحہ، قطر)، ۲۰۰۶ء میں راشٹریہ اقبال ایوارڈ، ۲۰۰۸ء میں یونیورسٹی اردو ٹیچر ایوارڈ، ۲۰۱۱ء میں اترپردیش ہندی سنستھان پرتھم ایوارڈ سے نوازے گئے۔

....

● معروف ترقی پسند ادیبہ، شاعرہ، سماجی کارکن برائے حقوق انسانی و حقوق نسواں **فہمیدہ ریاض** (ولادت: ۲۸/جولائی ۱۹۴۶ء، میرٹھ) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۲۱/نومبر ۲۰۱۸ء کو لاہور میں ہوگیا۔ وہ گذشتہ چند ماہ سے بیمار تھیں۔ ان کے والد ریاض الدین احمد ماہر تعلیم تھے۔ تقسیم کے بعد ان کا خاندان حیدرآباد سندھ میں قیام پذیر ہوا۔ فہمیدہ ریاض نے جمہوریت اور خواتین کے حقوق کے لئے پوری زندگی جدوجہد کی۔ وہ اپنے تانیثی (Feminist) اور غیر روایتی خیالات کے لئے معروف تھیں۔ فہمیدہ ریاض نے زمانہ طالب علمی میں ۱۵ سال کی عمر میں پہلی نظم لکھی جو احمد ندیم قاسمی کے رسالے 'فنون' میں شائع ہوئی۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے نثر اور دیگر تراجم میں بھی اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے شیخ ایاز اور مولانا جلال الدین رومی کی مثنویوں کے کئی تراجم بھی کئے۔ عمر کے آخری حصے میں انہوں نے نثری

تحقیقات پر بھی کام کیا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن کی منیجنگ ڈائریکٹر بھی رہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں گوداوری، خط مرموز اور خانۂ آب وگل ہے۔ خانۂ آب وگل فارسی زبان کی مشہور مثنوی مولانا روم کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۵؍ادبی کتابوں کی مصنفہ کی پوری زندگی تنازعات سے گھری رہی ہے۔ جب ان کا مجموعہ 'بدن دریدہ' منظر عام پر آیا تو ان پر شہوت انگیز اور حساس الفاظ استعمال کرنے کا الزام لگایا گیا۔ انہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائی اور شیخ ایاز کی کتابوں کا سندھی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے محمد ضیاء الحق کے دورِ آمریت سے تنگ آ کر پاکستان سے بھارت میں پناہ لی جہاں انہوں نے کئی برس گزارے۔ ان کا شعری مجموعہ ''اپنا جرم ثابت ہے'' جنرل ضیاء الحق کے ظلم وستم کو بیاں کرتا ہے۔ انہوں نے اس مجموعہ میں اپنا تجربہ بیان کیا ہے۔ فہمیدہ زمانہ طالب علمی سے طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہیں، ایوب خان کے زمانے میں طلبہ یونین پر پابندی کے خلاف لکھتی رہیں جبکہ جنرل ضیاالحق کے دور میں حکومتی پالیسیوں پر تنقید کے جرم میں ان پر ۱۴؍مقدمات قائم ہوئے۔ صدر ضیاء الحق نے ان کو جبری جلاوطن کردیا تو ہندوستان چلی آئیں اور پھر جنرل ضیاء الحق کے انتقال کے بعد ہی پاکستان واپس گئیں۔ ۲۲؍سال کی عمر میں فہمیدہ ریاض کا پہلا شعری مجموعہ 'پتھر کی زبان' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا، ان کا دوسرا مجموعہ 'بدن دریدہ' ۱۹۷۳ء میں ان کی شادی کے بعد انگلینڈ کے زمانہ قیام میں شائع ہوا جب کہ تیسرا مجموعہ کلام 'دھوپ' تھا۔ سال ۲۰۱۰ء میں انہیں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی اور ستارہ امتیاز سے نوازا گیا جبکہ ۲۰۱۷ء میں ہیومن رائٹس واچ کی جانب سے ہیمت ہیلمن ایوارڈ برائے ادب، ۲۰۰۵ء میں المفتاح ایوارڈ برائے ادب وشاعری حاصل کیا۔

....

● جناب **محمد جلیل پاشا** (سابق صدر نشیں اردو اکیڈمی آندھرا پردیش وصدر کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی عمر: تقریباً ۷۱ سال) کا انتقال ۲۵؍نومبر ۲۰۱۸ء کی شب حیدرآباد کے ایک پرائیوٹ اسپتال میں ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی آسیہ جلیل (اسسٹنٹ پروفیسر مانو، حیدرآباد) شامل ہیں۔ حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مرحوم کی کوششوں کا بڑا دخل رہا نیز ایم جی ایم نامپلی گرلز ہائی اسکول میں اندرا پریہ درشنی کالج کا قیام بھی ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ وہ اس کیمپس میں طالبات کے لئے یونیورسٹی کے قیام کے خواہشمند بھی تھے۔

....

● معروف بالی ووڈ گلوکار **محمد عزیز** (اصل نام: عزیز النبی، عرف منا پیدائش: ۲؍جولائی ۱۹۵۴ء، اشوک نگر) کا انتقال ممبئی کے ناناوتی اسپتال میں ۲۷؍نومبر ۲۰۱۸ء کو ہوگیا۔ گزشتہ ایک ہفتہ سے ایک پروگرام کے لئے کولکاتا میں مقیم محمد عزیز جب بذریعہ طیارہ ممبئی پہنچے تو ہوائی اڈہ پر ہی اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔ انھیں فوری طور پر ناناوتی اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد انہیں مردہ قرار دیا۔ ۲۸؍نومبر کو ممبئی میں ہی ان کی تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ بیٹی ثنا جو خود بھی ایک بہترین گلوکارہ ہیں اور بیٹا ظہیب ہیں۔ مرحوم نے سُروں کے شہنشاہ محمد رفیع کے بعد ۸۰؍کی دہائی سے اپنی مسحور آواز سے لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ دس برسوں سے زائد عرصہ تک انہوں نے بالی ووڈ پر حکمرانی کی۔ مرحوم تین بھائی اور چار بہنوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔ مرحوم کی موت کے

بعدان کی رہائش گاہ واقع شاہ امان لین، خضر پور، کولکاتا میں تعزیت کرنے کیلئے لوگوں کا ہجوم امنڈ پڑا۔ بچپن سے ہی محمد عزیز محلّہ فنکشن میں محمد رفیع کی آواز میں گانا گا کر لوگوں سے داد و تحسین حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے بنگلہ فلم 'جیوتی' سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ پھر ۱۹۸۴ء میں ممبئی چلے گئے جہاں انہوں نے ہندی فلم 'امبر' میں گیت گائے۔ وہاں ان کی ملاقات انو ملک سے ہوئی اور انہوں نے 'مرد' فلم میں گانے کا موقع دیا۔ امیتابھ بچن پر فلمایا گیا نغمہ 'مرد تانگے والا' بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بعد تو انہوں نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ مرد، پجارن، آدمی کھلونا ہے، لو-۸۶، لال ڈوپٹہ ململ کا، پاپی دیوتا، ظلم کو جلا دوں گا، پتھر کے انسان، بیوی ہو تو ایسی، برسات کی رات جیسی فلموں میں گانے گائے۔ اڑیہ اور بنگالی فلموں میں بھی انہوں نے نغمے گائے۔ کلیان جی آنند جی، لکشمی کانت پیارے لال، آر ڈی برمن، بپی لہری، راجیش روشن، رویندر جین، جتن للت جیسے موسیقاروں کے ساتھ انہوں نے کام کیا۔ اڑیہ زبان میں بھجن کا البم بے حد مقبول ہوا۔ امیتابھ بچن کے علاوہ متھن چکرورتی، رشی کپور، گووندا جیسے اداکاروں کو اپنی آواز دی۔ انورادھا پوڈوال کے ساتھ ان کی جوڑی کافی مشہور ہوئی تھی۔

....

● معروف ادیب اور صحافی ڈاکٹر سیّد حسن مثنیٰ (سابق صدر، شعبۂ اردو، رانچی کالج، جھارکھنڈ) کا ۲۷ر نومبر ۲۰۱۸ء کو طویل علالت کے بعد لکھنؤ کے ایرا میڈیکل کالج ہسپتال میں بوقت صبح انتقال ہوگیا۔ آپ طویل عرصہ سے گردوں کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ ان کا جسدِ خاکی لکھنؤ سے آبائی گاؤں گوپال پور، ضلع سیوان (بہار) لایا گیا جہاں دوسرے روز ۲۸ر نومبر کو انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۳ر بیٹے ہیں۔ ''ریڈیو نشریات''، ''چودھری سبط محمد نقوی''، ''مجتبیٰ حسین اور فنِ مزاح نگاری''، ''انیس کا شعور فن''، ''شارب ردولوی''، ''انیس اور انیس شناسی'' اور ''دیویندر ستیارتھی'' ان کی اہم کتابوں میں شامل ہیں۔

....

● سابق امریکی صدر جارج ایچ ڈبلیو بش (جارج بش سینئر، پورا نام: جارج ہربرٹ واکر بش۔ پیدائش: ۱۲ر جون ۱۹۲۴ء، ملٹن، میساچوسٹس، امریکہ) کا انتقال ۳۰ر نومبر ۲۰۱۸ء کی شام کو ہیوسٹن، ٹیکسا، امریکہ میں ہوگیا۔ وہ اعصابی بیماری پارکنسن میں مبتلا تھے۔ پسماندگان میں بیٹے جارج ڈبلیو بش، جیب بش، روبین بش، نیل بش، دوروتی بش کوتش، مارفین بوش ہیں۔ جارج بش سینئر دوسری جنگ عظیم کے پائلٹوں میں شامل تھے۔ ۱۹۵۴ء میں ریپبلکن کی جانب سے سیاست میں اترنے سے قبل وہ ٹیکساس میں تیل اور پیٹرول کے بڑے تاجر تھے۔ واضح رہے کہ جارج بش سینئر امریکہ کے ۴۱ویں صدر (۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۳ء تک) رہ چکے ہیں۔ ان کے صاحب زادے جارج ڈبلیو بش نے بھی ۴۳ویں امریکی صدر کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھائیں۔ بش سینئر اس سے قبل صدر رونالڈ ریگن کے نائب بھی رہ چکے تھے۔ ۱۷ر اپریل ۲۰۱۸ء کو جارج بش سینئر کی اہلیہ باربرا بش کا بھی انتقال ہوا تھا۔ ان کے دورِ صدارت کو ان کی خارجہ پالیسی کے لیے یاد کیا جاتا ہے جب مشرقی یورپ میں کمیونزم کا خاتمہ ہو رہا تھا، روس ٹوٹ رہا تھا اور امریکہ دنیا کے واحد سپر پاور کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ ان کی پالیسیوں نے امریکہ پر دنیا کے اعتماد کو بحال کیا اور ویتنام کی

جنگ کا بھوت خاموش کر دیا گیا لیکن ان پر گھریلو امور کو نظر انداز کرنے کا الزام لگایا گیا اور انھیں ۱۹۹۲ میں بل کلنٹن نے صدارتی انتخابات میں شکست دی۔ ۱۹۶۶ء میں انھوں نے ایوانِ نمائندگان میں سیٹ حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء میں صدر رچرڈ نکسن نے انھیں اقوام متحدہ کا سفیر مقرر کیا۔ ۱۹۷۴ء میں بیجنگ میں قائم نئے مشن کی سربراہی کی۔ ۱۹۷۶ء میں جیرالڈ فورڈ نے انھیں سی آئی اے کا ڈائریکٹر بنایا۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۹ء کے درمیان رونالڈ ریگن کے نائب صدر رہے۔ ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۳ء کے درمیان امریکہ کے صدر رہے اور خلیجی جنگ میں امریکہ کی قیادت کی۔

● ممتاز عالم دین، قومی رہنما، ممبر لوک سبھا **مولانا اسرار الحق قاسمی** (ولادت: ۱۵ر فروری ۱۹۴۲ء، کشن گنج، بہار) ۷ر دسمبر ۲۰۱۸ء کی صبح ساڑھے ۳ر بجے دل کا دورہ پڑنے سے کشن گنج میں انتقال کر گئے۔ نماز جنازہ آبائی وطن تاراباری، کشن گنج میں ملّی گرلس اسکول کے احاطے میں ادا کی گئی اور آبائی گاؤں ٹپو کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ہزاروں افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ انھوں نے ۵۰ر سال قوم اور ملت کی علمی، دینی، سماجی اور رفاہی خدمات میں گزارے۔ ہندوستان کی معروف دینی و سیاسی و سماجی جماعتوں کے رہنماؤں نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ایک طرف تعلیمی، ملّی فاؤنڈیشن کے بانی سربراہ اور دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ کی حیثیت سے مختلف پیمانوں پر اہم تعلیمی خدمات انجام دیں اور دوسری جانب آل انڈیا ملی کونسل کے نائب صدر اور آل انڈین مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن کی حیثیت سے ملت کی رہنمائی کی۔ مولانا نے تعلیمی مشن کے دوران ۱۶۵ر پرائمری تعلیمی ادارے قائم کئے۔ کشن گنج میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سینٹر قائم کرایا جو ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

● معروف مورخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر اور نیشنل آرکائیوز کے سابق ڈائریکٹر جنرل پدم شری **پروفیسر مشیر الحسن** (پیدائش: ۱۵ر اگست ۱۹۴۹ء، بلاس پور) کا انتقال ۱۰ر دسمبر ۲۰۱۸ء کی صبح دہلی میں ان کی رہائش گاہ پر ہو گیا۔ پروفیسر حسن کافی دنوں سے علیل تھے۔ باب العلم مسجد اوکھلا میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ پسماندگان میں بیوہ پروفیسر زویا حسن ہیں جو جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں سیاسیات کی استاذ ہیں۔ تدفین کے موقع پر مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے افراد بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں سابق نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری، دہلی کے سابق لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر شاہد مہدی اور موجودہ وی سی شاہد احمد کے علاوہ دہلی یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے کئی اہم اساتذہ اور دانشور موجود تھے۔ وہ تقریباً ۳۰ر سال تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے، بعد میں وہ اسی یونیورسٹی میں ۲۰۰۴ء سے ۲۰۰۹ء تک وائس چانسلر کی حیثیت سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنی مدت کار کے دوران یونیورسٹی کو ایک نئی شناخت دلائی۔ مئی ۲۰۱۰ء میں وہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ ۲۰۰۷ء میں وہ پدم شری کے اعزاز سے بھی سرفراز کیے گئے۔ پروفیسر

مشیر الحسن نے تقسیم ہند اور جنوبی ایشیا میں اسلام کی تاریخ پر قابل قدر کام کیا ہے۔انہوں نے ۵۰؍سے زائد کتابیں تصنیف کیں جن میں نیشنلزم اینڈ کمیونل پالیٹکس ان انڈیا ۱۸۸۵-۱۹۳۰، دی لیگیسی آف اے ڈیوائڈیڈ نیشن: انڈیاز مسلم سنس انڈی پینڈنس اہم ہیں۔۲۰۰۵ میں پروفیسر مشیر الحسن کی ایک کتاب A Moral Reckoning اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی سے شائع ہوئی تھی جس کا اردو ایڈیشن انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۲۰۰۶ میں 'دہلی کے مسلمان دانش ور (انیسویں صدی میں)' کے نام سے شائع کیا۔مرحوم نے پی ایچ ڈی کی ڈگری انگلینڈ کی کیمبرج یونیورسٹی سے حاصل کی۔ان کی پی ایچ ڈی تھیسس ''ہندوستان میں قومیت اور فرقہ پرستی پرمبنی سیاست'' کافی مشہور ہوئی اور جب اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا تو اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اس کے علاوہ تقسیم ہند پر ان کے تحقیقی عمل کو دنیا بھر کے دانشوروں نے بڑے پیانے پر تسلیم کیا۔

....

● مغربی بنگال اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر اور سابق آئی پی ایس افسر **حیدر عزیز صفوی** (ولادت: ۲۶؍فروری ۱۹۴۵ء) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۱۲؍دسمبر ۲۰۱۸ء کو ہوگیا۔وہ ضیق النفس اور دیگر مرض میں مبتلا تھے۔وہ سالٹ لیک کے ایک پرائیوٹ اسپتال بیل ویوکلینک میں زیر علاج تھے۔تدفین گوبرا قبرستان میں عمل میں آئی۔پسماندگان میں بیوہ فاطمہ صفوی کے علاوہ دو بیٹے احمد عزیز صفوی (مرحوم)، حامد عزیز صفوی اور ایک بیٹی ثمینہ عدنان ظہیر ہیں۔مرحوم ۲۰۱۱ء اور ۲۰۱۶ء میں ترنمول کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لئے الوبیڑیا (مشرق) سے ایم ایل اے منتخب ہوئے تھے۔ مرحوم انتہائی شریف النفس انسان تھے۔

....

● جناب **فہیم انور** (سابق چیئرمین جھارکھنڈ اسٹیٹ وقف بورڈ، خلف: جناب عبدالحکیم) کا انتقال ۷؍دسمبر ۲۰۱۸ء کی شب حرکت قلب بند ہوجانے سے ہوگیا۔۱۹؍دسمبر کو بعد نماز ظہر دھتکیڈیہہ مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور دھتکیڈیہہ قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔مرحوم بے حد منکسر المزاج اور نرم گفتار تھے۔وہ اپنے والد بزرگوار کی طرح ملت اسلامیہ کی تعلیمی سر بلندی کے لئے دن رات کوشاں رہتے تھے۔اخیر وقت تک وہ شہرۂ آفاق الکبیر پالی ٹیکنک (ڈپلومہ انجینئرنگ) کالج کے چیئرمین رہے جہاں سے ہر سال تقریباً ۶۵۰ طلبا و طالبات انجینئر بن کر ملک و بیرون ملک میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔اپنے والد کے قائم کردہ ریاست کے اولین غیر سودی اسلامی بینک، مسلم فنڈ معروف مسلم لائبریری، کبیر میموریل کالج، کبیر ویمنس ڈگری کالج اور جھارکھنڈ و ریاست بہار کے درجنوں اسکول، کالج، مدارس اسلامیہ سمیت جمعیۃ العلماء ہند، امارت شرعیہ مسلم پرسنل لا بورڈ وغیرہ سے وابستہ تھے۔ان خدمات کے اعتراف میں ریاستی حکومت نے انہیں جھارکھنڈ اسٹیٹ وقف بورڈ کے عہدہ جمیلہ پر فائز کیا تھا۔ان کا انتقال امارت شرعیہ کے لئے ایک دل خراش سانحہ ہے۔ملت اسلامیہ کی سر بلندی کے لئے انہوں نے جو خدمات انجام دیں اس کے لئے ملت اسلامیہ تا ابد احسان مند رہے گی۔

....

● ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے پی جی شعبۂ اردو کی سبکدوش صدر **پروفیسر جمیلہ خاتون** (ولادت: ۴؍جولائی ۱۹۴۸ء، مقیم محلّہ اسماعیل گنج، لہریا سرائے، دربھنگہ) کا انتقال ۲۱؍دسمبر ۲۰۱۸ء (جمعہ) کو ہو گیا۔ اسی روز بعد نماز مغرب مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے کے احاطہ میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور مقامی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مرحومہ ۲۱؍اکتوبر ۲۰۱۰ء کو ایل این متھلا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی صدر مقرر ہوئیں اور وہیں سے ۴؍جولائی ۲۰۱۳ء کو سبکدوش ہوئیں۔ مرحومہ کی رحلت سے اردو آبادی، علمی اور ادبی حلقہ سوگوار ہے۔ نہایت خلیق اور ملنسار خاتون تھیں۔ خانوادۂ امیر منزل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ سے بیحد قریب تھیں اور خاکسار کو عزیز رکھتی تھیں۔

....

● معروف بنگالی ادیب اور شاعر **نریندر ناتھ چکرورتی** (ولادت: ۱۹؍اکتوبر ۱۹۲۴ء، فرید پور، ڈھاکہ) کا ۲۵؍دسمبر ۲۰۱۸ء کو کولکاتا کے ایک غیر سرکاری اسپتال میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ وہ مختصر عرصہ سے نمونیا اور امراضِ قلب میں مبتلا تھے۔ اسی روز شام ساڑھے ۷ بجے ان کو نیم تلہ شمشان گھاٹ میں آخری رسومات ادا کی گئیں۔ تعزیت کے لئے ان کی لاش رابندر سدن میں ۴؍بجے سے ۶ بجے شام تک آخری دیدار کے لئے رکھی گئی تھی جہاں سوگواروں نے ان کا دیدار کیا۔ شمشان گھاٹ میں نذرِ آتش کئے جانے سے قبل ان کو بندوق کی سلامی بھی دی گئی۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں سونالی چکرورتی بنرجی، شیولی سرکار اور ایک بیٹا کرشنا روپ چکرورتی شامل ہیں۔ آنجہانی کے والدین ۱۹۳۰ء میں ڈھاکہ سے کولکاتا آ گئے۔ آنجہانی کو ۱۹۷۴ء میں ان کی کتاب "النگا راجہ" (عریاں بادشاہ) کے لئے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تھا جس کا اردو ترجمہ "شاہِ بےلباس" کے نام سے معروف افسانہ نگار شبیر احمد نے ۲۰۰۵ء میں کیا۔ ان کی مشہور نظموں میں "امل کانتی رودور ہوتے چیے چھیلو" (امر کانتی دھوپ بننا چاہتی تھی)، "کولکاتا رجیشو" (کولکاتا کا مسیح) اور "پاہاڑ ریر بچھے" (پہاڑی بچھو) وغیرہ شامل ہیں۔ انہیں ۲۰۱۷ء میں ریاستی سمان یعنی بنگلہ وبھوشن سمان سے بھی نوازا گیا تھا۔ انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ ناول، افسانے اور بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھیں۔ وہ ۱۹۵۱ء سے بنگلہ اخبار 'آنند بازار پتریکا' سے وابستہ تھے اور اس گروپ کے تحت شائع ہونے والے بنگلہ جریدے "آنند میلہ" کے پہلے مدیر بھی تھے۔ ان کی رحلت سے بنگلہ ادب میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے۔

....

● کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر، ممتاز ناقد و شاعر **پروفیسر حامدی کاشمیری** (ولادت ۱۹۳۲ء) کا انتقال ۲۷؍دسمبر ۲۰۱۸ء کو علی الصبح شالیمار، سری نگر میں واقع ان کی رہائش گاہ پر ہو گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا مسعود عالم اور ایک بیٹی صبا حامدی ہیں۔ مرحوم اردو اور کشمیری زبان کے ممتاز شاعر و ادیب تھے۔ آپ نے دونوں زبانوں کی خدمت اور ترویج کے لئے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے تقریباً ۵۰؍کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں جن میں اکتشافی تنقید کی شعریات، معاصر تنقید، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب، جدید کاشر شاعری، شیخ العالم اور شاعری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اردو اور کشمیری زبان و ادب کی خدمات کے تئیں انہیں غالب ایوارڈ

اور سال ۲۰۰۵ء میں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا نیز حکومت ہند نے ۲۰۱۰ء میں ملک کے تیسرے بڑے شہری اعزاز "پدم شری" سے بھی سرفراز کیا۔ ان کی رحلت پر علمی وادبی دبستان کو نا قابل تلافی نقصان ہوا ہے۔

....

● ممتاز نقاد، محقق، افسانہ نگار اور ادیب **ڈاکٹر سلیم اختر** (ولادت: ۱۱ر مارچ ۱۹۳۴ء، لاہور) کا ۳۰ر دسمبر ۲۰۱۸ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا۔ ان کی نماز جنازہ ۱۰ ر بجے صبح نرسری گراؤنڈ، جہاں زیب بلاک اقبال ٹاؤن میں ادا کی گئی۔ انھیں علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۰۸ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی اعزاز برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔ جامعہ پنجاب سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد شعبۂ تعلیم ہی سے بطور اردو لیکچرار وابستہ ہوئے۔ مختلف ادبی رسالوں کے ساتھ بھی منسلک رہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب 'اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ' اردو ادب میں اب تک لکھی گئی تاریخ میں اہم ترین حوالے کے طور پر یاد کی جاتی ہے۔ انھوں نے 'اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ' بھی مرتب کی۔

....

● معروف فلم ہدایت کار **مرنال سین** (پیدائش: ۱۴ر مئی ۱۹۲۳ء، فرید آباد، بنگلہ دیش) کا انتقال ۳۰ دسمبر ۲۰۱۸ء بروز اتوار صبح ۱۰:۳۰ بجے کولکاتا کے جنوبی علاقہ بھوانی پور واقع رہائش گاہ پر دل کا دورہ پڑنے سے ہو گیا۔ وہ طویل عرصہ سے بیمار تھے۔ ان کے انتقال پر صدر جمہوریہ ہند، رام ناتھ کووند، مغربی بنگال کی وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی، اداکارہ اپرنا سین، معروف اداکار سومتر چٹرجی وغیرہ نے اظہار تعزیت کیا۔ مرنال سین نے ہندی فلم "بھوون شوم" سے لے کر 'کلکتہ' جیسی فلمیں بنا کر سماج کے حقائق کو ناظرین کے سامنے پیش کیا۔ آنجہانی کی ابتدائی تعلیم فرید پور، بنگلہ دیش میں ہوئی۔ اس کے بعد کولکاتا کے مشہور اسکاٹش چرچ کالج سے مزید تعلیم حاصل کی۔ اس دوران وہ کمیونسٹ پارٹی کی جانب سے منعقد ثقافتی پروگراموں میں شریک ہوتے رہے۔ کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں فلموں سے دلچسپی بڑھنے لگی اور وہ فلم سازی کے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ وہ اپنے دوست رتوک گھٹک اور سلیل چودھری سے اکثر کہا کرتے کہ مستقبل میں وہ بامعنی فلمیں بنائیں گے لیکن خاندان کی مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے انہیں اپنا یہ خیال ملتوی کرنا پڑا۔ مرنال سین فلمی صنعت میں اپنے کیریئر کی شروعات کولکاتا فلم اسٹوڈیو میں بطور آڈیو ٹیکنیشین کی۔ بطور ڈائرکٹر ان کی پہلی فلم 'رات بھور' تھی جو باکس آفس پر بری طرح ناکام ثابت ہوئی۔ پھر ۱۹۵۸ء میں 'نیل آکاشے نیچے' ریلیز ہوئی جس کی کہانی ایک ایسے چینی تاجر وانگلو پر مبنی تھی جسے کلکتہ کی رہنے والی بسنتی کے بائیں بازو کے نظریات متاثر کرتے ہیں اور وہ اپنے ملک جا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر جاپانی فوج کے خلاف ساتھ چھیڑی گئی مہم میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو اس فلم میں بائیں بازو نظریات کے پیش نظر اس پر دو مہینے کیلئے پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد وہ کسی حد تک بطور ڈائریکٹر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہے۔ مرنال سین کی اگلی فلم ۱۹۶۰ء میں جلوہ گر ہوئی۔ اس فلم کی کہانی ۱۹۴۳ء میں بنگال میں ہوئے شدید قحط کے پس منظر پر مبنی تھی جس میں تقریباً پانچ لاکھ افراد بھوک اور قحط سالی سے مارے گئے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں این ایف ڈی سی

سی کی مدد سے مرنال سین نے فلم 'بھوون سوم' بنائی۔ اس فلم سے وابستہ دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ اس میں امیتابھ بچن نے پہلی بار اپنی آواز دی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں آئی فلم 'ارج' مرنال سین کے فلمی کیریئر کی ہٹ فلم میں شمار کی جاتی ہے۔ مرنال سین کو اپنے چار دہائی طویل فلمی کیریئر میں خوب شہرت ملی۔ انہیں ۱۹۸۱ء میں پدم بھوشن ایوارڈ اور ۲۰۰۵ء میں فلمی دنیا کے اعلیٰ ترین اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ وہ سماج کی خدمت کے لئے ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۳ء تک راجیہ سبھا رکن بھی رہ چکے ہیں۔ انہوں نے فلم کی پروڈکشن اور ہدایت کے علاوہ کئی فلموں کی کہانی اور اسکرین پلے بھی لکھے۔ انہوں نے سیاست، سنیما اور دیگر موضوعات پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ہندوستانی سنیما میں نمایاں خدمات کے لئے ۱۶؍ بار قومی ایوارڈ سے نوازے جا چکے ہیں۔

....

● بالی ووڈ اداکار، مکالمہ نگار، مزاح نگار اور ڈائریکٹر **قادر خان** (پیدائش: ۱۱؍دسمبر ۱۹۳۷ء، کابل، افغانستان) کا طویل علالت کے بعد کینیڈا کے ٹورنٹو میں ۳۱؍دسمبر ۲۰۱۸ء کی شام ۶؍بجے (کینیڈا کے وقت کے مطابق) انتقال ہوگیا۔ ان کی تجہیز و تکفین کینیڈا میں ہی ہوگی جہاں ان کے سارے اہل خانہ مقیم ہیں۔ پسماندگان میں بیوہ عذرا خان اور تین بیٹے سرفراز خان، شاہنواز خان، قدوس خان ہیں۔ قادر خان نے اسماعیل یوسف کالج سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں فلموں میں آنے سے قبل انھوں نے ایم ایچ صابو صدیق کالج آف انجینئرنگ، ممبئی میں بطور معلم اپنی خدمات انجام دیں۔ وہاں وہ مدنی ہندسیات کے معلم تھے۔ ان کے والد کا نام عبدالرحمان تھا اور ان کا تعلق قندھار سے تھا جب کہ والدہ اقبال بیگم برطانوی ہند کے پشین (موجودہ بلوچستان، پاکستان) سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسی کالج کے ایک سالانہ جلسہ میں ایک ڈراما اسٹیج کرتے ہوئے دلیپ کمار کی نظر ان پر پڑ گئی اور انھوں نے خان کو اگلی فلم کے لئے سائن کرلیا۔ شروع میں وہ تھیٹر کے لئے ڈرامے لکھا کرتے تھے اور اسی دوران فلم 'جوانی دیوانی'' کے لئے اسکرپٹ لکھنے کا موقع ملا۔ اور یہیں سے ان کے فلمی سفر کا آغاز ہوگیا۔ قادر خان نے ۲۵۰ سے زائد فلموں کے مکالمے لکھے۔ بطور اداکار وہ ۳۰۰؍ سے زیادہ فلموں میں نظر آئے اور ان کی پہلی فلم ۱۹۷۳ء کی 'داغ' تھی جس میں مرکزی کردار میں راجیش کھنہ تھے۔ ایکٹر بننے سے پہلے انہوں نے رندھیر کپور، جیا بچن کی فلم 'جوانی دیوانی' کے لئے ڈائیلاگ لکھے تھے۔ اسکرپٹ رائٹر کے طور پر انہوں نے منموہن ڈیسائی اور پرکاش مہرا کی کئی فلموں میں اپنی خدمات دیں۔ ایکٹر اور فلم نویس قادر خان 'آنکھیں، میں کھلاڑی تو اناڑی، جدائی، خون بھری مانگ، بیوی ہو تو ایسی، بول رادھا بول اور جڑواں' سمیت کئی ہٹ فلموں کا حصہ رہے تھے۔ ۴۵ سال سے زیادہ کے کیریئر میں خان کی اہم جوڑی ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ڈیویڈ دھون اور گووندا کے ساتھ رہی۔ تینوں نے ساجن چلے سسرال، ہیرو نمبر 1، قلی نمبر 1، دولہے راجا اور حسینہ مان جائے گی جیسی بلاک بسٹر فلمیں کی تھیں۔ منموہن ڈیسائی کے ساتھ ان کی فلموں دھرم ویر، گنگا جمنا سرسوتی، قلی، دیش پریم، سہاگ، پرورش اور امر اکبر انتھونی اور پرکاش مہرا کے ساتھ فلموں میں جوالا مکھی، شرابی، لا وارث اور مقدر کا سکندر شامل ہے۔

....

● **ایم تمنا** (اصل نام: محمد تمنا، مولد: مظفر پور، مقیم: کوتوالی چوک، دربھنگہ) کا انتقال تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں ۳ر جنوری ۲۰۱۹ء کو ہوگیا۔ اگلے دن ۴ر جنوری ۲۰۱۹ء کو بعد نماز ظہر مدرسۂ حمیدیہ کے احاطے میں نماز جنازہ ہوئی جب کہ تدفین قلعہ گھاٹ قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم اے ڈی ایم کے عہدے سے عرصہ قبل سبکدوش ہو چکے تھے۔ افسانوی ادب سے ان کا گہرا لگاؤ تھا اور ۶۰ ر کی دہائی میں ان کے افسانے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۳ ر بیٹے اور ۲ ر بیٹیاں ہیں۔ ''تمثیل نو'' کے مستقل قاری تھے۔

....

● معروف سماج وادی ولوہیاوادی **یونس لوہیا** (ولادت: ۹ فروری، ۱۹۲۵ء، نالندہ) سابق ممبر بہار قانون ساز کونسل کا مختصر علالت کے بعد ان کی رہائش ملت کالونی، پھلواری شریف میں ۷ر جنوری ۲۰۱۹ء کو انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ پھلواری شریف میں ہی ادا کی گئی اور بعد نماز عصر حرمین شریفین قبرستان، نیا ٹولہ پھلواری شریف میں سپرد خاک کئے گئے۔ مرحوم تعلیمی دور سے ہی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے لگے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی رکنیت حاصل کی۔ بھارت چھوڑو تحریک کے وقت کلکتہ جیل میں بند رہے۔ ۱۱ر اگست ۱۹۴۲ء کو پٹنہ جیل میں ۱۴ ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اس کے بعد لاہور میں لالہ لاجپت رائے کے یوم وفات کے موقع پر گرفتار ہو کر ۱۴ دنوں تک جیل میں رہے۔ پھر ہزاری باغ جیل میں کچھ دنوں کے لئے بند رہے۔ ۱۹۵۲ء میں کانگریس پارٹی سے استعفیٰ دے کر سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو کر لوہیا کے حمایتی بن گئے۔ ۷ مئی ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۸ء تک بہار قانون ساز کونسل کے ممبر رہے۔

....

● معروف صحافی، کالم نگار اور ادیب **ڈاکٹر قمر فردوسی** (ولادت: ۱۰ر ستمبر ۱۹۶۶ء، مقیم: جمشید پور، جھارکھنڈ) ۸ر جنوری ۲۰۱۹ء کی صبح ۸ بجے ٹاٹا مین ہاسپٹل میں حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال کر گئے۔ وہ عرصہ سے صاحب فراش تھے۔ نماز جنازہ ۹ر جنوری کو بعد نماز ظہر دھتکیڈیہ مسجد کے احاطے میں پڑھائی گئی اور تدفین ذاکر نگر قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ ان کے کالم کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ وہ جھارکھنڈ مکتی مورچہ کی سیاست سے بھی وابستہ تھے۔ نہایت خلیق، ملنسار اور مرنجامرنج شخصیت کے حامل تھے۔

....

● مولانا **حبیب صدیقی** (عمر تقریباً ۸۳ سال) کا انتقال ۹ر جنوری ۲۰۱۹ء کی صبح اچانک معمولی علالت کے باعث ہوگیا۔ پسماندگان میں تین بیٹوں کے علاوہ بیٹیاں اور پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے بھرا پورا کنبہ ہے۔ نماز جنازہ بعد نماز عصر احاطہ مولسری جمعیۃ علماء ہند کے صدر قاری سید عثمان منصور پوری نے ادا کی۔ بعد ازیں ہزاروں سوگواروں کے درمیان قاسمی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مولانا حبیب صدیقی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد رشید تھے، وہ سرزمین دیوبند کی ایک عظیم عہد ساز شخصیت تھے، جن کی پوری زندگی لوگوں کی بھلائی اور خیر خواہی میں گزری ہے، نرم لہجہ، شگفتہ اور شائستگی، بلند اخلاق ان کی زندگی کا خاصہ تھا، جنھوں نے سرزمین دیوبند پر

خدمت خلق کا عظیم سرچشمہ شروع کیا تھا اور آج دیو بند میں ان کے قائم کردہ ایک درجن ایسے ادارے ہیں جوان کی اقتصادی، ملی، تعلیمی، سماجی، سیاسی، ادبی اور صحافتی کی خدمات کی عظیم الشان نظیر بن کر ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔ مسلم فنڈ دیو بند کے تحت انہوں نے بچیوں کی تعلیم کے لئے پبلک گرلز انٹر کالج، تکنیکی تعلیم کے لئے مدنی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور مسلم فنڈ ناگل سمیت ایک درجن ایسے اداروں کا قیام کیا ہے جو خدمت خلق کے سفر پر رواں دواں ہیں۔ مرحوم جمعیۃ علماء ہند کے قومی خازن تھے۔ آل انڈیا اقتصادی کونسل کے چیئر مین اور دیو بند میونسپل بورڈ کے سال ۲۰۰۷ء سے سال ۲۰۱۲ء تک چیئر مین رہے ہیں۔

....

● آر جے ڈی کے سینئر لیڈر اور ایم ایل سی **محمد خورشید محسن** (خلف: محمد وصی الدین احمد، سابق ایم ایل اے پیدائش: ۱۰/۱اکتوبر ۱۹۵۲ء، بہار شریف) کا انتقال ۱۱/جنوری ۲۰۱۹ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے ہو گیا۔ ان کا جسد خاکی دوسرے روز پٹنہ سے بہار شریف واقع آبائی گھر محلہ میر داد لایا گیا جہاں بعد نماز عصر ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور مقامی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں ۲/ بیٹے ڈاکٹر فیض احمد اور انجینئر سراج احمد ہیں جب کہ بیٹی بھی ڈاکٹر ہیں۔ مرحوم کا خانوادہ شروع سے سیاست سے جڑا رہا ہے۔ ان کے والد ۱۹۶۰ تا ۱۹۶۹ء بہار شریف اسمبلی حلقہ کے رکن رہے۔ وہ اپریل ۲۰۱۸ء میں ایم ایل سی منتخب ہوئے تھے۔ مرحوم نے مگدھ یونیورسٹی سے بی اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سیاست میں قدم رکھا اور بہار شریف نگر نگم کے انتخاب ۱۹۷۲ء میں سب سے کم عمر وارڈ کونسلر بنے نیز ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۶ء نگر نگم کے چیئر مین ہوئے۔ ۴/ بار آر جے ڈی کے ضلعی صدر رہے۔

....

● معروف عالم دین، فقیہ ملت **مولانا زبیر احمد قاسمی** (ولادت: ۱۹۳۷ء) کا ۱۳/جنوری ۲۰۱۹ء کو صبح ۷ بجے ان کے آبائی وطن چندر سین پور گاؤں، مدھوبنی میں انتقال ہو گیا اور یہیں بعد نماز عصر نماز جنازہ ادا کی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں ۵/ بیٹے اور ۲/ بیٹیاں شامل ہیں جن میں مولانا اویس صدیقی اور مولانا ظفر صدیقی قاسمی سر فہرست ہیں۔ مرحوم نے اپنے علاقہ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیو بند میں داخلہ لے کر بقیہ تعلیم کی تکمیل کی۔ شیخ الحدیث مولانا فخر الدین مراد آبادی آپ کے قریبی اساتذہ میں شامل ہیں۔ قاضی مجاہد الاسلامؒ قاسمی کے ساتھ آپ کے گہرے روابط تھے۔ فقہی مسائل کے بارے میں قاضی صاحب مولانا زبیر مرحوم کی رائے کو خصوصی اہمیت دیتے تھے اس لئے انہیں فقیہ ملت کا لقب بھی دیا گیا۔ بہار کی مشہور درس گاہ جامعہ عربیہ اشرف العلوم کنہواں میں مہتمم کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اشرف العلوم کنہواں کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے اور اس کی تعمیر و ترقی میں مولانا زبیر احمد قاسمی کا کردار نا قابل فراموش ہے۔ اس کے علاوہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے رکن تاسیسی تھے۔ دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد میں بھی آپ شیخ الحدیث رہ چکے ہیں۔ کچھ برسوں قبل مدھوبنی کے ایک مدرسہ بشارت العلوم میں بھی مدرسہ کے کچھ ناگزیر حالات کی وجہ سے مہتمم کی ذمہ داری بھی انھیں سونپی گئی تھی۔

....

● کٹک کی سرزمین کے سرسید اور ماہر تعلیم **پروفیسر محمد قمرالدین خاں** (سابق وائس چانسلر برہم پور یونیورسٹی، برہم پور، اڈیشہ، ولادت: ۲۴؍جنوری ۱۹۳۸ء، کٹک، مقام: کاشانۂ مبارک، سیدانی باغیچہ، کٹک، اڈیشہ) کا انتقال ۱۶؍جنوری ۲۰۱۹ء کی صبح فجر سے قبل حرکت قلب بند ہو جانے سے ہو گیا اور بعد نماز مغرب تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم نہایت خلیق، مرنجامرنج نیز دیندار انسان تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے قیصر جمال، افسر جمال اور عنبر جمال ہیں۔ مرحوم اتکل یونیورسٹی کے پہلے اسکالر تھے جنہیں انگریزی ادب میں ڈی-لٹ کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔ وہ راونشا کالج، کٹک کے سبک دوش صدر، شعبۂ انگریزی تھے۔ کٹک کی سرزمین پر چل رہے درجنوں اداروں سے وابستہ تھے نیز مدرسہ سلطانیہ کے صدر تھے جہاں ان کی کاوشوں سے 'مانو' کا اسٹڈی سنٹر چل رہا تھا۔ انہوں نے ۲۰؍اکتوبر ۲۰۱۳ء کو مانو، حیدرآباد کے صیغۂ منصوبہ بندی میں مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے تقریباً دو سال خدمات انجام دے چکے ہیں۔ نومبر ۲۰۱۵ء میں انہیں کٹک میں اراضی کے الاٹمنٹ کے معاملات کے لئے نوڈل آفیسر مقرر کیا گیا تھا اور مارچ ۲۰۱۸ء میں انہیں کٹک کیمپس میں اعزازی مشیر مقرر کیا گیا۔ ان کی جدوجہد و کدوکاوش سے اڈیشہ حکومت نے ۵؍ایکڑ زمین 'مانو' کو عطیہ کیا جہاں مانو کا کیمپس، سیکٹر-۱۳، سی ڈی اے، کٹک میں قائم ہو چکا ہے جس کا افتتاح ۵ دسمبر ۲۰۱۸ء کو معزز وزیر اعلیٰ اڈیشہ شری نوین پٹنائک نے کیا۔ معزز وائس چانسلر مانو ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، ڈاکٹر سید محمد رحمت اللہ (ڈین سٹیلائٹ کیمپس، مانو) و دیگر معززین نے اس تقریب میں شرکت کی۔ اس کیمپس میں آئی ٹی آئی اور پولی ٹیکنک چل رہے ہیں۔ اس کیمپس کے اعزازی مشیر کار کی حیثیت سے مرحوم اپنی خدمات انجام دے رہے تھے جس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر وجے کمار مہا پاترا ہیں۔ اردو میں ان کی ایک کتاب ''مغربی نشاۃ الثانیہ پر مشرق کے ادبی و تہذیبی اثرات'' جو ان کی انگریزی تصنیف ''ایسٹرن کنٹری بیوشن ٹو یوروپین ری نا سا'' کا انہوں نے خود ترجمہ کیا ہے جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ جنوری ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئی یہ کتاب تاریخ کے شائقین کے لئے بے حد اہم ہے۔ ان کی انگریزی کتابیں اس طرح ہیں: دی میلنگ پَچ آف صوفی ازم ان اڈیشہ، ٹری بیوٹس ٹو اپیشمنٹ مین، لائیوس ٹو ری ممبر، دی رتھمک ورڈ اور دی پیرالڈ آف پروز اہم ہیں۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز (معزز وائس چانسلر) اور ڈاکٹر ایم اے سکندر (رجسٹرار) نے مرحوم کے انتقال کو کٹک میں اردو اور مانو کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے غمزدہ اراکین خاندان کے لئے تعزیت کی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم، ریجنل ڈائریکٹر مانو، کولکاتا نے بتایا کہ مرحوم انھیں بے حد عزیز رکھتے۔ اپنے افتتاحی پروگرام کا دعوت نامہ بھی انھیں واٹس اپ کیا تھا نیز کئی برس قبل جب وہ کولکاتا آئے تو ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ کولکاتا میں اجتماعی افطار میں شریک ہوئے نیز ریجنل سنٹر مانو کولکاتا پر ملنے آئے اور گاہے گاہے ان سے فون پر گفتگو ہوتی رہی۔ ان کی رحلت سے اس دیار کے علمی، ملی، سماجی حلقوں کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ ایسے لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔

....

● بزرگ شاعر اور صحافی **راقم لکھنوی** (اصل نام: مجید الحسن عمر: تقریباً ۸۵ برس) کا انتقال ۱۸؍جنوری ۲۰۱۹ء کی شام ۷؍بجے اسلامیہ اسپتال میں ہو گیا۔ دوسرے روز بعد نماز ظہر مٹیابرج کے انجمن محمدی قبرستان میں تدفین عمل

میں آئی۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ نوجوانی میں انہوں نے لکھنؤ کے کئی اخبارات میں کام کیا اس کے بعد کولکاتا آ گئے اور روزنامہ ''آزاد ہند'' میں نائب مدیر کی حیثیت سے طویل عرصے تک کام کیا۔ انہوں نے اداریے بھی لکھے اور فکاہیہ اور مزاحیہ کالم بھی تحریر کئے۔

....

● جامعہ مدنیہ سبل پور کے بانی اور سرپرست اور مدرسہ شمس الہدیٰ کے سابق پرنسپل **مولانا محمد قاسم** (ولادت: ۲۰ر نومبر ۱۹۵۳ء، بھاگلپور، ولد: ثابت حسین مرحوم ابن حافظ محفوظ حسین مرحوم) کا انتقال ۲۹ر جنوری ۲۰۱۹ء کو ۳ر بجے صبح پارس اسپتال میں ہو گیا۔ مرحوم ۲۸ر جنوری کو مغرب کی نماز کے بعد گر پڑے تھے اور برین ہیمبرج ہو گیا تھا۔ آپریشن ہوا لیکن وہ جانبر نہیں ہو سکے۔ ان کی نماز جنازہ پٹنہ کے تاریخی گاندھی میدان میں دن کے ۱۰ر بجے مولانا سید محمود مدنی نے پڑھائی۔ ان کا جسد خاکی ان کے آبائی گاؤں بھاگلپور ضلع کے کوروڈیہہ لے جایا گیا جہاں دیر شام تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں۔ بیٹا جامعہ حسینیہ لال دروازہ جونپور، یوپی میں زیر تعلیم ہے۔ مولانا قاسم چار بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ مرحوم کے دینی، ملی، تعلیمی اور سماجی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیمی لحاظ سے انہوں نے جو خدمت انجام دی مدرسہ مدینہ سبل پور اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

....

● سابق وزیر دفاع اور سینئر سوشلسٹ لیڈر **جارج فرنانڈیز** (ولادت: ۳ر جون ۱۹۳۰ء بمقام منگلور، کرناٹک) کا ۲۹ر جنوری ۲۰۱۹ء کو طویل علالت کے بعد دہلی کے میکس اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ وہ الزائیمر کے مرض میں مبتلا تھے۔ حال ہی میں انھیں سوائن فلو بھی ہو گیا تھا۔ ان کی آخری رسومات اُن کے فرزند شان فرنانڈیز کی امریکہ سے آمد کے بعد ۳۰ر جنوری کو انجام دی گئی۔ ان کی شادی ۲۲ر جولائی ۱۹۷۱ء کو سابق مرکزی وزیر اور ماہر تعلیم ہمایوں کبیر کی صاحبزادی لیلیٰ سے ہوئی تاہم بعد میں سماجی کارکن جیا جیٹلی کے ساتھ قربتوں کی وجہ سے لیلیٰ کبیر ۱۹۸۰ء میں جارج کی زندگی سے نکل گئیں۔ ان کی بیوہ اور سمتا پارٹی کی سابق سربراہ جیا جیٹلی نے کہا کہ آنجہانی کی خواہش کے مطابق پہلے ان کے جسد خاکی کو نذر آتش کیا گیا اور پھر ان کی باقیات کو دفن کیا گیا۔ ان کا بیٹا شان فرنانڈیز نیویارک میں انوسٹمنٹ بینکر ہے۔ جارج فرنانڈیز انگریزی سمیت نو دیگر ہندوستانی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ جارج فرنانڈیز جب ۱۶ر سال کے ہوئے تو ان کو ایک عیسائی مشنری میں پادری بننے کی تعلیم لینے بھیج دیا گیا اگرچہ چرچ میں ہونے والے تمام طرح کے رسم رواج کو دیکھ کر جلد ہی ان کی اس سے دلچسپی ختم ہو گئی۔ آخر کار ۱۹۴۹ء میں ۱۸ر سال کی عمر میں انہوں نے چرچ چھوڑ دیا اور روزگار کی تلاش میں ممبئی (اس وقت بمبئی) چلے گئے۔ ممبئی میں وہ سوشلسٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین تحریک کے پروگراموں میں حصہ لینے لگے جس کی وجہ سے ان کی شروعاتی شبیہ باغی لیڈر کی تھی۔ مسٹر فرنانڈیز اس وقت کے شعلہ بیان مقرر رام منوہر لوہیا کو اپنا گرو مانتے تھے۔ اپنے باغیانہ تیور اور قیادت کی خصوصیات کے سبب ۱۹۵۰ء تک وہ ٹیکسی ڈرائیور یونین کے بے تاج بادشاہ بن گئے تھے۔ جارج فرنانڈیز نے سمتا پارٹی قائم کی تھی۔ انہوں نے ایمرجنسی کے خلاف اپنی آواز بلند کی تھی اور سول رائٹس ایکٹیوسٹ کے طور پر مشہور ہوئے تھے۔ وہ

۱۹۷۷ سے ۱۹۸۰ کے درمیان مرار جی دیسائی کی قیادت والی جنتا پارٹی حکومت میں بھی مرکزی وزیر رہے۔

....

● سمستی پور کے سرسید **محمد شاہد حسین سوز** (ولادت: ۱۴ر فروری ۱۹۴۲ء) ۱۵ر فروری ۲۰۱۹ء کو انتقال کر گئے۔ ۱۶ر فروری ۲۰۱۹ء کو بعد نماز ظہر جامع مسجد واقع قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے اعجاز حسین، ارشاد حسین، التمش شاہد اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ فروری ۲۰۰۲ء میں وہ بحیثیت پرنسپل ملت اکیڈمی، سمستی پور سے سبکدوش ہوئے۔ مرحوم نے سمستی پور میں تعلیمی بیداری پیدا کر کے ضرورت مند بچوں کی مدد کی۔ انہوں نے ۱۹ر نومبر ۱۹۷۸ء میں 'ملت اکیڈمی' کی بنیاد رکھی۔ وہ اسے ایک بڑے تعلیمی ادارے میں بدل دینا چاہتے تھے۔ انہیں یہ منظور نہ تھا کہ بچوں سے زیادہ فیس لیں، کیونکہ اسکول قائم کرنے کا مقصد ان کا یہ تھا کہ وہ بچے بھی تعلیم حاصل کریں جو حالات کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔ اسی لئے ملت اکیڈمی کی توسیع کا سلسلہ جاری رکھا، 'ملت ایجوکیشنل سوسائٹی' قائم کی۔ اس کے تحت ۴ر تعلیمی ادارے شروع ہوئے۔ گرلس اسکول طالبات کے لئے مخصوص ہے جو ۱۰ویں تک ہے۔ ملت انٹر کالج بارہویں جماعت تک ہے۔ مرحوم نے سمستی پور اسمبلی حلقہ سے تین مرتبہ انتخابات بحیثیت آزاد امیدوار قسمت آزمائی بھی کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ مرحوم بے حد خلیق، ملنسار تھے اور راقم الحروف سے ۱۹۸۰ء سے تعلقات تھے۔

....

● ہندی کے معروف ادیب اور نقاد **نامور سنگھ** (ولادت: ۲۸ر جولائی ۱۹۲۶ء، جینا پور، وارانسی) کا انتقال ۱۹ر فروری کی شب ۱۱:۵۰ر بجے دہلی کے ایمس میں ہوگیا۔ آخری رسومات ۲۰ر فروری ۲۰۱۹ء کو ۳ بجے سہ پہر لودھی روڈ پر واقع شوگرہ میں ادا کی گئیں۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیوی کا انتقال کئی سال پہلے ہو چکا ہے۔ نامور سنگھ نے ہندی ادب میں شاعری کی تنقید کو ایک معراج بخشا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''کویتا کے نئے پرتیمان'' (۱۹۶۸) کے ذریعہ ہندی تنقید کے سمندر میں ایک ایسا پتھر پھینکا تھا جس کے دائرے نے ساحل تک کو چونکا دیا تھا۔ ہندی تنقید میں ان کی اس کتاب نے بڑے بڑے بتوں کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس سے پہلے ہندی میں ''آگیے'' یعنی سچید انند ہیرا نند واتشائن اگیے کا پرچم بلند تھا لیکن اس کے بعد پوری ہندی دنیا نامور سنگھ کے اردگرد گھومنے لگی۔ ان کی تصانیف کی فہرست بھی لمبی ہے کہ وہ تقریباً ۷۰ برسوں تک مسلسل لکھتے رہے۔ رسالہ ترتیب دیتے رہے، نئی کہانیوں اور کویتاؤں کو کتابی صورت میں پیش کر کے ادب کے قارئین کے ذہن میں سوالات قائم کرتے رہے۔ ہفتہ وار ''جن یگ'' کے ذریعہ سیاسی اور سماجی مسائل پر روشنی ڈالتے رہے تو خالص ادبی رسالہ سہ ماہی ''آلوچنا'' (۱۹۶۷-۱۹۹۰) کے ذریعہ ادبی حلقے تک اپنے افکار و نظریات کو پہنچاتے رہے۔ ان کی تصانیف کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ زبان و ادب کے تئیں وہ کتنے کمیٹڈ تھے۔ ان کی تصانیف میں ''بقلم خود'' (۱۹۵۱)، ہندی کے وکاس میں اپبھرنش کا یوگدان (۱۹۵۲)، آدھونک ساہتیہ کی پرورتیاں (۱۹۵۴)، چھایا واد (۱۹۵۵)، پرتھوی راج راسو کی بھاشا (۱۹۵۶)، اتیہاس اور آلوچنا (۱۹۵۷)، کہانی: نئی کہانی (۱۹۶۴)، کویتا کے نئے پرتیمان (۱۹۶۸)، دوسری پرمپرا

کی کھوج (۱۹۸۲)، واد، ویواد، سمواد (۱۹۸۹)، آلوچنا کے مکھ سے (۲۰۰۵)، کاشی کے نام (۲۰۰۶)، کویتا کی زمین اورزمین کی کویتا (۲۰۱۰)، ہندی کا گدھ پرو (۲۰۱۰)، سموکھ (۲۰۱۲)، ساتھ ساتھ (۲۰۱۲)، پُرورنگ (۲۰۱۸) اور ''دوآبھا (۲۰۱۸)۔ پروفیسر نامورسنگھ کی مذکورہ کتابیں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ وہ ادب اورزبان کے تئیں کتنے ایماندار تھے اورایک تخلیقی فنکار کی حیثیت سے کہ انہوں نے شاعری بھی کی اورایک نقاد کی حیثیت سے شعری سلیقۂ فکر کوایک نئی شناخت دینے کی جدوجہد کی اوراس میں وہ کامیاب رہے کہ آج ہندی تنقید بغیر نامورسنگھ کے ادھوری سمجھی جائے گی۔ بیسویں صدی کی ہندی ادب کی تاریخ میں نامورسنگھ کی خدمات ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کبھی حکومت کی پسند نہیں رہے کہ وہ کسی کو بھی کھری کھوٹی سنانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ باوجود اس کے سب کے دلوں میں ان کے لئے ایک احترام تھا۔ ساہتیہ اکادمی دہلی نے انہیں ۱۹۷۱ء میں ان کی کتاب ''کویتا کے نئے پرتیمان'' کے لئے انعام دیا تھا جب کہ ہندی اکادمی دہلی نے اپنا سب سے بڑا ایوارڈ ''شلا کا سمان'' ۱۹۹۱ میں دیا تھا۔ اتر پردیش ہندی سنستھان کی جانب سے ساہتیہ بھوشن ۱۹۹۳ء میں اور دلّی کرناٹک سنگھ کا قومی ایوارڈ ۲۰۱۵ء میں انہیں دیا گیا۔

....

● متواسماج کی پیشوا بینا پانی دیوی معروف بہ بڑی ماں (ولادت: ۱۹۱۹ء، بریشال، بنگلہ دیش) کا انتقال ۵/مارچ ۲۰۱۹ء کوایس ایس کے ایم ہاسپٹل میں رات ۸ بج کر ۵۲ منٹ میں ہوگیا۔ دوسرے روز صبح ان کی لاش کو کلکتہ پولس کی نگرانی میں ٹھاکر نگر کی ٹھاکر باڑی میں قومی اعزاز کے ساتھ نذر آتش کیا گیا۔ واضح رہے کہ متوامہا سنگھ بنگلہ دیش سے ہجرت کرنے والی چھوٹی برادری ہے۔ شیڈول کاسٹ کمیونٹی کی یہ دوسری بڑی برادری ہے۔ اس برادری کے پاس ۷۰ لاکھ ووٹ ہیں۔ ۲۹۴/ اسمبلی حلقوں میں سے ۷۴/ اسمبلی حلقوں میں ان کا اثر ہے۔ بڑی ماں کا وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ ۲۰۱۱ء میں ترنمول کانگریس کی کامیابی کے پیچھے اس برادری کا یک طرفہ رجحان بھی ایک بڑی وجہ تھی۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے بھی ۲/فروری کو شمالی ۲۴ پرگنہ کے ٹھاکر نگر میں بڑی ماں سے ملاقات کی تھی۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بڑی ماں کے انتقال کے بعد متواسماج میں ایک خلا پیدا ہونے کا قوی امکان ہے۔

....

● شہر دربھنگہ کے ممتاز سرجن ڈاکٹر عبدالوہاب (ولادت: فروری ۱۹۳۱ء، موہن پور، تاج پور، سمستی پور حال مقام محلہ: رحم خاں، دربھنگہ) کا ۶/مارچ ۲۰۱۹ء طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ دوسرے دن ۲/ بجے ملت کالج، دربھنگہ کے احاطے میں ادا کی گئی اوراس کے بعد ہزار ہا افراد نے نم آنکھوں سے انھیں محلہ رحم خاں قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔ جنازہ کی نماز ان کے داماد نے پڑھائی۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۳/ بیٹے ڈاکٹر احمد نسیم آرزو، احمد شمیم تمنا، ڈاکٹر احمد نعیم آفاق اور ۵/ بیٹیاں ڈاکٹر نزہت پروین و دیگر ہیں۔ ان کی رحلت سے متھلانچل کا علمی، سماجی، ادبی اور سیاسی حلقہ سوگوار ہے۔ ان کی شخصیت غیر معمولی اور منفرد تھی۔ ملی مسائل پر ان کی نظر گہری تھی۔ ان کی مسیحا نفسی اور غریب پروری کی داستانیں ہر خاص وعام کی زبان پر تھیں۔ وہ طبی سرگرمیوں کے

علاوہ فلاحی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ بقول علامہ اقبال :

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزاد، معانی میں دقیق

انہوں نے جن بیگم صغریٰ حسن میموریل گرلس ہائی اسکول، علامہ اقبال لائبریری، ملت شفاخانہ، زکوٰۃ فاؤنڈیشن قائم کئے نیز محلہ بی بی پاکر میں شاندار الہلال نرسنگ ہوم قائم کیا۔ شہر کے کئی اداروں سے وابستہ تھے۔ رسالہ 'تمثیل نو' دربھنگہ میں گاہے گاہے ان کی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔ مرحوم نے ڈی ایم سی ایچ سے ایم بی بی ایس اور ایم ایس نیز لندن سے ایف آر سی ایس کی اسناد حاصل کیں۔ سعودی عرب میں عرصہ تک طبّی خدمات انجام دیتے رہے۔ ہندوستان واپسی پر ایس کے ایم سی ایچ، مظفر پور میں بحیثیت پروفیسر جوائن کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ڈی ایم سی ایچ لوٹ آئے جہاں سے ۱۹۹۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے شعبۂ اردو کے قیام میں ان کا بڑا اہم رول رہا۔ ان کے بھانجہ اور بڑے خویش معروف شاعر و ادیب جناب اسلم بدر کی کاوشوں سے ڈاکٹر مرحوم کی خودنوشت ''سوز و ساز حیات'' فروری ۲۰۱۹ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔

....

● مشہور شاعر اور ادیب **سہیل اختر** کا (ولادت: ۱۰ر نومبر ۱۹۶۲ء، غازی پور، اتر پردیش) کا ۱۱ر مارچ ۲۰۱۹ء کی صبح ۹ بجے بھوبنیشور (اڈیشہ) کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو لڑکیاں ہیں۔ وہ طویل عرصہ سے گردے کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم جمشید پور میں ہوئی تھی۔ آئی آئی ٹی کانپور سے انہوں نے سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور ان کی ملازمت بھونیشور میں آئی ڈی سی او میں تھی۔ اس وقت وہ بھونیشور میں ڈپٹی جی ایم سول کے عہدے پر فائز تھے۔ سہیل اختر ایک کامیاب مترجم بھی رہے ہیں۔ ہندی اور انگریزی زبان میں انہیں عبور حاصل تھا۔ انہوں نے اردو کے علاوہ ہندی میں نظمیں کہی ہیں اور تقریباً ۴۰ نظمیں انگریزی میں بھی کہی ہیں۔ 'جاؤں تو جاؤں کہاں' انگریزی شاعر وشنو پد سیٹھی کی نظموں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ ان کی چند مشہور کتابیں کاغذ پر صحرا (غزلوں کا مجموعہ)، منجمد اخلاق کے سائے تلے (نظموں کا مجموعہ)، جاؤں تو جاؤں کہاں (بھونیشور کے آئی اے ایس آفیسر وشنو پد سیٹھی کی انگریزی نظموں کا مجموعہ)، دست زاد (غزلوں کا مجموعہ)، غزل کے رنگ (اکرم نقاش کے ساتھ ترتیب شدہ کتاب) کے علاوہ درجنوں مقالات اور مضامین ہیں۔ وہ اڈیشہ اردو اکیڈمی کے رسالہ کے مدیر بھی تھے۔

....

● گوا کے وزیر اعلیٰ **منوہر پاریکر** (ولادت: ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء) ۱۷ر مارچ ۲۰۱۹ء کو اپنی رہائش گاہ پر شام ۶:۴۰ بجے انتقال کر گئے۔ دوسرے روز ۱۸ر مارچ ۲۰۱۹ء کو شام ۵ر بجے آخری رسوم پنجی میں ادا کی گئیں۔ وہ طویل عرصہ سے لبلبے کے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ واضح رہے کہ ان کی بیوی میڈھا پاریکر بھی ۲۰۱۱ء میں کینسر سے ہی فوت کر گئی تھیں۔ منوہر پاریکر نے ۱۹۷۸ء میں آئی آئی ٹی بامبے سے انجینئرنگ میں گریجویشن کیا۔ وہ کسی آئی آئی ٹی سے گریجویشن کی

ڈگری حاصل کرنے کے بعد ملک کی کسی ریاست کے وزیر اعلیٰ بننے والے پہلے شخص تھے۔ پاریکر پہلی مرتبہ ۱۹۹۴ء میں پنجی اسمبلی سیٹ سے منتخب ہوئے۔ اس کے بعد مسلسل چار بار اس سیٹ سے کامیاب ہوئے۔ اس سے پہلے گوا کی سیاست میں کسی بھی لیڈر نے یہ اعزاز حاصل نہیں کیا تھا۔ سیاست میں آنے سے قبل پاریکر آر ایس ایس سے وابستہ ہوئے تھے اور شمالی گوا میں سرگرم تھے۔ ۲۰۰۰ء میں وہ پہلی مرتبہ گوا کے وزیر اعلیٰ ہوئے۔ ۲۰۰۲ میں گوا اسمبلی تحلیل ہونے کے بعد وہاں پھر الیکشن ہوا اور بی جے پی سب سے بڑی پارٹی کے طور پر ابھری۔ دوسری چھوٹی پارٹیوں اور ایک آزاد رکن کے تعاون سے پاریکر دوسری مرتبہ وزیر اعلیٰ بننے میں کامیاب رہے۔ گوا کی سیاست میں بی جے پی کی جڑیں جمانے میں پاریکر کا رول کافی اہم رہا۔ الیکشن کے بعد پٹرول پر ویٹ ہٹانے کا اپنا وعدہ انہوں نے پورا کیا۔ گوا میں پٹرول کی قیمت ۱۱؍روپے تک گھٹانے کی ان کی کوشش کا ملک بھر میں ذکر ہوا۔ ۲۰۱۷ء کے اسمبلی الیکشن میں انہیں دوبارہ گوا بھیجا گیا اور انہوں نے بحسن وخوبی بی جے پی کی حکومت چلائی۔

....

● **پروفیسر طارق جمیلی** (اصل نام: سید ابواجمل محمد طارق جمیلی، ولادت: یکم اکتوبر ۱۹۳۳ء، ولد: جناب محمد جمیل مرحوم ایڈوکیٹ، آبائی وطن: مہرتھا، ضلع: مظفر پور، متیم: لائن بازار، پورنیہ، سیمانچل، سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی، پورنیہ کالج، پورنیہ) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۳؍اپریل ۲۰۱۹ء کی شب پٹنہ میں ہوگیا جہاں وہ زیر علاج تھے۔ ان کا جسد خاکی پٹنہ سے پورنیہ لایا گیا اور ۴؍اپریل کو بعد نماز عشاء جنازہ کی نماز ادا کی گئی جس میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اور انہیں مقامی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ۶؍اپریل کو ان کی رہائش گاہ پر بعد نماز فجر قل وقرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ مرحوم نہایت ملنسار، مرنجاں مرنج اور خداترس انسان تھے۔ پسماندگان میں بیوہ (محترمہ نزہت طارق ظہیری) کے علاوہ تین بیٹے شارق کوثر، شاداب ثمر اور شہزاد عرشی اور صاحبزادی حنا شامل ہیں۔ مرحوم نومبر ۱۹۹۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ واضح ہو کہ مرحوم شاعر، ناقد، محقق، افسانہ نگار، ڈراما نگار کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں معروف تھے۔ وہ درجنوں کتابوں کے مصنف تھے جن میں طویل نظم 'پورنیہ' (۱۹۸۵ء) جس کے تین مختلف زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں۔ علاوہ ازیں 'جذبِ دروں' (شعری مجموعہ، ۲۰۰۹ء)، 'سورۂ یٰسین' (منظوم ترجمہ، ۲۰۰۷ء)، 'شکست کی آواز' (ڈرامہ، ۱۹۸۰ء)، 'آگ اور پانی' (تمثیل، ۱۹۸۰ء، ۱۹۹۴ء)، 'آزاد شرارے' (انشائیوں کا مجموعہ، ۱۹۸۷ء، ۱۹۹۶ء)، 'قلم جاگ رہا ہے' (افسانوی مجموعہ)، 'عرش گیاوی: حیات وخدمات' (تحقیق، ۲۰۰۹ء) بھی ان کی اہم کتابوں میں شامل ہیں۔ ان کی بیوہ محترمہ نزہت طارق ظہیری بھی ادیبہ ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''ایک روٹی سات پہاڑ'' شائع ہو چکا ہے۔ ان کی ایک مرتبہ کتاب ''طارق جمیلی: دیدۂ جوہر شناس'' شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ مرحوم پروفیسر طارق جمیلی کو ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی انعامات واعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ راقم الحروف (ڈاکٹر امام اعظم) سے ان کے مراسم ۱۹۸۶ء سے تھے۔ ان دنوں اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں اکثر و بیشتر پروفیسر سیّد ضیاء الرحمٰن، پروفیسر محمد عثمان (مدھے پورہ)، پروفیسر عبدالغفور (کٹیہار) اور پروفیسر طارق جمیلی کی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے داماد کولکاتا میں رہتے ہیں جہاں وہ اکثر آیا کرتے تھے۔

مانو کولکاتا رجنل سینٹر میں قومی یوم تعلیم کے موقع ۱۱ر نومبر ۲۰۱۵ کو وہ ابواللیث جاوید صاحب کے ساتھ مہمان کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ بعد میں بھی ان سے کولکاتا میں ملاقاتوں کے سلسلے رہے۔ ان کی رحلت سے خاکسار بیحد صدمہ پہنچا ہے۔

....

● ممتاز محقق، ناقد، مؤرخ، دانشور، ماہر لسانیات اور سابق وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی **ڈاکٹر جمیل جالبی** (اصل نام: محمد جمیل خان، ولادت: ۱۲ر جون ۱۹۲۹ء، علی گڑھ، ولد: محمد ابراہیم خان) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۱۸ر اپریل ۲۰۱۹ء کو کراچی میں ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز عصر کراچی کے علاقے ڈیفنس کی مسجد ابوبکر میں ادا کی گئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ موصوف ۱۹۸۳ء میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ۱۹۸۷ء میں مقتدرہ قومی زبان (موجودہ نام ادارہ فروغ قومی زبان) کے چیئرمین مقرر ہوئے نیز ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۷ء تک اردو لغت بورڈ کراچی کے سربراہ بھی مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ جمیل جالبی نے ۱۹۷۲ء میں قدیم اُردو ادب پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی اور ۱۹۷۸ء میں مثنوی کدم راؤ پدم راؤ پر ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں جبکہ سی ایس ایس کے امتحان میں بھی کامیاب ہوئے۔ مرحوم کی کتابیں 'قومی انگریزی اردو لغت'، 'جانورستان (جارج آرول کے ناول کا ترجمہ)، پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ، تاریخ ادب اردو، تنقید و تجربہ، نئی تنقید، ادب کلچر اور مسائل، محمد تقی میر، معاصر ادب، قومی زبان یکجہتی نفاذ اور مسائل، قلندر بخش جرأت لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، دیوان حسن شوقی، دیوان نصرتی، قدیم اردو لغت، فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ، میراجی ایک مطالعہ، ن م راشد ایک مطالعہ، ایلیٹ کے مضامین (ترجمہ)، ارسطو سے ایلیٹ تک، حیرت ناک کہانیاں، خوجی اہم ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ انہوں نے بارہ سال کی عمر میں سب سے پہلی کہانی ''سکندر اور ڈاکو'' لکھی جسے اسکول میں ڈرامے کے طور پر اسٹیج کیا گیا۔ ماہنامہ ''ساقی'' میں معاون مدیر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اپنا ایک سہ ماہی رسالہ نیا دور بھی جاری کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو ان کی اعلیٰ ادبی خدمات کے اعتراف میں 'ستارۂ امتیاز' اور 'ہلالِ امتیاز' کے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ انہیں ادبی خدمات کا سب سے بڑے ایوارڈ 'کمال فن ایوارڈ' سے بھی نوازا گیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ان کے اندر ذرہ برابر تعصب نہیں تھا۔ ان کی رحلت سے ایک عہد کا خاتمہ ہوا۔ اردو کی عالمی بستی سوگوار ہوئی۔

....

● معروف ڈرامہ نگار، اداکار، ہدایت کار، معلم اور پرنسپل سریندر ناتھ ایوننگ کالج، سیالدہ، کولکاتا **پروفیسر اقبال جاوید** عرف 'ماسٹر' (ولادت: ۵ر جنوری ۱۹۵۹ء، ولد: ڈاکٹر جاوید نہال مرحوم، مقیم: ۳۸ر رپن لین، کولکاتا -۱۶) کا انتقال ۵ر مئی ۲۰۱۹ء کو بوقت ۶:۴۵ شام طویل علالت کے بعد ہوگیا۔ ان کے جنازہ کی نماز ۶ر مئی کو بعد نماز ظہر ایلیٹ لین کی مسجد کے احاطے میں ادا کی گئی جہاں سیکڑوں افراد نے شرکت کی اور گوبرا قبرستان ایک نمبر میں ان کی تدفین عمل

میں آئی۔ وہ گزشتہ دو برسوں سے صاحب فراش تھے۔ اس درمیان وقفے وقفے سے نرسنگ ہوم میں بھی داخل ہوتے رہے۔ موصوف کے پسماندگان میں بیوہ محترمہ صبرینہ احمد جاوید کے علاوہ بھائی اور بہنیں ہیں۔ مرحوم بے حد خلیق، ملنسار اور مرنجا مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی کتابوں میں 'تحقیق و تنقید'، 'نقش جاوید' (ڈاکٹر جاوید نہال کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، 'مرقع جاوید' (جاوید نہال خاکوں کا مجموعہ)، 'آغا حشر کاشمیری: حیات اور ڈرامہ نگاری' اہم ہیں۔ انہوں نے اپنے والد کے افسانے 'نیم کارس' کا انگریزی میں ترجمہ Neem Abstract کے نام سے کیا جو رسالہ 'سرسوتی' کلکتہ میں شائع ہوا۔ موصوف کے متعدد مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ موصوف مغربی بنگال کے ۴۶۸ ر کالجوں میں سے واحد پرنسپل تھے جو اردو داں تھے۔ مرحوم شہر کولکاتا کے کئی سماجی و تعلیمی اداروں سے بحیثیت سرپرست یا رکن مجلس عاملہ بھی وابستہ تھے۔ انہوں نے چند برس قبل وشو بھارتی یونیورسٹی شانتی نکیتن سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انہیں صحافت سے بھی دلچسپی تھی اور اسپورٹس رپورٹر کی حیثیت سے عرصہ دراز تک رپورٹنگ کر چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے عوض مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے انہیں 'پرویز شاہدی ایوارڈ' (برائے ۲۰۰۸ء) سے نوازا۔

....

● معروف ادیب ڈاکٹر **حفیظ اللہ نیولپوری** (ولادت: اپریل ۱۹۳۶ء ساکن رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک، اڈیشہ) کا انتقال ۸ رمئی ۲۰۱۹ء صبح ۹ ربجے ان کی رہائش گاہ پر ہو گیا۔ مرحوم تقریباً ۵ برس سے صاحب فراش تھے۔ انھیں رعشہ کا مرض بھی لاحق تھا۔ اسی روز بعد نماز عصر قدم رسول قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۲ ربیٹے اور ۲ ربیٹیاں ہیں۔ مرحوم بھدرک کالج اور راونشا کالج، کٹک کے شعبۂ اردو کے سبکدوش استاد تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں ترتیب و تالیف کی ہیں جن میں اڈیشہ میں اردو بے حد اہم ہے۔ انھیں ترجمہ پر خاصا عبور تھا۔ کئی زبانوں اردو، فارسی، اڈیا، بنگلہ، انگریزی وغیرہ پر قدرت رکھتے تھے۔ ممتاز ناقد اور شاعر پروفیسر کرامت علی کرامت کے نسبتی بھائی تھے۔ ان کے ایک صاحب زادے ڈاکٹر سلمان راغب کٹک کے کالج میں استاد ہیں۔ ان کی رحلت سے اردو دنیا کا ادبی حلقہ سوگوار ہے۔ مرحوم بے حد خلیق، ملنسار اور بذلہ سنج انسان تھے۔ راقم الحروف نے ان کی رحلت پر غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''مرحوم سے میرے مراسم ۱۹۸۹ء سے ہیں۔ وہ میرے پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ دونوں کے ممتحن تھے۔ ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ میں نصف درجن وائیوا میں ان کی شرکت بحیثیت ممتحن رہی۔ میری رہائش گاہ ادبستان، محلہ گنگوارہ، دربھنگہ میں بھی ۲۰۰۱ء میں تشریف لائے تھے۔ وہ دربھنگہ آتے تو ڈاکٹر مظفر مہدی صاحب کے مہمان ہوتے۔ میرے پہلے شعری مجموعہ ''قربتوں کی دھوپ'' پر مضمون لکھا نیز رسالہ ''تمثیل نو'' میں ان کی تحریریں گاہے گاہے شائع ہوتی تھیں۔ میرے نام ان کے درجنوں خطوط زیر اشاعت کتاب ''نامے میرے نام'' (مرتب: شاہد اقبال) میں شامل ہیں۔ وہ مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔''

ادارہ ان حضرات کی رحلت پر افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ .... **(ڈاکٹر امام اعظم)**

☆☆☆

شکیل سہسرامی (پٹنہ)

حمد

تعداد کیا گناہوں میں لاکھوں ہزار کی
مخلوق بے شمار ہے پروردگار کی

ہوتی ہے صبح و شام خدا ہی کے حکم سے
تقدیر وہ ہی لکھتا ہے لیل و نہار کی

یہ کہکشاں کا حسن یہ قوسِ قزح کا رنگ
تخلیق بے مثال ہے نقش و نگار کی

ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے محیط
ملتی نہیں ہے راہ کسی کو فرار کی

اے خالقِ جہاں مرے اے رب کائنات
تسبیح ہے تو ہی تو دلِ بے قرار کی

مولا ترا خیال بڑا پاک صاف ہے
تصویر یہ جہان ہے گرد و غبار کی

طالب ترا شکیلؔ تری قربتوں کا ہے
اس کو ہوس نہیں ہے کسی اقتدار کی

....

امان خاں دل (امریکہ)

نعت شریف

مدینہ میرا ارماں ہوگیا ہے
غمِ ہستی کا درماں ہوگیا ہے
ہے یہ سرکارؐ کے قدموں کی برکت
کہ صحرا بھی گلستاں ہوگیا ہے
شہِ دیںؐ کی اماں میں آگیا ہوں
خدا میرا نگہباں ہوگیا ہے
نبیؐ کی ذات پر دل ہوکے شیدا
حقیقت میں مسلماں ہوگیا ہے
درودوں کو بنایا ہے وظیفہ
کہ جب بھی دل پریشاں ہوگیا ہے
سمیٹی ہے تجلی اُنؐ کے در سے
مرا دامن درخشاں ہوگیا ہے
نبیؐ عرشِ بریں سے ہو کے آئے
زمانہ ہے کہ حیراں ہوگیا ہے
حضوری کو جو آقاؐ نے بلایا
تو احقر کتنا ذی شاں ہوگیا ہے
رکھیں گے لاج محشر میں بھی آقاؐ
کہ دلؔ اُنؐ کا ثناخواں ہوگیا ہے

....

ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز

سعودی عرب میں ہندوستانی سفیر ڈاکٹر اوصاف سعید سے ایک مصاحبہ

(ڈاکٹر اوصاف سعید نے سعودی عرب میں ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے جائزہ لے لیا ہے۔ وہ سعودی عرب میں مقیم ہندوستانیوں میں بے حد مقبول ہیں کیوں کہ انہوں نے تمام ہندوستانیوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا ہے۔ اردو شعر وادب سے گہرے لگاؤ کی وجہ سے وہ ہر طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ سعودی عرب میں انہوں نے اردو زبان وادب' ہندوستانی تہذیب وثقافت کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان سے لئے گئے انٹرویو کے اقتباسات قارئین کی نذر ہیں۔)

سوال : سعودی عرب میں بحیثیت سفیر واپسی آپ کے تاثرات؟

جواب : سعودی عرب میں مجھے مختلف حیثیتوں سے تین مرتبہ خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ پہلی مرتبہ 96-1995ء جدہ میں قونصل حج کے طور پر۔ دوسری مرتبہ سکینڈ اور فرسٹ سکریٹری کی حیثیت سے سفارتخانہ ہند ریاض میں 98-1996ء اور 08-2004 تک جدہ میں قونصل جنرل کی حیثیت سے۔ تاہم سعودی عرب میں ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے اپنے تقرر کو سب سے زیادہ اہم اور باوقار سمجھتا ہوں۔ یہ ایک ایسے وقت ہوا ہے جب ہندوستان اور سعودی عرب کے تعلقات اب تک کے سب سے بہترین ہیں جب کہ حال ہی میں رائل ہائینس ولی عہد محمد بن سلمان بن عبدالعزیز السعود ڈپٹی پرائم منسٹر و وزیر دفاع سعودی عرب نے 19 اور 20 رفروری 2019ء کو پہلا سرکاری دورہ کیا جو ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔

سوال : سعودی عرب میں مقیم ہندوستانیوں کے مسائل آپ کی نظر میں؟

جواب : سعودی عرب کے مختلف شعبہ جات میں 27 لاکھ تارکین وطن خدمات انجام دے رہے ہیں اور مملکت سعودی عرب کی ترقی میں اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ ہندوستانی تارکین وطن کو تمام خلیجی ممالک میں بالخصوص سعودی عرب میں ان کی دیانت دارانہ خدمات اور سخت محنت کیلئے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ برسوں سے سعودی عرب کی منسٹری آف سوشیل ڈیولپمنٹ اور تارکین وطن کے مفادات کے تحفظ کے ذمہ دار ہندوستانی اداروں نے ہندوستانی ورکرس کے عام مسائل کی عاجلانہ یکسوئی کیلئے ایک موثر میکانزم بنایا ہے۔ انڈین ایمبسی اور ہندوستانی قونصل خانہ کے کمیونٹی ویلفیئر ونگس ضرورت میں ہندوستانیوں کی بروقت مدد کیلئے ہمیشہ متحرک رہے ہیں۔ ملازمت کی نوعیت' بقایہ جات کی ادائیگی وغیرہ جیسے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیشہ آگے رہے ہیں۔ ہندوستانی برادری کے وہ ارکان جن کے بچے ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے مسائل کا سامنا ہے کیونکہ مملکت سعودی عرب میں تارکین وطن کے بچوں کے لئے مواقع کم ہیں۔

سوال : حج کونسل اور قونصل جنرل کی حیثیت سے آپ کی مقبولیت غیر معمولی ہے' اس کا راز؟

جواب : یہ میری خوش نصیبی ہے کہ ابتداء ہی سے مجھے عوام سے قریب رہ کر خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ پہلے مئی 1993ء سے جنوری 1995ء تک ریجنل پاسپورٹ آفیسر حیدرآباد کی حیثیت سے اور پھر مختلف ممالک میں ایک سفارت کار کی حیثیت سے۔ میں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ میرے اور عوام کے درمیان کوئی

رکاوٹ نہ ہو۔لوگ ای میل،فون یا سوشل میڈیا کے ذریعہ بھی مجھ سے اپنے مسائل سے متعلق رابطہ قائم رکھتے ہیں اور تبادلہ خیال بھی۔اس سے مجھے عوام کی نفس شناسی کا موقع ملا اور مختلف مسائل سے عملی طور پر منصفانہ انداز میں نمٹنے کا موقع ملا۔

سوال : ہندسعودی عرب تعلقات کافی خوشگوار اور مستحکم ہیں' اسے مزید مستحکم کرنے کیلئے بحیثیت سفیر آپ کا رول؟

جواب : ہندوستان اور سعودی عرب کے درمیان صدیوں سے خوشگوار دوستانہ تجارتی اور ثقافتی تعلقات رہے ہیں۔ دونوں ممالک نے مختلف شعبوں میں جیسے تیل اور گیاس،تجارت واقتصادیات انوسٹمنٹ،سیکوریٹی اور دفاعی تعاون میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور بین الاقوامی دہشت گردی کے جنون کا مشترکہ طور پر مقابلہ کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے کیوں کہ اس سے عالم عرب کو خطرہ ہے۔سعودی عرب ہندوستان کے لئے توانائی کا فراہمی کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ہم سعودی عرب سے اپنی ضروریات کا 20 فیصد کچا تیل یہاں سے امپورٹ کرتے ہیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان امریکہ اور چین کے بعد کچے تیل کا تیسرا سب بڑا اصارف ہے۔سعودب عرب چین' امریکہ اور متحدہ عرب امارات کے بعد ہندوستان کا چوتھا سب سے اہم تجارتی پارٹنر ہے۔دونوں کے درمیان 27.48 بلین ڈالرس کی باہمی تجارت ہوتی ہے۔420 ہندوستانی کمپنیاں ہیں۔مملکت سعودی عرب میں جوائنٹ وینچرس یا صد فیصد مالکانہ حقوق کے ساتھ قائم ہیں۔حال ہی میں سعودی عرب نے ہندوستان میں 100 بلین ڈالرس انرجی،رفائننگ،پیٹروکیمیکلز،انفراسٹرکچر،اگریکلچر، منرلس اینڈ مائننگ مینوفیچرنگ،ایجوکیشن اور ہیلتھ کیئر کے شعبوں میں سرمایہ کے فیصلہ کا اعلان کیا ہے۔اس میں سعودی آرامکو کی جانب سے ہندوستان کے ان مغربی ساحلی علاقہ میں دنیا کی سب سے بڑی آئل ریفائنری اور پیٹروکیمکلس کے قیام میں مجوزہ سرمایہ کاری ہے۔بحیثیت ہندوستانی سفیر میری یہ کوشش رہے گی کہ حالیہ اعلیٰ سطحی دورہ کے دوران جن مختلف معاہدات پر دستخط کئے گئے اور جو اہم فیصلے کئے گئے اس پر عمل آوری کے سلسلہ میں متحرک رہوں تاکہ دونوں ممالک کے درمیان باہمی سیاسی،رفاعی،اقتصادی اور عوام سے عوام کے درمیان تعلقات مزید مستحکم ہوسکے۔

سوال : ہندوستانیوں کی کثیر تعداد ہندوستان واپس ہورہی ہے' انہیں روکنے اور انہیں وہاں روزگار فراہم کرنے کے لئے آپ کیا کرسکتے ہیں؟

جواب : ہندوستانی محنت کشوں کی خلیجی ممالک کو روانگی غیر معمولی ہے اور یہ ان ممالک میں ڈیمانڈ اور سپلائی پر منحصر ہے۔ کئی ممالک میں ملازمتوں کو تومیائے جانے کے باوجود ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد نئے روزگار کی تلاش میں خلیجی ممالک کا رخ کررہی ہے۔یو اے ای میں 33 لاکھ اور سعودی میں 27 لاکھ ہندوستانی محنت کش ہیں۔ ہندوستانی تارکین وطن پر تومیانے کی اثرات کو کم سے کم کرنے کے لئے خصوصی اقدامات کئے گئے ہیں۔ ہندوستان اور سعودی عرب کی حکومتوں نے دونوں ممالک کے مائیگریشن پلیٹ فارمس کو e-migrate اور e-tawtheeq کے ذریعہ مشترکہ کردیا ہے تاکہ نقل مکانی کیلئے متحرک و موثر ماحول فراہم کیا جاسکے۔

سوال : سعودی عرب ہندوستان میں ایک بلین ڈالر کا سرمایہ کاری کررہا ہے' کیا ان پراجکٹس میں واپس ہونے والے این آر آئیز کو مواقع مل سکتے ہیں؟

جواب : سعودی عرب کی جانب سے ہندوستان میں مجوزہ سرمایہ کاری مختلف شعبوں میں کی جائے گی جس سے توقع ہے کہ ان شعبوں کو زبردست فروغ حاصل ہوگا۔

سوال : اردو زبان وادب، تہذیب اور ثقافتی فروغ میں آپ نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے' آپ کے بعد سرگرمیاں ختم سی ہوگئی ہیں' کیا آپ کے آنے سے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا؟

جواب : میں نے ہمیشہ کلچرل ڈپلومیسی اور عوام سے عوام کے درمیان روابط کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ یہ دو تہذیبوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے اور سمجھنے میں مددگار ہے۔ جدہ میں میرے قیام اور خدمات کے دوران میں نے پہلا انڈیا فیسٹیول، پہلا ایشین فیسٹول، پہلا ایشین فلم فیسٹول کا سعودی عرب میں اہتمام کیا تھا۔ اس کے علاوہ سعودی وزارت اطلاعات وثقافتی امور کے زیر سرپرستی سعودی انڈیا فرینڈ شپ سوسائٹی قائم کی اور سعودی انڈیا سیول سوسائٹی ڈائیلاگ کا اہتمام کیا۔ یقیناً اس قسم کی مثبت اور تعمیری سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے میں ہر ممکنہ کوشش کروں گا۔

سوال : ریاض یا جدہ میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد؟

جواب : سعودی عرب میں ہندوستانی تارکین وطن کی بہت بڑی تعداد اردو بولنے والوں پر مشتمل ہے۔ میں نے سعودی عرب میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے فاصلاتی تعلیم کے تحت امتحانات کو متعارف کروانے کی حوصلہ افزائی کی تاکہ این آر آئیز کو فائدہ ہوسکے۔ تاہم بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر ان امتحانات کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ 1995ء سے میں نے جدہ میں سالانہ اردو مشاعرہ کے آغاز میں بھی اہم رول ادا کیا۔ یہ سعودی عرب میں ادبی سرگرمیوں میں سب سے مقبول ہے۔ ریاض اور دوسرے شہروں میں بھی مشاعرے اور ادبی سرگرمیوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ 2008ء میں ہندوستانی قونصل خانے کے پرچم تلے جدہ میں ایک بین الاقوامی اردو کانفرنس کا مانو اور کئی سماجی، ثقافتی انجمنوں کے باہمی اشتراک وتعاون سے اہتمام کیا گیا تھا۔ یقیناً تمام ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

سوال : سفیر کی حیثیت سے میعاد کے دوران منصوبے اور خاکے؟

جواب : اپنے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد انشاءاللہ دونوں ممالک کے باہمی اہمیت کے حامل امور کا جائزہ لوں گا اور اس پر توجہ دوں گا۔

سوال : آپ کا پیغام تارکین وطن کے نام؟

جواب : میں تمام ہندوستانی تارکین وطن کو ان کی سخت محنت، دیانت داری ہندوستانی اور سعودب عرب کے درمیان ہم آہنگی کا ذریعہ بننے کے لئے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میں ہر ایک کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ریاض میں ہندوستانی سفارتخانہ اور جدہ میں ہندوستانی قونصل خانہ موافق عوام رویہ اور طریقہ کار اختیار کرے گا اور ہندوستانی برادری کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرے گا۔

....

● ایڈیٹر اردو ویکلی ''گواہ'' حیدرآباد فون:9395381226

(بشکریہ اردو ہفت روزہ ''گواہ'' حیدرآباد شمارہ ۲۲-۲۸ مارچ ۲۰۱۹ء)

نوشاد نوری کا خط منظر شہاب کے نام

معروف ترقی پسند شاعر و ادیب جناب نوشاد نوری کا تعلق دربھنگا بہار سے تھا۔ وہ اُن دنوں لال مُیا (بنگلہ دیش) میں مقیم تھے اور ان کا وہیں انتقال بھی ہوا۔ انہوں نے منظر شہاب کے شعری مجموعہ "پیراہن جاں" پر اپنے تاثرات کا اظہار ایک خط کے ذریعہ کیا تھا جو قارئین کے لئے دلچسپی رکھتا ہے۔ ہم اس خط کو اپنے قارئین کے درمیان زیادہ رکاوٹ نہ بنتے ہوئے من وعن شائع کررہے ہیں تاکہ آپ اس خط سے محظوظ ہوسکیں۔

......ادارہ!

ڈھاکہ: ۶/مئی ۱۹۹۳ء

برادرم منظر شہاب! السلام علیکم

۱۹۹۱ء میں برادرم کلیم ہمرامی نے "پیراہنِ جاں" کا ایک نسخہ پڑھنے کیلئے عنایت کیا تھا۔ کس قدر خوشی ہوئی تھی، کیسی کیسی یادوں نے تڑپایا تھا، بھدول، شاہو بگہہ اور دربھنگہ کا نام سن کر کتنی مسرت ہوئی تھی۔ عجا بھائی یاد آئے، سہیل بھائی یاد آئے اور مظہر امام کی یاد تازہ ہوئی۔ دربھنگہ تمہارا بھی وطن ہو چکا ہے کتنی خوشی کی بات ہے۔ دربھنگہ جہاں کی مٹی سے میرا خمیر تیار ہوا ہے، میں وطن سے کتنی دور آگیا ہوں ایک چھوٹے سے ملک میں۔ کتنے افسوس کا مقام ہے۔ "پیراہنِ جاں" میں تمہارے کلام سے میں نے بہت لطف لیا۔ کئی مقام ایسے آئے جہاں بے تحاشہ گنگنانے اور گانے کا جی چاہا۔ کتنی شعریت ہے کتنی غنائیت۔ ایک میں ہوں جس کی ساری زندگی پوسٹر بازی میں گذر گئی۔

اس سال ڈھاکے میں ماہ اپریل میں منعقد ہونے والی SAARC کی سہ روزہ کانفرنس کے موقع پر کلچرل پروگرام میں اردو غنائیہ کی ذمہ داری مجھے دی گئی تھی۔ افتتاحی اجلاس کے لئے میں نے تمہاری ایک غزل سے چار اشعار انتخاب کیا:

پھر شعلۂ گل، موجِ صبا چاہئے یارو	گلنار گلستاں کی فضا چاہئے یارو
پیراہنِ جاں چاک رہے تیز ہوا میں	طوفان میں جینے کی ادا چاہئے یارو
جتنے بھی دریچے ہیں سبھوں کو نہ کرو بند	اک آدھ دریچہ تو کھلا چاہئے یارو
دل سنگِ ملامت سے حنا رنگ ہے لیکن	کچھ اور رفاقت کا صلہ چاہئے یارو

مختلف زبانوں میں غنائیہ پروگرام پیش ہوئے تھے لیکن پانچ ہزار کے سرکاری افتتاحی اجتماع میں اس غزل نے دھوم مچادی۔ بے خودی کا وہ عالم طاری ہوا کہ مجمع نے گانا شروع کردیا۔ ایک حسین اور جمیل اور خوش آواز گلوکارہ نے سات ایشیائی ملکوں کے مسائل زدہ لیڈروں کی طرف اشارہ کرکے "پیراہن جاں چاک رہے" کی تان لی تو ایک عجیب سماں بندھ گیا۔ سب سے زیادہ لطف اس وقت آیا جب "جتنے بھی دریچے ہیں" کی تان بھرتے ہوئے گلوکارہ نے پاکستانی وفد اور "دلِ سنگ ملامت" کی تان بھرتے ہوئے ہندوستانی وفد کی جانب بازو پھیلائے۔

مختلف زبانوں کے نصف درجن گانوں میں اس کی ہنوز تعریف ہو رہی ہے۔ یہ اب گانا تھا جس نے ٹائم شیڈیول توڑ دیا اور ہر شعر پر بار بار فرمائش ہوئی۔ مہمانوں کے لئے آخری تقریب جہاز کا دریائی سفر تھا جسے کانفرنس کی زبان میں Retreat کہتے ہیں۔ اگر چہ یہ اجتماع ڈھائی سو سے زیادہ نہ تھا مگر اس میں تمام ملکوں کے مندوبین، وزراء، ارکان پارلیامنٹ، اعلیٰ سرکاری افسران اور چیدہ چیدہ شہری شامل تھے۔ آرٹسٹوں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ یہاں بھی غنائی پروگرام اسی طرز پر ترتیب دئے گئے تھے اور کئی زبانوں کی چیزیں پیش کرنی تھیں مگر تمہاری غزل نے بھوٹان اور مالدیپ سے اُن کا حق چھین لیا اور سری لنکا کو نامکمل پروگرام کر کے ہٹ جانا پڑا۔ جاتے ہوئے ایک گلوکارہ نے تمہاری یہ غزل پیش کی:

ہم سفر یاد نہیں لطفِ سفر یاد نہیں | اُس ستمگر کو محبت کی ڈگر یاد نہیں
جانی پہچانی ہوئی راہ گزر یاد نہیں | آنکھ سے دل میں اترنے کا ہنر یاد نہیں
ایک وہ ہے کہ جواب حرفِ وفا بھول گیا | ایک میں ہوں کہ جسے حرفِ دگر یاد نہیں
شاخ در شاخ جنوں خیز بہاراں ہے مگر | مُرغ آوارہ کو اپنا ہی شجر یاد نہیں

جانی پہچانی رہ گزر میں گلوکارہ نے نرسمہا راؤ اور شاخ در شاخ کو نواز شریف کو مخاطب کر کے دریا میں طوفاں اٹھا دیا۔ واپسی میں دن کے جہاز پر کھانے کے بعد اسی گلوکارہ نے دوسری غزل پیش کی:

مجھ کو زنجیر محبت میں گرفتار نہ کر | دل ہے بیمار اُسے اور بھی بیمار نہ کر
ہر نظر پیار کی ڈستی ہی رہی ہے مجھ کو | مہرباں اتنا کرم کر، کہ مجھے پیار نہ کر
اس طرح دیکھ نہ مجھ کو کہ بہک جاؤں میں | اپنی معصوم نگاہوں کو گنہ گار نہ کر
زخم کی سیج پہ پھر اس کو سلانے کے لئے | مرے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار نہ کر

اس غزل میں گلوکارہ نے سبھوں کی طرف اشارے کنائے سے "ہر نظر پیار کی" کے دوران بنگلہ دیش کے ایک صحافی نے آواز کسی His Excellency ہزایکسیلنسی جناب نرسمہا راؤ تو جواب دیں، تو محفل لالہ زار بن گئی اور جب وہ زخم کی سیج الاپ رہی تھی تو ہندوستانی وفد کی طرف سے آواز آئی۔ شری نواز شریف کو پسینے آرہے ہیں اور محفل زعفران زار بن گئی۔ ان غزلوں کے گنگنانے کے اب زبردست چرچے ہیں۔

بہت خوبصورت اور غنائیہ غزلیں ہیں تمہاری۔ ہر غزل کے لئے نامی گرامی موسیقار نے کئی دھنیں بنائی تھیں اور ان میں میں نے اس دھن کا انتخاب کیا جو اردو کے مزاج کے مطابق ہو اور سننے والے کو اسیر کرائے۔ گلوکارہ کو لے کر میں نے تلفظ پر محنت صرف کی اور خدا کا شکر ہے کہ ف، غ، ق، ذ کی غلطیاں نہیں ہوئیں۔ کون سے اشعار کی تان کس شخصیت پر ٹوٹے گی اس کی بھی ٹریننگ دی گئی تھی بہ حسن و خوبی یہ تقریب انجام پائی اور بنگلہ دیش میں اردو سے عصبیت کا دباؤ ذرا ڈھیلا پڑا۔

تمہارا: نوشاد نوری

انور عظیم

جب شاعر کہے: ''پیراہن جاں چاک رہے تیز ہوا میں''

ابھی پچھلے ہفتے جب میں اپنے کالم میں محمد حسن کے اردو تھیٹر کے تصور پر بات چیت کر رہا تھا تو میری میز پر محمد حسن کا ایک اور خط تھا جو کسی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہو سکا، یہاں نقل ہے:

ڈی ے، ماڈل ٹاؤن، دہلی-۹ ۹ر جنوری ۱۹۸۰ء

''مجی، تسلیم۔ الفاظ کے نئے شمارے میں آپ کا افسانہ ''گرد'' پڑھا، پہلا حصہ بہت پسند آیا۔ مگر خاتمے نے مطمئن نہیں کیا۔ آپ کے ادھر کے افسانوں میں یہ افسانہ اپنی بے تکلفی نرمی اور بے محاباپن کی وجہ سے تپتی جون کی پہلی بارش کی طرح فرحت بخش ہے۔ شکریہ! خاکسار محمد حسن''

اس خط کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ اس لئے کہ اس میں معاصرین کے ردعمل اور ہم کلامی کی تنقیدی سطح ملتی ہے اور کہیں دوستانہ غلو کا نشان نہیں ہے۔ یہ باہمی ردعمل کا بے ریا طریقہ ہے جو معاصرین کی صحت مند عصریت کی روایت رہی ہے۔

معاصرین کی عصریت کی شناخت میں صرف ذاتی خطوط ہی نہیں بلکہ وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو احباب ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کتاب مجھے بہار سے بھیجی ہوئی ملی۔ کتاب کے سرورق پر تصنیف کا نام ''پیراہن جاں'' بہت ہی دیدہ زیب انداز میں لکھا ہوا ہے۔ یہ ایک شاعر کے کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ کوئی ایسا ویسا شاعر نہیں ہے۔ یہ منظر شہاب ہے، منظر شہاب۔ یہ کتاب کیا آئی مجھے ایک کھویا ہوا دوست مل گیا۔ وہ گنگنا رہا تھا:

پیراہنِ جاں چاک رہے تیز ہوا میں　　طوفان میں جینے کی ادا چاہئے یارو

ہماری دوستی اسی دور کی کھوئی ہوئی شناخت ہے، جو اب بیالیس سال بعد مجھے اس کتاب میں دکھائی دے رہی ہے اور میں ان شعروں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دیکھ رہا ہوں: ایک نرم آواز جو فراق کے شعلہ آواز سے ذرا مختلف ارتعاش پیدا کر رہی ہے... ہونٹ خاموش ہیں مگر آنکھوں میں آئینے سے ٹوٹ رہے ہیں، ہم خدا بخش لائبریری کے سائبان میں بیٹھے ہیں اور سوچ رہے ہیں کل کیا ہوگا۔ میں کبھی کبھی ایم اے کے امتحان سے بھاگ کر کہیں غائب ہو جانا چاہتا ہوں۔ اور اس دوست کی بڑی بڑی آنکھیں میری آستین کھینچتی ہیں۔ ایک چھوٹا سا ہوٹل جہاں میرا اُدھار کھاتا چلتا ہے، اور میں مسالے دار کلیجی گلے سے اتارتے ہوئے سوچتا ہوں، آخر کہیں نہ کہیں سے حساب تو چکانا ہی پڑے گا۔ پھر ایسا وقت بھی آتا ہے جب ہوٹل کی بجائے خدا بخش لائبریری کے کونے والے منظر شہاب کے کمرے میں رہتا ہوں۔ ایک ہی پلنگ پر دونوں سوتے ہیں۔ لائبریری کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے بچوں کا ٹیوشن منظر شہاب کے لئے کھانا مہیا کر دیتا ہے۔ اسی کھانے میں میرا اور منظر شہاب دونوں کا گذر ہوتا ہے۔ اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ کل ہم پر فاقے کے دن گزر سکتے ہیں۔ تب میں آوارہ و تنہا تھا لیکن منظر شہاب کی طرح رجائیت کی آگ میں تپتا ہوا۔ وہ کیا چیز تھی جس نے ان دنوں مجھے مرنے نہیں دیا۔ اور شاید یہ اچھا ہی ہوا، میرے لئے اور موت، دونوں کے لئے۔ اب تو چل چلاؤ کا وقت ہے۔ اور بہت سہانا وقت ہے۔ ایسے میں منظر شہاب کا یوں آجانا — اور شعروں

سے، ماضی کی یادوں سے، میرے وجود کو معنی خیزی کا ایک نیا ادراک عطا کرتا، عجیب حادثہ ہے زندگی کا!

تب کی بات ہے جب منظر شہاب کا موڈ کبھی کبھی بے حد یاس انگیز ہوتا تھا جو اس نظم میں آئینے کی طرح عکس آفریں ہے، خود اپنی حسرتوں سے بے نیاز:

سیاہ شب، یہ فضاؤں میں رینگتے سائے ہر ایک سمت خموشی ہے پنکھ پھیلائے

جمالِ شہر اندھیروں کی چوٹ سے گھائل

یاس کا مشاہدہ، بے ثباتی کی گھٹائیں، شاعر پر جذباتی اوس کی بارش۔ اور اجنبیت اور کنارہ کشی کی دھند میں لپٹی ہوئی اپنے آپ سے گریزاں دھار، یہ سب کیا ہے۔ کیا یہ سب اپنے آپ میں جذب ہو جانے کی حیرت انگیز کوشش نہیں؟ منظر شہاب تم نہیں بتاؤ گے مگر اب تم اپنے اگلے اشعار پڑھو اور خود اپنے رویے کو سمجھنے کی کوشش کرو اور دیکھو کہ یہ اس زمانے کا موڈ تھا جب مجاز اور جذبی کا آہنگ ہمارے دور کی شاعرانہ فسوں کاری میں ڈھل گیا تھا: وہی غمِ دل، وہی وحشتِ دل:

سجی سجی سی دکانیں، نہ قمقموں کے نجوم نہ ہی گل رخوں کے گلستاں، نہ قامتوں کے ہجوم

نہ شاخِ بازوئے تاباں، نہ صندلیں رخسار نہ آنچلوں کے کنارے، نہ گیسوؤں کی بہار

نہ قہقہے، نہ اشارے، نہ شوخیاں، نہ حجاب نہ زر نگار تکلف، نہ ریشمی آداب

شعاعِ نور کی یورش، نہ روشنی کا جلوس نہ جگمگاتے مناظر، نہ سیمگوں لمحات

نہ ریڈیو پہ تھرکتے طرب فزا نغمے نہ ناچ گھر میں چھناکے، نہ میکدے آباد

ہر ایک سمت خموشی، ہر ایک سمت قرار

بہت کم لوگ، جوان ساعتوں کے ارتعاش کو اپنے دلوں میں چھپا کر، زمانے بھر کی انسان شکنی کے طوفان سے گزرے ہیں، ہر ایسے شاعر کے قدموں کی آہٹ پر پلٹ کر ماضی کی طرف دیکھیں گے جب اس کی نارسائی اور اس کے جیسے انگنت لوگوں کی خواب پیمائی ان کو تنہا چھوڑ گئی تھی۔ جھیلو، اپنے آپ کو تنہا جھیلو، اس عہد کا رومانی پیغام بس اتنا تھا۔

یاد کرو ان لمحات کی گرمیٔ احساس کو اور دیکھو تمہارے نوجوانی کے جذبات میں کتنی حسن کاری اور تخلیقی سپردگی تھی جس کے بغیر کوئی شاعری نہیں ہو سکتی: یہ میرا خیال ہے۔ یہ کوئی عالمانہ مسلمہ نہیں ہے: تمہیں، تمہارا نظریاتی شعور ہاتھ پکڑ کر اٹھائے گا اور تم کو احساس ہوگا کہ اگر نظریہ پرستی تخلیق کار کو اس کے قدرتی رومان سے الگ کر دے تو یہ بہت بڑا ظلم ہے اور ایسا ظلم صرف سنیاس اور بن باس کے عہد میں روا ہو سکتا ہے۔ آؤ ابھی تمہارے ذہن کی گونج سنیں:

یہ میرے ذہن میں یادوں کے مسکراتے کنول / کسی کی نرگسی آنکھوں کی مشتعل تنویر / کسی کی مخملیں زلفوں کا رینگتا ہوا لمس / کسی کے ہونٹ کی رس گھولتی ہوئی کلیاں / کسی کے جسم کی قربت کے گرمیٔ احساس

یہ گنگناہٹ...... عہد کے جذبے کی مٹھاس اور کربنا کی ہے، جس کا کوئی انت نہیں ہے، احساس کا وہ خنجر، جو تم نے دل میں چھپا رکھا تھا، اپنا کام کر گیا۔ ہر بار جب ہمارے خوابوں کا خون آستین پر یا تکیے پر ٹپکتا ہے تو یہی لگتا ہے کہیں دور جنگل میں آگ لگی ہے اور وادی میں اجالا ہو رہا ہے۔

....

(بہ شکریہ: روزنامہ ''قومی آواز'' نئی دہلی، ہفتہ وار ضمیمہ ۱۶ر جنوری ۱۹۹۴ء)

مظہر امام

منظر شہاب: پیراہنِ جاں اور تیز ہوا

خلیل الرحمن اعظمی نے اپنی مشہور تصنیف ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' میں جس کی تکمیل ۱۹۵۷ء میں ہوئی، اس تحریک سے متاثر ہونے والے نوجوان شعرا میں ابن انشاء، رفعت سروش، باقر مہدی، حسن نعیم، بلراج کومل، قاضی سلیم، وحید اختر، عمیق حنفی، شاذ تمکنت وغیرہ کے ساتھ منظر شہاب کا بھی نام لیتے ہوئے لکھا تھا:

''یہ وہ شاعر ہیں جن کی اُٹھان ۱۹۴۷ء کے بعد کی ہے، اس لئے ان میں سے بعض نے انتہا پسند گروہ کا بہت کم ساتھ دیا ہے، بعض ایسے بھی ہیں جو خاصی حد تک اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔''

یہ تو صحیح ہے کہ منظر شہاب ترقی پسند ادبی تحریک سے قریبی طور پر وابستہ رہے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے انتہا پسند گروہ کا کبھی ساتھ نہیں دیا اور ناموں کی بھیڑ میں اپنی الگ پہچان باقی رکھی۔

پانچویں دہائی کے اوائل میں ان کا کلام اس وقت کے معتبر رسائل کے ذریعہ عموماً اور ''شاہراہ'' کے توسط سے خصوصاً اپنے قاری کا ایک بڑا حلقہ بنانے میں کامیاب رہا۔ ان کی بعض غزلوں اور ''ساقی نامہ''، ''ایک رات'' اور ''چاندنی رات''، جیسی نظموں نے انہیں نوجوان شاعروں میں جلد ہی ایک قابلِ لحاظ مقام عطا کیا۔ ان نظموں نے جمیل مظہری، آل احمد سرور، احتشام حسین اور اختر اورینوی جیسے صاحبانِ نظر سے بھی داد حاصل کی تھی۔ چھٹی دہائی کے وسط سے اپنی منصبی مصروفیات کے باعث منظر شہاب شعر گوئی کی طرف اس تندہی سے توجہ نہ دے سکے جس کا تقاضا ان کی تخلیقی صلاحیتیں کر رہی تھیں۔ شعر گوئی کی رفتار سُست ضرور ہوگئی لیکن جب بھی کوئی زبردست محرک سامنے آیا ان کی تخلیقی جولانیاں پھر کرشمہ دکھانے لگیں۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۸ء تک کے کلام پر مشتمل ''پیراہن جاں'' منظر شہاب کا پہلا مجموعہ ہے، جس کی اشاعت اس وقت ہوئی جب ان کی عمر ۶۲ سال سے تجاوز کر چکی تھی گویا ان کا شعری سرمایہ ۴۱ سال کے طویل عرصے کو محیط ہے۔ اس میں ۲۳ نظمیں، ۴۲ غزلیں، چھ رباعیات، تین آزاد قطعات اور دو گیت شامل ہیں۔

منظر شہاب نے جس زمانے میں شاعری شروع کی، وہ اُردو ادب میں گھن گرج کا، خطابت کا، بلند آہنگی کا دور تھا اور اس وقت کے بیشتر شعرا اونچی آواز میں 'عوام' سے خطاب کر رہے تھے۔ عوامی شاعری کے تصور نے ایک مخصوص فارمولا وضع کر رکھا تھا اور ہر شاعر اسی سُر میں سُر ملا رہا تھا۔ منظر شہاب ابتدا سے ہی اپنی شاعری کو اس شور و شغب سے بچائے رکھا۔ ان کی پہلی نظم ''سنہرے لمحے'' (۱۹۴۸ء) جس کا موضوع انقلاب ہے، کا آغاز اس نرم و نازک لہجے سے ہوتا ہے:

سنہرے لمحے/ نئی سحر کے سنہرے لمحے/ رُخِ جہاں سے ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں/
ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں، فضا کو زرّیں بنا رہے ہیں

اور یہ لہجہ آخر تک برقرار رہتا ہے!

اس زمانے کے مقبول موضوعات سے منظر شہاب نے اجتناب نہیں برتا۔ ان کے یہاں بھی امنِ عالم کی ضرورت کا احساس ہے، وہ بھی چین کی آزادی کا استقبال کرتے ہیں، لیکن ان کا لہجہ کہیں درشت اور تیز نہیں ہوتا۔ اگر تھوڑی بہت بلند آہنگی ان کی کسی نظم میں ملتی ہے تو وہ "ساقی نامہ" ہے:

گلستانِ چین آج گلنار ہے — بہار اپنی قسمت پہ سرشار ہے
وہ چینی جو مجبور و محکوم تھے — وہ چینی جو مفلوج و مظلوم تھے
وہ چینی جو فاقوں میں پلتے رہے — وہ چینی، لہو جو اُگلتے رہے
بالآخر وہ تیور بدلنے لگے — بغاوت کے شعلے مچلنے لگے
بالآخر علم کے علم اُٹھ گئے — بالآخر قدم کے قدم اُٹھ گئے

اگر اسے بلند آہنگی سے تعبیر کیا جائے تو اس کی نوعیت وہی ہے جو اقبال کی اسی عنوان کی نظم میں ہے:

پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دِکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ دونوں نظموں کی "بلند آوازی" بڑی خوش آہنگ ہے۔ ان دونوں مثنویوں کا عنوان "ساقی نامہ" ہے اور دونوں کی بحر ایک ہی ہے۔ منظر شہاب نے بلاشبہ اقبال سے تحریک حاصل کی ہے۔ لیکن ان کی فکر اقبال کے بعد کے اس عالمی منظر نامے کو پیش کرتی ہے جو بیسویں صدی کے دوسرے نصف کے اوائل میں اپنا اثبات کرر ہا تھا۔

منظر شہاب کی شاعری عام طور سے بالواسطہ اظہار کی شاعری ہے۔ ہر چند انہوں نے وقتی مسائل کے تعلق سے بھی نظمیں اور اشعار کہے، مگر چونکہ ان کا مزاج بنیادی طور پر رومانی آرائش کو ترجیح دی اور تحریک کے سیاسی نظریے سے اتفاق رکھتے ہوئے بھی شاعری کو شاعری کی طرح برتا۔ انہوں نے رمزیت اور ایمائیت سے بھی حسبِ ضرورت خلاقانہ کام لیا اور استعارہ سازی اور پیکر تراشی سے بھی اپنی تخلیقات کو تہہ داری عطا کی۔ ان کی شاعری صرف غمِ دوراں کی شاعری نہیں ہے، اس میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ ذات بھی ہے۔ انھوں نے انفرادی احساس اور تجربے سے اپنی شاعری کا نگار خانہ سجایا ہے۔ ان کے کلام کو ان کے دلآویز ڈکشن کے حوالے سے بھی دیکھنا چاہئے۔ "پیراہنِ جاں" کا مطالعہ کرتے ہوئے خوش رنگ آوازوں اور خوش آواز رنگوں سے قدم قدم پر معانقہ ہوتا ہے!

مجھے منظر شہاب کی نظموں میں "ایک رات" سب سے زیادہ پسند آئی۔ یہ نظم امنِ عالم کی خواہش پر منتج ہوتی ہے۔ امن ایک زمانے میں ترقی پسندوں کا خاص موضوع تھا، مگر اس موضوع پر عموماً اتنی سپاٹ، بے اثر اور بے رنگ شاعری کی گئی کہ اس سے ایک طرح کی کراہت محسوس ہونے لگی تھی، لیکن منظر شہاب نے اس نظم میں پُر کشش اور پُر اثر طرزِ اظہار اختیار کیا ہے۔ اسے ایک ایسی نجی مانوسیت عطا کی ہے اور اس میں اپنی شخصیت کا ایسا گداز بھر دیا ہے کہ یہ نظم معیاری اور مثالی شاعری کا نمونہ بن گئی ہے۔ پوری نظم اس لائق ہے کہ اسے نقل کیا جائے لیکن اس کا یہ موقع نہیں۔ فی الحال ادھر اُدھر سے کچھ ٹکڑے:

سجی سجی سی دکانیں، نہ قمقموں کے نجوم ـــــ نہ گل رُخوں کے گلستاں، نہ قامتوں کے ہجوم
نہ قہقہے، نہ اشارے، نہ شوخیاں، نہ حجاب ـــــ نہ زرنگار تکلف ، نہ ریشمی آداب
نہ ریڈیو پہ تھرکتے طرب فزا نغمے ـــــ نہ ناچ گھر میں چھناکے، نہ میکدے آباد
یہ آسماں پہ دبے پاؤں گوپیوں کا سفر ـــــ زمیں پہ پھیلتا گنگا کی بانسری کا یہ راگ
مراد پور کی گلیاں، یہ اونگھتا رومان ـــــ یہ اسپتال، یہ میداں، یہ کالجوں کی قطار
یہ اونچے اونچے کتب خانے فکر میں سرشار ـــــ یہ ہوسٹل، یہ جواں سال قہقہوں کا دیار
یہ چٹکلے ، یہ لطیفے ، یہ گالیوں کی مٹھاس ـــــ یہ بات بات میں جمنا کی موج کا عالم

منظر شہاب نے ''ساقی نامہ'' میں چینی انقلاب کی ہم نوائی کی،لیکن ۱۹۶۲ء میں جب چینی فوجیں ہماری سرزمین کی سرحد پر حملہ آور ہوئیں تو انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار نظم'' دو ملک دو کہانی'' میں کرتے ہوئے اشتراکی فکر پر بھی سوالیہ نشان قائم کیا:

چین جس کی پُرخلل نیت ہوئی ـــــ کم نگاہی شاملِ طینت ہوئی
اٹھ گیا بازار سے نقدِ وفا ـــــ بے وفائی شوق کی قیمت ہوئی
دشمنِ جاں بن گئی ہے دوستی ـــــ کیا مصیبت یار کی صحبت ہوئی
دم بخود ہے اشتراکی فکر گاہ ـــــ منتشر مسلک کی جمعیت ہوئی
جس کی اِک اِک بوند کو امرت کہیں ـــــ مشتبہ اس جام کی صحت ہوئی

اشتراکی تحریک سے وابستہ رہنے کے باوجود جب منظر شہاب نے محسوس کیا کہ اس کے رہنماؤں نے مصلحت کوشی اور زرپرستی کی بناپر انقلابی جدوجہد سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے تو انہوں نے کہا:

ہم ہوگئے اسیر طلسماتِ زرگری ـــــ جوشِ جنوں کو، عزمِ بغاوت کو کیا ہوا؟
سرسے کفن تو باندھ کے نکلے تھے سرفروش ـــــ دار و رسن کو،شوقِ شہادت کو کیا ہوا؟

اشتراکیت ایک زمانے میں اور ایک عرصے تک انسانی امید کی آخری پناہ گاہ تھی لیکن آہستہ آہستہ اس کا طلسم بھی ٹوٹنے لگا۔کوئی اور پناہ گاہ؟ کوئی اور منبع امید؟ یہ مقطع دیکھئے:

زرد پتوں کی مانند بکھرا کئے ،سرخ پھولوں کی چاہت میں منظر شہاب
اب تو بہتر ہے سپنوں کی انگنائی میں ایک ننھا سا تلسی کا پودا لگائیں

ترقی پسند شاعری میں رجائیت کو ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔منظر شہاب کی شاعری میں بھی امید ورجا کے نقوش جا بجا ملتے ہیں۔اور یہ اوپر سے اوڑھی ہوئی مصنوعی رجائیت نہیں ہے، بلکہ ان کے بطون سے اور ان کے طرزِ احساس سے پھوٹی ہے،لیکن چونکہ وہ ایک دردمند اور حساس دل رکھتے ہیں،اس لئے زندگی کے تاریک پہلو انہیں مایوس اور ناامید بھی کرتے ہیں،ان کے اندر غم وغصہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ایسے بہت سے اشعار ہیں اور ایک غزل تو اول تا آخر یاسیت آمیز ہے:

مری آنکھ روئے لہو نہ کیوں، مجھے دل نہیں کہ جگر نہیں

آج کی شاعری کا ایک اچھا خاصا حصہ فرقہ وارانہ منافرت اور فسادات اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات، قتل و خون، غارت گری، تباہی اور ان کے مضمرات کو کسی نہ کسی عنوان سے پیش کر رہا ہے۔ لیکن اب سے بہت پہلے ۱۹۶۴ء میں جب منظر شہاب جمشید پور میں خود اس مرحلۂ خاک وخوں سے گزرے تو انہوں نے کہا:

وہ صبحِ غم، وہ شامِ سوگواراں ہم نہ بھولیں گے ۔۔۔ لہو کی آگ میں جلتا گلستاں ہم نہ بھولیں گے
ستم کے گھاٹ پر روشن چتائیں مہ جبینوں کی ۔۔۔ ہوس کی سیج پر بے خواب خوباں ہم نہ بھولیں گے
نہ جانے کیا وہ کہتی تھیں، نہ جانے کس کو تکتی تھیں ۔۔۔ وہ پتھرائی ہوئی چشمِ غزالاں ہم نہ بھولیں گے
شہیدوں کے لہو سے تر بہ تر راہیں اہنسا کی ۔۔۔ اہنسا کی قسم، خونِ شہیداں ہم نہ بھولیں گے

انہیں اس سے بھی زیادہ اذیت ناک تجربے سے ۱۹۷۹ء میں دوچار ہونا پڑا، جب مشہور افسانہ نگار زکی انور بھی درندوں کی وحشت کا شکار ہوئے۔ اس موقع پر منظر شہاب نے ایک نظم بھی کہی "ماتم زکی انور کا" اور ایک غزل بھی، جو اپنے تاثر کے اعتبار سے ایک بلند درجہ رکھتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

بارشیں خون کی تیز ہیں، تیز ہیں خون کی آندھیاں ۔۔۔ چاک در چاک اُڑنے لگیں خون میں زیست کی چھتریاں
رات پٹرول کی آگ سے شہر میں یوں چراغاں ہوا ۔۔۔ کانپ کر بجھ گئیں دل کے روشن جھروکوں کی سب بتیاں
بے اماں خلق، کرفیو زدہ، روز و شب کے اندھیرے میں گم ۔۔۔ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے اپنے کتبات کی تختیاں
دونوں ہی لکھ رہی تھیں لہو سے مرے سانحہ قتل کا ۔۔۔ اک طرف حملہ ور آستیں، اک طرف پاسباں وردیاں

اور اسی تعلق سے یہ بلیغ اشارہ بھی ایک جہانِ معنی رکھتا ہے:

سراغِ قتل، شہادت، ثبوت، سب گونگے ۔۔۔ لہو خموش تھا، خنجر بھی بے زباں نکلا

محبوب، عاشق اور رقیب کا تصور منظر شہاب کے یہاں روایتی نہیں، بلکہ موجودہ سماجی پس منظر میں ہے اور آج کی فضا سے ہم آہنگ ہے۔ وہ رقیب میں آداب دل دہی دیکھتے ہیں اور اسے "باوضع خوش جفا" قرار دیتے ہیں۔ یہاں فیض کی مشہور نظم "رقیب سے" بے اختیار یاد آتی ہے۔ "خوش جفا" کی تازہ کار ترکیب بھی قابلِ لحاظ ہے:

بہ وقت رشک بھی آدابِ دل دہی کا لحاظ ۔۔۔ مجھے رقیب سا باوضع خوش جفا نہ ملا

اس غزل کے ایک دوسرے شعر میں عاشق کی اَنا کا اظہار حقیقی پیرائے میں ہوا ہے —— وہ اَنا جو اسے آج کے زمانے میں مجنوں اور فرہاد جیسا "عاشق صادق" بننے نہیں دیتی۔ اس شعر میں "خود ادا" کی ترکیب بھی توجہ طلب ہے:

میں خود ادا ہی سہی، زعمِ حسن تو ٹوٹا ۔۔۔ بلا سے عاشق صادق کا مرتبہ نہ ملا

اردو غزل میں محبوبہ کے لئے بھی تذکیر ہی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اور ذہن اس سے کچھ اس طرح مانوس ہو چکا ہے کہ اگر اتفاقاً کہیں تانیث کا صیغہ استعمال ہو تو اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ لیکن منظر شہاب نے اپنے ایک شعر میں اسے اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس کا لطف دوبالا ہو گیا ہے:

یہ رنگ و بوئے دل آرا، یہ پیکرِ شاداب ۔۔۔ بھرے شباب میں لگتی ہو گلستاں کی طرح

اسی غزل کا یہ لطیف شعر بھی دیکھئے:

فریب کار سہی، دل کا غمگسار تو تھا　　وہ اک خیال جو برسوں رہا گماں کی طرح

عشق وطلب کے متعلقات منظر شہاب کے تجربے کا حصہ بن گئے ہیں:

وہ بے زبان تکلم، وہ بے صدا ترسیل　　خموش رہ کے بھی سب کچھ کہا کہا سا ہے

یہ التفات کہ خود ہی وہ آ گئے اکثر　　یہ بے رخی کہ مہینوں اتا پتا نہ ملا

محبت صرف نفاستِ روح ہی نہیں، لطافتِ بدن بھی ہے۔ عشق کی جلوہ سامانیاں کئی روپ اختیار کرتی ہیں۔ منظر شہاب کے اشعار میں یہ زندہ صداقتیں دیکھئے:

عظیم تر ہے محبت میں روح کا رشتہ　　مگر بدن کا تعلق بھی درمیاں نکلا

واقعہ یوں بھی گزرتا ہے سرِ کوچہ عشق　　ایک چاہت کئی محبوب میں بٹ جاتی ہے

منظر شہاب کے یہاں موضوعات کا بھی تنوع ہے اور اسلوب و اظہار کا بھی۔ ہندی رس سے استفادے کا ثبوت ان کے گیت ہی نہیں ان کی نظم ''لہو ترنگ'' بھی ہے۔ انہوں نے بعض ایسے انگریزی الفاظ بھی نہایت دلکشی کے ساتھ اپنی غزلوں میں استعمال کیے ہیں جو ہماری روزمرہ کی بول چال کا ہی نہیں، بلکہ موجودہ طرز حیات کا بھی حصہ ہیں۔ مثلاً بس، کلب، ہلو۔ یہ اشعار دیکھئے:

تمام بس کے مسافر میں اضطراب سا تھا　　کہ اک نظر بھی اسے دیکھنا ثواب سا تھا

گھر کا آنگن ہو کہ دفتر کہ کلب یا خلوت　　کائنات آپ کے پیکر میں سمٹ جاتی ہے

'ہلو' پہ میرے، تبسم کا پردہ ڈال دیا　　بڑھایا ہاتھ تو 'آداب' کہہ کے ٹال دیا

منظر شہاب کو ہیئتی تجربوں سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک ایسی غزل بھی ملتی ہے جو اس کی متعین ہیئت کے مطابق نہیں ہے۔ یعنی اس کا آخری شعر مطلع کی صورت میں ہے اور اس کی ردیف اور قوافی غزل کے دیگر اشعار سے مختلف ہیں۔ اس طرح کی ہیئت میں صرف اقبال کے یہاں دو غزلیں ملتی ہیں۔ ایک ''بال جبریل'' میں اور ایک ''زبور عجم'' (فارسی) میں۔ منظر شہاب کی اس غزل میں تھوڑا سا فرق یہ ہے کہ آخری شعر ان کا اپنا نہیں ہے بلکہ حافظ کا مشہور مطلع ''ساقی بہ نورِ بادہ......'' ہے۔ میرا خیال ہے ان اشعار کو کوئی عنوان دے کر بہ آسانی حصۂ نظم میں شامل کیا جا سکتا تھا۔

منظر شہاب نے اس سے آگے بڑھ کر ''آزاد قطعہ'' کا تجربہ کیا ہے۔ آزاد نظم کے بعد آزاد غزل اور آزاد رُباعی کے تجربے ہوئے ہیں۔ مگر ''آزاد قطعہ'' کا تجربہ پہلی بار انہوں نے ہی کیا ہے۔ وہ اس کے بانی بھی ہیں اور خاتم بھی۔ نمونے کے طور پر ایک ''آزاد قطعہ'' دیکھئے:

تیرے پیکر کے چھلکتے ہوئے ساغر میں مرا حصہ ہے اتنا، مجھے معلوم نہ تھا\
میں ہوں پیاسا مگر اس درجہ ہوں پیاسا، مجھے معلوم نہ تھا\
یہ کڑی دھوپ یہ مسموم ہوائیں، یہ ترے پیار کی خلوت گاہیں

میرے ہر درد کا تو ہی ہے مداوا، مجھے معلوم نہ تھا

(ان دو "اشعار" کو آزاد غزل کے شعر بھی کہا جا سکتا ہے۔)

مجموعے کی ترتیب کے وقت منظر شہاب نے ایک دو نمایاں تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ جو نظم "پہاڑی لیلیٰ" کے نام سے شریک مجموعہ ہے "ادیباسی حسینہ" کے نام سے چھپی تھی۔ مجھے یہی عنوان زیادہ پسند ہے۔ اس نظم کا آخری مصرع جواب یہ ہے: اک قیامت پہاڑی لیلیٰ ہے

پہلے اس طرح تھا: ادیباسی حسینہ فتنہ ہے

اسی طرح ایک غزل کی ردیف جو پہلے "ڈر لگتا ہے" تھی، اب بدل کر "جی ڈرتا ہے" ہو گئی ہے میرے خیال میں "ڈر لگنا" خلاف محاورہ نہیں ہے۔ اب سے قریباً چالیس سال پہلے منظر شہاب کی متعلقہ ردیف "ڈر لگتا ہے" کے حوالے سے مہینوں بحث چلی تھی۔ یہ تبدیلی شاید اسی سے متاثر ہو کر کی گئی ہے۔

منظر شہاب خوش کلام شاعر ہیں۔ انہیں خود بھی اس کا احساس ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مقطع میں یہی بات بہ عنوان دیگر کہی ہے:

فسانہ تلخ ہے اور ضد کہ لطف سے کہیے مگر شہاب بہ ایں درجہ خوش کلام نہیں

ان کے دو مقطعے اور دیکھیے۔ یہ تعلی نہیں، بیانِ واقعہ ہے:

تیرے اشعار میں اعجازِ تاثر ہے شہاب! رگِ افکار کو تو خونِ جگر دیتا ہے

لوگ جس کو شہاب کہتے ہیں سخت کافر ہے، شعر کہتا ہے

منظر شہاب تہذیب فن کے شاعر ہیں۔ یہ بات زور دے کر اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آج کی شاعری میں خوش کلامی کا عنصر عنقا ہو چکا ہے اور زبان و بیان کے حسن کو روایتی ذہن کی علامت سمجھ کر بہ نظر تحقیر دیکھا جا رہا ہے۔ منظر شہاب زندگی کی تلخ حقیقتوں کے اظہار کے لئے بھی شیریں بیانی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے حساس فنکار ہیں جس کا آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلتا رہا ہے۔ اپنے کلام میں اثر پیدا کرنا ہما شما کے بس کی بات نہیں: معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود۔ خونِ جگر ہی ہر فن کو اثبات دیتا ہے۔ اسی خونِ جگر نے منظر شہاب کے کلام میں بھی لطف و اثر پیدا کیا ہے۔ یہ خوش کلامی، یہ اثر آفرینی، تیز ہوا میں پیراہنِ جاں چاک رکھنے کی ادا منظر شہاب کی شاعری کو درجۂ اعتبار بخشتی ہے۔ ایسے دور میں جب بہت سے سود بخش کام کئے جا سکتے ہیں، شاعری سے رشتہ استوار رکھنا واقعی بڑی جرأت چاہتا ہے۔ آج کے زمانے میں شعر کہنا، سچے شعر کہنا، کفر اور کافری سے کم نہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام کی ابتدا میں ہی اس شعر سے ملاقات ہوتی ہے۔ جس کے حوالے سے اس کتاب کا نام رکھا گیا ہے:

پیراہنِ جاں چاک رہے تیز ہوا میں طوفان میں جینے کی ادا چاہئے یارو!

یہی کج کلاہی، یہی بانکپن، منظر شہاب کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

....

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ ☆ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

رفعت سروش

منظر شہاب کی غزل ''مجروح پرندے کی صدا'' کے حوالے سے

مشہور ادیب اور شاعر منظر شہاب کی غزلوں کا مجموعہ میرے ہاتھ میں ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے ہم عصروں پر لکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ ہم سب ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں اور اگر سوچ بھی ایک جیسی ہو تو کلام پڑھتے پڑھتے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ اس نے ایسے لکھا اور ہم نے ایسے۔ اس نے یوں لکھا اور ہم نے اس بات کو دوسرے زاویئے سے سوچا یا کاش ایسا شعر ہم بھی لکھ سکتے۔ دراصل ایسے ہم عصروں پر لکھنا اپنے آپ کو تنقید کی دھار پر لکھنے کے مترادف ہے۔ اور کچھ ایسا ہی حال میرا اس قت ہے جب میں منظر شہاب کی غزلوں پر اظہار خیال کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

اب سے کئی سال قبل میں نے منظر شہاب کے نثری مضامین 'اور پھر بیاں اپنا' پر ایک مختصر مضمون لکھا ہے جو میری کتاب 'بہار نو بہار' میں موجود ہے۔ ان کی شناخت بحیثیت ایک ترقی پسند شاعری میں، ایک سرگرم ترقی پسند کی طرح تھی۔ جس نے مظہر امام کے ساتھ ایک ترقی پسند رسالہ 'نئی کرن' نکالنے پر قید و بند کی صعوبتیں جھیلی تھی اور منظر شہاب کی اس کتاب میں صلح پسندی (یا مصلحت) کا ایک ایسا منظر آیا ہے کہ انہوں نے کتاب کو معنون کیا ہے سجاد ظہیر، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے نام گویا ''رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی'' اور پھر نذر کیا ہے اس شعری مجموعے کو مابعد جدیدیت کے معروف ناقد وہاب اشرفی کے نام۔ گویا چاروں کھونٹ میں پرچم گاڑ دیا۔ یہ دراصل اس دور کا تقاضا ہے کہ جس میں تمام ادبی قدریں اتھل پتھل ہو چکی ہیں اور تنقید نگاروں کی چودھراہٹ کے اس دور میں تخلیق کار کی عافیت اس میں ہے کہ 'با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام' کے اصول پر کاربند رہے۔

'مجروح پرندے کی پہلی صدا' تو واقعی دل پُر درد کی صدا ہے اور غزل کے گھائل لب ولہجہ کی صدا کی بازگشت:

آنسوؤں کے دیئے رات بھر جلتے بجھتے رہے رات بھر
قطرہ قطرہ ٹپکتا لہو دل میں نشتر چبھے رات بھر
پیار کی آتشیں شاخ سے سرخ پتے گرے رات بھر

(اس شعر میں زوال ماسکو کا مرثیہ ہے)

راقم الحروف نے کتاب کو شروع سے اخیر تک پڑھا ہے۔ جس چیز نے سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کیا وہ ہے ان کے اشعار میں اسلامی تاریخ و روایات کے خوبصورت حوالے۔ کتاب کی بسم اللہ ہی خدائے بزرگ و برتر کے نام سے ہے۔ اور جن حوالوں نے کتاب کو معطر کر دیا ہے ان میں سب سے پہلے تو یہ شعر سنئے:

محترم ترے زمیں خلد مکرم سے شہاب محو آرام جہاں صاحبِ معراج ہیں

اور اسی غزل کا یہ شعر:

عشق سجدہ ہے مرا، قبلہ و کعبہ ہے مرا عشق دنیا ہے مری، عشق حرم خانۂ دیں

اور یہی استعارتی نظام شہاب کی غزلوں میں جگہ جگہ ہے۔ انداز میں تنوع ہے جس میں تخلیقیت کی جلوہ گری ہے:

لذتِ سجدۂ گریاں سے بھی محروم رہیں — میری پلکیں جو ہیں مصروف وضو میں اب بھی
بت کافر کا تقاضہ ہے شہاب — مسجدوں کو بھی خرابات لکھی
با وضو دل پہ لکھی میں نے ہے توبہ اپنی — کچھ نہیں زادِ سفر، حرمتِ توبہ تو ہے
منہ اندھیرے وہ موذن کی صدائے خوش کن — کہ مدھر تان سے جس کی دلِ منظر جاگا

....

وصل محبوب کی شامیں اے دوست — لہو مغرب کی نمازیں اے دوست
شورشِ جام براہیم سے زم زم کا سروش — تشنۂ عصر بھی فریاد بہ صحرا رکھتے
رہگذار مشرق میں اب جوئے خوں ہے تیز گام — وہ ابابیلیں کہاں ہیں جن سے سیلِ غم تھمے
حشر میں میرے گنہ کا فیصلہ آساں نہیں — کچھ فرشتے لکھ کے دیں گے، کچھ کریں گے پیش ہم

....

وہ نمازِ صبح ، وہ نالہ شبی — وہ دعاؤں میں بھی خوش حالیاں
کس قدر رکھا روایت کا منافق نے لحاظ — اور بھی طرزِ ستم تھے بولہب ہوتا نہ تھا
آدم کی فردِ جرم وراثت بنی شہاب — جنت کے میکدے سے اُڑایا نشہ ہے دل
علی الصباح رخِ یار کی مدھر قرأت — کتابِ عشق کی آیات کی تلاوت ہے
معبد ہے دل شہاب کا، ممکن نہیں یہاں — ناقوس کی صدا کہ صدائے اذاں نہ ہو
جاں فزا تھا سروش جس کا — جاں شفا ہے وہ آبِ زم زم
اشک جاں کے گرم پانی سے — سانس کرتی ہے وضو تنہا

میں نے دانستہ اس قبیل کے اشعار کو یک جا کر دیا ہے تاکہ اہلِ نظر محسوس کر سکیں کہ منظر شہاب نے اسلامی تلمیحات اور روایات کو کیسے کیسے خوبصورت اشعار میں بیان کیا ہے اور کن کن حوالوں سے اپنی شاعری کو منور کیا ہے۔ غزلوں میں یہ رنگِ سخن کمیاب ہے۔ منظر شہاب غزل کے سنجیدہ اور روایتی لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی اقدار کا پاس رکھا ہے۔ فکر میں فلسفیانہ گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔

وسعتیں عالمِ رنگیں کے مکاں سے آگے — ہائے کیا لوگ تھے دنیا کو قفس جانا تھا

اور اس کے ساتھ ایسے کرداروں کو بھی بے نقاب کیا جن کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ:

اس کے اعمال کا ہر لمحہ گناہوں کی بیاض — ایک خلقت نے جسے پاک نفس جانا تھا

معاشرہ کی بدحالی، عالمِ اقدار کی پامالی اور ظلم و تشدد کے مظاہر پر شہاب خون کے آنسو روئے ہیں۔ ایسے اشعار میں ان کی ترقی پسندانہ فکر کی جلوہ گری صاف محسوس ہوتی ہے:

ابھی ہوا چراغ سے تو جل گیا بدن — مغرور سر کا ناز اٹھانا نہ تھا کبھی

اب کے لہو کی رُت میں جدا شاخ سے تھے پھول — مقتل کا رنگ اتنا سہانا نہ تھا کبھی
بزم طرب یا سوئے مقتل — ہم بھی چلے تھے ، آگے آگے
شرط قاتل کی ہے جینا ہو تو ہم — ظلم کو لطف و عنایات لکھیں
اپنے ہاتھوں میں کٹے سر کو لئے — یار دلدار کی سوغات لکھیں
مفلسی کے اگر آسماں تن گئے — مفلسوں پر جہاں کے جہاں تن گئے
شامیانوں کی یوں بھی نوازش رہی — دھوپ سر پر کہاں تھی ، کہاں تن گئے

ان اشعار میں طنزیہ لہجہ کے ساتھ ساتھ جو تنقید ہے وہ اہل نظر محسوس کر سکتے ہیں اور یہ متحمل انداز شاعری کی جان ہے:

اس گلستاں میں ایسے گراں گوش ہیں جنہیں — پھولوں کے اتصال کا سرگرم نہیں پسند

اور ایسے سماج دشمن عناصر پر منظر شہاب نے ضرب کاری لگائی ہے۔ کہیں قدرے شاعرانہ لوازمات کے ساتھ تو کہیں بے باکانہ۔ اور اس قدر بے باکانہ کہ ان کے شکوے بلکہ نشانے پر چڑھ گئے ہیں۔ اور شر پسند عناصر کا چہرہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے اشعار میں طنز کی چاشنی بھی گھل مل گئی ہے اور تنقید کی تلخی بھی:

گلیوں میں قتل عام دریچے تھے ادھر کھلے — کچھ بھی نہ دیکھنے کا بہانہ کریں گے کیا
پنچھی ہرے درخت کے منتوں میں ڈھیر تھے — ترشول کا تھا غم کی شانہ کریں گے کیا
سچ کے گلے میں جھوٹ کا خنجر اتر گیا — الزام مرے قتل کا میرے ہی سر گیا
پتے شجر کو زخم کی پوشاک دے گئے — وہ موسمِ خزاں میں بھی کیا خوش لباس تھا

منظر شہاب کی ایک خصوصیت غزل میں منظر نگاری کی ہے جو نظموں کا لطف دیتی ہے۔ ایسے مناظر غزلوں میں بہت کم ملتے ہیں۔ شہاب مناظرِ قدرت سے ایسے خیالات کی ترسیل اور تنقید کا کام لینے کا فن جانتے ہیں۔ دیوارِ زنداں سے اُدھر ردیف والی غزل تو (شاید) ان کے ایام اسیری کی غزل ہے۔ خوبصورت مناظر کے ساتھ ان کے دل کی کسک اور زخموں کی مہک محسوس کی جا سکتی ہے:

آم کی خوشبو کہاں سے لے کے آئی ہے ہوا — کیا پھلوں کے باغ میں دیوارِ زنداں سے اُدھر
سہمے سہمے پھول بوٹے، رنگ خوشبو قید میں — کتنے دلکش راغ ہیں دیوارِ زنداں سے اُدھر
میں اسیر میر و راسخ صحنِ زنداں میں شہاب — شائقینِ داغ میں دیوار زنداں سے اُدھر

شائقینِ داغ کہہ کر شہاب نے ادب برائے ادب والوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ یہ کتاب شمس الرحمٰن فاروقی کے بھی نام ہے۔ مناظر قدرت کی عکاسی اور استعارے ملاحظہ فرمائیں:

ایسا لگتا ہے سدا سوچ میں ڈوبے جنگل — ہر زمانے کے ستم سے میں ہراساں ، حیراں
تا فلک دھند میں ملبوس خلاؤں کا طلسم — خواب در خواب سا پھیلا یہ پُر اسرار سماں
قربِ فطرت سے منور ہے مری زیست شہاب — مشترک چاہ ہے دونوں کے دلوں میں تاباں

کالے بادل لائے ہیں ہریالیاں — میرے زخموں کی کھلیں گی لالیاں
نرم گھاسوں پر رکھیں ہلکے قدم — اُوس کی نازک بہت ہیں جالیاں

....

عصر حاضر کی غزل نئی تشبیہوں، نئی لفظیات اور نئے تلازموں سے مزین ہے۔ کچھ غزلوں اور اشعار کو بلاشبہ اس دور کی نمائندہ غزلوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ جن میں حسیت ہے، زبان کا خلاقانہ استعمال ہے اور جذبات کی آمیزش ہے۔ کچھ اشعار:

مری پلکوں پہ جو اک بوند ذرا سی ٹھہری — سادہ کاغذ کی ہتھیلی پہ حنا سی ٹھہری
زندگی نے کبھی خوابوں کو سجانے نہ دیا — خانۂ دل میں سدا بیم و رجا سی ٹھہری
کیا لکھوں کیفیت لطف کہ جب یاد اس کی — غنچۂ دل ہی سبک سیر صبا سی ٹھہری

کاش اس خوبصورت غزل میں یہ برہنہ شعر نہ ہوتا:

کچے آنگن میں کھلے پھول نہ مرجھا جائیں — دھوپ ڈالر کی ابھی گرچہ ضیا سی ٹھہری

اور منظر شہاب کی اس غزل کی قرأت کے بغیر تو ان کی غزلیہ شاعری کا ذکر ادھورا رہے گا جس میں ان کی شناخت بھی ہے اور ان کے دور کا درد اور کسک بھی اور ان کا ہی نہیں ان جیسے اور کتنے انسانوں اور فنکاروں کے دل کی آواز ہے:

غزل

جیسے ویران حویلی کی صدا ہوں میں بھی — اپنی آواز میں محبوس ہوا ہوں میں بھی
زخم جاں پر تو زباں پر ہے صلائے کم کم — ایک مجروح پرندے کی انا ہوں میں بھی
برگ سرسبز سے جز لمس نہ رشتہ رکھا — بے کراں دشت کی آوارہ ہوا ہوں میں بھی
مجھ کو رو رو کے شہابؔ اپنی کہانی نہ سنا — میں ہوں واقف، تری سانسوں میں جیا ہوں میں بھی

میں بلا تکلف شہاب سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ "تری سانسوں میں جیا ہوں میں بھی" منظر شہاب کی غزلوں کا یہ مجموعہ "مجروح پرندے کی صدا" ابھی ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اور ہماری شاعری میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور تازگی کا وہ عالم کہ بقول شاعر:

ترے شعروں میں وہی لمس شہابؔ — پہلی بارش کی پھواریں جیسے

....

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

منظر شہاب کی نظموں میں الفاظ کا پیکر

کسی سماج کے مقاصد و اقدار اس کے کلچر کا جزو قرار پاتے ہیں، اس میں ادب کی تخلیق بھی شامل ہے۔ ادب کی تخلیق میں شاعری، خصوصاً غزل کا اکتساب عمل جداگانہ اہمیت کا حامل ہے لیکن نظم کی اپنی الگ انفرادیت ہے۔

منظر شہاب نے غزل اور نظم دونوں میں تجربے کئے ہیں اور اپنے دَور کی قدروں کو سامنے رکھا ہے جن کی جھلک ہم ان کے کلام کے آئینے میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ دراصل ان کا رشتہ وقت کے ساتھ گہرا رہا ہے۔ اس گہرائی کا پس منظر یہ ہے کہ منظر شہاب کی ابتدائی زندگی میں عسرت اور تنگدستی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے خوفناک طوفان کے تھپیڑے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے تھے۔ خون کے دریا کے بیچ ہجرت کا سلسلہ تھا اور اخلاق، مروت، شرافت اور انسانیت کے دم توڑتے اقدار تھے۔ ایسے میں منظر شہاب کا گاؤں اجڑ گیا، حویلیاں ویران ہو گئیں اور ہجرت کے کرب سے انہیں بھی گذرنا پڑا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''ان حادثات نے میری روح میں زہر گھول دیا۔ اعتبارات کی دنیا پارہ پارہ ہو گئی اور میں کٹی پتنگ کی طرح فضا میں بے سمت ڈولتا رہا۔ مایوس، تنگ دل، بے زار۔''

تبھی ۷؍نومبر ۱۹۴۷ء کو ان کی شادی ہو گئی۔ رشتۂ ازدواج کے پھول انہیں راس آئے۔ خوشگوار اعصابی انقلاب سے روشناس ہوئے اور جس وجدانی پیکر کی انہیں جستجو تھی ان کی شعر گوئی کے خطِ آغاز سے محسوسات کو اعتبار ملا۔ اس سلسلے میں ان کی اپنی رائے اس طرح ہے:

''اس رشتے نے مجھے ایک ایسے گھر سے منسلک کر دیا جو سرکش نوجوانوں کی پناہ گاہ اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اس ہراول دستہ کے سرغنہ منسوب حسن تھے۔ حسن امام درد خوبصورت افسانے لکھ رہے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی مظہر امام جو عصر حاضر کے ممتاز شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں، حزنیہ شاعری سے دلوں کو گرما رہے تھے۔''

منظر شہاب نے بھی حرف کی جادوگری اور آہنگ کی عشوہ طرازی سے رمز شناسی کا رشتہ جوڑا اور تخلیقی ادب سے وابستگی کو شیوہ بنایا۔ جہاں تک منظر شہاب کی نظمیہ شاعری کا ذہنی رویہ ہے اس میں انسانی محبت، مسرت، کدورت، دوستی، امید، ناامیدی کے جذبے کا امتزاج و اشتراک شامل ہے۔

دراصل ہمارے چاروں طرف جو کچھ چیزیں بکھری ہوئی ہیں وہ محض فریب نظر ہیں۔ یا یہ زندگی جو ہمارے اندر ہے وہی ان چیزوں میں بھی ہے اور آگہی دراصل مماثلت پہچاننے کا نام ہے۔ جب ہم اپنی ذات سے باہر کی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا ہی ہے جیسے ہم اندر کی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک فنکار یا شاعر اس شئے کے پیکر اور موسم کے ذریعے فعال ہوتا ہے اور علامتوں تشبیہوں میں گفتگو کرتا ہے۔ اس طرح فن پارہ معروضی طور پر صحیح معنوں میں فطری اور تاثر کے لحاظ سے انسانی بنتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اظہار کے بغیر اصل کی حقیقت انکشافی نہیں ہوتی۔ اور پرجوش اظہار شاعری سے ہی ممکن ہے۔

منظر شہاب کی نظمیں نفس مضمون کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی صداقت اور سنجیدگی کی خصوصیات رکھتی ہیں۔ان کا رویہ، زندگی پر ان کی تنقید، وسعتِ نظر، آزاد خیالی، فراخ دلی اور ہوشمندی ان کے تصوراتِ حیات میں موجود ہیں:

تمام عمر یہ حسرت یہ آرزو ہی رہی — کبھی تو شوق کا دامانِ تار تار سلے
کبھی تو دشتِ تمنا پہ چھائے رنگِ بہار — کبھی تو جبر یہ ہنسنے کا اختیار ملے

....

تمام عمر اسی انتظار میں گزری — ستم کی دھوپ ڈھلے تو دعائے شام کروں
ملے یہ شامِ گریزاں تو اس کی محفل میں — غمِ حیات کو نذرِ سرود و جام کروں

....

ہجومِ فکر کی حرماں نصیبی کے نثار — ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی
سراب بن کے پکارا وہ منزلیں تو ملیں — جو دل کے درد کو سمجھے وہ رہ گزر نہ ملی

....

نگارِ زیست تجھے کچھ خبر بھی ہو کہ نہ ہو — کہ تیرے چاہنے والے کا کیا ہوا انجام
کہاں کہاں نہ لٹا کارواں محبت کا — کہاں کہاں سے نہ آیا شکست کا پیغام

....

مری تو بیت گئی پھر بھی سوچتا ہوں میں — رہیں گے کب تلک آباد غم کے ویرانے
خدا کرے کہ ستم کی یہ دھوپ ڈھل جائے — ہزار پھول سے چہرے ہیں تیرے دیوانے

(نگارِ زیست تجھے کچھ خبر بھی ہو کہ نہ ہو)

منظر شہاب کی نظموں میں امکانی بیداری اور شعوری جدوجہد سے آگاہی ملتی ہے۔ان کے تصورات کی وسعت اور احساس کی بے پناہ شدت میں ان کا فن مضمر ہے۔نظم "ہدیۂ خلوص" سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ان میں روشن ذہن اور دردمند دل کی کارفرمائی نظر آتی ہے:

حیات ایک چمن ہے، مسرتیں ہیں پھول — مرے رفیق چمن کے یہ پھول چنتا چل
حقیقتیں ہیں بہت تلخ زندگانی کی — شہید زیست فسانوں کے خواب بنتا چل

....

حیات درسِ فرائض کا وہ صحیفہ ہے — کہ جس میں عشق کے رنگیں ورق بھی شامل ہیں
یہ وہ کتاب ہے جس میں دھڑکتے دل کیلئے — خرد کے ساتھ جنوں کے سبق بھی شامل ہیں

خدا کا شکر ادا کر تیرے جنوں کے لئے — حریمِ ناز کی آغوش انتظار میں ہے
سمیٹ لے گلِ نورستۂ بہار کہ آج — مسرتوں کا چمن زار اختیار میں ہے

ملک کی آزادی کے بعد حالات جس طرح نبرد آزما تھے وہ کرب آگیں یادیں منظر شہاب کے لئے ہمیشہ فکر آگیں رہیں۔ یہ کرب ذاتی اور انفرادی دونوں ہے۔اس کیفیت میں تشویش ہے، تردد ہے، بے یقینی ہے، گھٹن ہے، غیر محفوظیت ہے اور بیزاری ہے۔حقائق کے خدوخال کی طرف اشارے دیکھئے:

وہ صبحِ غم وہ شامِ سوگواراں ہم نہ بھولیں گے — لہو کی آگ میں جلتا گلستاں ہم نہ بھولیں گے

خزاں سامانی بدخواہیِ گل چیں معاذ اللہ — شکستہ سازیٔ رنگِ بہاراں ہم نہ بھولیں گے
جنوں کی گرد سے اہلِ خرد کی آنکھ کجلائی — تعصب کا غبار آلودِ طوفاں ہم نہ بھولیں گے
کلیجے چھلنی نوکِ خار سے معصوم کلیوں کے — دریدہ جابجا پھولوں کے داماں ہم نہ بھولیں گے
ستم کے گھاٹ پر روشن پتنگیں مہ جبینوں کی — ہوس کے سیج پر بے خواب خوباں ہم نہ بھولیں گے
نہ جانے کیا وہ کہتی تھیں، نہ جانے کس کو تکتی تھیں — وہ پتھرائی ہوئی چشمِ غزالاں ہم نہ بھولیں گے
شہیدوں کے لہو سے تر بہ تر راہیں اہنسا کی — اہنسا کی قسم خونِ شہیداں ہم نہ بھولیں گے
سمٹ آئے تھے گوشوں میں فضائے بیکراں والے — نگہباں ساختہ آزاد زنداں ہم نہ بھولیں گے
خود اپنے شور میں مدفون مجبوروں کی فریادیں — تغافل ہائے اہلِ اختیاراں ہم نہ بھولیں گے

بلا تفریق رنگ و بو جو ہر اک گل کی مونس میں
وہ چشمِ دشمنِ خارِ مغیلاں ہم نہ بھولیں گے

(ہم نہ بھولیں گے)

قومی یکجہتی اور وطن سے محبت پر بھی منظر شہاب نے نظمیں لکھی ہیں۔ وہ مشترک تہذیب اور زبان کا کردار چاہتے تھے۔ ساتھ ہی جغرافیائی، سیاسی و معاشی نظام کے اشتراک سے قومیت کے عناصر کی تشکیل چاہتے تھے تاکہ اتحاد قائم رہ سکے۔ اس اتحاد میں مذہب و عقائد، علوواخلاقیات، فنون و ہنر، رسم و رواج اور معاملات و معاشرت کا عمل چاہتے تھے۔ اس لئے کہ اپنے وطن کی سلامتی کے لئے یہ سب ضروری ہے:

اے مرے پیارے وطن

حسنِ فطرت کی امیں — تیری دنیائے حسیں
دور تک پھیلے ہوئے — کوہسارِ سُرمگیں
یوں پریشاں بدلیاں — جیسے زلفِ عنبریں
آبشاروں کی صدا — نغمۂ سحر آفریں
ندیاں محوِ خرام — جیسے رقصاں نازنیں
لہلہاتے سبزہ زار — تختہ ہائے مخملیں
سیم تن چاول کا نور — نورِ گندم صندلیں
تو جمالِ کائنات — رشکِ فردوسِ بریں
رنگ تیرا دلفریب — روپ تیرا دلنشیں

تو بہاروں کا چمن
اے مرے پیارے وطن

تو حریمِ مہوشاں — محفلِ صاحب دلاں
تو امامِ پنچ شیل — ہادیٔ امن و اماں

حسن کی ٹھنڈی نظر　　عشق کی میٹھی زباں
جو جنوں کا ہم نفس　　تو خرد کا رازداں
علم و حکمت کے صدف　　تیرے دریا میں نہاں
تو ہے خسرو کا علم　　تو ہے ارجن کی کماں
محملِ لیلائے فن　　رزم گاہِ صفدراں
وقت شاہد ہے اگر　　کذب کا اٹھا دھواں
چل پڑے تیرے سپوت　　چل پڑے تیرے جواں
طائفہ در طائفہ　　کارواں در کارواں
باندھ کر سر سے کفن　　اے مرے پیارے وطن
تجھ پہ قرباں جان و تن　　اے مرے پیارے وطن
اے مرے پیارے وطن

(میرے وطن)

منظر شہاب اپنی نظموں میں گونا گوں مناظر اور مظاہر سمیٹنے میں کامیاب ہیں۔ زندگی اور اس کی فتح و شکست، امید و بیم، حوصلوں اور حسرتوں، رشتوں اور الجھنوں کی آئینہ بندی کے ساتھ نئے احساس اور عرفان کی جلوہ گری بھی ان کے یہاں ملتی ہے۔ صنف نازک کے سلسلے میں احساس کی شدت منظر شہاب کے یہاں دوسرے انداز سے نظر آتی ہے:

اجنبی حسن، جامنی رنگت　　جسم سارا کسا کسا سا ہے
تنِ سرکش میں چستیٔ آہو　　سر میں سودائے باغیانہ ہے
قد میں اس کے اٹھان پربت کی　　چال میں ناز بادلوں کا ہے
کالی زلفوں میں ایک اجلا پھول　　بھانورے لاکھ پھول اکیلا ہے
بول جیسے کٹورے بجتے ہوں　　خامشی بھی سکوت گویا ہے
یہ وہ بت ہے کہ سنگِ اسود سے　　دستِ قدرت نے خود تراشا ہے
سر سے پا تک ہے کفر کا عالم
اک قیامت پہاڑی لیلیٰ ہے

(پہاڑی لیلیٰ)

منظر شہاب گرد و پیش کی اشیاء سے ربط پیدا کرتے ہیں۔ یہ ربط ذہنی یا نظریاتی نہیں، حسی اور تجرباتی ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی اور انسانی نفسیات کا محاسبہ کیا ہے۔ ان کی نظمیں ''سنہرے لمحے''، ''جشن کی رات''، ''ساقی نامہ''، ''ایک رات''، ''چاندنی رات''، ''مشورہ''، ''حکم امتناعی''، ''میں کیا لکھوں''، ''لہو تر نگ''، ''دو ملک دو کہانی''، ''یہ سچ ہے اگر''، ''گذرے ایام کو صدا دیں''، ''شجر کے چوتھے جگنو کا آخری سفر'' وغیرہ میں مزاج کا گہرا شعور اور احساس کو سلیقے سے برتنے کا ہنر ملتا ہے۔ ساتھ ہی بلند تخیل اور الفاظ کے خوبصورت پیکر تراشنے کی وسعت ملتی ہے۔

●●●

اقبال انصاری

منظر شہاب کے ''مجروح پرندے کی صدا''

بہت کم ہی شعری مجموعے ایسے ہوتے ہیں جوایک ہی نشست میں قاری سے خودکواوّل تا آخر پڑھوا لیتے ہیں۔ ''مجروح پرندے کی صدا'' اس اعتبار سے ایک نادر شعری مجموعہ ہے کہ اس کی ایک غزل پڑھنے کے بعد اگلی غزل پڑھنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور قاری قطعی غیر ارادی طور سے اخیر تک خودکو مصروف غزل پاتا چلا جاتا ہے۔

منظر شہاب کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ تو مر کھپ کے کیا جاسکتا ہے لیکن اجمالی تبصرہ مر کھپنے سے بھی کچھ زیادہ کا متقاضی ہے، اور پھر بھی تبصرے کا حق ادا ہو ہی جائے، یہ ضروری نہیں۔

یہاں شاعری کا ہر پہلو اور زبان کا ہر نکتہ توجہ طلب ہے، تبصرہ طلب ہے، تخیل، فکر، احساس، اظہار، زبان، بیان...... ایک ایک چیز رغبت و التفات کا دامن پکڑتی ہے، اور قاری کی حسیت ایک سکتے کے سے عالم میں خودکو شاعر کی حسیت سے ہم آہنگ پاتی ہے۔ میرے خیال میں منظر شہاب کی شاعری بے لاگ شاعری ہے، اس لئے بڑی بے دردی سے متوجہ اور بڑی بے رحمی سے متاثر کرتی ہے۔

اختصار کا پاس کرتے ہوئے یہاں صرف چند باتوں کا ذکر ہی ممکن ہے:

جناب منظر شہاب کی غیر روایتی شاعری کی اس انوکھی دنیا میں اگر ''سندر''، ''سرل''، ''مدھر'' اور ''کومل'' شبدوں نے زبان کو حلاوت وطراوت کی فراوانی عطا کی ہے، تو ''شبد''، ''بھاشا''، ''گیان''، ''وچار''، ''سجاؤ''، ''آستھا'' اور ''آشا'' نے ڈکشن کو خوب روئی وخوب صورتی کی افراط۔ اگر ''رہس''، ''رین بسیرا''، ''مدھوبن''، ''دشائیں''، ''کتھائیں''، ''آدیش''، ''پنچھی'' اور ''کاگے'' گہری معنویت کے قاصد ہیں، تو ''موبائیل''، ''پب''، ''ڈسکو''، ''ڈالر'' اور ''میزائیل'' جدّت وجدیدیت کے ایلچی۔

''کچھ نہیں زادِ سفر، حرمتِ توبہ تو ہے''، ''حشر کیا کیا نہ اہلسا کی قبا کا ہوگا!'' اور ''کرۂ ارض پر احسانِ خدا ہوں میں بھی'' جیسے مصرعے فکر کی سنجیدگی اور احساس کی دیانتداری کو آواز دیتے ہیں اور ''سبک رنگ''، ''لہو رُت''، ''ہم سفینوں''، ''زخموں کی لالیاں کھلنا'' اور ''نین ساگر'' جیسی ترکیبیں Aesthetic Sense کو صرف جگاتی ہی نہیں بلکہ تادیر جگائے رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ غزلیں، کچھ اشعار اور کچھ مصرعے جناب منظر شہاب کو یکتا و یگانہ کرنے میں بڑی والہانہ معاونت کرتے ہیں۔ مثلاً:

ہر سمت مونسون کی رم کی چاندنی
میرے ہی انتظار کا آنگن اداس تھا

اس شعر کی تشریح کرنا بڑا مجرمانہ سا فعل لگتا ہے۔ اس کی نازک سی شعریت حواس پر اور اس کا معصوم سا درد احساس پر طاری کر لینا اس شعر کی داد دینے کا سب سے اچھا طریقہ نظر آتا ہے۔ کچھ اشعار تو اشعار کے بجائے توانا تاثرات کے سرکش جھماکے سے لگتے ہیں۔ مثلاً:

موونج کے پنکھوں میں ابرک ٹانکتی، وہ سروتے سے کترتی چھالیاں
وہ نمازِ صبح، وہ نالہ شبی، وہ دعاؤں میں بسی خوشحالیاں

جانے کس بات پہ مسکان کی معصوم دمک، جانے کس چاہ میں نینوں کے کٹورے جل تھل "یوں زمانے کے ہوئے، دل کی زباں بھول گئے" غزل کے بجائے اس دور کی بہت قریب سے کھینچی گئی تصویر نظر آتی ہے۔ "جیسے ویران حویلی کی صداہوں میں بھی" ابتدا سے انتہا تک غزل کے بجائے استعاروں کا رنگ محل نظر آتی ہے۔

ایک غزل کے مندرجہ ذیل اشعار:

سچ کے گلے میں جھوٹ کا خنجر اتر گیا | الزام میرے قتل کا میرے ہی سر گیا
برسوں سے چونک چونک کے جاگا نہیں شہر | اے دوست کس دیار میں تیرا ہنر گیا

اور ایسے ہی بے شمار اشعار اس امر کے ضامن ہیں کہ منظر شہاب کا دور اپنے تمام "اثباتیات" وتمام "منفیات" کے ساتھ ان کی شاعری کی بنیاد و محرک ہے اور محسوسات کا پُرخلوص شائستگی سے اظہار اُن کی شاعری کا حُسن۔

"مجروح پرندے کی صدا" سروں کے اوپر سے نہیں گزرے گی، ساعت سے گزر کر سیدھے دلوں میں راہ بھی کرے گی، مقام بھی۔

....

● ۱۵۴/اے، اُنا انکلیو، میورویہار، فیز-۱، دہلی-۹۱

پروفیسر سید احمد شمیم

منظر شہاب: جینے کی ادا کا شاعر

منظر شہاب کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے وجود کا کوئی لازمی حصہ اُن کی ذات سے ٹوٹ کر جدا ہو گیا ہے مگر جواب بھی یادوں کے مدار میں گردش کرتا رہتا ہے۔ کبھی قریب آتا ہے کبھی دور چلا جاتا ہے۔ پانے اور کھونے کی اسی لذت اور اذیت سے منظر شہاب کی شاعری کا منظر نامہ اُبھرتا ہے مگر اس ٹوٹے ہوئے حصے کو گرفت میں لینا اس لئے دشوار ہے کہ:

سانحہ یوں بھی گزرتا ہے سرِ کوچۂ عشق ایک چاہت کئی محبوب میں بٹ جاتی ہے

اور یوں بھی منظر شہاب زندگی اور ادب کو معلوم سے نا معلوم کے دو طرفہ اثباتی اور منفی سفر کا عمل سمجھتے ہیں اور زندگی کی طرح ادب کو بھی کسی مخصوص رنگ میں مقید نہیں مانتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں ایک دھنک رنگ کیفیت اُبھرتی ہے۔

بنیادی طور پر اُن کے شعری کردار کی تعمیر رومانی عناصر سے ہوئی ہے۔ مگر انہیں وہ ذہن بھی نصیب ہے جو علل کو معلول سے جدا کر کے دیکھنے کا عادی نہیں ہے۔ انہوں نے زندگی کو 'اختلافِ معنٰی' کے حوالے سے سمجھا ہے اور فنکار کو 'حرف کی جادوگری اور آہنگ کے عشوہ طرازی کا رمز شناس ہونا' لازمی مانا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کا یہ بھی یقین ہے کہ ایسے موضوعات جو سماجی ارتقاء میں حارج ہوں تخلیقی ادب کی سطح کو پست کر دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ منظر شہاب کبھی 'ذات کی مجس' اور 'انانیت کی قبر' کو جائے عافیت نہیں مانتے اور 'زرد پتوں' کی طرح بکھر کر بھی اپنی انگنائی میں 'تلسی ایک ننھا سا پودا' اُگانے کی تمنا کرتے ہیں۔ اور 'تیغِ ستم سے حنا حنا' ہو کر بھی درد کا لمحہ زرنگار کرتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں کرب کی شاخوں میں بھی پھولوں کے چراغ دیکھتی ہیں۔ شاید اسی لئے منظر شہاب اُس وقت بھی ذات اور کائنات سے وابستہ رہے جب کہ اُن کے اکثر نامور ہم عصروں نے جدیدیت کی چکاچوند میں اپنے چہرے بدل لئے یہ حقیقت اپنے آپ میں کچھ کم دلنواز نہیں کہ زندگی کو جمیل تر بنانے کے خوابوں کو اُن کی آنکھیں کبھی نہیں بھولیں۔ اور یہ خواب کبھی 'معشوقِ ستم شعار' اور کبھی 'حسنِ بہار' کی صورت اُن کے دل میں پرورش پاتے رہے۔

جب مقصد خواب... اور خواب محبوب بن جائے تو نظر خبر بن جاتی ہے۔ اور اظہار انکشاف کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر آواز اپنی اصل میں انقلابی ہو کر بھی عرفانی محسوس ہونے لگتی ہے۔ منظر شہاب نے بھی وابستگی کے باوجود خود کو وفاداری بشرط استواری سے محفوظ اور تبلیغ سے بچا کر رکھا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی شاعر کے مزاج کی پہچان سب سے زیادہ اُس کی نظموں سے ہوتی ہے۔ غزل میں شاعر لمحہ بھر کے لئے اپنی جھلک دکھاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے مگر نظموں میں نقاب اوڑھ کر بھی کھل کھل جاتا ہے۔

'پیراہنِ جاں' منظر شہاب کے بیالیس سالہ ذہنی سفر اور شعری تجربات کا حاصل ہے۔ جس میں کل ۲۳ نظمیں، ۴۲ غزلیں، دو گیت، تین آزاد قطعات اور کچھ رباعیات ہیں۔ ظاہر ہے اتنی طویل مدت کی پیش نظر یہ سرمایہ

کوئی زیادہ نہیں۔ اتنے عرصے میں تو ان کے بعض ہم عصروں نے کوئی نصف درجن مجموعے شائع کرائے ہیں۔ گویا منظر شہاب کو کارزمانہ نے بیانِ شوق کا موقع بہت ہی کم دیا۔

'پیراہن جاں' کی پہلی نظم 'سنہرے لمحے' ہے جس میں وقت کے خرامِ رواں دواں کے ساتھ ساتھ کائنات کے رخِ جمال کے تزئین پانے کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ یہ آزاد ہیئت میں ایک مختصر مگر جاذبِ توجہ نظم ہے۔ جو حقیقتاً منظر شہاب کے پورے شعری مزاج کا اشاریہ بھی ہے۔

'پیراہن جاں' کی خوبصورت نظموں میں 'ایک رات'، 'ساقی نامہ'، 'چاندنی رات'..... لفظ اور معنی، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

'ایک رات' کا موضوع امن ہے اور اس موضوع پر ایک زمانے میں تقریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے مگر لفظوں کی تراشیدگی، پیکروں کی دلنوازی، تشبیہوں کی تازگی اور استعاروں کی سحرکاری کے اعتبار سے 'ایک رات' ایک شاہکار نظم ہے جس کی طلسماتی فضا میں پڑھنے والا خود گم ہو جاتا ہے۔

سیاہ شب ہے، خاموشی نے ہر سمت پنکھ پھیلائے ہیں۔ جمال شہر کو اندھیروں کی چوٹ نے گھائل کر دیا ہے۔ سجی سجائی دکانیں، قمقموں کے نجوم، گل رخوں کے گلستاں، گیسوؤں کی بہار، صندلیں رخسار، شاخِ بازوئے تاباں سب کے سب سو گئے ہیں..... شاعر اپنے افکار کی مدھم لطیف لہروں پر دلِ حزیں میں سیکڑوں غم لئے پلکوں پر لرزتے ہوئے دیپ جلائے جاگ رہا ہے۔ اُسے دکھ ہے کہ اس کا یہ خوبصورت شہر اور شہر کی فضائیں اور فضاؤں میں پھیلتا ہوا گنگا کی بانسری کا راگ، آسمانوں پر دبے پاؤں گوپیوں کا سفر، اسپتالوں، کتب خانوں، کالجوں کی قطاریں، پرسکون ہوسٹل اور ہوسٹل میں رہنے والے شوخ و شنگ لڑکے جو اپنی اپنی آنکھوں میں آنے والی سنہری زندگیوں کے خواب بسائے ہوئے ہیں۔ اور دور بہت دور کسی کی نرگسی آنکھوں کی مشتعل تنویر، مخملیں زلفوں کا رینگتا ہوا لمس، رس گھولتی ہوئی ہونٹوں کی کلیاں..... اگر جنگ چھڑ گئی تو ان ساری خوبصورت چیزوں کا انجام کیا ہوگا؟ اس سوال کے ساتھ نظم ختم ہو جاتی ہے اور دلوں میں ہزاروں جاں گسل سوالات جنم دے جاتی ہے۔

منظر شہاب کو پیکر تراشی اور فضا آفرینی سے ایک فطری لگاؤ سا معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی نظم 'چاندنی رات' بھی اس کی ایک خوبصورت مثال ہے اس میں بھی ایک دلکش طلسماتی رات کی تصویر کشی کی گئی ہے، رات کا عالم ہے، ہر طرف سیلِ نور جاری ہے، کائنات جیسے کنول میں سمایا ہوا ساگر ہے۔ دور نیل گگن میں چاندنی کی کشتی بہشت کا مانجھی کھے رہا ہے۔ کہیں کہیں روئی کے گالوں کی طرح شفاف ابر کے آوارہ ٹکڑے تیر رہے ہیں۔ جھومتی گاتی، زمزمے سناتی دھرتی کی گود میں کھٹولے پر ایک معصوم چاند کا ٹکڑا سو رہا ہے۔ پاس ہی ماں اپنا سمٹا سمٹا وجود لئے لیٹی ہے جس کا آنچل اوس میں بھیگا ہے اور نینوں میں کاجل پھیلا پھیلا ہے۔ ماں کے اس تقدس، حسن اور بچے کی معصومیت نے جمالِ کائنات میں رفعت اور ربودگی پیدا کر دی ہے ایسے میں کوئی شخص اگر کوئی آرزو کر سکتا ہے تو یہی کہ:

گردشِ وقت کاش تھم جاتی   صبح آتی نہ کوئی شام آتی

عشقیہ جذبات کی حامل نظموں میں 'مشورہ' لہجے کی شوخی، برجستگی اور تیکھے پن کی عمدہ مثال ہے۔ زیریں لہروں

میں ایک گہری اذیت بھی محسوس ہوتی ہے۔ شاعر نے اپنی محرومی کو چھپانے کے لئے شاید شوخ لہجہ اختیار کرلیا ہے:

تم بھی گستاخ اداؤں کو سکھاؤ تہذیب — شوخ جذبات کو سنجیدہ بناؤں میں بھی
معتدل تم بھی بناؤ بُت کافر کا مزاج — عقل کی راہ محبت کو دکھاؤں میں بھی

'مشورہ' کے برخلاف 'لہو ترنگ' میں کسک اور درد کی لے تیز ہے اور 'میں کیا لکھوں' خط کے پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ وقت کی بے رحمی بجھی ہوئی شبوں اور اُجاڑ دنوں کا ماتم کیا گیا ہے اور درد کے اس شعر پر نظم ختم ہوتی ہے:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

'پہاڑی لیلیٰ' اور 'گذرے ایام کو صدا دیں' بھی عشقیہ نظمیں ہیں۔ مگر اُن میں کوئی ارفع اور گہرا تجربہ نہیں ہے۔ احساس جمال کی تازگی کی وجہ سے دلکشی سی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے سوا ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ 'جشن کی رات'، 'ساقی نامہ'، 'حکم امتناعی' اور 'نگار زیست تجھے کچھ خبر بھی ہو کہ نہ ہو' ترقی پسندانہ خیالات بلکہ اشتراکی نظریات کی نظمیں ہیں۔ 'جشن کی رات' میں اُجالوں کے اندر پوشیدہ تاریکی کا چہرہ دکھایا گیا ہے۔ فیض نے اس کو 'داغ داغ اجالا' کہا تھا...... اور منظر شہاب نے یوں بیان کیا ہے:

لیکن اے دوست، شب تار کا منظر ہے وہی — دشتِ افلاک وہی وقت کا خنجر ہے وہی
اب بھی مفلوج ہیں محفل کے رباب و طاؤس — مضمحل شوق کی شہ رگ میں لہو ہے اب تک

جشن کی رات ابھی خواب کی منزل میں ہے...... 'نگار زیست تجھے کچھ خبر بھی ہو کہ نہ ہو' میں جذبات کی شعلگی نے شخصیت کا رچاؤ اختیار کرلیا ہے۔ غم کی زہرناکی اور حالات کی ستم ظریفی کا احساس دلوں کو اپنی مدھم مدھم آنچ سے پگھلاتا ہے۔ یہ خوبصورت اور جادو اثر تخلیق ہے مگر منظر شہاب کی سیاسی نظموں میں سب سے زیادہ اہم 'ساقی نامہ' ہے۔ یہ زور بیان اور تخلیقی حسن کا خوبصورت مرقع ہے...... روانی ہے کہ اقبال کے 'ساقی نامہ' سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ اقبال نے جو کام 'عشق' سے لیا ہے منظر شہاب نے وہی کام 'مسرّت' سے لیا ہے۔ لیکن عشق میں جو ماورائیت اور سرّیت ہے وہ مسرت میں نہیں ہے۔ دراصل یہ اقبال کی مادی روحانیت اور منظر شہاب کی روحانی مادیت کا فرق ہے۔ اقبال کے 'ساقی نامہ' کی کائنات وسیع تر ہے جبکہ منظر شہاب کے 'ساقی نامہ' کی دنیا نسبتاً محدود ہے۔

منظر شہاب نے اپنے سیاسی نظریات کی سزا میں زندان کی سیاہ راتیں اور المناک دن بھی گذارے ہیں مگر پھر بھی وہ اپنے نظریئے کے معاملے میں سخت گیر نہیں رہے۔ ذہن کا دریچہ کھلا رکھا۔ چنانچہ نظم 'دو ملک دو کہانی' جو ہندوستان پر چینی حملہ کے خلاف کہی گئی ہے شبہات کا نشان بن کر اُبھرتی ہے۔ اُن کے وجدان نے ایک چوتھائی صدی قبل وہ محسوس کرلیا تھا جس سے آج کی اشتراکی دنیا دوچار ہے:

دم بخود ہے اشتراکی فکر گاہ — منتشر مسلک کی جمعیت ہوئی
جس کی اک اک بوند کو امرت کہیں — مشتبہ اس جام کی صحت ہوئی

'پیراہنِ جاں' کی نظموں میں ایک تہنیتی نظم 'ہدیۂ خلوص' اور 'پریم چند' واقعاتی اور شخصی نظمیں ہیں۔ ظاہر ہے ان کا دائرہ محدود ہے، تہنیتی نظم مشہور شاعر مظہر امام کی شادی کے موقع پر کہی گئی۔ مسدس کی ہیئت میں یہ نظم انتہائی

خوبصورت ہے۔ الفاظ کی شوکت اور بیان کی قدرت قابلِ داد ہے۔ 'ہدیۂ خلوص' اشترا کی دانشور محمد عالم کے نام ہے۔ اس میں جذبے کی آنچ جیسی ہے مگر گہرائی تک اترتی ہے۔ ان نظموں کے برخلاف 'ماتم زکی انور کا' اور 'شجر کے چوتھے جگنو کا سفر' حادثاتی نظمیں ہیں جن سے شاعر کی دردمندی جھلکتی ہے مگر وسعت اور تخلیقیت کم ہے۔

'پیراہنِ جاں' کا پہلا حصہ نظموں کا ہے۔ پھر رباعیات، آزاد قطعات اور دو گیت ہیں۔ سب سے آخر میں غزلیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شاعر نے اپنی غزلوں کو بعد کا رتبہ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منظر شہاب کے بارے میں ہر اچھے اور سچے شاعر کی طرح یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ نظم کے شاعر ہیں یا غزل کے۔ فیض کو عموماً نظم کا اور فراق کو غزل کا شاعر کہا گیا ہے۔ مگر فیض کی غزلوں اور فراق کی 'آدھی رات'، 'جگنو' اور 'ہنڈولا' جیسی نظموں کے حسن کا انکار کون کرسکتا ہے؟ اسی طرح منظر شہاب اگر نظم کے بانکے شاعر ہیں تو غزلوں کے بھی البیلے شاعر ہیں۔ اُن کی غزلیں جو ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۰ء تک کے عرصے پر محیط ہیں، دانشوروں کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں اقبال کی آواز بھی چمک اُٹھتی ہے:

وہ سفید خواجگی تھی یہ سیاہ خواجگی ہے — وہ طریق گمرہی تھا یہ طریق رہزنی ہے
نہ محبتوں کا حاصل نہ صلہ ہے محنتوں کا — کہ متاعِ کوہکن پر وہی جبر خسروی ہے

......

ضمیر عشق میں میری نوا سے گرمی شوق — بلا کشانِ محبت کی آبرو ہوں میں
مرے جنوں نے سکھائی ہے بے خودی مجھ کو — بلا سے رند نہیں غیرتِ سبو ہوں میں

یہ اقبالیت فکر کی کم، اسلوب کی زیادہ ہے لیکن جب کبھی منظر شہاب دانشوری کے آسمان سے اتر کر وادیٔ دل میں آئے ہیں تو اُن کی غزلوں میں کہیں جذبات کی شوخی اور کہیں دردو الم کی کسک پیدا ہوگئی ہے:

جانے کیوں آج بھی ویرانۂ دل تک آکر — اکثر آواز ترا دیدۂ تر دیتا ہے
لذتِ زخم مجھے موت سے برگشتہ نہ کر — پھر کوئی دعوت پیکانِ نظر دیتا ہے

......

دردمندی بھی ہوگئی رسوا — صبر کا کیا گلہ کرے کوئی

......

خود ہی رونا ہے خود ہی چپ ہونا — درد کب ساتھیوں نے بانٹا ہے

واقعہ یہ ہے کہ کوئی کسی کا درد نہیں بانٹتا۔ ہم لاکھ رجائی اور جماعتی بن کر رہیں ذات کی تنہائی ہمارا مقدر ہے۔ صنعتی اور تکنیکی عہد کے بے سکونی، اقدار کا ہر لحہ اٹھتا ہوا جنازہ، فرقہ وارانہ منافرت کا زہر ہر باشعور ذہن کو آشوب آگہی میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ منظر شہاب بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکے ہیں:

رات پٹرول کی آگ سے شہر میں یوں چراغاں ہوا — کانپ کر بجھ گئیں دل کے روشن جھروکوں کی سب بتیاں
بے اماں خلق کرفیو زدہ روز و شب کے اندھیرے میں گم — اپنی گردن میں ڈالے ہوئے اپنے کتبات کی تختیاں
دونوں ہی لکھ رہی تھیں لہو سے مرے سانحہ قتل کا — اک طرف حملہ ور آستیں اک طرف پاسباں وردیاں

......

اکثر آنکھوں میں دبے پاؤں اُترتی ہوئی نیند اپنے قدموں کی ہی آہٹ سے اُچٹ جاتی ہے

......

ساگر کی بوند بوند ترستی ہے ابر کو اے آفتاب تیری تمازت کو کیا ہوا

منظر شہاب لفظ کو پیکر اور پیکر کو زندگی عطا کرنا جانتے ہیں۔ کہیں کہیں تیز دھار ریشمی طنز سے بھی کام لیتے ہیں، کبھی کبھی ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر کے چونکا دیتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے منظر، ماحول اور چہرے جاگ اُٹھتے ہیں:

اُٹھی نگاہ تو جلووں نے کی قدم بوسی بڑھے جو ہاتھ تو گیسو سنوارنے کو ملے

......

شیشہ تھا دل وہ ٹوٹ گیا پھر بھی بار بار تم کیوں یہ کہہ رہے ہو تمہاری خطا نہ تھی

......

تمام بس کے مسافر میں اضطراب سا تھا کہ اک نظر بھی اُسے دیکھنا ثواب سا تھا

......

وقت نے کتنا بنا ڈالا ہے انجانا اُسے اُس کی آواز کی تصویر سے پہچانا اُسے

منظر شہاب لفظوں کے رمز شناس ہیں۔ ان کے ہاں خنجر، لہو، رہگذار، رات، راگنی، شجر، جنگل، آواز کی تصویر، دھوپ، خواب، پہاڑ، آگ، بگولا وغیرہ بھی زندہ پیکر کبھی بامعنی نشانات بن کر اُبھرتے ہیں۔ ان پیکروں کو جھارکھنڈ کے چاروں طرف دوڑتی ہوئی سُرمئی پہاڑیوں، ہرے بھرے جنگلوں، بل کھاتی، رقص کرتی، گنگناتی ندیوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو خوبصورتی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے اور پھر یہ کہ ان جنگلوں میں آہستہ آہستہ جو آگ سلگ رہی ہے اُن کی معنویت بھی دعوتِ فکر دیتی ہے:

پہاڑ سے اتر آئے نہ آگ شہروں میں سنا ہے سبز بگولہ اُٹھا اُٹھا سا ہے
ہوا کی سانس ہے بوجھل فضا بھی ہے گم صم کہیں قریب ہی طوفاں رُکا رُکا سا ہے
ضرور صبح تلک بارشیں ہوئی ہوں گی اُداس آنکھ کا آنگن دھلا دھلا سا ہے
قاتل نے پھر لکھا ہے خنجر پہ نام میرا ہو دوستی تو ربطِ باہم نہیں بدلتا
سراغِ قتل، شہادت، ثبوت سب گونگے لہو خموش تھا خنجر بھی بے زباں نکلا

اب تک یہ سنا اور مانا جا رہا تھا کہ 'جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا' مگر نو دولتیوں کے اس عہد نے وہ قانون جنم دیا ہے کہ زبانِ خنجر کی طرح لہو بھی گنگ ہو کر رہ گیا ہے مگر منظر شہاب اس پر یقین رکھتے ہیں کہ زمین بھلے ہی آسمان کی طرح ستم ظریفی اختیار کرے، غم گسار، بلائے جاں بن جائے اور حالات کی آندھیاں تیز تر ہو جائیں لیکن جینے کی ادا سلامت رہنی چاہئے:

پیراہنِ جاں چاک رہے تیز ہوا میں طوفاں میں بھی جینے کی ادا چاہئے یارو

....

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو ● کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

پروفیسر سیّد منظر امام

ڈاکٹر ایم. صلاح الدین کی منظر شہاب شناسی

ایک زمانہ تھا کہ لوگ محقق کا احترام حد سے سوا کیا کرتے تھے کہ تحقیق صداقت تک پہنچنے کی تڑپ سے عبارت ہوتی تھی۔ وسعتِ علم، عرق ریزی، دیانت اور سنجیدگی اس کی پہچان ہوا کرتی تھی مگر اچانک ارباب اقتدار نے اس نے اس کا رشتہ روزی روٹی اور ترقی سے جوڑ دیا اور یہیں سے اس کی ارزانی کا آغاز ہوا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہر گلی کوچے میں چند ایک محقق حضرات اینڈتے پھرتے ہیں۔ پھر طرفہ تماشا یہ بھی ہوا کہ صاحبِ کتاب بننے کی ہوس میں بے تحاشہ تحقیقی کارنامے کتابی صورت میں شائع ہونے لگے جسے کوئی بھی سنجیدہ اور باذوق قاری پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ بہت ہوا تو شرماً لحاظاً سرسری نگاہ ڈالی اور کنارے رکھ دیا۔ اور صاحبِ کتاب کی تسکینِ انا کے لئے چند سطریں لکھ دیں کہ تم بھی خوش اور میں بھی بعافیت۔ لہٰذا اس بُرے وقت میں کبھی کوئی سنجیدہ اور علمی کام پڑھنے کو مل جاتا ہے تو جی خوش ہوتا ہے اور دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ اس دورِ ظلمت میں بھی امید کی کوئی کرن کہیں چمک اٹھتی ہے۔ ڈاکٹر محمد صلاح الدین کا تحقیقی مقالہ ''منظر شہاب: حیات اور فکر و فن'' بھی ایک ایسی ہی سنجیدہ اور عمدہ کوشش ہے جسے باذوق قاری دلچسپی سے مطالعہ کریں گے اور آئندہ نسلیں منظر شہاب اور ان کے عہد کی معاشرتی، سیاسی اور ادبی باخبری کا معتبر حوالہ محسوس کریں گی۔ ڈاکٹر محمد صلاح الدین ایک کامیاب استاد، خوش ذوق قاری ہیں۔ ان میں تلاش و جستجو کی بے پناہ تڑپ بھی ہے، جو اب عنقا ہوتی جارہی ہے۔

اس مقالے کا پہلا باب تحقیقی مقالوں کی روش کے مطابق منظر شہاب کے کوائف اور ان کے خاندان اور بزرگوں کے آثار اور افکار سے متعلق ہے اس مقام پر ہمارے اکثر نوجوان محققین غیر ضروری طوالت اور مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور تحقیق کی رُسوائی کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ صلاح الدین صاحب نے وقار اور اختصار کا کمال دکھایا ہے اور حد درجہ عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ دوسرے باب میں ترقی پسند تحریک کی افادیت، اہمیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس تحریک کے اساسی فلسفہ پر مفصل بحث کی ہے اور اس عہد کے ادبی مزاج کا تجزیہ کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی ضرورت اور افادیت پر مدلل بحث کی ہے مگر کہیں کہیں خوش گمانی کے شکار بھی ہوئے ہیں اور اس تحریک اور اس کے فلسفہ کے مضمرات سے نظر بچا کر سبک خرامی سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ البتہ منظر شہاب کے پیش رو اور ہم عصر شاعروں، ادیبوں کا ذکر ایمانداری سے کیا ہے اور جامعیت کا خاص خیال رکھا ہے اور ہم عصروں کے درمیان منظر شہاب کی قامت اور انفرادیت کے نقوش کو نمایاں کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

ان تمام محاسن کے باوجود اس حقیقت کو مان کر آگے بڑھنا چاہئے کہ کوئی بھی تحریر حرفِ آخر نہیں ہوتی، حرفِ آخر نہ ہونا ہی اچھے کارناموں کا وصف بھی ہوتا ہے۔ کوئی بھی علمی اور ادبی تحریر سیرابی سے نہیں تشنگی سے یادگار رہتی ہے۔

جہاں تک منظر شہاب کے شعری مزاج، ان کے فنی مرتبے کی شناخت اور تعین کا مسئلہ ہے محقق موصوف نے محنت ضرور کی ہے مگر ان کے کلام کی جادوگری، انفرادیت اور لفظوں کے برتنے کے سبھاؤ میں تجربے کی ہنر کاری

دکھانے میں بڑی حد تک ناکام رہے ہیں۔ تحقیق صرف حقیقت کا بیان نہیں ہوتی۔ اچھی تحقیق دلکش اصولِ نقد کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے تو جاذبِ توجہ بن جاتی ہے اور قاری کو نکات سے دو چار کرنے کے بجائے انجانے سفر سے لذت آشنا کرتی ہے۔ یہاں بھی ضروری ہے کہ محقق شعریت، تخلیقیت اور اشعار میں پوشیدہ آہنگ اور نغمگی کے رموز سے کما حقہ واقف ہو۔ ہمارے محققین اس رمز سے اکثر نا آشنا ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ٹھس تنقید کام و دہن کی خوش ذائقی سے محروم لفظوں کے بوجھ تلے سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے۔

میں بلا تامل یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ منظر شہاب اپنے عصر کے ترقی پسند شعرا کے درمیان منفرد ہی نہیں ممتاز بھی نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے اُن کا اپنا سرمایۂ فن ان کے ہم عصروں کے مقابلے میں بہت کم ہے مگر عظمت کی پہچان زود گوئی سے نہیں پُر گوئی سے ہوتی ہے۔

منظر شہاب کی شاعری جمالیت اور مقصدیت کے خوبصورت امتزاج سے نمو پذیر ہوئی ہے۔ وہ الفاظ کے مزاج داں ہیں۔ ان کی قدر و قیمت کو پہچانتے ہیں، ان میں پوشیدہ ساحری کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں اور انہیں انتہائی مشاقی اور خوش سلیقگی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ محض لفظوں کی ترتیب کے قواعدی اصولوں کے پابند نہیں ہوتے۔ وہ اپنی دنیا رکھتے ہیں اور جذبات کی کیمیا سے گزر کر آزاد اور کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں نادر تشبیہات اور تازہ کار استعاروں کا عجیب نظام ملتا ہے۔ رمز و کنایہ کا یہ استعمال حد درجہ Uncommon ہے۔ جس کی بہت سی مثالیں 'پیراہنِ جاں' میں جگمگ نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد صلاح الدین انہیں روشن نہیں کر سکے ہیں۔ میں ان کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں مگر میری بحث ایک دوسرے منطقے میں داخل ہو جائے گی اور میرے مکالمہ کا موضوع تو صرف محقق موصوف کی کتاب کی قدر و قیمت کا تعارف پیش کرنا ہے۔

منظر شہاب نے 'خوں چکاں قصہ میرا' میں ادب اور زندگی کو معلوم سے نامعلوم کے دو طرفہ اثباتی اور منفی سفر کا عمل کہا ہے اور یہی وہ کلید ہے جس کے بغیر منظر شہاب کی کائنات شاعری کے دروازے نہیں کھلتے اور جب کوئی اچھا قاری یہ بند دروازے کھول دیتا ہے تو شعری لذتوں سے شرابور ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد صلاح الدین کے یہاں دیانت دارانہ وژن کی کمی نہیں ہے مگر تخلیقی پہلوؤں کی جانب انگشت نمائی کی کمی صاف محسوس ہوتی ہے ورنہ "ساقی نامہ"، "ایک رات" اور "چاندنی رات" جیسی بے مثال نظموں کا سیر حاصل جائزہ لے سکتے تھے۔ منظر شہاب اپنی ترقی پسندی کے باوصف فن کا احترام کرتے ہیں اور اپنے تخلیقی عمل سے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ مقصدیت اور جمالیت کا خوبصورت امتزاج کس طرح جادو بن جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک تہنیتی نظم (بنام مظہر امام) اور ہدیۂ خلوص (بنام کامریڈ محمد عالم) جیسی واقعاتی نظموں میں نظریاتی آئینہ بندی کے ساتھ ساتھ اسلوب کی بہار اور الفاظ کے نکھار کا نگار خانہ سجا رکھا ہے۔ منظر شہاب نے مرثیہ کے مخصوص Form سے گریز کرتے ہوئے خوبصورت مرثیہ بھی لکھا ہے کوئی چاہے تو اسے Elegy کے نام سے بھی موسوم کر سکتا ہے۔ میری مراد 'ماتم زکی انور کا' اور 'شجر کے چوتھے جگنو کا آخری سفر' جیسی نظموں سے ہے۔ جس میں شاعر کی دردمندی پڑھنے والے کے اندر بوند بوند اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور نس نس میں درد کی لہر بن کر سرایت کر جاتی ہے۔ یہ دردمندی زندگی

سے گہری اُنسیت، اقدار کی پامالی کی دھیمی دھیمی چیخ ان کی غزلوں میں بھی موجود ہے جو روشنیوں کے شہر جمشید پور میں برپا ہونے والے ۱۹۷۹ء کے فسادات کے زیر اثر لکھی گئی ہیں۔ ان میں الفاظ احساس کی آنچ سے پگھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ان آنسوؤں کی ترسیل بن جاتے ہیں جو کاسۂ چشم سے ٹپک بھی نہ سکے اور اندر کی جھیل باہر کی آگ سے خشک ہو کر رہ گئی ہو۔ میرا موضوع اگر منظر شہاب کے کمالات شاعری سے متعلق ہوتا تو دکھاتا کہ 'دوستو شہر میں آگ ہی آگ ہے'، 'آگ میں کب تلک خون اپنا جلائیں' اور 'بارشیں خون کی تیز ہیں' 'تیز ہیں خون کی آندھیاں'، جیسی غزلوں میں کیسی آتش سیال موجزن ہے۔

منظر شہاب کی شاعری میں ۱۹۷۷ء کے آس پاس ایک نیا موڑ بھی ملتا ہے۔ نظریاتی وفاداری کے باوجود عصری حسیت کی آمیزش نے ایک بالکل مختلف منظر شہاب کو جنم دیا ہے۔ ان کی باخبری، سماجی دردمندی وہی ہے جو پہلے تھی۔ نظریاتی پاسداری میں کوئی فرق نہیں آیا ہے مگر اب الفاظ کا سبھاؤ اور اسلوب کی جادوگری، نئے تلازمات کی مصوری نے ایک نئے نگار خانہ کی تزئین کی ہے۔ اس مقالے میں اس طرف بھی توجہ نہیں دی گئی ہے اور جو دی گئی ہے وہ ناکافی ہے۔

منظر شہاب کی نثر تخلیقی نثر کی جلوہ ریزی سے معمور ہے۔ ان کے کئی مضامین عصری ادب کے مزاج کو سمجھنے میں بھی اچھا حوالہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بعض مضامین سوانحی یادداشت اور تنقیدی بصیرت کی آمیزش سے وجود میں آئے ہیں۔ ان پر سیر حاصل گفتگو سے گریز کیا گیا ہے۔ منظر شہاب نے سن اسّی میں ہیئتی تجربہ بھی کیا تھا اور وہ تجربہ آزاد قطعہ کا ہے جسے میں مظہر امام کی آزاد غزل 'ردِ شوق' کا اثر کہہ سکتا ہوں۔

''منظر شہاب: حیات اور فکر و فن'' ڈاکٹر محمد صلاح الدین کی ایک قابلِ توجہ کاوش ہے۔ تنقید اور تحقیق کو ساتھ لے کر چلنا بہت مشکل ہے۔ محمد صلاح الدین کوئی پیشہ ور نقاد بھی نہیں ہیں اس لئے اپنے تخلیقی سفر میں تنقید کے بارِ گراں کو سبک خرامی کے ساتھ اگر نہیں نبھا سکے ہیں تو یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے اور نہ اس سے مقالہ کی سنجیدگی متاثر ہوتی ہے۔ اہمیت تو اس کی ہے کہ انہوں نے تنقید اور تحقیق دونوں کے تقاضوں کو نباہنے کی ایماندارانہ کوشش ضرور کی ہے مجھے اعتراف ہے کہ موصوف کا کام قابلِ تہنیت ہے اور اُسے اعتبار کا درجہ حاصل ہے۔

....

ڈاکٹر سید ابوالفیض سید آبادی (گیا)

عصری آگہی کا شاعر: منظر شہاب

منظر شہاب عصری اردو شاعری میں ایک معتبر نام ہے۔ اردو ترقی پسند ادب اور تحریک کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جائے گی جب تک اس میں منظر شہاب، حسن نعیم، مظہر امام، انور عظیم، کلام حیدری اور احمد یوسف کی ادبی کاوشوں کا ذکر موجود نہ ہو۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر کلام حیدری، انور عظیم اور احمد یوسف نے نثری صنف میں اردو افسانے کو نئے رنگ و آہنگ اور نئی تکنیک سے جلا بخشی تو منظر شہاب، حسن نعیم اور مظہر امام نے شعری اصناف کو نئے موضوعات اور نئی طرز اظہار سے روشناس کیا اور دل کشی عطا کی۔

ادب نہ تو تفریح طبع کا ذریعہ ہے اور نہ سیاسی جماعت کا منشور۔ ادب دراصل زندگی کا وہ آئینہ ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ ہمارے خفیہ احساس کو بیدار کرتا ہے۔ انسان کے فطری جذبات کو لفظ و معنی کا لباس عطا کرنا ادب کا کار خاص ہے۔ وہ مصلح بھی ہے اور درس حیات بھی دیتا ہے۔ شرط اتنی ہے کہ ادائے اظہار کی حسن کاری مجروح نہ ہو۔

منظر شہاب کی شاعری میں زندگی کے نوع بہ نوع موضوعات کی جلوہ گری ملتی ہے۔ واقعات عالم اور گرد و پیش میں رونما ہونے والے سانحات کی تصویر کشی کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ انہوں نے کئی سماجی اور سیاسی انقلابات کا مشاہدہ کیا ہے۔ شہاب نے ان سے جو اثرات قبول کئے ہیں ان کو ایماندارانہ طور پر اپنی شاعری کے ذریعہ دل نشیں انداز میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا متعدبہ حصہ پُر اثر اور سحر انگیز ہے جس کا احساس خود انہیں بھی ہے، کہتے ہیں:

ترے اشعار میں اعجاز تاثر ہے شہاب — رگ افکار کو تو خونِ جگر دیتا ہے

وہ ادب میں مقصدیت کے قائل ہیں لیکن مقصدیت کی ہم نوائی کے باوجود ان کی نگاہ ہمیشہ کشادہ رہی ہے۔ کسی سیاسی نظریئے نے انہیں باندھ کر نہیں رکھا۔ حتیٰ کہ مارکسزم کو بھی انہوں نے ایمان کا درجہ نہیں دیا۔ اسے ہمیشہ ایک سائنسی نظریہ سمجھا جس میں حالات کے پیش نظر تغیر اور تبدل کی کارفرمائی ضروری ہے اور جب بھی انہوں نے محسوس کیا کہ اشتراکیت ادعایت کا شکار ہوتی جا رہی ہے تو برملا اس کا اظہار کیا جس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ انسان دشمن موضوعات کو ادبی لباس پہنانا ان کی شریعت میں کفر سے کم نہیں۔ وہ موضوعات کی صحت کے ساتھ ساتھ طرز اظہار کی صحت پر بھی زور دیتے ہیں۔ ''پیراہنِ جاں'' میں انہوں نے اپنے ادبی نظریات کا اظہار کتنے حسین انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''موضوع سے وفاداری لائق ستائش جذبہ ہے لیکن اس کے اظہار میں شعری لوازمات سے بے اعتنائی کو سراہا نہیں جا سکتا۔ اگر فنکار حرف کی جادوگری اور آہنگ کی عشوہ طرازی کا رمز شناس نہیں تو اس کا موضوع خواہ کتنی ہی افادیت کا حامل ہو تخلیقی ادب کا حصہ نہیں بن سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہیئت کی تمام تر فنکاری کے باوجود ایسے موضوعات جو سماجی ارتقاء میں حارج ہوں تخلیقی ادب کی سطح کو پست کر دیتے ہیں۔ ادب یا کسی فن لطیف میں ناوابستگی کا سوال بے معنی ہے۔ فنکار کبھی معنی کبھی ہیئت اور کبھی دونوں سے وابستہ رہتا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ منظر شہاب کی شاعری ان کے ادبی نظریات کا آئینہ ہے۔ انہوں نے ہمیشہ موضوع اور ہیئت کے ساتھ باہمی حسن ارتباط کو برقرار رکھا ہے۔ حکایت زیست کو شیریں اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ کہیں کہیں کم رسائی کا بھی احساس ہے۔ ملاحظہ ہو:

فسانہ تلخ ہے اور ضد کہ لطف سے کہیے　　مگر شہاب بہ این درجہ خوش کلام نہیں

مقصدیت اور جمالیات کے توازن سے ان کی شاعری کا روپ نکھرتا ہے۔ اس وصف نے انہیں اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد اور ممتاز حیثیت کا مالک بنادیا ہے۔

منظر شہاب نے زمیندارانہ ماحول میں پرورش پائی۔ زمینداروں کا دبدبہ ٹھاٹ باٹ، سامانِ تعیش اور ان کی پرشکوہ حویلیاں سب کچھ دیکھا۔ لیکن جلد ہی یہ ماحول بدل گیا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے ہولناک صورت اختیار کرلی۔ قتل و غارت گری تباہی بربادی اور مظالم کی گرم بازاری نے ڈیرہ ڈال دیا۔ خوف و ہراس میں گھرے لوگوں کی ہجرت، زمینداری کا خاتمہ، معاشی بدحالی وغیرہ ایسے حادثات تھے جنہوں نے ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس طوفان میں ان کا سفینہ حیات بھی موجوں کے تھپیڑوں سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان حادثات نے میری روح میں زہر گھول دیا۔ اعتبارات کی دنیا پارہ پارہ ہوگئی اور میں کٹی پتنگ کی طرح فضا میں بے سمت ڈولتا رہا۔ مایوس، تنگ دل، بےزار۔" (خوں چکاں قصہ مرا)

لیکن یہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی۔ ان کے ذہن نے مثبت راہ تلاش کرلی۔ مارکسزم کے مطالعہ سے سیاسی اور معاشی آزادی کے نکات کو سمجھنے میں مدد پہنچائی۔ قومی سیاست کو بین الاقوامی سیاسی پس منظر میں دیکھنے اور پرکھنے کا ہنر سکھایا۔

اشتراکی فکر و نظر نے اس درجہ متاثر کیا کہ وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے۔ ان کے ادبی نقطہ نظر میں بھی نمایاں تبدیلی آگئی جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے:

"میں نے ادبی تخلیقات کو نئے مفاہیم کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اشتراک درد کی تہہ میں افراد کے باہمی رشتوں کا سراغ ملتا ہے۔ سماجی تقاضے ابھرتے ہیں۔" (خوں چکاں قصہ مرا)

ان کی تخلیقی کاوشوں کا نیا انداز جو کلاسیکی انداز بیان سے جدا ہے، ملاحظہ ہو:

زیست گلزار سہی درد کا صحرا بھی تو ہے　　اس جزیرے سے لگا آگ کا دریا بھی تو ہے

روز و شب ظلم کے پنجوں پہ سسکتے ہوئے دل　　ان کے آزار کا کچھ اور تقاضا بھی تو ہے

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوگیا۔ ہندوستان کی آزادی کا سورج لاکھوں افراد کے خون میں نہا کر نمودار ہوا۔ حکومت کا جوا بدل گیا جس میں عوام کا بہت معمولی حصہ تھا۔ زمام حکومت گورے ہاتھوں سے منتقل ہو کر کالے ہاتھوں میں آگئی۔ فاقہ کشی معاشی استحصال، طبقاتی کشمکش سابق دستور قائم تھے۔ منظر شہاب نے ہندوستان کی ناآسودہ آزادی کے متعلق اپنے مجروح جذبات کا اظہار "جشن کی رات" میں بھرپور انداز میں کیا ہے۔ اس نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو:

لیکن اے دوست شب تار کا منظر ہے وہی　　دست افلاک وہی وقت کا خنجر ہے وہی

اب بھی مفلوج ہیں محفل کے رباب و طاؤس   مضمحل شوق کی شہ رگ میں لہو ہے اب تک
جشن کی رات ابھی خواب کی منزل میں ہے

ہندوستان کی معاشی غلامی اور شکست آرزوگی لے ان کی شاعری میں اکثر و بیشتر تیز ہو جاتی ہے۔درج ذیل اشعار میرے قول کی ضمانت ہیں:

اب تم اس کو بہار کہو یا خزاں کہو   ہیں خون عندلیب سے عارض گلوں کے نم
یہ نسیم پا شکستہ یہ طیور دل گرفتہ   ابھی گلستاں میں ماتم ابھی شاخ غم ہری ہے
یہ مفلسی کے ہرے کھیت بھوک کی فصلیں   تمہارے راج نے کیا سبز سبز اکال دیا

منظر شہاب کی شاعری میں اشتراکی فکر نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ہم عصر نوجوان دانشوروں کی طرح انہوں نے بھی اشتراکی انقلاب میں کشش محسوس کی۔ان کا خیال تھا کہ طبقاتی نظام کے خاتمہ اور دنیا بھر کے لوگوں کے دکھ درد کا مداوا سرخ انقلاب کی آمد کے بعد ہی ممکن ہے۔سوویت روس کے بعد چین،کوریا،ویت نام اور دیگر ممالک میں اشتراکی حکومت کے قیام اور پر حوصلہ جدوجہد نے ان کے دل کو ولولوں سے بھر دیا۔انہیں پر جوش اور پر مسرت جذبات نے ''سنہرے لمحے'' کا شعری پیکر اختیار کر لیا۔چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

''سنہرے لمحے/نئی سحر کے سنہرے لمحے/رخ جہاں سے ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں/فضا کو زریں بنا رہے ہیں/افق کے رخسار نیلگوں پر شفق کا غازہ دمک رہا ہے/شفق کا غازہ چہار عالم کو آئینہ سا دکھا رہا ہے

نئی سحر دراصل وہ سحر تھی جو اشتراکی تحریک کے ذریعہ وجود میں آئی تھی جس نے سرمایہ دارانہ نظام کی عالیشان عمارتوں کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔اس ضمن میں صرف دو اور نظموں کا ذکر کروں گا۔''ساقی نامہ'' اور ''حکم امتناعی۔'' یہ وہ نظمیں ہیں جو منظر شہاب کے اشتراکی افکار کی نمائندگی کرتے ہیں۔

'ساقی نامہ' منظر شہاب کے سیاسی مسلک کی کلید ہے۔روس،چین،کوریا،ویت نام اور یونان میں اشتراکی تحریکات کا عروج اور سرخ انقلاب کی جدوجہد اور کامرانیوں کی حوصلہ انگیز تصویر کشی کی گئی ہے۔بعض نقاد کا خیال ہے کہ'ساقی نامہ' دراصل منظر شہاب کے شعری افکار وفن کا شناخت نامہ ہے۔اس تخلیق نے شاعر کو کافی شہرت بخشی۔جب بھی اس نظم کا ذکر ہوا۔اقبال کے ساقی نامہ کا تذکرہ بھی آیا ہے اور ان دونوں نظموں کی مماثلت اور مغائرت کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔

'ساقی نامہ' جوش،ولولہ،یقین اور رجائیت کے جذبات سے لبریز نظم ہے۔روانی بے مثال ہے۔ایک ایک مصرعہ سے جیسے زندگی ابھر رہی ہو۔ساری نظم پر سحر انگیز فضا چھائی ہوئی ہے۔شعری لوازمات کے آئینے کو بہت سنبھال کر رکھا گیا ہے۔اس کا فکری پہلو بھی قابل توجہ اور لائق ستائش ہے۔میرے خیال میں یہ نظم شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ مشرق میں سورج ابھرتا ہوا   وہ چہرہ افق کا نکھرتا ہوا
چمکتے ہوئے لمحۂ زر نگار   لچکتے ہوئے شمس پاروں کے تار
فضائیں شعاعوں سے پُرنور ہیں
فضائیں نہیں، خطہ طور ہیں

آخری بند میں شاعر نے اپنے وطن عزیز ہندوستان کی اقتصادی غلامی کا ذکر کیا ہے گرچہ ہندوستان نے سیاسی آزادی حاصل کرلی ہے لیکن مفلوک الحال جہالت، توہم پرستی اور استحصال سے نجات حاصل نہیں ہوئی ہے:

یہ خم خانہ ہند میرا وطن	یہ سارے زمانے میں یکتا چمن
بہت اس کے دل سے اڑی دھول دھول	کہیں تب کھلے ڈال میں پھول پھول
مگر اس گلستاں کی رعنائیاں	وہ حسن بہاراں کی تہہ داریاں
ابھی تک ہیں مستور ظلمات میں	تجلی ہے پنہاں حجابات میں
اگرچہ ہے بزم اپنی، اپنے ہیں جام	مگر بادۂ غرب سے لالہ فام

''حکم امتناعی'' سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کی اسیری سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔ پاکستان کی فوجی حکومت نے ان دونوں اشتراکی مجاہدوں کو سلاخوں کے پیچھے بند کردیا تھا۔ اس حادثہ نے دنیا بھر کے ترقی پسند دانشوروں کو مضطرب کردیا اور انہوں نے اس جبر کے خلاف آواز اٹھائی۔ منظر شہاب کے ذہن پر جو تاثرات مرتسم ہوئے انہوں نے حکم امتناعی کا پیکر اختیار کرلیا۔ دو بند نذر کررہا ہوں:

سنا ہے ارض خدا کے صنم خانے/خموش ہیں در ودیوار پر اداسی ہے/شکست ساغر وطاؤس کی منادی ہے/ فقیہ نو کارواں حکم امتناعی ہے/اسیر حلقہ زنجیر میں ہیں مستانے!

اور پھر—

زمانہ فرض سے غافل نہیں مرے ہمدم/خزاں گزیدہ ہیں دشت ودمن تو یہ کب تک؟/ چھپے ہیں گھات میں ناوک فگن تو یہ کب تک؟/شکست پا ہیں غزال ختن تو یہ کب تک؟/ ہر ایک زخم کا جہد عوام مرہم ہے

دوسری جنگ عظیم کے بعد سوویت روس ایک عظیم طاقت بن کر ابھرا۔ جرمن، پولینڈ، ہنگری اور کوریا میں اشتراکی حکومتوں کا قیام عمل میں آگیا۔ چین میں سرخ انقلاب نے چیانگ کائی شک کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ انڈوچائنا-کمبوڈیا-انڈونیشیا اور ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک نے زور پکڑلیا۔ دنیا کے چھٹے حصے کے طول وعرض میں اشتراکیوں کا بول بالا ہوگیا۔ اشتراکیت کے سیلاب نے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں ہلادیں۔ امریکہ کی تجارتی منڈیاں سرد پڑنے لگیں۔ جنگی اسلحوں کی فروخت کساد بازاری کا شکار ہوگئی۔ اس اقتصادی بحران کا حل تیسری عالمگیر جنگ کے چھڑنے میں ہی مضمر تھا۔ دوسری جانب ترقی پسندوں کا خیال تھا کہ دنیا میں امن قائم رہا تو رجعت پسندوں کا اقتصادی بحران اس قدر شدید ہوجائے گا کہ ان کی ریڑھ کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی اور یہ اپنی موت مرجائیں گے۔ چنانچہ سوویت روس کی قیادت میں امن عالم کی تحریک کا آغاز کیا گیا۔ اس تحریک نے کافی زور پکڑلیا۔ دنیا کے گوشے گوشے میں امن کا نیلا پرچم لہرانے لگا۔ ایک نیا عوامی شعور بیدار ہوگیا۔ ادیبوں، شاعروں اور دوسرے دانشوروں نے ادبی تخلیقات تقاریر اور مباحث کے ذریعہ اس تحریک میں زبردست روح پھونک دی۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بے شمار افسانے، ڈرامے، ناول اور رپورتاژ لکھے گئے۔ اردو کے ترقی پسند ادیبوں نے سیکڑوں ادب پارے تخلیق کئے۔ متعدد رسائل نے ''امن نمبر'' نکالے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں امن عالم سے متعلق ادبی تخلیقات پر مشتمل ایک ضخیم انتخاب ''ہم امن چاہتے ہیں'' کے نام سے ہربنس سنگھ دوست (مرحوم) نے جمشید پور سے شائع کیا۔

منظر شہاب نے بھی جنگ کے خلاف اور امن عالم کی حمایت میں ایک انتہائی خوبصورت نظم لکھی — ایک رات۔ بلاشبہ اس موضوع پر انگنت نظمیں لکھی گئی ہیں۔ جو زیادہ تر بلند آہنگ اور براہ راست طرز بیان کا شکار ہوگئی ہیں۔ لیکن منظر شہاب کی نظم 'ایک رات' ایک فنکارانہ تخلیق ہے۔ خوبصورت علامت، تمثیل، امیجنری، تشبیہ، استعارہ، محاکات اور لطافت نے اس نظم کو ایک اثر انگیز لازوال فن پارہ کا درجہ عطا کردیا ہے۔

نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی شہاب نے اشتراکی تحریک کے خوش آئند پہلوؤں کو شعری جامہ پہنایا ہے۔ ان کے خیال میں مظلوم انسانیت کے دکھ درد کا علاج اشتراکی نظام میں ہی ممکن ہے۔ اس لئے اس نظام کے قیام کی آرزو ان کی شاعری کے رگ و پے میں جاری و ساری نظر آتی ہے۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

حدود طور کی بندش تو اٹھ چکی یارب — مگر ہنوز کلیموں پہ جلوہ عام نہیں
ہوا کی سانس ہے بوجھل فضا بھی گم سم ہے — کہیں قریب میں طوفاں رکا رکا سا ہے
منظر شہاب آؤ جی بھر کے ہم بھی رو لیں — چپ سادھنے سے عہد ماتم نہیں بدلتا

منظر شہاب ایک مخلص اشتراکی ہیں۔ انہوں نے مارکسزم کو ہمیشہ ایک نظریہ سمجھا ہے جس میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ صحیح مارکسزم ادعائیت سے آزاد نظریہ ہے جو کسی بندھے ٹکے اصول کا پابند نہیں۔ زندگی کی طرح اس نظریہ حیات میں لچک ضروری ہے ورنہ عمل کے میدان میں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑے گا۔ وہ کہتے ہیں:

عمل کی جنگ میں اکثر لچک بھی جاتا ہے — اصول زیست کا شمشیر بے نیام نہیں

انہوں نے مارکسزم کو اعتقاد کے طور پر تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ اپنے شعور کے دریچے کو ہمیشہ کھلا رکھا اور جب بھی محسوس کیا کہ اشتراکیت اپنی کارگذاریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو رہی ہے تو برملا اس کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اشتراکیت پر اعتماد کے باوصف اکثر تشکیک کا بھی اظہار ہوتا رہا ہے۔ تشکیک کی یہ کیفیت ابتدا سے ہی نظر آتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کارواں منتشر سفر ناکام — تیز بانگ درا کرے کوئی
جنوں نواز گریباں تو سی رہے ہیں مگر — کسے خبر یہ بہ امکانِ اعتبار سلے

۱۹۶۲ء میں چین نے ہندوستان کی سرزمین پر حملہ کردیا۔ ہند چینی بھائی بھائی کا فلک شگاف نعرہ لگانے والے اب شمشیر بکف ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ ہم وجودیت کے اصول کے تحت پنچ شیل کا معاہدہ پارہ پارہ ہوگیا۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی شدید نظریاتی بحران کا شکار ہوگئی۔ دلی میں تین دنوں تک بحث و مباحثہ کے باوجود بالاتفاق کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا۔ آخرش پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ کمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ (C.P.M) کے نام سے ایک نئی اشتراکی سیاسی جماعت وجود میں آگئی۔ پھر تو پارٹی کے ٹوٹنے بکھرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اخلاقی نظریہ رکھنے والے رہنماؤں کے نام سے کمیونسٹ پارٹی کے کئی گروپ بن گئے۔ سہولت پسندوں اور مہم بازوں کے درمیان کمیونسٹ پارٹی دن بدن انتشار کا شکار ہوتی چلی گئی۔ ان غیر متوقع واقعات سے منظر شہاب کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ انہوں نے چین کی جارحانہ پالیسی کی سخت مخالفت کی اور اشتراکیت کے سلسلہ میں ان کے جذبۂ تشکیک نے شدت اختیار کرلی۔ ملاحظہ ہو:

دم بخود ہے اشتراکی فکر گاہ   منتشر مسلک جمعیت کی ہوئی
جس کی اک اک بوند کو امرت کہیں   مشتبہ اس جام کی صحت ہوئی

حقیقت یہ ہے کہ منظر شہاب کی اشتراکی شاعری یقین وگمان کے سائے سائے چلتی ہے۔ امید اور نا امیدی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے محسوسات انسانی فطرت سے ہمیشہ قریب نظر آتے ہیں۔ جذبہ تشکیک نے ان کے نظریات کو نہ صرف کٹھ ملائیت سے بچائے رکھا بلکہ اس سے ان کی شاعری میں احساس کی کسک اور تہہ دار کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ کبھی کبھی ان کی دل شکستگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ وہ خود اپنے نظریات کی نفی کر رہے ہوں اور اور اضافی مادیت سے گریز کر کے عین روحانیت میں پناہ لینے کے خواہش مند ہوں۔ ایسے ہی احساسات سے بھر پور تمثیلی اور علامتی پیکر میں ڈھلا ہوا ایک شعر گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ کہتے ہیں:

زرد پتوں کی مانند بکھرا کیے سرخ پھولوں کی چاہت میں منظر شہاب
اب تو بہتر ہے سپنوں کی انگنائی میں ایک ننھا سا تلسی کا پودا لگا ئیں

چند اور اشعار نقل کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جو اشتراکی تحریک کی نارسائی کے المیہ کی عکاسی کرتے ہیں:

ساگر کی بوند بوند ترستی ہے ابر کو   اے آفتاب تیری تمازت کو کیا ہوا
کیا کیا نہ اہلِ درد پہ گزریں قیامتیں   لیکن اس ایک جان قیامت کو کیا ہوا
مصروف ہیں نماز تہجد میں مقتدی   کھوئے کہاں امام جماعت کو کیا ہوا

لیکن آزردہ احساسات کی کیفیت ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ بس آتی جاتی رہتی ہے۔ ندی کی معصوم اور سر دلہر کی طرح جلد ہی بادل چھٹ جاتے ہیں اور امید کا آسمان صاف شفاف اور کشادہ ہو جاتا ہے۔ ناکامیوں سے کام لینے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں:

پھر درد کی شاخوں میں نئے پھول ہیں روشن   پھر حوصلہ جینے کا ملا شہر ہوس میں

کتنی اندھیری رات ہے مشعل بکف چلیں   کیا سوچنا شہاب قیامت کو کیا ہوا

جینے کا یہی حوصلہ شاعر کو طوفان میں چاک پیراہن کی ادا سکھاتا ہے:

پیراہنِ جاں چاک رہے تیز ہوا میں   طوفان میں جینے کی ادا چاہئے یارو

منظر شہاب تقریباً ۵۰ سال سے جمشید پور میں قیام پذیر ہیں۔ وہ آدی باسیوں کی سیاسی سرگرمیوں سے قربت محسوس کرتے ہیں۔ اور سرسبز جنگلوں اور پہاڑوں میں نمو پذیر آدی باسیوں کے سبز انقلاب کی جدو جہد سے واقف ہیں۔ کہتے ہیں:

پہاڑ سے اتر نہ آئے آگ شہروں میں   سنا ہے سبز بگولہ اٹھا اٹھا سا ہے

ہندوستان کی آزادی کے تقریباً ایک دہائی بعد فرقہ پرستی کے عفریت نے پھر سے سر اٹھایا۔ کشت وخون کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے بلکہ فرقہ پرستوں کی گرفت روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ جمشید پور، رانچی، جبل پور، میرٹھ، بلند شہر، علی گڑھ، احمد آباد، بمبئی اور حیدرآباد میں بھیانک فسادات ہوئے۔ رفتہ رفتہ پورا ملک اس آگ کی لپیٹ میں آتا جا رہا ہے۔

منظر شہاب بہ نفس نفیس خونیں فسادات کے انگاروں سے برہنہ پا گذرے ہیں۔ جمشید پور ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۹ء کے فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناکی، تباہی، بربادی اور ہوس رانی نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ عصبیت کے اس مکروہ کھیل میں پروفیسر، ڈاکٹر، وکلاء اور دیگر دانشور افراد اور سیکولر سیاسی جماعت سے وابستہ کئی شر پسندوں نے دل کھول کر حصہ لیا۔ منظر شہاب نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ 'لہو کی آگ میں جلتا گلستان'، 'معصوم کلیوں کے چھلنی کلیجے'، 'مہ جبینوں کی روشن چتائیں'، 'پتھرائی ہوئی چشم غزالاں'، 'پاسبان ساختہ آزاد زندان'، 'خود اپنے شور میں مدفون فریادیں'، 'خون کی بارشیں'، 'پٹرول کی آگ کا چراغاں'، 'قتل کا سانحہ لکھتی ہوئی پاسبان وردیاں'، 'حسن گلرنگ' اور 'عشق گلنار کے جلتے ہوئے پیرہن'۔ یہ سب ایسے محسوسات ہیں جن کو شاعر نے ''ہم نہ بھولیں گے'' اور ''بارشیں خون کی تیز ہیں'' جیسی تخلیقات میں شعری پیکر عطا کیا ہے۔ متذکرہ بالا دونوں نظمیں تشبیہ، استعارہ، علامت، تمثیل پیکر تراشی اور ادائے اظہار کی نادرہ کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ فساد کے موضوع پر ایسی مرصع، مسجع موثر مکمل اور سارے شعری لوازمات و حسن کاری سے مربوط نظم کم ہی دیکھنے کو ملے گی۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے نظم 'ہم نہ بھولیں گے' کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں :

کلیجے چھلنی نوک خار سے معصوم کلیوں کے — دریدہ جا بجا پھولوں کے داماں ہم نہ بھولیں گے
ستم کے گھاٹ پر روشن چتائیں مہ جبینوں کی — ہوس کی سیج پر بے خواب خوباں ہم نہ بھولیں گے
نہ جانے کیا وہ کہتی تھیں، نہ جانے کس کو تکتی تھیں — وہ پتھرائی ہوئی چشم غزالاں ہم نہ بھولیں گے

(ہم نہ بھولیں گے)

اس ضمن میں منظر شہاب کی نظم ''ماتم زکی انور کا'' کا ذکر بھی ضروری ہے۔ زکی انور سے منظر شہاب کے دیرینہ تعلقات تھے۔ اتفاق یہ ہوا کہ جب وہ کریم سٹی کالج جمشید پور کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے تو زکی انور ان کے شریک کار بن گئے، کیونکہ موصوف اس کالج کے شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ایک عالم جانتا ہے کہ زکی انور سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ سیاسی طور پر وہ گاندھی وادی تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ ۱۹۷۹ء کے ماہ اپریل میں 'رام نومی' کے تیوہار کے موقع سے جب فضا کشیدہ ہوگئی اور ہندو مسلم اتحاد کے قائم رکھنے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ تو زکی انور نے چند رفقا جن میں ہندو حضرات بھی شامل تھے۔ ان کے تعاون سے بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ فرقہ پرستوں کے خلاف یہ ایک پرامن احتجاج تھا۔ مسلمانوں پر اس بھوک ہڑتال کا اچھا اثر نہیں پڑا۔ افواہ پھیلا دی گئی کہ زکی انور نے ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بھوک ہڑتال کا ڈھونگ رچایا ہے بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ زکی انور ہندوؤں کے ہاتھوں بک گئے ہیں اور مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنے کے لئے فریب کا جال بنا گیا ہے۔ مسلم فرقہ پرستوں نے بھوک ہڑتال کے خلاف اتنا مذموم پروپیگنڈہ کیا کہ پرجوش نوجوانوں کے ایک گروہ نے بھوک ہڑتال کے خلاف جارحانہ رخ اختیار کر لیا اور تقریباً ایک بجے رات میں شر پسندوں نے توڑ پھوڑ اور مار پیٹ شروع کر دی۔ کرسی ٹیبل اور دوسرے فرنیچر کو الٹ پلٹ دیا۔ تاثرات کی قلمبندی کے لئے جو رجسٹر رکھا گیا تھا اسے پارہ پارہ کر دیا۔ گالیوں اور زدوکوب کے ساتھ ساتھ بدترین نتائج کی دھمکی بھی دی گئی۔ بھوک ہڑتال کا شیرازہ بکھر گیا۔ ان حادثات نے زکی انور کو سخت صدمہ پہنچایا۔ وہ سخت ذہنی اور اعصابی تشنج میں مبتلا ہو گئے۔ انہیں

فرقہ پرست ہندوؤں اور فرقہ پرست مسلمانوں دونوں میں ایک سکہ کے دو رُخ نظر آنے لگے اور وہ اپنے ذاتی مکان میں جو ہندوؤں کے علاقہ میں تھا مقید ہو گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ان کے پڑوسی جن سے کئی برسوں سے ارتباط تھا ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کریں گے مگر وا حسرتا!

بدن پہ زخم کے نقش و نگار تھے ایسے　　پڑوسیوں نے محبت سے جن کو کاڑھا تھا

تصویر کا دوسرا رخ یہ تھا کہ وہ مسلمان دوست جنہوں نے بھوک ہڑتال کی حامی بھری تھی اور تا دم آخر رفاقت کا وعدہ کیا تھا جن کے خوف سے گوشہ نشیں ہو گئے اور زکی انور کو جھلستی دھوپ میں تنہا چھوڑ دیا۔

اداس چاند کی چھاؤں میں یار ساتھ رہے　　وہ آفتاب کی آندھی میں برگ تنہا تھا

زکی انور کو قتل کر دیا گیا یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس پر تمام انسان دوست اور غیر متعصب دانشوروں نے نوحۂ ماتم لکھا۔ زکی انور کو موت کی سزا کیوں دی گئی؟ آخر اس کا کیا قصور تھا؟ منظر شہاب کی زبان میں سنئے:

وہ سربریدہ تھا اس کا قصور اتنا تھا　　اندھیری رات میں مشعل رہ لے کے نکلا تھا

نظم کا آخری شعر جس سے زکی انور کے غیر متعصب مزاج اور ان کے فرقہ پرست مخالفین کے تیور کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

بس اتنی بات تھی جس پر خفا تھا زہد کہ وہ　　کلس کے سنکھ میں گنبد کا لحن بھرتا تھا

منظر شہاب نے ایک مخلص ترقی پسند شاعر کی طرح ہمیشہ فرقہ پرستی کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ ان کی شعری کا ایک متعد بہ حصہ ملکی سالمیت اور قومی ہم آہنگی سے عبارت ہے۔ 'ہندی بچوں کا قومی ترانہ'، 'دو ملک دو کہانی' اور 'اے میرے پیارے وطن' ایسی نظمیں ہیں جن میں قومیت اور وطن کی سالمیت کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ فرقہ پرستی کے خلاف منظر شہاب کے قلمی جدوجہد پر طویل گفتگو ہو چکی ہے۔ چلتے چلتے مزید دو اشعار نقل کرنا چاہتا ہوں۔

اے دوست انتقام کے شعلے بجھا کے دیکھ　　کس کے لہو سے ہاتھ ہیں کس کے رنگے ہوئے

....

سورج کہ چاند دونوں کے آئینے شکستہ　　پھر بھی مزاج سنگ برہم نہیں بدلتا

منظر شہاب کی شاعری کا اسلوبیاتی مطالعہ ایک علاحدہ موضوع ہے۔ سردست اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں شعری لوازمات کا بے حد پاس رکھا ہے۔ موضوعات کے قد و قامت کے اعتبار سے انہیں الفاظ کا ملبوس بخشتا ہے اور ہر عہد میں طرز اظہار کے عصری تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ ان کے شعری سفر میں مسلسل تغیر کا عمل جاری رہا ہے۔ انہوں نے ذہن کا دریچہ کھلا رکھا ہے۔ جدید ادب کے نت نئے علائم۔ تمثیلات اور ڈکشن کو لبیک کہا ہے درج ذیل اشعار ان کے ادبی نظریات کی صاف اور خوبصورت تصویر کشی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

مطلوب ہو گر شاہد معنی کی تجلی　　الفاظ کی صد رنگ قبا چاہئے یارو

شاداب نئی رت سے ہے گلزار ادب بھی　　پھولوں کو تر و تازہ ہوا چاہئے یارو

قابل ستائش امر یہ ہے کہ منظر شہاب نے اپنے ادبی نظریہ سے ہمیشہ وفا کی ہے اور انہیں خلوص کے ساتھ اپنی تخلیقات میں برتا ہے۔ انہوں نے آزاد قطعات کی شکل میں اردو شاعری کو گراں بہا تحفہ بھی عطا کیا ہے۔

....

شمس فریدی

''اور پھر بیاں اپنا'' ایک جائزہ

'اور پھر بیاں اپنا' منظر شہاب کے پندرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ منظر شہاب خود ایک شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری میں جمالیاتی دلکشی، فن کا رچاؤ، الفاظ کا دروبست، شیریں بیانی، فکر و خیال کی رنگینی اور بانکپن ہے۔ اُن کی نثری تحریر میں بھی حسن بیان اور بلندیٔ اسلوب میں جو سحر انگیزی ہے، اس حقیقت سے کوئی بھی صاحبِ علم و نظر انکار نہیں کر سکتا ہے۔

یہ کتاب منظر شہاب کی علمیت، ذہانت اور خلاقانہ ذہن کی وسعت کا ثبوت اور تنقیدی بصیرت کی غماز ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون 'ودیاپتی' پر ہے۔ میتھلی زبان میں ودیاپتی کی شاعری کی فنکارانہ بلندی اور فکر و خیال کے اچھوتے پن کا منظر شہاب نے بڑے دلآویز اور حسین انداز میں تعارف کرایا ہے۔ ودیاپتی کی عظیم شاعری کا مطالعہ انہوں نے بہ نظرِ غائر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ودیاپتی محبت اور حسن کے پجاری ہیں۔ بقول ودیاپتی مجھے جہاں بھی حسن ملا میں نے اُس سے محبت کی۔''

انہوں نے ودیاپتی کو کالیداس اور کیٹس کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ ودیاپتی کی سنسکرت زبان کی تصنیفات پر ان کی گہری نظر ہے۔ 'کیرتی لتا'، 'بھوپری کرما' اور 'پرس پریکشا' کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ خصوصاً انہوں نے پداولی کو ایک بے مثال تخلیق بتاتے ہوئے اس کی معنویت، غنائیت اور موسیقیت کا ذکر یوں کیا ہے:

''پداولی میں محبت کے سوز، وصال کی مسرت اور ہجر کے مرگ میر ساگ کے ساتھ ساتھ فن کی بہترین صناعی اور چابک دستی بھی موجود ہے۔ اس کی زبان اپنا ایک خاص رنگ رکھتی ہے۔ اس کو آپ کہیں سے دیکھیں یہ بول اٹھے گی۔ ''میں ودیاپتی کی تحریر ہوں'' گوکل کی کا کلی ہوں، گلستان ادب میں عندلیب کا نغمہ ہوں، ایک ایسا نغمہ جو اپنی ممتاز اور ترنم رکھتا ہے۔ کوئی متھلا میں آ کر ان کی مقبولیت کا اندازہ لگائے، بھوت ناتھ کے مندر سے لے کر نئی نویلی دلہن کے حجلۂ عروسی تک اُن کے نغموں کی جھنکار گونجتی ہے۔ اگر ایک طرف ٹیپو پجاری ڈمرو ہاتھ میں لئے دھونی رمائے ''دکھن ہرب دکھ مور ہے بھولا ناتھ'' (میرے دکھ کو کب دور کرو گے بھولا ناتھ) گا گا کر مقدس دیوتاؤں کو خوش کرتے ہیں تو دوسری جانب نئی نویلی دلہن کو حجلۂ عروسی تک پہنچاتے ہوئے دوشیزائیں ''سندری چلو پیو گھر نا چاہت لاگو درنا'' (اے دلہن گھر کی جانب چلو اور جاتے ہوئے تمہیں ڈرنا نہیں چاہئے) گا کر سہاگ کی جوت جلاتی ہیں۔''

چونکہ منظر شہاب بنیادی طور پر ایک تخلیقی شاعر ہیں، اس لئے اُن کے اظہار بیان اور طرز نگارش میں بے پناہ دلکشی اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے، ان کی نثر نگاری میں جو جادو بیانی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ایک رچے ہوئے شاعرانہ ذہن کے مالک ہیں۔ 'میتھلی کے لوک گیت' اُن کی کتاب کا دوسرا اہم مضمون ہے۔ میتھلی لوک گیتوں پر ان کا یہ مضمون دنیائے اردو ادب کے لئے ایک گراں مایہ تحفہ ہے۔ میتھلی لوک گیت سے قارئین کو متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں اصل متن کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے وہ قارئین ادب کو متحیر کر دیتے ہیں، انہوں نے اس کے لئے بڑی عرق ریزی اور کاوش کی ہے۔

الفاظ اور اسلوب بیان اتنا موثر اور دلکش ہے کہ متھلا کے لوگ گیتوں میں لطیف احساسات اور جذبات کا ایسا بھرپور اظہار ہے۔ جس میں متھلا دیس کی مٹی کی خوشبو کی لذت بھی اور حقیقی خدوخال کی تصویر کشی بھی، متھلا لوک گیتوں کی کئی اصناف مثلاً سوہر، جھومر، سمری، جنو گیت، لگن گیت، سمدانی، بٹ گمنی کا تعارف کراتے ہوئے ان کی معنویت کی تفصیل بھی دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

میتھلی لوک گیت میں جنسی بھوک سے لے کر پیٹ کی بھوک کی ترجمانی لوک گیت کے اصل متن کے ساتھ وہ جن الفاظ و اسلوب سے کام لیتے ہیں وہ صرف ان ہی کا حصہ ہے۔ میتھلی لوک گیت پر ان کے وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ میتھلی زبان کے اصل متن کے حسن و خوبی پر ان کی مضبوط گرفت اور دسترس حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ان لوک گیتوں کا دل بہت نازک ہے۔ اس دل میں کبھی کبھی پر جوش ترنگوں کی کلبلیں بھی اٹھتی ہیں، لیکن دل کا اصل رنگ اُس وقت نکھرتا ہے جب ان میں خوشی کی میٹھی لہریں اٹھتی ہیں یا غم کی ہلکی ہلکی آنچ سلگتی ہے۔ بھاوج دیور کے چٹکلے، ساس نند کی رنجشیں، ماں باپ کی شفقتیں، بھائی بہنوں کی محبتیں، پریتم کا پیار، وصل کا راگ، ہجر کی آگ، سماج کی بندشیں، مفلسی کی داستانیں اور نہ جانے کتنے احساسات دل کو چھو لیتے ہیں۔ ہجر کی آگ میں جلتی ہوئی ایک غم زدہ دوشیزہ کا نغمہ سنئے:

آم منجری مہوا توال تے، اونا پہو مورل گھورل
دیپ جرل باتی جرل تے ارنا بہو مورا ایل

(آم میں منجر لگ گئے، مہوا جھڑنے لگا، دیئے کی لَو ماند پڑ گئی، لیکن میرے پریتم نہیں آئے)

سوہر گیت متھلا کی عورتیں گھروں میں اُس وقت گاتی ہیں جب بیٹی اور بہو امید سے ہوتی ہیں۔ اُس گیت میں جذبات کی کیفیت اور تخلیقی سرشاری کا خوبصورت اظہار منظر شہاب عجیب پُر لطف الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہر رات عورتیں محفل جماتی ہیں اور ڈھولک کی تھاپ پر لہک لہک کر سوہر کے نغمے گاتی ہیں، ایک وجود کو تخلیق کرنے والی ماں کا دل اس طرح آرزومند ہوتا ہے۔''

کیو نہ بنے اُپجئے چمپارے کیو نے بنے کیسر دے
للنا کیو نے بنے چوئے مجھے چنریا رنگائے رہے

(کس بن میں چمپا ہوتا ہے اور کس بن میں کیسر اور کس بن میں کسم چوتا ہے، میں چنریا رنگاؤں گی)

لوک گیتوں میں متھلا کی معصوم حسیناؤں کے جذبات و احساسات کی سچی عکاسی وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہجر کے دنوں کے درد و غم سے بھری ہوئی تصویر کھینچنے میں متھلا کی عورتوں کو کمال حاصل ہے۔ پریتم کہیں پردیس میں ہے۔ اس کے انتظار میں ایک دلہن شنکھ کی چوڑیاں توڑ کر اور اپنی چولی چاک کر کے جوگن بن جانا چاہتی ہے۔''

پھوربئی ہم شنکھ چوڑیا پھاربئی ہم چولیا لے دھرتی جوگنیا کے دیش

اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ پردیس چلا جائے گا تو:

اے ہی ہم جنتیو پیا جیتن پردیسوا باندھتیو ہم ریشمک ڈور

(اگر میں جانتی کہ پیا پردیس چلا جائے گا تو اسے ریشم کی ڈور میں باندھ دیتی) لیکن ریشم کی ڈور تو بہت کمزور اور نازک ہوتی ہے، جس کے ٹوٹ جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

ریشم بندھن ٹوٹے پھاٹئی جے پتم　　　بندھوی تو ہے انچرا لگائے

(ریشم کی ڈور تو ٹوٹ پھٹ جائے گی اس لئے تجھ کو آنچل میں باندھ لوں گی۔)

اسی طرح کے دوسرے لوک گیتوں میں جذبات کی موجیں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی دلوں کو موہ لیتی ہیں۔ جوان دلوں کی دھڑکنوں، اداؤں اور جذبات کے چلبلے پن کو منظر شہاب نے پیش کر کے میتھلی لوک گیتوں کی جمالیات کو دلکش اور خوبصورت الفاظ سے آئینے میں اجاگر کیا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کی شخصیت پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اردو رسالوں کے نمبر بھی سہیل عظیم آبادی پر شائع ہوئے ہیں لیکن منظر شہاب نے ''ریت کے ٹیلے کا آہوئے بے پروا'' کے عنوان سے اپنے ذاتی تعلقات اور ان کے خطوط کے حوالے سے سہیل عظیم آبادی کے سیکولر مزاج اور بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں ان کے حقیقت پسندانہ خیالات اور تاثرات کا تجزیہ منفرد انداز میں پیش کیا ہے اور اپنی نظم میں ان کی شخصیت اور بلندیٔ فن پر بھر پور تاثرات کا اظہار کیا ہے جو بہت خوب ہے۔ میر تقی میر پر دو مضمون شامل کتاب ہیں۔ بلاشبہ دونوں مضامین تدریسی معیار پر پورے اترتے ہیں۔ لیکن آج میر کی شخصیت اور شاعری کے کئی مخفی پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔

بی۔زیڈ۔ مائل پر مضمون لکھ کر منظر شہاب نے دیرینہ تعلقات اور قربت کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ مائل صاحب جمشید پور کی سرزمین پر ایک باعمل اور باہمت اشتراکی سپہ سالار تھے۔ انہوں نے اس راہ میں بڑی صعوبتوں کا سامنا کیا لیکن ان کی امید کا چراغ تا دمِ آخر گل نہ ہوا۔

'نغمۂ عشق، رنگ پیراہن اور خوشبوئے بدن کا شاعر' کے عنوان سے اپنے مضمون میں حسرت کی عشقیہ شاعری کا منظر شہاب نے جس شاعرانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے وہ منفرد ہے۔ انہوں نے حسرت کو عشق، رنگ اور خوشبو کے شاعر کا نام دیتے ہوئے خوبصورت الفاظ میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''انہوں نے محبوب کے رنگ پیراہن اور خوشبو کے بدن کا ذکر جس والہانہ انداز میں کیا ہے اُن سے پہلے کسی شاعر کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ انہوں نے رمز، استعارہ، محاکات اور تمثیل کے خوبصورت پھولوں سے اپنے اشعار کا گلدستہ سجایا ہے۔''

منظر شہاب نے حسرت کی شاعری میں زندگی اور زندگی کی جس سچائی کی تلاش کی ہے، وہ ان کا اپنا الگ زاویۂ نظر ہے جس سے ان کی جمالیاتی شعور و آگہی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ حسرت کی شاعری کو ناقابل فراموش بتاتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

> ''انہوں نے جسمانی محبت کو آبرو بخشی، بدن کی خوشبو سے روح کو بالیدہ ہونا سکھایا اور لاشعور میں پوشیدہ بہت سے بے نام لذتوں کو ایک نام دیا، ایک شناخت دی، ایک چہرہ دیا۔''

حسرت کی شاعری میں بدن کی جمالیات اور کیف و نشاط کی جو لذت ہے وہ ان کے اشعار سے عیاں ہے:

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار خوشبوئے دلبری جو اس پیرہن میں تھی

ویسے حسرت موہانی خود کو مومن کے سلسلۂ تلمذ کا شاعر کہتے تھے، انہوں نے خود لکھا ہے: ''سادگی پسند ہونے کے باوجود ترکیبوں کے باب میں تقلیدِ مومن کرتا ہوں:

کہاں سے آئیں گی یہ رنگیاں ترکیب مومن کی یہ لطف خوش بیانی حسرتِ رنگیں نوا تک ہے''

'مولانا آزاد کا اسلوب' میں بھی منظر شہاب نے اپنی فہم وفراست سے مولانا آزاد کی علمی بصیرت اور منفرد اسلوب کا تخلیق کار بناتے ہوئے ان کی ہمہ گیر شخصیت کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے اظہار بیان میں کسی کی تقلید نظر نہیں آئی ہے۔ میرے خیال سے صحیح نہیں ہے۔

''جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق'' میں منظر شہاب نے اپنا بے پایاں خلوص، محبت اور شفقت کے پھول شفیق اعجاز پر نچھاور کیے ہیں۔ شفیق اعجاز ایک جذباتی اور سیماب پا انسان ہوتے ہوئے بھی قوم وملت کا درد اپنے سینے میں رکھتے تھے۔ وہ اولوالعزمی اور خود اعتمادی کی جیتی جاگتی تصور تھے۔ اُن کو شعر وادب سے والہانہ لگاؤ تھا اور ان کی طبیعت میں غضب کی تازگی اور معاشرے سے وابستگی کا پرخلوص جذبہ نمایاں تھا۔

'اسٹیج کی اصطلاحیں' اور 'ڈراموں کا ارتقا آغا حشر کے بعد' چالیس سال سے بھی قبل کے لکھے ہوئے مضامین ہیں۔ 'اسٹیج کی اصطلاحیں' میں منظر شہاب کی اسٹیج سے وابستگی اور ڈرامہ کے فن اور تکنیک سے ان کی گہری دلچسپی کی عکاسی ہوتی ہے۔ 'اردو ڈراموں کا ارتقا آغا حشر کے بعد' اردو ادب میں ڈرامہ کی اہمیت اور غایت پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن بعد میں ڈراموں میں جو پیشہ ورانہ رویئے کی کارفرمائیاں ظہور پذیر ہوئی ہیں ان کے اسباب کی نشاندہی منظر شہاب نے کر دی ہے، کلاسیکیت اور ترقی پسندیدیت کے دور سے لے کر جدیدیت کا جائزہ حقیقت پسندانہ معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے بدلتے ہوئے حالات کا موازنہ کرتے ہوئے یوں اظہار خیال کیا ہے:

''ترقی پسندیدیت نے کمزوریوں کے باوجود اردو ڈرامہ کو نئی زندگی دی تھی۔ جدیدیت نے اُسے الفاظ کا کفن پہنا کر کتابوں کی قبر میں دفن کر دیا ہے۔''

جدیدیت کی شدت پسندی سے ڈراموں کا ارتقا ان کی نظر میں مجہولیت کا شکار ہو گیا ہے۔ ویسے دور مابعد جدیدیت سے بھی وہ پرُ امید یا مطمئن نظر نہیں آتے۔ ایک انتہائی اہم مضمون اختر پیامی پر ہے۔ منظر شہاب نے اختر پیامی کی شاعری اور تہہ دار شخصیت پر اتنی سحر انگیز بیانی سے کام لیا ہے کہ بار بار دل کو تھام لینا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی اس مضمون میں منظر شہاب کی اپنی دلفریب شخصیت کی جھلک تھی۔ غرض یہ کہ ''اور پھر بیاں اپنا'' نثری مضامین کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے مصنف کے ذہنی وسعت، تخلیقی ایج کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی (Signification) اور ایک ادبی تحریر (Discovers) کا ایک قاری اساس متن ہے، جس کی آفاقی اہمیت دنیائے اردو ادب میں ہمیشہ برقرار رہے گی۔

● دین محمد ہاؤس، جگ سلائی، جمشید پور (جھارکھنڈ)

ڈاکٹر ایم.صلاح الدین

اردو ڈراما کے فروغ میں منظر شہاب کا کردار

کہاں گئے وہ دِوانے جو روشنی کے لئے   جلاتے رہتے تھے اپنا لہو چراغوں میں

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ منظر شہاب بھی ایسے 'دِوانوں' میں سے تھے جنھوں نے ترقی پسند تحریک کو آب و تاب دینے، شعری فکروفن میں جان ڈالنے، تعلیم و تعلّم کو پراثر اور مثبت سمت دینے، ٹوٹتے بکھرتے کریم سٹی کالج میں بحیثیت پرنسپل نئی روح پھونکنے تو کبھی اردو ڈرامے کی شناخت غیر اردو حلقہ میں قائم کرنے کیلئے اپنا لہو جلاتے رہے۔

ایک معتبر ترقی پسند اور رومانی شاعر تو تھے ہی جس کی نظیر دو شعری مجموعے ''پیراہنِ جاں'' اور ''مجروح پرندے کی صدا'' سامنے ہیں، جن کا شہابی رنگ چھلکا پڑتا ہے اور ایوانِ شاعری میں ان کا کلام اپنے اثر و نفوذ میں روح کی گہرائیوں تک اتر جانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسی شاعری خونِ دل جلائے بغیر کہاں ممکن ہوتی ہے، ساتھ ہی اپنے مضامین کے ذریعہ نثر میں بھی اپنا نقش کالجر چھوڑ گئے ہیں۔ مجموعۂ مضامین ''اور پھر بیاں اپنا'' اپنے مصنف کی ارفع تحقیقی و تنقیدی بصیرت اور صاحب اسلوب نثر نگار کی شناخت قائم کرتا ہے۔ بقول بلراج کومل:

> ''موضوعات کا تنوع، گہری تنقیدی نظر، اسلوب کی دلکشی اور دعوت مطالعہ آپ کے مضامین کے خصوصی اوصاف ہیں۔ آپ کا دائرۂ عمل ہمہ جہت اور طے شدہ سلاسل سے آزاد ہے۔''

(منظر شہاب: حیات اور فکروفن، ص: ۱۱۵)

اور ''پھر بیاں اپنا'' کے حوالے سے پروفیسر قمر رئیس یوں رقمطراز ہوئے:

> ''کتاب کے دو اہم اور کارآمد مضامین ڈرامے اور اسٹیج کے بارے میں ہیں، خصوصاً اسٹیج کی کرافٹ کی اصطلاحوں کے متعلق مضمون بے حد معلوماتی اور جامع ہے۔ اسی طرح آغا حشر کے بعد اردو ڈراموں کے ارتقا پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ بالخصوص جدیدیت کے تحت لکھے گئے ڈراموں بشمول تجرباتی تمثیلوں پر منظر شہاب نے اعتماد اور بڑے وثوق کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔'' (منظر شہاب: حیات اور فکروفن، ص: ۱۱۷)

ظاہر ہے اسٹیج اور ڈرامے کی گہرائیوں میں اترے اور ان کے نکات کی باریکیوں کو جانے پرکھے بغیر کوئی ایسے مضامین کیوں کر قلمبند کرسکتا ہے جن کی بابت پروفیسر قمر رئیس جیسا ادب کا پارکھ رطب اللسان ہے۔ یقیناً منظر شہاب کا لہو اس چراغ میں بھی جلا ہے۔ انہوں نے اس خطہ میں اردو ڈراما اور اسٹیج کا چراغ جلایا ہے جہاں ہندی، اڑیہ، بنگلہ اور مراٹھی ڈراموں اور تمثیلوں کا سکّہ چلتا تھا۔

منظر شہاب نے جولائی ۱۹۵۳ء میں بحیثیت لکچرر، کوآپریٹو کالج جمشید پور جوائن کیا۔ اس تقرری نے انہیں نئے امکانات سے روشناس کرایا۔ اڑیسہ، بنگال اور اُس وقت کے بہار کے نقطۂ اتصال پر واقع شہر آہن جمشید پور جو مختلف زبان و ثقافت کا سنگم رہا ہے اُس وقت یہ شہر صنعتی مدنیت کے امکانات سے بھرپور تھا۔ آریائی اور غیر آریائی زبانوں اور تہذیبوں نے ایک سنگم بنا رکھا تھا۔ مختلف النوع لسانی، ادبی اور ثقافتی معتقدات و نظریات ابھر رہے تھے۔ صوبوں کی بنیاد پر ثقافتی اداروں کی تشکیل عمل میں آرہی تھی۔ یہ ادارے اور انجمنیں کلچرل سرگرمیوں کی آماجگاہ تھے۔ انجمن

آرائی کا چسکا منظر شہاب کو در بھنگہ سے ہی لگا تھا۔ ایک در بھنگوی بدرالزماں مائل کی معتمدی میں جمشید پور انجمن ترقی پسند مصنفین، بلا امتیاز زبان و ثقافت خاصی سرگرم تھی۔ لہٰذا 'کند ہم جنس باہم جنس پرواز' کے مصداق جمشید پور آتے ہی منظر شہاب بھی شہر کی مختلف ادبی، تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں میں سرگرم ہو گئے۔ اس رنگا رنگ فضا نے ان کے تخلیقی سوتے کو ایک نئی راہ دی۔ بقلم منظر شہاب:

''ہندوستان بھر کی نمائندہ زبانوں اور تہذیبوں کی قوس قزح نے میرے ذہن کو کشادگی بخشی۔ بالخصوص اڑیہ، بنگلہ اور مراٹھی ڈراموں نے بہت متاثر کیا۔ ان کی قابل رشک کامیابیوں نے میرے جذبات کو اس حد تک مشتعل کیا کہ میں نے بھی کالج کی ''بزم اردو'' کی طرف سے ڈراما اسٹیج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

(رسالہ زبان و ادب پٹنہ، شمارہ جنوری تا اپریل ۱۹۹۴ء)

انجام کار ہم جلیس و ہم خیال اساتذہ سے صلاح و مشورہ کیا۔ طلبا میں تحریک چھیڑی۔ طلبا کے ذوق و شوق اور باذوق اساتذہ کے حوصلہ انگیز تعاون نے منظر شہاب کے عزم کو مہمیز لگائی۔ طلبا و طالبات سے Talented اداکاروں کا انتخاب کیا اور اپنی ہدایت کاری میں اوپندر ناتھ اشک کا ڈراما ''پردہ اٹھاؤ، پردہ گراؤ'' ۱۹۵۴ء میں اپنی ''بزم اردو'' کے اسٹیج سے پیش کیا تو شہر میں تہلکہ مچ گیا۔ پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے اپنے کالج میں ''فائن آرٹس کلب'' کی بنیاد ڈالی اور اس کے ذریعہ متعدد کامیاب ڈرامے اسٹیج کئے جس نے کوآپریٹو کالج کے دامن کو بے شمار انعامات و اکرامات سے بھر دیا۔

منظر شہاب کی ہدایت کاری میں بین الجامعہ یوتھ فیسٹیول دہلی ۱۹۵۶ء میں ڈراما ''مسز پرول ویدم'' اور ۱۹۵۸ء میں منعقدہ کل ہند تمثیلی مقابلہ، گوالیار میں ڈراما ''بھگوان چور بھیجو'' نے امتیازی کامیابی حاصل کر کے گرانقدر انعامات حاصل کئے۔ اسٹیج آرٹسٹ K.R. Malhotra جو پہلے پہل ان کی تحریک پر اسٹیج سے جڑے، نے لکھا ہے:

"I came in contact with him when I was selected to perfrom a role in Upendra Nath Asks's play "Parda Uthao, Parda Girao". It was declared the best play in the Annual Drama Competition of the college. He directed me in several plays, worth mentioning being :Bandar ka Punja", "Heere ki Talash", "Meer Kallu ki Gawahi" etc. The most popular play he directed was :Miss Parvalvedam" a hilarious comedy which was staged in Delhi 3rd All India Youth Festival in 1956. The play was highly appreciated by the spectators and bagged the Best Actor and Best Actress award. I weas privileged to be the Best Actor and Shakuntala Date the Best Actress. Prof. Shahab is a gentleman full of humbleness and humility. Although he directed me in so many plays but had no hesitation in co-acting with me in 'Meer Kallu ki Gawahi' and 'Jalte Dil Jalti Rahen'. While directing a play he always used his persuasive technique and was polite but firm. He never over-acted while directing a play. I very honestly feel that Jamshedpur owes a lot to Prof. Manzar Shahab as far as Drama and Mushairas are concerned."

(منظر شہاب: حیات اور فکر و فن، ص: ۱۴۲-۱۴۳)

یہ اعتراف یہ ہے کو آپریٹو کالج کے اس طالب علم کا جو بعد میں بحیثیت اسٹیج آرٹسٹ معروف ہوا، یقیناً ایسا محض عقیدتاً نہیں لکھ گیا ہے، کچھ تو ہے جو قابلِ اظہارِ ستائش ہے۔

منظر شہاب اپنے کالج تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ جمشید پور کی فعال کلچرل اکاڈمیوں اور انجمنوں کے متعدد ڈراموں کی بھی ہدایت کاری انجام دی۔ موصوف نہ صرف ایک کامیاب ہدایت کار کی حیثیت سے مقبول رہے بلکہ کئی ایک اسٹیج پر خود اداکاری بھی کی۔ مثلاً مہاراشٹر منڈل جمشید پور کے اسٹیج پر ڈراما ''جلتے دل اور جلتی راہیں'' میں ان کے کلیدی رول کو ناقابل فراموش بتایا جاتا ہے۔ گویا اس دور میں بقول پروفیسر مظفر اقبال:

''راگ رنگ، رقص و سرود اور ڈراما منظر شہاب کی زندگی بن گئے اور جمشید پور میں کالج اور شہر کی تمام ثقافتی سرگرمیوں میں ان کی حیثیت روحِ رواں کی ہوگئی۔''

(مضمون: منظر شہاب، سہ ماہی رفتارِ نو، دربھنگہ، سالگرہ نمبر جنوری ۱۹۶۳ء)

اس طرح موصوف جب تک کو آپریٹو کالج سے وابستہ رہے ڈراما اور اسٹیج پر اس قدر وارفتہ اور فریفتہ رہے کہ انکی ادبی سرگرمیوں کی رمق ماند پڑ گئی اور شعری تخلیق کا سوتا محض رستا رہا مگر جمشید پور کے مختلف النوع کلچرل سرگرمیوں کے حدود عروج میں اردو ڈراما اور اسٹیج کا سلسلہ بھی جاری کردیا۔ یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جس پر خاک نہیں ڈالی جاسکتی لیکن ۱۹۶۴ء میں جب کریم سٹی کالج جمشید پور کے پرنسپل کی ذمہ داری ان کے سر تھوپی گئی تو اسکے بعد ڈراما اور اسٹیج سے انکا رشتہ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ سید تفضل کریم رئیس شہر نے کریمیہ ٹرسٹ قائم کرکے جو اقلیتی کالج ۱۹۶۱ء میں جاری کیا اس کا شیرازہ جنوری ۱۹۶۴ء کے ہولناک فرقہ فساد کے بعد منتشر ہوگیا۔ اب اسکی از سر نو شیرازہ بندی کرنے اور کریم سٹی کالج کو معیار و مقام عطا کرنے کی جاں گسل سرگرمیوں نے ڈراما اور اسٹیج کی طرف عملی طور پر رخ کرنے کا انہیں موقع ہی نہیں دیا۔

البتہ ذہنی وابستگی کا اظہار انہوں نے دو مضامین ''آغا حشر کے بعد اردو ڈراما'' اور ''اسٹیج پر روشنی کا التزام'' بالترتیب رسالہ روحِ ادب، کلکتہ ڈراما نمبر رسالہ قند، پشاور نیز ''اور پھر بیاں اپنا'' میں شائع کرکے ضرور کیا جن کی کئی ممتاز ادب کے پارکھوں نے تحسین کی ہے۔ علاوہ ازیں ایک یک بابی تمثیلوں کا مجموعہ ''دیس بدیس کی ایکانکی'' کے نام سے بھی تصنیف کیا۔ ان خدمات کے صلے میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین دہلی، سنگھ بھوم انجمن ترقی پسند مصنفین، سنگھ بھوم ہندی ساہتیہ سمیلن، اردو گھر جمشید پور اور شائقین ادب ہندو مسلم ویلفیئر سوسائٹی جمشید پور نے اعزازات سے نوازا اور ۱۹۹۲ء میں جمشید پور کی تمام تمثیلی انجمنوں نے متحدہ طور پر اسٹیج کی مزید ترقی و ترویج کے لئے ایک پانچ رکنی ''نگراں کمیٹی'' بنائی تو اس کے رکن بنائے گئے جو ان کی ثقافتی خدمات کا اعتراف ہی تو ہے۔ ایسے کارنامے اور حصولیابیاں تبھی میسر آتی ہیں جب کسی میں یہ جذبہ کارفرما ہوا کرتا ہے کہ:

شمع کی طرح جئیں بزمِ گہہ عالم میں   خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

یہ جذبہ منظر شہاب میں بدرجۂ اتم موجود تھا کہ وہ ایک Genius شخصیت تھے۔ لہٰذا جب تک حرکت و عمل کی سکت رہی بحیثیت رکن نگراں کمیٹی، اسٹیج کی سرگرمیاں ان کی جاری رہیں۔

....

● موضع: رام نگر، پوسٹ: رام نگر دھونی، ویا نہرا (دربھنگہ)

احمد بدر

منظر شہاب کی نثرنگاری

غالبؔ نے کہا تھا:

کھلتا کسی پہ کیا مرے دل کا معاملہ　　　شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف شعروں کے انتخاب کے تجزیے سے ہی کسی کے دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع میسر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے اور آپ بھی یقیناً اس سے اتفاق کریں گے کہ کسی نثرنگار کے موضوعات کا جائزہ بھی اس کی شخصیت کی کلید ہو سکتا ہے۔ اس نہج سے منظر شہاب صاحب کی کتاب 'اور پھر بیاں اپنا' کا مطالعہ مجھے چند دلچسپ نتائج تک پہنچاتا ہے۔

اس مجموعے میں کل 15 مضامین ہیں جس میں سے ایک ہندی سے ترجمہ ہے۔ بقیہ 14 میں کچھ تاثراتی مضامین ہیں مثلاً وہ جو سہیلؔ عظیم آبادی، بی۔ زیڈ۔ مائل، اخترؔ پیامی، شفیقؔ اعجاز وغیرہ پر لکھے گئے۔ کچھ نیم تاثراتی نیم تجزیاتی ہیں جیسے حسرتؔ موہانی، مولانا آزاد اور 'بے در و دیوار' پر لکھے گئے مضامین کچھ علمی و معلوماتی مضامین ہیں مثال کے طور پر ودیاپتی، متھلا کے لوک گیت، اسٹیج کی اصطلاحیں۔ آغا حشر کے بعد اردو ڈرامے، میر کے خاندان، زمانہ، شخصیت اور شاعری وغیرہ موضوعات پر لکھے گئے مضامین۔ اسی فہرست میں میرؔ اور سوداؔ کی غزلوں کے تقابلی مطالعہ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

ان مضامین کو اس بار پھر سے پڑھتے ہوئے مجھے ان میں چار باتیں بہت صاف صاف دکھائی دیتی ہیں۔

پہلی یہ کہ ان میں سے بیشتر میں ایک طرح کا اپنا پن موجود ہے۔ ان موضوعات کے انتخاب کے پیچھے ان سے قلبی اور جذباتی تعلق کا بھی ہاتھ ہے۔ ان کو پڑھتے ہوئے بار بار اپنی مٹی، اپنے لوگ، اپنی وراثت، اپنی روایت، اپنا ادب، اپنے ادیب، اپنے بزرگ، اپنے دوست، اپنے عزیز جیسے پیکر مسلسل ابھرتے ہیں۔ آپ ودیاپتی کی شاعری پر ان کا مضمون پڑھ لیجیے۔ میتھلی لوک گیتوں پر ان کی تحریر پڑھ جائیے سہیلؔ عظیم آبادی پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مطالعہ کیجیے۔ یا اخترؔ پیامی پر سپردِ قلم کیا ہوا مضمون پڑھیے یا شفیقؔ اعجاز صاحب کی وفات کے بعد وجود میں آئی تحریر کے دروں میں جھانکیے ہر جگہ آپ کو 'اپنا پن' ضرور دکھائی دے گا۔

دوسری بات ہے تحریروں میں ایک خاص قسم کا Involvement منظرؔ شہاب دور کھڑے ہوئے کسی کی طرف اشارہ کر کے کچھ بتاتے نہیں بلکہ قاری کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس جذبے کے پیچھے اس موضوع کے ساتھ اپنے پن کا رشتہ ہے۔ ظاہر ہے جب موضوع ہی اپنا ہو تو اس کے ساتھ جڑاؤ لازمی ہے۔ اس سلسلے میں مذکورہ بالا تمام مضامین دیکھ جائیے یہ کیفیت نمایاں ملے گی۔ سہیلؔ عظیم آبادی سے متعلق مضمون کی آخری سطریں ملاحظہ فرمائیے اور قائل ہو جائیے:

'وہ کہاں ہیں؟ وہ سہیلؔ عظیم آبادی کہاں ہیں جنہوں نے 'الاؤ' جیسی کہانی لکھی، جو 'بے جڑ کے پودے' اور

'چار چہرے کے خالق تھے، جو قدم قدم پر اتنے محتاط رہے اور ادبی تخلیق سے اس قدر دست کش رہے کہ ان کی صلاحتیں اردو ادب کو وہ نہ دے سکیں جو دے سکتی تھیں۔ وہ اپنی زندگی سے اپنے آرٹ سے بہت بے پروا رہے۔ وہ درویش وہ مرد قلندر کہاں ہے؟ وہ ریت کے ٹیلے کا آہوئے بے پروا موت کی آندھی میں اڑتی ہوئی ریت کے نیچے دب کر ہمیشہ کے لئے دفن ہو گیا ہے۔'

اس حادثے کو بیان بھی کرنا چاہوں تو نہیں کر سکتا۔ پس اس موقع پر لکھی گئی اپنی نظم کے ایک بند پر اکتفا کرتا ہوں:

"سہیل الاؤ کی زرد لو میں/ کتھا کسانوں کے درد و غم کی/ قلم کی آنکھوں سے لکھ رہے تھے/ قلم کی آنکھیں/ کئی جگہوں کے/ لہو کے موتی پرو رہی تھیں/ اچانک یک...... نہ جانے کس سحر کا اثر تھا/ تمام کردار پتھروں کے بتوں میں تبدیل ہو گئے تھے/ قلم کی آنکھوں میں موتیا بند چھا گیا تھا/ کہانیوں کے لبوں پہ الفاظ جم گئے تھے!

اسی سے جڑی ہوئی تیسری بات ہے ان کے لہجے میں پوشیدہ اصرار کا پہلو۔ یہ کھل کر تو نہیں لیکن در پردہ اپنی بات منوانے کے لئے جذباتی دباؤ ڈالتے ہیں۔ اپنی بات پر زور ڈالنے کے لئے الگ الگ تکنیک اپناتے ہیں۔ انہیں یہ گوارا نہیں کہ قاری ان کی بات سے متفق نہ ہو۔ یہ حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ دلائل و شواہد کی یلغار کر کے ان کی پیش کردہ بات کو انہیں کے زاویہ سے مان لینے پر قاری کو تیار کر لیں۔ میر کے حالات پر ان کا مضمون پڑھ جائیے اس میں اس بد مزاج اور آشفتہ سر میر کی Image دھل جائے گی اور آپ کو ایک مظلوم میر دکھائی دینے لگے گا۔ یہی کیفیت سہیل عظیم آبادی کے مضمون میں بھی ملے گی جس میں وہ ایک فکشن نگار کی سطح سے اوپر اٹھ کر بے پناہ سیاسی بصیرت کے حامل دانشور دکھائی دیتے ہیں جو تقسیم ہند اور قیام پاکستان پر ایسے بھرپور اور جامع تبصرے کرتے ہیں جن کی توقع کسی اردو کے افسانہ نگار سے نہیں کی جاتی۔

چوتھی بات جو میں نے محسوس کی وہ ہے ان کی تحریروں میں غیر محسوس طریقے سے اسٹیج اور تھیسٹر کی تکنیکوں کا استعمال۔ ایک شخص کو مرکزی کردار میں رکھ کئی ذیلی کرداروں کو یکے بعد دیگرے اسٹیج پر پیش کرنا۔ ایک کو ممتاز کرنا۔ عقبی پردے کے استعمال سے کسی کیلئے مناسب ماحول سازی کرنا پھر مناسب وقت پر اس کی Centre Stage پر Entry کرانا یہ ساری تکنیکیں مختلف مضامین میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت کے بیشتر گوشے ان کی نثری تحریروں میں منعکس ہوتے ہیں۔ شاعری بھی۔ ایک دو مثالوں سے ثبوت فراہم کروں گا:

''صوبہ بہار کی راجدھانی پٹنہ سے دکھن فتوحہ سے اسلام پور تک بل کھاتی ہوئی ریلوے لائنیں اتنی پاس پاس چلا کرتی تھیں کہ اکثر گمان گزرتا تھا کہ یہ دو لکیریں ہجر کے لمحات کو توڑ کر ایک دوسرے سے گلے مل جائیں گی۔''

''ان کا مزاج ایک تیز رو دریا کی مانند تھا جو اپنے کناروں کو کاٹ کاٹ کر نئے کنارے بناتا جاتا ہے۔''

''حقیقت تو یہ ہے کہ حسرت کے رنگ تغزل نے اردو شاعری کی زمین کو اس طرح نکھار دیا کہ ساری

فضا پاک صاف اور شفاف ہوگئی۔ غزل کا ڈوبا ہوا چاند نکل آیا اور رفتہ رفتہ چندر ما کی جوت نے اپنی چادر بچھا دی۔''

یہ شاعرانہ انداز بیان شاعر منظر شہابؔ کا ہے جو نثر نگار منظر شہاب پر بھی Super Impose ہوتا ہے اور ڈراما نگار و ہدایت کار منظر شہاب کے ساتھ ایک Co-ordination قائم کرتا ہے۔

ویسے ایک بات طے ہے کہ منظر شہاب صاحب کی شخصیت میں تنقید کی جگہ یا تو نہیں ہے یا برائے نام ہے۔ اپنی تحریروں میں تنقیدی امکانات کے باوجود انہوں نے اس سے گریز کیا اور انہیں مضامین کہتے اور لکھتے رہے۔ اپنے پیش گفتار میں انہوں نے لکھا ہے:

''قابلِ افتخار اور گراں قدر روایت کے باوجود گزشتہ نصف صدی سے صنف مضمون نگاری اور ادباء کی بے اعتنائی کا شکار ہے۔ اکثر لائق ستائش انشا پرداز بھیس بدل کر ناقدوں کے خیمے میں داخل ہو گئے ہیں اور مرغولے اڑا رہے ہیں۔ اپنی اور تنقید نگاری دونوں کی عاقبت خراب کر رہے ہیں۔'

....

● شعبۂ اردو، کریم سٹی کالج، جمشید پور (جھارکھنڈ)

● **ڈاکٹر عطا کریم شوکت** (ولادت: ۱۲؍مئی ۱۹۴۶ء، سابق ڈپٹی ڈائریکٹر، مویشی پالن) کا انتقال ۲؍نومبر ۲۰۱۸ء صبح ساڑھے آٹھ بجے حرکت قلب بند ہونے کے سبب ہوگیا۔ نمازِ جنازہ ۳؍نومبر بروز ہفتہ دو بجے دن موضع سندر پور میں ادا کی گئی جب کہ تدفین آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم نیک، خلیق اور ملنسار تھے۔ ۲۰۰۴ء میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار بیٹے انظار کریم شوکت، شہزاد کریم شوکت، نشاط کریم شوکت، عنایت کریم شوکت اور دو بیٹیاں محترمہ راحلہ نوشابہ اور محترمہ رضیہ نوشابہ ہیں جب کہ انجینئر سید ظفر اسلام ہاشمی (نئی دہلی) اور انجینئر محمد شکیب (دبئی) داماد ہیں۔

....

● محبِّ اردو اور ادب نواز جناب **علیم اختر** کا انتقال ۲۱؍جنوری ۲۰۱۹ء کو ان کی رہائش گاہ سلطان گنج، کٹرہ منڈئی، پٹنہ میں ہوگیا۔ نمازِ جنازہ بعد نماز عصر درگاہ شاہ ارزاں کے امام نے مسجد کے احاطے میں پڑھائی اور مسجد سے متصل قبرستان میں ہی تدفین ہوئی۔ مرحوم ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے اور اعلیٰ اخلاق، خداترس اور صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ نہایت نیک، متحرک، فعال اور قومی وسماجی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ۲۰۰۵ء میں اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر جنرل بہار کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ سال ۲۰۰۶ء میں انہیں حج بیت اللہ کا شرف حاصل ہوا۔ مرحوم عرصہ تک در بھنگہ میں پوسٹل انسپکٹر رہے اور خاکسار سے بیحد قربت رہی۔ روزانہ ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، در بھنگہ میں ان کی آمد ہوتی۔ شعر وادب سے بیحد لگاؤ تھا۔ پوسٹل ادبی وثقافتی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تھا، جس کے بانی صدر مرحوم تھے، جب کہ جنرل سکریٹری سلطان شمسی تھے۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام باہر سے تشریف لانے والے شعرا وادبا کے اعزاز میں نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ مرحوم ''تمثیل نو'' کے ابتدائی قاریوں میں سے تھے۔

ایم.نصر اللہ نصر

منظر شہاب کے مہربانِ خاص

ادب نگاروں کا معاملہ یہ رہا ہے کہ وہ خود شاعر یا ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقات کو منظر عام پر تو لاتے ہیں جس کی وجہ کر ان کی اپنی ایک شناخت بنتی ہے۔ ادب نگاروں میں ان کا مقام و مرتبہ طے پاتا ہے۔ ادبی دنیا ان کی گراں قدر تصنیفات و تخلیقات سے فیض یاب ہوتی ہے لیکن ان ہی ادیبوں اور شاعروں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسرے ادیبوں کو پڑھتے اور پرکھتے ہیں اور تحریری شکل میں اپنی رائے بھی پیش کرتے ہیں۔ تنقید بھی کرتے ہیں اور توصیف بھی بیان کرتے ہیں۔ ایسے خرد مندوں میں ایک نام منظر شہاب کا بھی ہے۔ جو نہ صرف ایک اچھے اور مقبول عام شاعر ہیں بلکہ قابل ادیب اور نثار بھی ہیں۔ انھوں نے زندگی میں بہتوں پر مضامین لکھے۔ ان کی کتابوں پر تبصرے کیے۔ لہٰذا ان سے متاثر ہو کر بہتوں نے ان پر بھی مضامین لکھا ہے اور ان کا ادبی محاسبہ پیش کیا ہے جن کو جمع کر کے کتابی شکل میں منصۂ شہود پر لایا گیا ہے اور ''ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ ان مہربانوں میں وہاب اشرفی، حسن امام درد، خلیق الزماں نصرت، پروفیسر افتخار اجمل (پاکستان)، قیصر صحی عالم، رفعت سروش، مظہر امام، ڈاکٹر منصور عمر، ڈاکٹر ایم.صلاح الدین، راشد انور راشد، اسلم بدر، سید احمد شمیم اور ڈاکٹر امام اعظم کے نام نامی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ڈھیروں نے ان پر مضامین لکھے ہیں جو رسائل کی زینت بنے ہیں۔

ان کا شعری مجموعہ پیراہن جاں (۱۹۸۹) اور مضامین کا مجموعہ ''اور پھر بیاں اپنا (۲۰۰۲) کو ادبی دنیا میں کافی پذیرائی ہوئی نیز ''مجروح پرندے کی صدا'' (۲۰۰۷) کو بھی مقبولیت عام حاصل ہوئی۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پوری کائنات کا منظر نامہ پیش کر دیا گیا ہے جس میں کرب و نشاط کی سحاب آفرین لہریں اچھلی پڑتی دکھتی ہیں۔ منظر شہاب کی شاعری میں احساس کے منفرد ہیولے اور پیکر، صدا اور رنگ، خوشبو اور روشنی کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے جو قاری کے لئے باعث نشاط و انبساط ہے۔ الفاظ کا حسین درو بست اور تخیل کی رنگارنگی کسی چراغاں سے کم نہیں۔ موصوف کے شعری تجربات کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے تخلیقی ذرے میں کائنات کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں جمالیات کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی ادبی اور شخصی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ چند کے خیالات حسب ذیل ہیں ملاحظہ فرمائیں:

- ''طبعاً وہ بہت ہی سنجیدہ اور متین واقع ہوئے ہیں (لیکن حقیقت میں) نہایت ہی شوخ مزاج، بذلہ سنج اور چلبلے واقع ہوئے ہیں۔ ظرافت ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ راگ و رنگ، رقص و سرود منظر شہاب کی زندگی ہے۔ انہیں ناچ گانے اور ڈرامے سے بڑی گہری وابستگی ہے۔''

(ڈاکٹر مظفر اقبال ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے ص۲۹، ۳۰)

- ''ان کی معصوم نگاہی اور پاکیزگی نظر اپنے مزاج کی نرمی اور گھلاوٹ اور اپنی گفتگو کے مخصوص دلچسپ انداز کے باعث اپنے کالج میں بہت زیادہ محبوب ہیں، خاص کر صنف نازک کے درمیان۔ کالج کی اکثر لڑکیاں ان کے گیت اور غزلیں گاتی ہیں۔'' (ڈاکٹر مظفر اقبال)

- ''پیراہن جاں منظر شہاب کی شاعری کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ان کی خوبصورت اور حسین شاعری کا عکس جلوہ گر نظر آتا ہے۔ وہ ایک جمال پرست شاعر ہیں۔ خوبصورتی اور حسن ان کی شاعری کا محور اور مرکز ہے۔ وہ خوبصورت لہجے اور خوبصورت خیال کے ایک حسین خواب دیکھنے والے شاعر ہیں۔''
(پروفیسر افتخار اجمل شاہین ص ۳۷)
- ''منظر شہاب ترقی پسند تحریک کے نقش ہائے رنگ رنگ کا ایک خوبصورت نقش ہیں۔ ان کی ذہنی پرورش اسی تحریک کے زیر اثر ہوئی۔'' (رفعت سروش ص ۵۵)
- ''منظر شہاب کا تعلق ترقی پسندوں کی جماعت سے رہا ہے۔ اشتراکی فکر ان کے یہاں موجود ہے۔ استحصال کے خلاف ان کی آواز بھی بلند ہوئی ہے۔ معاشرتی زندگی کی ناانصافیوں کو منظر شہاب بے نقاب کرتے ہیں۔'' (ڈاکٹر امام اعظم ص ۱۳۲)

یہ چند اقتباسات ایسے ہیں جن سے منظر شہاب کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے علاوہ ان کی ادب نگاری اور ثقافت پسندی کا اظہار بخوبی ہوتا ہے۔ کتاب میں شامل مضمون نگاروں نے ان کا مطالعہ و مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے اور ان کی صفات حیات اور ادبی کرشمہ سازیوں کو خوب خوب اجاگر کیا ہے۔ ان کے مطابق منظر شہاب ایک سچے شاعر ہیں ترقی پسند تحریک سے زیادہ متاثر ہیں۔ ڈرامہ، رقص اور رنگ حیات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں ماہر ہیں۔ ان کی فکر بلند ہے مگر لہجے میں دھیماپن اور شائستگی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا اردو کی مختلف اصناف ادب اور صنف سخن پر دسترس رکھنا ہے۔ غزلوں، نظموں کے علاوہ ڈرامہ نگاری و مضمون نگاری پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ان تمام خوبیوں سے کوئی ہرگز ہرگز واقف نہ ہوتا اگر یہ موقر مضامین نگار ان کی مختلف ادبی سرگرمیوں کو اجاگر نہیں کرتے۔ اس لئے ان تمام مضمون نگاروں کا احترام لازمی ہے۔ بقول ڈاکٹر امام اعظم:

> ''گرچہ ہر عہد کی اپنی پہچان ہوتی ہے لیکن ایک اچھا شاعر اپنے عہد کی پہچان کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی پہچان بھی بناتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ محض تجربہ کررہا ہو تو یقینی طور پر یکسانیت اور اپنے عہد کے ہم عصر شعرا کی طرح اس کے یہاں بھی کم و بیش وہی طرز اظہار اور اسلوب دکھائی دے گا مگر تجربہ اگر فطری تحریک کے سبب ظہور میں آیا ہو تو اس کا رنگ علاحدہ ہوگا۔''

منظر شہاب بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ موضوع سے وفاداری لازمی ہے۔ شعری لوازمات سے بے اعتنائی قابلِ تحسین نہیں۔ فن کار کو حرف کی جادوگری اور آہنگ کی عشوہ گری کا رمز شناس ہونا چاہئے۔ ان کے بغیر موضوع افادیت کے حامل ہونے کے باوجود ادب کا حصہ نہیں بن سکتا۔ موصوف کا خیال بالکل درست ہے اور اس میں مشاقیت اور مشاہدے کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ مختصر یہ کہ جن مضمون نگاروں نے منظر شہاب کے تعلق سے مضامین قلم بند کیے ہیں ان کو داد تو بنتی ہی ہے۔ اس لئے کہ جس طرح کی خوبیاں صاحبِ مضمون میں ہیں کم و بیش اسی طرح کی صفات مضمون نگاروں میں بھی ہیں ورنہ اتنے اچھے اور معلوماتی مضامین ہرگز ہرگز نہ لکھے جاتے۔ ادب کی پوری چاشنی، اسلوب کی رنگت، بیان کا سلیقہ اور مطالعے کا ہنر ان میں بھی قابلِ داد ہے۔

....

ڈاکٹر رضوانہ پروین آرم

جلتے شبدوں کی آنچ اور کومل لہجے کا شاعر: منظر شہاب

جناب منظر شہاب کا شمار بھی نابعہ روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے۔ جو نہ صرف اپنی ذات سے انجمن تھے بلکہ جن کی علمی ادبی، تدریسی، و تنظیمی کارنامے صرف سرزمین جھارکھنڈ و بہار کے ہی لئے باعث افتخار نہیں ہیں بلکہ عالمی شعری، نثری اور تنظیمی فکری کینوس پر بھی اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ جلوہ فگن رہیں گی کیونکہ ادیب و مفکر کی ذات وکارنامے ماورائے حیات وممات، زمان ومکاں ہوتی ہیں۔ انگریزی فلاسفر Alferd de Mysset کے لفظوں میں "Great artists have no country"۔ ترقی پسند ادیب، دانشور، کی کثیرالجہات شخصیت اور فکروفن کے کئی پہلو ہیں۔ وہ ایک اچھے استاد، پرنسپل، منتظم کار، مدیر، ہدایت کار، اداکار، مصنف، شاعر و نثر نگار اور ترقی پسند تحریک کے فعال ومحرک رکن تھے۔ سماجی وسیاسی استحصالی قوتوں کو شکست دینا بھی ان کا نصب العین رہا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں معاملاتِ حسن و عشق کو بھی شائستگی کے ساتھ نہیں برتتے بلکہ غم دوراں کی بھی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

مرحوم نے کم وبیش ۹۰ رسال کی عمر پائی اور عمر کے اس طویل عرصے میں ترقی پسند تحریک کے صد نقش ہائے رنگارنگ تراشے اور عشق واشتراکیت کے امتزاج سے بہترین شعری پیکر اُبھارے۔

مرحوم اس ادبی کہکشاں کے آخری درخشندہ ستارے تھے جن میں انور عظیم، کلام حیدری، غیاث احمد گدی، اختر پیامی، نوشاد نوری، احمد یوسف، مظہر امام اور شکیل الرحمٰن شامل تھے۔ منظر شہاب کی تخلیقی و تشکیلی صلاحیت کو پروان چڑھانے میں اور ان کے فکروفن کو زرخیزی وشادابی بخشنے میں ''انجمنوں'' اردو اداروں، تحریری ومذاکرتی ادبی مقابلوں ومسابقوں، کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا ترجمان رسالہ ''نئی کرن'' اخبارات میں کالم نویسی اور دربھنگہ، پٹنہ وجمشید پور کی علمی وادبی نیز سیاسی سرگرمیوں کا بڑا عمل ودخل رہا ہے۔ بقول منظر شہاب:

> ''ہندوستان بھر کی نمائندہ زبانوں اور تہذیبوں کی قوس قزح نے میرے ذہن کو کشادگی بخشی۔ بالخصوص اڑیہ، بنگلہ اور مراٹھی ڈراموں نے بہت متاثر کیا۔ ان کی قابل رشک کامیابی نے جذبات کو اس حد تک مشتعل کیا کہ میں نے بھی کالج کی ''بزم اردو'' کی طرف سے ڈرامہ اسٹیج کرنے کا فیصلہ کرلیا۔''

(رسالہ ''زبان وادب'' پٹنہ شمارہ: جنوری تا اپریل ۱۹۹۴ء)

شاعری کی تعریف کرتے ہوئے انگلستان کے شاعر کیٹس نے کہا ہے کہ

:''شاعری لطیف انتہاؤں سے ہمیں متحیر ومتعجب کرتی ہے۔ Poetry Surprises by a fine excess۔''

شیلے کہتا ہے: ''شاعری بیک وقت تمام علوم کا مرکز ومحیط ہے دوسرے اصناف سخن دوسرے فنون لطیفہ میں بھی یہ خصوصیت لازماً ہوتی ہے مگر غزل میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔''

بحیثیت غزل گو شاعر منظر شہاب کے یہاں جذبوں کے احساسات وجذبات کی قوس قزح اپنی بہار دکھارہی ہے اور نظموں کا عضو عضو تغزل، غنایت، کیف وسرور، امید وبیم اور مسائل حیات وکائنات کے لطیف ترین احساسات

سے مملو ہے۔ ہزار رنگ شعاعیں انکی شعری تخلیقات سے منعکس ہو کر ذہن و دل پہ دستکیں دیتی ہیں اور نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے، ان کی شاعری عزیز نبیل کے اس شعر کی مصداق ہے کہ:

ہماری دیدہ وری کے ہزار پہلو ہیں   کہ ہم نے رقص کناں خوشبوؤں کو دیکھا ہے

شعری ونثری دونوں ہی اصناف میں انہوں نے اپنی جودت طبع اور منفرد انداز بیاں سے اظہار کے نئے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ترقی پسند تحریک نے اردو زبان وادب کو ذات سے کائنات کے سفر پہ گامزن کیا اور اردو ادب کو عالمی ادب سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ بخشا، متنوع موضوعات کو رنگا رنگ مسائل سے ہم آہنگ کر کے دریافت کا ایک نیا جزیرہ وا کیا ہے۔

زندگی کے مرکزی اور اہم حقائق رمسائل رواردات قلبی و دماغی غزل کے موضوع ہوتے ہیں۔ان حقائق میں واردات عشق کو اولیت حاصل ہے۔بقول آل احمد سرور:

''غزل بہر حال زخمی غزال کی آہ یا تیر نیم کش یا محبوب سے باتیں کرنے کا نام ہے یعنی یہ عشقیہ اور غنائیہ شاعری ہے لیکن یہ عشق حقیقی بھی ہوسکتا ہے اور مجازی بھی، خدا سے بھی، محبوب سے بھی، کسی عقیدے سے یا کسی مسلک سے بھی یعنی مسئلہ نظارے کا نہیں نظر کا ہے۔''

(اردو غزل مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، ص:۲۶)

''پیراہن جاں'' اور ''مجروح پرندے کی صدا'' منظر شہاب کے دو شعری مجموعے ہیں جو اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اجتہادی شان رکھتے ہیں ان کی شاعری الفاظ کے خوبصورت برتاؤ، لہجہ کی تازگی اور فرحت بخش انداز بیاں کا دلکش امتزاج ہے، جس کی بھینی بھینی خوشبوئیں مشام جاں کو معطر کرتی ہیں۔منظر شہاب بذات خود پیراہن جاں کے متعلق کہتے ہیں کہ:

''پیراہن جاں میری تمام عمر کے مختلف النوع احساسات کی کشید ہے، میری یہ آرزو رہی ہے کہ کبھی ذات کبھی کائنات اور کبھی دونوں کے باہمی ارتباط کے پس منظر میں زندگی کے جلوۂ صد رنگ کی عکاسی کو اپنا شیوۂ فن بناؤں۔''

منظر شہاب نے کلاسیکی شعراء سے لے کر اقبال اور فیض تک کے اثرات قبول کیے اور شعری روایت سے پورا استفادہ کیا پھر ان تمام تجربوں کو شعر کے پیکر میں ڈھالا ہے۔روایت کی پیروی کے باوجود روایت سے انحراف برتتے ہوئے جدید ترقی پسند رجحان کو بھی اپنایا۔انہوں نے اپنے تجربات واحساسات، اور جذبات ومشاہدات کو فنی حسن میں تحلیل کر کے تخیل کو پرواز، خیال کو وسعت، حسن و جمال کو دلآویزی عطا کی ہے۔تصور عشق، تقدیس حسن، پیکر تراشی، مناظر قدرت کی ساحرانہ تصویر کشی اور ان کا شدت احساس سے پگھلتا ہوا تندیٔ صہبا سا نرم و سبک لہجہ ان سے ایسے شعر کہلواتا ہے:

نرم لہجہ بھی عجب آگ لگاتا ہے شہاب   آگ دھیمی ہی سہی دل سے لپٹ جاتی ہے

متعدد ناقدین ادب اور اہل فکر وفن نے منظر شہاب کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے ان میں، ڈاکٹر وہاب اشرفی، جناب مظہر امام، ڈاکٹر شاختر، خلیل الرحمٰن اعظمی، مظفر اقبال، شکیل الرحمٰن، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، ابو الکلام قاسمی، بلراج کومل، کلام حیدری، صلاح الدین پرویز، علقمہ شبلی، سید احمد قادری پروفیسر افتخار اجمل شاہین

کے نام سرفہرست میں جنھوں نے ان کی شاعری میں جمالیات اور مقصدیت کے خوبصورت امتزاج کی نشاندہی کی ہے نادر تشبیہات اور تازہ کار استعارات وتراکیب، رمزو کنایہ، پیکر تراشی، اور شدت جذبات اور تخیل کی بلند پروازی کوان کی شاعری کا وصف خاص بتایا ہے۔ منظر شہاب ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ ان کی شعری کائنات میں نظم وغزل کے علاوہ دوسری اصناف شاعری مثلاً رباعی، قطعہ اور گیت بھی مجموعہ کلام میں بھی شامل ہیں۔ منظر شہاب کا طبعی رجحان ومیلان نرم ومدھم لہجہ کی نیم رومانی اور نیم فکری شاعری کی طرف رہا ہے، جس پر رمزیت کا انداز نمایاں ہے۔ اس رجحان کی نمائندگی ترقی پسندوں میں، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ، مجید امجد، اختر الایمان، ساحرلدھیانوی، ابن انشا، مظہر امام، کمال احمد صدیقی، رفعت سروش اور اسی طرح کے دوسرے شعراء کررہے تھے۔ بغاوت، انقلاب، احتجاج اور جمالیات سب کی بہترین آمیزش سے شاعری کا خمیر گوندھا گیا ہے۔ انہوں نے دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح غم جاناں اور غم دوراں دونوں کے اظہار میں روایت شکن رویہ اختیار کیا:

مجھے باغباں بتائے، یہ بہار ہے تو کیسی — نہ وہ فصل گل کا سودا، نہ وہ چاک دامنی ہے
اب اس کو تم بہار کہو، یا خزاں کہو — ہیں خون عندلیب سے عارض گلوں کے نم
سجدے کے طلبگار صنم گر بھی، صنم بھی — ہر آدمی لگتا ہے خدا شہر ہوس میں
ضمیر عشق میں میری نوا سے گرئ شوق — بلا کشان محنت کی آبرو ہوں میں

مقصدی ادب کی تعریف ان لفظوں میں کی جاسکتی ہے کہ:

''کامیابی مقصدی ادب وہی ہے جو مقصدی ہونے کے باوجود اصول جمالیات کی پیروی کرتے ہوئے فن کے اعلیٰ معیار پر اترے۔'' (افادی ادب ص:۹۲، اختر انصاری)

بقول سوسن لنگر ''فن ایسی ہستیوں کی تخلیق ہے جو انسانی احساس کی علامت ہے۔''

منظر شہاب کی تخلیقات زندگی، کائنات کے حسن، انسانی احساس وجذبات اور سماج کے مسائل سے براہ راست سروکار رکھتی ہیں۔ شعر کا لہجہ شعور کے سمندر کا استعارہ ہے۔ بیشتر غزلیں اور نظمیں نغمگی اور شعریت سے لبریز ہیں اور مقصدی ہونے کے باوصف اصول جمالیات اور تہذیب عشق وتزئین حسن و جمال سے آراستہ ہیں۔ شدت جذبات کا شعری اظہار فن کے تمام ترچاؤ اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہے جو انسانی احساس کی علامت ہیں سماجی و سیاسی استحصال کے خلاف احتجاج وانحراف کو بیان کرتے ہیں:

تمام عمر نگہ دار و غم گسار رہی — وہ اک نگاہ جو بکتا ہے سب نگاہوں میں
بندھے ہوئے ہیں کہ کھل کر بکھر نہ جائیں ہم — وہ گرنہ اب تو تعلق سزا سزا سا ہے
ہر عہد میں، ہر دور میں سولی پہ چڑھی ہے — حق مانگنے والوں کی صدا شہر ہوس میں
زہر آلود گھٹا بن کے نہ برسے گجرات — ابتدا یوں تو انجام بھلا کیا ہوگا
منظر شہاب آؤ جی بھر کے ہم بھی رولیں — چپ سادھنے سے عہد ماتم نہیں بدلتا
ہے ارتقائے جہاں انحراف کا انعام — وہ انحراف جو تجدید سے عبارت ہے

''پیراہن جاں'' کی بیشتر نظمیں ''نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی'' کا استعارہ ہیں۔ سنہرے لمحے، جشن کی

رات، چاندنی رات، ساقی نامہ، حکم امتناعی، پہاڑی لیلیٰ، لہوترنگ، وغیرہ جمالیاتی رچاؤ، نغمگی، تشبیہ و استعارے، علامات و تلازموں، پیکر تراشی، سوز و ساز حیات و کائنات اور تمام تر اشتراکی موضوعات کے باوجود شاداب نئی رت اور تر و تازہ سبک گام ہواؤں اور دلکش پیرائے بیان کا گلدستہ ہیں۔ میں یہاں صرف بخوف طوالت ان کی ایک نظم ''سنہرے لمحے'' درج کرنا چاہوں گی:

سنہرے لمحے/ نئی سحر کے سنہرے لمحے/ رخ جہان سے ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں/ ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں، فضا کو زریں بنا رہے ہیں/ اُفق کے رخسار نیلگوں پر، شفق کا غازہ دمک رہا ہے/ شفق کا غازہ چہار عالم کو آئینہ سا دکھا رہا ہے/ یہاں زمان و مکاں کی کوئی بھی قید باقی نہیں رہی ہے/ وہ آسماں ہو، زمیں ہو یا وقت کا خرام رواں دواں ہو/ تمام مشاطہ سحر کے کریم ہاتھوں جمال تزئین پا رہے ہیں/ فضا میں جادو جگا رہے ہیں!

اردو ادب کے نثری شہہ پارے ہماری ادبی وراثت کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں، جن کی تب و تاب سے اکیسویں صدی کی نثر منور ہے۔ مقفیٰ و مسجع عبارت سے لے کر آسان و عام فہم نثری تحریروں تک نثر کی اپنی ایک روشن تاریخ رہی ہے۔ رجب علی بیگ سرور، غالب، میرامن، مولانا شبلی، سرسید، حالی، مولوی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی اور سجاد انصاری کی نگارشات ادب عالیہ کا درجہ رکھتی ہیں، منظر شہاب کے نثری کارنامے اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں جن کے مطالعے کے بغیر ان کی علمی قدر و قیمت زبان و بیان، بلندیٔ فکر اور طرز بیاں کا احاطہ کرنا ممکن ہے۔ قمر رئیس نے ان کے مضامین کے مجموعے ''اور پھر بیاں اپنا'' پر اظہار خیال کرتے ہو لکھا ہے کہ:

''منظر شہاب کی ذہانت، تخلیقی صلاحیت اور ذہنی وسعت کے نقوش ان کے نثری مضامین پر مشتمل کتاب ''اور پھر بیاں اپنا'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انہیں میتھلی زبان کے شاعر ودیاپتی کی تخلیق ''پداولی'' میں فلسفہ حسن و جمال کی تجسیم کاری نے خاص طور پر متاثر کیا ہے''۔

اگرچہ منظر شہاب کو احساس ہے کہ ان مضامین کے بیشتر موضوعات سے قارئین کرام آشنا ہیں مگر ان کا یہ اعتراف کیا خوب ہے کہ:

پوچھا/ ان مضامین کو/ جن کے بیشتر موضوعات کے/ ذکر سے/ بے شمار قاری آشنا ہیں/ پیش کرنے کا/ جواز/ کیا ہے؟/ کہا/ ذکر/ انھیں پروشوں کا ہے/ لیکن/ ''بیاں'' / تو اپنا ہے۔

مذکورہ بالا بیان ایک افسانہ نگار، انشاپرداز، ڈارمہ ہدایت کار، ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک ایسے صاحب علم و فن کا بیان ہے کہ جنھوں نے ادب کو غم ذات کے تنگنائے سے نکال کر مسائل کائنات سے ہم آہنگ کر دیا ہے اور نثری مجموعہ ''اور پھر بیاں اپنا'' میں قدیم و جدید ادباء و شعراء کی کہکشاں سجا دی ہے اور خوش رنگ، سحر انگیز، دلکش انداز بیاں سے مملو شخصیات سے وابستہ ہر موضوع کا حق ادا کر دیا ہے، وہ بھی اپنے منفرد حسن بیاں اور سلیس و سادہ نثری پیرائے میں، جس کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

☆ ودیاپتی: میتھلی ادب کا عظیم فنکار ☆ میتھلی کے لوک گیت ☆ ریت کے ٹیلے کا آہوئے بے پرواہ: سہیل عظیم

آبادی ☆حیات وکائنات: مختلف بھی اہم بھی ☆میر تقی میر: خاندان: زمانہ: شخصیت اور شاعری ☆بی زیڈ مائل: ایک کج کلاہ شاعر ☆حسرت: نغمہ عشق، رنگ پیراہن، اور خوشبوئے بدن کا شاعر ☆مولانا آزاد کا اسلوب ☆ اختر پیامی: تیرے غزال کیا ہوئے؟ تیرے ختن کو کیا ہوا؟ ☆بے در و دیوار: چند تاثرات ☆میر تقی میر اور سودا کی غزلوں کا تقابلی جائزہ ☆جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق ☆اسٹیج کی چند اہم اصطلاحات ☆اردو ڈراموں کا ارتقا: آغا حشر کے بعد ☆افسانہ نگاری کے فنی حدود

مذکورہ بالا تمام مضامین اپنی نوعیت، کیفیت، اہمیت، پیشکش اور طرز بیاں کے پیش نظر ادبی حلقے میں توجہ کے حامل رہے ہیں، نثر جو تعمیری اظہار کا وسیلہ ہے، اس کا حق منظر شہاب نے ادا کر دیا ہے جس کا اعتراف شکیل الرحمن اعظمی، گوپی چند نارنگ، مختار الدین، شمس الرحمٰن، فاروقی، قمر رئیس، ابوالکلام قاسمی، بلراج کومل اور دیگر اہل نقد و فن نے کیا ہے، اور ہنوز یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ بلاشبہ منظر شہاب کی نثر شگفتہ ہے سریع الاثر ہے اور انکے اپنے طرز سے عبارت ہے۔ بہر کیف! وقت کی پالکی سے اتر جانے کا غم ہر ایک معتبر شاعر و نثر نگار، ہر خاص و عام کو ابد تک خون کے آنسو رولاتا رہے گا۔ ہم سب فریاد بہ لب ہیں کہ: 'خدا مغفرت کرے، بڑا ایک شخص تھا'

المختصر، منظر شہاب 'پیراہن جاں' 'مجروح پرندے کی صدا،' 'اور پھر بیاں اپنا'' اور دیگر سیاسی، سماجی و تنظیمی کارگردگیوں کے باعث اہل علم و ادب کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور عالمی ادب خصوصاً جھارکھنڈ کے ادبی اُفق پر اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ جھلملاتے رہیں گے، اس یقین کے ساتھ کہ:

ملیں گے خاک زادے روشنی سے ابد کے کہکشانی موسموں میں (نصیر احمد نصیر)

....

● صدر، شعبۂ اردو، ویمنس کالج، بشٹو پور، جمشید پور (جھارکھنڈ)

ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی

آسمان شاعری کا درخشندہ 'شہاب'

زوالِ عمر میں بھی تھے شگفتہ ذہن شہاب　　ضعیف جسم تھا تخئیل ذی فراش نہ تھی

منظر شہاب دربھنگہ کی ایک لیجنڈری شخصیت کا نام ہے۔ وہ کریم سٹی کالج، جمشید پور (جھارکھنڈ) کے بانی پرنسپل تھے، مگر شعر و سخن سے ان کی دلچسپی ابتدا سے ہی تھی۔ ان کی شاعری عام شاعری نہیں ہے، اس دور کے المیہ کا تخلیقی اشاریہ ہے۔ ان کی غزل انسانی درد و کرب کی اشک انگیز داستان ہے۔ اس میں 'مجروح پرندے کی صدا' ہے۔ یہاں کوئی 'زخمی فرشتہ' آہ و بکا کر رہا ہے۔ سسکیاں لیتے عوام، بے کس و بے بس افراد، مظلوم و مجبور اور گریہ وزاری کرتے انسانوں کی دنیا ان کی غزلوں میں آباد ہے۔ انھوں نے زیادہ تر غزلیں لکھی ہیں، نظمیں بھی لکھی ہوں گی، مگر ان کا جو اکلوتا شعری مجموعہ 'مجروح پرندے کی صدا' ہے، وہ نظموں سے یکسر معریٰ ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ زیادہ بحث اور مغز پچی کرنے کی ضرورت نہیں۔ خود انھوں نے ہی درج ذیل شعر میں یہ صاف کر دیا ہے، جو ان کی غزل پسندی کا اظہار بھی ہے اور نظموں کی وسعت و بے کرانی اور معنوی پہنائی کا اعتراف بھی کہ :

اگرچہ نظم کا آنگن کھلتا سا　　مجھے عزیز غزل کی انگنائی

صنف غزل عشوہ و ادا والی ایک خوب صورت اور طرح دار حسینہ ہے، ایک سچا شاعر و فن کار نظم ہی پر کیا موقوف ہے، غزل سے بھی موضوعات زمانہ اور نیرنگیٔ عصر کا مکمل احاطہ کر سکتا ہے، غالب نے جو یہ بات کہی تھی کہ 'بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل' وہ ان کا اپنا تفرد ہوگا، اور اردو تنقید کے جد امجد حالی نے جو مثنوی کی حمایت میں انتہا پسندی سے کام لے کر، غزل و قصائد کو 'ناپاک دفتر' مشتہر کیا تھا، وہ ان کی ذاتی نجی رائے تھی۔ اب تو ہمارے شعرا غزل کے مختصر پیمانے میں ہی پوری کائنات اور مسائل عصر اخلاقیات، سیاسیات، سماجیات، عمرانیات بھی کچھ انڈیل دیتے ہیں۔ منظر شہاب بھی آسمان شاعری کا وہ روشن ستارا ہے، جو افلاطونی نظریہ شاعری پر عمل کرتے ہوئے، غزل آسمان سے نئے نئے مضامین کی طلب میں لگا رہتا ہے اور اسے غزل کی صراحی میں ڈالتا رہتا ہے۔ ان کی شاعری عشق و رومان کی شاعری تو ہے کہ غزل کا رشتہ کلاسیکی عہد سے ہی عشق و رومان کے ساتھ مربوط و مستحکم ہے، مگر یہ ان کی غزل کا ظاہر ہے، جب قاری غزل کے باطن میں اترتا ہے، ایک الگ جہانِ معنی سے روشناس ہوتا ہے۔ انھوں نے خود عشق کیا تھا یا نہیں، یہ پردہ میں ہے، ویسے ہر انسان عشق کا خوگر ہوتا ہے، انسان کا خمیر ہی محبت سے اٹھا ہے، ان کے یہاں اس طرح کے مضامین سے تو یہی عقدہ کھلتا ہے کہ وہ عشق و محبت کی طلسماتی دنیا میں بھی الگ نظر اور نظریہ کے حامل ہیں اور عشق ایک خاص معنی میں ان کے یہاں جلوہ گر نظر آتا ہے :

عمر بیتی تو ہوا عشق کا اب گیان شہاب　　میں نے پہلے نہ محبت کا رہس جانا تھا

اور یہ اشعار تو انسانی زندگی میں عشق و محبت کی اہمیت کا اعلان نامہ ہیں، انھوں نے کہیں اقبال کی شاعری تو نہیں پڑھ لی تھی، مگر عشق کے حوالے سے اتنا مبالغہ تو اقبال نے بھی نہیں کیا تھا۔ اقبال نے عشق کو 'دم جبریل' اور 'دل مصطفیٰ'

تک ہی محدود رکھتے تھے، وہ عقل و عشق میں ایک توازن کے بھی قائل تھے۔ مگر منظر شہاب تو بے خودی کے عالم میں عشق کو قبلہ و کعبہ تک سے موسوم کر دیتے ہیں۔ دیکھیے، وہ کیا کچھ عشق کے تعلق سے کہتے ہیں:

عشق سجدہ ہے مرا قبلہ و کعبہ ہے مرا — عشق دنیا ہے مری، عشق حرم خانۂ دیں

نامہ مرے وجود کا دو لفظ میں اسیر — پہچان میری عشق ہے میرا پتہ ہے دل

مگر یہ عشق انھیں سہل بھی نظر نہیں آتا، ان کے نزدیک عشق کی یہ راہ بہت ہی پر خار ہے، مطلب یہ عشق کسی اور جہان کا پتہ دیتا ہے، کوئی اور منزل ہے جہاں تک شاعر رسائی چاہتا ہے۔ عشق ظاہری نہیں، کچھ اور ہے۔ بات وہی ہے کہ 'غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے':

عشق کا پرچہ لکھنا سنبھل کے — اثر مشکل، جانچ بہت ہے

پھر مجھے لامحالہ وہی جگر مرادآبادی والی بات اپنی طرف بلائے گی کہ:

یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجیے — اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

منظر شہاب نے عشق کو ایک علامت، ایک رمز، ایک تمثیل اور استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور انھوں نے اسی عشق و رومان کے پیمانے میں زمانہ کی مئے حیات کو بھی انڈیلا ہے:

سانس ڈھلتی گئی درد میں — درد کے زخم اگے رات بھر

موت قسطوں میں آتی رہی — ہم کہ مر مر جئے رات بھر

منظر شہاب کس ادبی تحریک سے وابستہ تھے، کون سا ادبی و شعری رجحان انھیں اپیل کرتا تھا، وہ کس ادبی و شعری نظریہ کے علم بردار تھے، اس کی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کوئی شاعر تحریکی وابستگی کی بیساکھی کے سہارے بڑا بن سکتا ہے۔ بالشتیہ سدا بالشتیہ ہی رہتا ہے۔ تحریک پلیٹ فارم ضرور مہیا کرتی ہے، مگر شہرت اور پہچان اپنے فن سے ملتی ہے۔ منظر شہاب کے شعری مجموعہ کے آغاز میں جو انتسابی الفاظ ہیں، ان سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ ایک آزاد پنچھی تھے، جس کو کسی ادبی تحریک کی منڈیر پر بیٹھنا اور کسی تحریک ساز کی قصیدہ خوانی منظور نہ تھی، انھوں نے سجاد ظہیر، نارنگ و فاروقی کے ساتھ مابعد جدید ناقد وہاب اشرفی کا علانیہ نام لے کر یہی عندیہ دیا ہے، مگر اس لفظی رسمی اظہار سے قطع نظر ان کے دیوان کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ منظر شہاب ایک ایسا شاعر ہے جس کے یہاں ترقی پسندانہ موضوعات و مضامین کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے خاتمے کا اعلان ممکن ہے، مگر ترقی پسندیت کا خاتمہ تو ممکن نہیں۔ یہ ہر زمانے میں نئے رنگ و روپ میں جنم لیتی رہتی ہے۔ ۱۹۳۵ء والی ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا جس طرح بم و بارود، آتش و آہن اور بندوق و رائفل کی شاعری کرتے تھے، امریکہ اور روس کی اجارہ داری کو شعر و سخن کی کلاشنکوف سے چیلنج کرتے تھے، منظر شہاب کے یہاں بھی اس قسم کے اشعار تلاش کرنے پر ملتے ہیں:

بموں کے خوف سے شہروں میں موت کی دہشت — سروں کی کھوج میں رائفلیں ہیں گاؤں میں

سنا تو ڈر سے چراغوں کے زرد تھے چہرے — چھپی ہوئی ہیں ہوائیں کمین گاہوں میں

ڈھلی ہے رات مگر صبح کا نشان نہیں — دھندلکا بھور کا آمادۂ بغاوت ہے

شکم کی آگ میں لاکھوں جلتے ہیں   مرے رفیق تری یہ پسپائی

منظر شہاب راہ فرار اختیار کرنے والے شاعر نہ تھے۔ نہ وہ خود پسندی کا شکار تھے۔ ان کی شاعری مطالبات زمانہ پر لبیک کہنے والی شاعری ہے۔ انھوں نے صرف عشق و رومان کی فضا میں اپنا شعری سفر طے نہیں کیا، بلکہ زمانہ کی نبض پر ہاتھ بھی رکھا، اس کو ٹٹولا، اس کے دکھ درد کو محسوس کیا۔ اضطرابات زمانہ کا نوٹس لیا اور وہ احساس شعر کے پیکر میں ڈھل گیا۔

آگ پٹرول کے پانی سے بجھائی اس نے   کتنا احساس مروت ہے عدو میں اب بھی

اس شعر میں نہ صرف انسانیت و آدمیت کے عنصر سے انسانوں کی محرومی کا نوحہ ہے، بلکہ اس میں زمانہ کی دشمنانہ روش اور منافقت و مخاصمت پر گہرا طنز بھی ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی بے حسی اور سوسائٹی کی سرد مہری کا مرثیہ بھی ہے۔ یہ شعر بھی موجودہ زمانہ کی لاقانونیت، بدنظمی اور ماورائے عدل و انصاف رویے پر تازیانہ عبرت ہے کہ:

محفوظ کرلیا ہے عدالت نے فیصلہ   قانونِ وقفِ عذرِ زمانہ نہ تھا کبھی

منظر شہاب کی شاعری غم زمانہ کی شاعری ہے۔ اس میں عصری صداقتوں کا اظہار ملتا ہے مگر انھوں نے ضبط و تحمل سے کام لیا۔ وہ سلگتے تو ہیں، مگر شعلہ بن کر خاکستر نہیں ہوتے۔ ایک سچا شاعر وفن کار سلگتا تو ہے، مگر وہ اپنا بند غم ٹوٹنے بھی نہیں دیتا کہ:

ٹانکے شہاب ٹوٹ گئے فرطِ درد سے   منظور دل کا درد دکھانا نہ تھا کبھی

اور اس کی وجہ شاید انھی کی زبان میں یہ ہو کہ:

اپنے زخموں کو کسی کو بھی دکھانا نہ شہاب   لوگ جیبوں میں نمکدان لئے پھرتے ہیں

ہندستان شہروں کا نہیں، گاؤں کا ملک ہے۔ اصلی ہندستان دیہاتوں میں بستا ہے۔ یہاں کی بیش تر آبادی گاؤں میں ہی رہنا اور بنوں، رمناؤں اور صحراؤں میں اٹھکھیلیاں کرنا چاہتی ہے۔ مگر شہری کرن کے عمل نے گاؤں کو بھی شہریت کے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ دھول سے اٹی گلیوں اور تنگ راستوں کے بجائے فرائے بھرنے والی سڑکیں ہیں۔ گاؤں کی رونق چھیننے اور گاؤں کو اجاڑنے میں قدرتی آفات کا بھی کم رول نہیں ہوتا۔ منظر شہاب اونچے اونچے فلک بوس فلیٹوں سے گھبراتے ہیں اور وہی مٹی کے کچے مکانوں کی یاد تازہ کر کے کف افسوس ملتے ہیں اور حسین ماضی کو یوں آواز دیتے ہیں کہ:

ان فلیٹوں کی شباہت یا رب   کوچۂ یار تک آئے تو مکاں بھول گئے

مٹی ہمارے گاؤں کی پکی نہ تھی شہاب   ندی کے اک کٹاؤ نے گھر بار لے لیا

منظر شہاب کی شاعری عصر حاضر کے مسائل و آلام کی بھی شاعری ہے اور وہ نئی ٹکنالوجی اور اس کے انقلابات و تغیرات پر بھی شاعرانہ نظر رکھتے ہیں۔ حالات حاضرہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ موبائل، انٹرنیٹ، اطلاعاتی ٹکنالوجی نے انسانی زندگی میں جو اتھل پتھل مچائی ہے اور انسانوں کے درمیان فاصلوں کی جو طویل خلیج قائم کردی ہے، اس پر وہ سینہ کوبی بھی کرتے ہیں:

نامۂ شوق کی خوش رنگ بیانی نہ رہی　　فیض ای۔میل سے اسلوب رواں بھول گئے
اب تو عشاق موبائل لئے پھرتے ہیں　　اک ذار صبر نہیں ضبط نہاں بھول گئے
حرف گفتار تھرکتے ہیں اب انٹرنٹ پر　　روبرو کیفیت دل کا بیاں بھول گئے

منظر شہاب نے کس کس کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، وہ کن کن کنوؤں سے سیراب ہوئے، کن دبستانوں کی سیر کی، کن دیوانوں کو اپنی نظروں سے گزارا، یہ ان کے معاصرین اور محققین وناقدین طے کریں گے، مگر وہ خود تو یہ کہتے ہیں کہ:

ہم اسیر میرؔ و راسخؔ صحن زنداں میں شہابؔ　　شائقین داغؔ ہیں دیوار زنداں سے اُدھر

شاعر ذرا شوخ بھی ہوتا ہے اور اس کی شوخیوں کی کوئی حد بھی نہیں ہوتی۔ یہ شوخی خالق ومخلوق اور صانع و مصنوع کے رشتوں کی دیوار کو بھی منہدم کرتی نظر آتی ہے۔ منظر شہاب کی شوخی کا ایک نمونہ دیکھیے:

حشر میں میرے گنہ پر فیصلہ آساں نہیں　　کچھ فرشتے لکھ کے دیں گے ہم کریں گے پیش کچھ

منظر شہاب نے وہ زبان لکھی ہے، جو آج کی مانگ اور ڈیمانڈ ہے۔ وہی زبان جس کا مارکیٹ اور بازار میں چلن ہے۔ انھوں نے زبان کے متعینہ سانچے کو توڑا بھی ہے اور اس کے ملبے پر زبان وبیان کا ایک نیا ڈھانچہ تیار کیا ہے۔ زبان توڑ پھوڑ کے عمل سے گزرنے کے بعد ہی بنتی، سنورتی اور نکھرتی ہے۔ ایک ہی دھرے پر چلتے رہنے سے زبان کے سمندر میں بھی بدبو اور تعفن پیدا ہوسکتی ہے۔ انھوں نے عربی فارسی کے ثقیل الفاظ کو غزل کی زبان نہیں بنایا ہے، جب کہ یہی زبانیں غزل کے مزاج ومنہاج سے زیادہ ہم آہنگ ہیں، بلکہ وہ زبان لکھی ہے جو بجا طور پر ہندستانی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ گویا بات وہی ہے، جس کا اعلان ملا وجہی نے سب رس کے اس اولین جملے میں کیا تھا کہ "آغاز داستان بزبان ہندوستان۔" منظر شہاب کی زبان ہندی کے نرم ونازک اور کومل الفاظ سے آب ودانہ اور غذا حاصل کرتی ہے۔ انھوں نے غزل کی نئی شبداولی تیار کی ہے اور اردو کے مختصر فرہنگ الفاظ کو غیر محسوس اور ان چھوئے الفاظ کا ذخیرہ دیا ہے۔ ان کی تقریباً ہر غزل میں ہندی کے سرل اور سہل الفاظ کی دنیا آباد ہے۔ دو یشی، سجھاؤ، اتر، لیکھک، شبد، دیا، وچار، مونسون، مدھرتان، انجل، پھل، آشا، بھور وغیرہ وہ الفاظ ہیں جو ان کے احساس کے عکاس ہیں کہ:

اے کاش کہ نازک سی غزل لکھتے　　احساس کی بھاشا کو سرل لکھتے

منظر شہاب نئی حسیت کے حامل شاعر تھے۔ انھوں نے علاقائیت کی سرحدوں کو توڑا، مگر انھیں اپنی مٹی سے محبت بھی تھی، جو ایک فطری امر ہے۔ دیکھیے وہ کس طرح اپنی زمین اور اپنے آبائی منطقہ کے ساتھ تعلق کا اظہار کرتے ہیں:

بدن میں تازگی متھلا کی نرم مٹی کی　　ادا و ناز میں اس دیش کی حلاوت ہے

خلاصہ یہ کہ منظر شہاب کی شاعری جہان رنگ وبو کی شاعری ہے۔ اس میں سوز وساز بھی ہے اور آرزو وامید کی جستجو بھی۔ ان کی شاعری زمین کی شاعری ہے۔ یہاں سنگلاخ حقیقتوں اور معاشرتی صداقتوں کا برہنہ بیان ملتا ہے۔ وہی باتیں، وہی موضوعات، وہی مضامین جن سے ہماری زندگی کا رابطہ وواسطہ رہا ہے۔ ان کی ہر غزل ہماری زندگی کو چھو اور مس کرتی ہے۔ انھوں نے کلاسیکی الفاظ وتراکیب کے ذخیرہ سے استفادہ تو کیا ہے کہ کلاسیکی سرمایہ

سے انحراف ممکن نہیں، مگر انھوں نے نئے لفظیات اور نئی ترکیبیں بھی تراشی ہیں۔ ان کی غزلوں میں کچھ الفاظ اتنے 'عریاں' ہیں کہ غزل کا نرم شبنمی لہجہ بھی گھائل اور مجروح ہو جاتا ہے۔ کچھ غزلیں غزل مسلسل کے مرتبے کی ہیں اور نظمیہ عنصر کی وجہ سے ہمیں متاثر کرتی ہیں۔

آدمی اور شاعری میں ذرا فرق ہے۔ انسان اکہرا اور یک رنگ ہو تو معاشرے میں پسندیدہ اور محبوب نظر بن جاتا ہے، مگر شاعری اکہری اور سادی ہو تو ادب معاشرے میں اس کا رتبہ، خدا معلوم کیوں گھٹ جاتا ہے۔ یہاں دوہری معنویت اور تہ داری کا سکہ چلتا ہے۔ منظر شہاب کی شاعری سیدھی چال چلتی ہے۔ یہ شخصیت و عادت کا اثر ہوگا، مگر ان کے یہاں مقصدیت کے ساتھ، جمالیات کی فراوانی بھی ملتی ہے۔ مجھ ہیچمداں نے تو پہلی قرأت سے یہی سمجھا ہے، مگر معروف افسانہ نگار اور صحافی سید منظر امام نے ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے:

> ''منظر شہاب کی شاعری جمالیات اور مقصدیت کے خوبصورت امتزاج سے نمو پذیر ہوئی ہے۔ وہ الفاظ کے مزاج داں ہیں، ان کی قدر و قیمت کو پہچانتے ہیں، ان میں پوشیدہ ساحری کو محسوس کرتے ہیں اور انھیں انتہائی شائستگی اور خوش سلیقگی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ محض لفظوں کی ترتیب کے قواعد اور اصولوں کے پابند نہیں ہوتے۔ وہ اپنی دنیا رکھتے ہیں اور جذبات کی کیمیا سے گزر کر آزاد اور کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔''

☆☆☆

● مقام و پوسٹ: اجرا، وایا: ریام فیکٹری، ضلع: مدھوبنی، بہار، پن نمبر: 847237 (موبائل نمبر: 8651708079)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبدؔ

منظر شہاب: نظم وغزل کے آئینے میں

منظہر امام نے ایک جگہ لکھا ہے" آج کل لوگ مجموعہ پہلے چھپواتے ہیں اور شاعری بعد میں شروع کرتے ہیں"۔ اس سلسلے میں انہوں نے عظیم شاعر فراق گورکھپوری کا نام پیش کیا تھا۔ جن کی پہلی شعری کتاب ۴۳ سال کی عمر میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس لحاظ سے منظر شہاب فراق پر سبقت لے جاتے ہیں کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ "پیراہن جاں" عمر کی چھٹی دہائی میں اشاعت پذیر ہوا۔

منظر شہاب کو نام نمود سے کبھی دلچسپی نہیں رہی لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا، جتنا لکھا اسے اردو کے شعری ادب میں بیش بہا اضافہ کہا جائے گا۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے بلکہ اشتراکی نظام کے ہم نوا رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے قید و بند کی سختیاں بھی کہیں اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ہنوز اپنے اسی نظریے پر قائم و دائم ہیں۔

منظر شہاب نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی اگر چہ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ نظم کے شاعر ہیں یا غزل کے اس لئے کہ دونوں ہی اصناف پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ ایک زمانے میں بلکہ یوں کہئے کہ جب وہ طالب علمی کے دور سے گذر رہے تھے انہوں نے "ساقی نامہ"، "ایک رات"، "چاندنی رات" جیسی نظمیں لکھیں جو آج بھی اردو نظم نگاری میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آیئے سب سے پہلے میں آپ کو ان کی نظم "ایک رات" سے متعارف کراؤں۔ نظم کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

سیاہ شب یہ فضاؤں میں رینگتے سائے — ہر ایک سمت خموشی ہے پنکھ پھیلائے

جمالِ شہر اندھیروں کی چوٹ سے گھائل

بجھی بجھی سی دکانیں، نہ قمقموں کے نجوم — نہ گل رخوں کے گلستاں، نہ قامتوں کے ہجوم

نہ شاخِ بازوئے تاباں نہ صندلیں رخسار — نہ آنچلوں کے کنارے، نہ گیسوؤں کی بہار

....

شعاعِ نور کی یورش، نہ روشنی کا جلوس — نہ جگمگاتے مناظر، نہ سیم گوں لمحات

نہ ریڈیو پہ تھرکتے طرب فزا نغمے — نہ ناچ گھر میں چھناکے نہ میکدے آباد

ہر ایک سمت خموشی، ہر ایک سمت قرار

یہ بتادوں کہ "ایک رات" اُس زمانے میں کہی گئی جب منظر شہاب پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) کے طالب علم تھے اور اقبال ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ان ہی دنوں کلام حیدری، انور عظیم، شکیل الرحمٰن، نادم بلخی ان کے ہم جماعت تھے۔ اب اس نظم کے آگے کے حصہ کو دیکھئے اور منظر شہاب کی شعری تزئین کاری پر غور کیجئے:

دلِ حزیں میں نہاں یوں تو سینکڑوں غم ہیں — مگر یہ ایک کہیں لا دوا نہ بن جائے

یہ مہکے مہکے چمن زار، پارکوں کا یہ حسن — مراد پور کی گلیاں، یہ اونگھتا رومان

یہ کالی داس کے نغمے، یہ ودّیا کی دُھنیں — یہ میرؔ، گورکیؔ، ٹیگور اور شانتی کلا
یہ لازوال ادیبوں کی زرنگار قطار

اور پھر اسی نظم کے آخری حصے کو دیکھئے:

انہیں خیالوں نے دل کا قرار چھینا ہے — میں سوچتا ہوں یہ آدم کی عظمتوں کے نشاں
یہ ارتقا یہ تمدن کی ضو فشاں قندیل — دل و نظر کے یہ دلچسپ چند افسانے
چھڑی جو جنگ تو ان کا مآل کیا ہوگا — جنوں گے کے دور میں طرز خیال کیا ہوگا

ان کی نظم ''ساقی نامہ'' اقبال کے ''ساقی نامہ'' کی یاد دلاتی ہے۔ نظم ابتدا تا انتہا اسی انداز کی ہے۔ چند اشعار سنئے:

خوشا طالع وقت درخشاں ہے آج — گل افشاں چمن زار دوراں ہے آج
بہاریں ہیں گیتی پہ سایہ فگن — روش در روش اور چمن در چمن
چمن میں دل آویز گل کاریاں — فضا میں جنوں کی سرمستیاں
دہکتے فسوں آفریں لالہ زار — کہ جن سے لباس خزاں تار تار
صبا کی سر شاخ سرگوشیاں — ادا شوخیاں، ناز اٹھکھیلیاں
الجھتی ہوئی وہ خیاباں کے ساتھ — لپٹتی ہوئی بیدِ لرزاں کے ساتھ

نظم کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

یہ خُم خانۂ ہند میرا وطن — یہ سارے زمانے میں یکتا چمن
غلامی کے شعلوں میں جلتا رہا — خزاں کے بگولوں میں جھلسا رہا
بہت اس کے دل سے اڑی دھول دھول — کہیں تب کھلے ڈال میں پھول پھول
مگر اس گلستاں کی رعنائیاں — وہ حسنِ بہاراں کی تہہ داریاں
ابھی تک ہیں مستور ظلمات میں — تجلّی ہے پنہاں حجابات میں
اگرچہ ہے بزم اپنی، اپنے ہیں جام — مگر بادہ غرب سے لالہ خام
عنایت ہو اے ساقئ عہد ساز — مئے عصر سوز و زمانہ گداز
اٹھا ساقیا جامِ آتش فروز — عطا کر جگر کو مسرت کا سوز
مسرت جو فیوچک کو زیر رسن — سناتی رہی نغمۂ فکر و فن

منظر شہاب کی نظموں میں اگر شمشیر وسناں کی جھنکار ہے تو ذکر لب ورخسار بھی، ان کے یہاں غمِ دوراں اور غمِ جاناں دونوں موجود ہیں۔ جہاں انہوں نے محبوب کی زلفیں سنوارنی چاہی ہیں وہیں گیسوئے زمانہ کی مشاطہ گری بھی کی ہے۔ ان کی مختصر سی نظم ''پہاڑی لیلیٰ'' ہے جو آج بھی چھوٹا ناگپور (جھارکھنڈ) میں بے حد مقبول ہے۔ چونکہ یہ نظم مختصر ہے اس لئے میں پوری نظم قارئین کے لئے پیش کر رہا ہوں:

اجنبی حسن، جامنی رنگت — جسم سارا کسا کسا سا ہے

تنِ ترکش میں چستی آہو — سر میں سودائے باغیانہ ہے
قد میں اس کے اٹھان پر بت کی — چال میں ناز بادلوں کا ہے
کالی زلفوں میں ایک اُجلا پھول — بھانورے لاکھ پھول اکیلا ہے
بول جیسے کٹورے بجتے ہوں — خامشی بھی سکوت گویا ہے
یہ وہ بت ہے کہ سنگِ اسود سے — دست قدرت نے خود تراشا ہے

سر سے پا تک ہے کفر کا عالم
ایک قیامت پہاڑی لیلیٰ ہے

شہر جمشید پور نے دو خونی فساد دیکھے ہیں۔ وہ شہر جو امن و آشتی کا گہوارہ تھا ہر مذہب اور ہر قوم کے لوگ بہت ہی پُرسکون زندگی گذارتے تھے جس شہر نے فساد کی ہولناکیاں نہیں دیکھی تھیں۔ وحشت اور درندگی کے مناظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے وہی شہر دوبار خونی فساد سے گذرا سینکڑوں لوگ شہید ہوئے۔ کتنے گھر برباد ہوئے، کتنے بچے یتیم اور کتنی سہاگنوں کو بیوگی کے دور سے گذرنا پڑا۔ منظر شہاب جنھوں نے یہ فسادات صرف دیکھے ہی نہیں بلکہ اس فساد میں ان کے کئی عزیز کو بھی جامِ شہادت پینا پڑا۔ اس فساد نے زکی انور جیسے فنکار کو ہم سے چھین لیا۔ ان کی نظم ''ہم نہ بھولیں گے'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو زکی انور کی شہادت کا مرثیہ ہے:

یہ صبح غم یہ شام سوگواراں ہم نہ بھولیں گے — لہو کی آگ میں جلتا گلستاں ہم نہ بھولیں گے
جنوں کی گرد سے اہلِ خرد کی آنکھ کجلائی — تعصب کا غبار آلود طوفاں ہم نہ بھولیں گے
کلیجے چھلنی نوکِ خار سے معصوم کلیوں کے — دریدہ جابجا پھولوں کے داماں ہم نہ بھولیں گے
نہ جانے کیا وہ کہتی تھیں، نہ جانے کس کو تکتی تھیں — وہ پتھرائی ہوئی چشم غزالاں ہم نہ بھولیں گے
خود اپنے شور میں مدفون مجبوروں کی فریادیں — تغافل ہائے اہلِ اختیاراں ہم نہ بھولیں گے
بلا تفریق رنگ و بو جو ہر کلی کی مونس ہیں — وہ چشم دشمن خار، مغیلاں ہم نہ بھولیں گے

اب میں منظر شہاب کی غزلوں پر گفتگو کروں گا۔ یہ سچ ہے کہ منظر شہاب نے شعر گوئی کا آغاز نظموں سے کیا تھا۔ اور انہوں نے چند بے حد خوبصورت اور فکر انگیز نظمیں اردو شاعری کو عطا کی ہیں جن کا ذکر اوپر کی سطروں میں ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ منظر شہاب نے بے حد پیاری، بے حد خوبصورت، اور بے حد اثر انگیز غزلیں اردو ادب کو عطا کی ہیں۔ آیئے ان کے اوّلین مجموعہ ''پیراہنِ جاں'' کی غزلوں سے لطف اٹھایا جائے:

یہ اور بات ہے کہ بتوں کو خدا کہیں — لیکن خدا کو ہم نے بنایا نہیں صنم
ناداریاں میری کہ تمہیں کچھ نہ دے سکا — تم نے تو خیر سونپ دی مجھ کو متاعِ غم

....

مجھے باغباں بتائیں یہ بہار ہے تو کیسی — نہ وہ فصلِ گل کا سودا نہ وہ چاک دامنی ہے
یہ نسیم پا شکستہ یہ طیور دل گرفتہ — ابھی گلستاں میں ماتم، ابھی شاخ غم ہری ہے

....

حدود طور کی بندش تو اٹھ چکی یارب | مگر ہنوز کلیموں پہ جلوہ عام نہیں
خلوص رکھ کے بھی محروم ارتقاء ہی رہا | وہ کارواں جو زمانے میں تیزگام نہیں
عمل کی جنگ میں اکثر لچک بھی جاتا ہے | اصول زیست کا شمشیر ہے نیام نہیں

مری آنکھ روئے لہو نہ کیوں مجھے دل نہیں کہ جگر نہیں | تری بے رخی کا گلہ ہے کیا مری آہ میں ہی اثر نہیں
وہ دیا ہوں شاخ گلاب کا جو بہار میں بھی نہ جل سکا | میں وہ پاشکستہ نسیم ہوں کہ چمن میں جس کا گزر نہیں

جتنے بھی دریچے ہیں سبھوں کو نہ کرو بند | اک آدھ دریچہ تو کھلا چاہئے یارو
شیشے کی کوئی چیز سلامت نہ رہے گی | اس دور میں پتھر کی انا چاہئے یارو

آیئے اب ان کے دوسرے مجموعہ کلام ''مجروح پرندے کی صدا'' جس میں صرف غزلیں ہیں کے چند خوبصورت اشعار سے آپ کو متعارف کراؤں:

ابر آنکھوں میں اٹھا تھا تو برس جانا تھا | بوندا باندی سے دل و جاں کو نہ ڈس جانا تھا
وہ گھٹا بن کے جو برسی تو جلے تن من سب | بھول میری تھی اسے محض امس جانا تھا
کیا خبر تھی کہ تہہ سنگ سے میٹھا چشمہ | اس کی باتیں تھی کھری اس کو نرس جانا تھا
حرف اظہار کی کوتاہ رسی تو دیکھو | اس کے رخسار کی کلیوں کو بکس جانا تھا
عمر بیتی تو ہوا عشق کا اب گیان شہاب | میں نے پہلے نہ محبت کا رہس جانا تھا

بیشتر قوافی میں ہندی کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن کس خوبصورتی اور کاریگری کے ساتھ یہ صرف اور صرف منظر شہاب کا حصہ ہے۔ ''مجروح پرندے کی صدا'' کی بیشتر غزلیں منظر شہاب کی دوررسی، غزل پر ان کی مضبوط گرفت، شعری التزام اور بھرپور حسن کا مرقع ہیں۔ آیئے ان کے کچھ اور اشعار سے آپ کے ذہن و دل کو تابانی اور شگفتگی عطا کروں:

میری پلکوں پہ جو اک بوند ذرا سی ٹھہری | سادہ کاغذ کی ہتھیلی پہ حنا سی ٹھہری
زندگی نے کبھی خوابوں کو سجانے نہ دیا | خانۂ دل میں سدا بیم و رجا سی ٹھہری

بستر مرگ سے امید لگی بیٹھی ہے | آخری وقت کی مایوس دعا ہوں میں بھی
زخم جاں پر تو زباں پر ہے صلائے کم کم | ایک مجروح پرندے کی انا ہوں میں بھی
مجھ کو رو رو کے شہاب اپنی کہانی نہ سنا | میں ہوں واقف تری سانسوں میں جیا ہوں میں بھی

یہ صحیح ہے کہ منظر شہاب کو وہ شہرت ناموری اور وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ واقعی مستحق تھے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس میں ان کے اپنے تساہل اور دیگر مصروفیات کا بڑا دخل ہے۔ اس کے باوجود وہ اردو کے ایک مستند، باوقار اور حوصلہ مند شاعر ہیں۔ جن کا کلام ہمیں نہ صرف آسودگی بخشتا ہے بلکہ ہمارے ذہن کے بہت سے بند دریچوں کو وا بھی کرتا ہے۔

● ملت کالونی، واسع پور، دھنباد-۸۲۶۰۰۱ (جھارکھنڈ)

ڈاکٹر امام اعظم

منظر شہاب: شخصیت اور فن

منظر شہاب کا اصل نام سید محمد یٰسین تھا۔ ان کی ولادت ۳۱ رمئی ۱۹۲۷ء کو شاہو بگہہ، ضلع گیا، ثم جہان آباد (بہار) میں ہوئی۔ ان کے جدامجد آبائی وطن 'کوسیاواں' ترک کر کے موضع بلاول تھانہ ہلسہ ضلع نالندہ میں جا بسے تھے۔ والد بزرگوار سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری کا سلسلۂ نسب نویں پشت میں حضرت سلطان بلخیؒ سے جاملتا ہے جن کے نانا سید شاہ مبارک حسین ساکن شیخ پورہ (مونگیر) حضرت شیخ شعیب، عم زادہ حضرت مخدوم جہاں کی اولاد میں سے تھے جب کہ نانی کا خاندانی تسلسل حضرت مظفر شمس بلخیؒ، حضرت ابراہیم ادھم اور حضرت امام حسینؑ سے گزرتا ہوا امیر المومنین حضرت علیؑ کرم اللہ وجہٗ تک پہنچتا ہے۔ منظر شہاب کے نانا ڈاکٹر شمس الدین کے جد اعلیٰ سید شاہ فیض اللہ بخاری نے ۱۵۱۸ء (بہ زمانہ بہلول لودی) شاہو بگہہ میں سکونت اختیار کرلی۔ صوبہ بہار کا یہ دور افتادہ گاؤں مردم خیزی کے لئے مشہور تھا۔ علامہ فضل حق آزاد جیسے متبحر عالم اور ملک گیر شہرت یافتہ شاعر، شاعر خمریات عزیز عظیم آبادی اور نامور مثنوی نگار عبدالمجید شمس (پرنسپل) کو اسی سرزمین سے نسبت تھی۔ اسی گاؤں کی بالیدہ فضاؤں میں منظر شہاب کی زندگی کے ابتدائی ایام گزرے۔ ان کے والد سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری جو بذات خود ایک عالم دین، شعلہ بیاں خطیب اور معتبر شاعر تھے، اپنے آبائی وطن بھدول، ضلع نالندہ کو بھول گئے اور شاہو بگہہ ضلع گیا ثم جہان آباد کے ہو کر رہ گئے۔ وہ جمعیۃ العلماء ہند کے سرگرم رکن تھے اور جنگ آزادی کی تحریک میں انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ انھوں نے مدرسۂ الٰہیات، کانپور سے فراغت حاصل کی تھی۔ منطق، فلسفہ اور علم کلام ان کے خاص مضامین تھے۔ وہ شعر گوئی کا بھی ذوق سلیم رکھتے تھے۔ ان کی والدہ کا نام آمنہ خاتون بلخی تھا۔ غرض یہ کہ بچپن سے منظر شہاب کو ایسا ماحول ملا جو مذہب، فلسفہ، ادب اور سیاست سے متعلق مباحث کا محور تھا۔ اس طرح ادب اور سیاست سے ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری مدرسہ حمیدیہ، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں (۱۹۲۳ء) استاد ہوئے۔ پھر مدرسہ الٰہیات، کانپور ۱۹۲۸ء میں مدرس ہو کر چلے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں راج ہائی اسکول دربھنگہ میں بحیثیت مدرس اردو، فارسی ہو کر آئے۔ ۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں شاہو بگہہ اجڑ گیا تو انھوں نے دربھنگہ کو اپنا مستقر بنالیا۔ منظر شہاب کی والدہ کا نام سیّدہ بی بی سکینہ خاتون تھا۔

۱۹۳۹ء میں والد کی نگرانی میں مہاراجہ دربھنگہ کی مشہور درسگاہ راج اسکول میں منظر شہاب کا داخلہ ہوا جہاں بنگلہ ادب کے مشہور ادیب وبھوتی بھوشن بنرجی مدرس اعلیٰ تھے۔ مہاراجہ دھیراج کو اپنی درسگاہ کی نمائش کا بے حد شوق تھا۔ مشاہیر وقت کی خوشگوار آمد کا سلسلہ قائم تھا جن میں معروف گلوکار کے ایل سہگل، لارڈ لنلتھگو وائسرائے اور ریناز فلسفہ اور سابق صدر جمہوریہ ہند سروپلی رادھا کرشنن جیسی شخصیات کی آمد کے نقوش ان کے ذہن میں ثبت رہے۔ وہیں سے انہوں نے ۱۹۴۴ء میں میٹریکولیشن کیا اور ۱۹۴۵ء میں سی ایم کالج، دربھنگہ میں داخلہ لے لیا جہاں سے ۱۹۴۹ء میں گریجویشن مکمل کیا۔ اسی درمیان ۱۹۴۵ء میں ایک قلمی رسالہ 'رحیل' سید محمد یٰسین شعلہ شاہو بگھوی کے نام

سے مرتب کیا جس کا مقصد ادبی سے زیادہ اصلاحی تھا۔ بعد میں مظہر امام کے مشورہ پر اپنا ادبی نام منظر شہاب رکھ لیا۔ منظر شہاب کے جمشید پور میں لیکچرار ہونے کے بعد ان کا خانوادہ جمشید پور مستقلاً منتقل ہو گیا۔ ۱۹۸۱ء میں سید محمد طہٰ الٰہی فکری کا انتقال ہوا اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے تین بیٹے منظر شہاب، سید احمد شمیم، اعجاز احمد اور ایک بیٹی سیدہ فردوسیہ کو چھوڑا جن میں معروف شاعر اور ناقد پروفیسر سید احمد شمیم کریم سٹی کالج، جمشید پور کے شعبۂ اردو سے سبکدوش ہو کر پارڈیہہ، مانگو، جمشید پور میں مقیم ہیں۔

گھریلو ماحول کے زیر اثر منظر شہاب کانگریس کے ہم نوا اور مسلم لیگ کے مخالف بن گئے تھے۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فساد، کشت و خون اور ملک کی تقسیم نے ان کے سیاسی نظریات پر گہرا اثر ڈالا اور وہ اشتراکی تحریک سے قریب ہو گئے۔ ۱۹۴۱ء سے ان کی تخلیقات دربھنگہ، پٹنہ، کلکتہ، دہلی وغیرہ کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ ماہنامہ ''تہذیب'' نے برصغیر میں ان کو متعارف کرانے میں بڑا رول ادا کیا۔ ۱۹۴۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین (شاخ دربھنگہ) کا قیام جب عمل میں آیا تو معتمد اول کی ذمہ داری انھیں سونپی گئی۔ منسوب حسن، حسن امام درد اور مظہر امام اس کے سرگرم رکن تھے۔ یہیں سے ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند ادب کے ترجمان سہ ماہی 'نئی کرن' کا اجرا مظہر امام اور ان کی مشترکہ ادارت میں ہوا جس کے صرف تین شمارے ہی شائع ہو سکے۔ 'نئی کرن' نے ان دونوں کی شہرت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اشتراکی رجحان کے سبب ان دونوں کو بھی حکومت وقت نے خطرناک شہری قرار دے کر فروری ۱۹۴۹ء میں گرفتار کر لیا جس کے احتجاج کے طور پر کئی رسائل میں اداریے بھی لکھے گئے۔ بالخصوص کرشن چندر نے ''محاذ'' (بمبئی) میں ایک سخت نوٹ سپرد قلم کیا۔ جیل سے رہا ہو کر منظر شہاب نے جولائی ۱۹۴۹ء میں گاندھی میموریل خانقاہ انگلش ہائی اسکول، اسلام پور، ضلع نالندہ میں مدرس کی ملازمت کر لی اور ملازمت کے بعد اشتراکی تحریک کے سرگرم رکن بن گئے۔ ۱۹۵۰ء میں ملازمت چھوڑی اور اسی سال پٹنہ کالج کے ایم اے اردو کورس میں داخلہ لیا۔ کلام حیدری، انور عظیم اور اختر پیامی ان کے ہم جماعت تھے۔ شکیل الرحمٰن، نادم بلخی اور انیس امام ایک سال بعد آئے۔ ان کا کمرہ ترقی پسند ادیبوں کا اڈہ بن گیا۔ گاہے گاہے سیاسی کارکن بھی وارد ہو جاتے تھے۔ کامریڈ حبیب الرحمٰن جن سے ان سب کو والہانہ عقیدت تھی اکثر و بیشتر ان کے مہمان کی حیثیت سے قیام فرماتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پٹنہ کے ادبی آسمان پر قدیم اور جدید ادیبوں کی کہکشاں جگمگا رہی تھی۔ اختر پیامی، انور عظیم، کلام حیدری، حسن نعیم، شکیل الرحمٰن اور نادم بلخی جیسے نو یافت ستارے روشنی بکھیر رہے تھے۔ پٹنہ کے قیام نے ان کے ادبی ذوق کو امید افزا مہمیز لگائی۔ علامہ جمیل مظہری، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، سجاد ظہیر اور سہیل عظیم آبادی جیسے قد آور ادیبوں نے ان کی تخلیقات کو توصیفی کلمات سے نوازا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پٹنہ نے ایک ادبی جریدہ ''نئی راہ'' شائع کیا جس کی مجلسِ ادارت میں انور عظیم، حسن نعیم اور رفیق جابر کے ساتھ وہ بھی شامل تھے۔ کامریڈ حبیب الرحمٰن کے اصرار پر انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت قبول کر لی لیکن عملی سیاست سے ہمیشہ دور رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کے آئیڈیل رہے اور ان کی طرز نگارش کو اپنانے کا ان کے اندر جنون تھا۔

جولائی ۱۹۵۳ء میں شعبۂ اردو، کوآپریٹو کالج (جمشید پور) میں ان کی تقرری بحیثیت لیکچرار ہوئی۔ جمشید پور

فنونِ لطیفہ کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر نے ان کے مذاقِ فن کو ڈراما اور اسٹیج کے شوقِ لطیف سے آشنا کیا۔ ہدایت کاری کے علاوہ انھوں نے خود بھی کئی تمثیلوں میں کام کیا۔ کل ہند یوتھ فیسٹول میں ان کی ہدایت کاری میں اسٹیج شدہ ڈرامہ مسز پرول ویدم (۱۹۵۶ء) کو اول انعام ملا۔ اس کے علاوہ "پردہ اٹھاؤ، پردہ گراؤ" (اوپندر ناتھ اشک) ۱۹۵۴ء میں اور "بھگوان چور بھیجو" (۱۹۵۸ء) میں اسٹیج ہوئے۔ "میر کلّو کی گواہی" اور "Monkey's Paw" جیسے ڈراموں کو ہدایت بھی دی۔ خود انھوں نے کئی ڈراموں میں اداکاری کی تھی۔ ۵؍اگست ۱۹۶۵ء کو کریمیہ ٹرسٹ کے ٹرسٹی کی ایما پر انھوں نے کریم سٹی کالج کے بانی پرنسپل کی ذمہ داری سنبھالی اور مئی ۱۹۸۹ء میں وہ اس سرگراں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں جب کمیونسٹ پارٹی انتشار کا شکار ہوگئی تو انھوں نے رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ ویسے وہ اشتراکی نظریات کو انسانی ارتقاء کا اہم ستون سمجھتے رہے۔ ادب میں وہ موضوع کی صحت اور ہیئت کے حسن کے قائل تھے۔ ادب یا دیگر فنونِ لطیفہ میں ناوابستگی کے سوال کو بے معنی سمجھتے تھے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "پیراہن جاں" (۱۹۸۹ء)، مضامین کا مجموعہ "اور پھر بیاں اپنا" (۲۰۰۲ء) اور دوسرا شعری مجموعہ "مجروح پرندے کی صدا" (۲۰۰۷ء) شائع ہو چکے ہیں۔ خطوط "حرف حرف داستاں" کے نام سے زیرِ اشاعت ہیں۔ "شاخ شاخ پھول" (غزلوں کا مجموعہ) اور کئی کتابیں منتظرِ اشاعت ہیں۔ ان کی حیات اور کارناموں پر لکھے گئے دو تحقیقی مقالات پر ڈاکٹر ایم صلاح الدین اور ڈاکٹر انور مجیب کو بالترتیب ایل. این. متھلا یونیورسٹی (دربھنگہ) اور مگدھ یونیورسٹی (بودھ گیا) سے ڈاکٹریٹ کی سندیں بھی تفویض ہو چکی ہیں نیز ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی کتاب 'منظر شہاب: حیات اور فکر و فن' ۲۰۰۴ء میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (دہلی)، مغربی بنگال اردو اکاڈمی (کولکاتا)، بہار اردو اکاڈمی (پٹنہ)، سنگھ بھوم ہندی ساہتیہ سمیلن (جمشید پور)، اردو گھر، شائقین ادب، ہندو مسلم ویلفیئر سوسائٹی (جمشید پور) نے ان کی ادبی و ثقافتی خدمات کے اعتراف میں انعامات و اعزازات سے نوازا ہے۔

منظر شہاب ۷؍نومبر ۱۹۴۷ء کو حسن امام درد، مظہر امام اور سید منظر امام کی بہن سیدہ نسرین (نسرین شہاب) سے امیر منزل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں رشتۂ ازدواج سے بندھے۔ ان کے دو بیٹے ڈاکٹر منظر حسنین (سابق صدر، شعبۂ حیوانیات، کریم سٹی کالج، جمشید پور) اور پروفیسر اختر حسنین (سابق استاذ، شعبۂ نفسیات، کے ایم پی ایم انٹر کالج، جمشید پور) ہیں جب کہ دو بیٹیاں نکہت نسرین عرف بے بی (صدر شعبۂ ہوم سائنس، اسکول کالج فار گریجویشن، ساکچی، جمشید پور) اور شبنم نسرین عرف پونم (متوفی ۱۵؍اپریل ۲۰۱۷ء، تدفین ۱۶؍اپریل ۲۰۱۷ء، بمقام میورو ہار قبرستان دہلی) ہیں۔ داماد ڈاکٹر اشرف بہاری (صدر شعبۂ فلسفہ، کریم سٹی کالج، جمشید پور) اور شہیر امام (کنسلٹنٹ، سی شیل بینک، ساؤتھ افریقہ) ہیں۔ بہوئیں ڈاکٹر شیریں حسنین (پی جی، صدر شعبۂ اردو، کولہان یونیورسٹی، چائباسہ) اور ڈاکٹر کشور آرا (شعبۂ اقتصادیات، ویمنس کالج، جمشید پور) ہیں۔

منظر شہاب کا انتقال ۷؍ستمبر ۲۰۱۶ء کو آٹھ بجے رات ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر منظر حسنین کی رہائش گاہ (آزاد نگر، جمشید پور) میں ہوا۔ نمازِ جنازہ ۸؍ستمبر ۲۰۱۶ء کو بعد نمازِ ظہر ادا کی گئی اور پرولیا روڈ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

منظر شہاب اپنی کشمکش حیات کا ماحصل یہ اشعار چھوڑ گئے:

اس دور میں پتھر کی انا چاہئے یارو　　　شیشے کی کوئی چیز سلامت نہ رہے گی

......

بیچ دریا کے خوشی ہے، کنارے ہلچل　　　میری کشتی کا سفر ختم ہوا لگتا ہے

ہم یہ جانتے ہیں کہ منظر شہاب ترقی پسند شاعر تھے اسی لئے ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد بہتوں کی طرح ترقی پسندی کے منکر کبھی نہیں ہوئے اور نہ اپنی شاعری کو مقصدیت کا آلہ بنایا۔ ترقی پسندی کے باوصف ان کے یہاں فن کا احترام بہتوں کے مقابلے میں بدرجۂ اتم ملتا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "پیراہن جاں" ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا جس میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۸ء تک کے کلام شامل ہیں۔ گرچہ ان کا شعری سرمایہ ۴۱ رسال کے طویل عرصے پر محیط ہے جو کافی تاخیر سے منظر عام پر آیا مگر اس کے وجود نے ثابت کر دیا کہ شاعری مقصدیت اور جمالیت کے امتزاج سے کس طرح سحر کار بنتی ہے۔ اس پہلے مجموعہ نے ہی بتا دیا کہ منظر شہاب الفاظ کے مزاج داں تھے، ان کی قدر و قیمت پہچانتے تھے، الفاظ میں پوشیدہ ساحری کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے۔ اس لئے انتہائی مشاقی اور خوش سلیقگی سے انہیں برتتے رہے۔ منظر شہاب کے الفاظ محض لفظوں کی ترتیب کے قواعدی اصولوں کے پابند نہیں تھے، وہ اپنی دنیا رکھتے ہیں اور جذبات کی کیمیا سے گزر کر آزاد اور کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں نادر تشبیہات اور تازہ کار استعاروں کا عجب نظام ملتا ہے۔ رمز و کنایہ کا ان کے یہاں استعمال حد درجہ منفرد و مخصوص ہوتا ہے، جن سے "پیراہن جاں" کا گوشہ گوشہ جگمگاتا نظر آتا ہے۔

"پیراہن جاں" کی نظمیں "ساقی نامہ"، "ایک رات" اور "چاندنی رات" باور کراتی ہیں کہ تخلیقی عمل میں مقصدیت اور جمالیت کا خوبصورت امتزاج ہو تو شاعری سر چڑھ کر بولتی ہے۔ "ایک تہنیتی نظم (بنام مظہر امام)"، "ہدیۂ خلوص (بنام کامریڈ محمد عالم)" جیسی واقعاتی نظموں میں نظریاتی آئینہ بندی کے ساتھ ساتھ اسلوب کی بہار اور الفاظ کے نکھار کا سجا نگار خانہ قابل دید ہے۔ نظمیں "ماتم زکی انور کا" اور "شجر کے چوتھے جگنو کا آخری سفر" اصلاً مرثیہ ہیں اور اتنے دلدوز کہ انھیں Elegy بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں شاعر کی دردمندی قاری کے اندر بوند بوند اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور نس نس میں درد کی لہر بن کر سما جاتی ہے۔ یہ مرثیے جمشید پور کے ہولناک فرقہ وارانہ فساد کی ایسی پراثر آئینہ کاری کرتے ہیں کہ ان میں الفاظ احساس کی آنچ سے پگھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور آنسوؤں کی ترسیل بن جاتے ہیں جو کاسۂ چشم سے ٹپک بھی نہ سکے۔ یہ مرثیے ان کے اس شعر کے مصداق ٹھہرتے ہیں کہ:

سبھوں کے درد میں اک رشتۂ نہاں نکلا　　　سنی جو میری کہانی تو رو پڑے سب لوگ

منظر شہاب کی دردمندی، زندگی سے گہری انسیت، اقدار کی پامالی سے سلگتی دھیمی دھیمی چیخ ان کی غزلوں میں بھی موجود ہے مگر چیخ میں کرختگی نہیں، لہجے میں وہ پھوہڑپن نہیں، گھن گرج، بلند آہنگ دعوے اور نعرہ بازی نہیں جو مقصدی یا ترقی پسند شاعری کا طرۂ امتیاز باور کیا جاتا رہا ہے بلکہ یہ اس موقف پر سدا گامزن رہے کہ:

آگ دھیمی ہی سہی دل سے لپٹ جاتی ہے　　　نرم لہجہ بھی عجب آگ لگاتا ہے شہاب

اس کی توجیہہ مظہر امام نے یوں کی ہے:

''منظر شہاب کی شاعری عام طور سے بالواسطہ اظہار کی شاعری ہے، ہر چند انہوں نے وقتی مسائل کے تعلق سے بھی نظمیں اور اشعار کہے، مگر چونکہ ان کا مزاج بنیادی طور پر رومانی رہا، اس لئے انہوں نے ایسے موضوعات و مسائل کے برتاؤ میں بھی نرمی، نفاست، تزئین اور آرائش کو ترجیح دی اور تحریک کے سیاسی نظریئے سے اتفاق رکھتے ہوئے بھی شاعری کو شاعری کی طرح برتا۔ انہوں نے رمزیت و ایمائیت سے بھی حسبِ ضرورت خلاّقانہ کام لیا اور استعارہ سازی اور پیکر تراشی سے بھی اپنی تخلیقات کو تہہ داری عطا کی۔ ان کی شاعری صرف غمِ دوراں کی شاعری نہیں ہے۔ اس میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ ذات بھی۔ انہوں نے انفرادی احساس اور تجربے سے اپنی شاعری کا نگارخانہ سجایا ہے۔ ان کے کلام کو ان کے دل آویز ڈکشن کے حوالے سے دیکھنا چاہئے......۔''

(کتاب 'تنقید نما' ۲۰۰۴ء مضمون ''منظر شہاب: پیراہنِ جاں اور تیز ہوا''، ص: ۱۶۷)

ان کا دل آویز ڈکشن کیا ہے؟ اس کی وضاحت کلام حیدری نے یوں کی ہے:

''منظر شہاب کی زبان پُر اثر ہے۔ اس میں شعلگی اور لپلپاتی آگ کی لپٹیں نہیں ہیں مگر ہڈیوں تک پگھلا دینے والی وہ آگ ہے جو اوپر سے راکھ ہے۔ منظر شہاب کی پوری شاعری مدھم آگ ہے۔ شعریت بہت کم مجروح ہوئی ہے، وہ بھی ترقی پسندی کے ۱۹۵۰ء-۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۲ء وغیرہ کے خارجی اثرات کی بنا پر، منظر شہاب کو وہاں تلاش کرنا، اس کی شناخت کرنا غلط ہوگا، وہ تو یہاں ہے:

دوست پتھر نہ اٹھاؤ یہ ہے غیروں کا چلن　　زخم پھولوں کے لگاؤ کہ سنبھل بھی نہ سکوں''

(ماہنامہ 'کتاب نما: نئی دہلی، شمارہ: ۱۰، ۱۹۹۱ء، ص: ۶۷-۶۸)

یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں خوش آوازوں اور دلنشیں رنگوں سے قدم قدم پر معانقہ ہوتا ہے۔

فکری اعتبار سے منظر شہاب کی شاعری میں ۱۹۷۷ء کے آس پاس ایک نیا موڑ آتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ، یہ کہ نظریاتی وفاداری کے ساتھ عصری حسیت کی آمیزش سے اپنی شاعری کو نیا رنگ و آہنگ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ گرچہ ان کی باخبری، سماجی دردمندی وہی ہے جو پہلے تھی، نظریاتی پاسداری میں بھی کوئی فرق نہیں آتا مگر اب الفاظ کے سجاؤ، سجاؤ اور گھبن سے اسلوب میں جادوگری اور نئے تلازمات کی مصوری سے نئے نگارخانے کی تزئین کرتے نظر آتے ہیں۔ شعری مجموعہ ''پیراہنِ جاں'' میں اس رویہ کی کچھ جھلک ملتی ہے مگر دوسرا مجموعہ ''مجروح پرندے کی صدا'' (مطبوعہ: ۲۰۰۷ء) میں منظر شہاب الگ رنگ ڈھنگ میں سامنے آتے ہیں۔ کہتے ہیں:

خوش رنگ موتیوں سے سجائیں غزل شہابؔ　　انمول آنسوؤں کا خزانہ کریں گے کیا

اس لئے یہ مجموعہ خالص غزلوں پر مشتمل ہے۔

جب معاشرت، سیاست، تہذیب اور تمدن بدلے تو زندگی کے دھارے بدلے اور قدریں بدلیں۔ زندگی نئے مسائل و معاملات سے دوچار ہوئی۔ ان تغیرات نے شاعر کو جو درد دیا ہے اس کا اظہار تو حسبِ حال کرنا ہی تھا

سومنظر شہاب نے خوب کیا اور اس طرح کیا:

زوالِ عمر میں بھی تھے شگفتہ ذہن شہابؔ ضعیف جسم تھا تخئیل ذی فراش نہ تھی

درد پگھلے گا ہڈیوں میں جب رنگ لائے گی زخمِ پیزہنی

ظاہر ہے جب درد ہڈیوں میں پگھلتا ہے اور اشک بن کر ٹپکنے کی بجائے شعروں میں ڈھلتا ہے تو اثر رکھتا ہے اور اثر پذیری کا فن ابھی تک غزل ہی ہے۔ لہٰذا ان کی غزلیں مقصدیت اور جمالیات کے آمیزے سے تیار دھنک رنگ شعری پیکروں پر مبنی شبنم بن کر موتی رولنے کی صناعی کے نمونے ہیں، جن میں مختلف النوع اپنے اور بنی نوع انسان کے درد، متبدل تہذیب اور سیاست کے بخشے ہوئے کرب، سائنس اور ٹکنالوجیکل ارتقا کے ضرب سے اپجے احساسات وادراک کے ایسے پیکر ملیں گے جو نظر کو خیرہ، فکر کو مہمیز اور دل کو مسوس کر رکھ دیتے ہیں۔ عموماً غزلوں میں حیرتناک جلوے گاہے گاہے کوندتے ہیں مگر ان کی بعض غزلیں پوری کی پوری ''از دل خیزد و بر دل ایزد'' کی مصداق ہیں اور فن میں مقصدیت کی آمیزش پر نیش زنی کرنے والوں کو آئینہ دکھاتی ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

خرد کی دھوپ کڑی دوپہر میں کیا ہوگی ابھی تو عکس رخ صبح کی تمازت ہے

......

کچے آنگن میں کھلے پھول نہ مرجھا جائیں دھوپ ڈالر کی ابھی گرچہ ضیا سی ٹھہری

......

کیا ضروری ہے فسادات لکھیں کیوں نہ اس کو لفظ گجرات لکھیں

......

ریشے ریشے میں کہیں زہر نہ بھر دے شبنم ہم نشینوں سے کبھی یوں نہ ڈرے تھے پتے

......

نرم و نازک تھے بہت پھول کنول کے پر اب اس میں ایک تیزانی کیوں ہے سمجھنا ہوگا

یہ مثالیں شاہد ہیں کہ پہلے کے مقابلے ان کے اسلوب میں تنوع، شعروں میں تپش اور نشتریت زیادہ در آئی ہے۔ گویا ؏ ''گردوں کا رنگ دیکھ بدلتا تخن کا رنگ'' کے مصداق ''چپکے چپکے شہاب کے دل میں جو شاعری طرزِ نو اُگاتی ہے'' اس کے جلوے خوب تر ہیں۔ نئے الفاظ، الفاظ کی نئی معنویت، نئی اصطلاحوں، نئی نئی زمینوں، استعاروں کے نئے رنگ و آہنگ، نئی نئی ترکیبوں اور نئی نئی علامتوں کی چھبن اور گھبن دیکھ قاری عش عش کر اٹھتا ہے۔ ہاں! کہیں کہیں ان کی نامانوسیت منظر شہاب کے شبنمی لہجے کو گھائل ضرور کرتی ہے مگر ان سے تنگ دامنی کا ازالہ بھی ہوتا ہے اور تہذیبِ فن کی پاسداری بھی ہوتی ہے۔ اس کی دو مثالیں کافی ہیں:

رخسار کھل اٹھے تو بدن کے تمام عضو اس حسنِ انتشار کی تفصیل ہو گئے

......

حرفِ گفتار تھر کتے ہیں اب انٹرنیٹ پر رُوبرو کیفیتِ دل کا بیاں بھول گئے

لہٰذا اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ منظر شہاب تہذیبِ فن کے شاعر تھے۔ وہ ایک ایسے حساس فنکار تھے جن کا آئینہ تندیٔ صہبا سے پگھلتا رہا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے روزنامہ 'قومی آواز' دہلی شمارہ: ۴ رمارچ 1991ء میں لکھا ہے کہ :

''منظر شہاب ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کا ذہن کشادہ ہے۔ وہ کسی خاص نظریئے سے بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات میں ذات اور کائنات کا انتہائی خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ ان کی شاعری کو ترقی پسندیدیت اور رومانیت کا حسین امتزاج سمجھنا چاہئے۔ اچھا شاعر اپنا لہجہ رکھتا ہے اور منظر شہاب کا ایک لہجہ ہے۔''

منظر شہاب نے تنقید بھی لکھی ہے۔ منظر شہاب کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اور پھر بیاں اپنا'' ان کے ادبی سفر کا احاطہ کرتا ہے۔ مضامین کی اہمیت سے کوئی بھی باشعور انکار نہیں کرسکتا۔ منظر شہاب خود بھی گہری فکر کی شخصیت کے مالک تھے۔ جو کچھ بھی لکھتے رہے اس میں تنوع اور مواد کی جامعیت موجود ہوتی ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین میں ''میتھلی کے لوک گیت''، ''حیات وکائنات: مختلف بھی، اہم بھی''، ''مولانا آزاد کا اسلوب''، ''اختر پیامی: تیرے غزال کیا ہوئے؟ تیرے ختن کو کیا ہوا؟''، ''میر تقی میر اور سودا کی غزلوں کا تقابلی جائزہ''، ''اسٹیج کی چند اہم اصطلاحیں''، ''افسانہ نگاری کے فنی حدود'' ایسے مضامین ہیں جو اہم بھی ہیں، معلوماتی بھی اور ان کی تحریری صلاحیت کے غماز بھی۔

منظر شہاب جب تجزیہ کرتے ہیں، تقابلی مطالعہ کرتے ہیں، تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو اعتدال کا دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ فن اور فنکاری کی بات کرتے ہیں لیکن مواد کی اہمیت ان کے یہاں موضوع بحث رہی ہے۔ زبان کی چاشنی کا جب ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ''زبان مصری کی ڈلی کی طرح شیریں ہے''۔ کسی گیت کا جائزہ لیتے ہیں تو فرماتے ہیں: ''اس گیت کی مثال تپتے ریگستان میں نخلستان جیسی ہے۔'' جب ودیاپتی کا تذکرہ کرتے ہیں تو تسلی آمیز باتیں کرتے ہیں: ''......یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ودیاپتی محبت اور حسن کے پجاری ہیں۔'' ایک جگہ انہوں نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے: ''مجھے جہاں بھی حسن ملا میں نے اس سے محبت کی۔''

غرض کہ پوری کتاب میں ان کی تحریری اور فکری صلاحیتوں کے گل بوٹے بکھرے نظر آتے ہیں۔ تحریر میں جاذبیت کا خیال رکھتے ہیں۔ بے جا طوالت سے احتراز کرتے ہیں۔ موضوع سے بھٹکنے کی کوشش نہیں کرتے۔ Pin Pointed باتیں کہنے کی ان کے یہاں بے پناہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ لہٰذا ان کی تنقیدی بصیرت کو حقیقی تنقید کا نام دیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

مظہر امام کی شاعری سے چربہ اور سرقہ

مظہر امام کی نظموں کی بات کی جائے تو احساسِ ذات کے حوالے سے جو بے تعلقی اور برجستگی ان کے یہاں ملتی ہے اور معصوم اور پاکیزہ اندازِ بیان میں جو سادگی اور صداقت ہم دیکھتے ہیں اس میں قدرتی پن صاف اور واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اپنے احساسات، طبیعت اور واردات قلبی کے بیان میں اپنی پرکاری سے جس طرح نئے نئے پہلو مظہر امام نے نکالے ہیں وہ ان کی جذباتی بصیرت اور فنی پختگی کی دلیل ہیں۔ ان کی نظمیں بحث کا دروازہ کھولتی رہی ہیں۔ وقت کی سیڑھیاں اترتے ہوئے حیرت کدہ سامنے لاتی رہی ہیں۔ ہیئت و موضوع کے لحاظ سے ارفع و اعلیٰ کا درجہ پاتی رہی ہیں۔ ذاتی محرومیوں اور نا آسودگیوں کے گرد گھومتی ہوئی رموزِ حیات و کائنات تک پہنچنے والی نظمیں خون کی گرمی، حرکت اور متحرک زندگی کی علامت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظموں سے متاثر ہونے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ یہ متاثر ہونا پسندیدہ اور مثبت تکمیل نہیں ہے بلکہ سوچ کو پیوست کر کے چربہ اتارنا ہے اور سرقہ کرنا ہے۔ نئی نسل کے شعرا کے ساتھ ہم عصر شعرا بھی خود کو محفوظ نہیں رکھ سکے ہیں۔

مجموعہ ''زخمِ تمنا'' میں مظہر امام کی نظم ''خواب سچ بھی ہوتے ہیں'' صفحہ ۱۰۹ پر ہے۔ جس کے یہ دو مصرعے ہیں:

اپنے سخت بستر پر　　کروٹیں بدلتا ہوں

علقمہ شبلی کے مجموعہ ''بے چہرہ لمحے'' کے صفحہ ۸۴ پر نظم ''کلکتہ'' کے یہ دو مصرعے ملاحظہ کیجیے:

تیرگی کے بستر پر　　کروٹیں بدلتا ہوں

مظہر امام کی مقبول نظم ''خواب سچ بھی ہوتے ہیں'' سے پریم وار برٹنی بھی متاثر ہوئے۔ ان کی نظم ''ہنی مون'' جولائی ۱۹۷۱ء کے ''روبی'' دہلی میں شائع ہوئی۔ دیکھیے مظہر امام کی نظم کا کس طرح چربہ ہے:

مظہر امام	پریم وار برٹنی
ناتواں امنگوں کو	عشق کی امنگوں کو
دل کو گدگداتی ہیں	حسن گدگداتا ہے
....	
کیا حسین سپنے ہیں	کیا حسین موسم ہے
....	
انکھڑیاں حسینوں کی	مے کدے نگاہوں کے
مے کدے لٹاتی ہیں	مستیاں لٹاتے ہیں
....	
حسن مسکراتا ہے	عشق مسکرایا ہے
عشق گیت گاتا ہے	حسن جگمگایا ہے
چاندنی کے دریا میں	چاندنی کے پھولوں میں

مظہر امام کی نظم "اکھڑتے خیموں کا درد" بہت مقبول رہی ہے۔اس نظم میں یہ کلیدی مصرعے ہیں:

مہیب طوفاں مہیب تر ہے　　　　کہیں بھی جائے اماں نہیں ہے

اس نظم سے اثر پذیری زبیر رضوی کے یہاں نمایاں ہے۔ان کی نظم "دھوئیں کا تیزاب" رسالہ "ذہنِ جدید" دہلی کے مارچ تا مئی ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی ہے:

یہ کون شب خون مارتا ہے/ یہ کون خیمے جلا رہا ہے/ یہ آسمان کس نے نوچ ڈالا/ کوئی ستارا کہیں نہیں ہے/
یہ رات کتنی مہیب تر ہے/ کہ گر یہ کوئی ہر ایک ساعت ہر ایک منظر/ رگوں میں کاٹو تو خوں نہیں ہے/
کہیں بھی جائے اماں نہیں ہے/ کہیں کوئی مہرباں نہیں ہے

علیم اللہ حالی نے بھی مظہر امام سے خوشہ چینی کی ہے۔مظہر امام کی نظم "اکھڑتے خیموں کا درد" سے ہی یہ مصرعے دیکھئے:

عقیدے نیزوں کے زخم کھا کر سسک رہے ہیں/ یقین کی سانس اکھڑ چلی ہے/ عزیز قدروں پہ جانکنی
کی گرفت مضبوط ہوگئی ہے/ نڈھال خوابوں کے ہونٹ سے خاک وخوں کے شعلے ابل رہے ہیں/ کوئی
خدا ہے تو وہ کہاں ہے؟/ کوئی خدا تھا تو وہ کہاں ہے؟

یہ نظم مجموعہ "رشتہ گونگے سفر کا" میں شامل ہے جس کی اشاعت ۱۹۷۴ء میں ہوئی تھی۔علیم اللہ حالی کا مجموعہ "سفر جلتے دنوں کا" ۱۹۷۹ء میں چھپا۔اس میں ایک نظم "آخری الزام" ہے۔اس کے ان مصرعوں کو مظہر امام کے مصرعوں سے ملایئے:

عقیدے گلیوں کے چند آوارہ مسخرے لونڈوں کی صورت/ کھڑے ہوئے/ اس غلیظ انبار پر مسکرا رہے ہیں/
صحف اعلیٰ کہ جن کو صدیوں سے ہم نے/ پاکیزگی کی اونچی بلندیوں پر سجا کے رکھا تھا/ اب خس وخاک ہو چکی ہے

اعزاز افضل نے اپنا ایک قطعہ "ڈنکے کی چوٹ" مظہر امام کی ایک غزل کے ایک شعر کو بنیاد بنا کر لکھا ہے۔ مظہر امام کی یہ غزل پہلی بار "ذہنِ جدید" دہلی کے ستمبر نومبر ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں چھپی جس کا شعر ہے:

کوئی سنے نہ سنے عرضِ حال کرتا جا　　　　نہ رُک جواب کی خاطر سوال کرتا جا

اعزاز افضل کے قطعات کا مجموعہ "قلم برداشتہ" ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آیا۔اس میں صفحہ ۱۱ پر یہ قطعہ شامل ہے جس پر ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۳ء کی تاریخ درج ہے یعنی مظہر امام کی غزل کی اشاعت کے تقریباً ایک سال بعد وجود میں آیا:

تمہارا کام ہے، اظہارِ درد کردینا　　　　کوئی سنے نہ سنے، عرضِ حال کرتے رہو
دماغ اس کی سماعت کا عرش پر ہی سہی　　　　جواب آئے نہ آئے سوال کرتے رہو

مظہر امام کی درج ذیل غزل سب سے پہلے رسالہ "گفتگو" بمبئی کے ستمبر ۱۹۷۸ء، "سطور" دہلی کے نومبر ۱۹۷۸ء اور "سیپ" کراچی کے اپریل ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔تین اشعار ملاحظہ کریں:

زلزلے سب دل کے اندر ہوگئے　　　　حادثے رومان پرور ہوگئے
دھوپ میں پہلے پگھل جاتے تھے لوگ　　　　اب کے کیا گزری کہ پتھر ہوگئے
تم کہ ہر دل میں تمہارا گھر ہوا　　　　ہم کہ اپنے گھر میں بے گھر ہوگئے

رحمت امروہوی کی ایک غزل دو ماہی "گلبن" احمد آباد کے سالنامہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی، اس کے تین

اشعار ہیں:

حادثے جیسے مقدر ہوگئے — اب تو ہم راہوں کا پتھر ہوگئے
پہلے کیسے موم ہوجاتے تھے لوگ — آج کل تو لوگ پتھر ہوگئے
اپنے گھر میں رہ کے بھی رحمت اب ہم — ایسا لگتا ہے کہ بے گھر ہوگئے

''برگِ آوارہ'' حیدرآباد کے ۱۹۸۳ء کے ایک شمارہ میں مصطفےٰ مومن کی پابند غزل شائع ہوئی جس کے دو اشعار ہیں:

پھول کا تحفہ نہ ہو راہ کے پتھر ہی سہی — دوستو! ملتے رہو اوروں سے چھپ کر ہی سہی
اک سہارا تو ملے خواب زدہ آنکھوں کو — میری تصویر نہیں سائے کا پیکر ہی سہی

یہ دونوں اشعار مظہر امام کی آزاد غزل سے لئے گئے ہیں۔ ''رشتہ گونگے سفر کا'' میں یہ آزاد غزل شامل ہے۔ اس سے قبل رسائل میں شائع ہو چکی ہے جس میں ''شب خون'' اور ''کوہسار'' جیسے رسالے شامل ہیں:

پھول ہو زہر میں ڈوبا ہوا پتھر نہ سہی
دوستو! میرا بھی کچھ حق تو ہے چھپ کر سہی کھل کر نہ سہی
یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی

مظہر امام کی پہلی حمد ''اوراق'' لاہور میں ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی اور پھر کئی جگہ چھپی۔ یہ حمد دیکھئے:

ترا ہی بحر، سفینہ رواں بھی تیرا ہے — بھنور بھی تیرے ہیں اور بادباں بھی تیرا ہے
ہے تیری بزم میں آخر کہاں جگہ میری — چراغ بھی ہیں ترے اور دھواں بھی تیرا ہے
مجھے تو نذر بھی کرنے کو کچھ نہیں اپنا — جبیں کی خاک تری آستاں بھی تیرا ہے
نقوش پا کو اٹھائے کہاں کہاں جاؤں — کہ گردِ رہ بھی تری، کارواں بھی تیرا ہے
دیا ہے کیوں مجھے لوح و قلم کا بارِ گراں — کہ گردشیں بھی تری، آسماں بھی تیرا ہے
بس اک کشاکشِ بے نام اور میں بے بس — نتیجہ بھی ہے ترا، امتحاں بھی تیرا ہے
میں تھک کے بیٹھ رہوں یا قدم بڑھائے چلوں — فنا بھی تیری ہے نام و نشاں بھی تیرا ہے

اس حمد کی تقلید کرنے اور اثر لینے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ چند اہم ناموں کی حمد ملاحظہ کریں۔

زیب غوری کی حمد ان کے مجموعۂ کلام ''چاک'' مطبوعہ ۱۹۸۵ء میں شامل ہے۔ چند شعر دیکھئے:

عطائے خاص ہے یہ شرحِ آرزو بھی تری — ثنا بھی تیری ہے لفظوں کی آبرو بھی تری
ترا نشانہ ہے فتح و شکست پر غالب — مری پناہ بھی تیری، صفِ عدو بھی تری
بکھرتے پھول بھی تیرے، چٹکتی کلیاں بھی — خزاں بھی تیری، بہار شگفتہ رو بھی تری
شفق سے سرخ ثمردار باغ بھی تیرے — یہ کشتِ زارِ تمنائے زرد رو بھی تری
یہ غم بھی دین ہے تیری یہ چارۂ غم بھی — کہ چاکِ دل بھی ہنرمندیِ رفو بھی تری

پریم کمار نظر کی حمد ''آج کل'' اگست ۱۹۸۶ء میں چھپی:

کتاب بھی ہے تری حاشئے بھی تیرے ہیں — ہیں منطقیں بھی تری فلسفے بھی تیرے ہیں
جہانِ وجد بھی تیرا جہانِ حیرت بھی — ہیں صورتیں بھی تری آئینے بھی تیرے ہیں
ہر امتحان سے اب تو ہی سرخرو کرنا — مثلثیں بھی تری زاویئے بھی تیرے ہیں
ترے ہی ہاتھ میں ہے موسموں کی گردش بھی — ثمر بھی تیرے ہیں اور ذائقے بھی تیرے ہیں
طناب خیمہ بھی تُو ہے سراغ دشت بھی تو — ہیں منزلیں بھی تری قافلے بھی تیرے ہیں
سوالِ وصل بھی تو ہے جواب ہجر بھی تُو — چناب بھی ہیں ترے اور گھڑے بھی تیرے ہیں
ہے فرد جرم بھی تو، مدعی بھی منصف بھی — عدالتیں بھی تری، فیصلے بھی تیرے ہیں

مناظر عاشق ہرگانوی کی حمد ۱۹۸۸ء کے کئی رسائل میں شائع ہوئی۔ ملاحظہ کریں:

یہ کائنات یہ رنگِ بہار تیرا ہے — فلک کا روپ زمیں کا نکھار تیرا ہے
صبا میں رقص، گلوں میں خمار تیرا ہے — چمن چمن شجر نغمہ بار تیرا ہے
سرودِ ہستی دوراں پہ تیری شیرینی — ندی کا گیت، رم جوئبار تیرا ہے
مقامِ شوق و مسافت کا مدعا تو ہے — یہ راہ تیری ہے یہ رہ گزار تیرا ہے
مری غزل، مرا نغمہ، مری نوا تو ہے — مرے وجود کا یہ لالہ زار تیرا ہے
مرے خدا دلِ عاشق کو آئینہ کردے — یہ فکر، یہ سخنِ شعلہ بار تیرا ہے

رئیس الدین رئیس کی حمد ''دائرے'' کراچی کے اکتوبر ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں شائع ہوئی:

ہر اک لفظ ترا ہے، ورق بھی تیرا ہے — زبان و لب بھی ترے ہیں سبق بھی تیرا ہے
خوشی بھی تیری ہے، رنج و قلق بھی تیرا ہے — غموں سے ہوگیا سینہ جو شق بھی تیرا ہے
طلوعِ مہر کا منظر بھی تیری صناعی — غروب شام بھی، رنگِ شفق بھی تیرا ہے
یہ میرے بازو بھی تیرے ہیں، محنتیں بھی تری — جبیں بھی تیری، جبیں پہ عرق بھی تیرا ہے
ترے خیال سے ابہام بھی بنے الہام — کہ تو علیم ہے لفظ ادق بھی تیرا ہے
غریب شہر کو لکھ دے رئیس دین بھی تو — کہ ہر گناہ کو بخشے یہ حق بھی تیرا ہے

شمس بدایونی کی حمد اگست ۱۹۸۹ء کی ہے۔ ان ہی دنوں ''کوہسار'' میں اشاعت کے لئے میرے پاس آئی تھی:

یہ دھوپ بھی یہ کرم کا سحاب بھی تیرا — زمیں بھی تیری یہ خانہ خراب بھی تیرا
شہوں کے نور اجالوں کی تیرگی کی قسم — بلائے جان ہے یہ آفتاب بھی تیرا
ہیں تیری دین، یہ تشکیک کے اندھیرے بھی — متاعِ علم و ہنر کا سحاب بھی تیرا
مرے شعور کے سرکش خیال بھی تیرے — مری نگاہ کا مبہم سا خواب بھی تیرا
میں تیرا عکس ہوں گر تو ہے کل تو جزو ہوں میں — ہے میری ذات میں یہ التہاب بھی تیرا
یہ آگہی ترے علم و خبر کا صدقہ ہے — کہ شہر علم بھی اور اس کا باب بھی تیرا

تیری بلا سے اگر ٹوٹ کر بکھر بھی گیا	ہوائے تیز بھی تیری حباب بھی تیرا
یہ کائنات غبارِ ازل سہی لیکن	بشر کے نام ہے یہ انتساب بھی تیرا
ہنوز سادہ ورق کیوں ہیں ذہن و فکر بشر	کتاب بھی تری درسِ کتاب بھی تیرا
قدم قدم پہ عناں گیر ضابطے تیرے	نفس نفس میں مروج نصاب بھی تیرا

مظہر امام کی حمد دیرپا اور دور رس اثرات کی حامل ہے۔ اور اس کی بازگشت جدید ترین نسل کے کلام میں بھی سنائی دینے لگی ہے۔ مظہر امام کی حمد کا مطلع ایک بار اور دیکھئے:

ترا ہی بحر، سفینہ رواں بھی تیرا ہے	بھنور بھی تیرے ہیں اور بادباں بھی تیرا ہے

نئی نسل کی نمائندہ شاعرہ عذرا پروین کی غزل کا یہ مطلع ملاحظہ کیجئے:

مری تباہی نہ میری اپنی، نہ ڈوبنے کے جواز تیرے	کہ بحر تیرے بھنور بھی تیرے، جو ڈوبے وہ سب جہاز تیرے

اظہار و بیان، لب و لہجہ اور اسلوب و آہنگ کی اس مماثلت کو کیا نام دیا جائے!

میں نے مظہر امام کی ہمہ گیریت کے اعتراف کے لئے اس کینوس پر روشنی ڈالی ہے۔ موازنہ اور تقابلی مطالعہ میرا مقصد نہیں ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ بدگمانیاں اور مایوسیاں سامنے آئیں۔ مظہر امام نے اردو شاعری کو نیا لب و لہجہ، نیا آہنگ اور نئی کیفیت اور فضا سے روشناس کرایا ہے۔ معمولی سی بات کو غیر معمولی اور محدود کو لامحدود دبنا دینے کا فن انہیں خوب معلوم ہے۔ ان کے الفاظ سے امکانات کی وسعتوں اور گہرائیوں کی بشارتیں ملتی ہیں اور آفاقی سچائیوں سے مملو غور و فکر اور خیال کے ارتقاع کی برگزیدگی کا سورج روشن ہوتا ہے!!۔

....

پروفیسر خالد حسین خاں (میرٹھ)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے ناول ''شبنمی لمس کے بعد'' کے ایک پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر خالد حسین خاں لکھتے ہیں:

''شبنمی لمس کے بعد'' کے مطالعہ سے راقم تحریر کو یقین کامل ہے کہ ہر عالم و عامی، ناقد و قاری ہی نہیں زاہد اپنا ایمان، عابد اپنا پیان، واعظ اپنا بیان، ادیب و شاعر اپنا فرمان نیز حافظ اپنا قرآن اور سیاست دان اپنا رجحان، سادھو سنت اپنا گیان و دھیان تج کر مجامعت کی گنگا میں غوطے لگانے پر بے محابا، بے جھجک اور بے دھڑک مجبور ہوگا۔ 'شبنمی لمس کے بعد' کے بنظر غائر مطالعے اور تجزیاتی جائزے سے راقم کا ایمان تازہ، دل و دماغ میں ہیجان برپا اور نفس سرکشی و سرشاری پر بے طرح آمادہ اور جوش و جنوں، افلاطونی عشق کے خواب و خیال نیز شہوانی وصال کی طلسماتی فضا میں مائل بہ پرواز ہو گئے۔ آپ کا کرشاتی قلم اور جناتی ذہن کیسی کیسی دلفریب دور کی کوڑیاں ڈھونڈ لاتا ہے، سمجھ سے پرے ہے! یہ ناول بھیجے کر باسی کڑھی میں ابال کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ ''قوت باہ'' کا اتنا تیر بہ ہدف نسخہ ایجاد کر کے آپ نے قدیم باتصویر کوک شاستر کے علاوہ ''خاندانی دواخانہ، ہاشمی دواخانہ، بڑے حکیم صاحب کا دواخانہ اور ان جیسے بہت سے عیار حکیموں، ویدوں کی روزی روٹی کے لئے خطرہ پیدا کردیا ہے۔''

اختر جاوید (ہوڑہ)

مظہر امام کی یاد میں

(محترم ادیب و شاعر مظہر امام کا تعلق کلکتہ اور نواح سے بہت پرانا ہے۔ کلکتہ اُن کا دوسرا گھر رہا ہے جب تک وہ یہاں رہے ہمیشہ "بزم غواص" کی نشستوں میں پرویز شاہدی اور سالک لکھنوی کے ساتھ بزم مذکور کو رونق بخشتے رہے۔ میں ۱۹۵۳ء میں کلکتہ کے ایک معروف ترین اسکول جبلی انسٹی ٹیوشن کا طالب علم تھا۔ وہ اُس وقت سی ایم او ہائی اسکول میں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر تھے اور پرویز شاہدی ہیڈ ماسٹر تھے، اُس وقت سے میں اُن کو نہایت قریب سے جانتا ہوں۔ نہایت وضع دار آدمی تھے۔ میں جب جاتا تھا تو نہایت محبت سے بٹھاتے تھے۔ میں اُن کے تعلق سے کئی باتیں جو نہایت اہم ہیں اور جن سے اُن کے مزاج کی عکاسی ہوتی ہے۔ کئی بار یہاں کی ادبی مجلسوں میں کہہ چکا ہوں جو اُن کی شخصیت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اُن کا اٹھ جانا دنیائے اردو کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے مگر ایسا ہی ہوتا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اُن کے لئے زندگی جینے کی چیز تھی اور جب تک رہے ایک نظم وضبط کے ساتھ رہے اور زندگی کو رُسوا نہ ہونے دیا۔ ایسے لوگ خال خال ملتے ہیں۔ بہر حال حق مغفرت کرے بڑا آزاد مرد تھا۔ اب ان کی یادیں اور اُن کی تحریریں رہ گئی ہیں جو ہماری آنکھوں کے لئے مثل سرمہ ہیں۔

.........اختر جاوید، کولکاتا ۲۹ رفروری ۲۰۱۲ء)

لکھتے لکھتے داستانِ عشق مظہر سو گئے
ڈھونڈتی ہے ہر نظر آخر کہاں وہ کھو گئے
وہ امامِ لشکری ذی شان تھے مظہر امام
جاتے جاتے تخمِ الفت کشتِ دل میں بو گئے

......

یہ آنکھ نم ہوئی تو کیا، جہاں ہے غم سے سوگوار
غزل، رباعی، نظم سب ہیں اس کے غم سے بیقرار
امام تھا ادب کا وہ جو اُٹھ گیا جہان سے
ہزار دل فسردہ ہیں، ہزار آنکھ اشکبار

......

امام جنبشِ نوکِ قلم ہے اشک فشاں
ترے فراق میں ہر آنکھ بھی ہے جوئے رواں
یہ بوجھ اتنا گراں بار تو کبھی بھی نہ تھا
تمہارے بعد اے مظہر یہ زندگی ہے گراں

......

تری کتاب غزل عہد ساز ہے مظہر
سطر سطر تری نغمہ طراز ہے مظہر
ہر ایک مصرعہ طہارت نصیب ہے اے امام
تمہاری فکر میں طورِ نماز ہے مظہر

......

وہ حرف و لفظ سے بزمِ ادب سجاتے تھے
اندھیری رات میں قندیل وہ جلاتے تھے
ادب کی راہ میں گم گشتۂ سفر تو نہ تھے
وہ خضر بن کے کئی راستے دکھاتے تھے

وہ حسنِ شعر کمالاتِ فاریابی تک ۔۔۔ کہ اُن کی فکر تو آئی تھی باریابی تک
کہاں کسی سے کبھی ہار ماننے والے ۔۔۔ کہ اُن کا لہجہ تو آیا تھا بو ترابی تک

......

ہر ایک شعر میں اک شانِ مظہریت ہے ۔۔۔ وہ شعر کہتے ہیں اس میں بھی اک مشیت ہے
جہانِ شعر میں شانِ قلندری اُن کی ۔۔۔ اُنہیں تو رومیؔ و سعدیؔ سے ایک بیعت ہے

......

وہ لفظ لفظ سے غزلوں کا تن سجاتے تھے ۔۔۔ وہ دل سجاتے تھے جاویدؔ من سجاتے تھے
وہ کوہساروں میں تزئینِ گُل بھی کرتے تھے ۔۔۔ ہمارے گھر میں بھی گنگ و جمن سجاتے تھے

......

وہ ایک شانِ قلندر وہ خواجگیؒ امام ۔۔۔ وہ ایک مظہرِ ذیشان شاعرِ فرجام
امام شیشہ گری میں کمال رکھتے تھے ۔۔۔ وہ حرف حرف بناتے رہے کئی اصنام

......

یہ کس نے چھین لیا آج شاعری کا دماغ ۔۔۔ یہ کیسے ٹوٹ گیا آج آزری کا ایاغ
اُجالے روتے ہیں اب منھ چھپا کے اے مظہر ۔۔۔ یہ جلتے جلتے بجھا کیسے ساحری کا چراغ

......

تیری غزلوں میں اے مظہر خوشبوئے شیراز ہے ۔۔۔ تیری نظموں میں اے مظہر زندگی کا ساز ہے
تو نہیں تو کیا ہوا، تحریر زندہ ہے تری ۔۔۔ پہلے جو آواز آئی تھی، وہی آواز ہے

......

یہ جسم تیرا خاک ہے پیوست خاک ہے ۔۔۔ یہ جسم کچھ نہیں ہے تری روح پاک ہے
دانست میں تو تم نے کیے تھے رفو بہت ۔۔۔ اب بھی قبائے زیست بہت چاک چاک ہے

......

وہ سنگ و خشت میں آثار زندگی کی نمود ۔۔۔ کبھی نہ آیا کہیں فکر میں کہیں سے جمود
ہر ایک شخص سے وہ دوستی نبھا کے گئے ۔۔۔ کہ اُن کی قبر پہ جاؤ، پڑھو سلام و درود

......

زمانہ موت پہ مظہر امام ششدر ہے ۔۔۔ جو تم نے لکھا وہی زندگی کا دفتر ہے
تمہارے شعر زمیں سے ہیں آسمان تلک ۔۔۔ تمہاری فکر تو طائر کا کوئی شہ پر ہے

......

ہر ایک صنفِ ادب کے امام بھی تھے وہی ۔۔۔ ہر ایک شعر میں جاویدؔ ایک دیدہ وری
نہ اب امام، امامت، نہ صف، نہ شورِ اذاں ۔۔۔ کہیں صدا نہ کوئی شور ایک بے خبری

......

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد

مظہر امام: ایک آواز جو ہمیشہ سنائی دے گی

اردو شعر و ادب میں بہت کم لوگ اتنے خوش نصیب ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے شعری و ادبی افکار سے ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہو اور نقش ہائے دوام چھوڑے ہوں۔ ان ہی خوش بختوں میں ایک نام جناب مظہر امام کا ہے جنہیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور آنکھیں اشکبار ہوئی جاتی ہیں۔ اگر صرف بہار ہی کو لے لیا جائے تو بھی بلا کسی جھجھک یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاد اور جمیل مظہری کے بعد مظہر امام ہی وہ فنکار ہیں جنہوں نے برصغیر میں اپنے ادبی نقوش ثبت کئے۔

مظہر امام نے ادب کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔ وہ جب تک رہے ادبی عبادت میں مشغول رہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح عبادت انسان کو نیک، پاک اور طاہر بنا کر رکھتی ہے اسی طرح مظہر امام نے ہر موقع پر، اپنے ادبی سفر کے ہر لمحے میں ادبی طہارت کا خیال رکھا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص جو اپنے پیشے میں بھی اونچے عہدے پر فائز رہا ہو، جس نے دفتری ذمہ داریاں بھی نہایت خوش اسلوبی اور ایمان داری سے نبھائی ہوں، وہ میدان شعر و ادب میں بھی اتنے اونچے مقام پر پہنچ گیا۔ سوچئے تو حیرت معلوم ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے ادب کو کبھی بازیچہ اطفال نہیں سمجھا بلکہ مجاہدہ سمجھا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ بغیر محنت اور عرق ریزی کے آدمی اپنی منزل نہیں پا سکتا۔

مظہر امام کا ادبی سفر اس وقت شروع ہوا جب وہ صرف تیرہ چودہ سال کے تھے۔ اسی کم عمری میں انہوں نے ایک نئی صنف ''آزاد غزل'' کا بھی تجربہ کیا اور اس کے موجد کہلائے۔ آزاد غزل کو کامیابی ملی یا ناکامیابی یہ ایک الگ سوال ہے۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ اس معتوب صنف سخن کو بھی آگے بڑھانے میں تقریباً ڈھائی سو شعراء نے حصہ لیا۔ ان میں کچھ ایسے نامور شعراء بھی ہیں جو اردو شعر و ادب کی آبرو کہے جاتے ہیں۔

اپنے ادبی سفر کے آغاز میں مظہر امام نے افسانے بھی لکھے۔ ان کے دو تین افسانے کچھ رسالوں میں شائع بھی ہوئے ہیں جن میں ''مضراب'' کراچی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ ناقد کی حیثیت سے بھی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی تنقیدی بصیرت کی داد ان کے بزرگ اور ہم عصر ناقدین دے چکے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ایک اچھا شاعر ہی ہوسکتا ہے جس کی نظر انتقاد بھی بڑی عمیق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی زبان کے بیشتر شعراء مثلاً ورڈس ورتھ، کالرج، ملٹن، شیلی بڑے شاعر ہی نہیں بڑے نثر نگار بھی تھے۔

مظہر امام کے تبصرے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تبصروں پر مشتمل ان کی کتاب ''نگاہ طائرانہ'' منزلت کی حامل ہے۔ اس میں وہ تبصرے بھی شامل ہیں جو انہوں نے تقریباً پچاس سال قبل اپنے چھوٹے بھائی سید منظر امام کی ادارت میں نکلنے والے سہ ماہی جریدہ ''رفتارِ نو'' (پہلی آزاد غزل اسی میں اشاعت پذیر ہوئی تھی) میں شائع ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بھی ان تبصروں کی کافی پذیرائی ہوئی تھی۔ کئی اہم ناقدین و مبصرین نے ان تبصروں کے سلسلے میں مدیر ''رفتارِ نو'' کو خط لکھے تھے۔ ایسے کم لوگ ہوتے ہیں جو ادب کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ مظہر امام

ان میں ایک تھے جو ریاضت، محنت، جاں فشانی ادب کے سلسلے میں انہوں نے کی ہے، کم ہی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اس پُل صراط کو عبور کیا ہو۔

مظہر امام نے نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی۔ دونوں صنف میں انہوں نے کمال کے جوہر دکھائے۔ اگرچہ غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظمیں کم ہیں لیکن ان کی بعض نظموں کو بلاشبہ اردو کی بہترین جدید نظموں میں شمار کیا جائے گا۔ ''اکھڑتے خیموں کا درد''، ''رشتہ گونگے سفر کا''، ''شعاع فردا کے راز دانو''، ''اشتراک'' ایسی نظمیں ہیں جو ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کی شاعری کے متعلق کہا ہے کہ:

''مظہر امام کو اپنے لہجے کی انفرادیت ثابت کرنے کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ حیات و کائنات سے ان کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ ان کا تصور کسی روایتی فکر سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔''

آل احمد سرور کیا خیال ہے:

''مظہر امام ہمارے ان ممتاز شعراء میں سے ہیں جن کے یہاں میلانات اور فنی حیثیت کی عکاسی کے ساتھ اپنی ساری ادبی روایت کا عرفان بھی ملتا ہے۔''

مشہور ناقد احتشام حسین نے آج سے پچاس سال قبل ان کے سلسلے میں یہ باتیں رقم کی تھیں:

''مظہر امام نے اشاریت اور سپاٹ اظہار کے درمیان ایک راستہ نکالا ہے جو نہ تو ابہام کی طرف جاتا ہے نہ فرسودگی کی جانب بلکہ تازگی اور تنوع کا احساس دلاتا ہے۔ ایسی بات ان کے موضوعات کے انتخاب کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔''

عصر حاضر کے معروف ناقد اور دانشور گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ:

''اردو شاعری میں مظہر امام ایک مقتدر اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے پوری زندگی ادبی دشت کی سیاحی میں گزار دی ہے۔ نثر نگاری کے میدان میں بھی وہ اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کے بعض تنقیدی مضامین خاصے بحث انگیز ثابت ہوئے ہیں۔''

ان کی کتاب ''آتی جاتی لہریں'' پر کئی دانشوروں نے اپنی آرا اس طرح ظاہر کی ہیں:

''بہت دنوں بعد اردو میں تنقیدی مضامین کا ایسا ہلکا پھلکا مجموعہ شائع ہوا ہے جسے مزے لے لے کر پڑھا جاسکتا ہے۔'' (ڈاکٹر محمد حسن)

وارث علوی کی رائے ہے:

''لطف آتا ہے ایسی تنقیدیں پڑھنے میں جو مسائل اٹھاتی ہیں۔ کتاب کی یہی خوبی کیا کم ہے کہ وہ تجسس اور اکساہٹ پیدا کرتی ہیں۔ آپ جارگون (Jargon) سے بچ گئے ہیں یہ ایک بڑی چیز ہے۔ زبان بھی ایسی لکھتے ہیں کہ فوراً محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص کو کچھ کہنا ہے اپنی زبان میں۔ ایسے لوگوں کی باتیں سننے میں مزہ آتا ہے۔''

مشہور فنکار وارث کرمانی نے ان کی کتاب ''تنقید نما'' پر ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

''آپ نے 'تنقید نما' نام رکھ کر خاکساری کی ہے۔ 'تنقید نما' ہزاروں تنقیدی کتابوں سے بہتر ہے۔
ہاں اس معنی میں یہ عنوان صحیح ہے کہ اسے پڑھ کر لوگ تنقید لکھنا سیکھ جائیں گے۔''

اردو کے مشہور ناقد اور شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی ان الفاظ سے مظہر امام کی پذیرائی کی ہے:

''مظہر امام ان معدودے چند شعراء میں سے ہیں جنہیں اپنا ہم عصر اور ہم سفر سمجھنے میں مجھے ہمیشہ مسرت ہوتی ہے۔ ان کے شعری مزاج کے بارے میں جب بھی میں نے سوچا ہے مجھے اس دریا کا خیال آیا ہے جو میدانوں میں بہتا ہے اور اس کی چال میں سکون اور گمبھیرتا ہوتی ہے۔ ان کے یہاں تیز روشنی اور تیز رنگوں کی چونکا دینے والی شاعری نہیں ہے۔ ان کے کلام میں ایک سلونا پن ملتا ہے جو زمین سے قربت اور اپنائیت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ میرے دیکھتے دیکھتے کتنے نوجوان شاعر طوفان کی طرح آئے لیکن ان کی آوازیں بہت جلد فضا میں کھو گئیں۔ مظہر امام نے آہستہ آہستہ اپنی آواز کا جادو جگایا، مجھے یقین ہے کہ ان کا فن دیرپا ثابت ہوگا۔''

جمیل مظہری کا خیال ہے:

''اگر چہ جدت پسندی اور ترقی پسندی دونوں تحریکوں کے معنوی اثرات توازن اور اعتدال کے ساتھ کسی ایسی جگہ جمع ہیں وہ مظہر امام کا فن اور مظہر امام کی شاعری ہے۔ یہی ان کی فنی خصوصیت ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز کرتی ہے۔''

کوئی بھی مشہور ناقد یا شاعر ایسا نہیں ہے کہ جس نے مظہر امام کی شاعری اور نثر کو توصیفی نگاہ سے نہ دیکھا ہو۔ مظہر امام ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ ایک ایسی آواز جس نے نہ صرف اپنے زمانے بلکہ اپنے بعد آنے والی نسلوں پر بھی نقش دوام ثبت کئے ہیں۔

....

● ملت کالونی، واسع پور، دھنباد (جھارکھنڈ) موبائل: 09934113066

● سید عبدالرحیم مرحوم موضع بلیا، ضلع دربھنگہ کی چھوٹی بیٹی، سابق سرپنچ علی نگر (دربھنگہ) جناب غلام زین العابدین کی بہو، سید متین اشرف (بی بی پاکر، دربھنگہ) کی چھوٹی ہمشیرہ اور سلیم صبیح فاروقی (عزمو) کی اہلیہ فرحانہ کا طویل علالت کے بعد صفدر جنگ اسپتال، نئی دہلی میں ۸/ اگست ۲۰۱۸ کو ۳/ بجے شب ہوگیا۔ جسد خاکی بذریعہ ایمبولینس علی نگر لایا گیا جہاں ۹/ اگست کو ۳/ بجے شب ان کی تکفین آبائی قبرستان (علی نگر) میں عمل میں آئی۔

....

● کٹیہار میڈیکل کالج کے بانی احمد اشفاق کریم (رکن راجیہ سبھا) کی اہلیہ محترمہ نزہت نسرین کا انتقال ۲۹/ مارچ ۲۰۱۹ء کو دہلی میں ہوگیا جہاں وہ بغرضِ علاج گئی تھیں۔ اسی روز ان کا جسد خاکی پٹنہ لایا گیا۔ دوسرے روز ۳۰/ مارچ ۱۰/ بجے دن پٹنہ حج بھون میں جنازہ کی نماز ہوئی اور ایئرپورٹ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحومہ نیک سیرت، مخیر اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوار رحمت میں جگہ عنایت کرے۔ پسماندگان میں شوہر کے علاوہ ۲/ بیٹے اور ۲/ بیٹیاں ہیں۔

سید احمد شمیم

یہ نہ ہونا تھا پھر کیسے ہوا؟

(سید منظر امام کے حوالے سے)

حقیقتاً جسے دوستی کہتے ہیں دو افراد کے درمیان ایسے تعلقات پر محیط ہوتی ہے جسے کسی تیسرے سے بیان کوئی کرنا بھی چاہے تو کر نہیں سکتا ہے اور جو دوست ہوتے ہیں قریب تر ہونے کے باوجود اکثر بے صوت و صدا گفتگو کرتے ہیں۔ دل کے حالات کا غیر کو اس سے کیا واسطہ۔

۱۹۴۶ء کے فسادات کے بعد جب میرا گاؤں شاہو بیگھہ ضلع گیا، جہان آباد اجڑا تو ہمارے والد مرحوم سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری اپنے خاندان کو لے کر دربھنگہ چلے گئے جہاں وہ راج ہائی اسکول میں مدرس تھے۔ اسی ۴۶ء میں میرے بڑے بھائی منظر شہاب مرحوم کا عقد امیر منزل کی بیٹی مہر النساء سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ اپنی نئی نویلی بھابی کو دیکھنے کے لئے امیر منزل پہنچے اور وہیں میری پہلی ملاقات سید منظر امام سے ہوئی اور یہی پہلی ملاقات ہماری دوستی کی ابتدا ہے۔ پھر تو ایسا ہوا کہ میرے زیادہ تر اوقات امیر منزل میں ہی بسر ہونے لگے۔ منظر امام اپنے لڑکپن میں بھی نہایت شائستہ، بھولے بھالے ہوا کرتے تھے۔ یہ شائستگی، نفاست تمام عمر اس کے ساتھ رہی۔

کچھ ہی دنوں کے بعد میرا اور منظر امام کا داخلہ ایک ہی کلاس میں حسن امام درد مرحوم نے راج ہائی اسکول میں کروا دیا۔ یقیناً یہ بات ان کے اور میرے والد کے مابین مشورے سے ہی ہوئی ہوگی لیکن داخلے کے دن میرے والد سامنے نہیں آئے۔ داخلہ ہو گیا تو پڑھائی کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اس سے دوستی اور بھی مستحکم ہوئی کیونکہ ہم لوگ ایک ساتھ Combined مطالعہ کے شوق میں گرفتار ہو گئے۔

منظر امام اپنے لڑکپن میں انتہائی Introvert تھے۔ اسکول میں بھی کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ رہنا، کھیل کے اوقات میں بھی وہ سبھوں کے ساتھ کھیل نہیں سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں اسکول کے ایک کنارے میں کھیلتے رہتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ کئی تجربے سامنے آئے۔ غالباً ساتویں آٹھویں کلاس ہی میں شعر و ادب سے بھی آشنائی ہوئی اور کیسے نہ ہوتی جبکہ ہر دو ہفتے اور مہینے کے عرصے میں امیر منزل میں ترقی پسند مصنفین کی نشستیں ہوا کرتی تھیں اور ہم دونوں کو شعر و ادب سے یا ترقی پسند تحریک سے جوڑنے کے خیال سے انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی۔ دو تین برسوں میں ہی انجمن ترقی پسند مصنفین لگ بھگ ہم لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی کیونکہ مظہر امام دربھنگہ چھوڑ کر کلکتہ جا چکے تھے اور منظر شہاب پٹنہ اور جمشید پور۔ پٹنہ تعلیمی سلسلے سے اور جمشید پور ملازمت کے تعلق سے جا چکے تھے۔ یہ واقعہ ہم دونوں کے لئے بہت مستحسن ہوا اور ادب اور ترقی پسند ادب سے آشنائی نے بڑی حد تک ہماری آنکھوں کو کشادہ بنا دیا تھا۔

منظر امام اسی زمانے میں لکھنے لگے تھے۔ میری تحریر ان کے مقابلے میں بہت کمزور ہوتی تھی لیکن جب جمشید پور آیا تو ایک نئے آفاق سے واسطہ پڑا اور یہاں منظر امام نہیں تھے۔ منظر امام فطری طور پر ایک فنکار تھے۔ ان کو ادب

اور صحافت دونوں سے دلچسپی تھی۔ شاعری کرتے تھے اور افسانے بھی لکھتے تھے اور پٹنہ ہی سے اپنی طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے 'رفتارِ نو' جاری کیا تھا۔

سچی دوستی کی پہچان یہ بھی ہے کہ دنیا قربتیں اور بڑھا دیتی ہے۔ انہوں نے 'رفتارِ نو' کی ادارت میں مجھے بھی شامل کیا۔ اس دوران میری چیزیں بھی نثر اور نظم میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ سہیل، صبح نو، شاعر، پگڈنڈی اور دیگر کئی رسائل سے میرے تعلقات مضبوط ہوتے گئے۔ ایک عرصے کے بعد منظر امام بھی جمشید پور ہی آگئے، پھر دوست کا ملنا جلنا شروع ہوگیا۔ مگر میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے لکھنے کی رفتار بہت دھیمی ہوگئی ہے۔ جمشید پور سے انہوں نے 'ترسیل' کی اشاعت کی جس کی مدیرہ شاہینہ امام تھیں اور ترتیب دینے والوں میں منظر امام اور یہ ناچیز تھا۔ کچھ دنوں کے بعد منظر امام دھنباد چلے گئے اور گرونانک کالج جوائن کرلیا۔ ایک بات عرض کروں کہ گرونانک کالج کے شعبۂ اردو کیلئے جب اشتہار شائع ہوا تو میں نے بھی درخواست دی تب منظر امام رُک گئے۔ جب وہاں انٹرویو ہونے لگا تو میں پہلی بار رجھریا گیا اور ٹھہرنے کا انتظام ہوا نامور افسانہ نگار غیاث احمد گدی کے یہاں۔ میرا اسلیکشن ہو بھی چکا تھا لیکن مقطع میں سخن گسترانہ بات آگئی۔ دوسری بار جب گرونانک کالج سے اشتہار شائع ہوا تو منظر امام گئے، میں نہیں گیا۔ منظر امام کے دھنباد میں رہ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھنباد میرے لئے گھر آنگن ہوگیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا کہ منظر امام نے سہ ماہی 'وقت' کا اجرا کیا اور اس کی ادارت میں بھی میں ان کے ساتھ ساتھ رہا۔

بیان کروں تو میری اور منظر امام کی داستان بہت لمبی ہوجائے گی۔ ہوا یہ کہ مجھے غیر ارادی طور پر مظہر امام اور پھر منظر کاظمی پر خاکے لکھنے پڑے۔ منظر کاظمی پر خاکہ اس کی کتاب 'لکشمن ریکھا' کے تعلق سے لکھا گیا اور بہار اردو اکاڈمی نے ایک شام مظہر امام کے ساتھ برپا کی تو مجھ سے کہا گیا کہ تم مظہر امام کی شخصیت پر مضمون لے کر آؤ۔ اس طرح دوسرا خاکہ بھی لکھا گیا۔ میرے دونوں ہی خاکے اتنے پسند کئے گئے کہ منظر امام کو کیا سوجھی کہ اس نے مجھ سے اس پر لڑنا شروع کیا کہ تم مجھ پر بھی خاکہ لکھو۔ میں اس سے گریز کررہا تھا کہ ہمارے درمیان کچھ ایسے واقعات بھی ہیں جنہیں لکھنا مناسب نہیں تھا۔ مگر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو ہی جاتا ہے۔ پھر یوں ہوا کہ منظر امام جمشید پور آئے اور اپنے ہمراہ زبردستی مجھے دھنباد لیتے گئے۔ پھر وہی کہ خاکہ لکھو نہیں تو سالے تمہیں جمشید پور جانے نہیں دیں گے۔ یہ واسع پور ہے۔ میں واسع پور (ادبی گینگ) سے ڈر گیا۔ اور ایک دن رات کے ۹ بجے وہ خاکہ لکھنا شروع کیا اور تقریباً ۴ بجے خاکہ مکمل ہوگیا۔ پھر سوگیا۔ صبح کو منظر امام نے اٹھایا۔ میں نے خاکہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ تو وہ چونکے اور خوش بھی ہوئے، مسرور بھی ہوئے، کہیں کہیں تھم بھی گئے پھر اسی خاکے کو شاہینہ پروین نے پڑھا۔ میں نے محسوس کیا کہ شاہینہ پروین کے چہرے پر کچھ سایہ سا آگیا ہے۔ دوسرے دن جب میں وہاں سے چلنے لگا تو میں نے وہ خاکہ منظر امام کے ہاتھ میں تھما دیا۔ منظر امام نے کہا ''میں کیا کروں گا۔'' میں نے کہا ''تم اس کو پڑھو گے، غور سے پڑھو گے۔ جہاں چاہو قلم زد کردینا، جہاں چاہو اپنی طرف سے لکھ دینا۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔ حساب دوستاں دردل برابر۔'' یہ خاکہ میری کتاب ''بند آنکھوں کا تماشا'' میں ''من تو شدم تو من شدی'' کے عنوان سے شامل ہے۔ تین مہینے کے بعد وہ خاکہ میرے پاس واپس آیا جس میں جگہ جگہ منظر امام نے قلم زد کیا تھا۔ ایک آدھ سطر بڑھا بھی دیا تھا لیکن جب

کتاب شائع ہوئی تو پھر وہ ہنگامہ ہوا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ در پردہ منظر امام کے اشارے پر ہی ہوا ہے۔ لیکن میں نہ کل اسے مانتا تھا نہ آج مانتا ہوں۔ اس درمیان ہم دونوں ایک دوسرے سے پہلے ہی کی طرح ملتے رہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے درمیان کچھ ٹوٹ سا گیا ہے۔ عین ممکن ہے یہ احساس، صرف احساس ہو حقیقی نہ ہو کیونکہ کچھ دنوں کے بعد جب ''شہپر'' نے مجھے ایوارڈ دیا تو منظر امام نے کہا کہ تم، تمہاری بیوی اور تمہارے ساتھ جو بھی ہوں گے عزیز جو بظاہر ہے میرے بھی عزیز ہوں گے، میرے یہاں ٹھہریں گے اور یہی ہوا۔ ہنگامے کی رات گذر گئی۔ یہاں ایک چیز اور بتا تا چلوں کہ میں دھنباد جب بھی جاتا تھا میں اور منظر امام ایک ہی بیڈ پر رت جگا کرتے تھے۔ میں نے ایک بار کہا بھی کہ ''شاہینہ تم اٹھ کر کہاں چلی۔'' اس نے مسکرا کر کہا کہ ''مجھے خبر ہے کہ آپ دونوں ایک ساتھ رہیں گے۔''

سیّد منظر امام نے ''بے در و دیوار پر'' لکھتے ہوئے ایک خوبصورت جملہ لکھا تھا: ''وہ بے در و دیوار کی وجہ سے میری ذات کے در و دیوار کے اندر ہے میں جب کبھی اس سے ملنا چاہتا ہوں، اس سے ہم کلام ہونا چاہتا ہوں'' بے در و دیوار'' اٹھا لیتا ہوں۔ شاہینہ امام اس پر اکثر جملے اچھالا کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں'' تم نہیں جانتی ہو شمیم جو میرے لئے ہے کوئی دوسرا نہیں ہے۔''

ڈاکٹر حسن نظامی کی کتاب کی رسم اجرا پر جب میں، اسلم بدر، علی حسین اور انکے چھوٹے داماد کے ساتھ عزیزی حسن نظامی کے یہاں ہم لوگوں کا قیام ہوا۔ شام میں جب جلسہ ہوا تو منظر امام اپنے داماد ڈاکٹر امام اعظم کے ساتھ جلسے میں آئے۔ جلسے کے بعد منظر امام میں مجھے ایک گوشے میں لے گئے اور کہا کہ کل واپسی کے وقت ناشتہ میرے یہاں سے کر کے جاؤ گے۔ میں نے حامی بھی بھر لی۔ دن میں میں اور اسلم بدر کے علاوہ جو بھی ہیں منظر امام اور شاہینہ کیلئے بالکل انجانے ہیں۔ سویرے سویرے اس کے یہاں خواہ مخواہ شاہینہ کو زحمت دینا ہے چنانچہ میں جمشید پور کیلئے روانہ ہو گیا اور راستے سے منظر امام کو فون کر دیا' پھر جو اس پر تپاک چڑھا اگر میں روبرو ہوتا تو نہ جانے وہ کیا کرتا'

ابھی ابھی بقرعید سے کوئی دو تین دن قبل اس کا اچانک فون آیا'' سدن (اہلیہ سید احمد شمیم) کو بقرعید ہمارے ساتھ کرنی ہے'' لیکن مجبوریاں ایسی تھیں کہ میں ٹال گیا اور اب سوچتا ہوں کہ مجھ سے بڑی بھول ہوئی، بھول نہیں بلکہ بڑا ظلم ہوا۔ اللہ کے یہاں کیا جواب دوں گا کہ آخر وقت میں میں منظر امام کے پاس رہ بھی نہیں سکا۔ اللہ اسے مغفرت کرے۔ اس کا اخلاق، اس کی محبتیں، اس کی جاں نثاریاں ایسی ہیں کہ مرنے کے بعد وہ میرے اور قریب ہو گیا ہے۔ اور میں، وہ نہیں ہے پھر بھی خود کو اس کے سامنے مجرم محسوس کرتا ہوں۔

میرے لئے میرے بارے میں اب کون ہے جو ایسا سوچے۔ دراصل من تو شدم ...... میرے اس احساس کی ترسیل ہے جب منظر امام نے رشتہ توڑ لیا، مجھے چھوڑ کر تنہا چلا گیا تو لگتا ہے کہ میرا بچپن میرا ہے نہ میری جوانی، نہ میرا بڑھاپا۔ ان تینوں ادوار کا واحد استعارہ وہی تھا جواب نہیں رہا۔

....

● بیت الشرف، نزد جے کے ایس کالج، پارڈیہہ، پوسٹ کپالی، مانگو، جمشید پور-832110 (جھارکھنڈ)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

سید منظر امام کا تخلیقی عمل

سید منظر امام بنیادی طور پر افسانہ نگار اور صحافی تھے۔ انہوں نے کثرت میں وحدت کا سراغ لگایا تھا اور خیال اور مقصد کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا تھا۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں بھی انہوں نے وقت نکال کر مطالعہ کو شعار بنایا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ علمی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی کاوشوں کی وجہ سے ان کی زندگی فعال تھی اور ان کے وجود کی تاریخ ہمیشہ روشن رہی اور مربوط اور مسلسل خدوخال نمایاں کرنے کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہی۔ اس طرح اکتساب کی صورت سامنے آتی رہی اور وہ آشنا نا آشنا مفہوم تک پہنچنے کی کوشش میں لگے رہے۔ وسیلے کو مؤثر بناتے رہے اور نئے تیشے کے راستے پر گامزن رہے۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ کو انہوں نے جس فنکارانہ نظر سے دیکھا پرکھا تھا اس کی جستجو کی حقیقی شناخت کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

''آنکھیں کیا کچھ نہیں دیکھتیں۔ دشت وصحرا بھی اور گل و گلزار بھی۔ لو دیتے چراغوں کا اجالا بھی اور بجھتے ہوئے دیئے کا دھواں بھی۔ زندگی ذاتی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔ کبھی حدِ نگاہ تک کانٹے ہی کانٹے، سراب ہی سراب، پیاس ہی پیاس، کبھی پیروں کے نیچے بھیگی ہوئی گھاس کا دبیز لمس، کسی درخت کی مہربان چھاؤں، آواز دیتا ہوا کوئی رنگ، سانس لیتی ہوئی کوئی خوشبو۔ سو یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ سارے نظاروں میں اپنا تو بس وہی ہے جو دو پلکوں کے درمیان بسیرا کرلے۔''

(یہ سرگذشت ہی ہے)

خیالات اور رجحانات باہر آنا چاہتے ہیں تو ٹوٹتی بکھرتی زندگی کا نظارہ اسی طرح کیا جا سکتا ہے جس طرح منظر امام نے بیان کیا ہے۔ نت نئے تجربے اور نئی لہر کی حرمت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس دسترس کے لئے احساس اور ضرورت تک رسائی ضروری ہے۔

منظر امام نے جب کہانیاں لکھیں تب وہ کالج کے طالب علم تھے۔ اس زمانہ میں عام طور پر ادبی شعور نا پختہ ہوتا ہے لیکن منظر امام کی کہانیاں مثبت اور منفی انداز میں جذباتی لہروں کے ساتھ مل کر ایک مخصوص اسلوب تک لے جاتی ہیں۔ اس طرح تخلیق میں ان کی موجودگی غیر متعلق نہیں رہتی۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فساد عام بات ہے۔ منظر امام نے جمشید پور کے فرقہ وارانہ فساد پر لکھتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس اس طرح کرایا ہے:

''گیارہ اپریل ۱۹۷۹ء۔ رام نومی کا موقع تھا۔ ہم دھنباد میں تھے کہ جمشید پور میں دوسرا خونی فساد برپا ہوا۔ اس قسم کی غارت گری اکثر مذہب کے نام پر ہوتی ہے۔ مذہب جس کا دوسرا نام انسانیت ہے، محبت ہے، پیار اور اخوت ہے۔ فون تک سے ہماری بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ بس کی آمد و رفت بند تھی۔ ان دنوں جمشید پور کے لئے کوئی ڈائرکٹ ٹرین بھی نہیں تھی۔ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ یہی اطلاع ملتی رہی کہ یہ سن ۱۹۶۴ء سے بھی بڑا فرقہ وارانہ فساد ہے۔ شاہینہ کی بے چینی، بے قراری، قابل دید تھی۔ اس نے کھانا پینا ترک کر رکھا تھا۔ ہر وقت آنکھیں اشکبار رہتیں اور روح مضطرب۔

میری باجی، برادر نسبتی، بچے، شمیم سب وہاں تھے۔ لیکن ان کی رہائشیں ایسے علاقہ میں تھیں جہاں
ایک ہی مذہب کے افراد کثیر تعداد میں موجود تھے اس لئے ان کی طرف سے قدرے اطمینان تھا۔"

سید منظر امام کی تصریح اور تشریح کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ وہ جس تاریخی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں اس کا سرا سیاست سے جڑا ہوا ہے۔ سید منظر امام ادیب تھے اور ان کے خاندان کے لوگ فساد کی آگ میں گھرے ہوئے تھے۔ ایسے میں ان کی حساس طبیعت جبر، ظلم، بربریت اور خیر اور انسانیت کے حالات کے زیر اثر تھی۔ خارجی مظاہر پر اپنے داخلی ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے وہ آگے بتاتے ہیں:

"پانچ چھ دن گذر گئے اور ہمیں وہاں کے حالات کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ ۱۸/اپریل کو کالج میں مسٹر ستیش ورما کا، جو میرے خسر محترم کے پڑوسی تھے، فون ملا کہ احمد صاحب (سید معین الدین احمد۔ شاہینہ کے والد۔ ٹسکو میں ملازم) کرفیو کے دوران گھر سے باہر نکلے تھے لہذا انہیں پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ ان کی فیملی کو میں اپنے کوارٹر میں لے آیا ہوں۔ آپ فوراً آجایئے — اسی رات ہم آسنسول ہوتے ہوئے جمشید پور کے لئے روانہ ہو گئے۔ ٹرین گیارہ بجے دن میں وہاں پہنچی۔ پلیٹ فارم پر اترتے ہی ایک عجیب سی ویرانی اور سناٹگی کا احساس ہوا۔ آٹو رکشہ سے ہم چناب روڈ پہنچے۔ سامنے ہی مسز ورما کا کوارٹر تھا۔ اتنے برس بیت جانے کے بعد بھی اس وقت کے سارے مناظر میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ امی اور بچیوں کی آہ و فغاں، ان کا ستا ہوا چہرہ، آنکھوں میں ریگستان جیسی ویرانیاں اور ان سب کے ساتھ شاہینہ کا دھاڑیں مار کر رونا۔ کرب و بلا کا منظر میرے قریب تھا — یہ محسوس کرتے ہوئے دیر نہیں لگی کہ پایہ ڈھہ گیا ہے، ستون گر گیا ہے اور عمارت منہدم ہو چکی ہے۔" (یہ سرگذشت ہی ہے)

سید منظر امام کے اظہار کی یہ پینٹنگ نہیں ہے۔ بلکہ نثری تحریر میں سیاسی ماحول کی واضح تصویر ہے جس میں تاثیریت (Impressionism) اور اظہاریت (Expressionism) کی تکنیک ہے۔ سیاسی حالات میں شامل داخلی کیفیت کا اظہار ہے جس میں درد، کرب، خشک آنسو اور بہت کچھ ہے کہ جمہوری نظام میں جبر و استبداد کا منظر نامہ ایسا بھی ہے۔ ان کی اسی تحریر سے یہ اقتباس بھی دیکھئے:

"یہ محسوس کرتے ہوئے دیر نہیں لگی کہ سید معین الدین احمد اپنی بیوی اور تین نا کتخدا بیٹیوں کو چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ بے کفن، بے سہارا، بغیر چار کاندھوں کے۔ نہ قبر بنی، نہ کسی نے مٹی ڈالی اور نہ دعاؤں کیلئے ہاتھ اٹھے۔ سن ۱۹۶۴ء کے فساد میں ان کا پورا اثاثہ لٹ گیا تھا۔ رہائش نذر آتش کر دی گئی تھی۔ چھت نہیں تھی، لیکن بیوی کا سہاگ اور لڑکیوں کے لئے شجر سایہ دار موجود تھا۔ اس بار کی خوں ریزی نے سایہ دار شجر کو جڑ سے اکھاڑ دیا تھا۔"

میرے خیال میں سیاست کی ایک تعریف یہ ہے کہ جس میں خلوص نہ ہو بلکہ صرف ظاہری یا کاغذی ہمدردی ہو۔ آج کی سیاست یا شاید صدیوں سے ایسی ہے کہ مفاد اور مقصد کے لئے کمزور یا اقلیت پر ظلم و جبر کیا جائے۔ اس کی ایک صورت فرقہ وارانہ فساد بھی ہے۔ یہ دراصل حکمت عملی ہے۔ موقع شناسی ہے۔ جوڑ توڑ کی راجنیتی ہے جس کی زد میں سید منظر امام کے سسرالی رشتہ دار ہی نہیں آئے بلکہ زکی انور جیسے افسانہ نگار اور ناول نویس بھی بھینٹ چڑھ گئے۔ اپنی

سرگذشت میں منظر امام نے زکی انور کو بھی اپنی بساط کے ذریعہ سیاست کے منفی معنی کے ذریعہ واضح روپ دیا ہے:

''مجھ پر دوسری قیامت ٹوٹی جب یہ المناک اطلاع ملی کہ زکی بھائی بھی شہید کر دیئے گئے۔ وہی زکی انور جنہوں نے پانچ سو سے زیادہ افسانے لکھے، دو درجن ناول تحریر کیے جو انتہائی روادار اور قوم پرست تھے۔ سیکولرزم پر ایقان رکھتے تھے۔ فرقہ پرستی اور نسل پرستی کے مخالف اور ترقی پسند رجحانات کے حامی تھے۔ انہیں زکی انور کو بے دردی اور بے رحمی سے قتل کر کے اندھے کنویں میں ڈال دیا گیا۔ زندگی کو حسن اور اعتبار بخشنے والے زکی بھائی ہم سے جدا کر دیئے گئے۔ میں غم کے ملبے میں دبا جا رہا تھا۔ پورا وجود زلزلے کی طرح لرز رہا تھا، کانپ رہا تھا۔ ابھی جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں مجھے منظر شہاب کی نظم 'ماتم زکی انور' یاد آ رہی ہے جو اس سانحہ کے بعد لکھی گئی تھی:

وہ سر بریدہ تھا اس کا قصور اتنا تھا | اندھیری رات میں مشعل وہ لے کے نکلا تھا
سنا ہے چاروں طرف خنجروں کی بارش تھی | نہ جانے دشتِ ستم سے وہ کیسے گذرا تھا
تمام حلقۂ گردن پہ منجمد تھا لہو | گلے سے سرخ گلوبند جیسے لپٹا تھا
بدن پہ زخم کے نقش و نگار تھے ایسے | پڑوسیوں نے محبت سے جن کو کاڑھا تھا
اداس چاند کی چھاؤں میں یار ساتھ رہے | وہ آفتاب کی آندھی میں برگِ تنہا تھا
بکھر گیا تھا وجود اس کا کانچ کی مانند | وہ ٹوٹ کر بھی اکائی میں اپنی زندہ تھا
بس اتنی بات تھی جس پر خفا تھا زاہد کہ وہ | کلس کے سنکھ میں گنبد کا لحن بھرتا تھا!''

جیسا کہ ہم جانتے ہیں تخلیقی سطح کی گونج موضوعات کی گہرائی میں اترتی ہے اور ذہن کے ساتھ دل کو متاثر کرتی ہے۔ معاشرہ کے تقاضوں کی تفہیم کے بیچ نارسائی کا احساس اس لئے بھی ہوتا ہے کہ بنیادی مسئلہ تہذیب سے پیوستگی کا ہے اور معاشرت کے ساتھ وجود کی سلامتی کے ساتھ جڑتا ہے۔ افسانہ ہو یا دیگر تحریر سید منظر امام کے یہاں چابک دستی کی تصویر ملتی ہے۔ رجائیت پسندی کے عناصر بھی واضح طور پر اظہار پاتے ہیں اور واقعاتی تناظر میں جو دبکتی آگ چھپی ہوئی ہے اس سے شکست خواب کی صورت واضح ہوتی ہے۔ ایک مثال دیکھئے:

''اکتوبر سن ۶۰ء۔ اقبال ہوسٹل، پٹنہ کا کمرہ نمبر ۲۸۔ وہیں مغنی صاحب (پروفیسر عبدالمغنی) سے میرا پہلا تعارف ہوا تھا۔ عبدالوہاب صاحب (وہاب اشرفی) نے کروایا تھا جو VI year English کے اسٹوڈنٹ تھے۔ چند ماہ قبل پٹنہ کالج میں بھی رہے۔ آنرز (اردو) میں میرا داخلہ ہوا تھا۔ اقبال ہوسٹل میں نیا نیا آیا تھا۔ میری ادارت میں سہ ماہی ''رفتارِ نو'' اسی سال نکلنا شروع ہوا تھا۔ دو شمارے آ چکے تھے اور کافی پسند کیے گئے تھے۔ ''یہ سید منظر امام ہیں۔ رفتارِ نو نکالتے ہیں۔ بی اے کا پہلا سال ہے۔'' یہ وہاب کے الفاظ تھے۔ ''اچھا آپ ہی منظر امام ہیں۔ مظہر امام صاحب کے بھائی ہیں آپ؟ رسالہ میں نے 'کتاب منزل' (پٹنہ میں اردو کتابوں کی مشہور دکان) میں دیکھا ہے۔ اچھے لوگ لکھ رہے ہیں۔'' اس پہلی ملاقات نے مجھ پر کیا اثر ڈالا اس کا اظہار میرے لئے بہت مشکل تھا۔''

(دربھنگہ: دل سے جاتی ہی نہیں یاد تری)

سید منظر امام کی تحریریں تخلیقی عمل کی ٹھوس صورت رکھتی ہیں، اور اسلوب کے بے ساختہ لب ولہجہ سے وہ مزاج و منہاج کا تعین کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تخلیق کاری کو ۲۱ رویں صدی کا پیکر عطا کرنے میں کامیاب ہیں۔

سید منظر امام اپنی فلم بینی کا ذکر کرتے ہوئے مظہر امام کی ایک عادت کو بھی بیان کرتے ہیں:

''فلموں کی عادت بھی مجھے بھیا (مظہر امام) سے ملی۔ خود وہ بہت فلمیں دیکھتے تھے۔ ان کے پاس ایک مجلد کاپی تھی۔ فلم دیکھ کر آتے تو اس کاپی میں فلم کا نام، فلم ساز و ہدایت کار کا نام، یہاں تک کہ Film Certification کی تاریخ بھی درج کرتے اور آخر میں اپنے ریمارکس جو اس طرح ہوتے:

Good, Very Good, Superb, Average, Rotten

ان میں Superb اور Rotten کے معنی میں نے ڈکشنری دیکھ کر معلوم کئے تھے۔ مجھے یا گھر کے کسی عزیز کو فلم دیکھنے کی قطعی ممانعت تھی۔ جب تک وہ دربھنگہ رہے۔ میں نے جو بھی فلمیں دیکھیں ان سے چھپ چھپا کر۔ کبھی پکڑا گیا، مار کھائی۔ ایسا بھی ہوا کہ یخ بستہ سردی میں باہر کرسی پر بیٹھ کر پوری رات گذارنی پڑی۔ مگر بری عادتیں آسانی سے کہاں جاتی ہیں؟''

(دربھنگہ: دل سے جاتی ہی نہیں یاد تری دوسری قسط)

تہذیب کے لامتناہی سفر میں منظر امام نے اپنی پہچان پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے نیا وژن خلق ہوتا ہے اور فکر و خیال کو حیاتی کیفیت ملتی ہے۔ ساتھ ہی تلازمیت کی گداز یت بصیرت افروز بنتی ہے:

''ہمیں بھی یہی تعلیم دی جاتی تھی کہ کسی کو چھوٹا نہ سمجھو، حقیر نہ جانو، بڑوں کے ساتھ محبت سے پیش آؤ۔ بزرگوں کا دیا ہوا یہ درس آج بھی میرے لئے شمع ہدایت ہے۔ میں نے کبھی کسی سائل کو بھی تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ یہاں مجھے ایک بات یاد آرہی ہے۔ بہت چھوٹا تھا میں، یہی دس گیارہ سال کا۔ منجھلے بھیا (مظہر امام) کے ساتھ رکشے پر ڈاکٹر کے یہاں جا رہا تھا۔ اس زمانے میں بیشتر گھروں میں سروس لیٹرن ہوا کرتا تھا۔ مہترانیاں روز آکر غلاظت صاف کرتیں اور پھر وہ غلاظت میونسپلٹی کی گاڑی جسے بم پولس کہا جاتا تھا اٹھا کر لے جاتی۔ اتفاق سے اسی وقت وہ گاڑی آتی دکھائی دی۔ میں نے ناک پر رومال رکھ لیا۔ گاڑی گذر گئی۔ بھیا بولے (ان کے لہجے سے غصہ جھلک رہا تھا) ''کیا تم اتنی دیر سانس نہیں روک سکتے تھے کہ ناک پر رومال رکھ لیا۔ جو اس گاڑی کو چلا رہا تھا وہ بھی تو انسان ہے......'' آج تک ان کے یہ الفاظ میرے اندر زندہ ہیں۔'' (دربھنگہ: دل سے جاتی ہی نہیں یاد تری۔ پانچویں قسط)

سید منظر امام نے بہت کم لکھا لیکن جو لکھا اس میں یکسوئی اور ایک خاص فضا ہے۔ ان کی سوانح کا جو حصہ یادداشت بن کر جستہ جستہ ''تمثیل نو'' میں قسط وار چھپا اس میں داخلی جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ ندرت اور اچھوتا پن کے عناصر بھی خلوص کی سچائیوں کے ساتھ نفسیات کی گرہ کشائی کرتے ہیں۔ الفاظ کا برمحل استعمال اور ان کی بلند آہنگی سحر انگیز فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہیں۔ جس سے رسائی کی حد امکان تک پہنچنا ان کی دسترس کے مظہر ہیں۔ فکر و احساس کا رچاؤ اور منطقی سوچ افہام و تفہیم کی گذرگاہ ضرور بنتے ہیں جس سے ان کی انفرادیت معنوی سطح پر مختلف جہت کے در وا کرتی ہے۔

● کوہسار، بھیکن پور-۳، بھاگل پور-۸۱۲۰۰۱ (بہار)

انجم عثمانی

پروفیسر سید منظر امام: ایک تاثر

پروفیسر سید منظر امام (فاطمہ ہاؤس، واسع پور، دھنباد) کے انتقال پُر ملال سے مجھے بے حد دکھ ہوا۔ انکا سانحہ ارتحال میرے نزدیک ایک دوست، ایک بھائی، مشیر اور دھنباد شہر میں اردو کا چراغ روشن رکھنے والی شخصیت کا دارفانی سے رخصت ہو جانا ہے:

تمام رات اندھیرے سے جنگ کرتا رہا　　　چراغ ہو گیا گل روشنی سلامت ہے

اللہ ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے اور مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت بخشے۔ آمین!

میرے ساتھ مرحوم کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ مجموعہ کلام ''احساس آئینہ'' اور ''دل کے آنگن میں'' کی اشاعتیں ان کے مفید مشوروں کی مرہون منت ہیں۔ سہ ماہی ''وقت'' دھنباد کی اشاعت کے دوران میں سخت بیمار تھا اور ویلور (چنئی) میں زیر علاج تھا۔ اللہ کے فضل سے جب مرض میں افاقہ ہوا اور میں آفیشل کوارٹر سے ریٹائر ہو کر واسع پور اپنے مکان میں آگیا تو سب سے پہلے پروفیسر سید منظر امام سے ملنے ان کے دولت خانہ پر گیا۔ دیکھتے ہی وہ خوش ہو گئے اور ''وقت'' کے لئے غزل کی فرمائش کی۔ میں نے غزل کہہ کر حوالے کر دی اور اگلے شمارے میں شائع بھی ہو گئی۔ سہ ماہی ''وقت'' میں میری اور رونق شہری کی غزلیں ایک ساتھ شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر امام اعظم کے رسالہ سہ ماہی ''تمثیل نو'' دربھنگہ کا مجھ سے تعارف سیّد منظر امام کے توسط سے ہی ہوا۔ مرحوم نے تاثرات اور تخلیقات ارسال کرنے کی تاکید کی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ پروفیسر سید منظر امام کا سب سے اہم کارنامہ دھنباد ضلع میں ادبی سرگرمیوں کو تحریک دے کر ایک نیا ماحول پیدا کرنا ہے۔ ''مرکزِ ادب'' واسع پور، دھنباد جس کے وہ صدر تھے، دھنباد کی منجملہ ادبی فضا کو اس قدر گرم کر دیا جس کا اثر آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دھنباد کول فیلڈ کی سنگلاخ سرزمین مردم ناشناسی کے لئے جانی جاتی ہے مگر پروفیسر سید منظر امام کے سانحہ ارتحال کا یہ فیض ہے کہ ادارہ ''رجحانِ ادب'' جھریا کی جانب سے ایک یادگار ادبی مجلّہ ''یادِ رفتگاں'' شائع کیا گیا ہے۔ جس میں دھنباد کے ان شعرا و ادباء کے احوال و کوائف پیش کئے گئے ہیں جن کا انتقال ہو چکا ہے۔

پروفیسر سید منظر امام کے تعلق سے لکھا گیا سید احمد شمیم کا مضمون بے حد اہم ہے۔ بچپن سے لے کر وقتِ آخر تک کے حالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کے مضمون میں سیّد منظر امام کی ادبی صلاحیتوں اور علمی بصیرت کے حوالے سے ان کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ کولکاتا کے نوجوان شاعر احمد معراج نے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''سیّد منظر امام: شخصیت اور ادبی کارگزاریاں'' لکھ کر ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ سے مارچ ۲۰۱۹ء میں سند حاصل کی ہے۔ اس مجلّہ کی دستاویزی حیثیت ہے اور آئندہ ریسرچ کرنے والوں کے لئے ایک ریفرنس کے طور پر کام آئے گا۔ اس مجلّہ میں شامل نظم اور مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں جن میں آمر صدیقی، الیاس حمد گدی، غیاث احمد گدی، سید ابوالقاسم وغیرہ پر تحریر کئے گئے مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ ''تمثیل نو'' کا شمارہ

جولائی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء موصول ہوا مگر میں اپنی علالت کی وجہ سے تاثرات تحریر نہ کر سکا۔ کمزوری زیادہ رہتی ہے۔ مرض میں اللہ کے فضل سے افاقہ ہوا ہے۔ دعا کریں جلد صحت یاب ہو جاؤں۔ مرحوم پروفیسر سیّد منظر امام پر ایک تعزیتی نظم پیشِ خدمت ہے:

رونق سی جس کے دم سے تھی گلشنِ ادب میں — وہ بلبلِ چمن تھے منظر امام صاحب
یاد آئیں گی نشستیں وہ ''مرکزِ ادب'' کی — جب صدرِ انجمن تھے منظر امام صاحب
تنقید اور صحافت پر دسترس تھا یکساں — اک شمعِ علم و فن تھے منظر امام صاحب
اک شخصیت میں پنہاں کیا کیا نہ خوبیاں تھیں — خود میں اک انجمن تھے منظر امام صاحب
ویران ہوگئی ہے اہلِ ادب کی محفل — ہیں اشکبار آنکھیں، مغموم ہے ہر اک دل

● نیو کالونی، واسع پور، دھنباد- 826001 (جھارکھنڈ)

جناب مظہر امام کا مکتوب اپنے چھوٹے بھائی پروفیسر سید منظر امام کے نام

دہلی: ۷ر دسمبر ۲۰۰۵ء

برادرِ عزیز: دعائیں،

یہ پوسٹ کارڈ تمہیں خط لکھنے کے ارادے سے ہی پتہ لکھ کر رکھا تھا۔ دراصل میں نے آج دو رسالے تمہارے نام ری ڈائرکٹ کئے ہیں۔ شاید تمہارے دیکھے ہوئے ہوں یا تمہاری دلچسپی کے نہ ہوں۔ چند روز پہلے عبدالرحمٰن سے فون پر بات ہو رہی تھی تو معلوم ہوا کہ دھنباد میں کوئی رسالہ اسٹال پر نہیں آتا۔ کوئی براہ راست خریدار ہو تو دوسری بات ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا رسالہ ہو جو میرے پاس نہ آتا ہو۔ کبھی اتفاقاً کوئی لے جاتا ہے۔ کسی کسی کو ری ڈائرکٹ بھی کر دیتا ہوں، اگر ریپر ٹھیک ہو۔ لہٰذا سوچا ہے کہ ایسے کچھ پرچے تمہیں ری ڈائرکٹ کر دوں، تاکہ تم عبدالرحمٰن کے حوالے کر دو۔

آج دوپہر میں 'تمثیل نو' آیا تو تمہاری تحریر پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ دوراں سے شکایت میں غیر معمولی دردمندی ہے۔ یہ تمہاری تحریر کا اعجاز ہے۔ مجاہدالاسلام مرحوم کا ذکر پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور ان سے متعلقہ حصے کو تمہاری بھابھی کو سناتے وقت میری آواز گلوگیر ہو گئی۔ ایسی نثر آج کل نہیں لکھی جارہی ہے۔ کاش تم نے باقاعدگی سے نثر لکھی ہوتی۔ دعا ہے کہ یہ یادداشت یا خودنوشت جلد مکمل ہو جائے۔ تم نے خود ہی یاد دلایا تھا کہ 'جھنک جھنک پایل باجے' فلم کے بارے میں میں نے کہا تھا: "It is a poem on Celluloid" یہ تمہاری اس تحریر میں نہیں ہے۔ تم نے کلکتہ کے جس سفر کا ذکر کیا ہے اُس وقت محمود ایوبی وہاں نہیں پہنچے تھے۔ وہ میرے کلکتہ چھوڑنے کے بعد وہاں آئے۔ امید ہے تم لوگ مع الخیر ہو گے۔ تمہاری بھابھی انشاء اللہ ۱۶ر دسمبر ۲۰۰۵ء کو حج کے لئے روانہ ہوں گی۔ شابینہ کو دعائیں!

تمہارا: مظہر امام

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد

سیّد منظر امام: کچھ یادیں، کچھ باتیں

کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن پر کچھ لکھنا دشوار ہی نہیں ناممکن سا لگتا ہے اور اگر اس شخصیت کی حیثیت استاد کی بھی ہو، یقین جانئے اس وقت جب میں پروفیسر منظر امام کے بارے میں کچھ لکھنا چاہ رہا ہوں تو میرا قلم کانپ رہا ہے اور ایک عجیب کیفیت میں مبتلا ہوں۔ منظر امام کی شخصیت کی اتنی پرتیں ہیں کہ ان کی تہہ تک پہنچنا کسی بھی انسان کے لئے ممکن ہی نہیں ناممکن ہے اور میرا تعلق تو ان سے استاد اور شاگرد کا ہے۔ یہ رشتہ ایسا ہے کہ جس کا احترام ہر حال میں لازم ہو جاتا ہے۔

سن ۱۹۸۱ء کی بات ہے۔ میں نے انٹرمیڈیٹ آرٹس میں داخلہ لیا تھا۔ کلاس روم میں بیٹھا ٹیچر کا انتظار کر رہا تھا تبھی ایک چوڑی پیشانی والے شخص کی آمد ہوئی اس سے قبل کہ ہم لوگ سلام کرنے کے لئے ہاتھ اٹھاتے انہوں نے خود ہی سلام کیا اور ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا، خود ہی اپنا تعارف کرایا اور ہمارے نام سے بھی واقف ہوئے اس وقت معلوم ہوا کہ ان کا نام سید منظر امام ہے ایک پل کے لئے احساس ہوا کہ واقعی امام ہیں یا صرف نام کے (گستاخی معاف) اس دن انہوں نے Syllabus کے متعلق جانکاری دی اور شعر و ادب پر مختصر سی گفتگو کی اور چلے گئے لیکن ہم تمام طلباء کو باور کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ آدمی باصلاحیت ہیں اور فن تدریس سے پوری طرح واقف بھی۔ اس کے بعد Classes ہوتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ ہمارے رشتے بھی مضبوط تر ہوتے گئے۔ اس وقت دھنباد میں پروفیسر شمیم احمد خان (سابق لکچرار پی کے رائے میموریل کالج دھنباد) زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ ایک تو وہ اس شہر میں قبل سے تھے اور Tuition بھی جم کر کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر لڑکیوں کے، پھر ایسا ہوا کہ پروفیسر منظر امام آہستہ آہستہ شہرت کی سیڑھیوں پر چڑھتے چلے گئے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا ادبی ذوق بے حد ستھرا اور مطالعہ کافی وسیع تھا، ان کی رہائش گاہ پر شعر و ادب کی بساطیں بچھنے لگیں۔ ان کے آنے کے بعد ہی مرکز ادب کا قیام ہوا، جس کی نشستیں پابندی سے ان ہی کی قیام گاہ پر ہوا کرتی تھیں، جہاں دھنباد اور جھریا کے تقریباً سبھی شعراء و ادباء شریک ہوتے تھے۔ ان میں غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

سیّد منظر امام کو شروع ہی سے ادبی ماحول ملا تھا اور ان کی پرورش و پرداخت ہی شعری فضا میں ہوئی تھی۔ ان کے دونوں بڑے بھائی حسن امام درد اور مظہر امام شعر و ادب کی دنیا میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ بعد میں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں جناب مظہر امام نے اردو شعر و ادب میں عالمی جگہ بنائی۔ سید منظر امام کو بچپن ہی سے کتابیں، رسائل و جرائد دیکھنے کے مواقع ملے۔ اس زمانے کے تمام معروف جریدے ان کے یہاں آیا کرتے تھے۔ "ہمایوں"، "نقوش"، "سویرا"، "ادب لطیف"، "شاہراہ"، "شاعر"، "نیا دور" ان سبھی پرچوں سے انہیں استفادے کا موقع ملا۔ حالانکہ اس وقت وہ اسکول کے طالب علم تھے۔ میٹرک تک آتے آتے انہوں نے کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی کے افسانے اور فیض احمد فیض، ن۔ م۔ راشد، ساحر لدھیانوی، مجروح

سلطان پوری، سردار جعفری، کیفی اعظمی، اختر الایمان وغیرہم کی تخلیقات کا مطالعہ کرلیا تھا۔ان کی حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی ادبی دلچسپی کو دیکھ کران کے بھائی مظہرامام ہمیشہ تنبیہ کیا کرتے۔ان کا کہنا تھا کہ پہلے درسی کتابوں پر توجہ دینا چاہئے۔شعروادب کے لئے پوری زندگی پڑی ہے۔منظرامام خود کہتے ہیں کہ آج وہ جو کچھ بھی ہیں اس میں ان کی والدہ کے علاوہ ان کے بڑے بھائیوں کا بھی ہاتھ ہے۔اس سلسلے میں وہ اپنے برادر نسبتی جناب منظر شہاب کا بھی ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ان کو کسی لائق بنانے میں اہم حصہ لیا ہے۔

سیّد منظرامام نے شاعری بھی کی ہے،افسانے بھی لکھے ہیں اور کچھ مضامین بھی اُن کے رشحات قلم کا نتیجہ بن چکے ہیں۔ان کا شعری اثاثہ بہت ہی کم ہے۔لیکن جو بھی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ان کی بڑی خصوصیت زبان کی صفائی اور محاورات کا فنکارانہ استعمال ہے۔الفاظ اور تراکیب کی بندش سے شعروں میں حسن پیدا کردیتے ہیں،سادگی پر کیف خیال اور رعنائیت ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ان کی ایک بے حد خوبصورت نظم ''درد خوشبوؤں کا'' ملاحظہ کیجئے:

محبت تو لمحوں کی پیلی چٹانوں / کے نیچے / دبی ہے / تو میں سوچتا ہوں / اٹیچی / جو خاموش کمرے / کے تاریک گوشے میں / رکھی ہوئی ہے / کہیں پھینک آؤں / کہ اس میں / ہزاروں ہی الفاظ کی خوشبوئیں / سو رہی ہیں / جنہیں اب / جگانے کا حاصل / نہیں ہے!

ایک اور نظم ''گمشدگی'' کی یہ سطریں دیکھئے:

کئی بار / سنسان خاموش راتوں میں / سوچا ہے میں نے / کہ ترکِ وفا ہی میں ہے مصلحت اب / سرابوں کے پیچھے / یوں ہی بھاگنے کا صلہ کچھ نہیں ہے / کہ تم / بہتی موجوں کی صورت / میری آرزوؤں کے ساحل کو چھوکر / کسی اور وادی کو سیراب کرنے چلی جاؤ گی / اور میں / اپنی یادوں کے تپتے ہوئے / ریگ زاروں میں تنہا کھڑا / سوچتا ہی رہوں گا / تمہیں ایک سپنے کی مانند پاکر / مجھے بھی خبر کچھ نہیں ہے / کہ کیا کھودیا تھا / تمہیں آج کھو کر میں یہ سوچتا ہوں / کہ کیا پالیا ہے......!

وہ خود کہتے ہیں کہ شاعری انہوں نے صرف منھ کا مزہ بدلنے کے لئے کی ہے۔انہوں نے شعرگوئی کی طرف جم کر توجہ نہیں کی ورنہ یقیناً وہ شاعری میں بھی اپنے لئے ایک مخصوص جگہ بنالیتے۔ان کی غزل کے یہ اشعار دیکھئے:

جب تک ترا خیال شریک سفر نہ تھا ــــ رستے میں تیز دھوپ تھی کوئی شجر نہ تھا
کٹ جاتی یوں تو زندگی ترے بغیر بھی ــــ اک آگ سرد سرد تھی اس میں شرر نہ تھا
جب تک جئے مسیح کئی تھے مرے قریب ــــ مرنے لگے تو پاس کوئی چارہ گر نہ تھا
کھڑکی سے کتنے چہرے سڑک تاکتے رہے ــــ کوئی قتیلِ چشم سرِ رہ گزر نہ تھا
رسوائیوں کی آنچ نے کندن بنا دیا ــــ منظر امام ترا جنوں معتبر نہ تھا

ان کے کلام میں حسن زبان بھی ہے اور فکر و خیال کی رعنائی بھی۔ساتھ ہی ساتھ تجربے کی ندرت،جدید لب و لہجہ،احساسات کی تازہ کاری اور نیا آہنگ بھی ہے۔آپ کی شخصیت استادِفن کی سی ہے جس پر اردو زبان و ادب

خصوصاً جھارکھنڈ کے اردوداں کو ناز ہے۔ یہی نہیں آپ کے فکر و فن پر مضامین اور تبصرے لکھے گئے۔ آپ زندگی سے فرار کو کفر سمجھتے ہیں جن کا اعتراف آپ کے ہم عصروں نے کیا ہے۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں مخصوص الفاظ کے استعمال اور فقرہ ظرافت سے سنجیدگی پیدا کر دیتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ گفتگو کی زبان کو ادبی پیرایہ دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ آپ کے نزدیک فکر و علم کی ایک وسیع منزل ہے جس کی طرف خود بھی گامزن ہیں اور دوسروں کو بھی راہ دکھا رہے ہیں۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ: ''انسان کے اندر کا فنکار انسانی عصر کی لکیروں کا قیدی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے وجود میں ڈوب کر خود کو سمجھاتا ہے اور سمجھنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ان لمحات کا شعور زندہ کر لینا چاہتا ہے۔ حقیقتوں کے درمیان سے گزر کر اور پھر ان حقیقتوں کے قلب میں جو حقیقت نظر آتی ہے اسے اپنے اندر جذب کر کے اپنے طور پر پیش کرتا ہے۔'' سید منظر امام کے یہاں ایسی ہی حقیقت نگاری کی جھلک ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ ''جلتے چراغ، بجھتے چراغ''، ''نئی زندگی''، ''گیت بے کیف ہے جب تک نہ اسے ساز ملے''، ''کچھ یادیں کچھ آنسو''، ''اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو''، ''انسان زندہ ہے'' ان کے کامیاب افسانے ہیں۔

یہ سطریں ملاحظہ ہوں:

''تم صبح کی سہانی ہوا ہو! تم طلوع سحر کی چمک ہو۔ تم وجدان کا سرچشمہ ہو، تمہارا دل بہار کی خوشبوؤں میں بسا ہوا خوبصورت پھول ہے۔ تمہاری آواز سن کر میرے دل کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں اور ہونٹوں سے نغمہ برسنے لگتا ہے۔''

پھر یہ سطریں:

''سامنے رکھی الارم گھڑی میں دو بجنے والے تھے۔ وہ اٹھی، دروازہ کھولا اور باہر سڑک پر آگئی۔ ویران محلہ بالکل ویران تھا، چاندنی دودھ میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی تھی شاید، پونم کی رات تھی۔ لڑکی کے قدم لڑکے کے مکان کی طرف اٹھنے لگے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ لڑکا باہر صحن میں سوتا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی۔ اتنی قریب کہ اس کے گرم گرم سانسوں کی تپش کو محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے ہمت سے کام لیا اور اپنے دہکتے ہوئے کنوارے ہونٹ لڑکے کے خشک ہونٹوں سے پیوست کر دیئے۔''

منظر امام اپنے مخصوص شاداب اور نشاطیہ لہجے، فنی رچاؤ اور صحت مند تصور عشق اور انسانی احساس و نفسیات کے تجزیہ سے اپنے افسانوں میں جس طرح ہمہ گیری اور آفاقیت پیدا کر دیتے ہیں وہ ان کے افسانوں کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ اپنے الفاظ میں ایسے خیالات کا اظہار کرنے میں انہیں قدرت حاصل ہے۔ ان کی فکری جہت روشن اور قابل رشک ہے۔ وہ شاعر کم افسانہ نگار زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے مضمون ''تری تحریر سے خوشبو پھوٹے'' میں ان کے افسانوں کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ''منظر امام کے اندر شعر گوئی کی بے پناہ قوت موجود تھی۔ فن پر بھی دسترس تھی۔ لیکن طبیعت شاعری سے افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوگئی۔ شاید اس کی وجہ یہ

رہی ہو کہ جب منجھلے بھائی مظہر امام حصول روزگار کے لئے کلکتہ چلے گئے تو ان کی لائبریری سے استفادہ کی کھلی آزادی مل گئی اور وہ افسانوی ادب کے سحر میں ڈوب گئے اور اس طرح افسانہ لکھنے کی تحریک ملی...''۔ان کا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ انہوں نے صرف افسانہ نگاری میں دلچسپی لی ہوتی تو وہ آج یقیناً ایک معتبر افسانہ نگار ہوتے۔ سید منظر امام ایک فرض شناس مدرس بھی تھے جنہوں نے شاگردوں پر علم وعرفان کے موتی ہی نہیں لٹائے بلکہ ان کے اندر خود اعتمادی کا جوہر بھی بھرا ہے۔ان کے شاگردوں میں لڑکیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے انہوں نے ہمیشہ نیک اور پاکیزہ خیالات کی تشہیر کی اور یہی آرزو رکھی کہ ان کے شاگرد علم وادب کی اچھی واقفیت حاصل کر سکیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کے یہاں علم کے جویاؤں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

سیّد منظر امام کی تحریر بہت شگفتہ ہے۔آپ کا اخلاق اور طرز گفتگو ایسا دلکش ہے کہ جو بھی ایک مرتبہ آپ سے ملاقات کرتا ہے آپ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔تقریر بھی اچھی فرماتے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر منفرد لب ولہجہ رکھنے والے ایک ادیب اور خلیق انسان ہیں۔ان کی خودنوشت 'یہ سرگذشت ہی ہے'' جس کی ۱۰ اقساط معروف فنکار ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ کی زینت بن چکی ہیں۔ارباب فکروفن سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں اور لوگ اسے کتابی صورت میں دیکھنے کے لئے بے صبری سے منتظر ہیں۔میری بھی یہی خواہش ہے کہ ان کی یہ سرگذشت جلد منظر عام پر آئے تاکہ تشنگان ادب اپنی پیاس بجھا سکیں۔آیئے خودنوشت کی چند سطروں سے آپ کو روشناس کراؤں:

''جمشید پور کی دنیا ایک عجیب دنیا تھی۔ ماں کی کوکھ کی طرح گرم، آرام دہ اور محفوظ، بہار (اب جھارکھنڈ) کے تمام شہروں میں یہ شہر ان دنوں بھی سب سے زیادہ پسند تھا اور آج بھی سب سے اچھا لگتا ہے۔ یہاں گزارے ہوئے شب وروز یاد آتے ہیں تو اپنے دروازے پر زندگی کی دستکیں سنائی دینے لگتی ہیں، وہاں بسر کئے ہوئے ایام وقت کی سطح پر مردہ مچھلیوں کی مانند ابھر آتے ہیں۔شفاف اور کشادہ سڑکیں، خوبصورت عمارتیں، ڈمنا جھیل جبلی پارک، بسٹو پور اور ساکچی بازار نٹ راج سنیما جواب بند ہو چکا ہے ناولٹی اور کوالٹی ریستوراں جو اس زمانے میں کافی شہرت رکھتا تھا، ایک ایک کر کے سنیما کے متحرک سایوں کی طرح ابھرنے لگے ہیں۔اس شہر کے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں کئی چہرے میری یادوں کے روزن سے جھانکنے لگتے ہیں۔اتنے برس بیت جانے کے بعد بھی ان کی یاد دل کے ویرانے میں چراغ جلاتی رہتی ہے اب بھی میری پلکوں پر ان کی سہانی رفاقت اور بے پناہ محبت کے آنسو تھرتھراتے رہتے ہیں۔ان ہی چہروں میں سب سے روشن چہرہ میری چھوٹی باجی اور میرے دولہا بھائی (منظر شہاب) کا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ شہاب بھائی نے ہمیشہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھا۔میرے اچھے برے کا خیال رکھا۔قبل بھی اظہار کر چکا ہوں کہ میری ادبی تربیت میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔میرے ذوق کو پنپنے کے لئے ہر ممکن سہولت فراہم کی۔میرے کیریئر کا خیال رکھا۔''

اپنی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر سادگی نیکی اور خیر کو انسانی پیکر میں دیکھا جاسکتا ہے تو وہ میں نے اپنی اماں کو دیکھا۔ جو محلے کی سن رسیدہ عورتوں کے لئے ہمیشہ بی بی رہیں اور کم عمروں کے لئے بی بی دادی۔ فصل کے موقع پر گاؤں سے اناج وغیرہ آتا تو حاجت مندوں میں جھولیاں اور گھڑے بھر بھر کر بانٹتیں۔ خود بہت کم کہیں جاتی تھیں مگر گلی محلے کی غریب عورتیں، اکثر ان کی پلنگ کی پٹی سے لگ کر بیٹھی رہتیں۔ اپنی اپنی پریشانیاں انہیں سناتی رہتیں۔ ان کے یہاں غریب، امیر، بڑے چھوٹے کا کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ اناج ہی نہیں محبتیں بھی جھولیاں بھر بھر کر بانٹنا جانتی تھیں۔''

اور جب کئی برس کے بعد وہ اپنے شہر دربھنگہ گئے اور امیر منزل کی طرف سے ان کا گذر ہوا تو ان پر جو کیفیت گذری اس کا اظہار کتنے خوبصورت اور ساتھ ہی دردناک الفاظ میں انہوں نے کیا ہے یہ سطریں دیکھئے:

''چند ماہ قبل جون ۲۰۰۶ء میں دربھنگہ جانا ہوا تھا۔ سالم کے سب سے چھوٹے لڑکے عزیزی ساجد کی تقریب کتخدائی تھی۔ قلعہ گھاٹ سے گذرا تو ششدر رہ گیا۔ یہ وہ امیر منزل ہرگز نہیں تھا۔ جہاں میں نے آنکھیں کھولی تھیں اور جس کے ہر حصے میں میری صداؤں کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ یہ بالکل وہ امیر منزل نہیں تھا جو ایک زمانے تک ادب و ثقافت کا مرکز بنا رہا۔ اور جس کی خاک سرمۂ چشم بصیرت تھی کہیں سے بھی یہ وہ امیر منزل نہیں لگتا تھا۔ جہاں ہم پانچ بھائی بہنیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے، جہاں ہمارے والدین کی میتیں قبر گاہ کیلئے روانہ ہوئی تھیں اور جس گھر سے ہماری دونوں بہنوں کو سجا کر سنوار کر سسرال بھیجا گیا تھا اور جس امیر منزل میں سردیوں کی چمکتی دھوپ میں ہری گھاس پر بیٹھ کر ہم چار یار (شمیم، سالم، صدیق اور میں) کیرم کھیلا کرتے تھے اور جس کی فضاؤں میں میرے بھتیجے، بھتیجیوں، بھانجے، بھانجیوں کی کلکاریاں گونجا کرتی تھیں۔ اب تو اس عمارت کی پیشانی سے امیر منزل کی تختی بھی مٹ چکی تھی۔ پورا مکان چنکا ہوا لگا۔ ٹکڑوں میں بٹا ہوا۔ ویران، اجاڑ، بے رنگ، بے رونق پام کے وہ فلک بوس اشجار جو امیر منزل کے مین گیٹ پر محافظ کی طرح ایستادہ تھے۔ جڑ سے غائب ہو چکے تھے۔ مگر اس کا ذمہ دار کوئی ایک نہیں تھا ہم پانچوں تھے۔ سید امیر علی مرحوم اور سیدہ کنیز فاطمہ مرحومہ کی پانچ اولادیں، ان کے چشم اور چراغ۔ افسوس ان کی پہلی ہی نسل نے اس دلکش نشانی کو سپرد غیر کر دیا تھا۔ آنسو مرجھائے ہوئے پتوں کی طرح میری آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔''

اگر چہ سید منظر امام شہرت کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں سے پیچھے رہ گئے اور اس کی وجہ محض ان کی بے نیازی ہے یا پھر شہرت سے بیزاری یا کاہلی۔ ویسے بھی وہ حد درجہ آرام طلب ہیں شاید اس لئے بھی کہ انہیں زندگی میں آسائشیں زیادہ ملیں اور صعوبتیں کم۔ انہوں نے بہت کم لکھا خواہ وہ نثر میں ہو یا شعر میں ہاں ان کو مطالعے سے ہمیشہ دلچسپی رہی بلکہ یوں کہئے کہ آج بھی مطالعہ ہی ان کا وسیلہ حیات ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو انہوں نے قلم

پکڑنا سکھایا یا شعروادب کی طرف راغب کیا وہ آج اچھے خاصے مشہور ہو چکے ہیں اور ادب میں انہیں درجۂ اعتبار حاصل ہے۔ ان میں کئی نام ہیں فی الحال میرے ذہن میں۔ محمد سالم، سید احمد شمیم، شوکت خلیل کے اسماء آرہے ہیں۔ محمد سالم اور سید احمد شمیم ان کے بے حد گہرے دوست ہیں۔ محمد سالم کے بارے میں ان کی یہ سطریں دیکھئے:

''سالم کی دوستی کو میں اپنی زندگی کا بیش بہا قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں۔ اس کی رفاقت مجھے ایسے چشموں پر لے گئی جس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ سرد تھا۔ اس کی ملاقات سے قبل میری زندگی بہت گھٹی ہوئی، سکڑی ہوئی اور امیر منزل کی چہار دیواری تک محدود تھی۔ سالم کا یہ احسان ہے کہ اس نے ایک جوئے آہستہ خرام کو راز سرشاریٔ رفتار سے آگاہ کیا۔''

دیگر دوستوں کے بارے میں ان کا خیال ہے:

''یہ سچ ہے کہ جمشید پور میں اگر سید احمد شمیم نہ ہوتے، منظر کاظمی اور شمس فریدی کا ساتھ نہیں ہوتا تو جو ایام وہاں گذرے ہیں ان میں وہ حسن نہیں ہوتا خیالوں میں وہ رنگت نہیں ہوتی جن سے زندگی کی راہیں منور ہوتی ہیں۔''

منظر کاظمی کے انتقال کے کچھ دن قبل انہوں نے ''وقت'' کے پہلے شمارے میں یہ سطریں لکھی تھیں:

''منظر کاظمی تم بہت بیمار ہو۔ شمس فریدی نے فون پر بتایا کہ موت اور زندگی کے درمیان کشمکش جاری ہے مجھے یقین ہے فتح زندگی کی ہوگی۔ گذشتہ ماہ ہی تمہیں دیکھ کر آیا ہوں مل کر آیا ہوں۔ باتیں کر کے آیا ہوں...... مجھے تو نہیں محسوس ہوا کہ تم تھک گئے ہو ہار گئے ہو اور زندگی کے دروازے پر موت کی دستک سننے لگے ہو۔ مجھے قطعی نہیں لگا ایسا۔ کتنی باتیں کی ہم نے ''وقت'' کے لئے تم نے بہت سارے مشورے دیے، کتنے قہقہے لگائے ہم نے کہ ہمارے قہقہے شہر بھر میں مشہور تھے، یاد ہے نا۔ جمشید پور میں ہماری تثلیث بن گئی تھی میں، تم اور سید احمد شمیم۔ کسی نے اسے 'Intellectual Triangle' کا نام دے دیا تھا۔ اس تثلیث کو برقرار رہنے دینا دوست تمہاری رفاقت میں گذرا ہوا ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل میری یادوں کی انگشتری میں نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ نہ جانے کتنی دوپہریں، کتنی شامیں اور کتنی راتیں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ بتائی ہیں۔''

سید منظر امام کا شمار دھنباد کی ایک اہم ادبی وتہذیبی شخصیت میں ہوتا ہے۔ کئی ادبی تنظیموں کی آپ نے بنیاد رکھی۔ آپ نے شہر دھنباد میں اردو کیلی گرافک سینٹر بھی قائم کیا۔ معیاری رسالہ ''وقت'' جاری کیا جس نے سید امین اشرف، محمد سالم، سید احمد شمیم، اسلم بدر اور علیم صبا نویدی پر خصوصی نمبر نکالے جسے آج بھی لوگ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اور آئندہ اس طرح کا کوئی اور نمبر شائع ہو اُس کے لئے مسلسل اصرار بھی کرتے ہیں لیکن کوئی معاون نہ ہونے اور کچھ اپنی صحت کی وجہ سے اس کے دوبارہ اجراء کی ہمت نہیں کرتے حالانکہ ان کی آرزو ہے کہ 'وقت' دوبارہ شائع ہو۔

سید منظر امام جانتے ہیں کہ زندگی ہر لمحہ تغیر پذیر ہے وہ زندگی کی اس رزم گاہ میں اپنی پوری توانائی کے

ساتھ عمل پیرا نظر آتے ہیں۔زبان کی صفائی وسادگی ان کا خاص وصف ہے۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے صحیح لکھا ہے:

"سیّد منظر امام نے بہت کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا اس میں یکسوئی ہے اور مسحور کن فضا موجود ہے۔اگر وہ لکھتے رہتے تو یقیناً آج حقائق کی سنگلاخ زمینوں کے راہرو ہوتے جن کا تخلیقی شعور اچھے اچھوں کو گم گشتہ کر دیتا۔یہ میں اس دعوے کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ ان کی سوانح کا جو حصہ یادداشت بن کر جستہ جستہ "تمثیل نو" دربھنگہ میں قسط وار چھپ رہا ہے اس میں داخلی جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ندرت اور اچھوتا پن کے عناصر بھی خلوص کی سچائیوں کے ساتھ نفسیات کی گرہ کشائی کرتے ہیں۔"

برسوں قبل معروف اور منفرد افسانہ نگار ش۔مظفر پوری نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا تھا: "منظر امام! بہار میں دو ہی افسانہ نگار اچھی زبان لکھتا ہے، ایک میں اور دوسرے تم"۔سید منظر امام کی زبان اور اسلوب کو دیکھ کر ش۔مظفر پوری مرحوم کے اس جملے کی سچائی کا یقین ہو جاتا ہے۔

سیّد منظر امام جب تک بقید حیات رہے اُن کا سایہ قائم رہا اور تشنگانِ علم وادب کی سیرابی ہوتی رہی۔ان کی موجودگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ادب سے زندگی کا اور زندگی کی سچائیوں کا کس طرح اظہار سامنے آتا ہے کہ ایسی شخصیتوں کا ذہن بدلتا ہے اور سماجی، معاشرتی درجے کی نشاندہی کس طرح ہوتی ہے۔ان کے طرز عمل میں خلوص نیت دیکھی جا سکتی تھی اور ان کے فکر وخیال کی اہمیت سے مقصد حیات کو جانچا پرکھا جا سکتا ہے۔وہ راستے کے مسافر نہیں تھے بلکہ فطری صلاحیت سے کام لے کر انہوں نے خود بھی صحیح سمت میں سفر کیا اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

....

● ملت کالونی، واسع پور، دھنباد (جھارکھنڈ)، موبائل: 09934113066

● **ڈاکٹر عمران احمد** اے آر ڈی، مانو ریجنل سینٹر دربھنگہ (ولادت ۱۲ر فروری ۱۹۵۶ء ولد جناب محمد ادریس مرحوم، باقی پور، لہریا سرائے، دربھنگہ مقیم امام باری، دربھنگہ) کا ۲ر اپریل ۲۰۱۹ء کو شام کے تقریباً ۴ بجے دہلی کے بی ایل کپور ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔مرحوم کی تدفین ۴ر اپریل کو ان کے آبائی گاؤں باقی پور، لہریا سرائے، دربھنگہ میں انجام پائی۔مرحوم کے جسدِ خاکی کو بذریعہ طیارہ دہلی سے پٹنہ لایا گیا جہاں سے بذریعہ روڈ دربھنگہ پہنچایا گیا۔نماز جنازہ بعد نماز ظہر گاؤں میں ادا کی گئی اور ہزاروں افراد نے نمناک آنکھوں کے ساتھ مرحوم کو سپرد خاک کیا۔مرحوم تقریباً ۲ر ماہ سے ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔مرحوم دربھنگہ ریجنل سینٹر پر فروری ۲۰۰۵ء میں اے آر ڈی کی حیثیت سے جوائن کیا تھا۔مرحوم کی ایک کتاب "تنقیدی رَو" (مضامین کا مجموعہ) ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی تھی۔مرحوم محمد علی اشرف فاطمی (سابق مرکزی وزیر، حکومت ہند) کے چچازاد اور خالہ زاد بھائی اور سیّد شاہنواز حسین (سابق مرکزی وزیر، حکومت ہند) اور ڈاکٹر ارمان عالم خورشید کے نسبتی بھائی تھے۔

ایم نصر اللہ نصر

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی: ادب کا کوزہ گر

عصر حاضر میں اردو ادب کے چند مخصوص ادب نگاروں میں ڈاکٹر پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی حیثیت ممتاز و منفرد ہے۔ وہ اردو ادب کے ہر فن مولا قلم کار کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی ادبی زنبیل میں کیا نہیں ہے۔ وہ ایک استاد شاعر' استاد ادیب' بہترین محقق' بصیرت افروز ناقد' عمدہ مضمون نگار' نئی صنف سخن کے موجد اور تجربہ کار صحافی بھی ہیں۔ انھیں جس زاویے سے پڑھئے یا پرکھیے وہ آپ کی میزان پر پورے اتریں گے۔ بڑے کھرے انسان ہیں۔ ادب نگاری کا تو جیسے ان کے سر میں سودا سمایا ہوا ہے۔ وہ ایک پل بھی فرصت سے محظوظ نہیں ہوتے۔ ہمہ وقت مصروف عمل رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اصناف سخن اور موضوعات ادب پر اب تک ان کی 235 کتابیں منظر عام پر آ کر مقبولیت کے گلدستے سمیٹ چکی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا نتیجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور ادب نگاری پر درجنوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کو زبان و بیان اور طرز اظہار نیز نقد و نظر پر قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے ادب کو صرف پڑھا اور لکھا ہی نہیں ہے بلکہ ادب سے عشق کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں حیات و کائنات کی تفہیم و ترسیل کا خاص اہتمام ہے۔ فنی کاریگری' تخلیقی ہنرمندی اور عصری آگہی ان کی تخلیقات میں سلیقے سے آراستہ نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم کے مطالعے کے پیش نظر مناظر صاحب نے اردو ادب کی بیشتر اصناف پر طبع آزمائی کی ہے اور اردو ادب کو بہترین تخلیقات کا تحفہ دیا ہے چاہے وہ تخلیق و تنقید ہو' تصنیف و تالیف ہو' روایتی غزل ہو یا آزاد غزل یا غزل نما سب کی بہترین پاسداری کی ہے۔ ساختیات کی تشریح بھی معلوماتی انداز میں کی ہے اور فکشن کا مظاہرہ بھی خوب کیا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نئے خیالات و نظریات کے زیر اثر اپنی تنقید میں ایسے ایسے رنگ ابھارے ہیں اور آہنگ نمایاں کیے ہیں جن کو صحیح معنوں میں نئے رجحانات کا نام دینا چاہیے۔ بچوں کے ادب پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں' ناول اور ناولٹ بھی۔ ان کا تازہ ناول ''شبنمی لمس کے بعد'' زیر مطالعہ ہے۔

ناول انگریزی لفظ novel اور اطالوی لفظ novella سے مشتق ہے جس کے معنی من گھڑت یا تصوراتی نثری بیانیہ' داستان یا طویل قصہ ہے۔ جس کو a fiction prose narrative بھی کہا گیا ہے۔ ناول زندگی کا رزمیہ بھی ہے جو سماج اور معاشرے کی کروٹوں کو ایک نئے ذائقے کے ساتھ پیش کرتا ہے جس میں احساس اور ارتقا کے عناصر کی فراوانی ہوتی ہے۔ اس کی ضخامت کی حد مقرر نہیں مگر ضخامت اس کی شرط بھی ہے۔ اختصار کی اس میں گنجائش نہیں۔ اس کی خصوصیات میں کہانی کا طویل ہونا' حقیقی زندگی اور حقیقی منظر و پس منظر کی نمائندگی ہونا اور ساخت میں پیچیدگی شامل ہیں۔ ورجینا وولف کے مطابق ناول میں اتنی جگہ ہوتی ہے کہ ناول نگار اس میں ہر چیز سمو سکتا ہے۔ اردو ناولوں میں بھی اس کے اہتمام کی پاسداری کی جاتی ہے۔

اردو ناول نگاری کے ڈیڑھ سو سالہ زندگی میں نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس (1869) سے لے کر اب تک جتنے بھی ناول لکھے گئے ہیں ان میں سماجی' معاشرتی' تہذیبی' ثقافتی اور معاشی زندگی و حالات کی عکس ریزی ملتی ہے۔

نئی کروٹوں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ نئے اسلوب، نئے موضوعات اور نئی تکنیک اور ہیئت کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جہاں تک موجودہ صدی کا تعلق ہے تو اس صدی میں بھی اردو ناول لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن اس صدی کی ناول نگاری میں بڑی پیچیدگی نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ یہ دور ہی عجیب ہے۔ اس دور میں کسی چیز کو استحکام حاصل نہیں۔ فکر و خیال میں پختگی نہیں۔ یہاں کروٹ کروٹ تبدیلی ہوتی نظر آتی ہے۔ اقدار نظریات، طرز زندگی، رہن سہن، تصورات و خیالات اور تہذیب و تمدن میں لمحہ لمحہ تغیرات کے جلوے رونما ہوتے رہتے ہیں۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا ناول ''شبنمی لمس کے بعد'' ایک ایسا ناول ہے جس کی کڑی دوسرے ناولوں سے مل کر بھی نہیں ملتی۔ بالکل الگ ایک رنگ لئے ہوئے ہے۔ انفرادی طرز کا یہ پہلا ناول ہے جو پورے کا پورا خطوط پر مشتمل ہے اور وہ بھی ایک مرکزی کردار کے خطوط پر۔ مکتوب نگار کے سارے خطوط مکتوب الیہ کے جواب میں لکھے گئے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مکتوب الیہ کا ایک بھی خط مکتوب نگار کو نہیں ملا ہے۔ وہ خود ہی اس کی باتوں کا جواز پیدا کرتا ہے اور اس کا جواب لکھتا ہے۔ گویا یہ ایک من گھڑت کردار ہے، ایک تخیل کا ہیولیٰ ہے جس کو وہ اپنا محبوب بنائے ہوئے ہے بلکہ خواب و خیال میں اس سے نکاح بھی کر بیٹھتا ہے۔ اسے شوہر اور محبوب کی طرح مشورے بھی دیتا ہے اس کے ناز بھی اٹھاتا ہے اور فلمی انداز میں ازدواجی رشتہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''میں تڑپ کے رہ گئی، بے چینی اور اداسی بڑھ گئی۔ شادی کے کیسے کیسے سپنے بنے تھے۔ سب ادھورے رہ گئے کیوں کہ شادی کے تیسرے دن پتہ چلا کہ وہ شادی شدہ ہیں۔'' (یہ دراصل ناول نگار کی خود ساختہ سوچ ہے اور ناول کا نقطۂ آغاز جہاں سے ناول کا سفر شروع ہوتا ہے اور تجسس کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔)

کہانی کچھ اس طرح بنی گئی ہے کہ مرکزی کردار کاشف کی ملاقات شادی کی ایک تقریب میں فرحت نام کی ایک خوبرو لڑکی سے ہوتی ہے۔ ملاقات دوستی میں بدلتی ہے اور دوستی شادی میں۔ شادی کا سبب فرحت کا حد سے زیادہ حسین ہونا، بھرا ابھرا جسم اور جنسی کشش بنتا ہے۔ شادی کے بعد فرحت کو پتہ چلتا ہے کہ کاشف پہلے سے ہی شادی شدہ ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں۔ فرحت اس راز کے فاش ہوتے ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ جب کہ اس کے گھر والوں نے اسے بارہا سمجھایا تھا کہ یہ لڑکا پردیس یعنی عرب میں ملازمت کرتا ہے اس کا کوئی بھروسہ نہیں لیکن فرحت کی ضد اس کی زندگی برباد کر دیتی ہے۔ فرحت ایک اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی ہے لیکن اس پورے وقفے میں دونوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوتی۔ کاشف اپنے وطن آتا بھی ہے تو اپنی پہلی بیوی کے پاس ہی رہتا ہے۔ اسے ہی خرچ بھیجتا ہے۔ فرحت کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں دیتا۔ فرحت زمانے کا طنز سہتے سہتے پریشان ہو جاتی ہے اور دوسری جگہ ایک فلیٹ خرید لیتی ہے۔ پھر کاشف اس پر شک کرنے لگتا ہے اور کسی سے نہ ملنے کا بار بار مشورہ دیتا رہتا ہے۔ ساتھ ہی جو خطوط اسے وہ لکھتا ہے اس میں وہ ساری کیفیات بیان کرتا ہے جس سے اس کے جنسی تلذذ سے لطف اندوز ہونے کا بیان زیادہ ہوتا ہے۔ وہ فلسفیانہ انداز میں کبھی ہپ کی قسمیں بتاتا ہے تو کبھی پستان کی۔ کبھی اس کے رسیلے ہونٹوں کو مزے لے کر بیان کرتا ہے تو کبھی اس کے گالوں کو سیب سے مشابہ کر کے کاٹ لینا چاہتا ہے۔ خوابوں میں اس سے چپٹے رہنے اور اس کے جسم کے گداز حصوں کو انگلیوں سے ٹٹولنے کا ذکر لطف لے لے کر بیان کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ سچ میں فرحت کے ساتھ ہم بستر ہوا ہے لیکن یہ سب اس کا وہم ہوتا ہے۔ پھر ایک دن اس

کی ملازمت کی غیر یقینی صورت حال کا بھی راز فاش ہو جاتا ہے اور اس کی پریشانیاں بھی دکھنے لگتی ہیں۔ آخرش فرحت اس سے نجات کی صورت میں طلاق کی بات لے آتی ہے لیکن یہ سب کچھ یک طرفہ احساس' یک طرفہ سوچ اور جذباتی تخیلات ہیں۔ جسمانی اتصال بھی سپنے کی باتیں ہیں۔ تلذذ کا خیال بھی صرف خیال ہی ہے۔ ناول نگار کے مطابق کاش یہ افسانہ نہیں ہوکر حقیقت ہوتی تو شاید ناول لکھنے کی ضرورت درپیش نہیں ہوتی۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ ناول پڑھتے وقت اکثر مراحل پر قاری کو حقیقت کا احساس ہوتا ہے۔ رحمان عباس کے مطابق:

> ''ناول کا حسن خالص جمالیاتی تجربہ نہیں ہوتا بلکہ انسانی اخلاقیات کا محاسبہ اور مراقبہ ہونا بھی اس میں شامل ہے۔ ناول انسانی زندگی کو دیکھنے' سمجھنے اور محسوس کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ ناول آدمی کی زندگی' کلچر' معاشرت' اور نفسیات کے پس منظر میں اس کی جذباتی و جنسی گتھیوں کو تہہ در تہہ پھیلی دنیا اور رشتوں کی پیچیدہ اور مبہم کیفیتوں کو گرفت میں لانے سے عبارت ہے۔ ناول نگار کسی تحریک کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ سماج اور اخلاقیات کے مدمقابل بساط زندگی پر آدمی کی کشمکش کی پیداوار ہیں۔'' ('دربھنگہ ٹائمز' ناول نمبر ص:۸۴)

مذکورہ کلمات کی روشنی میں اگر مناظر صاحب کے ناول ''شبنمی لمس کے بعد'' کے مطالعے سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار کے دل و دماغ میں ایسا کوئی خیال برسوں سے پک رہا تھا جس کا لاوا اس ناول کی شکل میں نکلا ہے۔ جس میں ان تمام کیفیات کو یکجا کر دیا ہے جو انسان اپنی زندگی کے مختلف اوقات اور منفرد مراحل میں سوچتا رہتا ہے اور اس طرح کی خواہشات سے آشنا ہوتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ تو سپنے کی باتیں ہیں اور خواب و خیال میں سب کچھ کا ہونا لازمی بھی ہے۔ اس لئے کہ اتنے سارے خطوط کے جواب میں دوسرے مرکزی کردار یعنی فرحت کا ایک بھی خط موصول نہیں ہوتا۔ پہلے میں نے کچھ افسانے بیسویں صدی میں پڑھے تھے جن کا انداز خطوط کے سوال و جواب کی بنیاد پر ہوا کرتا تھا۔ یہ پہلا ناول ہے جو اس نہج پر لکھا گیا ہے۔ بے شک اسے مناظر صاحب کی پہل کہہ سکتے ہیں کیوں کہ وہ اس طرح کے کام میں ماہر ہیں۔

ان کے طرز نگارش کا کون قائل نہیں۔ ہر پل کچھ نیا سوچتے رہتے ہیں۔ نئے خیالات' نئے اسلوب' نیا منظرنامہ' نیا انداز' نیا لہجہ نئے سلیقے کے ساتھ پیش کرنا ان کی فطرت ہے۔ آیئے ناول کے کچھ اقتباسات ملاحظہ کریں:

- ''آج صبح تم سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا اور بڑا میٹھا میٹھا سکون محسوس ہوا۔ کانوں میں رس گھول دینے والی تمہاری آواز میں عجب جادو ہے کہ روح بھی تر و تازہ ہو جاتی ہے۔''
- 'تمہارے ہونٹوں اور گالوں کو چومنے سے جو لمس ملا اس نے بہت ساری خواہشوں کو بڑھا وا دیا۔ تمتماتے ہوئے رخساروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دیکھنے میں بالکل تر و تازہ لگتے ہیں، بالکل تازہ سیب۔ بار بار خواہش ہوتی ہے کہ دانتوں سے کاٹ لوں۔ تمہارے رسیلے ہونٹوں سے تو میں مانوس ہوں۔''
- ''ان معاملات میں لیڈی ڈاکٹر نسبتاً Male ڈاکٹر سے زیادہ بہتر ثابت ہوتی ہے۔ میل ڈاکٹر ضرورت نہ رہنے پر بھی (بدن سے زیادہ کپڑے) کھلوا چھوڑتے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر سے مستقل مشورہ لیتی رہو گی۔''
- ''میں تمہارے سارے خواب اپنے ہونٹوں سے گن گن کر چن لوں گا اور تمہیں پیار کے پے در پے اور یکے بعد دیگرے نئی نئی چاہت کے طریقوں سے سرشار کرتا رہوں گا۔''

تلذذ نگاری کوئی آسان کام نہیں۔ ناتجربہ کار افسانہ نگار یا ناول نگار اس کی ترجمانی سے قاصر رہتا ہے۔ اسے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ لمس کیا ہے۔ لمس شبنمی ہوتا ہے یا اس میں شعلگی کی کیفیت زیادہ ہوتی ہے۔ عورت کے جسم کا کون کون سا حصہ تلذذ و تلطف سے بھرا ہوتا ہے جس کے چھوتے ہی دل و دماغ کے ساتھ جسم میں بھی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اگر وہ مل جائے تو کیا کہیے والی کیفیت سے وہ دوچار رہتا ہے۔ لیکن تجربہ کار آدمی سارا عمل اپنے تجربے کی روشنی میں کرتا ہے۔ جیسا کہ مناظر صاحب نے اس ناول کے بہانے کیا ہے۔ ان کے ان مشاہدات کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ انھوں نے شبنمی آگ کی آنچ سے جس طرح شعلہ بھڑکایا ہے یہ انہی کا حصہ ہے۔ نہایت ہی صبر و سکون کے ساتھ انگلیوں کا استعمال کیا ہے ذہن کو قابو میں رکھا ہے اور ایک ایسی زندگی کی سیر کرائی جس کے متمنی تو سبھی ہوتے ہیں لیکن مشاہدہ کسی کسی کو ہی ہوسکتا ہے۔

ان کے اس ناول کی صرف یہی خصوصیات نہیں ہیں۔ بلکہ وہ بیشتر خصوصیات اس میں موجود ہیں جس کا ناول کے قاری کو انتظار رہتا ہے۔ جو ناول کے اوراق کو الٹنے پر مجبور کرتا ہے۔ قاری کو پورے طور پر اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ ان کے اس ناول میں ذاتی مسائل بھی ہیں اور سماج کی عکس ریزی بھی۔ تہذیب کی عریانی بھی ہے اور تمدن کی پامالی کا اظہار بھی۔ فریب، دغا اور شاطرانہ عمل کا گزر بھی ہے۔ ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیں:

☆ ”نہیں وہ تمہارے مذہبی مسلک کا نہیں ہے۔ پھر تمہارے گھر والے اتنی آزاد خیالی کو پسند نہیں کریں گے۔

تم باؤلی ہوئی ہو۔ دو دن میں عرب میں رہنے والے اس شخص کے بارے میں تم کتنا جان سکی ہو۔“

کتنی سچائی ہے اس اقتباس میں آپ محسوس کر سکتے ہیں۔ پہلے ہی سفر میں عرب کے نام پر اچھی لڑکیوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ سکھ کے سپنے چور چور ہو جاتے ہیں جب پتہ چلتا ہے کہ لڑکا یا تو عرب کی جیل میں ہے یا کمپنی اسے کئی ماہ سے نہ تنخواہ دیتی ہے اور نہ وہاں سے واپسی کا کوئی انتظام کرتی ہے۔ در در بھٹکنے کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ زندہ لاش بن کر جینا پڑتا ہے۔

مناظر صاحب جملے بڑے اچھے تراشتے ہیں جن کو پڑھ کر دل بے ساختہ داد دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جن سے فلسفیانہ حقائق کی جلوہ نمائی بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ کریں:

> ”کسی بھی شخص کے ماتھے پر شرافت نہیں لکھی ہوتی۔ تقریباً سبھی مرد صرف اس وقت تک شریف رہتے ہیں جب تک ان کو ذالت دکھانے کا موقع نہیں ملتا۔ موقع ملتے ہی وہ اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ عورت کمزور ہوتی ہے اور اپنی بے عزتی کا داغ کسی کو بھی نہیں دکھائے گی۔“

لکھا تو بہت کچھ جا سکتا ہے مگر قاری کے صبر کا زیادہ امتحان نہیں لینا چاہیے۔ چاول کے دو دانے ہی بتا دیتے ہیں کہ چاول کچا ہے یا پکا ہوا ہے۔ امید ہے کہ اس مختصر وضاحت سے ہی مناظر صاحب کی ناول نگاری کے مرتبے و مراتبے کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

....

● ہوڑہ موبائل: 9339976034

ڈاکٹر وصیہ عرفانہ

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی چار کتابیں

پروفیسر محمد حسن: یادیں باتیں: مناظر عاشق ہرگانوی اردو کے سب سے بڑے لکھاری ہیں۔ اردو میں شائع ہونے والے تقریباً تمام تر ادبی رسائل و جرائد میں نہایت تواتر کے ساتھ ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے یہاں نہ تو کبھی موضوعات کی کمی رہی اور نہ ہی علمی و ادبی توانائی کی۔ انہوں نے اردو ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اصناف اور ہیئت کے حوالے سے انہوں نے نت نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ جس طرح وہ مختلف النوع مضامین لکھتے رہے، اب اسی رفتار سے ان کی کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں۔ اب تک مناظر عاشق ہرگانوی کی دو سوتیں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ "مناظر عاشق ہرگانوی کی رفتار بہتوں کیلئے لائق رشک ہے۔"

زیر تبصرہ کتاب دراصل ممتاز نقاد پروفیسر محمد حسن [۱۹۲۶-۲۰۱۰] سے وابستہ یادوں اور باتوں پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا آغاز پروفیسر محمد حسن سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی پہلی ملاقات (۱۹۷۴) سے ہوتا ہے۔ "اردو ادب میں دانشوری کی روایت" کے موضوع پر خدا بخش لائبریری میں منعقد ہونے والے سیمینار میں ان کی دوسری ملاقات ہوئی۔ اسی سیمینار میں محمد حسن نے اپنے مقالے میں اردو ادب میں دانشوری کی روایت کو سرے سے رد کر دیا۔ ان کے اس نظریئے نے اردو کے ادبی حلقوں میں کافی تہلکہ خیزی پیدا کر دی تھی۔ محمد حسن کے اس عالمانہ مقالے کو مناظر عاشق ہرگانوی نے بہ طور خاص اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی سیمینار میں 'آگ کا دریا میں دانشوری' کے موضوع پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے بھی مقالہ پڑھا تھا جس کی پذیرائی محمد حسن نے ان الفاظ میں کی تھی۔ "آپ کے تجزیئے کی روشنی کی آنکھ جگنوؤں کی مانند ہیں"۔ دانشورانہ فکر کے تہذیبی رچاؤ کی علامت ڈاکٹر محمد حسن کی نظم "تاریخ پڑھانا بند کرو"، موت کی حقیقت بیان کرتی ہوئی نظم "موت کے نام"، قدروں کی شکست و ریخت پر مبنی نظم "آپ بیتی" اور دیگر چند نظموں کو کتاب میں رقم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن سے لیا گیا ایک انٹرویو بھی کتاب میں شامل ہے۔ بعد ازاں محمد حسن کے تخلیقی کارناموں اور علمی و ادبی فتوحات پر مناظر صاحب نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس ذیل میں انہوں نے نہ صرف محمد حسن کے نظریہ فکر کا تجزیہ کیا ہے بلکہ ان کی شخصیت کے بعض لطیف گوشوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ کتاب میں محمد حسن کے ان خطوط کے اقتباسات بھی جابجا درج ہیں جو انہوں نے مناظر صاحب کے نام لکھے ہیں اور جن میں مناظر عاشق ہرگانوی کے علمی و ادبی کارناموں سے متعلق ان کے خیالات روشن ہوئے ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر محمد حسن کی چند یادگار تصویریں ہیں جو کتاب کی زینت میں اضافہ ہیں۔ اردو کے ایک قد آور ناقد محمد حسن کے تئیں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے خراج عقیدت کے طور پر شائع ہونے والی یہ کتاب اپنی خوبصورت طباعت اور دیدہ زیب گیٹ اپ کے باعث بھی ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی۔

....

دہشت گردی (منظوم): کتاب "دہشت گردی" میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور شاہد نعیم نے دہشت گردی کے موضوع کے تحت شاعروں کے جذبات و احساسات کو جمع کیا ہے۔ دہشت گردی اب کسی ایک گلی، ایک شہر یا ایک ملک کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ آج یہ ایک عالمی حوالہ بن چکا ہے۔ نسل، مذہب، عقائد، مسلک، علاقائیت، سرحدیں گویا دہشت گردی کے متعدد اسباب اور وسیلے ہیں۔ عام آدمی صرف سہولت اور تحفظ چاہتا ہے۔ اسے صبح کو شام کرنے کے لئے کسی نظریے، فلسفے یا منشور کی ضرورت نہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ عام آدمی ہی دہشت گردی کی ہولناکی سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔

شاعر معاشرے اور حالات کا نباض ہوتا ہے اور اظہار کے پیرائے اس کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ دیگر موضوعات کی مانند دہشت گردی جیسے سلگتے موضوع کو بھی بے شمار شاعروں نے اپنے اپنے طور پر محسوس کیا اور ان احساسات کو جداگانہ رنگوں میں الفاظ کا پیراہن عطا کیا ہے۔ اس کتاب میں مناظر عاشق ہرگانوی اور شاہد نعیم نے یک موضوعی نظموں، غزلوں، قطعات اور رباعیوں کے انتخاب سے ظلم کی عصری تاریخ مرتب کی ہے۔ مذہبی منافرت، ظلم و بربریت، بدامنی، بدعنوانی اور ان کے بوجھ سے کراہتی روحیں...... یہ ہمارے عہد کی سچائیاں ہیں جن کو پڑھ کر ہمارا آنے والا کل ماضی کی بدنمائیوں پر شرمندہ ہو کر شاید نیا سنہرا باب لکھنے میں کامیاب ہو جائے۔

اس انتخاب میں عصر حاضر کے ایک سو اٹھارہ شاعروں کے کلام کو یکجا کیا گیا ہے۔ زیادہ تعداد نظموں کی ہے۔ غزل، قطعے اور رباعی کے علاوہ ماہیے، دوہے، گیت اور ہمن کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا گیا ہے۔ اس کتاب کا سرورق دیدہ زیب اور جاذب نظر نہیں بلکہ دہشت انگیز ہے۔ ابوغریب جیل کی بربریت، ۱۹۸۱ کے اندوہناک مناظر، ۲۶/۱۱ کی دہشت انگیزی، گجرات فسادات کے خوں ریز مناظر اور دیگر دلدوز تصویریں قاری کو کتاب کے مطالعے سے قبل ہی یہ غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ:

جلے مکانوں میں بھوت بیٹھے بڑی متانت سے سوچتے ہیں
کہ جنگلوں سے نکل کے آنے کی کیا ضرورت تھی آدمی کو
(پرکاش فکری)

....

جوگندر پال: شخصیت: اردو ادب کی تاریخ میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اپنی بسیار نویسی کے حوالے سے یکتا ہیں۔ انہوں نے ادب کی ہر صنف میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ بے تحاشہ لکھتے ہیں گویا انہوں نے تخلیق و تنقید اور تصنیف و تالیف کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے۔ بہت سی چیزیں وہ فرمائشی یا دوستوں کی دلداری کی خاطر لکھتے ہیں لیکن جب کبھی وہ اپنے دل کی دلداری کا حق ادا کرتے ہوئے کچھ تخلیق کرتے ہیں تو وہ تخلیق ایک الگ لطف و کیف کی حامل بن جاتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے اسی قلبی تقاضے کی دین ہے، لہٰذا کیف آور، لطف انگیز اور اثر آفریں ہے۔

اردو افسانے اور ناول کے باب میں جوگندر پال کا نام محتاج تعارف نہیں۔ نرم، صلح جو اور سادہ فطرت کے حامل ہونے کی وجہ سے انہوں نے نہ کبھی گروپ بازی کی اور نہ ہی حاشیہ برداری۔ نتیجتاً، اردو ادب کے منظرنامے میں اہم منصب پر فائز ہونے کے باوجود ان کی فکری و فنی صلاحیتوں کا اعتراف آج تک ویسا نہیں ہو سکا جس کے وہ حقدار ہیں۔ جوگندر پال کے تئیں اس جانی بوجھی پہلوتہی کے احساس نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو اس کتاب کی تخلیق پر مجبور کیا ہے۔ ہرچند کہ یہ کتاب جوگندر پال کی محض شخصیت کو احاطہ کرتی ہے۔ لیکن مناظر صاحب نے جس طرح جوگندر پال کے فن پاروں کے ذریعے ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کا تحلیل و تجزیہ پیش کیا ہے، وہ اردو ادب کے طالب علموں کو مہمیز کرتا ہے کہ جوگندر پال کے فن پاروں اور ان کے فنی رویوں کا بالاستیعاب مطالعہ ہونا چاہیے۔

کتاب کے آغاز میں ''گفتنی'' کے بعد جوگندر پال کا مناظر صاحب کے ذریعہ لیا گیا انٹرویو شامل ہے۔ جس سے نہ صرف جوگندر پال کی ذاتی زندگی اور اس کے بعض مخفی گوشے سامنے آتے ہیں بلکہ اردو ادب کی رفتار، رجحانات اور اس کے مستقبل کے تئیں جوگندر پال کے افکار بھی روشن ہوتے ہیں۔ انٹرویو کے بعد اختصار کے ساتھ ان کی حیات اور بعض یادگار لمحات کو پیش کیا گیا ہے۔ جوگندر پال کے افسانوں، افسانوی مجموعوں، ناولوں اور ان کی اشاعت کا تفصیلی ذکر ہے۔

ان کے افسانوں کے ترجمے متعدد ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کو ملنے والے انعامات واعزازات کی بھی تفصیل درج ہے۔ بلاشبہ، مناظر صاحب نے جوگندر پال پر تحقیق کرنے والوں کے لئے معقول زمین فراہم کی ہے۔ بعدازاں جوگندر پال کے مشورے کے مطابق ان کے افسانے ''کھودو بابا مقبرہ'' کومن وعن شامل کیا گیا ہے جس کے متعلق جوگندر پال کا نظریہ ہے کہ زندگی کی مختصر اور طویل کہانی کے لئے مذکورہ افسانہ رہنما ہے۔اس افسانے کی پیشکش کے بعد مناظر صاحب نے ان افسانوں اور ناولوں کے موضوعات، منظر ناموں، مکالموں اور بعض اہم کرداروں کا تحلیل وتجزیہ کرتے ہوئے جوگندر پال کی شخصیت اور داخلیت کو نمایاں کیا ہے۔ جوگندر پال کی باطنی کیفیات اور ان کا داخلی شعور ان کی اپنی تحریر ''خودوفاتیہ'' کے ذریعہ پوری طرح اجاگر ہوتا ہے جسے بطور خاص مناظر صاحب نے اس کتاب میں پیش کی ہے۔ کتاب کا آخری حصہ جوگندر پال کی تصویروں پر مبنی ہے۔اس مختصر سی کتاب میں مناظر صاحب نے بڑی خوبی اور بڑی محبت کے ساتھ جوگندر پال کی مکمل شبیہ کو قاری کے روبرو کر دیا ہے۔ یہ کتاب جوگندر پال کے مطالعے کے سلسلے میں ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔

....

ساحر کی محبتیں: ناکام محبت، تجزیاتی مطالعہ: زیر تبصرہ کتاب ساحر کی محبتوں پر اظہر جاوید کی کتاب کا ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے ذریعہ کیا گیا تجزیاتی مطالعہ ہے۔اظہر جاوید شاعر بھی ہیں اور ناقد بھی ساتھ ہی ساتھ صحافت کی جانب بھی ان کا رجحان ہے۔ ساحر لدھیانوی سے ان کی ذہنی اور قلبی وابستگی ہے۔اسی جذبے کے تحت انہوں نے ساحر کی محبتوں بنام 'ناکام محبت' کا جائزہ لیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے تحقیقی کدو کاوش بھی کی ہے۔ ساحر سے وابستہ لوگوں کی تحریروں، رسالوں میں شائع ہونے والے مضامین اور ساحر کی نظموں کے حوالے سے انہوں نے ساحر کے مزاج اور فطرت کا تجزیہ کر کے متعدد نتائج اخذ کئے ہیں۔ ساحر کے تئیں اظہر جاوید کی عقیدت اکثر ان کے اخذ کئے گئے نتائج میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ساحر کے معاشقوں کے ذیل میں انہوں نے ایشر کور، پریم چودھری، امرتا پریتم، لتا منگیشکر، سدھا ملہوترہ، شکیلہ بھوپالی، ناز صدیقی اور کئی گمنام چہروں کا ذکر کیا ہے۔ بمبئی کے شب وروز، فلم انڈسٹری کی صارفانہ ذہنیت، فلم سنسر بورڈ میں ساحر کی کوششوں سے وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں اور ساحر کی زندگی کے بعض مخفی گوشوں کے ذکر پر مبنی اظہر جاوید کی کتاب پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا تجزیہ ایک الگ اہمیت اور شناخت رکھتا ہے۔اظہر جاوید نے ساحر کے تعلق سے اپنی باتیں کہی ہیں اور مناظر صاحب نے اظہر جاوید کی تحریری کاوش اور ساحر کی شخصیت دونوں کو فوکس کیا ہے۔ ساحر کی مشہور نظموں اور ان کی وجہ تخلیق کی تفصیل اس کتاب کو وقیع بناتی ہے۔ فلمی نظموں کے حوالے سے کتاب میں ایک غلطی اصلاح طلب ہے۔فلم 'کالا پتھر' کے دو گیتوں کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ مؤخرالذکر گیت دراصل فلم 'کبھی کبھی' میں شامل ہے۔اسی طرح فلم 'داغ' میں فلمائے گئے گیت کو فلم 'کبھی کبھی' سے منسوب کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں ساحر لدھیانوی اور ان کے رفیقوں محمد رفیع، جاں نثار اختر، امرتا پریتم، مدن موہن وغیرہ کی یادگار تصویریں ہیں۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور قیمت مناسب۔ ساحر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خصوصی طور پر اور دلچسپ کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے عمومی طور پر یہ کتاب اہم ثابت ہوگی۔

....

● 'خیاباں'، نزد راجد آفس، چکنور روڈ، دھرم پور، سمستی پور-۸۴۸۱۰۲ (بہار)

ڈاکٹر امام اعظم

مناظر عاشق ہرگانوی کی نعتوں میں جاگتے احساس کی چبھن

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اپنے زمانہ کے ایسے نابغہ ہیں جن کی خلاقی کے خراد پر متنوع شعری تجربوں نے جدت اور شاعری نے وقار پایا ہے۔ ان کی ندرت فکر وفن کا مظہر ان کی نعتوں کا تازہ مجموعہ ہے جس کا نام بھی اچھوتا ہے یعنی ''ہر سانس محمدؐ پڑھتی ہے''۔ ان کی نعتوں میں تازگی ہے، دل دوزی ہے اور جاگتے ہوئے احساس کی چبھن ہے، ایسی چبھن کہ قاری کا دل بھر آتا ہے، کبھی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں، کبھی دیدہ و دل سرشار ہو اٹھتے ہیں اور ایمان کی حرارت بڑھ جاتی ہے۔ پہلے مناظر عاشق کے تخیل کی تازگی کی ایک جھلک دیکھیں :

☆ اسی کے جلوے سے عاشق ہے روشنی ساری　　اسی کے نام سے دنیا میں زندگی ساری
☆ ہر شئے میں ان کا نام ہے اس کائنات کی　　خلقِ خدا سے رشتہ ہے کیسا حضورؐ کا

اب ذرا گرونانک اور کبیر داس کی چوپائیوں پر نظر ڈالیں:

نام جس وستو کا انک کرو تم چوگنے داؤ　　دو ملایکے پچ گن کر لو بیئے بھاگ لگاؤ
باقی بچے تو نوگن کرلو پیچھے دوئی ملاؤ　　نانک اس ودھی ہر شئے میں تم نام محمدؐ پاؤ

....

عدد نکالو ہر چیز سے چوگن کرلو وائے　　دوملائے پچ گن کرلو، بیس سے بھاگ لگائے
باقی بچے تو نوگن کرلو، دو اس میں اور ملائے　　کہے کبیرا سنو بھائی سادھو، نامِ محمدؐ آئے

ان چوپائیوں میں حروف کے ابجدی اعداد سے ریاضی کا جو فارمولا سامنے آتا ہے اس کے مطابق کائنات کی ہر چیز کے عدد سے محمد کا عدد-۹۲ نکلتا ہے۔ اس طور دونوں سنتوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ خالق کائنات نے اپنے حبیب کا نوری کرنٹ ہر شئے میں دوڑا رکھا ہے۔ بالفاظ دیگر انہوں نے بھی تائید کی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ وجہِ تخلیق کائنات ہیں۔ اب دیکھیں کہ ڈاکٹر مناظر کے تخیل نے حسن و وجدان کی آمیزش سے منشاء الٰہی اور نانک و کبیر کے استدلال کی کیسی دلکش تجسیم کردی ہے کہ ''اسی کے نام سے دنیا میں زندگی ساری'' اور ''خلق خدا سے رشتہ ہے کیسا''؟ کی تہہ میں سیرت رسول اکرمؐ کی روشنی میں اترتے جایئے اور فکر وفن کے وجد آگیں کیف سے سرشار ہوتے جایئے۔

ایسی تاثیر محض سخن آفرینی کی نہیں لگتی کہ ''دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں''۔ ایسی صدائیں فی الواقع تبھی دل سے نکلتی ہیں جب تجربانا کا عرفان ہوتا ہے، اپنے وجود کے مقصدِ تخلیق کی منشائے خالق کا ادراک اور عاقبت کا ایقان ہوتا ہے۔ پھر احساس یوں جاگتا ہے :

کچھ کر نہ سکے طاعت وللہ نبیؐ کی ہم　　یہ سوچ کے دل اپنا کچھ اور پریشاں ہے

تب مرتعش بصیرت، ہادی اعظم و شافع محشرؐ سے دل کے تاروں کو اس طور جوڑ دیتی ہے کہ حبِ نبیؐ کی چنگاری دہکنے لگتی ہے جسے فروزاں کرنے کے لئے شاعر اپنے خالق سے یوں رجوع کرتا ہے:

اسے آباد کردے اے خدا حبِّ نبیؐ سے　　کہ اب تک دیدہ و دل کا مرے خالی مکاں ہے

ایسے احساس سے جگی بے قراری اور وجدانی کیفیت میں شاعر کا دل بھی گا ہے گا ہے مدحت سرا ہوتا رہا ہے۔ خیال ناچیز میں نعت گوئی کا حق بھی ایسی ہی کیفیات میں ادا ہوا کرتا ہے۔ بصورت دیگر محض سخن طرازی کے ثمرات میں وہ حلاوت کہاں ملتی ہے جو لبوں پر پھیل جائے۔

انسان عموماً دنیا کے دام تزویر یعنی مایا جال میں پھنس کر اپنے دیدہ و دل میں دنیا کو ہی بسا لیتا ہے لیکن جیسے ہی زندگی کے کسی مرحلے میں ایمان کی حرارت یہ احساس کراتی ہے کہ وہ صرف دنیا کے لئے نہیں بلکہ دنیا تو اس کے لئے محض ایک میدان عمل کی حیثیت رکھتی ہے، اس کیلئے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے تو اسے دیدہ و دل کے مکاں خالی ہونے کا احساس شدید ہوتا ہے تب دل کی گہرائیوں سے ایسی صدائیں نکلتی ہیں:

آپ کو تو چاہنے والوں کی اپنے ہے خبر — خواب ہی میں آکے دل پاکیزہ میرا کیجئے
کار دنیا آپ سے غافل کرے مجھ کو اگر — لو چراغِ عشق کی اس دم بڑھایا کیجئے
اک آپؐ کا سہارا مناظرؔ کو ہے فقط — کچھ مغفرت کا ہے نہیں سامان مصطفیٰؐ

یہ صرف مناظر کے جاگتے احساس کی چبھن نہیں رہ گئی ہے بلکہ اپنے سے باخبر ہر اہلِ ایماں کی حس کو بھی کچوکے لگاتی ہے۔ یہی تو شاعری کا کمال ہے کہ یہ شاعر کے احساس، اسکے مشاہدے، اسکے تجربے کو عام حسیات کا جزو بنا دیتی ہے لیکن یہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب بقول مناظر عاشق:

''شاعری اسلوب، طہارت اور جذبے کی بنیادی ہم کاری سے اور مختلف تخلیقاتی مراحل سے گزر کر ایک ایسے نقطہ ارتکاز تک پہنچاتی ہے جہاں حسن اور وجدان کی آمیزش سے صوتی ڈھانچے ماورائی معانی سے ارتباط پیدا کر کے نغمات سرمدی بن جاتے ہیں......'' (گفتنی،ص:۳)

اب دیکھیں کہ موصوف کا خیال ان کے فن میں کس طور اترا ہے۔ کہا ہے:

بخشا ہر ایک ذرّے کو خورشید کا فروغ — اعجاز یہ دکھا گئی صحبت رسولؐ کی

قبل اسلام کے عرب قبائل کی جبلت کو نظر میں رکھیں اور قبولیت اسلام کے بعد ان کی اشرفیت کے عروج پر نظر ڈالیں تو پوری تاریخ انسانی میں وہی دور ایسا سامنے آتا ہے جس میں تخلیق انسانی کی منشاء الٰہی پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ ایسی کایا پلٹ کرنے والی ہستی کون ہے؟:

دعا دشمنوں کے لئے بھی کرے جو — نہ آیا کوئی آج تک دیں کا رہبر
کبھی پیٹ بھر جو کی روٹی نہ کھائی — ہیں مختارِ عالم، چٹائی ہے بستر
ہیں محتاج و نادار و بیکس کی دولت — وہ بابِ کرم بھی تو بحرِ عطا ہیں
ہے عرفانِ حق بھی جو بندے کو حاصل — وہی ایسے رشتے کی محکم بنا ہیں

ظاہر ہے خالق کائنات نے جس ہستی کی وجہ سے کائنات کی تخلیق کی انسان کو خلیفۃ الارض بنایا اور انسان کے عرفانِ ذات، عرفانِ حق، عرفانِ عشق و منصب کا وسیلہ اسی اپنے حبیب کو بنایا تو پھر ان سے محبت و عقیدت رکھے اور ان کے شعار کی پیروی کئے بغیر کامرانی و فلاح انسانی کیسے ممکن ہے کہ:

محمدؐ کی محبت شرط ٹھہری دین و ایماں کی — بجز اس کے نہیں کوئی بھی صورت کام آئے گی
تفاخر بھی نہیں کچھ خاندانی کام آئے گا — غریبوں اور محتاجوں کی خدمت کام آئے گی

یوں مناظر عاشق ہرگانوی کے تخیلات ہماری تخئیل کو مہمیز، ہمارے احساس کو بیدار اور پندار کو چر کے لگا کر محاسبے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسے جذبہ واحساس کے فنی پیکروں کو محض خوش فکری کی سطح سے اٹھنے والی لہروں سے تعبیر کر کے نہیں گزرا جا سکتا۔ فی الواقع ع را ہے بہ خلوت دل جانانم آرزوست کی زیریں لہریں شاعر کی نس نس میں دوڑتی نظر آ رہی ہیں۔ بصورت دیگر تسلیم ورضا کی اس منزل پر پہنچنا ممکن نہیں کہ:

دل مرا واقف کچھ آداب محبت سے نہیں — عاشقِ ناداں سہی کچھ اُس کو دانا کیجئے
جب نعت نبیؐ کی ہوتی ہے — وہ داغ گنہ کے دھوتی ہے
ہوتی ہے معافی عصیاں کی — جب آنکھ گنہ پہ روتی ہے
ہم کو بتلا دیا مقصدِ زندگی — جس کو پانے کا بھی راستہ دے گئے

ڈاکٹر ہرگانوی کے دل میں جو سمائے، ان کی عقل نے جسے تسلیم کیا وہی اصل مقصد حیات انسانی ہے اور فی الحقیقت انسان کی کامرانی اور انسانیت کی فلاح کا صراط مستقیم بھی وہی ہے جو محسن انسانیت بتلا گئے لیکن فی الواقع اطاعت نفس، مقصود زندگی بن گئی ہے جس کے نتائج کو انسان کے ہی ایجاداتی کرشموں نے آئینہ کر رکھا ہے سو سکتی انسانیت اور ظلمت کا دور دورہ ہر آن پوری خلقت کے سامنے ہے باوجود اس کے نفس نے جو ڈگر پکڑ رکھی ہے اس پر پیچھے مڑ مڑ کر توبہ توبہ کرنے پر ہر کوئی گامزن ہے۔ اس صورت حال کا کرب و درد ان کی نعتوں میں بھی خوب ٹپکا ہے، مثلاً ایک آزاد نعت ملاحظہ ہو:

بحر ظلمت میں یا محمدؐ/ ہے آپؐ ہی کا بس اک سہارا/ فیوضِ شبنم کی جھنکیوں سے/ عذار گل ہے/
تگی ہے پت جھڑ سے/ آگ غم میں/ اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا ہے/ جو آشکارا ہے یا پیمبر/
ہم عاصیوں کے تم ہی مسیحا/ تمہارے دم سے ہے ضوفشانی

زمانے کے سرد و گرم کا احساس تو سبھی کو ہوتا ہے مگر ان کے اثرات ومضمرات کے محسوسات کی تجسیم کاری سب کے بس کی نہیں ہوتی۔ یہ تخلیق کار کے ہی جاگتے احساس کی مرہون منت ہوتی ہے۔ مناظر نے اس نعتیہ نظم میں اپنے زمانے کے حالات اور اس کے اثرات ومضمرات کی کربناک اور بصیرت افروز تجسیم کاری کی ہے اور ان کے مداوا کیلئے محسن انسانیتؐ کے التفات کرم کی جس طور آرزو کی ہے وہ جاگتے ہوئے احساس کی سراپا مظہر ہے۔

اس طرح کی عرفان ذات عشق اور عرفان تعلیقات معاشرہ پر مبنی احساسات کی دلکش و دلدوز تنویریں اور تصویریں مناظر عاشق ہرگانوی کی نعتوں میں بکھری پڑی ہیں۔ ان میں احساسات بظاہر شاعر کے ہیں مگر ہمارے احساسات بن کر دیدہ و دل میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ یوں ان کی نعتوں میں تازگی فکر، فنکارانہ حسن اور اسلوبیاتی تنوع دیدنی ہے جن میں عشق رسولؐ کی سوچ آگیں طہارت شاعر کے دل کی آواز بنتی صاف نظر آتی ہے۔

....

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ظفر اوگانوی کا ایک دلچسپ خط مع جواب

پروفیسر ظفر اوگانوی میرے بزرگ دوست تھے۔ اور یہ دوستی تب سے تھی جب وہ طالب علم تھے اور میرے گھر ہرگانواں کبھی اپنے والد بزرگوار مولانا سید فصیح احمد صاحب کے ساتھ اور کبھی تنہا آیا کرتے تھے۔ دراصل ان کے والد مولانا فصیح احمد استھانواں کے مدرسہ محمدیہ کے صدر مدرس بلکہ انچارج تھے اور میرے دادا خان بہادر حاجی عبدالرحیم وکیل اس مدرسہ کے نگراں یا ڈائرکٹر تھے۔ مولانا سید فصیح احمد کا معمول تھا کہ وہ ہر دس روز پر میرے دادا کے پاس آتے تھے اور مدرسہ کی پیش رفت کے سلسلے میں مشورہ کرتے تھے۔ ظفر اوگانوی ان کے ساتھ کبھی کبھی آیا کرتے تھے اور ہماری دوستی ہوگئی تھی کہ وہ میرے پاس ہی زیادہ وقت گذارتے تھے۔ تب میں اسکول کا طالب علم تھا اور وہ بی اے آنرز پاس کر چکے تھے اور انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لیا تھا۔ حالانکہ ظفر اوگانوی کی پیدائش سرونج (مدھیہ پردیش) میں ہوئی تھی۔ تب ان کے والد وہاں کے ریاض المدارس میں اردو، فارسی اور عربی کے مدرس تھے۔ لیکن بعد میں وہ استھانواں (ضلع پٹنہ) آگئے تھے۔ ظفر اوگانوی نے مدرسہ محمدیہ سے ہی اپنے والد کی نگرانی میں فوقانیہ بورڈ کا امتحان پاس کیا تھا۔ میں نے ۱۹۶۲ء سے لکھنا شروع کیا تھا اور ۱۹۶۳ء سے رسائل میں چھپنے لگا تھا۔ میری رفتار تیز تھی جبکہ ظفر اوگانوی نے پہلا افسانہ ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا اور اسی سال پٹنہ کے ''صنم'' میں شائع ہوا تھا۔ یہ خاموشی ۱۹۷۰ء میں ٹوٹی جب ان کی ایک نظم کٹک کے رسالہ ''شاخسار'' میں شائع ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں ان کی غزل بھی چھپی لیکن اس سے قبل ان کا ایک تنقیدی مضمون ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اس طرح لکھنے کی وجہ سے ہم زیادہ قریب آگئے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں جب انہیں یو جی سی سے فیلوشپ ملا تو انہوں نے پی ایچ ڈی کے لئے جمیل مظہری کی نگرانی میں رجسٹریشن کرایا۔ تب کبھی کبھار میرا پٹنہ جانا ہوتا تھا۔ جب بھی گیا ظفر اوگانوی سے ضرور ملتا اور ایک وقت کا کھانا وہ دسترخوانیہ ہوٹل میں مجھے ضرور کھلاتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں صغیر بلگرامی پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی اور ۱۹۶۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ اور وہ وہیں کے ہو گئے۔ تب ان سے رابطہ کم ہو گیا۔ ۱۹۹۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس دوران میری نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ایک تھیسس ان کے پاس گئی۔ ایک بار وہ بھاگلپور آئے۔ اور ایک بار میرا کلکتہ جانا ہوا۔ میرے ساتھ ایک لکچرر سید جمشید حسن تھے۔ ہم دونوں ان سے ملے تو اگلے دن دوپہر کے کھانے پر انہوں نے اپنے یہاں بلایا اور مرغ و ماہی سے ضیافت کی۔ ہاں، اپنا رسالہ ''کوہسار جرنل'' میں انہیں بھیجتا تھا۔ مشمولات سے متعلق تین چار بار انہوں نے خطوط لکھے۔ ایک خط تفصیلی اور دلچسپ ہے۔ یہ یکم جون ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ کریں:

''کوہسار جرنل، آپ جس محبت اور استقلال کے ساتھ مجھے ارسال کر رہے ہیں اس سے ''وفاداری بشرطِ استواری'' کی صحیح مثال میرے سامنے آئی ہے۔ میں آپ کی ''کاوش'' کا معترف ہوں لیکن

کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ آپ خواہ مخواہ نزاعی مسئلوں میں خود بھی الجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھا دیتے ہیں۔ کبھی آپ مذہبی مسائل پر بھی زور توجہ صَرف کرتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کی کاوشیں صرف ادب اور اس کے مسائل تک محدود رہیں۔ اور یہ دنیا اتنی وسیع ہے کہ اگر سنجیدگی سے کام کیا جائے تو آپ ''کوہسار جرنل'' کو مذہب اور مذہبی سیاست سے الگ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

بہر حال، یہ چند جملے برسبیل تذکرہ اور مشورہ تھے۔

ویسے پچھلے کئی شمارے بحیثیت مجموعی اپنے اعتبار سے وقیع تھے۔ آپ کے ذوق مطالعہ، وسیع المشرب کردار اور تحرک سے یہ امید بندھتی ہے کہ ''کوہسار جرنل'' کو معیار و وقار بہت جلد حاصل ہو جائے گا۔

محترم عبدالواسع صاحب پر مجھے کچھ لکھنا ہے۔ یہ قرض ہے۔ کوشش میں ہوں کہ جلد ادا ہو جائے۔

مکرر یہ کہ کراچی سے محبی رفعت القاسمی کا ایک خط آیا تھا۔ اس میں انہوں نے بطور خاص آپ کے لئے درج ذیل جملے تحریر کئے ہیں۔ من وعن نقل کر رہا ہوں:

''یادش بخیر! ایک ڈیڑھ سال قبل مجھے ایک سوالنامہ ملا تھا۔ کوئی صاحب غالباً حبیب مرشد خاں ہیں۔ ''اردو غزل ۱۹۶۰ء کے بعد'' کے موضوع پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے زیر نگرانی مقالہ لکھ رہے تھے۔ میری عادت اور میرا اشعار نہیں کہ کسی تذکرے کے لئے یا اور کوئی سوالنامہ پُر کر کے بھیجوں۔ عاشق ہرگانوی صاحب کو میرے ایک دوست نے کتاب بھجوائی تھی۔ میری کتاب ان کے پاس ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کوئی رسالہ نکالا تھا (عاشق نے)، اس میں میری ایک دو غزلیں بھی چھاپی تھیں۔ لیکن آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میرا نام رفعت القادری یا ہاشمی لکھا تھا۔ میں نے وہ رسالہ نہیں دیکھا۔ لیکن جس شخص کی نگرانی میں حبیب مرشد خاں مقالہ لکھ رہے ہیں اور ان کا یہ حال ہو تو سوالنامہ پُر کر کے کیا بھیجنا۔''

(ہاں، رفعت القاسمی صاحب کا مجموعہ مجھے پروفیسر افتخار اجمل شاہین صاحب نے بھیجا تھا۔ اسی کی روشنی میں حبیب مرشد خاں صاحب کی طرف سے انہیں سوالنامہ ارسال کیا گیا تھا۔ لیکن آگے کی ''شکایت'' کے لئے ان کی ''یادش بخیر'' نے دھوکہ کھایا ہے۔ ''کوہسار جرنل'' ''کوہسار'' یا اپنی ادارت و مشاورت میں شائع ہونے والے کسی بھی رسالے میں رفعت القاسمی صاحب کا کلام میں نے آج تک شائع نہیں کیا ہے۔ اور نہ ہی ابھی تک ان کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ لکھا ہے۔ اس لئے ''غلط نام'' میرے رسالے میں شائع ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔ اب جب کہ انہوں نے ''محبت'' دکھائی ہے تو میں ان کا کلام اور ان کی کتاب پر تبصرہ جلد ہی شائع کروں گا۔ ویسے ان کے لئے عرض ہے کہ ہندوستان میں ''رفعت'' اور ''فرحت'' کے ساتھ ''قادری'' اور ''ہاشمی'' لکھنے والے کئی شاعر ہیں جن کی تخلیقات میں شائع کرتا رہتا ہوں — ہرگانوی)!

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

اردو افسانچے کا ایک المیہ

اردو میں افسانچہ کے موجد سعادت حسن منٹو مانے جاتے ہیں اور جوگندر پال نے اس صنف مختصر نویسی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن افسانچہ کے لئے اردو میں کوئی حتمی تعریف سامنے نہیں آئی ہے۔ کسی اصول، کسی بندش، کسی قاعدہ یا کسی متضاد نظریہ سے بھی واقفیت نہیں ملتی ہے۔ بلکہ مختصر جملے، ریزہ کاری اور ریزہ خیالی اس کا آئینہ خانہ ہے۔ اس کے فن میں معجزہ اور کرامات شامل نہیں ہیں بلکہ بات، واقعہ یا محسوسات کو اس طرح کم سے کم الفاظ میں سمیٹا جاتا ہے کہ دل کو چھو لے۔ اس نقاب پوش آرٹ میں برتنے کی سلیقگی ہے اور حقیقت کا استفہام ہے۔ کشش اور پیکر تراشی کا ضابطۂ اظہار بھی ہے۔ اردو میں اس کے نمونے بھرے پڑے ہیں۔ میری تین کتابوں ''قوس قزح''، ''پرت در پرت'' اور ''خواتین کے افسانچے'' میں افسانچوں کی کہکشاں دیکھی جاسکتی ہے۔

آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اختتام پر یہ دعویٰ سامنے آرہا ہے کہ ''میں بچوں کے افسانچہ کا موجد ہوں۔'' مجھے اس بچگانہ دعویٰ پر ہنسی اس لئے آئی کہ اردو میں بچوں کے افسانچے کی روایت بہت پہلے سے موجود ہے۔ بچوں کا پہلا رسالہ ''پھول'' ۱۹۰۸ء میں لاہور سے نکلا تھا۔ اس کے بعد ''غنچہ'' ۱۹۲۲ء میں بجنور سے، ''پیام تعلیم'' ۱۹۲۴ء میں دہلی سے، ''نونہال'' ۱۹۴۳ء میں دہلی سے، ''کھلونا'' ۱۹۴۷ء میں دہلی سے اور آج تک درجنوں رسائل نکلتے رہے ہیں جن میں بچوں کا صفحہ مختص ہوتا رہا ہے۔ ان صفحات پر بچوں کے لکھے چند سطری معیاری افسانچے چھپتے رہے ہیں جن کی تعداد ہزاروں میں ہوگی۔ تب بچوں کے افسانچوں کے موجد وہ کہلائیں جو ۱۹۰۸ء سے شائع ہورہے ہیں۔ خود منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' میں اور جوگندر پال کے دونوں مجموعے میں بچوں کے معیار کے افسانچے شامل ہیں۔

رستہ سازی اور سوچ میں پرواز کی کمی کی وجہ سے غلط دعویٰ سامنے آنے سے ادب میں گمراہی پھیلتی ہے۔ مانوس فضا میں اجنبیت پھیلانا کوئی تاریخی کارنامہ نہیں بلکہ اردو افسانچے کا یہ المیہ ہے۔

نقشبند قمر نقوی بھوپالی

کند ہم جنس با ہم جنس......

اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے قرآن پاک میں واضح الفاظ میں اعلان فرمایا:

ان الشیطان للانسان عدو مبین (بے شبہ شیطان، انسان کا کھلا دشمن ہے)۔

جب اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے آدم وحوا کو جنت میں اقامت کا حکم دیا تو ان کو متنبہ کر دیا تھا کہ وہ شیطان سے ہوشیار رہیں اور اس کے فریب میں نہ آئیں۔ لیکن شیطان نے ان کو بہکا ہی دیا، اور ان کو جنت سے نکلوا دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

و قلنا یا ادم اسکن انت و زوجک الجنۃ و کلا منھا رغدا حیث شئتما و لا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین، فاز لھما الشیطان عنھا فا خرجھما مما کانا فیہ۔ (سورۃ البقرہ)

(اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، اور اس میں جو چاہو کھاؤ پیو، اور اس درخت کے پاس مت جانا، ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے، پھر ہلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے۔)

انسان اور شیطان کی رزم آرائی زمین پر انسان کی آمد سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے جب آدم کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا تو ملائکہ کو حکم دیا، آدم کو سجدہ کریں، سارے ملائکہ نے حکم کی تعمیل میں آدم کو سجدہ کیا، لیکن شیطان نے سجدہ نہیں کیا، حکم عدولی کا مرتکب ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے اس کو ملعون قرار دیا، اسی وقت سے وہ انسان کا دشمن ہو گیا۔

البتہ قدیم زمانے میں انسان کی عقل اور شعور بھی ارتقا کے ابتدائی دور میں رہے ہوں گے، ایسے متعدد امور کا ان کو علم نہیں تھا جو ایک مدت بعد رائج ہوتے گئے۔ جس طرح انسان نے علوم وفنون میں بتدریج ترقی کی اسی طرح کئی افعال وطریقے بھی ان کو ہمیشہ سے معلوم نہیں تھے، خصوصاً انسان کی بنیادی معصومیت کے پیش نظر ان سے کسی بدی کے ظہور کا امکان قطعاً نہیں تھا۔ لیکن ان نیک بندوں پر شیطان کی نظر یقیناً رہی ہوگی اور یہ کوشش بھی کہ ان کو مختلف برائیوں سے آشنا کر کے نیکی کے راستے سے ہٹائے۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے اسی کام کا وعدہ کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کیلئے مختلف زمانوں میں نبی اور رسول مقرر فرمائے جن کو حسب ضرورت ایسے علاقوں، اور شہروں، یا قبیلوں میں تعینات کیا جہاں اصلاح اور ہدایت کی ضرورت تھی۔ لوگ ان رسل کی ہدایات پر عارضی طور سے ایمان لاتے اور کچھ مدت بعد پھر گمراہی کی راہ پر چل نکلتے، نتیجتاً مزید رسل متعین کئے جاتے۔

کئی ہزار سال قبل مسیح ایک علاقہ مدین، جو شرق وسطیٰ کا ایک خطہ تھا، اور غالباً عرب کے شمال میں واقع تھا، ایک قوم کا وطن تھا۔ یہ قوم مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے، اسی لئے اس علاقے کا نام مدین ہو گیا تھا، توراۃ اور انجیل سے معلوم ہوتا ہے، یہ علاقہ شام کے جنوب مشرق اور عرب کے شمال میں واقع تھا۔ یہاں جو قوم آباد تھی، اس نے شہر سدوم کو اپنا مستقر بنایا تھا اور نزدیکی علاقوں پر تسلط قائم کر لیا تھا، اس قوم کے لوگوں نے مختلف برائیاں تو

اختیار کی ہی تھیں، ایک ایسا فعل قبیح بھی اختیار کرلیا تھا جو ان سے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا، وہ اپنی نفسانی خواہش ہم جنسوں سے پوری کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے: ولوطا اذقال لقومه اتا تون الفاحشة ما سبقكم بها من احدمن العالمين (سورہ: اعراف، آیت: ۸۰) (ہم نے ہی لوط کو بھیجا، اس نے اپنی قوم سے کہا تم لوگ ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا جہان میں کسی نے نہیں کیا)۔

ابن کثیر نے سورۃ اعراف کی تفسیر میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''جن میں ایک برائی اغلام بازی تھی جو ان سے پہلے دنیا میں مفقود تھی، اس بدکاری کے موجد یہی لوگ تھے۔''

حضرت لوطؑ، ہاران بن آذر کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر) اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے ان کو مبعوث فرما کر سدوم میں تعینات کیا تھا۔ ابن کثیر نے ہی (تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورۃ اعراف، جلد دوم، صفحہ ۱۸۶) یہ بھی لکھا ہے: ''حضرت لوطؑ نے فرمایا، تم سے پہلے تو یہ ناپاک اور خبیث کام کسی نے نہیں کیا۔ عورتوں کو جو اس کام کے لئے تھیں چھوڑ کر تم، مردوں پر ریجھ رہے ہو۔''

اس طرح یہ یقینی بات ہے کہ اس فعل قبیح کی موجد مدین کی قوم ہی تھی۔ ان سے پہلے دنیا میں ایسا کام کسی نے نہیں کیا تھا۔ تورات اور انجیل میں بھی (بائبل، کتاب جینیسس) اس قوم کی اس عادت کا مفصل تذکرہ اور مذمت ہے، لیکن جس طرح ان کتابوں کی تحریف کی گئی ہے اس کے پیش نظر اس کام میں ملوث مغربی معاشرے ممکن ہے آئندہ اشاعتوں میں یہ تذکرہ حذف کر دیں۔

بائبل سے ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وبا، یونان میں بھی پہنچ گئی تھی۔ غالباً مدین کے لوگوں سے ان اقوام نے بھی سیکھی جن سے ان کا تجارتی رابطہ رہا ہوگا۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مذکورہ بالا آیات کی تفسیر میں لکھا ہے:

> ''لوط، سدوم اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے، تا کہ ان کی اصلاح فرمائیں اور گندے خلاف فطرت اور بے حیائی کے کاموں سے باز رکھیں جن میں وہاں کے لوگ مبتلا تھے'' بلکہ اس بے حیائی کے موجد تھے'' ان سے پہلے عالم میں اس بیماری سے کوئی واقف نہیں تھا، اوّلاً یہ حرکت شیطان نے سدوم والوں کو سجھائی اور وہیں سے دوسرے مقامات میں پھیلی۔'' (تفسیر عثمانی ص: ۲۴۹)

بائبل میں یہ بیان، سدوم اور جمورا کے حوالے سے بالتفصیل، کتاب جینیسس کے ابواب ۱۸ اور ۱۹ میں شامل ہے۔ یونان سے ایران، افغانستان اور مغرب میں یورپ کے مختلف ممالک میں رائج ہوتا رہا، قدیم ہندوستان کی تواریخ میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

مشہور مورخ ہیروڈوٹس، جو ترکی کے شہر بدروم میں تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح گذرا ہے، اپنی مشہور زمانہ تالیف 'ہسٹوریا' میں لواطت کا تذکرہ نہایت تضحیک اور کراہت کے ساتھ کرتا ہے۔ اسی کا بیان ہے کہ یہ کام لوگوں نے یونانیوں سے سیکھا تھا۔ یونانیوں نے لکھا ہے کہ انہوں نے یہ افعال بد ایرانیوں سے سیکھا تھا۔

مشہور یہودی فلسفی، فیلو، جس کا زمانہ ڈیڑھ دو سو سال قبل مسیح قیاس کیا گیا ہے، اپنی کتاب میں لواطت کا تذکرہ نہایت کراہت اور مذمت کے ساتھ کرتا ہے۔

ایک اور مشہور مورخ و فلسفی Plutarch جو دراصل یونانی تھا، لیکن رومن دربار سے وابستہ ہو کر رومن ہو گیا، اپنی معروف کتاب Moralia میں ایرانیوں کے بارے میں رقمطراز ہے:

"Iranians used to sleep with eunach boy"

رومن بادشاہ جسٹینین نے اپنی کتاب شمارہ ۷۷ میں، جو تقریباً ۵۳۸ء میں لکھی گئی، اس بدفعلی کے مرتکبین کی مذمت کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام رومن سلطنت میں بھی ہوتا تھا۔

زرتشتی دینی کتاب Venidad میں بھی ہم جنسی یا لواطت کا تذکرہ مذمت آمیز الفاظ میں ہے۔

یورپی ملکوں میں بھی لواطت کا رائج ہونا ثابت ہے، انگلینڈ اور فرانس میں تو ایسے بازاروں کا وجود تھا جہاں طوائفوں کے ساتھ ساتھ، مذکر طوائفوں کی دکانیں بھی ہوتی تھیں۔

عرب جاہلیت کے دور میں اس کام سے پاک نہیں تھا، ایک ایسا واقعہ بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ضرور ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس فعل بد سے ناواقف نہیں تھے، ایک بار جب اہل مکہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین صلح اور افہام و تفہیم کی کوشش بار آور ہونے کو تھی عتبہ نے سجدہ کرنے سے اس لئے انکار کیا تھا کہ وہ اپنے 'سرین' اٹھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے مٹھی بھر کنکریاں زمین سے اٹھا کر پیشانی میں لگائیں جس کا مطلب سجدہ سمجھا گیا۔ (سیرۃ النبیؐ شبلی نعمانی)

خلافت بغداد کے اس دور میں جب ''باللہ'' نام کے خلفا ہوا کرتے تھے، اور جو خلافت کے زوال کا زمانہ تھا، کم عمر تر کی لونڈے بطور خدام (یا غلام) رکھے جانے لگے، ان کو باللہی خلفا عزیز رکھتے تھے، بعض خلفا کے لئے ان غلاموں کے پورے دستے کے دستے ہوا کرتے تھے، یہ لونڈے آخر زمانے میں اس قدر با اثر ہوئے کہ سلطنت کا کاروبار ان کے ہاتھوں میں چلا گیا، خلفا صرف عیش کرتے تھے۔

سارے یورپ، اور مشرق وسطیٰ میں صاحب استطاعت لوگ غلاموں اور کنیزوں کے شائق تھے، اس زمانے میں کنیزوں اور غلاموں کی خرید و فروخت ایک منافع بخش تجارت ہو گئی تھی، آخر دور میں جو مغل طاقت کے عروج کا دور تھا، غلاموں کی خرید و فروخت کی زیادہ گرم بازاری تھی، ان غلاموں کی قیمتوں میں شکل و صورت کی بنیاد پر کمی بیشی ہوتی تھی۔ حسین و جمیل اور خوش جسم غلاموں کی قیمت زیادہ لگتی تھی، تواریخ میں غلاموں کی خرید و فروخت کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ ملتا ہے جبکہ اسی دور میں کنیزوں کا بازار کسی قدر سرد رہا، غالباً وسط ایشیا میں لواطت کا رواج تھا، اسی لئے یہ مغلوں میں رائج رہا۔

اگر شاعری کو ماحول اور معاشرے کے حالات و جذبات کا آئینہ دار سمجھا جائے، تو ایران کی شاعری میں لواطت کے واضح نشانات ملتے ہیں، ایران کی قدیم، زمانۂ وسطیٰ اور جدید شاعری میں، ہم جنس سے تخاطب کا رواج رہا ہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا   بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

''ترک شیرازی'' کسی ''حسینہ'' کا لقب تو نہیں ہوسکتا۔ ''حسین'' کیلئے کہا گیا ہے۔ یہ کہنا قطعاً درست نہیں کہ ان شعرا کا خطاب عورتوں سے تھا۔

ایران کے شہر تہران میں ۱۹۷۶ء کے دور میں ایک علاقہ حرام کاری کیلئے مخصوص تھا۔ اس کو ''شہر نو'' کہا جاتا تھا۔ یہاں طوائفوں کے ''خانوں'' کے علاوہ لونڈوں کے خانے بھی ہوتے تھے۔

ہندوستان کے مغل دور میں فارسی حکومت کی زبان بھی رہی، اور عوام میں بھی مروج ہوگئی، بنیادی طور سے اردو شاعری آغاز سے ہی فارسی شاعری سے متاثر رہی، ابتدائی شاعری کا جائزہ بتاتا ہے کہ اردو میں بھی فارسی شاعری کی تراکیب، انداز بیان، اور اکثر مضامین سے ہی استفادہ کیا گیا۔ البتہ بہت ابتدا میں، جو امیر خسرو وغیرہ کا زمانہ تھا، ہندی الفاظ بھی اردو میں شامل رہے اور ہندی طرز تخاطب سے استفادہ کیا گیا، ہندی شاعری میں عورت کا خطاب مرد سے ہوتا تھا، امیر خسرو نے وہی طریقہ اختیار کیا، جیسے ان کے اس شعر سے ظاہر ہے:

شبانِ ہجراں دراز چوزلف، روزِ وصلش چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

لیکن ان کے بعد جو شعرا ہوئے انہوں نے یہ طریقہ ترک کر کے فارسی شاعری کا تتبع کیا، اور خطاب ہم جنس سے ہونے لگا، نجانے کس سبب سے اردو شاعری میں عورت سے خطاب کو معیوب خیال کیا گیا، سارے شعرا کچھ ایسے اولیا اصفیا تو نہیں ہوتے تھے جو دین کے خیال سے ایسا کرتے، لواطت تو دینی اعتبار سے ہی نہیں، بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے بھی انتہائی مذموم اور حرام کام ہے، اگر ان کے مضامین کو دن رات بڑے ذوق وشوق سے بیان کیا جاسکتا تھا، تو عورت سے خطاب میں دین کیسے مانع ہوسکتا تھا۔ جیسے درج ذیل شعر:

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر   یا وہ جگہ بتادے جہاں پر خدا نہ ہو

بڑے بڑے مجمعوں میں، شاعر لہک لہک کر لونڈوں کی تعریف میں غزل درغزل پڑھتے اور کوئی مجوب نہیں ہوتا تھا، حتیٰ کہ لونڈوں کے شباب کا تذکرہ بھی واضح الفاظ میں کیا جاتا تھا، جیسے:

صاف تھا جب تک تو ہم کو بھی جواب صاف تھا   اب تو خط آنے لگا، شاید کہ خط آنے لگا

یعنی لونڈے کے چہرے پر سبزۂ خط نمودار ہوگیا، یا درجِ ذیل شعر:

لگا نہ خط سے رخ پُر عتاب کو عیب   وگرنہ لگتا گہن سے ہے آفتاب کو عیب

مراد یہی ہے کہ ''سبزۂ خط'' سے بھی اس چہرے میں عیب نہیں پیدا ہوا۔

اردو شاعری نے اس روش کو موجودہ دور میں بھی ترک نہیں کیا، ابھی تک شعرائے کرام لونڈوں کو ہی مخاطب کئے جارہے ہیں، جتنا کلام رسائل میں شائع ہوتا ہے، یا مشاعروں میں پڑھا جاتا ہے۔ سارا اسی روش کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور ان کے خالقین کو اپنے اس طریقے اور وضع شاعری پر نہ شرمندگی ہوتی ہے نہ ان مضامین کے بیان میں تکلف ہوتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ان بیانات کو جنس مخالف سے خطاب تصور کیا جانا چاہئے لیکن یہ محض غلط بیانی ہے۔ اگر جنس مخالف سے منسوب کرنا ہی مقصود ہو تو اس کو واضح بیان کرنے سے اجتناب کیوں؟ ایک بے غیرتی کے کام

سے اجتناب نہیں اور ایک قدرتی طریقے سے اجتناب کا بہانہ ہے!

دورِ حاضر میں جبکہ انسان کرۂ زمین کی بندشوں سے نکل کر اجرام فلکی کی جانچ پڑتال کر رہا ہے، اور وہ وقت دور نہیں جب کسی اور سیارے پر انسانوں کی بستی بسالی جائے، تو انسان کی اخلاقی اور معاشرتی حالت میں ترقی کے شجر میں بھی طرح طرح کے گل بوٹے نکلنے لگے ہیں۔

اس پیش رفتگی کا شاخسانہ یہ کہ بعض معاشروں میں لواطت نے جرم اور گناہ کے دائروں سے نکل کر قانون کی پناہ حاصل کر لی، ایسے بھی ترقی یافتہ ممالک میں جہاں شرم اور غیرت نے خلعت بے حیائی زیب تن کر لیا، اور متعدد گناہوں اور جرائم کو عام اعلان کے ساتھ زیرِ عمل لانے کو جائز قرار دے لیا۔ اسکینڈ ینیوین ممالک میں بہت کچھ جائز ہوتا تھا، لیکن نیدرلینڈ نے اس کی انتہا کرتے ہوئے، ہم جنسوں کے شادی کو قانون کی پناہ عطا کی، اور اسی ملک میں پہلی مرد کی شادی مرد سے ۲۰۰۲ء میں قانونی طور پر ہوئی۔ یہ گویا اس کام کا آغاز تھا۔ اس کی اقتدا برطانیہ نے کی، اور فوراً بعد امریکہ میں بھی ہم جنسی شادیاں قانونی طور پر انجام پانے لگیں۔

یورپ اور امریکہ میں اب مفعولوں کو شرم و غیرت کی ضرورت نہیں رہی، فاعل اور مفعول اب علی الاعلان اپنی اس قسم کی ترجیجات کو ظاہر کرتے ہیں، ان کے حقوق کا تذکرہ ہوتا ہے، مفعولوں نے اپنا لقب ''گے'' رکھ چھوڑا ہے، ان کے جماعتی نظام ہیں، جلسے ہوتے ہیں، جلوس نکلتے ہیں، یہ لوگ اپنے حقوق کے طالب ہوتے ہیں جس میں سب سے اہم حق یہ کہ ہم جنس شادی میں جو مرد ''بیوی'' کا کردار ادا کرتا ہے اس کو قانون ''بیوی'' تصور کرتے ہوئے، سارے حقوق عطا کرے۔

امریکہ میں پہلے تو ''گے'' شخص کو سرکاری اداروں اور اکثر نجی اداروں میں بھی ملازمت دینے سے اجتناب کیا جاتا تھا لیکن ''گے'' جماعتوں نے جلسوں اور جلوسوں اور احتجاجات کے ذریعے ان سب اداروں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس قسم کی تخصیص نہ کریں۔ عدالت نے بھی ان کی پشت پناہی کی اور اس کو ذاتی ترجیح قرار دیا۔ لہٰذا اب نہ صرف نجی اداروں میں ان کو ملازمت مل جاتی ہے بلکہ سرکاری اداروں میں بھی اجازت ہوگئی ہے۔ امریکہ میں تو افواج میں بھی ان کو رکھا جانے لگا۔

لواطت کے ساتھ ساتھ ایک اور نجاست نے بھی رواج پایا،...... عورت کا عورت کے ساتھ جنسی تعلق...... جو لواطت سے بھی زیادہ قابل مذمت کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں عصمت چغتائی کے ایک مشہور افسانے سے اس کے رواج کا پتہ چلتا ہے، ممکن ہے اس کا افسانہ ذاتی تجربے پر مبنی ہو۔

اب امریکہ میں ہم جنسوں کے مابین شادیوں کی تقریبات بھی اسی طرح منعقد ہوتی ہیں جس طرح مرد عورت کے رشتے کی تقریبات، اور ان کی صدارت بھی پادری جی کرتے ہیں، جو خطبۂ ازدواج بھی پڑھتے ہیں۔ اخبارات میں ایسی ازدواج کی تصاویر بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی ہیں تاہم امریکہ کی تقریباً ایک درجن ایسی ریاستیں ہیں جو ہم جنسوں کی شادی کو خلاف قانون اور مخرب اخلاق خیال کرتی ہیں، ان ریاستوں میں ہم جنسی شادیوں کی اجازت نہیں۔

اکثر اسلامی ممالک میں ابھی تک تو اس کام کو شرمناک اور بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے، کسی اسلامی ملک میں اس

کے جائز ہونے کی اطلاع نہیں۔ جن ملکوں میں ہم جنسی شادیاں رائج ہیں، وہاں ایسی رفاقتوں کی مدت قیام کے بارے میں علم نہیں، لیکن بدیہی بات ہے ایسے رشتے زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتے۔ ایک بار لندن میں عبدالغفار مرحوم کے زیرانتظام ایک اردو کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں اس نے ہندوستان اور پاکستان کے متعدد ممتاز ادیبوں کو مدعو کیا، ان لوگوں نے اردو کے بارے میں مقالے پڑھے، اسی کانفرنس میں شکاگو میں مقیم ایک ہجڑہ نما شخص نے جس کو کچھ تماش بینوں نے ادیب سمجھ رکھا تھا، اپنا مضمون پڑھا جس کا اردو سے تعلق نہیں تھا بلکہ ''ہجڑوں'' کے ہجڑا بننے، ان کے رسوم و رواج، ان کی مفعولیت اور طور طریقوں کا بیان تھا، یہ ساری روداد اس کے ذاتی تجربوں پر مبنی تھی، اسی نے بیان کیا تھا کہ مردوں کی مردوں سے شادی یا عورتوں کی عورتوں سے، دیرپا نہیں ہوتی، دو چار سال کے بعد فریقین الگ ہو جاتے ہیں۔

امریکہ کے اخبارات میں ایسی کوئی خبر نظر سے نہیں گذری جس میں ہم جنس شرکائے حیات کی ایک مدت بعد علیحدگی اختیار کرنے کی خبر دی گئی ہوتی، ایک دو طلاق کے مقدمات ضرور عدالتوں میں پیش ہوئے، لیکن ایسے فضول رشتے مستقل ہرگز نہیں ہو سکتے کچھ عرصہ بعد ہی فریقین ایک دوسرے سے تنگ آجاتے ہوں گے اور اپنی اپنی راہ لیتے ہوں گے، ان واقعات کی تشہیر بھی غیر ضروری ہے۔

ہم جنسی کا ایک ہولناک انجام تو وہ مرض ہے جس کا علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ یعنی ''ایڈز''۔ یہ مرض جس کو ہوا وہ اس کی تشخیص کے بعد جلد ہی فنا ہو گیا۔ اس کا سب سے پہلا نہایت شہرت یافتہ شکار تو امریکی فلم ایکٹر راک ہڈسن تھا، اس کی موت کے بعد ہی سائنسدانوں کی توجہ اس مرض کی طرف ہوئی۔ وہ لوگ جو ہم جنس سے شادی کر لیتے ان میں سے کسی کے اس مرض میں مبتلا ہونے کی خبر نہیں سنی گئی، اسی طرح کسی ''لیسبین'' عورت کے ایسے کسی مرض میں مبتلا ہونے کی بھی کوئی اطلاع نہیں ہے۔

پاکیزگی، اخلاق، خوبیٔ اعمال اور شرم وحیا کو جو تصور اسلام نے پیش کیا انسانیت اس کی مثال پیدا نہ کر سکی۔ باوجودیکہ اس شریعت پر کم لوگ عمل پیرا ہیں، لیکن جو لوگ عمل نہیں کرتے ان کو بھی اسلامی اقدار کی پاسداری کا خیال ضرور رہتا ہے، اور واقعتاً ان کی بھی کوشش یہی ہوتی ہے کہ خلاف شرع کام سرزد نہ ہو، البتہ شیطان بھی اپنی حرکات سے باز نہیں آتا، کچھ کمزور ارادے والے لوگ اس کے فریب میں ضرور آجاتے ہیں۔

اسلامی ممالک بے شک بدحالی، انتشار اور افتراق میں مبتلا ہیں، لیکن ان ممالک میں زندگی کی اقدار اب بھی ان ممالک سے مختلف ہیں جہاں اسلام نہیں ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ جس کام کو اسلامی ممالک میں برا سمجھا جاتا ہو، وہی کام غیر اسلامی ممالک میں جائز قرار دے دیا گیا ہے، اگرچہ یہودی اور عیسائی پاک کتابوں میں، اس کام کی سزا بھی اسلامی سزا سے مختلف نہیں۔ زبور، توراۃ اور انجیل وقرآن ساری کتب کا منبع وخالق تو ایک ہی ہے۔ اس لئے احکام میں مماثلت کا ہونا قدرتی بات ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ سب اقوام نے اپنی کتابوں میں ایسی تحریفات کر لیں کہ اصل احکام و بیانات نہیں ملتے، قرآن پاک ہی واحد ایسی کتاب ہے جو ہر قسم کی تحریف وتبدیلی سے پاک ہے۔

شریعت اسلامی میں لواطت کی سزا کے بارے میں مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ ہر ایک میں رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا:

''جسے تم لوطی فعل کرتے پاؤ، اس کو اور اس کے نیچے والے، دونوں کو قتل کردو۔''

امام شافعیؒ بھی اس حدیث مبارک کے حکم کی تعمیل کی تائید کرتے ہیں۔

اسلام نے حیا، غیرت اور اخلاق کی پاکیزگی کا جو بے مثال تصور پیش کیا اس پر اب صرف وہ لوگ عمل پیرا ہیں جن کو قدامت پسند کہا جاتا ہے۔ اس اخلاق کا کوئی شائبہ بھی کسی مغربی ملک یا قوم میں موجود نہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک جن میں سے بیشتر اسلامی روایات کے امین سمجھے جاتے ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں ناکام اور پس ماندہ رہ کر اپنی زبوں حالی میں گرفتار ہیں۔ اس حالت میں بھی مغربی معاشروں کے اثرات ان کی زندگی کو متاثر کر کے، اسلامی اقدار کی بیخ کنی میں مشغول ہیں۔ پاکستان کے معاشرے میں اس تخریبی کارروائی میں مزید اضافہ ہندوستان کی فلمی بے راہ روی کی نقالی سے ہو رہا ہے، جس کا نتیجہ ہے، پاکستانی لوگ ہندوستان کی متعدد رسوم اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اسلام سے بتدریج دوری اس کا نتیجہ ہے۔ پاکستان خصوصیت کے ساتھ مغربی معاشروں کے رسوم و رواج کی چکاچوند پر ریجھ کر نہایت خوشی سے ایک غیر محسوس انقلاب میں مبتلا ہے!

معاشرتی انقلاب...... اسلامی ممالک کے معاشروں کی بنیاد میں گھس گیا ہے، اور عمارت کو اکھاڑے دے رہا ہے، مسلمان اب یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے دین میں کس خاموشی اور کامیابی کے ساتھ لادینیت اور فحاشی شامل کی جارہی ہے، بلکہ وہ ان جدید طریقوں کے اختیار کرنے میں خوش ہیں جو ان کو بالآخر دین سے دور کردیں گے۔

....

● ۶۴۴۶- ایس، انڈین پولس پلیس، ٹلسا، او کے-۷۴۱۳۶ (امریکہ)

● محمد طارق (اصل نام: ظریف اعجازی، ولادت: ۱۱رستمبر ۱۹۴۹ء، ولد: مولوی اعجاز احمد نستوی مرحوم سابق وائس چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ، دربھنگہ، مقیم: سیناپت کالونی، دربھنگہ) کا انتقال ۲۹ر مارچ ۲۰۱۹ء بوقت شام ۵ر بجے ہو گیا۔ نماز جنازہ ۳۰ر مارچ ۲۰۱۹ء کو بعد نماز ظہر مدرسہ حمیدیہ، قلعہ گھاٹ کے احاطے میں ادا کی گئی اور تکفین محلہ مہدولی قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم ۳۰ر ستمبر ۲۰۰۹ء کو کوشی پروجیکٹ (محکمہ آبپاشی)، دربھنگہ سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی نکہت پروین (زوجہ ڈاکٹر سیف اللہ خالد، سکریٹری الاقراء بی ایڈ کالج، دھنباد)، دو بیٹے انجینئر محمد صادق اور انجینئر محمد نازش اعجازی ہیں۔ مرحوم دو بھائی محمد آصف، محمد نافذ اور دو بہنیں صبوحی بیگم مرحومہ اور فرزانہ بیگم ہیں۔ مرحوم نہایت خلیق، ملنسار اور دیندار تھے۔

....

● نوجوان ناقد ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کی والدہ (عمر ۶۵ برس) کا انتقال ۱۷ر جنوری ۲۰۱۹ء کی رات ہو گیا۔ حال ہی میں گرنے کی وجہ سے ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کا آپریشن ہوا تھا۔ پسماندگان میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر اجراوی سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ مرحومہ انتہائی شفیق، ملنسار اور دیندار خاتون تھیں اور نیک کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔

نقشبند قمر نقوی بخاری

ادبی صحافت

شاید یہ تبصرہ مروجہ طریقے سے مختلف ہو، اول تو یوں کہ اس میں ایڈیٹوریل طریقہ کار سے کام نہیں لیا گیا، اس لئے "میں" جابجا جلوہ گر ہوں، دوسرے یہ کہ "تبصرے" اور "تنقید" کے فرق کو ملحوظ رکھا گیا۔ تبصرہ صرف زیر نظر تخلیق کے اوصاف سے تعلق رکھتا ہے... مبصر اگر چاہے تو اس میں ناقدانہ زاویہ نظر بھی اختیار کر لے، اس سے تبصرے کی افادیت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

اردو ادب کے لئے اکیسویں صدی ایک ایسا دور ہے جہاں بے شمار ایسے مسائل نے سر اٹھا رکھا ہے جو پہلے موجود نہیں تھے۔ یہ ایک قدرتی حالت ہے، جو روز افزوں سائنسی، معاشرتی اور سیاسی انقلابات کا نتیجہ ہے۔ ان جدید مسائل نے ادب کو بھی متاثر ضرور کیا ہے۔ ایسے فنکارانِ ادب کی تعدد بہت کم ہے جو اس تیز رفتار تبدیلی کا احساس کرتے ہوئے پیکر ادب میں تازہ خون شامل کر سکیں، اسی لئے اردو ادب میں وہ تازگی اور اصلیت بہت کم ہے جو گذشتہ صدی کے اوائل میں ہوتی تھی۔ لکھنے والوں اور ادب تخلیق کرنے والوں میں ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا ہے جس کو "خود سازی" کہا جا سکتا ہے۔ اس جذبے کے تحت ادیب کو یہ فکر زیادہ ہوتی ہے کہ اس کی تخلیق خود اس کی اپنی شخصیت کے ارتقا اور افزائش مراتب میں کس حد تک معاونت کرتی ہے۔ موجودہ دور میں صرف تخلیق ادب کے نقطۂ نظر سے بہت کم ادب تخلیق ہوتا ہے۔ ہر تخلیق کے پس پشت "شخصیت سازی" کا جذبہ ہی نہیں بلکہ ضد کارفرما نظر آتی ہے جو طلب شہرت کی بنیاد پر بنائی ہوئی عمارت جیسی ہوتی ہے۔

غالباً ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں، ایک مختصر سی کہانی "سنہری مچھلی" میں نے لکھی اور اپنے اتالیق کو دکھائی۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کو کسی قدر درست کر دیا اور لاہور سے شائع ہونے والے رسالے "عالمگیر" میں اشاعت کے لئے بھیجا۔ یہ رسالہ ایک درویش صفت ادیب حافظ محمد عالم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ انہوں نے میری کہانی بچوں کے صفحات میں شائع کی اور مجھ کو اس کا معاوضہ تین روپے منی آرڈر سے بھیجے۔ کیا اس دور میں کوئی رسالہ، ناشر یا مدیر کسی قلم کار کو ایک روپیہ بھی دیتا ہے؟ اب تو ادیب اور شاعر رسالے میں اپنی تخلیق کی اشاعت کے لئے رسالے کو رقم دیتا ہے تو تخلیق شائع ہوتی ہے۔ بڑی رقم دیتا ہے تو گوشہ شائع ہو جاتا ہے۔

لیکن... بات جو کہی جا رہی ہے وہ کچھ اور ہے، اس مختصر کہانی سے تین روپیہ وصول ہونے کی خوشی میں، ایک کہانی میں نے لکھی اور اتالیق کو دکھائی، انہوں نے پسند تو کی لیکن پوچھا... یہ کیوں لکھی ہے... میں نے کہا، تین روپیہ اور ملیں گے، انہوں نے اس خیال کی مخالفت کی... کہنے لگے:

"میاں...... تم مستقبل کے ادیب اور شاعر ہو، لیکن اپنی اہلیت کو حصول زر کا وسیلہ مت بنانا، جو شخص زندہ رہنے والا ادب یا کلام تخلیق کرتا ہے، وہ مالی منفعت یا ذاتی شہرت کا طلبگار نہیں ہوتا... تم صرف ادب تخلیق کرو، تمہارا مقصد صرف تخلیق ہونا چاہئے۔" اب اس فلسفے کے سمجھنے والے شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ مالی منفعت تو اب کوئی لکھنے والا لاکھ چیخے پیٹے نہیں ہو سکتی، شہرت کی طلب پر کوئی قید نہیں، بلکہ یہی وہ شعبہ ہے جس میں تیز رفتار ترقی ہو رہی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب لکھنے والے محض ادب تخلیق کرتے تھے، قطع نظر اس سے کہ وہ تخلیق ان کی اپنی شخصیت سازی کا کام کرے، یا نہ کرے، موجودہ دور میں تخلیق کار اپنی شخصیت سازی کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے۔

زمانے نے ادب کو ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ایک طرف تو اردو کی بقا کیلئے جدو جہد میں مسلسل نشیب و فراز کا عالم ہے یہ نہیں کہ اردو کی آبیاری میں کوتاہی کی جا رہی ہو لیکن مخالف امواج کی شدت میں بتدریج اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس طوفان سے نبرد آزمائی کی تدابیر کا فقدان معلوم ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر کچھ دانشور اس ادبی جہاد میں مصروف ضرور ہیں، لیکن کسی متفقہ اجتماعی تحریک یا تدارک کا وجود نہیں ہے۔

دوسرے... سیاسی مصالح نے نجانے کتنے قلم کاروں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، اب ایسا نہیں ہے کہ ہر ادیب یا شاعر اردو کا دیوانہ بنا رہے، کئی شعراء کلام تو اردو میں تخلیق کرتے ہیں، لیکن ابلاغ کے لئے ہندی رسم الخط بروئے کار لاتے ہیں...... **!فاعتبروا یا اولی الابصار!**

تمثیل نو...... اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے...... یا کتاب ہے! رسالہ اس لئے کہ حضرت امام اعظم اس کو رسالہ کہتے ہیں، کتاب اس لئے کہ...... محو حیرت ہوں کہ اس شئے کو کیا کہا جائے...... سلیقہ تو رسالے کا ہے، پیکر کتاب کا ہے اور اس پیکر ادب کے اندر تاریخ سازی کا ایک کارخانہ سرگرم عمل معلوم ہوتا ہے۔

ادب، ثقافت، سیاست، صحافت، لطافت اور ان کے ہم قافیہ کئی الفاظ کی خوبیوں سے مزین کتاب...... ''تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش''...... مطالعہ کرنے کے لئے میرے جیسے کم علم شخص کو کئی ماہ کا وقت لگا، لیکن میں نے تہیہ کر رکھا تھا، اس کا ایک ایک لفظ پڑھ کر ہی رہوں گا...... بحمد اللہ تعالیٰ میں نے یہ کارنامہ انجام دے ہی لیا......!

امام اعظم صاحب کا نام تو بہر حال 'تمثیل نو' کے عجیب و غریب شماروں میں ماہ تاباں ہے ہی، لیکن ان کے معاون اور اس کتاب کی 'ترتیب و تہذیب' کے ذمہ دار...... ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جن کی تہذیب کا عکس اس کتاب کے ہر صفحے سے نمایاں، اور جن کی عطا کردہ ترتیب کی خوبی ہر مضمون سے ظاہر ہے۔

البتہ...... یہ ایک اجتماعی سعی مستحسن کا نتیجہ ہے۔

''تبصرہ'' اب محض ایک تعریفی مضمون نہیں رہ گیا بلکہ ادب کی ایک صنف کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے، اب کسی تخلیق کے بارے میں تعریفی کلمات لکھ دینا تبصرہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ثابت کرنا ہوتا ہے کہ اس تعریف کا سبب کیا ہے۔ جس دور میں مدرسوں میں جیومیٹری پڑھائی جاتی تھی، تب ہر تھیورم کے تکمیل کے بعد تین انگریزی حروف لکھنا ہوتے تھے...... کیو ای ڈی...... جس کا مطلب تھا...... quod erat demonstradum یعنی...... یہی ثابت کرنا تھا...... تبصرہ صنف ادب یا تخلیق کے بارے میں تفصیلی اور منصفانہ اظہار خیال ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی بتانا ہوتا ہے کہ اس اظہار خیال کے پس پشت کیا عوامل و محرکات ہیں۔ اور یہ سب بتانے کے بعد لکھ دینا ہے QED۔

تبصرہ رقم کرنے کی سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ اس کو تنقید سے جداگانہ رہنا چاہئے، میں تو تنقید سے قطعاً احتراز فرماتا ہوں...... مجھے اپنی جان پیاری ہے......

'تمثیل نو' کے وہ متعدد شمارے جو میں نے ملاحظہ کئے، سبھی اپنی نوعیت کے منفرد شمارے تھے، اسی طرح زیر تبصرہ کتاب...... 'تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش'...... ایک منفرد، قابل تحسین اور تاریخ ساز شمارہ ہے۔

مزے کی بات تو یہ، میں "اعتراف نامہ" پڑھتا رہا اور سوچتا رہا، برادرم امام اعظم نے تو گویا صحافت اور تبصرہ کی اجمالی تاریخ مرتب کردی اور اس کتاب کا ایک مرصع نقش مرقوم فرمادیا...... اور جب یہ مضمون ختم ہوا تو دیکھا یہ ڈاکٹر ابرار احمد نے لکھا ہے...... اور کیا خوب لکھا...... بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں ماشاءاللہ۔

کتاب اندر کتاب...... اشاریہ تو میں جناب پڑھنے سے رہا...... اتنے لکھنے والوں کے نام تو میں نے پہلے کبھی نہ سنے نہ دیکھے...... یہ کیا معجزہ ہے؟ واللہ میں نے ایسا "اشاریہ" تو پہلے دیکھا ہی نہیں، میں نے سارا پڑھا تو نہیں، لیکن سوا سو سے زائد صفحات پر محیط یہ 'حیرانیہ' اپنی نوعیت کا ایک ہی کمال ہے، میں نہیں سمجھتا کسی نے ایسا کام کیا ہوگا، کم از کم میری نظر سے نہیں گذرا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "تمثیل نو" نہ صرف متواتر شائع ہو رہا ہے بلکہ ہر شمارہ اپنے تنوع اور موضوعاتی وضع کے تحت ایک نادر دستاویز کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

باقی تو یہ ہے کہ 'تمثیل نو' کے مختلف شماروں کے بارے میں لکھاریوں کی لکھاوتیں ہیں، اور یہ بھی خوب ہی ہیں۔ تمثیل نو کے بے شمار شماروں کی شمار آرائی بھی ہو جاتی ہے، اور ان کے بارے میں اصحاب فکر کے خیالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں، ان کی خوبیوں کا اجمالی اقداریہ پیش نظر آ جاتا ہے۔

مثلاً ایک شمارے کے بارے میں ڈاکٹر محسن جلگانوی نے سہرے کے متعلق لکھتے ہوئے اشارہ کیا، کہ اس نیم ادبی صنف کو اس شمارے میں ادبی حیثیت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے یہ شمارہ دیکھا نہیں، لیکن ڈاکٹر محسن کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے جیسے "کوشش کی گئی" کا مطلب ہے کوئی قابل تذکرہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ تاہم سہروں کے بارے میں کچھ سخن گسترانہ باتیں تو انہوں نے فرما ہی دیں۔ ایسے سہرے جو ادب میں شمار کئے جا سکیں کم لکھے گئے، دلاور فگار ایک دلچسپ مزاح نگار تھے، ایک بار وہ ایک مرثیہ اور ایک سہرا بہ یک وقت لکھ رہے تھے، اتفاقاً دونوں کے مصرعے خلط ملط ہو گئے اور نہ دولہا خوش ہو سکا نہ، نہ متوفی کے پس ماندگان، بلکہ دونوں فریقین دلاور فگار سے دھینگا مشتی پر آمادہ ہو گئے۔ اس سہرے کا ایک مصرع ہی میرے ذہن میں ہے۔ پہلے مصرع میں دولہا کو سہرے سمیت دعا دی گئی تھی، اور دوسرا مصرع تھا: یہ کیا رہیں گے جب نہ رسول خدا رہے!

'تمثیل نو' کا وہ شمارہ جس میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بارے میں مضامین ہیں، میری نظر سے نہیں گذرا۔ مجھے ان دونوں فلسفوں سے دلچسپی رہی ہے۔ کاش میں نے شمارہ دیکھا ہوتا۔ وحدت الوجود کے بارے میں علمائے اسلام کا اتفاق نہیں...... یعنی قابل قبول نہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ فلسفہ قطعاً نظر انداز کر دیا جائے، اگرچہ ابن عربی پر کفر کا الزام بھی عائد کیا گیا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کے رد کے لئے وحدت الشہود کا فلسفہ تخلیق فرمایا تھا۔

بات ساری یوں ہے، امام اعظم صاحب نے شاید عزم مصمم کر رکھا ہے کہ ہر شمارے کو ایک غیر معمولی موضوعاتی شمارہ بنا کر تاریخ ادب کا حصہ بنا دیا جائے، اور ابھی تک اس میں کامیابی کا سہرا بدست خود اپنے سر باندھتے چلے آ رہے ہیں...... بلکہ باندھے چلے جا رہے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ آپ اپنے منصوبوں پر عمل کرتے چلے جائیں۔

یہ ضرور کہہ دینا ہے، 'تمثیل نو' کے ہر شمارے کا اداریہ بھی بے شبہ چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ میری مراد ہے قابل

تحسین ہی نہیں بلکہ دعوت خیال دینے والا ہوتا ہے...... اور جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ خود بولتا ہے...... یہ ڈاکٹر امام اعظم نے قلمبند کیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کے کام کی تحسین کے لئے اس ''نقش'' میں کچھ منظومات بھی شامل ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض کا مطالعہ کئے جن میں سے کچھ صنعت توشیح میں بھی قید ہیں...... واہ واہ ہیں۔

ایک پیش رفت میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے کسی ایسے شمارے کا تذکرہ کیا ہے جس میں مدیر 'تمثیل نو' نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی مکمل تاریخ کی رعنائیاں جمع فرمادی ہیں...... اگر ممکن ہو تو اس شمارے کی ایک جلد مجھے ارسال فرمادیں۔ قیمت ضرور دے دوں گا، اس لئے کہ میں ''حماسہ'' کی ساتویں جلد تالیف کررہا ہوں۔ اس کے بعد آٹھویں جلد ان شاء اللہ کاملاً جنگ آزادی سے متعلق ہوگی، اس کام میں یہ شمارہ یقیناً میرے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ یہ بھی 'تمثیل نو' کی کامیابی کی دلیل ہے۔

اس کے علاوہ بھی 'تمثیل نو' کی کامیابی کی متعدد دلیلیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر امام اعظم ایک بہت طویل ادبی سفر پر کمر باندھے راہ پیا...... ذرا ٹھہریئے، کیا اس لفظ کا استعمال اس ضمن میں مناسب ہوگا؟...... نہیں ہوگا، کہ راہ پیا کے معنی ہیں راستہ ناپنے والا... یہ ایسے لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا جو سفر پر ہوں اور اس سے دل برداشتہ بھی ہوں، لہٰذا وہ فضول تضیع اوقات میں مبتلا ہوں گے...... کسی کو دفع کرنے کے لئے بھی کہا جاتا ہے...... اپنا راستہ ناپو... یعنی دفع ہو جاؤ۔ لہٰذا میں یہ اصطلاح رد کرتا ہوں، ڈاکٹر امام اعظم کے ادبی سفر کے بارے میں کہوں گا......

یہ رہ نورد شوق ادب ہیں...... اردو کے مبلغ، سرپرست اور علم بردار ہیں...... اردو کا قافلہ ان کی قیادت میں دربھنگہ سے نکلا تو کلکتے میں وارد ہوا... کولکاتا... اور پھر عالمگیر سیاحت پر چل نکلا ہے۔ کہتے ہیں ان کی گہری نگاہ کولکاتا کی ثقافتی سرگرمیوں پر بھی ہے...... ان کی نگاہ کہاں کہاں پہنچی ہوئی ہے! میری ایک غزل کا شعر ہے:

یہ حوصلہ مرا دیوانگی سے ہے افضل
مرے جنوں میں بھی تہذیب کا قرینہ ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ شعر ان کی ساری کاوشوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ جیسے میں نے اسی ضمن میں کہہ دیا ہو! اگرچہ ایسا نہیں ہے، لیکن کس قدر برمحل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے...... بلکہ ایسا ہی ہے...... 'تمثیل نو' کے اس شمارے میں رسالے کے بارے میں متعدد منظوم و منثور آرا کو یکجا کر دیا ہے، یہ بھی کارآمد مجموعہ ہے، اس سے ایک طویل مدت پر پھیلی ادبی سرگرمیوں کی ایک دلکش تصویر بن جاتی ہے۔ اور اگر دیکھا جائے تو اس طویل مدت کے شماروں کی تاریخ بھی۔ گویا اس شمارے کو 'تمثیل نو' کی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے، عام طور سے رسائل کے مشمولات میں فکر و فن، کمال و حسن بیان، جمال اظہار و بصیرت و دانش اور علوئے خیال کا فقدان ہوتا ہے، بے تکے افسانے، بے مقصد افسانچے، غیر علمی مضامین، اور اکثر ساقط الوزن اور فن سے محروم منظومات کی کثرت ہوتی ہے، شاید ان رسائل کے مدیران کو بے معیار تخلیقات کی اشاعت سے اپنے جرائد کے شعبہ مالیات کو تقویت پہنچتی ہو، لہٰذا وہ معیار کو نظر انداز کرتے ہوئے جو آیا اسے شائع کر دیتے ہیں، ان رسائل کو انتخاب اور تحفظ معیار کا لحاظ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

'تمثیل نو' کے جو شمارے میری نظر سے گذرے ان میں اس رواج سے قطع تعلق کرتے ہوئے تخلیقات کے معیار اور افادیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اسی لئے یہ رسالہ دوسرے تمام رسائل سے جدا اپنی انفرادیت تسلیم کرالیتا ہے۔ وہ تو غنیمت ہے میں نے یہ تبصرہ بہت مختصر لکھا، اگر میں مختصر سے ذرا طویل لکھتا تو یقیناً صرف دس بارہ صفحات میں بھی ساری بات مکمل نہ ہوتی۔ میں مضامین مختصر ہی لکھتا ہوں۔ خطوط بھی مختصر ہی ہوتے ہیں۔ اب یہ کہ لفظ ''مختصر'' کے مفہوم کو جس طرح لوگ سمجھتے ہیں، ضروری نہیں کہ میں بھی وہی سمجھنے لگوں، میرا مضمون بہ اجمال بھی دس بارہ صفحوں سے کم تو ہوتا ہی نہیں۔

....

● ۶۴۴۶-ایس، انڈین پولس پلیس، ٹلسا، او کے-۴۱۳۶ کے (امریکہ)

'تمثیل نو' کا تازہ شمارہ (جولائی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء) جس میں سب کچھ ہے
تحقیق، تنقید، تخلیق کے علاوہ باخبری بھی

ڈاکٹر امام اعظم ہر محاذ پر سرگرم رہتے ہوئے زبان و ادب کی ترقی کے کاموں سے دوسروں میں بھی دلچسپی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ افسانہ، تنقید، تحقیق، خبر نگاری، سب سے سروکار رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیق یقیناً قابل قدر ہیں۔ ہمہ وقت خود کو رفتار ادب سے واقف رکھنے کے ساتھ دوسروں کو بھی بتاتے رہتے ہیں کہ کیا ضرورت ہے کیا لکھنا چاہئے۔ اسی لئے 'تمثیل نو' کو بڑے سلیقے سے پیش کرتے ہیں وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ادبی دنیا میں کہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس سے اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہمہ وقت واقف رکھیں اس کوشش میں جس خلوص، ایمانداری، انہماک اور صلاحیت کی ضرورت ہے وہ اس کا استعمال کرتے ہیں۔

سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر امام اعظم 'تمثیل نو' کو ادبی مجلہ رکھتے ہوئے فلم، سیاست، عام معلومات وغیرہ سے متعلق مضامین کو بھی شائع کرکے بتاتے ہیں کہ ادب میں سبھی کچھ ہوتا ہے یہ صرف افسانہ، غزل، نظم یا تنقید پر ہی منحصر نہیں ہوتا ہے۔

'تمثیل نو' کا تازہ شمارہ خصوصیت سے نظام صدیقی، نقشبند قمر نقوی اور ڈاکٹر عابد معز کی خدمات کو اجاگر کرنے کے لئے جدا جدا گوشوں پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جس محنت سے مضامین حاصل کئے ہوں گے اگر اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ لازم ہوگا کہ 'تمثیل نو' کو پورے انہماک سے پڑھا جائے کیونکہ تبھی حق ادا ہوگا۔

ڈاکٹر امام اعظم خوش نصیب ہیں کہ انہیں باصلاحیت اور مخلص ممتاز ادیبوں کی مدد ہمہ وقت حاصل رہتی ہے۔ وہ اس سے نہ صرف خود مستفید ہوتے ہیں بلکہ پوری اردو دنیا کو فائدے حاصل کرانے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ 'تمثیل نو' یقیناً ایک ایسا جریدہ ہے جس کو پڑھنا اور رکھنا چاہئے۔ تازہ شمارہ ''اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت'' (جولائی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء) سے متعلق ہے اس لئے قابل قدر ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم کو ان کی ادبی، صحافتی، تحقیقی و تنقیدی کاوشوں پر مبارکباد دینا ایک طرح ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(بہ شکریہ: روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ ۵/اگست ۲۰۱۸ء)

پروفیسر عبدالمنان

مومن کی شاعری میں تطبیق و تضاد

زندگی تضاد اور تطبیق کے آنگن میں رقص کرتی ہوئی دل بستگی اور دیدہ نگاہی کا جلوہ دکھاتی اور عصری تنوعات کے پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرتی ہے تو اس میں معنی آفرینی اور آفریدگی کی جہتیں ایک نوع کی گلشن آفریدہ میں جوش نمو کا رمز پیدا کرتی ہیں۔ حقیقی شاعری جذبات کے دلکش اظہار کا آئینہ ہوتی ہے۔ جذبات کی تہہ میں محبت جب انگڑائیاں لیتی ہے اور رشک و تمنا، جلوت و خلوت، شکوۂ محبوب اور طرفگی ادا کا طرفہ تماشا دکھاتی ہے جو جذبے کا یہی آئینہ شکستہ ہونے کے باوجود نگاہ آئینہ ساز میں لطافت اور تہذیب کا ذریعہ بنتی ہے۔ عشق کی انتہا سطحیت سے پرے ہٹ کر محبت کی ارتعاشاتی لے کا جذب پنہاں بن جائے تو شاعری کی سطح بلند تر ہو جاتی ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ بوالہوسی میں جذبوں کی تھرتھراہٹ احساس سوز میں رنگ نہیں بھرتی۔ اخلاقیات کا فلسفہ پیش نہیں کرتی اور مریضانہ ذہنیت کا اظہار کرتی ہے تو انسانی جبلت کے جواہر پارے عنقا ہوتے ہیں۔ اسی جواہر پارے نے مومن کی پردہ داری کو پردہ دری میں بدل دیا ہے: ؏ عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مومن جو خوش الحان اور عاشقانہ و فاضلانہ صنف کے مالک تھے اور ان کی شاعری جو حکایت از شباب اور حدیث عشق زناں سے عبارت ہے، تغزل کی محفل میں ذوق دل بستگی کا سامان تازہ کرتی ہے تو وہ بے معیار تصنع کا غازہ نہیں چڑھاتے بلکہ برملا کہتے ہیں:

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

Poe نے ایک موقع سے لکھا ہے کہ کوئی شخص اپنی سچائیوں کو پوری طرح لکھ نہیں سکتا۔ اگر چہ اس کی کوشش ہوتی ہے لیکن سچائی ایسے پردے کا سہارا لیتی ہے کہ وہ پوری طرح چھپ نہیں سکتی نہ ہی مکمل طور پر عیاں ہوتی ہے۔ اسی نیم دروں نیم بروں کے درمیان شخصیت کے پیچ و خم اجاگر ہوتے رہتے ہیں اور مومن کا معاملہ ہماری نگاہوں کو اور خیرہ کرتا ہے خاص ادا کے ساتھ۔ اس کا اعتراف بہتیرے ناقدوں نے کیا ہے۔ لیکن جس طور پر پذیرائی اور مدح سرائی کی توقع تھی وہ نہیں ہو سکی۔ ان کی غیرت مندانہ طبیعت اور دست طمع کی درازی سے پرہیز نے جبہ سائی اور خوشامدانہ روش سے دور رکھا۔ ٹامسن صاحب نے ۸۰ روپے کی پروفیسری دینا چاہی تو انکار کیا۔ ریاست کپورتھلہ نے ۳۵۰ روپے پر بلانا چاہا، وہ نہیں گئے۔ اسی طرح انعامات و اکرامات سے پرہیز کرتے رہے۔ نہ ستائش کی تمنا رکھتے تھے نہ ہی صلے کی پروا تھی۔ وہ اپنے فن کے معیار و مرتبہ سے واقف تھے اس لئے ان کے غیور طبیعت نے سر کے بل جانے نہیں دیا:

مومن چلا گیا تو چلا جائے اے بتو! آخر قدیم خادم بیت الصنم نہ تھا

......

مومن اور دیر خدا خیر کرے طور بے ڈھب نظر آتے ہیں ہمیں

مومن کی دوطرفہ زندگی نے ان کی فکر میں ایسی جاذبیت اور انفرادی شان پیدا کردی کہ وہ کعبہ وکلیسا کے سنگم سے بیگانہ وش نہیں ہو سکے کہ جہاں وہ خانقاہ نشینی اور پیر طریقت کی بلند مشربی کو اپنی زندگی کا جز ولاینفک سمجھتے تھے وہاں عشق مجازی سے بیگانگی اختیار نہیں کی تھی۔عروج شہید وصدق سے رغبت کے علاوہ محبت کی نگاہ کی بے تابی اور خندہ زنی کی ادا چاہتے تھے۔ان کی آرزو کا تقاضہ اور سادگی میں پرکاری کا زور عشق کی منتہا سے جاملتا ہو یا نہ ملتا ہو، ایک نوع کی شائستگی اور طرز وفاداری پائی جاتی ہے۔اسی مرحلۂ شوق نے ہر ہر ادا کے ساتھ جان نکلنے کی سبیل پیدا کی جبکہ اس زمانے کی روایت کے پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے کہ مومن کے عہد تک عشق کا برملا اظہار طرز معاشرت کے خلاف تھا اور تمنا کی بے تابی کو ایک حد تک آزاد کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔دل ربائی دل بستگی کا ذریعہ تھی لیکن ناموسِ وفا ہر دم اپنی شکل دکھا رہا تھا۔اسی ادا نے کھولا ہے راز بسمل کا۔عشق مجازی کی کرتب بازیاں مومن کے ذوق مستانہ اور شوق دلبرانہ کا ایسا ذریعہ تھیں جنہوں نے ان کی شاعری میں تہہ داری پیدا کردی۔مومن خود پوشی کے باوجود نا آسودہ خواہشوں اور شدت احساس کو چھپا نہیں سکے۔دوطرزی شاعری سادگی اور پے چیدہ خیالوں کے تنوعات کی لہر کو چھپانے سے قاصر رہی۔ان کی پے چیدگی بڑھی ہوئی علمیت کا شاخسانہ ہے اور سادگی پرکار حیات کا عکس ہے جس کی جہاں تابی جدت طرازی کی طرف پروانہ وار کھینچتی ہے۔

میں نے متضاد کیفیتوں کا ذکر کیا ہے کہ شخصیت کی تعمیر غیر توازن حالات اور کس بل کے میل سے ہوتی ہے جس کو آفتاب تازہ بھی روشنی دیتی ہے اور ماہ تاباں کی کرن بھی ضیا پاش کرتی ہے۔آلام روزگار بھی یورش پنہاں گولاتی ہے اور جوش عید بھی جلوہ دکھاتی ہے۔تصور جاناں بھی مسرتوں اور غمزۂ غماز کا پیغام دیتی ہے اور شمع محفل بھی بزم ناز کا پیام دیتی ہے۔غرض کہ مومن کی عاشقی پارسائی کا لباس زیب تن نہیں کرتی لیکن پاس وضع اور ناموس خیال کو بھی جانے نہیں دیتی۔ ع شب بت کدے میں گزرے ہے دن خانقاہ میں

اسی دورنگی لے نے ان کی شخصیت کو دو آتشہ بنا دیا۔تاریخ کے اوراق الٹے جائیں اور انفرادی کاوش میں شاہد و شراب کی رنگینی کے واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو تصور جاناں کا روپ ملے گا جو یک گونا بے خودی کی طرف مائل کرے گا۔مومن کے دور میں دہلی میں شاہد و شباب اور بتان خود آرا کے لئے شوق کا سامان گراں نہیں تھا۔شوق بے پروا کے عیش کا سامان شرافت اور دل بستگی کے ساتھ دہلی کی بزم خانہ اور جلوت وخلوت خانے میں پورے ہو سکتے تھے۔ارباب نشاط کی اس محفل میں روسا کے بچے آداب زندگی سیکھنے جاتے تھے۔یہاں سطحیت نہیں تھی۔ شائستگی اور ادب نوازی کا عمدہ چلن موجود تھا۔یہاں نظارۂ جمال بھی تھا اور شوق وصال بھی۔رقیب کا رشک بھی تھا اور ہجر پردہ نشیں بھی۔

آنکھوں سے جا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو	ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
چھوٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی	ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے
پتہ گو اب تو ہی فرما کس کو سودا ہے یہ کون	اور کی سنتا نہیں اپنی ہی بکتا جائے ہے

جس ماحول اور عشوہ طراز فضا میں مومن کے شب و روز گذرے تھے اس میں خنداں لبی کی درخشانی کا زور

تھا۔ دل ستم زدہ کے تھام لینے کا سماں تھا۔ ذوق نظارہ میں شوق بے پروا کو داد عیش کا سامان مل گیا تھا:

جھلک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں — ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے
چارہ جو اور بھی اچھا میں کروں گا ٹکڑے — پردۂ شوخ جو پیوند گریباں ہوں گے
دھیان کے غیر کے تحمل کا — ہوش دیکھا ترے تغافل کا
مے نہ اتری گلے سے جو اس بن — مجھ کو یاروں نے پارسا جانا

ڈاکٹر یوسف خاں نے ایک موقع پر لکھا تھا:

''مومن خاں مومن نے عشقیہ مضامین کے اسالیب میں جو نزاکت اور لطافت پیدا کی وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنی غزل کو مجازی عشق کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس کے حدود سے آگے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مومن نے اپنی غزل میں عشق کی کیفیتوں، حسن کی اداؤں اور اس میدان کے تمام تجربوں کو اس طرح بیان کیا کہ ذوق وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کنائے اور استعارے کے بادشاہ ہیں۔ اردو زبان کے اعلیٰ اور دل نشیں تغزل کے نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں۔''

صاحبِ گل رعنا نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے طرز بیان میں جیسی لطافت و رعنائی ہے وہ ان کی جولانی طبیعت کی تماشاگاہ ہے۔ سوتم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بلا — وہ کیوں شریک ہوں میرے حالِ تباہ میں

مومن کے ہاں رمزیت، مبالغہ آرائی اس درجہ لطیف ہے کہ اس طعن دیپک کی مانند ہے اور خیالوں میں ایسی رعنائی کہ جیسے پھولوں کی پنکھڑیاں شبنم سے تر ہوں:

کس واسطے اے شمع زباں کاٹتے ہیں لوگ — کیا تو نے بھی کی تھی شب ہجراں کی شکایت
مجھے مار ڈالا ہے انکار نے پھر — نہ کہنا کہ 'کیا مجھ پہ دعویٰ کسی کا'
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
کیا اس بت پر مرتا ہوں تو مومن — کیا میں کیا کروں مرضی خدا کی
رحم کر خصم جان غیر نہ ہو — سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا
تاب کم ظرف کو کہاں تم نے — دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی
اشک دشمن بہانا تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

مومن نے مختلف صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل میں ان کے اوصاف اور فکر رسا کے جوہر پوری طرح کھلتے ہیں لیکن مرثیہ، مثنوی اور واسوخت کے علاوہ قصیدہ میں بھی جولانیٔ طبیعت کے جوہر دکھائی دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں زبان کی شستگی محاورہ بندی اور سلاست و روانی کا جوش نمایاں ہے۔ مگر شاعرانہ، رمزیت اور معاملہ بندی وغیرہ نے ان کے خیالات کو بلند تر کیا ہے۔ فارسی زبان پر کامل دسترس کی وجہ سے اس کی مختلف صنفوں میں جوہر دکھائے ہیں۔ مومن کی رباعی کی مقبولیت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اختصار کے باوجود جامعیت کی شان رکھتی ہے۔

علاوہ ازیں وزن کی دل کشی اور ترنم آمیزی کا اثر گانے یا نغمہ ریز ہونے میں مدد دیتی ہے۔مومن نے ۲۰۰ رسے زائد رباعیاں کہیں اور اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑا۔

مومن کے زمانے میں ذوق، غالب، شاہ نصیر کے علاوہ ظفر کا ڈنکا بج رہا تھا۔ غالب نے افکار کی بلندی اور معنی آفرینی کی وجہ سے اردو غزل کی دنیا میں جیسی نکہت آرائی اور افکار کے جلوے دکھائے ان کی تعریف ان کے معاصرین نے بھی کی اور بعد کے اہل قلم حضرات نے بھی۔ مومن کی غیرت مندانہ طبیعت اور علمی بصیرت نے جیسے فن کے دروازے کھولے اور جیسی صنائی اور تراکیب کا ہنر پیش کیا اس کی تعریف ان کے ہمعصروں نے بھی کی اور بعد کے ناقدوں نے بھی۔ اس حقیقت کو اس خیال کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے کہ مومن نے وہ طرز فکر اپنایا اور ایسی مہارت کا ثبوت دیا کہ ان کی شاعری دیپک کی طعن کی طرح ہوگئی جس کی لپک شعلہ سا ہے۔ اگرچہ مومن کے سوز میں نہ غالب کی سی آفاقیت ہے اور نہ ہی جرأت کی سی پستی ہے لیکن مومن کی سادگی اور جوش میں جیسی بصیرت افروزی اور تہہ داری ہے اس کی مثال خال خال ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

کیا کیا شکن دیئے ہیں دل زار کو مگر — اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا
میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں — تیری نگاہِ شوق سے کیا کچھ عیاں نہیں
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
پروردۂ وفا سے ہو کب ترک عاشقی — کیا ناز تھے کہ مجھ سے تحمل نہ ہوسکا
شب تم کو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

مومن کی شاعری میں نہ صرف صنعت گری اور لفظوں کی طرح داری وترکیب سازی کا کھیل ہے بلکہ عظمت انسانی کی حقیقتوں کا احساس ملتا ہے جس نے انفرادیت کی شان پیدا کردی ہے:

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری — واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

مومن کی فنی جودت اور فکری کمالات کی رفعت کا اعتراف تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں یوں ہے جو ان کی تمام تر خوبیوں کا نچوڑ ہے: ''مسیحا نفس معجز بیان حکیم بے نظیر شاعر بے عدیل مومن خاں مومن۔''

مومن اپنے کمال فن اور مشتاق دردِ دل حکمت، علم نجوم، شطرنج بازی کی مہارت اور فراخ دلی و بے نیازی کی وجہ سے بے انتہا مشہور و منفرد تھے۔

ان نصیبوں نے کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کا

مکر شاعرانہ کی مثال پر کشش اور جادوئی ہے جس نے مومن کی شاعری میں ایک نوع کا نکھار اور شبنمی آہٹ پیدا کردی ہے:

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں — اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا	جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ	یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے
شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے	زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

کسی ادنیٰ خیال کو اعلیٰ بنانا اور مبالغہ آرائی کے ذریعہ بلند تر کرنا مستزاد یہ کہ فکر کا سحر آمیز جلوہ دکھانا مومن کا کمال فن ہے:

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو	وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی	کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ذی علم مفکرین کا کہنا ہے کہ جرأت کی معاملہ بندی اور مومن کی معاملہ بندی میں بڑا فرق ہے کہ مومن اپنے خیال کی آرائش میں معیار کا خیال رکھتے ہیں۔ الفاظ وترکیبوں کو چابک دستی کے ساتھ برتنے کے معاملے میں عامیانہ پن سے دور رہتے ہیں:

خاک میں مل جائے یارب بے کسی کی آبرو	غیر مری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

مومن کی شاعری کی فکری وفنی جہتوں کی عقدہ کشائی میں ان کے اسلوب کی جادوگری اور عصری نقوش ونفوس کے زیروبم کی داستان پر توجہ مبذول کئے بغیر نہ فرض سے سبکدوشی ہوسکتی ہے اور تفہیم کی عقدہ کشائی ممکن ہوسکتی ہے۔ مومن کی شاعری روایت کا کسی طور نمونہ ہو کر نئی روایت کی تخلیق کا ایک ایسا جہاں آباد کرتی ہے جس کا اپنا مذاق ومزاج ہے۔ اس دنیا میں بت ہزار شیوہ کی داستان تحرک آمیزی کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے وہ اپنے ذہن کے دروازے کو شعلہ سا لپک جانے والی بجلیوں سے روشن کرتے ہیں اس میں جیسی برق رفتاری اور خلوص بھرا جذبہ ہے وہ منفرد خیالوں کا درپن ہے:

پہنچے وہ لوگ رتبے کو کہ مجھے	شکوۂ بخت نارسا نہ رہا
مومن اور دیر خدا خیر کرے	طور بے ڈھب نظر آتے ہیں ہمیں
اس کے اٹھتے ہی جہان سے اٹھے	کیا قیامت ہے دل کا آجانا

میر کی شاعری میں عشق کے احتیاط سے جو گداز پیدا ہوا ہے اسی عشق کی نارسائی نے مومن کے ہاں رنگینی بخشی ہے۔ یہ چیز دونوں کے ماحول اور ذہنی انفرادیت کا نتیجہ ہے۔ ان کے مزاج ومرتبے کا تعین اور مذہبی لگاؤ اس والہانہ تسکین کی اجازت نہیں دیتا اور اخلاقی پستیوں میں ڈوبنے کا انداز نہیں دکھاتا جس میں عامیانہ پن ہو۔ ان کے یہاں یگانگت میں بھی پاس وضع کا وہ وطیرہ ہے جو پُرکار اور پُراثر ہے۔ اور انفرادیت کی شان رکھتا ہے۔ فن میں رعنائی خصوصی تجربوں اور زندگی کے گہرے مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے جو آفاقی تجربے کو دائمیت عطا کرتی ہے۔ یہ کسی جماعت کی پاسداری کی امین نہیں ہوتی بلکہ فن کار کے خلوص اور نظر کی وفاداری کی داعی ہوتی ہے۔ یہاں اس قول کی صداقت پر ایمان لانے کی ضرورت ہے کہ وہ فن پارے سے کس حد تک بصیرت دیتا ہے۔ اسی کو پاؤنڈ فن زندگی کی ترجمانی سے تعبیر کرتا ہے اور یہ ترجمانی دلیل سحر اس وقت بنتی ہے جب نئی صبح اپنی تگ وتاز کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ قابل قدر فنکار وقت کے خانے میں اپنی اسیری کا روپ نہیں دکھاتا۔ اس میں ماضی بھی زندہ ہوتا ہے اور مستقبل

کی آہٹ بھی سنائی دیتی ہے۔ ہر دور کی اپنی بصیرت ہوتی ہے۔ جس پر ایک اقلیتی طبقہ اپنی عقلیت کا زور دکھاتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مانوس جلوے کا طلسم توڑے اور نیا خیال پیش کرے۔ وہ ساغر جم کے مقابلے میں جام سفال کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی نئی میکدہ سازی نظر کی ضمانت بنتی ہے اور جو جام چھلکتا ہے وہ شوخ دیدگی پیدا کرتا ہے۔ اس پس منظر میں مومن کی شاعری تخیل کی پرواز کی عمدہ مثال ضرور ہے لیکن ٹھہر کر عذر کرنے کا موقع فراہم نہیں کرتی۔ مومن کی شاعری فوری اپیل کی شاعری نہیں ہے۔ وہ اپنے زمانے کی نباض بھی ہے اور ترجمان بھی کہ ان کا زمانہ پیچیدہ اور پر معنی ہوتا جا رہا تھا اور تکلف کا ایسا پردہ تھا کہ اس کو چلمن بنانے اور پر وقار معنویت دینے کی ضرورت پر زور دیا جا رہا تھا اور اس کی روح میں جیسی تازگی تھی اس میں عشق کا جوش اور نظر کی وفاداری پنہاں ہو رہی تھی۔ اس میں پنہائی کی آہٹ سنائی دے رہی تھی جس کے بارے میں یہ خیال پیش کیا جا سکتا ہے کہ وہ (مومن) رفتہ رفتہ افکار کے میدان میں قدم رکھ رہے تھے میری مراد فکر کی بلندی اور کشادگی ہے۔ مثلاً :

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے دل   آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
پامال ایک نظر میں قرار و ثبات ہے   اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے
چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی   ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

مومن کی شاعری کی عدم مقبولیت کی وجہ ان کا اسلوب اور فکر کا محدود دائرہ ہے اور بقول ظہیر صدیقی:

''میرے خیال میں بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ غزل کے ذریعے نہ ہمیں ابدیت کی وادی کی سیر کرا سکے نہ خارجی کائنات کے حوادث کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ غالب کی طرح تماشائے گلشن کے ساتھ تمنائے چیدنی ان کے ہاں نہیں ہے۔''

میرا خیال ہے کہ مومن اپنی حد میں ایسی آبیاری اور گل سازی کا ثبوت دیتے ہیں جن کے اوصاف سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے فکر کی لالہ کاری میں جو تازگی اور تابندگی ہے وہ حسی تجربہ اور شوخیِ نظر پر دلالت کرتی ہے:

دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لئے   سخن بہانا ہوا مرگ ناگہاں کے لئے
عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو   کہ شب غم کوئی کسی طور بسر کرتا ہے
لذت جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا   طعنے کیا کیا اسے ارباب ستم دیتے ہیں

....

● ۲۴/بی، عبدالحلیم لین، کولکاتا-۱۶ (مغربی بنگال) موبائل: 9907171781

ڈاکٹر مظفر مہدی (دربھنگہ/امریکہ)

اردو تحریک تاریخ کے آئینہ میں

اردو ایک پیاری زبان ہے۔ یہ ہندو مسلم دونوں کی مشترکہ کوششوں کا خوبصورت ثمرہ ہے۔ سیکولر مزاج کی حامل اور گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ ملک کی آزادی میں اپنا بھرپور کردار نبھانے والی زبان ہے تو ٹوٹے دلوں کو جوڑنے اور پیار و محبت کا پیغام عام کرنے والی زبان تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ مگر اپنی گوناگوں خوبیوں اور دلکشیوں کے باوجود ہمیشہ ہی گندی سیاست اور مسموم و تنگ نظر لوگوں کی دشمنی کا شکار بھی ہوتی رہی ہے۔ اردو زبان کے ساتھ یہ ناروا سلوک کوئی نیا نہیں ہے بلکہ انگریزوں نے اپنے ابتدائی دور اقتدار میں ہی اپنی مشہور زمانہ پالیسی لڑاؤ اور حکومت کرو، کا کامیاب حربہ استعمال کر کے اردو دشمنی کا بیج بو دیا تھا۔ انہوں نے کمال ہوشیاری کے ساتھ اردو زبان کو مسلمانوں سے اور ہندی کو ہندوؤں سے منسوب کر کے اردو دشمنی کا شاخسانہ کھڑا کیا جس کا اثر آج بھی دیکھا جا رہا ہے۔ جبکہ امر واقعہ یہ تھا کہ مدت دراز کے بعد دونوں قوموں (ہندو مسلم) کے درمیان وحدت ملکی کا ایک خوبصورت منظر ابھر کر سامنے آیا تھا، لیکن انگریزوں کی لگائی ہوئی آگ کے باعث ان کے اتحاد و اتفاق کا تانا بانا بہت جلد بری طرح منتشر ہو کر رہ گیا۔

محسن قوم سر سید احمد خاں جو اپنا سب کچھ قربان کر کے قومی صلاح و فلاح میں شب و روز لگے ہوئے تھے اردو زبان کی نئی صورتحال کو دیکھ کر بہت پریشان و بے چین ہوئے لہٰذا انہوں نے اردو زبان کے مسئلوں کو بھی اپنے اصلاحی و احیائی مشن میں شامل کر کے اس کے تحفظ و بقا کی کوشش شروع کی اور نقش اول کے طور پر اردو کی حمایت کے لئے ۹ ستمبر ۱۸۸۳ء کو الہ آباد میں ایک سنٹرل کمیٹی بنائی اور ہر ضلع میں اس کی شاخیں قائم کرنے کی تجویز کی (۱) اردو ہندی تنازع میں حکومت نے ہندوؤں کا ساتھ دیا اور عدالتوں میں اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کا حکم جاری کیا۔ حکومت کے اس اقدام سے مسلمانوں کو شدید صدمہ ہوا لہٰذا اردو والوں نے اس کے تدارک کے لئے فوری طور پر ۲۹ را پریل ۱۹۰۰ء کو اردو ڈیفنس کمیٹی بنائی جس کا شاندار اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا (۲) سر سید کے بعد ان کے رفیق خاص اور قائم مقام محسن الملک نے اردو تحریک کی باگ ڈور سنبھالی اور کامیابی کے ساتھ اس کو آگے بڑھایا۔ قائدین اردو تحریک کے نئے نئے اقدامات سے اہل اردو کے ساتھ حکومت کا رویہ سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا مصلحتاً وقتی طور پر تحریک کی کارروائی روک دینی پڑی لیکن اردو کی محبتوں کا چراغ لوگوں کے دلوں میں جلتا رہا در یں اثنا آخر دسمبر ۱۹۰۲ء اور اوائل جنوری ۱۹۰۳ء میں شاہی دربار کے موقع پر دہلی میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس کانفرنس کے متعدد شعبے قائم ہوئے جن میں سے ایک اردو کا شعبہ بھی بنا جس کا نام "انجمن ترقی اردو" پڑا (۳) علامہ شبلی نعمانی اس کے سکریٹری مقرر ہوئے تو مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ نائب صدر بنائے گئے۔

سر سید و محسن الملک نے اپنی کوششوں سے تحفظ اردو کی جنگ کو جہاں لا کر چھوڑا تھا ان کے رفیق خاص علامہ شبلی اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے انجمن کے کاموں کو کافی کچھ آگے بڑھا کر اتنا متحرک و فعال بنا دیا کہ ان کے وقت کے بعض غیر جانبدار اور بااثر ہندو دانشوران بھی اس سے متاثر ہوئے اور آگے بڑھ کر اپنا تعاون پیش کیا۔ یوں تو سر سید کے دور سے ہی اردو کی تحریک مختلف صوبوں میں پہنچنے لگی تھی لیکن علامہ شبلی کی ذات اور ان کی کوشش نے

اسے اور بھی جلا بخشی۔ توقع یہ کی جارہی تھی کہ ان کی رہنمائی میں یہ تحریک اور بھی زیادہ مضبوط و مستحکم ہوگی اور اردو زبان بلند سے بلند تر ہوتی جائے گی لیکن ہوا یہ کہ علامہ نے اپنی علمی اور تنظیمی مصروفیتوں کے باعث انجمن کی ذمہ داریوں سے اپنے کو علیحدہ کرلیا۔ علامہ شبلی کے بعد اردو تحریک کو کامیابی کے ساتھ آگے لے کر بڑھنے والی اہم شخصیتوں میں مشہور و معروف محقق مولوی عبدالحق ابھر کر سامنے آتے ہیں جنھوں نے اردو زبان کی ترقی و بقا کے لئے اپنی پوری زندگی نچھاور کردی۔ ان کی ناقابل فراموش خدمات کے پیش نظر ان کو "بابائے اردو" کا لقب دیا گیا۔ وہ آج بھی اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کے بعد اس "انجمن ترقی اردو" کی ذمہ داری ممتاز و معروف قلم کار قاضی عبدالغفار کے سپرد کی گئی جسے انہوں نے بحسن و خوبی انجام دیا۔ انہوں نے انجمن کے ترجمان، ہفتہ وار ہماری زبان کی ادارتی ذمہ داری بھی قبول کی اور اسے کامیابی کے ساتھ نبھایا۔ یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا البتہ گمان غالب کہ "ہفتہ وار ہماری زبان" دہلی کا اجرا مولوی عبدالحق کے مبارک ہاتھوں ہی ہوا ہوگا۔ بہر کیف اردو تحریک کی جب بھی کوئی تاریخ مرتب ہوگی تو قاضی صاحب مرحوم کا نام ہرگز نظر انداز نہیں ہو سکے گا۔ قاضی عبدالغفار کے بعد اردو کے ممتاز ناقد اور دانشور پروفیسر آل احمد سرور انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری مقرر ہوئے اور ساتھ ہی انہوں نے انجمن کے ترجمان "ہفتہ وار ہماری زبان" کی بھی ادارت کی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلسل اٹھارہ برسوں تک پابندی سے اس کا اداریہ لکھا۔ ان کے معرکۃ الآرا اداریوں کے باعث یہ ہفتہ وار ترجمان لوگوں میں کافی مقبول ہوا۔ ہماری زبان کے علاوہ انجمن کی سرپرستی میں ایک ادبی اور تحقیقی رسالہ "اردو ادب" بھی نکلتا رہا ہے۔ غالباً یہ بھی مولوی عبدالحق کے دور کی یادگار ہے۔ بہر حال اس کی ادارت بھی آل احمد سرور نے کی اور اس کو ادبی وقار بخشا۔ سرور صاحب نے لمبے عرصہ تک انجمن کی قیادت کے بعد اپنی علمی و ادبی مصروفیتوں کے باعث انجمن کی تمام تر ذمہ داری ڈاکٹر خلیق انجم کے سپرد کردی جسے انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ نبھایا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے دور میں کئی تاریخی کام انجام دیئے جن کے باعث انہیں ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ خلیق انجم سے قبل انجمن کا دفتر علی گڑھ میں ہوا کرتا تھا جسے وہ علی گڑھ سے تبدیل کر کے دہلی میں لائے۔ ان کا دوسرا اہم تاریخی کام یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دور میں راؤز ایونیو دہلی میں ایک شاندار "اردو گھر" کی تعمیر کرائی اور انجمن کی مرکزیت کو کافی مضبوط کیا۔ غالباً ان کے ہی دور میں انجمن کا اپنا مکتبہ بھی قائم ہوا۔ اردو گھر اور مکتبہ دونوں ہی انجمن کے مالی استحکام کا بڑا ذریعہ بنے۔ "ہماری زبان" کو بھی اور زیادہ مقبولیت ملی۔ ان دنوں ڈاکٹر خلیق انجم کی جگہ انجمن کی ذمہ داری ڈاکٹر اطہر فاروقی نبھا رہے ہیں جن سے اہل اردو کو بہت سی توقعات ہیں۔

جہاں تک بہار میں اردو تحریک کا تعلق ہے تو بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جن دنوں اردو تحریک کے مرکزی رہنما اردو کے تحفظ و بقا کی کوشش کر رہے تھے تو ان کے ہی زیر اثر انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر بہار کے لوگ بھی اردو کے حقوق کی بازیابی کی تگ و دو میں مصروف نظر آتے ہیں۔ بہار میں اردو تحریک کے ماضی پر نظر رکھنے والے اس ضمن میں سید جعفر امام ایڈوکیٹ کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے اپنے ساتھیوں کے تعاون سے اردو زبان کو دشمنوں کے نرغے سے نکالنے کی کوشش کی۔ ان کے بعد دوسری اہم شخصیت محمد ایوب ایڈوکیٹ پٹنہ کی نظر آتی ہے جنھوں نے بڑے اخلاص کے ساتھ اردو تحریک کی قیادت کی اور تحریک کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھا کر دوسروں کے لئے مشعل راہ بنے۔ محمد ایوب ایڈوکیٹ مرحوم کے ساتھ ہی اردو دنیا کے ممتاز و منفرد محقق قاضی عبدالودود کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جن کی عملی شمولیت سے

بہار میں اردو تحریک کو بڑی تقویت ملی لیکن بدنصیبی یہ رہی کہ قاضی صاحب مرحوم جیسے جاگیردارانہ مزاج کے حامل لوگ دوسروں کی قیادت میں زیادہ دنوں تک کام نہیں کر سکتے۔ لہٰذا وہ اپنے بہی خواہوں کے ساتھ الگ ہو گئے۔ ان کی علیٰحدگی سے وقتی طور پر مخلصین اردو کو تکلیف ضرور ہوئی مگر وہ محمد ایوب مرحوم کی رہنمائی ہی میں اردو نوازی کا حق ادا کرتے رہے۔ چند دنوں بعد شاہ مشتاق صاحب مرحوم کو اس تحریک کی ذمہ داری سونپی گئی۔ شاہ مشتاق مرحوم کی خوبی یہ رہی ہے کہ وہ سبھوں کے لئے قابل قبول تھے۔ شاہ مشتاق نے بھی بہت جلد اس تحریک کی ذمہ داری اس وقت کے شعلہ بیان مقرر اور مشہور روزنامہ اردو اخبار "سنگم" کے مالک و مدیر غلام سرور کے حوالہ کر دی یا حالات ایسے پیدا ہوئے کہ انجمن کی باگ ڈور غلام سرور کے ہاتھوں میں آئی۔ ان دنوں غلام سرور کا ستارہ کافی عروج پر تھا۔ لہٰذا ان کے ساتھ پروفیسر عبدالمغنی، بیتاب صدیقی، شاہ مشتاق، انیس الرحمٰن، رضی الدین حیدر، ہارون رشید، شمیم سیفی، ابوذر عثمانی، سید احمد قادری اور دوسرے کئی افراد آپس میں اختلاف رکھنے کے باوجود اردو زبان کی محبت میں ان کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ انجمن کی قیادت غلام سرور کے ہاتھوں میں آتے ہی انہوں نے اس کا نام بدل کر ریاستی انجمن ترقی اردو رکھ دیا اور اس طرح مرکزی انجمن سے اس کا الحاق ختم ہو گیا۔ غلام سرور کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ وہ سیاسی عزائم کے مالک تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے سیاسی مقصد کے حصول کے لئے بھی اس کا استعمال کرنا شروع کر دیا جس سے کاروان اردو کے ڈھیر سارے اراکین کو شدید اختلاف ہوا۔ چنانچہ مظفر پور میں تحریک کے اجلاس کے موقع پر یہ اختلاف اور بھی زیادہ ابھر کر سامنے آیا اور بدنما شکل اختیار کر گیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ بہار میں اردو تحریک کے نام پر یہ ایک بدنما داغ تھا جس کی تکلیف دہ یاد آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں باقی ہے۔ مظفر پور کے اجلاس کے بعد تحریک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ جو لوگ غلام سرور کی کارکردگی اور ان کے رویوں سے مطمئن نہیں تھے وہ پروفیسر عبدالمغنی کے گرد جمع ہو گئے۔

ملک کی سربراہی ہو یا کسی تحریک کی قیادت کہا جاتا ہے کہ قیادت میں تبدیلی بیشتر اوقات نیک فال ثابت ہوتی ہے کیونکہ قائد اپنی صلاحیت اور سوچ کے مطابق صف بندی کرتا ہے۔ کارکنان میں جوش و خروش پیدا کرتا ہے جبکہ لمبے عرصے تک ایک شخص کی قیادت کے باعث اکثر ٹھہراؤ آ جاتا ہے اور تحریک کے کارکنوں کی قوت کارکردگی ماند پڑنے لگتی ہے۔ بہر کیف مظفر پور بہار میں انجمن کے اجلاس کے موقع سے جو ناخوشگواری پیدا ہوئی اس کے بعد جن لوگوں نے بھی پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت پر اپنا اعتماد ظاہر کیا انہوں نے انہیں مایوس نہیں کیا بلکہ ان کے اعتماد کا بھرم رکھا اور اپنی خداداد صلاحیت سے کام لے کر اردو تحریک (انجمن ترقی اردو بہار) کو از سر نو منظم کر کے ایک نئی قوت کی شکل میں لا کھڑا کیا۔ پروفیسر عبدالمغنی غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ انگریزی کے استاذ، اردو تنقید کے ممتاز و منفرد نقاد، ماہر اقبالیات، ایک کامیاب مقرر اور اردو تحریک کے مجتہد، مضبوط اور پختہ ارادوں کے مالک اور یقین محکم سے لبریز تھے۔ انہوں نے اردو تحریک کو از سر نو منظم ہی نہیں کیا بلکہ کئی تاریخی کام بھی انجام دیئے مثلاً اردو بھون پٹنہ کی تعمیر، ہندوستان کے تمام صوبوں میں سب سے پہلے بہار میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلا کر دوسرے صوبوں کے لئے مثال پیش کرنا۔ مختلف سرکاری دفتروں میں اردو والوں کی بحالی کروانا۔ بہار کی تمام یونیورسٹیوں کے Senate میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک Senator مقرر کروانا۔ بہار کے مختلف مقامات پر غیر مسلم بھائیوں کے لئے اردو کیمپ لگا کر اردو سکھانے کا انتظام کرنا اور اس کام کے لئے عزیز الحسن مرحوم کی خدمات حاصل کرنا وغیرہ ایسے کام رہے ہیں جو کبھی بھی فراموش نہیں کیے جا سکتے ہیں۔

صابر علی سیوانی

وحشت کلکتوی کی تخلیقی ہنر مندی

بیسویں صدی کی ادبی تاریخ میں شعروسخن کے صنف میں اپنی شناخت قائم کرنے والے فنکاروں میں خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی بھی شامل ہیں۔ رضا علی وحشت کی پیدائش ۱۸رنومبر ۱۸۸۱ء کوکلکتہ میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی شمشاد علی ہگلی (کلکتہ) کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا حکیم غالب دہلی کے متوطن تھے، لیکن بعد میں انہوں نے ہگلی میں سکونت اختیار کرلی۔ ابتدا میں وحشت کی تعلیم مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ہوئی۔ یہ وہی تاریخی مدرسہ ہے جسے جنرل وارن ہسٹینگو نے ۱۷۸۰ء میں مسلم شرفاء کوعربی، فارسی، عربی اور اسلامی قوانین کی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا۔ بعد میں اس مدرسہ میں ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، ایشیائی مطالعات، فلسفہ، ارضیات، قانون اور منطق وغیرہ کی تعلیم کا نظم کیا گیا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بعد رضا علی وحشت نے کلکتہ یونیورسٹی کے انٹرنس امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی، لیکن معاشی حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے آگے کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ معاش کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ ۱۹۰۱ء میں مرکزی حکومت کے امپیریل ریکارڈ کے شعبۂ فارسی میں مولوی کی حیثیت سے مامور ہوگئے اور پھر ترقی پاکر چیف مولوی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کی خدمات کے صلے میں حکومت نے انہیں خان صاحب (۱۹۲۵ء) اور پھر خان بہادر (۱۹۳۱ء) کے خطابات سے نوازا۔ مختلف عہدوں پر فائز ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے فرائض منصبی بخوبی انجام دیئے۔ حسنِ خدمت کے سلسلے میں انہیں کافی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

وحشت نے جب شعروسخن کے دامن میں پناہ لینی شروع کی تو مولوی ابوالقاسم شمس کی شاگردی میں آئے۔ شمس، داغ دہلوی کے شاگرد اور عبدالغفور نساخ کے خلفِ رشید تھے۔ وحشت کو جو ادبی ماحول ملا تھا، اس نے ان کی شاعری کے رنگ و آہنگ کو صیقل کرنے کا کام کیا۔ دوسری جانب فارسی شعراء عرفی، نظیری، ظہوری، صائب، محتشم کاشانی وغیرہ کی شاعری کے مطالعہ نے ان کی تخلیقیت اور فکری تنوع میں بیش بہا اضافے کا کام کیا۔ علاوہ برایں میر، غالب اور مومن کے کلام کے مطالعہ نے ان کے شاعرانہ شعور کی پختگی میں نہایت مؤثر کردار ادا کیا۔ شاعری کے ذریعہ نہ صرف مغربی بنگال بلکہ پورے ہندوستان میں اپنی انفرادی شناخت قائم کرنے میں وحشت کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اپنی امتیازی شناخت کے ذریعہ ادبی کینوس پر ایک پُرکشش ادبی تصویر بنانے میں وہ کامیاب ہوئے، جس کا احساس وحشت کو بھی تھا، تب ہی تو انہوں نے تعلی کے پیرائے میں یہ کہا تھا:

شعر نے وحشت ترے ایک شور برپا کردیا   سرزمینِ ہند گونج اُٹھی تری آواز سے

وحشت کی شاعری کے محاسن کا اندازہ لگانے کے لئے ادب کے چند مشاہیر کی آراء پڑھنا کافی ہوگا۔ نیاز فتح پوری نے پڑھے لکھے آدمی کے غزل کے میدان میں قدم رکھنے پر طنزاً جو بات کہی ہے اور استثنائی کیفیت کا جو اظہار وحشت کے سلسلے میں کیا ہے اسے ملاحظہ کیجئے:

''پڑھا لکھا آدمی جب غزل میں اپنی قابلیت کے اظہار پر آجاتا ہے تو غزل کو بالکل برباد کردیتا ہے،

لیکن وحشت کی خوش ذوقی نے کبھی یہ نقص اپنے کلام میں پیدا ہونے نہیں دیا۔"

اسی طرح آل احمد سرور نے بھی وحشت کی غزل کے بارے میں اپنی تنقیدی رائے قائم کرتے ہوئے کچھ اس انداز سے لکھا ہے:

"وحشت استادِ فن ہیں۔ فن کے لحاظ سے وحشت کا درجہ بلند ہے۔"

ایک دوسری جگہ وحشت کے فکروفن کے حوالے سے آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ:

"مولوی رضا علی وحشت متوطن کلکتہ زمانہ موجودہ کے ان چند برگزیدہ شعراء میں سے ہیں، جن کے حسنِ کلام پر اردو شاعری کو فخر کرنا چاہیے۔"

مجنوں گورکھپوری نے وحشت کی کلاسیکی شاعری کی انفرادیت کچھ اس انداز سے بیان کی ہے:

"وحشت کلکتوی باوجود قدیم اور روایتی دبستان کے شاعر ہونے کے اپنے کلام میں ایک انفرادی لہجہ کا پتا دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں فارسی کا لطیف عنصر ایک خاص طرز ہے، جو غزل کے مزاج کو قائم رکھتے ہوئے شاعر کے کلام کو عام سطح سے کچھ بلند کر دیتا ہے۔ وحشت کی شاعری کی سب سے زیادہ محسوس اور نمایاں خصوصیت جذبات کا نہایت رچا ہوا توازن اور اندازِ بیان کی انفرادیت ہے۔"

نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور آل احمد سرور کی وحشت کی شاعری کے بارے میں تنقیدی آراء سے وحشت کی شاعری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے بلند پایہ فنکار تھے اور ان کی شاعری کی انفرادت کیا تھی۔ اب وحشت کے اشعار کی روشنی میں ان کی شاعری کے اوصاف ملاحظہ کیجیے اور ان کی تخلیقی صلاحیت کو محسوس کیجیے۔ وحشت کی غزل کے اکثر و بیشتر مقطعے ایسے ہیں جن میں وحشت کی انفرادیت خود ان ہی کے لفظوں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اپنے مقطعوں میں تعلّی سے کام لیتے ہوئے خود کو اپنے عہد کا استاد شاعر گردانا ہے اور غالب اور میر کی اتباع پر تفاخر کا اظہار کیا ہے۔ وحشت کے چند مقطعوں پر نگاہ ڈالیے:

ترے اندازِ سخن سے ہے یہ ظاہر وحشت — کہ مقدر ہے ترا غالبِ دوراں ہونا

کلام میر پڑھ پڑھ کر ہوا ہوں میں نکتہ ور وحشت — تلمذ ہے اسی استاد سے طبعِ سخن داں کو

پیچھے پیچھے تیرے ہوگا اہلِ فن کا قافلہ — وحشت اک دن تو ہی میرِ کارواں ہو جائے گا

ہمسری تیری تو اب ہو نہیں سکتی وحشت — تو فنِ شعر کا استاد ہے، ہم مان گئے

کچھ خبر بھی ہے تجھے وحشتِ شیریں گفتار — کہ تجھے لوگ "امام الشعراء" کہتے ہیں

خود کو "امام الشعراء" کہلانے والے اور غالب کی اتباع کی آرزو رکھنے والے وحشت نے اپنے کلام کی خوبیاں مذکورہ مقطعوں میں بیان کر دی ہیں۔ ان کی شاعری میں جو مضامین اور خیالات بروئے کار لائے گئے ہیں وہ روایتی ضرور ہیں، لیکن انہوں نے جس انداز اور جس لہجے میں ان روایتی دبستانِ سخن کی نمائندگی کی ہے، اس سے وحشت کا امتیاز و انفراد قائم ہوتا ہے۔ مرزا غالب کی شاعری کے اثرات بلکہ ان کی پیروی کے عناصر نمایاں طور پر وحشت کی شاعری میں جھلکتے ہیں۔ بلکہ بعض مقامات پر تو وحشت نے غالب کے مصرعوں کو بھی اپنے اشعار میں پیش

کئے ہیں۔ غالب کا ایک مشہور شعر ہے:

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست　　مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بو تراب میں

وحشتؔ غالب کی پیروی میں کس قدر مجنونانہ ذہن رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے اس شعر سے ہوتا ہے:

وحشت مرا عقیدۂ غالب پہ ہے عمل　　"مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بو تراب میں"

خود کو غالبِ زمانہ کہلائے جانے پر فخر کا احساس وحشت کو ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے غالب کی پیروی کس حد تک کی ہے اور اس کے اثرات ان کی شاعری میں کس قدر نمایاں ہیں۔ وہ غالب کی شاعری کی پیروی کو کوئی مشکل کام نہیں سمجھتے ہیں اور غالب کے ہی انداز میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں، جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کی پیروی آسان کام نہیں:

تری شاعری نے وحشتؔ یہ مچائی دھوم کیسی　　کہ زمانہ کہہ رہا ہے تجھے غالبِ زمانہ

وحشتؔ ہمیں تتبعِ غالب ہے آرزو　　دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

غالب کا ایک شعر ہے جس میں انہوں نے آدمی سے انسان بننے کے مشکل مراحل کو پیش کیا ہے، اسی شعر سے استفادہ کرتے ہوئے وحشت نے غالب کی اتباع کو آسان بتایا ہے، جو مذکورہ شعر سے واضح ہوتا ہے۔ غالب کا شعر ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

علامہ رضا علی وحشت کی شاعری میں فصاحت و بلاغت، لطفِ زبان، معاملہ بندی، نازک خیالی اور فکری وسعت، اور تخیل کی بلند پردازی کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی شاعری اظہارِ عشق، تجرباتِ عشق، رمز و فا شعاری، معاملاتِ دنیوی، لذتِ غم، شب ہائے ہجراں کی تلخی، کیفیاتِ انبساط و خوشی، غمِ حیات کی لذت اور انسان کے داخلی احساسات و جذبات کی پوری عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ خان بہادر رضا علی وحشت کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ لطفِ زبان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں:

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی　　تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

مجال ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی　　خیالِ ترکِ محبت کا بار بار آیا

ہزاروں خواہشیں تکمیل کا، جن کو تقاضہ ہے　　تری دنیا نہیں ہے، یہ تو اک دامِ تمنا ہے

کسی طرح دن تو کٹ رہے ہیں فریب امید کھا رہا ہوں　　ہزار ہا نقش آرزو کے بنا رہا ہوں، مٹا رہا ہوں

فراق کا الم نہ ہو، وصال کی خوشی نہ ہو　　ہے وہ بھی کوئی زندگی کہ جس میں زندگی نہ ہو

پیدا ہوا کچھ ایسا تلاطم خیال میں　　شب ہائے ہجر کٹ گئیں شوقِ وصال میں

بے وفائی اور وہ بھی محبوب کی بے وفائی اس مضمون کو شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو، جس نے اپنے شعر میں نہ باندھا ہو۔ وحشت کے ہاں بھی اس موضوع پر متعدد اشعار مل جاتے ہیں۔ فریب خوردگی اور بے وفائی شاعروں کا محبوب موضوع رہا ہے۔ کیونکہ جب دل کو ٹھیس پہنچتی ہے تو تکلیف ہوتی ہے اور یہی تکلیف شاعر کو اپنی دل کی چبھن،

کسک، درد کے اظہار مجبور کرتی ہے۔ اظہار خیال کا سب سے موثر ذریعہ شاعری کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس صنف کے ذریعہ بات دوسروں تک بہت آسانی سے پہنچ جاتی ہے اور بہت موثر انداز میں ترسیل کا کام کرتی ہے۔ وحشت کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت بار بار ایسے مضامین پر نظر پڑتی ہے، جوان کے مافی الضمیر کو دردانگیز اور دل انگیز پیرائے میں ان کی شاعری بیان کرتی ہے۔ وحشت کہتے ہیں:

قسمت میں ناامیدیِ حسرت ہے کیا کروں — اُس بے وفا سے مجھ کو محبت ہے کیا کروں
کس کو خبر نہیں ہے کہ دیتا ہے وہ فریب — دل کو فریب کھانے کی عادت ہے کیا کروں

وحشت کی جس غزل کا یہ مطلع اور دوسرا شعر ہے، اسے پڑھتے ہوئے یکبارگی مجھے کلیم عاجز (مرحوم) کی وہ مشہور غزل یاد آ گئی جس میں بڑی خوبصورتی سے عاجز نے شاعر کی بے کسی اور محبوب کی جفاکشی، ستم شعاری اور بے وفائی کا ذکر کیا ہے۔ کلیم عاجز فرماتے ہیں:

ہر چند غم و درد کی قیمت بھی بہت تھی — لینا ہی پڑا دل کو ضرورت بھی بہت تھی
ظالم تھا وہ، اور ظلم کی عادت بھی بہت تھی — مجبور تھے ہم، اس سے محبت بھی بہت تھی

وحشت کی شاعری فارسی اور اردو کی مستحکم روایت کی پاسداری کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے لیکن وحشت نے اپنی شاعری کے ذریعہ زبان کا لطف اور معانی کا حسن ہاتھ سے کبھی جانے نہیں دیا۔ فارسی تراکیب، تلمیحات اور خوبصورت تراکیب سے اپنے کلام کو آراستہ کر کے ایک خاص لہجہ اردو شاعری کو دیا۔ حالانکہ انہوں نے شیوۂ قدیم اپنایا لیکن طرز جدید کا لبادہ پہنا کر۔ شاعری دل کی آواز کی ترجمانی ہوتی ہے اور یہ کام بخوبی وحشت نے اپنے شعروں کے ذریعہ کیا ہے۔ اس کا اظہار درج ذیل اشعار میں ملتا ہے جن میں اظہار خیال کی ایک خاص طرح کی بیباکی اور جرأت مندی نظر آتی ہے:

پابندیٔ رسوم کو سمجھا ہے بندگی — زنار چھین لیں گے ابھی برہمن سے ہم
محنت ہی پہ موقوف ہے آسائشِ گیتی — کھوئی مری راحت، مری راحت طلبی نے
جو کہئے کچھ تو وہ اپنی خطا ٹھہرتی ہے — خموش رہئے تو ہوتا ہے بدگماں کوئی
مزہ آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ — کہیں سے تم بیاں کرتے، کہیں سے ہم بیاں کرتے

وحشت کی شاعری اقدار حیات اور زندگی کی نزاکتوں کی ترجمانی ضرور کرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان مسائل و موضوعات کو بھی چھونے کی کوشش کرتے ہیں جو ذوق، میر، غالب، حسرت اور آتش وغیرہ کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر وحشت کی شاعری چونکاتی بھی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے سوچنے پر مجبور ضرور کرتی ہے کہ واقعی ایسا ہوتا ہے یا ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ خیال کہ عاشق اپنے محبوب سے اپنے دل کی بات کہنا چاہتا ہے لیکن جب سامنے آتا ہے تو وہ عشق کے سمندر میں اس طرح غرق ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا اصل مدعا بیان کرنا ہی بھول جاتا ہے۔ یہی خیال یہاں پایا جاتا ہے:

کہا تو ہے کچھ اپنا حال میں نے آپ سے لیکن — وہی سننے کے قابل تھا جو حصہ رہ گیا دل میں

رفیق جعفر (پونے) کا ایک شعر وحشت کے اس شعر سے ملتا جلتا ہے اور اسی مفہوم کی توضیح کے لئے موزوں کیا گیا ہے۔ رفیق جعفر کو زندہ رکھنے کے لئے اُن کا یہی ایک شعر کافی ہے:

پھر زندگی کی فلم ادھوری ہی رہ گئی　　　وہ سین کٹ گئے جو کہانی کی جان تھے

کلیم حاذق ایک اچھے ادیب اور تنقید نگار ہیں۔ انہوں نے وحشت کی حیات و شاعری پر ایک مونوگراف ''وحشت کلکتوی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ وہ وحشت کی شاعری کی باریکیوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وحشت کی حیات و شاعری کا مطالعہ ہمیں اردو فارسی کی مضبوط شعری روایات سے جوڑتا ہے۔ وہ اردو فارسی دونوں ہی زبانوں کی زندہ تہذیبی اقدار کی ثنا خوانی میں تاعمر مصروف رہے۔ وحشت لطفِ زبان کے شاعر تھے۔ ان کے ہاں جو روایتی فکر ہے اس میں ایک نوع کی انفرادیت ہے۔ وحشت کے کلام میں صوتی حسن، ترکیب لفظی اور معنی آفرینی ہے ان کی غزلوں میں سحر انگیزی پیدا کرتی ہے۔ وحشت کی اپنی زندگی حسرت و آلام سے پُر تھی۔ ایسے شعراء بہت کم پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے زندگی کی مسخ صورت سے محبت کی اور بخشی ہوئی حیات کے سارے رنگوں کو بصیرت کی مشق کرنے کا موقع دیا، لفظوں کو ایسی قوت گویائی عطا کی جو دل بن کر دھڑ کتے ہیں۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وحشت جیسے شعراء کی نسل کی تخلیقی مہارت نے فارسی شاعری کو اردو کا جون بدلنے پر نہ صرف مجبور کر دیا بلکہ اردو شاعری کی اپنی شناخت کو مستحکم کرنے کے دروازے وا کر دیئے۔ ایسی ادبی شخصیات کو ہماری تاریخ ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔''

(وحشت کلکتوی، کلیم حاذق، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۶، ص: ۶۳)

وحشت کے کلام کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں فکر و خیال کی ترقی پسندی پائی جاتی ہے۔ وہ بات وہی کرتے ہیں جو دوسرے کلاسیکی شعراء کرتے آئے ہیں، لیکن اسے برتنے کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔ لکھنے والوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ وحشت کے ہاں بھی وہی جدید رویّہ نظر آتا ہے جو اقبال کے یہاں تھا۔ اقبال نظم کے فنکار تھے اور وحشت غزل میں اپنی ہنرمندی دکھا رہے تھے۔ اسی وجہ سے ل۔ احمد اکبرآبادی نے کہا ہے کہ:

''شعرِ وحشت کا غالب جزو تغزل ہے۔ حسن و عشق دہرائی گئی ہیں مگر یہ سب کچھ تو اردو شعر میں پہلے سے موجود تھا۔ میری نظر میں جو چیز وحشت کو ممتاز بناتی ہے، وہ ان کے فکر و خیال کی ترقی پسندانہ خصوصیت ہے۔'' (بحوالہ وحشت کلکتوی، کلیم حاذق، ص: ۵۷)

ل۔ احمد اکبرآبادی کے دعوے کی دلیل میں وحشت کے چند اشعار پر نظر ڈالئے تو فنکار کے فکر و خیال کی ترقی پسندی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان اشعار میں ضرب المثل بننے کی پوری خوبی موجود ہے۔ بلکہ ان کا ایک شعر تو کافی مشہور ہے۔ جس میں انہوں نے ''موجِ دریا کا حریف'' بننے میں عقل و ہوش کے مثبت فیصلے کی بات کہی ہے۔ وحشت کا شعر ہے:

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف　　　ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

یا وحشت کے یہ اشعار جن میں فکر و خیال کی تہہ داری کے ساتھ ساتھ ان کی زبان پر قدرت اور حسنِ معنی کی ترسیل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ایسے ہی اشعار نے وحشت کو اپنے عہد کا ایک بڑا شاعر بنایا۔ وحشت کے خلاقانی ذہن کی پرواز دیکھئے:

نشانِ زندگیٔ دل ہے بے قراریِ دل — ہے اس کی موت اگر چین آ گیا دل کو
تو کسی کا ہو کے دیکھ اے شکوہ سنجِ روزگار — کیوں یہ کہتا ہے کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں
ہوا ہوں تیری پیہم بے رُخی سے اس قدر بے حس — کہ الفت کی نظر بھی اب تو پہچانی نہیں جاتی
حسرت گناہ کی بھی تو پوری نہ ہو سکی — دو دن کی زندگی مجھے بدنام کر گئی
ہر چند اپنے سر سے قیامت گزر گئی — ہم منتظر ابھی تری آوازِ پا کے ہیں

وحشت نے غالب کی پیروی کرتے کرتے خود کا سراغ پانے کی کوشش کی ہے۔ان کے بہت سے اشعار پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے غالب کے دیوان کو سامنے رکھ کر غالب جیسے اشعار کہنے کی کوشش کی ہے لیکن غالب کی پیروی کر کے کوئی غالب تو نہیں بن سکتا، ہاں غالب کی زمین، فکر و خیال، صنائع و بدائع کے استعمال سے استفادہ کر سکتا ہے۔لیکن وحشت کے بارے میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی پیروی نے انہیں بھی بڑا شاعر ضرور بنا دیا۔غالب کی شاعری سے خوشہ چینی تو بہتوں نے کی ہے، لیکن جس کی پیروی جو دیوانگی وحشت کے ہاں پائی جاتی ہے وہ دیوانگی اوروں کے ہاں مفقود نظر آتی ہے۔وحشت نے زبان کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔لفظوں کی تراکیب بھی ان کے ہاں اچھی ہیں۔زبان کی سلاست کے ساتھ موسیقیت سے لبریز وحشت کی شاعری قاری کو باندھے رکھتی ہے اور قاری کچھ نہ کچھ سیکھ کر ہی اٹھتا ہے۔مختصراً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وحشت نے بے مقصد شاعری نہیں کی بلکہ مقصدیت کو پیش نظر رکھ کر اپنی فکر و خیال کو لفظوں کا جامہ پہنا کر بہترین شاعری کی ہے۔وحشت کے فکر و فن پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی رسائل کے نمبرات بھی چھپ چکے ہیں۔وحشت کی کتابوں اور اُن پر شائع ہونے والے رسائل کے نمبرات کی تفصیل اس طرح ہے:

دیوانِ وحشت (۱۹۱۰ء)، ترانۂ وحشت (۱۹۵۳ء)، نقوش و افکار (۱۹۷۵ء)، وحشت کے قلم کی نشانیاں ہیں جو بالترتیب ستارۂ ہند پریس کلکتہ، مکتبۂ جدید لاہور، مکتبۂ عارفین ڈھاکہ کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔علاوہ بریں متعدد کتابیں، مضامین وحشت (مرتب جمال احمد صدیقی)، یادگار وحشت (مرتب اسحاق راشد)، سوغات (مرتب اسدالزماں)، حیات وحشت (ڈاکٹر وفا راشدی)، ناسخ سے وحشت تک (معید رشیدی)، وحشت کی حیات و ادبی خدمات پر مشتمل ہیں جو منظر عام پر آ چکی ہیں۔رسالہ مہر نیم روز (وحشت نمبر)، رسالہ مغربی بنگال (وحشت نمبر) کے نمبرات بھی وحشت کی شخصیت و ادبی کارناموں پر شائع ہو چکے ہیں۔وحشت ۲۰ر جولائی ۱۹۵۶ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ان کی تدفین ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں عمل میں آئی۔

....

● ہولڈنگ نمبر 9-4-87/C/12، فرسٹ فلور، عقب مغل ریزیڈنسی، ٹولی چوکی، حیدرآباد (تلنگانہ)
mdsabirali70@gmail.com

ڈاکٹر محمد امین عامر

پروفیسر سلیمان خورشید: علم و ادب کا درخشاں ستارہ

ریاست مغربی بنگال کی راجدھانی کلکتہ میں ایسی کئی کثیر الجہات شخصیتیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں جو علم و ادب کی دنیا میں تاریخ ساز کارنامے ثبت کر کے تادیر قائم رہنے والے تاثرات چھوڑ گئیں اور نسل آئندہ کو حرارت بخش پیغام دے گئیں۔ ان شخصیتوں میں ایک نمایاں، ممتاز، قد آور اور تابندہ شخصیت پروفیسر سلیمان خورشید کی تھی جن کے متعلق پروفیسر ملک زادہ منظور احمد رقم طراز ہیں:

> ''مغربی بنگال اور خصوصیت کے ساتھ کلکتہ کی معاصر ادبی اور تہذیبی زندگی کا کوئی بھی تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ معروف دانشور، ادیب اور اردو تحریک کے فعال اور متحرک رہنما جناب پروفیسر محمد سلیمان خورشید کا تفصیلی ذکر اس میں شامل نہ ہو۔ علم و دانش، تلاش و تحقیق اور جستجو و آرزو کے حوالے کے ساتھ ساتھ ان کی فعال اور متحرک زندگی کا ایک نمایاں حوالہ یہ بھی ہے کہ وہ کلکتہ کی معروف، سماجی، ادبی اور علمی تنظیموں سے نہ صرف متعلق رہے ہیں بلکہ ان کی سربراہی میں ان تنظیموں نے خوب سے خوب تر کی جانب اپنا سفر جاری رکھا ہے۔''

اقتباس مذکور میں پروفیسر سلیمان خورشید کی پوری داستانِ حیات سمٹ کر آ گئی ہے اور ان کی کثیر الجہات زندگی کا آئینہ نذر قارئین ہے۔ اب پروفیسر موصوف سے متعلق طویل سطریں رقم کرنے کی بجائے فقط ان کے سوانحی خاکے پر اکتفا کرتا ہوں جس سے ان کی ہمہ گیر شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

پروفیسر محمد سلیمان خورشید کی ولادت ۲۸ر جولائی ۱۹۴۶ء کو کلکتہ میں ہوئی۔ والدین کے ساتھ ان کی رہائش راجا بازار میں تھی۔ ابتدائی تعلیم کی حصولیابی کے بعد ۱۹۶۹ء میں مولانا آزاد کالج کلکتہ سے تاریخ میں بی اے (آنرز) اور ۱۹۷۲ء میں پریسیڈنسی کالج (کلکتہ یونیورسٹی) سے ایم اے (تاریخ) کے امتحان میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اسکے بعد ۶ر مئی ۱۹۷۸ء سے ۳۱ر دسمبر ۲۰۰۹ء یعنی ۳۱ برسوں تک وہ سٹی کالج کلکتہ کے شعبۂ تاریخ سے بحیثیت پروفیسر وابستہ رہے۔ بعدۂ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامی تاریخ سے بحیثیت مہمان لکچرر نومبر ۱۹۹۴ء سے دسمبر ۲۰۱۴ء تک وہ منسلک رہے۔ اس کے بعد وہ دو سال یعنی ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء مولانا آزاد کالج کلکتہ کے شعبۂ اسلامی تاریخ میں جز وقتی اعزازی لکچرر کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ ۲۰۱۰ء میں عالیہ یونیورسٹی کلکتہ کے شعبۂ تاریخ میں انہوں نے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات ثبت کروائیں۔

چونکہ پروفیسر سلیمان خورشید تاریخ کے ممتاز اور مقبول استاد رہے ہیں اسلئے اس میدان میں تدریسی خدمات انجام دینے کے علاوہ انہوں نے تاریخی موضوعات پر کئی گرانقدر اور تحقیقی خطبات بھی دئے اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت بھی کی۔ کلکتہ، نیپال، بہار، کراچی، مہاراشٹر، جامعہ ملیہ نئی دہلی، جادب پور یونیورسٹی اور ایران سوسائٹی کلکتہ، ایشیاٹک سوسائٹی اور عالیہ یونیورسٹی کلکتہ وغیرہ میں انہوں نے شرکت کی اور امیر خسرو، علامہ اقبال، مولانا آزاد اور بین اسلامزم، بیسویں صدی میں بنگال کے مسلمان، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی جنگ آزادی میں بنگال اور بہار کے مجاہدین کا رول، جنگ پلاسی کی اہمیت اور اس کے ثمرات، سرسید کی حیات و خدمات، ۱۸۵۷ء کے اسباب بغاوت ہند، مولانا ابوالکلام

آزاد، تاریخ ہند میں فرقہ پرستی، رابندر ناتھ ٹیگور اور سید جمال الدین افغانی ومغربی شہنشاہیت اس طرح کے عنوانات کو انہوں نے موضوع بحث بنایا اور اپنے ہم شرکاء میں کامیاب ومقبول رہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کے مختلف اداروں اور تنظیموں میں ادبی، سماجی اور تعلیمی موضوعات پر سو (۱۰۰) سے زائد لکچر دیئے اور اپنے علم وفضل، وسیع المطالعہ اور دانشوری کا لوہا منوالیا۔ تاریخ یورپ، اسلامی تاریخ وثقافت، عہد وسطیٰ کا ہندستان، بنگال کے عہد وسطیٰ کی تاریخ، تاریخ بنی امیہ و عباسی اور تاریخ ایران وترکی ان کے خصوصی موضوعاتِ مطالعہ رہے ہیں۔ موصوف کی تاریخ سے واقفیت اور اس سے انکی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار تحریک اسلامی کے کارکن اور معروف صحافی سید علی کے اس اقتباس سے ہوتا ہے جو زیر سطر ہے:

> ''سلیمان خورشید ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ تاریخ میں انہوں نے ایم اے کیا ہے۔ برسوں سٹی کالج میں تاریخ پڑھائی ہے۔ تاریخی شعور رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی کی تاریخ کا علم بھی رکھتے ہیں اور دور جدید وقدیم تاریخ کا بھی۔ تاریخ انہوں نے پڑھی ہے پڑھائی بھی ہے اور تاریخ ہضم بھی کیا ہے جس کے نتیجے میں ان کے مزاج میں اور گفتگو میں سلیقہ، توازن اور رچاؤ پایا جاتا ہے اور سامعین اس کا وزن بھی محسوس کرتے ہیں۔''

علم وادب کی دنیا میں اپنی آب وتاب دکھانے کے علاوہ وہ علمی، ادبی، سماجی، ملی اور ثقافتی اداروں مثلاً مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ، پاکستان انڈیا پیپلز فارم فار پیس اینڈ ڈیموکریسی، انجمن ترقی اردو مغربی بنگال اور محمڈن اسپورٹنگ کلب کلکتہ کے اعلیٰ عہدوں اور مناصب سے وابستہ رہ کر اپنی سرگرمیاں دکھاتے رہے۔ موصوف بہت ہی خلیق، منکسر المزاج، شریف الطبع، سنجیدہ فکر اور نیکوکار انسان تھے۔ وہ ۲۹ رنومبر ۲۰۱۰ء کو حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی شرفیاب ہو چکے تھے۔

سلیمان خورشید قوم وملت کے بہی خواہ، سچے ہمدرد، بے لوث خادم اور ترجمان تھے۔ اردو زبان کا کوئی مسئلہ ہو یا مسلمانوں کا کوئی دینی، شرعی، سماجی، ملی اور مذہبی مسئلہ ہو ان سب سے وہ خاص لگاؤ رکھ کر اس کے حل کے لئے شب و روز دوادوش کرتے اور اس طرح بجا طور پر قائد ملت اور ترجمان ملت کا فریضہ انجام دے کر قوم وملت کے دلوں میں اپنی جگہ بناتے۔ وہ گوناگوں علوم وفنون اور صلاحیت وقابلیت سے بہرہ ور تھے۔ انگریزی، اردو، عربی، فارسی، بنگلہ اور ہندی زبانوں سے کماحقہٗ واقف تھے مگر انگریزی واردو کے بہترین مقرر اور خطیب (Orator) تھے۔ نہایت شگفتہ اور سلیس زبان میں تقریر کرنے کا ایسا ہنر جانتے کہ عام آدمی بھی ان کی گفتگو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ موصوف ایجوکیشنل کوآرڈی نیشن کمیٹی کے (۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۴ء) جنرل سکریٹری بھی رہے اور تعلیمی میدان میں بے پناہ سرگرمیاں دکھا کر قوم وملت کے نونہالوں میں علم کی روح پھونکی اور انہیں تعلیم سے روشناس کرانے اور آگے بڑھنے کا جذبہ وحوصلہ عطا کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے بعنوان ''پروفیسر محمد سلیمان خورشید: شخصیت اور کارنامے'' ۵۵۰ صفحات پر مشتمل ایک کتاب ترتیب دی جو پروفیسر موصوف کی کثیر الجہات شخصیت کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں مختلف شعبۂ حیات سے وابستہ ۹۲ قلمکاروں کے مختلف عنوانات کے تحت گرانقدر مضامین ہیں جو پروفیسر موصوف کی علمی وادبی شخصیت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی پر دال ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔ کاش پروفیسر موصوف کے علمی خطابات کو بھی جمع کر کے بشکل کتاب شائع کی جاتی تو انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین وسیلہ ہوتا۔ علم وادب کا یہ درخشاں ستارہ ۱۵ رمئی 2018ء کو دائما غروب ہوگیا۔

....

● 7/8، پیل خانہ، تھرڈ لین (چوتھی منزل)، ہوڑہ-711101 (مغربی بنگال)، موبائل: 9883057511

ڈاکٹر ایم. صلاح الدین

تحقیقی کتاب ''عربی ادبیات کے اردو تراجم'' کی معنویت

عربی زبان سے ہندوستان کی مغربی ساحلی ریاستوں کا واسطہ مسلم حکمرانوں کی آمد سے صدیوں قبل عربی سوداگروں کے ذریعہ قائم ہو چکا تھا، اسے مسلم حکمرانوں کے توسط سے یہاں وسعت ملی ،مگر اسلامی تعلیمات کے دائرے میں سمٹی رہ گئی؛ کیونکہ یہاں سنسکرت کی طرح عربی کو بھی مذہبی شناخت دے دی گئی، جب کہ تقریباً ان ہی ادوار میں عرب مملکت میں عربی نے جو تہذیبی وتمدنی کایا پلٹ کی، اس سے یورپی اقوام نے خاصا اثر قبول کیا، جدید یورپی علوم وفنون کی تاریخ شاہد ہے کہ یہی عربی یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی موجب بنی، یورپی اقوام نے عربی سے استفادہ کر کے خود کو دقیانوسی (Orthodoxy) تہذیب وتمدن کے غلبے سے نکال کر ترقی کی نئی شاہراہ پر ڈال لیا اور آج تک اس کی قدر دان ہے، ابھی پچھلے دنوں ستمبر ۲۰۱۸ء کے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سیشن سے یورپی ملک آسٹریا کی وزیر خارجہ KurozSebastian نے عربی میں خطاب کر کے سب کو چونکا دیا تھا، انھوں نے اس دوران کہا کہ ''لبنان میں عربی سیکھی تھی ،عربی انتہائی اہم اور خوبصورت زبان ہے، یہ اہم تہذیب وتمدن کی روشن علامت ہے۔''
(روزنامہ انقلاب، ۲؍اکتوبر، ۲۰۱۸ء)

پھر بھی ہم نے اقوام یورپ سے لو لگایا اور ان ہی کی زبانوں اور ادب پر فریفتہ ہو گئے، ہمارے لئے عربی ادبیات درخور اعتنا نہ رہے، تاہم نصابی تقاضے کے تحت اور انفرادی وذاتی ذوق کی تسکین کے نتیجے میں عربی ادبیات کے جو تراجم ہوئے، انھوں نے ہماری فکر اور زبان پر خاصا اثر ڈالا ہے، ان اثرات کے جائزے پر بھی التفات کم کم ہی رہا ہے، ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی نے ''عربی ادبیات کے اردو تراجم'' پر گہری نظر ڈال کر اس کمی کو کسی حد تک پورا کیا ہے، عربی ادبیات کے اردو تراجم نامی اس کتاب میں ڈاکٹر ابرار اجراوی نے عربی ادبیات کے قدیم وجدید سرمایے سے کما حقہ روشناس کرانے کی سعی کی ہے، اس کی اہمیت وافادیت کیا ہے؟ اس بابت حقانی القاسمی کی رائے توجہ کھینچتی ہے:

> ''عربی ادبیات کے اردو تراجم'' ایک ایسا موضوع ہے، جو اپنی معنویت اور ماہیت کے اعتبار سے منفرد اور مختلف ہے، ابرار اجراوی نے بڑی محنت سے عربی ادبیات کے ان تراجم کا سراغ لگایا ہے، جس سے اردو زبان وادب کی لسانی وفکری ثروت میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے اور اظہار وبیان کے نئے زاویے ملے ہیں۔...... ان سے پیش تر کسی نے اس موضوع کو مس نہیں کیا ہے؛ اس لئے اس کی اہمیت مسلم ہے، اس موضوع کے واسطے سے انھوں نے غیر ممسوس منطقہ کی سیاحت کی ہے اور ایک ایسی اجڑی ہوئی کائنات کو آباد کیا ہے، جس میں بہاروں کے بہت سے امکانات پوشیدہ ہیں، انھوں نے عالمی اقدار وافکار سے شناسائی اور بین ثقافتی ترابط وتعامل کی ایک حسین صورت تلاش کی۔''

ڈاکٹر ابرار اجراوی نے خوانِ قاسمی سے دسترس عربی کی نعمت پائی، اسی نعمت کدے میں دورانِ طالب علمی عربی اردو ترجمہ نگاری سے وابستگی کے مواقع میسر آئے، دونوں زبانوں کی نزاکت ولطافت سے جو آگاہی حاصل ہوئی،

فکر کو پر پرواز ملا، اسے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جے این یو دہلی کی کھلی ڈلی فضاؤں میں سیرابی نصیب ہوئی۔ یہاں سے ان کی تحقیقی، تنقیدی بصیرت نے جلا پائی اور علم و ادب کے بحر ذخار میں غواصی کا جنون پیدا ہو۔ نتیجتاً ''اسلام اور مغربی تہذیب'' (تحقیق و تخریج) اور ''تذکیر بسورۃ الکہف (تحقیق و تخریج)'' ۲۰۰۶ء میں تصنیف کیا، عربی ادیب احمد بن عبدالرحمٰن الصویان کی عربی تصنیف ''معالم الرحمۃ'' کا اردو ترجمہ ''نبی رحمت'' کے نام سے ۲۰۱۳ء میں کیا، تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ادب امکان'' ۲۰۱۴ء میں شائع کرایا، ۲۰۱۷ء میں ''تمثیل نو، دربھنگہ'' کے شمارہ اول تا جون ۲۰۱۷ء کے جملہ مشمولات کا اشاریہ ۴۸۰ صفحات میں ترتیب دیا۔ یہ بھی ماقبل کے اشاریاتی کتب و مجلات کے مقابلے میں ترتیب و تنظیم اور پیش کش کے لحاظ سے بے نظیر ٹھہرا ہے اور ابھی یہ زیر نظر کتاب منصۂ شہود پر آئی ہے۔ ان کے مضامین اور تبصراتی نگارشات کی اشاعت ان پر مستزاد ہیں۔ ڈاکٹر ابرار اجراوی جواں سال ہیں، ان کا اشہب قلم رفتار پر ہے، جہاں قدموں کے نشان نہیں ملتے، ان نادیدہ و پرخطر راہوں سے ہو گزرتا ہے اور دیدۂ بینا کے آثار ثبت کرتا جاتا ہے، ایسی ہی زیر نظر تصنیف ہے، جو میرے سامنے ''قطرہ میں دجلہ دکھائی دینے'' کی مصداق ہے۔

یہ کتاب تین ابواب پر محیط ہے۔ پہلے باب بعنوان ''ترجمہ کا فن اور خصائص و امتیازات'' کے تحت انھوں نے ترجمہ کے تصور و تناظر اور تعریف و تقسیم کے نکات پر اس طرح مربوط و مبسوط گفتگو کی ہے کہ اس حوالے سے لکھی گئی ما قبل کی دوسری کتابوں سے ان کی گفتگو کوئی مشابہت و مجانست نہیں رکھتی۔ دوسرا باب ''عربی اردو ترجمہ نگاری: سمت و رفتار'' سے موسوم ہے، اس میں عربی سے اردو ترجمے کے آغاز سے تقریباً حال تک کے سمت و رفتار کا دست یاب مواد و سرمایے کا موادیاتی اور اسلوبیاتی محاکمہ کیا ہے۔ ان مراحل سے بحسن و خوبی گزرنے کے بعد آخری مرحلہ میں اپنے ہدف ''عربی ادبیات کے اردو تراجم'' پر توجہ مرکوز کی ہے اور اپنے جائزے کا محور عربی نثر نگار، شعرا و ادبا کے دست یاب گراں قدر قدیم عربی دواوین، جدید عربی دواوین، سیرت و سوانح، خودنوشت، داستان، حکایت، ناول، ناولٹ، ڈراما، قصہ، افسانہ، سفرنامہ، تنقید، ادبی تاریخ، انشائیہ، خطبات، لطائف وغیرہ کے اردو ترجموں کو بنایا ہے۔ غیر عربی اعلام و کبار علما کی عربی کاوشوں کو تج نہیں کیا ہے، کیوں کہ مجموعی طور سے اردو تراجم کی دنیا اتنی وسیع ہے کہ اسے سمیٹنے میں مصنف کا اپنے ہدف پر گرفت محال ہو جاتا اور عربی ادبیات سے اردو قارئین کے استفادہ کی راہ استوار کرنے کا منشا شاید تشنہ رہ جاتا، لہٰذا اپنے اشہب قلم کی باگ ڈھیلی نہیں کی اور اس طرح ان کا محاکمہ کیا کہ ماقبل کے محاکموں سے یہ مختلف و منفرد لگتا ہے۔ اس طور پر مصنف نے اپنے منشا اور ہدف کی پاس داری کر کے اس کتاب کی اہمیت و افادیت کو دوچند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبۂ عربی و اردو، بابا غلام شاہ بادشاہ یونی ورسٹی جموں کشمیر نے لکھا ہے کہ:

> ''ادبیات کے تراجم سے جس طرح کسی اجنبی زبان کے ادب سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے، اسی طرح ان تراجم کے تنقیدی مطالعے سے ہر دو زبان کے آپسی لین دین، اخذ و عطا اور باہمی اثر و تاثیر کی گرہیں بھی کھلتی نظر آتی ہیں۔'' (فلیپ کتاب مذکور)

یہ قول اس کتاب پر صادق آتا ہے، ایک مثال سے اپنی بات واضح کرتا چلوں کہ **مصطفی لطفی منفلوطی** کی ایک طویل کہانی ''الضحیہ'' کا حبیب اشعر دہلوی نے ترجمہ کر کے ''رخسانہ'' کے نام سے ۱۹۵۰ء میں کتابی

شکل میں لاہور سے شائع کیا تھا، اس پر ڈاکٹر ابرار راجراوی نے اس طور روشنی ڈالی ہے:

''اس ترجمے کا انتساب پاکستانی بیسواؤں کے نام ہے، کیوں کہ اس میں ایک بیسوا کی دردانگیز کہانی بیان کی گئی ہے جس کا جسم تو آلودہ تھا، مگر اس کی روح پاک تھی۔ چوں کہ یہ ایک فرانسیسی کہانی ہے، اس لیے کرداروں کے نام اور فضا بھی اسی ملک اور وہاں کی تہذیب و ثقافت سے مماثلت رکھتے تھے لیکن مترجم نے اجنبیت کی دیوار کو ہٹانے کے لیے اس کہانی کے کرداروں اور مقامات کے نام کو تبدیل کر دیا ہے اور مقامات کے نام بمبئی اور دلی اور کرداروں کے نام رخسانہ، جاوید، ممتاز، ارمان اور پرویز اور دوسرے ہندوستانی نام رکھ کر دراصل اس کہانی کی فضا اور ماحول پر ہندوستانیت کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ قاری کسی اجنبیت کا شکار نہ ہو اور اس کو یہ کہانی اپنے ہی معاشرے اور اردگرد کی کہانی معلوم ہو...... اس لیے انھوں نے الفاظ کا ساتھ دیتے ہوئے عربی تعبیرات کو اردو کے قالب میں اتنی خوب صورتی سے ڈھالا ہے کہ اس سے بہتر ترجمے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، نہ کہیں الفاظ کے کانٹوں سے دور بھاگنے کی کوشش، نہ یہ گمان گزرتا ہے کہ عربی کی اس تعبیر کو اردو ادا کرنے سے اپنی تنگ دامانی پر شرمندہ ہے۔ حبیب اشعر نے کہانی کے اسما اور اماکن کو ہندستانی رنگ میں تبدیل کر دیا ہے، ناموں اور کرداروں کے تبدیل کرنے کی اس روش پر اپنے وقت کے بہترین عربی داں اور مترجم علامہ نیاز فتح پوری نے بھی اعتراض کیا تھا، مگر وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ ناموں کو تبدیل کرنے اور اس کو مترجم الیہ زبان کی تہذیب و ثقافت کے حسب حال کر دینے سے اس کہانی کے اثر و ت اثر اور اس کی قوت و تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ انگریزی سے بھی جتنے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کا ترجمہ ہوا ہے، وہاں بھی نفس کہانی کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، باقی اس کے کردار اور اس کے ماحول و فضا کو تبدیل کر دیا گیا ہے، تاکہ قاری اور اس ترجمہ شدہ مواد کے درمیان دوسری زبان و ادب کا حجاب باقی نہ رہے۔'' (ص:۱۷۹-۱۷۸)

ایسی ہی تنقیدی بصیرت کی کارفرمائی اس کتاب میں نظر آتی ہے۔ البتہ جدید شاعری کا باب تشنہ لگتا ہے، شاید مواد تک نارسائی کے بموجب ہو۔ ویسے یہ بھی ہے کہ عربی اردو تراجم کے باب پر گرد کی تہ در تہ اتنی جمی ہے کہ اسے کریدنا کوہ کنی کے مترادف ہے۔ بایں صورت اپنے ہدف کے مطابق مواد و موضوعات تک تحقیقی جنون ہی رسائی عطا کر سکتا ہے اور اس تحقیقی جنون کی یہ کتاب شاندار گواہی دیتی ہے۔ اس کی داد نہ دینا ناسپاسی ہوگی اور اس بات کی ستائش کہ اپنی نارسائی پر برملا عجز کا اظہار بھی کیا اور کھلے دل سے یہ دعوت دے کر کتاب کا تمت بالخیر کیا ہے کہ:

''راقم کا یہ جائزاتی، تعارفی اور تبصراتی کام اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد کام ہے، اگر دوسرے حوصلہ مند محققین بھی انگریزی ادبیات کے ترجموں کی طرح عربی ادبیات کے ترجموں کے باب سے گرد جھاڑنے کی کوشش کریں تو بہت سے لعل و گہر ہاتھ آ سکتے ہیں اور اس سے مفلسی و تہی دست اردو کا چھوٹا سا رقبہ بھی وسیع ہو سکتا ہے اور اس کی عالمگیر مقبولیت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔'' (ص:۲۲۷)

ان آخری باتوں میں بڑا وزن ہے، ان کے پیش کش کے دعوے میں اور دعوت میں بھی دم ہے، ان میں جو دعوت ہے اور بین السطور میں مغرب پرستی کے عمومی رجحان پر جو طنز ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔ یہاں دعوت کے ساتھ تو خیر انھوں نے طنز ملیح سے کام لیا ہے مگر اپنے پیش لفظ میں جہاں تہاں تبصرے میں اور دیگر مضامین میں عربی و مشرقی ادبیات سے گریز کے اوپر بڑا تیکھا وار کیا ہے جو کہیں طنز قبیح تو کہیں طعن و تشنیع کی حد کو چھو جاتا ہے۔ خیال ناچیز میں:

اپنی روش نکالیں کہ پہچان بن سکے
بڑھتے رہیں کسی کو ملامت کیے بغیر

ہی ''ابراریت'' کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

ویسے جو صورت حال ہے، اس پر ان جیسے اہل قلم کا ابال بے محل بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ واقعتاً انگریزی کے مقابلے عربی ادب اتنا قلاش نہیں ہے اور نہ عربی اردو تراجم کا باب اتنا بنجر ہے، جتنا ادھر کی عدم توجہی سے باور ہوتا ہے، میرے خیال میں رجعت پسندی کا لیبل لگنے کے خوف سے بھی لوگوں نے اس کی طرف سے منہ پھیر رکھا ہے، ڈاکٹر ابرار اجراوی نے اس جانب ایک جرأت مندانہ قدم بڑھایا ہے اور آئینہ دکھا کر جو دعوتِ فکر دی ہے، وہ پذیرائی کی مستحق ہے، مجھے یقین ہے بقول حقانی القاسمی کہ:

''یہ کتاب نہ صرف عربی اور اردو ادبیات کے اساتذہ اور طلبا کے لیے مفید ثابت ہوگی؛ بلکہ نئے ثقافتی دریچوں کو کھولنے میں کامیاب ہوگی۔''

....

● موضع و پوسٹ: رام نگر، وایا: نہرا، ضلع دربھنگہ، بہار-847233 ؛ موبائل:9852745502

ایم نصر اللہ نصر

'فرات' اور حسین الحق

ناول انگریزی لفظ Novel سے اردو ادب میں داخل ہوا ہے جو اطالوی لفظ Novella سے مشتق ہے۔جس کے معنی نیا' انوکھا اور جدید کے ہیں Oxford Dictionery میں ناول کو ایک من گھڑت نثری بیانیہ (A fictitious prose narrative) کہا گیا ہے۔کبھی اس کی تعریف یوں کی گئی تھی کہ یہ ایک ایسا صنعتی قصہ ہے۔جس میں عہد حاضر کے پس منظر میں ذات' کائنات اور سماج و معاشرت کی کشمکش کو بیان کیا گیا ہو جس میں تہذیبی و تمدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہو جس میں قدیم تاریخ' جدید عصری حالات اور کشمکش حیات' تضاد و تصادم کے عکس ریزے پیش کیے گئے ہوں۔دراصل ناول وہ صنف ادب ہے۔جس میں زندگی کے مختلف مسائل و مراحل کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔جس کا انداز بیان قصہ گوئی سے ملتا جلتا ہے۔اس میں سماج اور زندگی کی حقیقتوں کو بیان کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔بقول کوثر مظہری:

''یورپ میں ناول نگاری نشاۃ ثانیہ کے بعد شروع ہوئی۔صنعتی انقلاب نے یورپ کی زندگی کو جس طرح تہہ و بالا کیا اور مادی ترقی کے ساتھ ہی زندگی کو غلاظتوں اور کثافتوں سے جس قدر آلودہ کر دیا' اس کی ترجمانی کیلئے روایتی اصناف ادب کافی نہیں تھیں۔اسلئے ناول اور افسانے جیسی اصناف وجود میں آئیں اور بہت تیزی سے ترقی کے منازل طے کرتی گئیں۔اردو میں ناول نگاری کی ابتدا ۱۸۵۷ کے بعد ہوئی۔نہ صرف اردو میں بلکہ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں ۱۸۵۷ سے پہلے ناولوں کا وجود نہیں۔'' (موجِ ادب ص:۴۱)

ہندوستان میں ناول نگاری کا سبب بھی غدر کی ہلاکتوں' انگریزوں کے مظالم اور معصوم ہندوستانیوں کا قتل عام کا نتیجہ ہے۔یہاں کے دانشور اور اہل قلم نے اس غیر موافق تبدیلی کو شدت سے محسوس کیا اور اس کا اظہار ناول اور افسانوں کی شکل میں کرنے سے گریز نہیں کیا۔اصلاحِ معاشرہ بھی اس کے وجود میں آنے کا ایک خاص سبب ہے۔تہذیب کی پامالی اور اخلاق کے گرتے معیار نے ڈپٹی نذیر احمد کو اردو میں پہلا ناول لکھنے کا شرف بخشا جس کا سلسلہ نصف صدی تک جاری رہا۔انہوں سات ناول لکھے جو اصلاح معاشرہ کے لئے ہی لکھے گئے۔چونکہ ان کی ناول نگاری میں کچھ کمیاں رہ گئی تھیں اس لئے پریم چند کی ناول نگاری کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔پھر تو اس کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

ناول کی تین خصوصیات نمایاں ہیں۔

۱- ناول کی کہانی طویل ہوتی ہے۔ ۲- ناول حقیقی زندگی اور حقیقی منظر و پس منظر کی نمائندگی کرتا ہے۔

۳- ناول کی ساخت زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔

فنی اعتبار سے ناول میں پلاٹ' کردار' مکالمہ' منظر نگاری اور نظریہ حیات کی پاسداری کی جاتی ہے جو اس کے اجزائے ترکیبی کہلاتے ہیں۔ماہرین ادبیات کی تفہیم کے مطابق:

''قصہ کے واقعات میں جب ایسا معنوی اور باطنی ربط و تسلسل پیدا ہو جاتا ہے کہ اگلا واقعہ پچھلے واقعہ کا لازمی اور منطقی نتیجہ معلوم ہو تو اسے پلاٹ کہتے ہیں پلاٹ کے ابتدائی حصے میں ناول نگار کرداروں کو روشناس کرا دیتا ہے اور دوسرے حصہ میں ان کے معاملات میں گتھیاں پڑنی شروع ہو جاتی ہیں۔تیسرے حصہ میں وہ

معاملات الجھ جاتے ہیں۔ یہ حصہ کہانی کا کلائمکس کہلاتا ہے۔ چوتھے حصہ میں معاملات سلجھنے لگتے ہیں۔ پانچویں حصہ میں نتائج برآمد ہوتے ہیں اور کہانی ختم ہو جوتی ہے۔'' (مجلہ جامعہ اردو علی گڑھ ص ۹۶)

حسین الحق کا ناول 'فرات' کا پلاٹ بھی کچھ ایسا ہی ہے جس میں نظم وضبط کا اہتمام ہے اور ایک جہان حقائق کا باب کھلتا ہے۔ جس میں واقعات کی ایک دنیا خلق ہوئی ہے۔ ہر چند کہ اس میں بکھراؤ زیادہ ہے لیکن ان واقعات کے پیچھے جو اسباب بیان کیے گئے ہیں وہ بالکل واضح ہیں جس کا مرکزی کردار وقار احمد ہیں جو ایک ریٹائرڈ پروفیسر' شاعر' ناقد اور ادیب ہیں۔ زندگی کے اتنے تجربات سے آشنا ہو چکے ہیں کہ ہر معاملہ اور مسائل کائنات کو ہلکے انداز میں نہیں لیتے۔ وہ ان کے بارے میں کافی فکر وغور کرتے ہیں۔ ان کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر پہروں سر دھنتے ہیں اور کسی عجیب سے خوف کی کیفیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کی عمر ستر سال کی ہو چکی ہے اور وہ عرفان و وجدان کے اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے مزید قدم بڑھانے میں انہیں گریز ہے۔ ان کے دل میں کچھ عجیب سا خوف اور ایک گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ جو شخص فلسفہ اور ادب پر بحث کرتے ہوئے تھکتا نہیں تھا اب وہ ان موضوعات کو منہ لگاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ شب بیداری اس کا معمول بن چکی ہے۔ رات گئے پلکیں بند ہوتی ہیں اس لئے صبح کو تاخیر سے اٹھتے ہیں۔ یہی ان کا معمول ہے یہی ان کی زندگی بھی ہے۔ وہ اکثر ذات اور کائنات کے مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے رموز و نکات کی بھول بھلیوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ تصوف پر ان کا مطالعہ اور مشاہدہ اچھا ہے۔ وہ تصوف کو ہی نجات کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں دنیا کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ گھبراہٹ اور اکتاہٹ انہیں پریشان کیے رہتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک روز وہ سکون کی تلاش میں گھر سے نکل پڑتے ہیں اور کسی تبلیغی جماعت کے قافلے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب انہیں وہاں بھی سکون نہیں ملتا ہے تو ایک روز بغیر امیر جماعت کو مطلع کیے مسجد سے نکل پڑتے ہیں۔ بے اطمینانی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی اس لئے ایک دوسری جماعت کے ہمراہ ہو لیتے ہیں۔ یہاں ان کو ایک اسکول کا صدر مدرس بنا دیا جاتا ہے۔ وقار احمد وہاں سے بھی چپکے سے راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر ان کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ سڑکوں پر رقص کرتے نظر آتے ہیں اور یہ مصرع بھی دہراتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں'' ہے رے میں تیری پریم دیوانی''۔ کہانی یہاں آ کر اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال واجد نے اس ناول کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''زیب داستاں کے طور پر ناول میں اور بھی بہت کچھ ہے جس میں قدروں اور رویوں کا ٹکراؤ اور زمانے کے ساتھ ساتھ زندگی کے بدلتے ہوئے اسالیب کی بھی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں مگر ناول کا اصل موضوع زندگی سے بیزاری ہے جو ناشکری کا نتیجہ ہے۔ وقار احمد ادیب' شاعر' ناقد' پروفیسر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جینے سے گھبراتے ہیں۔ اسلئے کہ بقول ان کے انہیں زندگی میں سب کچھ ملا مگر صفیہ خالہ کی بیٹی نہیں ملی' جس سے وہ عشق کرتے تھے۔ عشق کیا کرتے تھے بس ایک بار اس پر نظر پڑ گئی تھی۔'' (دربھنگہ ٹائمز جون ۲۰۱۶ ص ۱۴۳)

دراصل یہ واقعہ کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ ستر سال کا بوڑھا کسی جوان لڑکی پر عاشق ہو جائے جب کہ وہ شاعر' ادیب اور پروفیسر بھی رہا ہے۔ مگر اس میں ایک سچائی تو ضرور ہے۔ یہ آج کا المیہ بھی ہے۔ 'دل بھی آیا تو مہترانی پر' والی بات ہے مگر اس سے باز کون آتا ہے۔ شموئل احمد نے اپنے افسانہ 'لنگی' میں اسی راز کو تو فاش کیا ہے۔ بادشاہت اور نوابی دور میں بھی یہ جنون عام رہا۔ بادشاہوں کو کنیزوں پر دل آتا رہا چاہے عمر کے درمیان کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو۔ زمینداروں کا

معاملہ بھی یہی رہا اور اب تو یہ گھر گھر کی کہانی بن گئی ہے۔ گھر میں بیٹے بیٹیاں اور پوتے پوتیاں جوان ہو رہے ہوتے ہیں اور گھر کے بزرگ عشق لڑانے سے باز نہیں آتے۔

کہا گیا ہے کہ انسان اپنے عمل اور اوصاف سے پہچانا جاتا ہے۔ ناول بھی انسانی زندگی کی تصویر ہے۔ اس کے کردار بھی انسان ہوتے ہیں۔ چناں چہ کسی ناول کے کردار حقیقی زندگی سے جس قدر قریب ہوں گے اسی قدر وہ ناول کامیاب کہلائے گا۔ انسان معصوم پیدا ہوتا ہے۔ دنیاوی ماحول میں وہ پروان چڑھتا ہے۔ حالات و حادثات سے متاثر ہوتا ہے اور ان سے اچھے برے دونوں طرح کے اثرات قبول کرتا ہے۔ چناں چہ وہ کردار جو ناول میں اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں مکمل (Round) کہلاتے ہیں۔ دوسرے قسم کے کردار سادہ (flat) ہوتے ہیں جو زندگی کا ایک رخ پیش کرتے ہیں۔ یہاں وقار احمد کا کردار ایک مکمل کردار ہے جو آغاز تا اختتام اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار وقار احمد بالکل اس پر کھرے اترتے ہیں۔ ناول نگار نے بڑے اہتمام اور سچائی سے اس کردار کو پیش کیا ہے۔

مکالمہ ناول کا ایک ضروری جز ہے۔ یہ اظہار خیال کا ایک ذریعہ بھی ہے اس سے انسان کے جذبات و احساسات کا انکشاف بھی ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ فطری' مناسب' موزوں' واضح اور دلچسپ ہوں۔ اس میں کردار کی زبان' عمر' رشتہ' طبقات اور جغرافیائی حالات کا خیال رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ حسین الحق نے اپنے ناول فرات میں اس کا خاص خیال رکھا ہے۔ بلکہ پورا ناول مکالماتی انداز میں ہی لکھا گیا ہے۔ مکالمے بھی خوبصورت' فطری' مناسب اور دلچسپ ہیں۔ چند مکالمے آپ بھی ملاحظہ فرمالیں:

- ''ایسا غریب پسر اتنا شاندار خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر وقار احمد نے جو خواب دیکھا نہیں اس کی انہیں تعبیر مل گئی اور ان کی آنکھوں میں جو خواب خود بہ خود بس گیا تھا اس کی تعبیر الٹی ہوگئی۔ اسی سال صفیہ خالہ کی بیٹی کی شادی ہوگئی۔''
- ''کہاں جا رہے ہیں؟''
  ''آفس کے لئے نکل رہا ہوں۔''
  ''اب آج تو کم از کم آفس نہ جایئے۔''
  ''جو ہو رہا ہے اجودھیا میں۔ یہاں کیا مسئلہ ہے۔''
  ''آپ بھی عجیب آدمی ہیں' سارا ملک تناؤ میں ہے اور پھر آپ کو پرانے شہر سے ہو کر جانا اور آنا ہے۔ آپ ماتھر جی سے مشورہ کر لیجیے۔''
- ''مگر وہ بوڑھا آدمی میرا باپ ہے۔''
  ''یہ کیا بات ہوئی؟ اس کی جگہ کسی اور کو اگر میرا باپ بنا کر پیش کیا گیا ہوتا تو وہ میرا باپ ہوتا۔''
  ''یہ بہت کمینی اور گندہ فکر ہے۔ قصائی کے عمل کی طرح خود غرض اور ظالم۔''
  ''اس میں ظلم اور کمینے پن کا کیا سوال ہے؟ یہ تو ایک حقیقت ہے۔''
  ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ رشتوں کی کوئی معنویت نہیں۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ اصل چیز تو تعلق ہے۔ رشتہ کیا؟''

مذکورہ مکالمے جیسے بیشمار مکالمے درج ہیں جو صرف مکالمے نہیں بلکہ ان میں تہذیب کی ٹوٹتی بکھرتی شکلیں نمایاں ہیں۔ مذہب اور سیاست کی آڑ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بہترین عکس ریزی کی گئی ہے۔ بڑے چبھتے سوالات کھڑے کئے گئے ہیں۔ آج کا سماج اور تہذیب اس قدر تاراج اور تہی دست ہو چکی ہے کہ سوائے نفرت اور مفاد کے انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ انسان سے انسانیت ختم ہو چکی ہے۔ انسانی ہمدردی اور سماجی بھائی چارگی کا تو دور دور تک شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ اسی کی منظر نگاری اس ناول میں بھی کی گئی ہے۔ مختلف تہذیبوں کا آپسی اختلاط اور بے راہ روی' سرکشی' من مانی' روایت سے بغاوت آج کا معمول بن چکا ہے۔ آج کی نسل اسے تہذیب و معاشرے کی ترقی سمجھتی ہے اور روایت کے پاسدار اسے بربادی کا سبب۔ اس کی تصویر کشی اس ناول میں بہت عمدگی سے کی گئی ہے۔

منظر نگاری ناول نگاری کے عناصر ترکیبی کا ایک اہم جز ہے۔ جس سے زمان و مکان کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ کردار کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملک اور معاشرے کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخی پس منظر بھی عکس ریز ہوتے ہیں۔ ایک عہد کی مکمل اور نامکمل تصویر قاری کے ذہن پر ابھر آتی ہے اور کبھی کبھی وہ خود کو اس کا ایک حصہ یا ناظر سمجھنے لگتا ہے۔ اس ناول میں بھی ایسے بے شمار مناظر موجود ہیں۔ بلکہ اس میں کوئی ایک عہد نہیں کئی ادوار کے عکس ریزے موجود ہیں۔ قدیم' جدید اور عصری واقعات و حالات کو عمدہ ماہرانہ بلکہ مشاق ہنر کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ جو کبھی دل کو خوب بھاتا ہے تو کبھی کبھی بیزاری کا احساس بھی ہوتا ہے۔ جس کا اظہار ڈاکٹر اقبال واجد نے کچھ یوں کیا ہے:

> ''حسین الحق نے اپنے ناول فرات میں ابرہہ کا کعبہ تعمیر کیا ہے جو اصل مرکز کے گرد طواف کرنے سے غیر محسوس طریقے سے ہمیں روکتا ہے اور ایک مجازی اور جعلی چیز کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر زندگی کو اس کی اصل حقیقت سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حسین الحق نے اپنے تصوف کا نام بھی لیا ہے' کچھ شریعت و معرفت کی باتیں بھی کی ہیں مگر خود تصوف کے عملی اسالیب میں ان کے یہاں تضاد نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے اندر زندگی سے اکتاہٹ کی کیفیت ملتی ہے۔ یہ دراصل فکر و عمل کا فرق ہے۔ اسی فکر و عمل کے فرق نے حسین الحق کے ناول 'فرات' کے ہر کردار میں زندگی سے بُعد پیدا کر دیا ہے۔'' (ص ۱۴۴)

ڈاکٹر صاحب کی باتوں میں سچائی ہے۔ ناول اپنے ساتھ اتنے مسائل کو لے کر ساتھ چلتا ہے کہ کسی ایک کی طرف قاری کی نظر مرکوز نہیں رہتی۔ فرات کو انہوں نے ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جو حق و باطل کی جنگ کا منظر نامہ ہے۔ جہاں ظالم اور مظلوم کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ جہاں انسانیت سوز اعمال کو دہرایا گیا ہے۔ جہاں معصوموں پر ظلم کے نئے نئے حربے اپنائے گئے ہیں۔ حسین الحق نے بھی کچھ ایسا کرنے کی کوشش کی ہے مگر آگے چل کر شاید راستہ بھٹک گئے ہیں۔ ایسا ہمیں اور قاری کو محسوس ہو سکتا ہے لیکن ناول نگار کی اپنی رائے مسلم ہے۔ یہ اپنی اپنی تفہیم کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں انہیں ناکام ناول نگار نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ مجھے ان کا انداز تحریر و تخلیق پسند ہے۔ مزید بہتر کوشش کا مشورہ ماہرین ادب دے سکتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ناول لائق تحسین ہے۔

....

● ہوڑہ (مغربی بنگال) موبائل:9339976034

ایم نصر اللہ نصر

خالد محمود کا نثری اسلوب

خالد محمود کا قلمی نام بھی خالد محمود ہے۔ یہ بڑی سعادت کی بات ہے کیونکہ اکثر ادبا و شعرا کو اپنے اصلی اور تاریخی نام اطمینان بخش نہیں لگتے۔ یا تو وہ پورے نام کو بدل لیتے ہیں یا کم از کم اس میں اضافہ و ترمیم ضرور کرتے ہیں لیکن موصوف نے ایسا کچھ نہیں کیا اور اپنے ایک ہی نام پر قائم رہ کر ادبی دنیا میں اپنا مقام و مرتبہ متعین کر لیا۔ نیز شہرت کی بلندیوں کو بھی چھو لیا۔ خالد محمود کی آمد اس دار فانی میں ۱۵ر جنوری ۱۹۴۸ کو سرونج (مدھیہ پردیش) کی سرزمین پر ہوئی جس سے وہاں کی پوری فضا احساس کی ایک نئی خوشبو سے معطر ہو گئی۔ خالد محمود نے ابتدائی تعلیم مدرسہ ریاض المدارس (سرونج) سے حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم حمیدیہ پوسٹ گریجویٹ گورنمنٹ کالج، بھوپال سے نیز بی۔ ایڈ اور ایم۔ اے کی ڈگری سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، بھوپال سے حاصل کی لیکن پی ایچ۔ ڈی۔ کی سند بعنوان 'اردو سفر ناموں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ' جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے ملی۔ خصوصی مطالعات میں سفر نامہ، شاعری اور مضمون و مقالہ نگاری شامل ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے کر باعزت سبکدوش ہوئے۔ بے شمار مناصب پر فائز رہے اور انعامات و اعزازات سے سرفراز بھی ہوئے جن میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دہلی برائے ترجمہ اور میر تقی میر ایوارڈ بھی شامل ہیں دنیا کے بیشتر ممالک کا ادبی و شعری سفر کر چکے ہیں۔ تصنیفات میں ۲۵ر سے زائد کتابیں ان کے کشکول میں محفوظ ہیں۔ زیر مطالعہ ان کی تنقیدی و تحقیقی کتاب "تفہیم و تعبیر" ہے جو ۴۳۲ر صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں ۲۸ر تنقیدی مضامین، ۵ر گفتگو اور ۲۳ر جائزے شامل ہیں۔ ان کا تعارف کچھ یوں پیش کیا گیا ہے:

> "پروفیسر خالد محمود اردو کے ایک ممتاز استاد، خوش فکر شاعر، طنز و مزاح نگار، مترجم اور نقاد ہیں۔ آپ نے متعدد ناولوں اور کہانیوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ دو شعری مجموعے "سمندر آشنا" اور "شعر چراغ" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ "شگفتگی دل کی" انشائیوں اور خاکوں کا مجموعہ ہے اور "اردو سفر ناموں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ" ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جو ہندو پاک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اردو اکادمی دہلی کی درخواست پر آپ نے "شاہ مبارک آبرو" پر مونوگراف تحریر کیا۔ مضامین کے تین مجموعے 'تحریر کے رنگ'، 'ادب کی تعبیر' اور 'ادب اور صحافتی ادب' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی نے آپ کو اردو ترجمے کے ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے 'کل ہند میر تقی میر ایوارڈ برائے شاعری' سے نوازا۔ آپ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت، اردو اکادمی دہلی کی وائس چیرمین شپ، مختلف رسائل و جرائد کی ادارت اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی سربراہی جیسے اہم مناسب پر فائز رہے۔ ۲۰۱۶ میں بھوپال یونیورسٹی نے "پروفیسر خالد محمود کی شخصیت اور فن" کے موضوع پر ڈاکٹر محمد ایاز کو پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری تفویض کی۔"
>
> (تفہیم و تعبیر ص ۳۸۳)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالد محمود کی شخصیت اور ادبی حیثیت کس قدر بلند ہے۔ سفر نامے پر تحقیق

کوئی آسان کام نہیں اور ان کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ تو اور مشکل ترین کام ہے۔اس کے علاوہ ایک نثر نگار کا شاعر ہونا وہ بھی بلند پائے کا ان کی شخصیت میں چار چاند لگانے کے مصداق ہے۔خالد محمود کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کی نثر بڑی شگفتہ اور شائستہ ہے۔اس کا اسلوب نہایت ہی سلیقہ مند اور قابلِ تحسین ہے۔ان کے خامۂ گہر بار سے نکلے ہوئے الفاظ اور سجائے ہوئے جملے اپنی آب وتاب کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔چند اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

- 'کوثر صدیقی ایک ہمہ جہت فن کار ہیں۔انہوں نے وادیٔ شعر وادب میں بہت دیر سے قدم رکھا مگر جب رفتار پکڑی تو پلٹ کر نہیں دیکھا۔کئی زبانوں سے واقف اور کئی علوم سے آشنا ہونے کے باوصف خودستائی اور خوداشتہاریت سے ناواقف وناآشنا ہیں۔'
- 'ڈاکٹر شہزاد انجم ایک ذہین نقاد اور دیدہ رس محقق ہیں۔ان کی بصیرت تخلیقات کے ان پہلوؤں کو دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے جن تک رسائی حاصل کرنا سہل نہیں مگر چونکہ وہ فن پارے کا تجزیہ کرتے ہوئے دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں اس لئے اس راہ دشوار سے بہ آسانی گزر جاتے ہیں۔'
- 'کہا جاتا ہے کہ غزل بڑی شاطر صنفِ سخن ہے۔بظاہر آسان بباطن مشکل وہ شعر گوئی کے اپنے شائقین کو ورغلا کر بہت جلد اس کو خوش فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے کہ انھوں نے اس کا حق ادا کر دیا۔نو واردوں پر اس کا یہ حربہ عموماً کارگر ثابت ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بڑا یا کم از کم اچھا شاعر ضرور سمجھنے لگتے ہیں۔'
- 'شاعری میں بعض اصطلاحات ایسی بھی ہیں جو ہر ایک کا مقدر نہیں بنتیں۔کسی کسی شاعر کو فیض یاب کرتی ہیں۔ندرتِ خیال اور جدتِ ادا کا تعلق اسی قبیل کی اصطلاحات سے ہے۔یہ الگ بات ہے کہ جابہ جا استعمال کی زد میں آکر فی زمانہ ان کی قدر ومنزلت میں کمی آگئی ہے اور ان کی معنویت کو گہرا صدمہ پہنچا ہے۔'

مذکورہ اقتباسات کے مطالعے کی روشنی میں بات کریں تو موصوف کی نثر نگاری میں امتیازات اور انفرادیت کے نمایاں رنگ صاف دکھتے ہیں۔شخصیات کے تعلق سے وہ لفظیات کی پیکر تراشی سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کا مطالعہ بھی دیدہ ریزی اور دقت نظری سے کرتے ہیں پھر کچھ رقم کرتے ہیں۔وہ ایسے جملے تراشتے ہیں جن میں ان کے محاسن ومعائب سب نظر آتے ہیں اور ان کا نثری اسلوب بھی چمکتا اور دمکتا ہوا نظر آتا ہے۔معلومات کی پرتیں بھی کھلتی ہیں اور علم وآگہی کے دریچے بھی وا ہوتے ہیں۔فن اور اصناف فن کی نقاب کشائی بھی مہذب طریقے سے کرتے ہیں۔مرصع سازی اور شعر گوئی کے تعلق سے جو گفتگو ہوئی ہے وہ کس قدر حقیقت پسندانہ ہے۔اچھی شعر گوئی کے لئے اچھے لفظوں کا انتخاب ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کے مناسب استعمال سے واقفیت لازمی ہے۔ایسے کتنے نکتے ہیں جن کی طرف موصوف نے بلا تامل اشارہ کیا ہے۔چند اور اقتباسات ملاحظہ کریں:

- 'اردو ہماری مادری زبان ہے اور مادری زبان سے لگاؤ فطری بات ہے اردو کے ذریعہ ہم سب اپنی تہذیب' ثقافت' ادب' تاریخ' مذہب اور روایات سے واقف ہوئے۔اسی نے ہمیں بات کرنا سکھائی' ذہنی اور ادبی تربیت کی۔اس زبان کے بڑے احسانات ہیں۔اس اعتبار سے بھی ہم پر اس کا فروغ

لازم آتا ہے۔ اردو ایک نہایت دلکش اور ادبی حیثیت سے مالا مال زبان ہے۔ یہ ہماری پروقار شناخت کا سب سے موثر وسیلہ ہے۔'

- 'انشائیہ ایک ذہنی ترنگ ہے۔ اسے ایک چھتری سے بھی تعبیر کیا گیا ہے جس پر پالتو کبوتر بیٹھتے ہیں جب انھیں اڑا دیا جاتا ہے تو چاروں طرف چکر کاٹ کر پھر اسی پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یعنی اگر آپ انشائیہ لکھ رہے ہیں تو دنیا جہان کی باتیں کیجیے مگر موضوع آپ کی نگاہ سے اوجھل نہ ہو۔ انشائیہ میں شگفتگی شرط ہے۔

خاکہ ایک ایسی غیر افسانوی صنف ادب ہے جس میں خاکہ نگار سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے موضوع یعنی ممدوح سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہو بلکہ اس سے ہمدردی بھی رکھتا ہو اور جو واقعات بیان کرے بوقت ضرورت ان کی تصدیق بھی کر سکے۔'

- 'غزل کی تفہیم میں جو اصطلاحات مدت دراز سے شعر اور شاعر کے تعین قدر کا وسیلہ ہیں ان میں شگفتگی' شائستگی' روانی' بے ساختگی' ندرت خیال' ندرت بیان' جدت ادا' جوش بیان' سوز و گداز' مضمون آفرینی' صداقت جذبات' شدت احساس' نزاکت فکر' زبان کی سادگی' بیان کی صفائی' سلاست' روزمرہ محاورہ' ضرب المثل' بندش کی چستی' اثر انگیزی' اثر آفرینی جیسے ایمائی حوالے اور صنائع بدائع کے تعلق سے تشبیہ' استعارہ' تلمیح' تضاد' مبالغہ' مرعات النظیر' رعایت' مناسبات' علامت' ایہام' کنایہ' مجاز' مجاز مرسل' لف ونشر' حسن تعلیل اور اسی قبیل کی دوسری معروف اور کثیر الاستعمال صنعتیں ہیں جن کا علم و ادراک غزل کے استاد کے لئے از بس لازمی ہے۔" (تفہیم و تعبیر ص ۲۴۲)

ملاحظہ کیجیے کہ کس خوبی اور خوش اسلوبی سے موصوف نے انشائیہ اور خاکے کے فرق کو بتایا ہے اور دونوں کو ان خوبیوں سے آشنا کیا ہے جن کا برتنا راقم کے لئے لازمی ہے۔ اس رہ گزر کی نشاندہی کر دی ہے جو انشائیہ نگار اور خاکہ نگار دونوں کے لئے مشعل راہ ہے۔، عام طور پر جماعت میں طلبا و طالبات کو غزل پڑھاتے وقت اردو کے اساتذہ صرف شعر کے مفہوم کو واضح کر کے چلے آتے ہیں انھیں صنف سخن کی ابجد سے بالکل واقفیت نہیں ہوتی۔ ایسے اساتذہ طلبا کی تشنگی کو دور نہیں کر سکتے اور نہ ان میں غزل کے تعلق سے دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر انھیں غزل کی صنف اور شاعری کے اوصاف کے ساتھ غزل پڑھائی جائے تو وہ خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایک شعر کے اندر مذکورہ کون کون سی خوبیاں اور خصوصیات ہیں انھیں کھل کر بتانا چاہئے۔ خالد صاحب کی صلاح اور باریک بینی کی داد دینا لازمی ہے۔ انھوں نے نہ صرف صلاح دی ہے بلکہ ان تمام نکات کہ طرف اشارہ بھی کر دیا ہے جو شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے خود سمجھنا ضروری ہے۔

لیکن ان اقتباسات کی جو اہم کڑیاں ہیں وہ ان کی لفظیات کی مرصع سازی ہے۔ جملوں کی حرمت کا پاس ہے۔ تخیل کی پرواز ہے۔ لفظوں کا دروبست ہے۔ انداز بیان اتنا سلیقہ مند ہے کہ نہ کسی لفظ کو خراش آتا ہے اور نہ جملوں کی صف بندی میں کوئی بے ترتیبی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی اسلوب اور پیکر تراشی ان کو دوسروں سے ممتاز و منفرد مرتبہ و

مقام عطا کرتی ہے۔ ان کے ذہن میں لفظوں کا خزانہ بھرا پڑا ہے لیکن وہ انھیں بے دریغ خرچ نہیں کرتے۔ نہایت ہی ہوشمندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تراکیب واستعارے نیز ضرب المثل اور محاوروں کی پاسداری کا خوب خیال رکھتے ہیں اور سیراب ہو کر لکھتے ہیں۔ جیسے افکار و خیال کے ساتھ لفظوں کا سیلاب بھی امڈ ے پڑتا ہے لیکن ایک بھی لفظ یا ترکیب ذہن کو گراں نہیں گزرتی۔ سب کے سب حسب ضرورت ہی استعمال میں آتے ہیں۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں اور یہ محسوس کریں کہ موصوف کی نثر نگاری کا اسلوب کتنا اچھا اور جامع ہے۔ یہ کمال خدا کسی کسی کو دیتا ہے:

- ”تدریس غزل کے باب میں جو معاملات موضوع گفتگو بنے ہیں یا بن سکتے ہیں ان میں غزل کی ہیئت اور اس کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کے علاوہ آغاز وارتقا' مزاج اور نوعیت' موضوعات اور شعریت' اسالیب واظہار' تحریکات ورجحانات' رموز وعلائم' اور ان کی فکری فنی جہات' داخلیت' خارجیت' مادیت' رجائیت' قنوطیت' ارضیت اور ماورایت جیسے میلانات روایت' بغاوت فرسودگی' جدت' قافیہ پیمائی' ابتذال' اور انحراف واجتہاد بے شمار مسائل ہیں جن کی واقفیت کے بغیر تدریس غزل کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔“ (تفہیم وتعبیر ص ۲۴۲)

مختصر یہ کہ خالد محمود کی شاعری جتنی اچھی ہے ان کی نثر نگاری بھی اتنی ہی پر اثر ہے۔ اس کا انحصار زبان دانی اور زبان پر قدرت رکھنے پر ہوتا ہے۔ موصوف کے مضامین پڑھ کر مجھے سمجھ میں آیا کہ زبان پر قدرت رکھنا کس کو کہتے ہیں اور عمدہ اور اثر انگیز اسلوب نگاری کیا ہے۔ ان کے یہاں لفظیات کی جلیبیاں بھی نہیں ہیں اور لچھے دار مکالمے بھی نہیں۔ الجھاؤ تو بالکل نہیں ہے۔ جادو بیانی اور سحر انگیزی کا معاملہ بھی نہیں ہے۔ وہ جو بھی محسوس کرتے ہیں صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ اتنا کم بھی نہیں کہ قاری کو تشنگی کا احساس ہو اور اتنا مفصل اور سیلابی بھی نہیں کہ وہ اوب جائے۔ بلکہ انداز اور اسلوب اتنا پیارا ہے کہ اگر قاری ان کی نگارشات کو پڑھنا شروع کرتا ہے تو پھر مکمل مضمون پڑھے بغیر رکتا نہیں ہے۔ ان کی تخلیقات میں دلچسپی کے اتنے سامان ہوتے ہیں کہ قاری پوری گرفت میں رہتا ہے اور مضمون خود کو پڑھوا لیتا ہے۔ اس کتاب میں اردو ادب کی تاریخ 'تہذیب اور تصانیف کے علاوہ اصناف شعر وادب کا بھی تذکرہ درج ہے۔ جس میں دارالمصنفین' شبلی کی نظمیہ شاعری غالب اور شبلی کی شاعری کا تقابلی جائزہ' مکاتب شبلی کا محاسبہ' ہندوستانی' یونانی اور چینی سفرناموں کی تاریخ' مصر و حجاز کے واقعات' حالی' ملا رموزی' ملک زادہ منظور احمد کے رقص شرر اور کرب خنداں (غضنفر) کا محاسبہ' طنز و مزاح افسانہ نگاری' شاعری اور دیگر علوم وفنون پر بھی گفتگو محفوظ ہے۔ قاری اس کتاب کو جس زاویے سے پڑھنا چاہے وہ فیض حاصل کر سکتا ہے بلکہ سیراب ہو سکتا ہے۔

....

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

''گیسوئے اسلوب'' ڈاکٹر امام اعظم کا تنقیدی مکاشفہ

ڈاکٹر امام اعظم ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں۔ دنیائے شعروادب میں اپنی گونا گوں کاوشوں کے سبب مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ شاعری اور نثر نگاری دونوں سے گہری دلچسپی ہے۔ ان کے شعری مجموعے ''قربتوں کی دھوپ'' (مطبوعہ: ۱۹۹۵ء) اور ''نیلم کی آواز'' (مطبوعہ: ۲۰۱۴ء) بطور شاعر ان کے اعتراف میں معاون ہیں۔ تنقید و تحقیق کے حوالے سے ان کی کتابیں ''مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ'' اور ''مناظر عاشق ہرگانوی کا لٹریری زون'' اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے ساہتیہ اکاڈمی کیلئے اروِن کمل کے ہندی شعری مجموعے ''نئے علاقے میں'' کا اردو ترجمہ (۲۰۰۱ء) اور عبدالغفور شہباز پر مونوگراف (۲۰۱۲ء) لکھا ہے۔ ''اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب: کثرت میں وحدت کا اظہار'' سے ان کے فکر و نظر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کئی کارآمد کتابیں ترتیب بھی دی ہیں۔ ''نصف ملاقات'' (مرحوم مشاہیر ادب کے خطوط مظہر امام کے نام۔ مطبوعہ: ۱۹۹۴ء)، ''اقبال انصاری: فکشن کا سنگ میل'' (۲۰۰۳ء)، ''مولانا عبدالعلیم آسی: تعارف اور کلام'' (مطبوعہ: ۲۰۰۳ء)، ''عہد اسلامیہ میں دربھنگہ اور دوسرے مضامین'' (۲۰۰۹ء)، ہندوستانی فلمیں اور اردو'' (۲۰۱۲ء)، ''فاطمی کمیٹی رپورٹ: تجزیاتی مطالعہ'' (۲۰۱۳ء)، ''نامۂ نظیر'' (۲۰۱۴ء) ''اکیسویں صدی میں اردو صحافت'' (۲۰۱۶ء)، ''شخصیت سیریز: مظہر امام'' (برائے اتر پردیش اردو اکاڈمی ۲۰۱۷ء) اور ''نقوش علی نگر: تبصرے اور تجزیے'' (۲۰۱۸ء) ایسی کتابیں ہیں جن کے مضامین معیاری اور موضوع کو جلا بخشنے والے ہیں۔ ان کی ادارت میں رسالہ ''تمثیل نو'' شائع ہوتا ہے جس کی پذیرائی عالمی اردو گاؤں میں ہوتی ہے۔ اس کے کئی خاص گوشوں نے نئے مباحث کو جنم دیا ہے۔ سنجیدہ ادبی حلقوں میں ان کی اس ادبی کارگذاری کو بنظر تحسین دیکھا جاتا ہے۔ وہ ادبی مضامین کے ذریعے شعروادب کی تفہیم و تنقید کا اہم کام بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ مختلف موضوعات اور ادبی شخصیات پر ان کے مضامین مطالعہ پسندی اور تعین قدر سے عبارت ہے۔ ان کے مضامین کے اب تک تین مجموعے ''گیسوئے تنقید'' (۲۰۰۸ء)، ''گیسوئے تحریر'' (۲۰۱۱ء) اور ''گیسوئے اسلوب'' (۲۰۱۸ء) شائع ہوئے ہیں جو ان کی ادبی شخصیت کو نئی پہچان عطا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم ان خوش نصیب تخلیق کاروں میں سے ہیں جن کی خدمات کا اعتراف بھی ہوا ہے۔ ان کی شخصیت اور فن کاری کے حوالے سے کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ڈاکٹر ایم. صلاح الدین نے ''ڈاکٹر امام اعظم: اجمالی جائزہ'' کے نام سے ان کی جملہ کارکردگیوں کو پیش کیا ہے۔ ''دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی و صحافتی خدمات کے حوالے سے'' کے موضوع پر ڈاکٹر سرور کریم نے ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے اور ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی حیثیت کو مزید مستحکم کرتا ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے ''ڈاکٹر امام اعظم کی بازآفرینی'' کتاب لکھ کر یہ واضح کیا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی خدمات وسیع ہیں اور قابل ستائش بھی۔ سید محمود احمد کریمی نے ان کے شعری مجموعہ ''قربتوں کی دھوپ'' کا انگریزی

میں ترجمہ کیا ہے جو "Proximal Warmth" کے نام سے ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی نے ''تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش'' کے نام سے کتاب ترتیب دی ہے جو بلاشبہ ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی صحافتی مصروفیتوں کا اعتراف اور اس رسالے کی اہمیت کا آئینہ ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی شخصیت میں ادب وصحافت کی خمیر شامل ہے اور ان کی تحریر میں ایک قسم کا وقار اور ادبی بصیرت نیز خوش بیانی پائی جاتی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب ''گیسوئے اسلوب'' ادبی مباحث اور تنقیدی جائزے پر محیط ہے۔

مصنف نے مشمولہ مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں اصناف کے تعلق سے بحث ومباحثہ اور تحریکات کی تاریخ نیز زبان کے مباحث پر مبنی مضامین شامل ہیں جبکہ دوسرا حصہ شعر وادب کی اہم شخصیات کے کارنامے اور ان کی کتابوں پر علمی وادبی تحریروں سے آراستہ ہے۔ ''علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں'' کے عنوان سے تحریر کا راست پہلو زبان اور تعلیم کی سمت میں سرسید احمد خاں کی کوششوں کا اظہار یہ ہے۔ بلاشبہ سرسید احمد خاں نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر تعلیم کو عام کرنے اور اس کے ذریعے کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے تحریک چلائی جس کا جیتا جاگتا ثبوت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ ''کولکاتا تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں'' ایک وقیع مضمون ہے۔ اس میں کلکتہ کی تاریخ کے روشن پہلو احسن طریقے سے بیان ہوئے ہیں۔ یہ تحریر تاریخ کا ادراک رکھتی ہے اور شہر نگاراں کی ادبی اور ثقافتی منظرنامے کو پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ اور موجودہ صورت حال پر ایک مضمون ''اکیسویں صدی میں بنگال میں اردو صحافت کی پیش رفت'' شامل کتاب ہے۔ کولکاتا اور مغربی بنگال کے تعلق سے یہ دو مضامین مصنف کی اس خطہ سے دوستانہ اور گہرے روابط کو ظاہر کرتے ہیں۔ ''اردو نظموں کا پس منظر اور پیش منظر: ۱۹۸۵ء کے بعد'' نئی نسل کے نظم نگار شعراء کی تخلیقی اپج کے جائزے پر محیط ہے اور اردو معاشرے میں نظم نگاری کے بدلتے رنگ کا تذکرہ بھی اس میں ملتا ہے۔ اس مضمون میں نمائندہ نظم نگار شعراء کے ذکر سے نظم نگاری کی صورت گری کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ فلموں میں اردو کے استعمال اور فلم کی کامیابیاں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اختصار سے ''ہندوستانی فلمیں اور اردو: ایک منظرنامہ'' میں ان تمام نکات سے گفتگو کی ہے جن سے فلم انڈسٹری اور اردو کا تعلق ہے۔ ''اکیسویں صدی میں اردو کے روشن نقوش'' کے باطن میں اردو زبان کی ترقی وترویج اور اس کی وسعت نیز قومی سالمیت کا جذبہ موجزن ہے۔ آزاد غزل نے تجربہ پسند شعراء کو متاثر کیا اور اس صنف شاعری کو جلا ملی۔ انہوں نے ''جدید شاعری میں آزاد غزل کا ہیئتی تجربہ'' میں اس کی ابتدا، فنی محاسن اور شعری تجربہ کرنے والے تخلیق کاروں کے اشعار کو پیش کرتے ہوئے اس تجربہ کو مستحسن قرار دیا ہے۔ آزاد غزل کے شعری مجموعوں اور اس صنف پر ہوئے تحقیقی کام کا حوالہ دیتے ہوئے رسائل وجرائد کے گوشے شائع ہونے اور اس کی مقبولیت کا ذکر بھی کیا ہے ''مشترکہ تہذیب: ہندوستانی ثقافت کی شاخ گل'' میں ملک کی سالمیت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی وترقی کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس میں اردو کے رول کو اجالا ہے۔ اردو زبان کو تمام عصری ضرورتوں میں استعمال، بطور خاص میڈیا کے ذریعے اس کی تشہیر اور عوامی بنانے کی ضرورت پر زور دیتا ہوا مضمون ''اردو زبان اور میڈیا'' ہے۔ انہوں نے آن لائن انسائیکلوپیڈیا میں اردو وکی پیڈیا کا جائزہ لیا ہے اور یہاں

شامل مواد سے غیر اطمینانی کا اظہار کیا ہے جو بجا ہے۔ یہاں نامکمل اور بعض دفعہ غلط اور غیر مصدقہ معلومات ملتی ہے۔ انہوں نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اردو کے بڑے اداروں کو اس طرف توجہ دینی چاہئے۔

مضامین کا اگلا پڑاؤ شخصی کارناموں اور کتابوں کے باطن سے مکالمے پر محیط ہے۔ یہاں شعری کاوشوں کے حوالے سے گیارہ مضامین شخص اور شاعری پر تبصراتی تنقیدی زاویہ نظر کی تمثال ہے۔ عبدالغفور شہباز، علی سردار جعفری، مجاز، شاد عارفی، علقمہ شبلی، لطف الرحمٰن، وسیم بریلوی، منصور عمر، سید تقی عابدی، ف.س.اعجاز اور سراج دہلوی کی شاعری کے مختلف ابعاد میں سے چند ایک کو موضوع بناتے ہوئے ان کی کارکردگی کو واضح کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی کوشش رہتی ہے کہ فنکار کے کارنامے خواص وعوام کے درمیان آجائیں اور ان میں پوشیدہ محاسن کی بازیافت ہوتی رہے۔ اس کے لئے وہ متن سے سروکار رکھتے ہیں، ادب پارے کو بنیاد مانتے ہوئے فن کار کی ادب سے وابستگی کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے مضامین میں بیان کا انداز تفہیمی اور تشریحی ہوا کرتا ہے۔ وہ اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے حسب ضرورت معیاری حوالہ جات سے کام لیتے ہیں اور ادب پارے کے منتخب حصے سے گفتگو کو آراستہ کرتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، ابواللیث جاوید، یٰسین احمد کی افسانہ نگاری کو متعدد عنوانات کے تحت موضوع بنایا گیا ہے۔ انہوں نے جہاں بیدی اور منٹو کی عظمت پر خامہ فرسائی کی ہے تو آج کے توانا فکشن رائٹر یٰسین احمد کے موضوعات سے بھی بحث کی ہے۔ انہیں اردو کی عظیم روایتوں سے محبت ہے تو معاصر ادب سے بھی دلچسپی ہے۔ یہ معاملہ شعر ونثر دونوں میں ہے۔ مولانا آزاد کے افکار کو موضوع بنایا گیا ہے، احتشام حسین کے خطوط پر خامہ فرسائی کی گئی ہے تو معاصر تنقید نگاران نظام صدیقی، ابوالکلام قاسمی، احمد سجاد، ارتضیٰ کریم، اور حقانی القاسمی کی تنقید نگاری کے چند گوشوں کو آشکارا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مصنف نے سید محمد اشرف کے ناول ''آخری سواریاں'' اور صدیق عالم کے منظوم ناول ''چار رنگ کی کشتی'' کا جائزہ لیا ہے اور دونوں ناولوں کو اردو ناول نگاری میں اہمیت کا حامل بتایا ہے۔ انہوں نے دیانت داری سے ان ناولوں کی خوبیوں کو نفس مضمون سے وابستہ رکھا ہے۔ ''گیسوئے اسلوب'' میں دو مرحومین ادبا مظہر امام اور منصور عمر کے لئے تحریر کردہ تعزیتی مضامین ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کو یاد کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ''وہ جو بچھڑ گئے: مظہر امام'' اور ''پھول مرجھا گئے خوشبو کا سفر جاری ہے: منصور عمر'' کے عنوانات سے مضامین میں جدت ہے اور دونوں حضرات کو جاننے میں معاون بھی ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (داستانی طرز کے قلم کار)، ظہیر انور (سفرنامہ: ایک عرض تمنا)، جاوید دانش (اردو ڈراما کا ایک مقناطیسی عنوان)، حشمت کمال پاشا (ادب اطفال میں کمالات)، اقبال جاوید (آغا حشر کاشمیری: حیات اور ڈراما نگاری)، مصطفیٰ اکبر (افکار سے اظہار تک) اور ایس ایم آرزو (مزاح نگاری) پر مضامین کتاب اور صاحب کتاب کو جاننے کے لئے معاون ومددگار ہیں۔ ان تحریروں سے تخلیق اور تخلیق کار دونوں کے جہات روشن ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم کے مضامین سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جن سے ان کی نگاہ بصیرت، فکری صلابت اور متن سے سروکار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

''......سرسید سے بڑا ریفارمر اور تحریکی صلاحیت کا مالک ملک میں ہنوز پیدا نہیں ہوا۔ وہ جدید

تعلیم کے معماروں میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔علی گڑھ تحریک محض دریا کا بہاؤ نہیں تھا۔دور رس نتائج کا حامل اجتہادی کارنامہ تھا جس نے آج مسلمانوں کو، برادران وطن کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا اہل بنادیا۔" (علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں)

"......نئی نظمیں اپنے معاشرے سے نہ کچھ لیتی ہیں اور نہ کچھ دیتی ہیں۔ جو یہاں جی رہے ہوتے ہیں اسی کا بیان ہے۔اور اسی کے آہنگ سے جو زیر و بم پیدا ہوتے ہیں وہی موسیقیت ،وہی اس کا جمال اور حسن ہے اور پیرایۂ اظہار اور مواد ایک دوسرے میں اس قدر پیوست ہوتے ہیں کہ ان کو الگ الگ کر کے نئی نظم پر تجزیہ کرنا لا حاصل ہوگا۔"

(اردو نظموں کا پس منظر اور پیش منظر:۱۹۸۵ء کے بعد)

"......لیکن آزاد غزلیں صرف ذوق کی تسکین اور ارتقائی ضرورت کے پیش نظر وجود میں نہیں آئیں بلکہ ادب میں بھی ان دنوں نئے تجربے، نئے شعوری رجحانات اور نئی سمتیں رونما ہو رہی تھیں اور ادب پرانی قدروں کو چھوڑ کر نئی قدروں میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ظاہر ہے کہ ادب کا یہ رویہ اپنے اندر مثبت پہلو رکھتا ہے۔چنانچہ آزاد غزل نے اسی حقیقت کے پیش نظر اپنا مقام باضابطہ بنالیا ہے۔"

(جدید شاعری میں آزاد غزل کا ہیئتی تجربہ)

"......سردار جعفری کی غزل کا مطالعہ ہمیں شاعری کی اس فضا کی طرف لے جاتا ہے جہاں دن کے شور شرابے بھی ہیں، رات کا سکوت بھی، زندگی کی بلند آہنگی بھی ہے اور محبت کی سرگوشی بھی، فکری ترقی پسندی بھی ہے اور نئی روایت کی چاردیواری بھی جو ترقی پسند شاعروں کی بھیڑ میں بھی انہیں منفرد اور معتبر بناتی ہے۔سردار جعفری کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فکر و فن کی گہرائی و گیرائی سے پوری نسل کو متاثر کیا۔" (ترقی پسند غزل اور علی سردار جعفری)

ڈاکٹر امام اعظم کی تنقید فن کار اور فن پارے کی قدر و قیمت کو واضح کرنے میں کامیاب ہے۔تنقید اگر کسی فن پارے کے باطن سے مکالمہ کر کے قاری کو اس کے اختصاص سے روبرو ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے تو اس طور پر ڈاکٹر موصوف کے مضامین کے محتویات ادب کی اسی روایت کا توانا حصہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور وہ پوری ایمانداری سے تفہیم ادب کی جستجو میں منہمک ہیں۔ان کی دوسری تنقیدی کتابوں میں شامل مضامین وقیع ہیں اور قاری کو فن پارے کے مطالعہ کے لئے ابھارتے ہیں۔ایسا ماننا چاہئے کہ ڈاکٹر امام اعظم اپنی تحریر میں سادگی، روانی اور برجستگی کے سبب اور ایک نئے معنی و مطالب کی گرہ کشائی کا مژدہ سنانے میں کامیاب و کامران ہیں۔ایک اچھے نثر نگار کے لئے یہ منزل مسرت و شادمانی سے کم نہیں۔

....

● محلہ فیض اللہ خاں، حامد کالونی، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۴ (بہار)

موبائل: 9430898766 ای میل: mojeerazad@rediffmail.com

خواجہ احمد حسین

احسان دربھنگوی کی شاعری میں خوداعتمادی

آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی کلکتہ کو ادبی حیثیت حاصل رہا۔ ادبا و شعراء بنگال کے کونے کونے میں گیسوئے ادب سنوارنے میں اپنا خونِ جگر جلاتے رہے۔ ان میں معدودے چند کو ہی شہرت نصیب ہوئی۔ باقی گمنامی کی زندگی گذار کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حیات میں ان لوگوں کا نہ کوئی تخلیقی کلام شائع ہوا نہ ہی بعد از مرگ ان پر کوئی ادبی محفل منعقد ہوئی۔ وجہ چاہے جو بھی رہی ہو مگر ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے پیچھے اپنا کوئی ایسا وارث یا جانشین نہیں چھوڑا جو ان کو گمنامی کے غار سے باہر نکالنے کی صلاحیت رکھتا۔ ہاں چند لوگ اپنے نیک شاگرد ضرور چھوڑ گئے تو ان پر کچھ کام ہوا۔ ویسے اب شاگردوں کو اتنی فرصت کہاں کہ اپنے مرحومین استاد یا دوست احباب پر قلم اٹھائے، سوائے اپنی ذاتی تشہیر کے۔ ادب کے ان ہی چند بدنصیبوں میں ایک بڑا اور باوقار نام محترم احسان دربھنگوی کا بھی تھا۔ ان کے وصال کے بعد کسی نے بھی ان پر کوئی کام نہیں کیا۔ اوروں کی طرح انہیں بھی نظرانداز کیا گیا۔ انتقال کے برسوں بعد ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''کلامِ احسان'' تب منظرِ عام پر آیا جب ان کے لائق و فائق صاحبزادے جب ہمایوں جمیل سے ڈاکٹر ہمایوں جمیل بنے۔ بڑے ہی کرب انگیز لہجے میں وہ ''کلام احسان'' میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''اب جب اہل کلکتہ نے بھی حسب عادت انہیں (احسان دربھنگوی) کو بھی فراموش کر دیا ہے، میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''کلام احسان'' کے نام سے قارئین کی نذر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔''

ڈاکٹر ہمایوں جمیل ایک نہایت ہی نیک صفت اور اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ فی الحال کلکتہ کے تاریخی مولانا آزاد کالج کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں۔ انہوں نے جب اپنے والد بزرگوار کی کتاب ''کلامِ احسان دربھنگوی'' عنایت کی تو ورق گردانی کرتے کرتے اس شعر پہ میری نگاہ پڑی جسے میں زمانہ طالب علمی سے ہی سنتا آیا تھا:

وقتِ رخصت نہ مجھے دیدۂ تر سے دیکھو
اک مجاہد کو مجاہد کی نظر سے دیکھو

احسان دربھنگوی اپنے دور کے نہ صرف ہر دلعزیز اور مقبول شاعر تھے بلکہ استاد شاعر علامہ جمیل مظہری کے چند اہم شاگردوں میں سے ایک تھے۔ ان کی علمی و ادبی بصیرت کے بنا پر ان کے ہم عصروں نے بھی انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس دور کے بزرگ شعراء بھی ان کی شعری صلاحیتوں کے معترف تھے۔ ان کے استاد علامہ جمیل مظہری ان کی شعر گوئی کو اس قدر پسند کرتے تھے کہ ایک محفل میں ادباء و شعراء کی موجودگی میں یہاں تک کہہ ڈالا:

بجز ثقالت معنی غزل میں رس ہو نہ رنگ
خدا نہ کردہ کہ احسان مظہری ہو جائے

اس سے بڑھ کر ایک شاگرد کے لئے اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے کہ جس کی زندگی میں ہی استاد اس کی علمی و ادبی

صلاحیت کا معتقد ہو جائے۔ سالک لکھنوی، ابراہیم ہوش، مظہر امام اور علامہ شبلی نہ صرف ان کے ہمعصر تھے بلکہ ان کی دوستی پر بھی احسان صاحب کو بڑا ناز تھا۔ اب اس زمانے میں ویسے مخلص دوست کہاں جو اپنے ادیب و شاعر دوست کی صلاحیت کا برملا اظہار کریں۔ موجودہ دور میں تو ہمیں ایک دوسرے کی غیبت کرنے اور نیچا دکھانے سے فرصت ہی نہیں، اعتراف کرنا تو دور کی بات ہے۔ اب تو حال یہ ہے کہ نوجوان ادبا و شعراء اپنے بزرگوں کو بھی نشانہ بنانے لگے ہیں جس کا ایک ثبوت ہمیں مسلم انسٹی ٹیوٹ کے ایک سیمینار میں دیکھنے کو ملا تھا کہ ایک نوجوان ناول نگار نے جب شمس الرحمٰن فاروقی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ خدا کرے کہ ہم ابھی سے بھی اپنے پرکھوں کے نقش قدم پر چل کر ایک اچھا اور صحت مند ادبی ماحول پیدا کریں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو خالص ادبی قرطاس پر ناموں کو محفوظ کرانا غالباً ناممکن ہوگا۔

اپنی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ان کا دربھنگہ جانا ہوا۔ ان دنوں مظہر امام بھی دربھنگہ میں تھے۔ سی ایم سائنس کالج میں شعبۂ نباتات کے استاد ڈاکٹر شمیم باروی نے اپنے یہاں ایک شعری نشست آراستہ کی تھی جس میں پروفیسر نہال اختر (پرنسپل ملت کالج، دربھنگہ)، مظہر امام، اویس احمد دوراں، محمد سالم، ایم اے ضیاء، منصور عمر اور امام اعظم وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ امام اعظم نے احسان دربھنگوی کی نذر ایک قطعہ کیا تھا جو ان کے دوسرے شعری مجموعے ''نیلم کی آواز'' (2014ء) میں درج ہے، ملاحظہ فرمائیں:

آپ نے شہرِ کلکتہ میں نام کیا   شعر و ادب پر آپ کا ہے بے حد احسان
عمر گزاری شعر و سخن کی خدمت میں   آپ کی اپنی طرزِ ادا، اپنی اک پہچان

مظہر امام احسان دربھنگوی کے پہلے شعری مجموعہ ''شہر آرزو'' کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''احسان دربھنگوی ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنی بے نیازی کو لذت اندوزی کا ذریعہ بنالیا ہے۔ انھیں کبھی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نہیں رہی۔ شاعری ان کے لئے اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرنے اور روحانی مسرت حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔...... احسان دربھنگوی ایک نہایت خوش گو شاعر ہیں۔ اچھی شاعری عموماً نقادوں کی نگاہ اور سر سے اونچی جاتی ہے، اس لئے اگر احسان دربھنگوی کو وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ مستحق ہیں تو ہمیں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے۔......''

(کتاب ''نگاہِ طائرانہ'' 2007ء ص:19)

احسان دربھنگوی نے اپنے بزرگوں اور ہم عصر ادبا و شعراء کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بعد از مرگ دنیا انہیں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ پوری ادبی دنیا میں ان کے شعری تخلیقات کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ آپ بھی جب اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو انگنت موضوعات پر ایسی نظمیں اور غزلیں ملیں گی جس کو پڑھنے کے بعد تادیر اس کا اثر ذہنوں میں قائم رہے گا۔ یہ بند دیکھیں:

وہ آج بھی تمہارے نشان سے ڈرتے ہیں   تمہاری تیغ، تمہاری سناں سے ڈرتے ہیں
تمہاری شدت تاب و تواں سے ڈرتے ہیں   مجاہدوں کی صدائے اذاں سے ڈرتے ہیں

ندی کا جوش ہو طوفان کا خروش ہو تم
وہ جانتے ہیں کہ جاں باز سرفروش ہو تم

بقول وہاب اشرفی ان کی نظموں میں ان کی شاعری کا آہنگ بلند ہوتا ہے۔ احسان دربھنگوی یقیناً بلند خیالات کے حامل انسان تھے۔ ان کے خیالات میں وہ سارے موضوعات عیاں طور پر دکھائی دیتے ہیں جو ایک بڑے شاعر کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے یہاں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ ان کے زمانے میں بیشتر شعراء اور ادباء ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے لیکن وہ متاثر ہونا تو دور کی بات اس تحریک کے قریب سے بھی ہو کر نہیں گذرے۔ انہوں نے اپنی راہ خود نکالی جس میں ان کا اپنا رنگ صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے:

معذرت تھی وہ فقط اپنی غلط بینی کی　　　جس پہ نازاں تھے بہت ہم وہ بصیرت کیا تھی

دربھنگہ علم و ادب کا ہر دور میں مرکز رہا ہے۔ اسی مٹی کا یہ نایاب اور بلند پایہ شاعر اپنے بلند خیالات کے پیش نظر اہلِ سخن کو دعوت فکر دے ڈالا کہ:

میں اک فقیر ہوں لیکن مزاج کا ہے یہ حال　　　ہوا بھی تیز چلے تو جلال آجائے
اگر رند ہوں لیکن ولی ہوں اپنی جگہ　　　جسے یقین نہ ہو آئے اور آزما جائے

احسان صاحب کو گذرے ایک زمانہ ہو گیا مگر اپنے اشعار کی بدولت وہ آج بھی زندہ ہیں۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کو اُن ادباء و شعراء کو بھی یاد کرنا چاہئے جن کو وہ اب تک نظر انداز کرتے چلے آرہے ہیں۔ وحشت کلکتوی تو ایک تلخ شعر کہہ کر کلکتہ چھوڑ کر بہت دُور چلے گئے اور پھر لوٹ کر واپس نہیں آئے۔ ان کی شکایت ادب کے موجودہ پس منظر میں درست ہے کہ نہیں اس کا فیصلہ اب ہمیں کرنا ہے کہ:

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی　　　تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

احسان دربھنگوی کے اس شعر پہ اپنی گفتگو تمام کر رہا ہوں کہ:

یہ دنیا انجمن ہے درمیانی فکر والوں کی　　　بہت کم ہوتے ہیں عقل و شعور و آگہی والے

....

● کانکی نارہ، ضلع: نارتھ چوبیس پرگنہ　موبائل: 9831851566

ڈاکٹر حسن انصاری

اردو افسانے کی روایت: حجاب امتیاز علی تک

حجاب امتیاز علی کا ادبی سفر اس وقت شروع ہوا جب اردو فسانے کی عمر صرف بیس سال تھی۔ اس وقت اردو افسانہ نگاری کے دو رجحانات ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک طرف پریم چند اور ان کے ہم عصر افسانہ نگار حقیقت پسند افسانے لکھ رہے تھے تو دوسری طرف کچھ ایسے افسانہ نگار تھے جو ادب لطیف کے قائل تھے۔ ان کے افسانوں میں غزل جیسی کھنک اور دلکشی و رعنائی تھی۔ ایسے افسانہ نگاروں میں سب سے پہلا نام سجاد حیدر یلدرم کا ہے۔

منشی پریم چند نے افسانہ نگاری کی ایک ایسی راہ پیدا کی جس پر بہت سے افسانہ نگار چلنے لگے۔ ان کا پہلا افسانہ ''انمول رتن'' ہے جو ۱۹۰۷ میں منظر عام پر آیا تھا۔ منشی پریم چند کو اصلاحی میدان کا علمبردار کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی زندگی اور اس دور کے مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ معاشی بدحالی، جہالت، اندھی عقیدت، چھوا چھوت، توہم پرستی، فرقہ پرستی، غلط رسم و رواج اور بچپن کی شادی جیسے مسائل کو انہوں نے متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے۔

ہریجنوں کی بدحالی، عورتوں کی بدتر سماجی حیثیت اور شودروں کی قابل رحم حالت کو انہوں نے اپنے افسانوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی بدتر صورت حال آج بھی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔

ہریجن اور شودروں کی آبادی عام لوگوں کی آبادی سے دور ہوتی تھی۔ انسانی حقوق سے محروم یہ لوگ جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارتے تھے۔ وہ نہ مندروں میں جاسکتے تھے اور نہ ہی مذہبی کتابوں کو چھو سکتے تھے۔ ان کی نہ کوئی اپنی زمین ہوتی تھی اور نہ کوئی اپنا مکان۔

شودروں اور ہریجنوں کی طرح عورتوں کی صورت حال بھی بد سے بدتر تھی۔ بیواؤں کو اچھے لباس، چوڑیوں، زیورات، خوشبو اور دوسری آرائشوں سے محروم کیا جاتا تھا۔ ان کے بال کٹوائے جاتے تھے اور انہیں اتنا منحوس سمجھا جاتا تھا کہ خوشی کے کسی موقع پر ان کا جانا بدشگونی سمجھا جاتا تھا۔ بچپن کی شادی اور جنسی مسائل عورتوں کے لیے ایک ایسی لعنت تھی جس سے پیچھا چھڑانا آسان نہ تھا۔

مختصر یہ کہ پریم چند نے سماجی مسائل اور گھریلو مسائل پر پہلی بار کھل کر لکھا۔ اونچی ذات کے لوگوں نے نچلی ذات والوں کا جس طرح استحصال کر رکھا تھا اس کے خلاف انہوں نے بہت سے افسانے لکھے۔ اونچی ذات والوں کے خلاف آواز اٹھائی اور افسانہ نگاری کے میدان میں ایک ایسی راہ نکالی جس پر بعد کے افسانہ نگاروں نے اس وقت کے سماجی اور گھریلو مسائل کو اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

پریم چند کی راہ پر چلنے والوں میں علی عباس حسینی، اعظم کریوی، پنڈت بدری ناتھ سدرشن، اوپندر ناتھ اشک اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ تھے۔ ان لوگوں نے شہر اور دیہات دونوں جگہ کے رہنے والوں کی زندگی میں درپیش مسائل کو پیش کرنے کی کوششیں کیں۔ عورتوں کی بے بسی۔ سماجی نابرابری اور جاگیردارانہ نظام کی کمزور طبقوں کے ساتھ

جبر و زیادتی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

پریم چند اور ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے افسانہ نگار بھی تھے جن کے افسانوں کی فضا میں شاعری کا لطف تھا، غزل کی خوشبو تھی۔ رومان بھرے انداز میں لکھے گئے اس طرح کے افسانوں میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے جذبات کی عکاسی ان کے گھریلو حالات، ان کے خاندان کا جھوٹا وقار اور ان کی بے بسی کی ترجمانی ایسے افسانوں میں کی گئی ہے۔ اس طرح کے افسانوں کی اردو ادب میں اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ اس طرح کے افسانہ نگاروں میں پہلا نام سجاد حیدر یلدرم کا ہے۔ ان کے افسانے اسلوب کے لحاظ سے بے حد اہم ہیں۔

''اس کا دل چاہتا ہے کہ ایک ذات، ایک وجود آئے جو اس پر قادر ہو، جو اس پر حاوی ہو، جو اسے دکھ دے، اس کے دل میں درد پیدا کرے، احساس پیدا کرے، اسے مسل ڈالے۔''

(افسانہ ''خارستان و گلستان)

یلدرم کے افسانوں میں ازدواجی زندگی کے مسائل بھی ہیں اور نوخیز لڑکیوں کے ذہن میں رفیق حیات کے انتخاب کے سلسلے میں ابھرتے ہوئے چھلاوے بھی۔ مختصر یہ کہ یلدرم نے عورت اور ان کے مسائل کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ ''صحبت ناجنس'' اور ''نکاح ثانی'' وغیرہ ان کے بہت ہی اچھے افسانے ہیں۔

سجاد حیدر کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں نیاز فتح پوری، ایم اسلم، مرزا ادیب حکیم احمد شجاع کے ساتھ ساتھ حجاب امتیاز علی بھی ہیں۔

حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں حسین اسلوب اور رنگین فضا ہر جگہ قائم رہتی ہے۔ ان کے افسانوں میں گھروں میں بند رہنے والی عورتوں اور لڑکیوں کے گھٹے گھٹے ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔

اس طرح افسانہ نگاری کے پہلے دور میں دو خاص رجحانات ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

۱۹۳۵ء کے بعد اردو افانوں میں ترقی پسندی کا دور شروع ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے سماج کی غلط رسومات اور توہمات کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس تحریک کے زیر اثر اردو افسانہ ایک بے حد کارآمد صنف کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں کچھ لوگوں کو سیاسی مسائل سے، کچھ کو سماجی زندگی میں پھیلی ہوئی بے چینی سے اور کچھ لوگوں کو بڑھتے ہوئے اشتراکی نظام سے دلچسپی تھی۔ اس طرح الگ الگ افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق افسانے لکھنے شروع کر دئے۔ پہلے دور کے حقیقت پسند اور رومانی دونوں رجحانات کمزور پڑنے لگے۔ پہلے دور کی رومانی دنیا کو چھوڑ کر چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی دنیا کو اہمیت دی جانے لگی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق:

''افسانہ نگاروں کا اصل مقصد چونکہ اس دنیا کو بنی نوع انسان کے لیے زیادہ سے زیادہ حیات افروز اور خوش آئند بنانا تھا اس لیے اشتراکیت، جمہوریت، آزادی، غلامی، آمریت، مذہبی اجارہ داری، طبقاتی تنگ نظری، نسلی برتری، معاشی جبریت، نفسیاتی پیچیدگیاں، جنسی الجھنیں، معاشرتی ناہمواریاں بھی زیر بحث آئیں۔''

(''اردو افسانہ اور افسانہ نگار'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی ۱۹۸۲ء، ص: ۱۱۷)

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی اور انور عظیم وغیرہ بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے ظلم وستم سے نفرت کا اظہار کیا۔ بھوک و افلاس اور مزدوروں کی بے بسی کو قاری کے سامنے متاثر کن انداز سے پیش کیا ہے۔

آزادی سے پہلے اردو افسانہ نگاری کے پہلے دور کے ساتھ ساتھ کئی لوگوں نے دوسری زبان کے افسانوں کے ترجمے اردو میں کئے۔ ترجمہ کے ذریعہ دنیائے ادب میں ایک انقلابی تبدیلی آئی۔ اس طرح کے افسانوں میں بھی گوناگوں مسائل کی عکاسی ہوئی ہے۔ افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں کچھ مزاحیہ افسانے بھی لکھے گئے۔ اس طرح کے افسانوں کی اپنی جگہ ایک الگ اہمیت ہے۔ اس طرح کے افسانے خالص اصلاحی مقصد سے لکھے گئے ہیں۔ اس دور میں کچھ نفسیاتی افسانے بھی لکھے گئے۔ اس طرح کے افسانوں کی بھی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی دور سے ترقی پسند دور تک کئی رجحانات اور نظریئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ہر رجحان کے افسانہ نگاروں نے کسی نہ کسی صورت میں سماج کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کے افسانوں کی نہ صرف تاریخی اہمیت ہے بلکہ اصلاحی نکتۂ نظر سے بھی یہ بہت اہم ہے۔

حجاب امتیاز علی کی ادبی زندگی کی باضابطہ شروعات تک اردو افسانہ نگاری میں حقیقت پسند اور رومان پسند رجحانات کے علاوہ ترجمہ شدہ افسانے، مزاحیہ افسانے اور نفسیاتی افسانے بھی تحریر کئے جا رہے تھے لیکن حجاب امتیاز علی نے رومانی افسانوں کو ہی ترجیح دی۔ وہ اپنے دور تک کے افسانہ نگاروں سے کچھ نہ کچھ متاثر ضرور ہوئیں۔ انہوں نے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی کرنے کی بھی کوشش کی لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں کیونکہ انہیں عوامی زندگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ ان کی گھریلو زندگی کے مسائل سے ناآشنا تھیں۔ ان کے افسانوں میں محبت ونفرت کی کسک اور جدائی وناکامی کے درد وغم کی جھلک نمایاں ہے۔ وہ واقعات میں خوشبو اور رنگینی بھرنے کیلئے حسین الفاظ کا سہارا لیتی ہیں۔ انہوں نے اکہرے اور مربوط پلاٹ تیار کر کے ماہرانہ انداز میں حیرت واستعجاب میں ڈوبے ہوئے واقعات کو رومانی لباس عطا کیا ہے۔

حجاب امتیاز علی نے ناول، مضامین، ڈرامے اور خطوط وغیرہ کے علاوہ شاعری بھی کی ہے لیکن ان کی شہرت و مقبولیت کا باعث ان کی افسانہ نگاری ہے۔ ان کے افسانوں کے دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ادبی سرمایہ کسی بھی طرح نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے لیکن ان کے ادبی سرمائے کو اردو ادب میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کی وہ حقدار تھیں۔

''مہمان داری''، ''ماہرین فن''، ''صنوبر کے سائے''، ''نادیدہ عاشق'' اور ''میری ناتمام محبت'' حجاب امتیاز علی کے مقبول ترین افسانے ہیں۔

....

● شعبۂ اردو، ناگیندر جھا مہیلا کالج، دربھنگہ (بہار)

ڈاکٹر مسیح الدین خاں

فیض احمد فیض: ایک عہد ساز شاعر

لب بند ہیں ساقی، مری آنکھوں کو پلا دے　　وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

مندرجہ بالا شعر سے فیض احمد فیض کی ادبی شہرت کا آغاز ہوتا ہے، وہ عہد ساز شخصیت، قدیم شاعر اور معزز صحافی ہونے کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے بھی سربراہ تھے۔ ایک جگہ پر وفیسر قمر رئیس رقم طراز ہیں:

''فیض کی شاعری قوموں اور زبانوں کی سرحدوں کو پار کر گئی، وہ ساری دنیا کی عوامی تحریکوں کے شاعر تھے۔''

ان کی شاعری کی شروعات روایتی انداز سے ہوئی، اولین تخلیقات میں حسن و عشق کے موضوعات اور اپنے واردات قلبی روایتی انداز میں پیش کئے ہیں، ان کے یہاں بھی وہی سرشاری و سرمستی، حسن و محبت کے ترانے ملتے ہیں جو عشقیہ شاعری میں ملتی ہے۔

شروع کے دور میں فیض نے عشقیہ شاعری کی لیکن رفتہ رفتہ وہ انقلابی شاعر ہوتے گئے، ان کا نام آتے ہی ہمارے ذہن و دماغ میں ذہنوں کو جھنجھوڑنے والے شاعر کا تصور آتا ہے، ان کی شاعری دلوں کو چھو لینے والی شاعری ہے، سماج میں پائی جانے والی نا آسودگی، مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس نے فیض کے ذہن کو بہت زیادہ متاثر کیا، یہاں تک کہ ان کے لب و لہجے میں مایوسی اور اداسی آ گئی۔

فیض نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہی انھوں نے رومان عشق و محبت کی دنیا سے نکل کر حقیقت نگاری کی دنیا میں سانسیں لینا شروع کیا، اور ان کا انداز بیان بالکل بدل گیا، ملاحظہ کیجیے:

دنیا نے تیری یاد سے بے گانہ کر دیا　　تجھ سے بھی دلفریب ہیں، غم روزگار کے

فیض کی ابتدائی شاعری میں رومانیت کی جھلک نظر آتی ہے، ان کی شاعری شروع میں رومانی عناصر اور عشقیہ عنوانات ہی تک محدود رہی لیکن آگے چل کر ان میں تنوع اور وسعت پیدا ہوئی، ان کی عشقیہ شاعری میں جذبات موجود ہیں، شروع کی شاعری میں جہاں ایک طرف رومانی موضوعات دیکھتے ہیں وہیں دوسری جانب انداز قدیم اور فن و روایت کی پابندی نظر آتی ہے، ان کی شاعری میں انقلابی اور سیاسی عناصر کا امتزاج سب سے زیادہ اہم ہے، اگر ان کی شاعری میں سے انقلابی اور سیاسی آہنگ لے لیا جائے تو ان کی شاعری بے رنگ ہو جائے گی، ان کی شاعری نسل نو کے لئے پیش پیش رہی ہے، اور اس میں ایک طرح کا سحر موجود ہے۔

فیض کی شاعری پر شعراء متقدمین کا اثر ہے، یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ وہ ایک عہد ساز شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں بڑے شعراء کا عکس نظر آتا ہے، لیکن رنگ بالکل منفرد ہے، غالب، سودا، اقبال، میر، اختر شیرانی کا اثر فیض کے کلام پر ہے، ان کے کلام میں متقدمین کا اثر ضرور کارفرما ہے، لیکن وہ اپنے الگ لب و لہجے میں ہے، وہ الفاظ و معانی کی باریکی کو خوب سمجھتے ہیں، اس میں توازن اور ٹھہراؤ ہے، ردیف اور قافیہ کا خیال ہے۔

فیض کی ابتدائی شاعری پر اپنے ماقبل شعراء حفیظ جالندھری، جوش اور اختر شیرانی کے رومانی انداز کا بھی اثر ہے لیکن کچھ ہی وقت میں فیض نے رومانی فضا سے الگ منفرد مقام بنایا اور انھوں نے انگریزی اور روسی شعراء سے بھی اثر قبول کیا ہے، انگریزی شعراء جن کا اثر فیض کی شاعری پر ہے، وہ اس طرح سے ہیں، شیلے، بائرن، ورڈز ورتھ، ایلیٹ، رابرٹ

فراسٹ، ایکلس، جان کیٹس، اسوسن برن، تھامس ہارڈی وغیرہ اور شیلےاورکیٹس کے اثرات بالکل نمایاں ہیں۔
فیض نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے، ان کے عہد میں ہندوستان دو بڑے طبقوں میں بٹ چکا تھا، ایک استحصالی طبقہ (ظالموں کا) اور دوسرا استحصال کے شکار غریب، کسانوں اور مزدوروں کا طبقہ۔
فیض کے یہاں عام ترقی پسند شعراء کے برخلاف نعرہ بازی نہیں ہے،اس لئے وہ کہیں بھی غیر متوازن نہیں ہوئے، ان کے یہاں روایت کا احترام ہے،اور روایت پسند شاعر ہیں، مگران پر روایت پسندی کا الزام نہیں لگا سکتے، وہ زندہ جاوید حقیقتوں کو سراہتے ہیں، ان کے یہاں نئے حالات، نئی زندگی اور بدلتے ہوئے سماجی ماحول کا عکس ہے، انھوں نے اپنے زمانے کی ہر سیاسی وعوامی کشمکش سے اثر قبول کیا، اوران کی پوری شاعری ایک اخلاقی قدر بن کر، اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے ہے، جذبہ خلوص اور والہانہ پن ہے، وہ اپنے کلام کے ذریعے انسانوں کوان کے حقوق پانے کے لئے جذبہ وجوش دلاتے ہیں اورعوام سے اپنی آواز بلند کرنے کے لئے کہتے ہیں۔

اے خاک نشینوں اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے

ان کے حیات میں بہت سے نشیب وفراز رہے،لیکن فیض کو مستقل سماجی اور سیاسی تبدیلیوں سے گزرنا پڑا، وہ ایک سچے فنکار تھے،عوام کو بیدار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی ہے، اس پر فرض ہے گردوپیش کے مضطرب قطروں میں دجلہ کا مشاہدہ، ان کی بینائی پر ہے، اسے دوسرے کو دکھانا، اس کی فنی دسترس پر اس کا بہاؤ میں دخل انداز ہونا، اس کے شوق کی صلابت اورلہو کی حرارت پر ہے۔" (فیض احمد فیض، دست صبا ۱۹۳)

فیض ایک بڑے عہد کے بلند شاعر ہیں، انھوں نے اپنے عہد اور ماحول کو اختیار کیا، اور شاعری شروع کی، ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ماحول سے کس طرح متاثر ہوتے؟ اور حالات سے سمجھوتہ بھی کیا اور اختلاف بھی، اور ماحول کو قبول بھی کیا اور رد بھی، ان کے زمانے میں سماجی اور معاشرتی، تہذیبی قدریں بدل رہی تھیں، پرانے خیالات کی جگہ نئی تہذیبیں نئی قدریں لے رہی تھیں، لہٰذا فیض نے اپنی شاعری میں عصری حالات کا اثر لیا اور قارئین کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔
فیض نے اپنی شاعری کو نئے شعور سے بخشا ہے، ان کے لہجے میں غنائیت ہے جو ان کی نظموں اور غزلوں میں یکساں طور پر ظاہر ہوتی ہے، انھوں نے اپنے عہد کے سماج کی پوری عکاسی کی ہے، اوران کے کلام پر سوشلزم کا گہرا اثر پڑا ہے، جس کو فیض نے محسوس کرتے ہوئے سماج کے ہر طبقے کو جگہ دے کر ان کی بات رکھی۔ انھوں نے ہر موقع پر مختلف موضوعات پر لکھا ہے، اور خوب لکھا ہے، ان کا قلم کبھی رکا نہیں، وہ لکھتے ہیں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے؟ — کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہے انگلیاں ہم نے
نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں — چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے — نظر چُرا کے چلے جسم وجاں بچاکے چلے

....

● 504/122، ٹیگور مارگ، شباب مارکیٹ، لکھنؤ-226020 (موبائل:9307690748)

ترنم پروین

خودنوشت سوانح نگاری کا فن

(بہار کے خصوصی حوالے سے)

سوانحی ادب میں خودنوشت ایک معروف اور معتبر صنف ہے۔ یہ کسی شخص کی گذری ہوئی زندگی کی ایک ایسی داستان ہوتی ہے جس میں زندگی کے تجربات اور مشاہدات بیان کئے جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی اس میں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا جاتا ہے اور کہیں کہیں خودستائش کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ محمد طفیل اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے جو خود اس نے بے کم وکاست اور راست راست قلم بند کی ہو جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب وفراز معلوم ہوتی ہو اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم سب اس کی خارجی زندگی کے سوا اس کی داخلی کیفیات کے حجرے میں بھی دیکھ کر جھانک سکیں۔''

(نقوش آپ بیتی نمبر جلد اول، محمد طفیل۔ ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۴، ص: تصریحات)

خودنوشت سوانح نگاری میں مصنف اپنے قلم سے خود اپنی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کہانی سناتا ہے اور دوسروں کو اپنے تجربوں سے آگاہ کرتا ہے۔ ایک اچھے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات کو ہو بہو قلم بند کرے۔ مصنف کی دلچسپی شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنی تصویر کشی ہونا ضروری ہے۔ ''اپنی تلاش میں'' کے اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''سکستھ ایئر میں تھا۔ کوئی نومبر یا دسمبر کا مہینہ ہوگا کہ اسٹیٹ اسکالرشپ کا اشتہار نکلا۔ کسی خاص سبجیکٹ کے لئے اسکالرشپ مخصوص نہ تھی۔ وہ اسکالرشپ تھی اور بہت جنیکس تھے۔ ابا جان نے کہا تم بھی درخواست دے دو میں یہ سوچ کر کہ اگر اسکالرشپ ملی تو پھر انگلینڈ جانا ہوگا گھبرا گیا۔ اس وقت تک پٹنے سے باہر نہیں گیا تھا۔ ابا جان کا حکم تھا......''

(اپنی تلاش میں جلد دوم، کلیم الدین احمد، بہار اردو اکاڈمی پٹنہ، ۱۹۸۷، ص: ۱۱۲)

سوانح نگاری اپنی شخصیات پر روشنی ڈالنے اور اپنی شخصیت کو ابھارنے کے لئے اپنے دور کی کسی دوسری شخصیات کا ذکر ضمنی طور پر کرتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں لکھتے وقت اسے چھوٹا یا بڑا دکھانے کی غرض سے درمیان مصنف اپنا ذکر خود بھی کرتا جاتا ہے۔ نفسیاتی طور پر وہ اپنے آپ کو بڑا اور اچھا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی کے مطابق:

''وہ اپنی تصویر خود اپنے ہاتھوں تیار کرتا ہے۔ زندگی کے کینوس پر واقعات کے امٹ چھاپوں سے ایک پیکر تراشا ہے جس میں اس کی اپنی شخصیت کا جلال وجمال نمایاں ہوتا ہے۔ اپنے خوابوں، خیالوں اور افکار واقدار کا رنگ وآہنگ ہوتا ہے ہر چند کہ اس میں خارجی دنیا کا بیان ہوتا ہے، دوسرے اشخاص

کا ذکر ہوتا ہے۔ سیاسی، سماجی حالات کی منظر کشی بھی ہوتی ہے لیکن یہ ساری چیزیں مصنف اپنی ذات کے آئینے میں دیکھتا اور دکھاتا ہے۔''

(اردو خودنوشت، فن اور تجزیہ: ڈاکٹر وہاج الدین علوی، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص: ۳۵)

خودنوشت سوانح نگاری اردو کی ایک ایسی صنف ہے۔ جس کا مصنف اپنی پوری زندگی کے نشیب وفراز کو اپنے قلم کے ذریعہ یادوں کا ایسا نگار خانہ بنالیتا ہے جسے وہ خود بھی دیکھتا ہے اور دوسرے لوگ بھی دیکھتے ہیں۔ خودنوشت کی ابتدا بھی ذات کے اظہار سے حالات کی تفہیم کی کوشش کے طور پر ہوتی ہے۔ یہ صرف ایک فرد کی داستان حیات نہیں بلکہ ایک تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

خودنوشت رحم اور خوف دونوں کا جذبہ پیدا کرتی ہے کیونکہ دوسروں کی سرگزشت قاری کے لئے سبق اور نصیحت کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔

''وہ ایک وکیل کے پاس پہنچتا ہے تو وکیل اس سے سوال کرتا ہے کے آخر اس نے کون سا جرم کیا ہے۔ جواباً کہتا ہے کہ میں تو اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ اپنے فرائض انجام دیتا ہوں اور گھر واپس چلا آتا ہوں۔ میرا کسی جرم سے کوئی واسطہ نہیں۔ میری روش سب سے الگ تھلگ رہنے کی ہے۔ وکیل جواب دیتا ہے کہ اگر بے گناہ ہے تو پھر وہ اس کا دفاع نہیں کرسکتا۔ اگر اس نے کوئی جرم کیا ہوتا تو اس کا کیس لڑنے کے قابل ہوتا۔'' (قصہ بے سمت زندگی کا ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص: ۳۴۶)

خودنوشت سوانح نگاری سے سماج کے مطالعہ کا ایک خوبصورت اظہار ہوتا ہے لکھنے والے کا تعلق جس شعبے سے ہوتا ہے اس کے ذہنی ارتقا کی عکاسی بھی خودنوشت سوانح میں دیکھی جا سکتی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنی خودنوشت ''قصہ بے سمت زندگی کا'' میں لکچرر شپ سے پروفیسر بننے اور پھر پروفیسر سے بہار کالج سروس کمیشن کے چیئرمین بننے تک کے جو واقعات اور حالات پیش کئے ہیں اس سے ان کے ذہنی ارتقا کی عکاسی ہوتی ہے۔

''بہر طور میں کمیشن کا چیرمین ہوگیا۔ ٹھیک اس وقت سارے Promoted پروفیسر Demote کردیے گئے تھے۔ حکومت کے اس رویہ کو پروفیسر نے ہائی کورٹ کے بعد سپریم کورٹ میں چیلنج کر رکھا تھا۔ رنجن جی نہیں چاہتے تھے کہ پرموشن اسکیم کے تحت لوگ پروفیسر ہوں۔ مجھے چیرمین کی حیثیت سے سپریم کورٹ میں بھاگ دوڑ کرنی تھی، ابتدائی وقت ایسے ہی مرحلوں میں گزرا، سپریم کورٹ نے ٹیچروں کے خلاف Verdict دیا عجیب منظر تھا......''

(قصہ بے سمت زندگی کا ڈاکٹر وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۸، ص: ۲۰۳)

خودنوشت کے ذریعہ کسی مخصوص شخصیت کی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ اس دور کے سیاسی، سماجی، تاریخی، تمدنی اور ثقافتی پہلو بھی اس طرح ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خودنوشت کے ذریعہ صرف ایک فرد کی زندگی کے گوشے ہی نہیں بلکہ اس دور کے متعلق بہت سی معلومات بھی حاصل ہوجاتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال حسین کی اپنی خودنوشت ''داستاں میری'' کے اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''اردو اور فارسی کے ہمارے تین پروفیسر رائے صاحب اور بہاری سنگھ، مولانا عبدالماجد اور حافظ شمس الدین احمد تھے۔ حافظ صاحب شاعر تھے اور ثاقب گوالیاری کے شاگرد تھے۔ آپ فارسی کم اور اردو زیادہ پڑھاتے تھے۔ دونوں زبانوں کے اچھے عالم تھے۔ اقبال کی نظمیں راقم کو پہلے پہل انہی سے پڑھنے کا اتفاق ہوا:

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

(داستاں میری ڈاکٹر اقبال حسین پٹنہ اشاعت اول ۱۹۸۹، ص:۱۲۶)

خودنوشت نگاری میں امانت داری، دیانت داری اور صداقت کا ہونا ضروری ہے۔ اسے اس صنف کا جوہر خاص قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی ''میری دنیا'' عتیق صدیقی کے ''یاروں کے سہارے''، جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ''یادوں کی دنیا'' آل احمد سرور کی ''خواب باقی ہیں'' ادا جعفری کی ''جو رہی سو بے خبری رہی'' اختر الایمان کی ''اس آباد خرابے میں'' اور اویس احمد دوراں کی ''میری کہانی'' میں یہ عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔

خودنوشت لکھنا آسان نہیں ہے۔ کسی آدمی کے لئے بچپن سے آخر عمر تک کی باتوں کو یاد رکھ کر پورے دیانت داری اور صداقت کے ساتھ بیان کرنا بہت ہی مشکل مرحلے سے گزرتا ہے۔ لیکن اس مرحلے سے گزرنے کے بعد جو چیز سامنے آتی ہے اس سے مردہ روح میں نئی جان پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید اس لئے یہ مثل مشہور ہے کہ خودنوشت میں انسان دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ صبیحہ انور کے الفاظ میں:

''خودنوشت سوانح حیات لکھتے وقت جس بے باک سچائی کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بغیر نہ تو وہ خود نوشت کے معیار پر پوری اترتی ہے اور نہ ہی پڑھنے والے کے لیے اپنے اندر کوئی دلچسپی رکھتی ہے۔ اگر خودنوشت نگار حقیقت سے دامن بچاتا ہے تو سب سے بڑا نقصان خود اس کا اپنا ہوتا ہے کیونکہ پردہ داری اور غلط بیانی سے اس کی زندگی میں سپاٹ پن اور جھول پن پیدا ہو جاتا ہے۔''

(اردو میں خودنوشت حیات ڈاکٹر صبیحہ انور نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۹۳، ص:۱۹)

سید عبداللہ نے ''نقوش'' لاہور کے آپ بیتی نمبر جلد اول (۱۹۶۴) کے ص نمبر ۶۴ پر لکھا ہے کہ خودنوشت نگار خود ہی کوزہ گر، خود ہی مجرم، خود ہی گواہ اور خود ہی جج ہوتا ہے۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے۔ خودنوشت میں مصنف خود ہی بتاتا ہے کہ کن حالات میں انہوں نے اس رنگ برنگی دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ کس طرح وہ بچپن سے جوانی کی سرحد پر قدم رکھا اور اس کا طالب علمی کا دور کیسا رہا اس کی کامیابیوں کامرانیوں اور ناکامیوں کی داستان لوگوں کے دلوں پر کتنی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنی محرومیوں اور ناکامیوں سے کیسے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ہزاروں رکاوٹوں کے باوجود وہ کس طرح اپنی زندگی کی کشتی کو ساحل تک پہنچانے میں کامیاب رہا۔ کیسے کیسے لوگوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ اس کے دور میں رہن سہن، رسم و رواج اور سیاسی حالات کیسے تھے۔ ان ساری باتوں کو وہ پوری ایمان داری اور

سچائی کے ساتھ اور کبھی ان میں مسالا ڈال کر پیش کرتا ہے۔ وہاج الدین علوی نے اس سلسلے میں کہا ہے:

"وہ (خودنوشت نگار) خود ہی ذات کا محور ہے خود ہی نظر ہے اور خود ہی آئینہ میں اپنی زندگی کے تجربوں، مشاہدوں اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیات کا ناظر بھی ہے۔"

(اردو خودنوشت فن وتجزیہ وہاج الدین علوی، ص:۳۲)

خودنوشت کے لیے ایک بات جو سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ خودنوشت نگاری کا فن تخلیقی نثر کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے کردار حقیقی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں تاریخی، سیاسی اور سماجی معلومات کا خزانہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بصیرت افروز ہی ہو۔ اس لئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے خودنوشت سوانح لکھتے وقت تحریر میں حسن پیدا کرے۔ تحریر کی دلکشی بھی قاری کو باندھ کر رکھتی ہے اور وہ آگے کے واقعات کو پڑھتا چلا جاتا ہے۔

"یہی پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ کل کلکتہ خواب کی طرح تھا۔ اب تو گھر آنگن کی طرح ہے۔ پھر بھی خوابوں کی دنیا بڑی سہانی ہوتی ہے۔ خواب دیکھنا چاہئے عروج کے زینے اس کے اندر ہوتے ہیں۔ یہ کیا میں تو سات آٹھ سال کا بچہ بن گیا تھا ان خوابوں میں کھو گیا تھا جو اس زمانے کے بچے دیکھتے ہیں:

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا   بات پہنچی تیری جوانی تک

"کلکتہ پہنچ کر کچھ دیر ریل کا انتظار کرنا پڑا۔ کورومنڈل اکسپریس سے روانہ ہونا تھا۔ وائف نے خواہش ظاہر کی، ہوڑہ برج کا نام بہت سنا ہے۔ جب تک ٹرین آرہی ہے اس اثنا میں دیکھ لیتے ہیں۔"

(چاندنی دھوپ کی پروفیسر ایم کمال الدین ایجوکیشنل پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۱۷، ص:۲۶۷)

مختصر یہ کہ خودنوشت سوانح مصنف کی زندگی کی ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جو خود اس کے قلم سے لکھی جاتی ہے۔ یہ شخصی اظہار کا ایک بہترین وسیلہ ہے جس میں حقیقت اور غیر جانب داری سے کام لیا جاتا ہے۔

....

● ریسرچ اسکالر، پی جی شعبۂ اردو، ایل این ایم یو، دربھنگہ (بہار)

Email: tarannumperweendbg7@gmail.com Mobile: 9576086829

محمد سرور لون

علی سردار جعفری: سیاست کے مدو جزر میں تیرتا سخن ور

اردو میں جن ترقی پسند شعرا نے سب سے زیادہ سیاستی موضوعات کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا ان میں علی سردار جعفری کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ چوں کہ ان کا تعلق اس دور سے تھا جس وقت اردو شعر و ادب میں اہم ترین موضوع سیاست تھا جس کے نتیجے میں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ بظاہر برصغیر کی تقسیم سیاسی اتفاق رائے سے ہی ہوئی تھی اور پورا برصغیر سیاسی بحران کا شکار تھا، سیاست کا لفظ بھی اسی بحران کا شکار رہا۔

یوں تو سردار جعفری کوئی سیاسی لیڈر یا رہنما نہیں تھے۔ وہ تخلیقی تحریکی اور جمالیاتی شخصیت کے مالک تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ مارکسی نظریات سے پوری طرح متاثر تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے باضابطہ ممبر بھی تھے۔ اس کے علاوہ وہ ادبی، ثقافتی اور تحریکی پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں چاہے وہ علی گڑھ میں ہو یا لکھنو، علی سردار جعفری نے سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ علی گڑھ سے ان کا اخراج بھی ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ لکھنو میں انھوں نے اسٹوڈینٹ یونین کا الیکشن بھی لڑا اور جیتا بھی۔ اس وقت وہ کمیونسٹ پارٹی کی اسٹوڈینٹ ونگ، اسٹوڈینٹ فیڈریشن آف انڈیا کے ممبر تھے اور اسی کے ٹکٹ پر انھوں نے اسٹوڈینٹ یونین کا الیکشن لڑا تھا۔ علی سردار جعفری نے اپنی جیت درج کر کے پہلی مرتبہ زمیندار و تعلقہ دار لابی کو لکھنو یونی ورسٹی یونین سے باہر کر دیا تھا اور پھر سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا نام یونی ورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔ بقول سجاد ظہیر:

> ''علی سردار جعفری جو علی گڑھ یونی ورسٹی سے اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر نکالے جانے کے بعد اب لکھنو یونی ورسٹی میں ایم اے کرنے کے لیے داخل ہو گئے تھے لیکن اپنا بیشتر وقت اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو دیتے تھے۔'' (روشنائی ص:246)

سردار جعفری کو جب علی گڑھ یونی ورسٹی سے نکالا گیا تو وہ ترقی پسند نظریات سے متاثر ہو گئے تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے قلم کاروں کا مطالعہ کیا بالخصوص لینن، گاندھی جی، نہرو وغیرہ کی سوانح عمریاں پڑھیں اور اس طرح اشتراکی کتابوں کے مطالعے اور منٹو، مجاز وغیرہ کی صحبت نے انھیں اشتراکی تحریک کی راہ پر ڈال دیا اور انھیں محسوس ہوا کہ ان کی زندگی کا مقصد شاید مل گیا ہے۔ اس طرح وہ مارکسی نظریات کے حامی ہو گئے اور اس دور میں جس طرح کی شاعری کی اس میں مارکسی نظریات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ مجاز، رشید جہاں، سجاد ظہیر، سبط حسین وغیرہ سے قربت نے ان کے اس نظریے کو مزید پختگی عطا کر دی۔ اس کی فکر کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی تھیں کہ یہاں سے وہ کسی قیمت پر پیچھے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ جس کے نتیجے میں انھیں دو بار جیل بھی جانا پڑا۔ ترقی پسند تحریک کی نصف صدی کے دوسرے خطبے میں سردار جعفری کہتے ہیں:

> ''میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ 1940ء جب میں نے لکھنو یونیورسٹی کے سیکریٹری ہونے کی حیثیت سے

طلبا کو سر ماریسن گورنر کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے آمادہ کیا اور ہندوستان کے یہ چیف جسٹس لکھنو میں کانوکیشن کا خطبہ نہیں پڑھ سکے تو یو پی کے گورنر نے وائس چانسلر کو یہ ہدایت دی کہ مجھے یونی ورسٹی سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن وائس چانسلر نے برطانوی حکومت کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ وائس چانسلر حبیب اللہ صاحب تھے اور میرے استاد انگریزی کے پروفیسر سدھانت۔ دونوں نے میرا حوصلہ بڑھایا آخر کار حکومت نے مجھے گرفتار کر کے ایم اے فائنل کا امتحان دینے سے روک دیا۔''

(ترقی پسند تحریک کی نصف صدی، ص:60)

یہ ان کی زندگی کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ رہا۔ جیل سے آٹھ ماہ بعد رہائی عمل میں آئی۔ اس کے بعد بلرام پور میں نظر بند رہے۔

1940ء میں سردار جعفری کی ملاقات مخدوم محی الدین سے ہوئی۔ اس سے پہلے مخدوم سے ''نیا ادب'' کے سلسلے میں خط و کتابت ہو چکی تھی۔ سردار جعفری لکھنو میں تھے اور مخدوم حیدرآباد میں۔ جیل میں رہنے کی وجہ سے انہیں اس وقت مخدوم سے زیادہ تفصیلی گفتگو کا موقعہ نہیں مل سکا۔ پھر جب وہ 1941ء میں مخدوم سے ملے تو یہاں انہیں تفصیلی گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔ اس بارے میں سردار جعفری ''مخدوم سرخ سویرے کا شاعر'' میں لکھتے ہیں:

''یہ تصویر ہماری اس وقت کی جذباتی کیفیات کی ترجمان تھی۔ ہمارا پورا ''نیا گروپ'' اسپین کی خانہ جنگی سے بہت متاثر تھا۔ ہم نے اسی زمانے میں اسپین کے شاعر لورکا کی کچھ نظمیں اور نوجوان انگریزی ادیب کاڈویل ریلف فاکس اور جانکر افورڈ کے حالات پڑھے تھے۔ ہمارے دل میں بھی یہ امنگ تھی کہ ان جمہوری ادیبوں کی طرح ظلم، جہالت، شہنشاہیت اور بربریت کے خلاف لڑ کر ہم بھی کہیں اپنی جان دے دیں۔''

(نوائے ادب، جنوری۔ مارچ 2004، مضمون مخدوم: سرخ سویرے کا شاعر، از سردار جعفری، ص:3)

1941ء میں سردار جعفری کی عالمی فکر کی یہ بہترین تصویر کشی ملتی ہے۔ 1942ء میں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری جناب پی ہوش سی جوشی اور سجاد ظہیر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ممبئی کے ایک کمیونسٹ اخبار کے لیے استعمال میں لائیں۔ اس وقت سجاد ظہیر اور سردار جعفری دونوں نے اخبار کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس اخبار نے سردار جعفری کے سیاسی شعور کو مزید جلا بخشی۔ سردار جعفری لکھتے ہیں:

''اس اخبار کی اشاعت نے میری صلاحیتوں کو جلا بخشی اور کمیونسٹ پارٹی نے مجھے باقاعدہ طور پر اپنا کارڈ ہولڈر بنالیا۔ جس کی میں نے 58 کے بعد کوئی تجویز نہیں چاہی۔ لیکن میں مارکسٹ رہا۔ اس پارٹی سے منسلک رہ کر مجھے سمترا نندن پنت، جوش ملیح آبادی اور دوسرے کئی دانشوروں سے ملنے کے مواقع ملے۔ کئی فلم ستارے بھی ہمارے دفتر میں آتے تھے۔ خصوصاً کے ایک سہگل، پرتھوی راج کپور، کے این سنگھ یہ سب میرے بے حد چاہنے والے تھے۔''

(کتاب نما، علی سردار جعفری نمبر، نومبر 1990، مضمون ''لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں'' ص:60)

اوپر ذکر کیے گئے واقعات سے سردار جعفری کی بصیرت اور سیاسی نظریات کی کما حقہ وضاحت ہو جاتی ہے۔ اصل میں سردار جعفری نظم نگار شاعر تھے۔ وہ اپنی زندگی میں شروع سے آخر تک ترقی پسند تحریک سے متاثر رہے۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کا سوال ہے یہ ایک ادبی تحریک ضرور ہے لیکن ساتھ ہی ایک سیاسی نظریے کی علم بردار بھی۔ اس تحریک سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں اس سیاسی نظریے کے حلقے اور گہرے رنگ صاف طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ ان شعرا کا سوال ہے، فیض، مخدوم، ساحر اور مجروح کے مقابلے میں سردار جعفری کے یہاں سیاسی رنگ زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ خاص طور پر ان کی نظموں میں سیاسی فکر زیادہ نمایاں ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی   کھلونے دے کر کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو   زمانہ کس قدر بے تاب ہے کروٹ بدلنے کو

سردار جعفری ہندوستان کے ایسے واحد شاعر ہیں جنھوں نے عظیم اکتوبر انقلاب، اس کے رہنما لینن اور سوویت اشتراکی سماج پر سب سے زیادہ نظمیں کہیں ہیں۔ انھوں نے انقلابیوں کی ستائش، سرخ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی اور راہ انقلاب میں جان بحق ہونے والے سپاہیوں کو خراج عقیدت اور تحسین کے لیے شاہکار نظموں کی زبان دی ہے۔

ہندستان میں جب آزادی کی تحریک زور و شور چل رہی تھی۔ انگریزی حکومت آزادی کی اس تحریک کو دبانے کے لیے تمام ناجائز حربے استعمال کر رہی تھی جن میں تحریر و تقریر پر پابندی سے لے کر ''رولٹ ایکٹ'' تک شامل تھا جس کے مطابق کسی بھی شخص کو بغیر مقدمہ چلائے مہینوں قید میں رکھا جا سکتا تھا۔ اس کی سخت مخالفت ہوئی لیکن حکومت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ انگریزوں نے ہر احتجاج کو سختی کے ساتھ کچلنے کی روش اختیار کی۔ یہاں تک کہ جلیان والا باغ جیسا واقعہ پیش آیا جہاں انگریزوں کی بربریت اور سفاکی انتہا پر نظر آتی تھی، ان حالات میں سردار نے بھی بڑی شدت کے ساتھ انگریزی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرنا شروع کیا، یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے سرداری جعفری کی نظموں میں سیاسی عنصر نظر آتا ہے۔ اُن کے پہلے شعری مجموعہ ''پرواز'' میں ''مزدور لڑکیاں''، ''سرمایہ دار لڑکیاں''، ''اشتراکی''، ''ارتقا و انقلاب''، ''جنگ اور انقلاب''، ''سامراجی لڑائی''، ''انقلاب روس'' اور ''تعمیر نو جیسے عنوانات پر نظمیں ملتی ہیں۔ سرداری جعفری کی سیاسی نظموں میں اکثر و بیشتر ہم کو ایک انقلابی جوش اور شدت پسندی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے فرسودہ نظام کو بدلنے کے لیے اگر تشدد کی ضرورت ہو تو اس کا سہارا لینا چاہیے یہاں سردار جعفری کی کچھ ایسی نظموں کے ایک دو بند پیش ہیں جن کے مطالعہ سے ان کے سیاسی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی نظم ''بغاوت'' کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

بغاوت عصر حاضر کے سپنوں کا ترانہ   بغاوت دور حاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانونِ سیاست سے   بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بد دعاؤں سے   بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے

جنوری 1946ء میں گوالیار میں حکومت کے خلاف ایک احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ انگریزی سرکار کے حکم پر کچھ

دیسی افسروں نے جلوس پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اس میں ایک کم سن لڑکا شہید ہو گیا تھا۔ اس واقعے پر سردار جعفری نے ایک نظم ''گوالیار'' کے عنوان سے لکھی۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہیں:

یہ دیسی حکمراں جو نسل انسانی سے خارج ہیں — وہ کہتے ہیں جنھیں انگریز آقاؤں نے پالا ہے
بھیانک ان کی روحیں ہیں تو مردہ ہے ضمیر ان کا — سفید ان کی رگوں کا خون ہے دل ان کا اجالا ہے
کروڑوں مفلسوں کا خون جلتا ہے چراغوں میں — جو ان منحوس راجواڑں کے محلوں کا اجالا ہے
یہ سب بے آسرا مظلوم بیواؤں کے آنسو ہیں — چمکتے موتیوں کی ان کی گردن میں جو مالا ہے
یہ سب برطانیہ کے تاج شاہی کے نگینے ہیں — ہر اک ان میں سے بھارت ورش کے سینے کا چھالا ہے

آزادی کے بعد دیسی لیڈروں سے خطاب کرتے ہوئے اپنی نظم ''گرد کارواں'' میں سردار کہتے ہیں:

یہ مانا آج سرفراز شل آسماں تم ہو — یہ مانا حریت کی منزلوں کے رازداں تم ہو
یہ مانا فخر عالم ، نازش ہندوستاں تم ہو — مگر گزرے ہوئے وقت طرب کی داستاں تم ہو
عدو کو چھوڑ کر اپنوں سے ہی دست و گریباں ہو — خفا ہو دوستوں سے دشمنوں پر مہرباں تم ہو

غرض سردار جعفری کی کچھ ایسی سیاسی نظمیں بھی ہیں، جہاں ان لہجہ تیکھا اور تیز و تند ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کہ وجہ سیاستدانوں کا وہ مکر و فریب ہے جو عوام کے مسائل حل کرنے کے بجائے ان کیلئے نئے مسائل کھڑے کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ سیاست داں ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ عوام اس بات سے بے خبر ہی رہیں کہ اقتدار و اختیار کو اپنے بس میں کرنے کے بعد سیاست داں کیسی کیسی گھناونی سازشوں اور بدعنوانیوں میں ملوث ہیں۔ اس کیلئے وہ عوام کو مذہب، ذات پات، علاقہ، زبان اور ایسے ہی کئی مسائل میں الجھائے رکھتے ہیں۔ ایسے ملک دشمنوں اور قوم فرشوں سے نرم و ملائم زبان اور دھیمے لہجے میں بات کیسے کی جا سکتی ہے۔ خود سردار کے ان الفاظ میں تشدد کا جواب تشدد ہی سے دیا جانا چاہیے اور تلواراں کو تلواراں ہی سے کاٹنا پڑتا ہے۔ اسی لیے سردار جعفری کی ان سیاسی نظموں میں ہم کو زبان اور لہجے کی تیزی و تندی کا احساس ہوتا ہے۔ سردار جعفری کا شعری مجموعہ ''امن کا ستارہ'' 1950ء میں منظر عام پر آیا جس میں ان کی تین نظمیں سویت یونین اور جنگ باز، استالن کتھا اور امن کا ستارہ شامل ہیں۔ سردار جعفری نے اس مجموعے کا انتساب ہی ''امن عالم کے مجاہدوں'' کے نام کیا ہے۔ جس سے ابتدا ہی میں واضح ہو جاتا ہے کہ ان نظموں کا مقصد سماج سے ظلم و بربریت اور استحصال و استبداد کو ختم کرنا اور امن و امان کی راہوں کو داستوار کرنا ہے۔ اس مجموعے میں سردار جعفری نے پیش لفظ سے پہلے ایک مختصر نظم بھی شامل کی ہے جو یوں ہے:

جنگ باز خوں خواروں / ہم تمہیں سزا دیں گے / یہ غرور زرداری / خاک میں ملا دیں گے / خون کے
پیاسے ہو / ہم مزا چکھا دیں گے / وہ نظام وہ دنیا / جس میں جنگ پلتی ہے / ایک دن مٹا دیں گے

اس سماج میں سامراجی استحصالی قوتوں کا لوہا منوا لینے اور ان پر شاندار فتح پانے کا عزم اور امید دکھائی دیتی ہے۔ ایسی فتح یابی کے حصول سے شاعر کا مقصد ظالم و جابر نظام حکومت کا سدِ باب اور جنگ و جدل کا خاتمہ ہے تا کہ امن و آشتی کے نئے دور کا آغاز ہو سکے۔

مجموعے میں شامل تینوں نظموں میں رجائیت کا گہرا رنگ دکھائی دیتا ہے جو عوامی بیداری کے غرض سے لکھی گئی ہیں۔ یہ نظمیں ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا سے ظلم و جبر، خون ریزی و بدامنی اور غربت و افلاس مٹا دینے کے گراں قدر پیغامات کی حامل ہیں۔ یہ سویت یونین کو آئیڈیل مان کر دیگر ممالک بشمول ہندوستان میں ایسی خوشگوار صورتحال پیدا کرنے کی امنگیں اور آرزوئیں پیش کرتی ہیں جہاں عوامی حکومت کے زیر سایہ آزادی، ترقی اور امن و آشتی کا ماحول پروان چڑھے اور پھولے پھلے۔ لہٰذا ''سویت یونین اور جنگ باز'' کا خاتمہ اس بند پر کرتے ہیں:

ہے اک سوویت کا دیس خاک پر بسا ہوا	مگر اک اور ہے ہمارے خون میں رچا ہوا
ہماری آرزو ہمارے خواب میں سجا ہوا	یہ خواب وہ ہے جس کا کل زمین کو انتظار ہے

سردار جعفری انقلاب اور بغاوت کو اپنا آلہ کار تو بناتے ہیں لیکن ان کا مقصد کبھی بھی بے جا جنگ و جدل اور سفاکی و خون ریزی نہیں بلکہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی نظام کی تشکیل نو ہے تاکہ محکوم و مجبور عوام کو آزادی انصاف، حق مساوات مل سکے اور پر امن معاشرے کا قیام عمل میں آسکے۔ ان کی نظم ''امن کا ستارہ'' کا اختتام یوں ہوتا ہے:

امن اور شانتی کے لیے لڑنے والوں کی جے	مسکراتے ہوئے ہونٹ ہنستے ہوئے سرخ گالوں کی جے
حریت کے چمکتے شرارے کی جے	امن کے جگمگاتے ستارے کی جے

ہندوستان کو جب آزادی حاصل ہوئی تو دیگر لاکھوں ہندوستانیوں کی طرح سردار جعفری کے لیے بھی یہ نہایت ہی مسرت و انبساط کا دن تھا۔ وہ آزاد ہندوستان کو اپنے سپنوں کے آئینوں سے دیکھنا چاہتے تھے جو ایک مکمل اور آئیڈیل ملک بن کر دنیا کے نقشے پر ابھرے۔ انھوں نے ''جمہوریہ کا اعلان'' نامہ لکھا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ:

نہ پھر خوف ہو گا نہ پھر احتجاج	نئے سر سے تعمیر ہو گا سماج
یہ افلاس کی رات ڈھل جائے گی	کسانوں کی دنیا بدل جائے گی
رہے گا نہ کوئی بھی بے روزگار	مصیبت سے چھٹ جائیں گے کامگار
نئی دیں گے ماتھے کو تنویر ہم	بدل دیں گے انسان کی تقدیر ہم

مگر وہ آزادی کے بعد ہندوستان کی عمودی صورت حال سے کبھی مطمئن نہیں رہے کیوں کہ یہ ہندوستان ان کی خواہشوں پر پورا اترتا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ مزید یہ کہ آزادی کے ساتھ تقسیم کی ہولناکی بھی آئی تھی جس نے نہ صرف لاشوں کے انبار پر ملک کے دو ٹکڑے کر دیے بلکہ مذہب کے نام پر ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ اس صورت حال میں بھی سردار جعفری نے امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہ ملک کے اندرونی ماحول کو بہتر بنانے اور امن و بھائی چارگی کو فروغ دینے میں مصروف عمل رہے۔ سردار جعفری نے اپنی عملی اور قلمی کوششوں کے ذریعہ ہندوستان کے اندر دو قوموں کے درمیان امن و بھائی چارگی کے ماحول کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے دو تہذیبوں اور دو اہم زبانوں کو قریب لانے کی بھی کامیاب کوششیں کیں۔ انھوں نے دیوان میر اور دیوان غالب کی تدوین دیوناگری رسم الخط میں کی۔ انھوں نے سات جلدوں میں اردو غزلوں کا انتخاب ''غزل نامہ'' ڈاکٹر راج نگم کے اشتراک سے ہندی میں شائع کیا۔

انھوں نے تقسیم ہند کے بعد ہندو پاک کے درمیان در آئی عداوت و منافرت کی فضا ختم کرنے اور دوستانہ ماحول کو فروغ دینے کی کوشش کیں جس کے اعتراف میں امریکہ کے ہارورڈ فاؤنڈیشن نے انھیں 1999ء میں خصوصی اعزاز سے نوازا۔ امن مسائی کے سلسلے میں ان کی نظم ''صبح فردا'' کا ذکر برمحل ہوگا:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے	اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے	ہمارے خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے	میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

لاکھوں لوگوں کی طرح سردار جعفری کا بھی گراں قدر خیال یہ تھا کہ جنگیں صرف مسائل پیدا کر سکتیں ہیں، مسائل کو حل نہیں کر سکتیں۔ ہندو پاک اگر چہ دو خطوں میں منقسم ہو چکے ہیں مگر دونوں ملکوں کے مسائل ایک ہی نوعیت کے ہیں لہٰذا دونوں ممالک کی حکومتوں کو جنگ کی تیاریوں میں بے جا مصارف و وسائل کی بربادی کی جگہ باہمی تعاون سے ایک دوسرے کی ترقی کے لیے مصرفِ عمل ہونا چاہیے کیوں کہ اسی میں دونوں کی بھلائی ہے۔

دسمبر ۱۹۸۸ء میں جب بھوپال گیس حادثہ ہوا۔ اس حادثے نے پوری انسانیت کو شدید صدمہ پہنچایا۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر سردار جعفری نے ایک دل سوز نظم ''عنوان شہر یاراں'' کے نام سے لکھی۔ اسی طرح بابری مسجد کی شہادت پر بھی کرب ناک نظم لکھ کر احتجاج کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ مئی ۱۹۹۰ء میں جب بھارت نے نیوکلر بم کا دھماکہ کیا تو سردار جعفری نے کھلے عام اس سے ناراضگی جتائی تھی ان کا ماننا تھا کہ آج جب کہ بھارت کے سامنے لاتعداد مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست انسانی زندگی سے ہے۔ سب سے پہلے ان کا تدراک ضروری ہے نہ کہ نیوکلیر بموں کا دھماکہ۔ سردار جعفری کا پیغام امن کا پیغام ہے جنگ و جدل کا نہیں وہ اس پیغام کی توسیع میں ملکی حدود کے منکر ہیں:

ہمیں دنیا کی سرحدوں سے کیا مطلب
ہمارا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سردار جعفری کی شخصیت صرف شاعری تک محدود نہیں رہی بلکہ وہ ہندوستان کی سیاسی صورتحال اور سماجی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بین الاقوامی امور پر بھی رائے زنی ایک سیاسی مدبر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

....

● ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد، گچی باؤلی، حیدرآباد-500046 (تلنگانہ)

محمد رضوان

کلیم عاجز کے اسلوبِ غزل پر میرؔ کے اثرات

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں بہار کی سرزمین بہت زرخیز رہی ہے۔آزادی کے بعد اردو شاعری کے افق پر جو نام ابھر کر ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں کلیم عاجزؔ نہایت محبوب و معتبر نام ہے۔انہوں نے اپنی مخصوص و منفرد شاعری سے پوری اردو دنیا کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔تقریباً پچاس برسوں تک مختلف اصناف شاعری کو اپنے خون جگر سے سینچتے رہے اور اپنی غزلیہ شاعری میں ایک مخصوص مقام و مرتبہ حاصل کیا۔

اصناف شاعری میں یوں تو انہوں نے حمد لکھی، نعتیں لکھیں، سہرے اور شخصی مرثیے لکھے۔ نظمیں بھی تخلیق کیں اور غزلیں کہیں۔لیکن شہرت و دوام انہیں غزل کے شاعر کے طور پر حاصل ہوئی۔غزل سے ان کا تعلق محض شاعر کا نہیں بلکہ عاشق و محبوب کا ہم نشیں و ہمزاد کا آگاہ رموز فن اور واقف اسرار کا رہا۔

کلیم عاجز کی زندگی میں ہی ان کی شاعری اور ان کے فن کے متعلق کئی اہم شخصیات نے اپنے تاثرات و نظریات پیش کئے ہیں۔

ان کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ وہ میر تقی میر کے مقلد، پیرو کار اور ان کے اسلوب کے خوشہ چیں ہیں۔

فراق گورکھپوری، جمیل مظہری اور کنہیا لال کپور جیسے نابغۂ روزگار نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ   تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

کلیم عاجز نے اپنے پہلے مجموعے ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''تعمیر آرٹ کا بنیادی مقصد ہے۔انسانیت کے گھاؤ دیکھے نہیں جاتے۔میں نے اپنے گھاؤ کے آئینہ میں دنیا کے گھاؤ دیکھے دونوں کی ہم آہنگی نے مجھے رولایا۔اگر مجھے گھاؤ نہ لگتے تو شاید مجھے دنیا کے گھاؤ نظر نہیں آتے۔ مجھے اپنے گھاؤ سے پیار ہے۔لیکن دنیا کے گھاؤ سے دکھ ہے جی چاہتا ہے سارے گھاؤ مجھے لگ جائیں۔دنیا کا چہرہ صاف ستھرا ہو کر نکھر آئے۔''

مرے دل کو ہے جنوں سے بڑی اعتقاد مندی   ترے سامنے اسی نے مجھے جرأت سخن دی

(حوالہ ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا''، ص:۱۷۴)

کلیم عاجز کی غزلوں کا لہجہ بھی ایک خاص مطالعے کی چیز ہے۔ان کے لہجے میں جیسی اپنائیت، معصومیت، نرمیت اور مظلومیت جھلکتی ہے۔دراصل ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

جب ''فصل بہاراں آئی تھی'' کے مقدمہ میں خود کلیم عاجز رقم طراز ہیں:

''۱۹۶۶ء میں جب پڑھانے لگا تو میر سے آشنائی پیدا کرنی پڑی اور اختر صاحب نے یہ سمجھ کر کہ مزاج میرؔ سے مشابہ ہے۔مجھے ایم اے کے کلاسوں میں میر اور آتش ہی پڑھانے کو دیا۔جب پڑھانے لگا اور

''ذکر میر'' میں پڑھا تو معلوم ہوا کہ ہاں ''سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا''۔ جب معلوم ہوا تب اپنی شاعری میں ۱۹۶۸ کے بعد میری زبان پر میر کا نام آنے لگا۔''
(مقدمہ: ''جب فصل بہاراں آئی تھی'' کلیات کلیم عاجز، ص: ۲۹۳)

درحقیقت ''ذکر میر'' کے مطالعہ کے بعد کلیم عاجز کی صرف زبان پر ہی میر کا نام نہیں آنے لگا بلکہ انہوں نے اپنی پوری شخصیت کو میر کے رنگ میں ڈھالنے کی شعوری کوشش کی اور اپنی شاعری کے اسلوب کو میر کے انداز میں برتنے لگے۔ کلیم عاجز کو میر کی ذات سے مشابہت اور اپنی شاعری میں ان کا انداز نظر آنے لگا۔

مثلاً میر کی زندگی برباد اور شکستہ تھی لہٰذا ان کے لب و لہجہ میں بھی شکستگی ہے۔ کلیم عاجز کی زندگی بھی میر کی طرح شکستہ ہے اس لئے ان کے لب و لہجہ میں بھی شکستگی ہے۔ دونوں ہم حال ہیں اسی لئے ہم زبان اور ہم لہجہ بھی دکھائی دیتے ہیں:

کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے دیدنی ہے شکستگی دل کی
(میر)

ہلکی ہلکی سی صدا آتی رہی ساز دل سے ٹوٹنے کے بعد بھی
(کلیم عاجز)

جمیل جالبی نے میر کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

''طرز میر مختلف اجزاء سے مل کر بنا ہے اس طرز میں عاشق میر، مجنوں میر اور شاعر میر تینوں کی آوازیں مل کر ایک ہوگئی ہیں۔'' (محمد تقی میر، ص: ۱۱۲)

کلیم عاجز کے فن اور اسلوب کا بھی یہی حال ہے کہ ان کی غزلوں میں مجنوں کلیم، عاشق کلیم اور شاعر کلیم تینوں ہی مل کر ایک ہو گئے ہیں اور ان تینوں کی آواز و انداز نے مل کر ان کے کلام کو میر تقی میر کے کلام اور ان کے اسلوب کے کافی قریب کر دیا ہے۔ جس کا انداز کلیم عاجز کی غزلوں کے مطالعہ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ اور اس بات کا اقرار کلیم عاجز نے واضح طور پر کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے:

غزل گوئی ہماری میر سے کچھ کم نہیں پیارے تری محفل میں کس کی آنکھ جو نم نہیں پیارے
وہ آ گئے روش میر کی غزل والے ہمیں یہ دیکھ کر کہتے ہیں آج کل والے

میر کے تفصیلی مطالعہ کے بعد کلیم عاجز شخصیت اور فن دونوں لحاظ سے میر کے اسیر ہو گئے اور میر کے اسلوب کو اختیار کرنے لگے۔ لہٰذا کلیم عاجز کی غزلوں پر میر کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''میر نے یہی کام کیا اور میں نے یہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کا کام، اقبال کا کام، فیض و فراق کا کام حسرت و جگر کا کام آسان ہے، میر کا کام آسان نہیں اس لئے کلیم عاجز کا کام بھی آسان نہیں۔ اپنے بہتے ہوئے آنسو پونچھتے جانا۔ درد انگیز مسکراہٹوں سے تشفی دینا یہ کام مشکل ہے۔ میر نے یہی مشکل کام کیا ہے اور میں بھی یہی مشکل کام کر رہا ہوں یا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' (کلیات کلیم عاجز، ص: ۲۹۶)

اقتباس ملاحظہ ہو:

جب ان کو خون جگر کا کوئی کام آگیا — بے ساختہ لبوں پہ مرا نام آگیا
زخموں سے خون دل کی روانی تھمی نہ تھی — ان کی نظر کا پھر کوئی پیغام آگیا
یوں خون جگر میں ڈوب کے نکلی صدائے دل — جیسے کوئی چھلکتا ہوا جام آگیا

بقول کنہیا لال کپور:

''کلیم عاجز دور جدید کے پہلے شاعر ہیں جنہیں میر کا انداز نصیب ہوا ہے۔ ان کی غزلوں کے تیور نہ صرف میر کی بہترین غزلوں کی یاد دلاتے ہیں بلکہ ہمیں اس سوز و گداز سے بھی روشناس کراتے ہیں جو میر کا خاص حصہ تھا۔''

اشعار:

بھلا آدمی تھا یہ نادان نکلا — سنا ہے کسی سے محبت کرے ہے
کبھی شاعری اس کو کرنی نہ آتی — اسی بے وفا کی بدولت کرے ہے
بغیر اس بے وفا سے جی لگائے — جو سچ پوچھو تو دل کس کا لگے ہے

کلیم عاجز نے ہر چھوٹے بڑے انقلاب اور اس سے رونما ہونے والے نتائج کو ایک تماشہ بیں کی طرح سے نہیں بلکہ ایک دیدہ ور انسان کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ اسے سمجھا، جھیلا اور محسوس کیا پھر اپنے انفرادی ردعمل کو اجتماعی بنا کر تمام تلخیوں اور زہرناکیوں کو خوش گوار اور شیریں بنا کر اپنے کلام میں پیش کیا۔ کلیم عاجز کی غزلیں صرف ان کے غم دل کی ترجمان نہیں بلکہ اس میں آفاقی رنگ اور اجتماعی شعور بھی ہے۔ جس کے بنا پر ان کی شاعری کو صرف ان کے غم دل کا عکاس ہی نہیں بلکہ غم دوراں کا ترجمان بھی کہنے میں کوئی عار نہیں ہوگا۔

● ریسرچ اسکالر، پی جی شعبہ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ، موبائل: 9709673671

زینب ناز

سید علی حیدر نیر کے تعلیمی نظریات وخیالات

سید علی حیدر نیر ۱۴؍ ستمبر ۱۹۲۵ء کو موضع کولہوا درگاہ ڈاکخانہ انوگرہ ''میروان''، ضلع سیوان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم کا نام سید عبدالرحمن تھا۔ ابتدائی تعلیم وتربیت مکتب سے شروع ہوئی۔ ضلع اسکول چھپرہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا راجندر کالج چھپرہ سے بی۔اے کیا۔ اور پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ سے اردو فارسی اور عربی میں ایم۔اے کیا۔ اسکے بعد پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ سے فارسی ادب میں Ph.D کی سند حاصل کی۔ فاصلاتی نظام عمل کے تحت جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کیا۔ تو جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے جدید فارسی ادب میں اعلیٰ سند حاصل کی۔ اس کے علاوہ عالم کا امتحان ۱۹۵۴ء میں فاضل حدیث کا امتحان ۱۹۵۷ء میں بہار مدرسہ اگزامینیشن بورڈ سے پاس کیا۔ مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا سے B.Ed کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ سے B.L. کی ڈگری لی۔ علی حیدر نیر مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کرنے کے لئے تگ ودو کرتے رہے۔ اس کے بعد ایل۔ ایس۔ کالج مظفر پور بہار یونیورسٹی، مظفر پور میں اردو لکچرر کی حیثیت سے کئی برسوں تک درس وتدریس کا کام کرتے رہے۔ بعد میں انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز ریسرچ ان عربک اینڈ پرسین، پٹنہ میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز رہے اور ۱۹۸۳ء میں اسی ادارہ سے سبکدوش ہوئے۔ ۶؍ فروری ۱۹۹۲ء کو راہی ملک عدم ہوئے اور اپنے آبائی گاؤں کولہوا درگاہ میں مدفون ہوئے۔

سید علی حیدر نیّر کے تعلیمی نظریات وخیالات: علی حیدر نیّر کے تعلیمی نظریات وخیالات کی ترجمانی انکی طرز تحریر سے وابستہ ہے۔ شروع سے ہی ادب نواز تھے۔ اس لئے انکے تعلیمی نظریات وخیالات بالکل واضح ہیں۔ اور انکی ادبی کتابیں قابل مستند ہیں۔ آزادیٔ ہند کے بعد سید علی حیدر نیّر نے مشرقی ادب کو نئے رجحانات سے دیکھا اور پرکھا اور ادبی سرگرمیوں میں شامل ہوئے جب علی حیدر نیر کو علم وادب کا ذوق وشوق پیدا ہوا تو روایتی حصار سے باہر نکل کر عصری حالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ یہاں تک کہ شعر وشاعری سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تو شاہ علی ستاری عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ چنانچہ ''مجلس ادب اردو مظفر پور'' کے عنوان سے اپنی کتاب ''ادب ومعاشرہ'' میں تذکرہ کیا ہے۔ مجلسِ ادب میں آٹھ نشستیں ہیں۔ ہر نشست اپنی جامعیت کے لحاظ سے قابل ذکر ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''ہر دور میں باکمال شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں، جنہوں نے کشتِ زار ادب کی آبیاری کی ہے۔ جناب حافظ رحمت اللہ صاحب، ریاض حسن خان خیالؔ اور مضطر مظفر پوری نے اس چمنستان ادب کی آبیاری کی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام سب سے پہلے صوبہ بہار میں عمل میں آیا اور یہیں سے ''اخبار الاخبار'' نام کا ایک اخبار جاری ہوا جس نے مذکورہ ادارہ کے نقط کے اسلاف نے ادباء اور شعراء کی سرپرستی میں نہایت فیاضی سے کام لیا حفیظ جونپوری عرصۂ دراز تک اس دربار کے متوسلین میں سے رہے۔ شعر وادب کی ہنگامہ خیزی سے یہاں کی فضا ہمیشہ معمور رہی۔ مضطر مظفر پوری نے تو ایک ادبی حلقہ ہی پیدا کر دیا تھا۔'' (ادب ومعاشرہ: از سید علی حیدر نیر ص-۱۰۱)

سید علی حیدر نیر کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے علمی و ادبی تخلیق کو جدید سیاق و سباق سے متعارف کرایا اور اپنے عہد و ماحول کے اعتبار سے نئے تناظر کو پیش کیا اور مسلسل جدو جہد کرتے رہے۔ فکری رموز و نکات کے باہمی نظریات کو حسین امتزاج سے تعبیر کیا تو اظہار نوعیت کی تقدیم و تاخیر کی وسعت نگاری میں تحقیقی مدارج کو امور طلب کی طرف راغب کیا یوں تو فلسفہ کی موشگافیوں نے باہم عمل کا نظریہ قائم کیا اور منطقی ارتباط کی توسیع نے باریکیاں پیدا کیں جس سے ادب کا حسین مزاج واضح طور پر نمایاں ہوا۔ چنانچہ ''قومی یکجہتی اور اردو'' کے نام ایک واضح ثبوت ہے :

''ہمارے یہاں معاشرے میں وحدت فکر پیدا کرنے میں اقبال کی خدمات بھی کم اہم نہیں ہیں۔ اسکے دل میں انسانیت کا بے پناہ درد تھا اور ہندوستان کو وہ انسانوں کی بستی سمجھتا تھا۔ اسلئے اس کی زبوں حالی پر اس نے آنسو بھی بہائے ہیں اور ایک جہتی و محبت کا پیغام بھی دیا ہے۔ اس نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ساتھ ہی ساتھ ''ہمالہ'' ''قومی گیت'' ''نیا شوالہ'' ''ترانۂ ہندی'' ''سوامی رام تیرتھ'' وغیرہ موضوعات پر بھی معرکہ آرا نظمیں لکھ کر اپنی وسعت قلبی اور رواداری کا ثبوت دیا ہے اور بتایا ہے کہ اچھائی جہاں بھی موجود ہو، اس کی قدر کرنی چاہئے تنگ نظری سے کام لینا جرم ہے۔ اس طرح اس نے افتراق کے بجائے اخوت و مروت پر زور دیا ہے۔'' (ادب و معاشرہ از سید علی حیدر نیر ص-۵۸)

سید علی حیدر نیر کی لسان ثلاثہ کی تخلیق میں فکری، اجتہادی اہمیت ہمیں نئے باب سے ہم کنار کرتے ہیں۔ ان کا تہذیبی، سماجی، سیاسی شعور نہایت پختہ ہے اور شعور کی مختلف سطحیں ان کے تخلیقی نظام سے اس قدر مربوط و منسلک ہیں کہ ان کا تخلیقی احساس منفرد اور مختلف ہے بلکہ ان کا Dynamic Approach بالکل جداگانہ ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی نگاہ کسی خاص نقطۂ فکر کی پروردہ نہیں۔ ان کی تحریر کی توانائی التزام متحرک اور فعال پر بنی ہے اور بصیرت و آگہی کی بلند سطح پہ علمی، ادبی، تاریخی شعور بالیدہ ہے ''نقد و نظر'' ہو یا ''خبر و نظر'' یا پھر ''فکر و نظر'' ہو یا ''ادب و معاشرہ'' تخلیقی جرأت اور حوصلہ مندی کی یہ ایک نمایاں مثال ہے، ان کی فکر میں کلاسیکی رنگ کے ساتھ اسلوب جدت کا بھی امتزاج ہے۔ اپنی متنوع کی ادبی خدمات، عصری و تہذیبی کی روایات اور سنجیدہ موضوعات کے باعث صوبہ بہار میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ سید علی حیدر نیر فارسی زبان کے بڑے باذوق اسکالر تھے۔ انہوں نے فارسی زبان و ادب میں ''عروض الہند''، ''آصف نامہ''، ''رسالہ ذکر مغنیاں ہند'' اور ''دیوانِ قاسم ارسلان'' میں اپنی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کا علمی ثبوت فراہم کیا ہے۔ بلکہ فکر و فن کے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ علمی و ادبی آہنگ کی بصیرت نوازی کی ہم آہنگی نے اس قدر مربوط و منظم کر دیا ہے کہ تحقیقی معیار میں ذوق ادب کا احساس جلوہ گر ہوتا ہے۔ شعوری طور پر معائب و محاسن کے تمام رموز و نکات کو نمایاں کرنے کی سعی کی ہے۔ جذبہ احساس منظر عام پر لانے کی اک تبلیغی سعی کی ہے جس سے ان کے تعلیمی نظریات و خیالات اور تہذیبی روایات کا پتہ چلتا ہے۔

سید علی حیدر نیر نے عہد کے تقاضوں اور مطالبات کے پیش نظر اپنی ترجیحات کا تعین کیا چونکہ شعر و ادب کا عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ ان کی شعری قوت اور تخیل کی بلندی نے ادبی تصورات کو نمایاں کیا وہ اپنی تمدنی تلمیحات، تہذیبی اشارات اور ثقافتی کنایات میں نظر آتے ہیں بلکہ آزادی ہند کے بعد فکری جہات کی بالیدگی ایسی پیدا ہوئی جو وہم و گمان

سے بالاتر تھی نیر کی ناقدرانہ حیثیت بھی تشریحی ،تمہیدی صورت میں جلوہ گر ہوئی تو قدیم ثقافتی نظریے میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ تقلیدی صورت بالکل محذوف ہوگئی گویا تہذیبِ نوعی نے اسلوب کو وہم وگمان سے جدا کردیا۔

دبستانِ بہار میں نقد وتبصرہ اور تنقید کا شعور آزادی کے قبل اور بعد میں بھی جاری رہا جس میں قابلِ ذکر جناب قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد ہیں ۔لیکن بعد میں تمثیلی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی محاسبہ کی گنجائش نے الطاف حسین حالی کو اول نقاد تسلیم اور سب سے پہلے تنقید کا چراغ روشن کیا مگر اتفاق ہے کہ اردو زبان وادب میں تنقید نگاری کا جذبہ نمایاں ہوا تو ہر صنف میں اس کی توضیحاتی نمائش ہونے لگی اور ادب والوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا:

''جمعیتِ اقوام کا پہلا مہلک وار عالمِ اسلام پر پڑا قبائے خلافت پارہ پارہ ہوگئی ترکی جو امانت خلافت کا ضامن تھا اس زد میں آ گیا۔ خلافت کی وجہ سے عالمِ اسلام میں جو کچھ شیرازہ بندی قائم تھی ایک لخت ختم ہوگئی خلافت کی مقدس گرفت سے آزاد ہو کر عالمِ اسلام کا چپہ چپہ مغربی استعمار پسندی اور نوآبادیات کے فاسد رجحان کی آہنی گرفت میں آگ دردمندانِ اسلام نے خون کے آنسو بہائے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور حضرت بی اماں کے زیرِ قیادت کے لیے اس دریوزہ گری کے خلاف آواز بلند کی اور فرمایا:

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے   مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

اسی تحریک نے بعدہ قومی بیداری پیدا کی یہ تحریک بالآخر آزادی ہند جمعیت اقوام کے تحت فرنگی گرگوں کی یہ چیرہ دستی، عالمِ اسلام تو نہیں بھول سکتا۔'' (فکرونظر: از سید علی حیدر نیر، ص ۹۰-۸۹)

پروفیسر سید علی حیدر نیر کی علمی وادبی تحقیقات نے اردو فارسی زبان وادب میں ایک انفرادی نظریہ عطا کیا ہے جو ان کے انفرادا اختصاص کا حصہ ہے اور انکی تخلیقات بھی مختلف رسائل وجرائد اور اخبارات کی زینت بنتی رہی ہے۔ زینت بنتی رہی ہے۔علی حیدر نیر نے قدیم وجدید تمام اصناف پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اجمالی طور پر تمام موضوعات میں وسعت پیدا کی ہے اور سنجیدگی کے ساتھ ادب کو اعلیٰ معیار تک پہونچایا ہے۔ چنانچہ ''فضل حق آزاد کی نظم نگاری'' کی تحقیق وتنقید نگاری پر اک مبسوط نظر ڈالی ہے اور ''کلیاتِ میر سوز'' کی تحقیق آرائی میں سوز کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے ادب کی عظمت کا خیال پیدا کیا ہے۔ اس لئے ان کی تحریر میں عربی کی جامعیت، فارسی کی شان وشوکت، اردو کی سادگی اور بے تکلفی اور ادب کی روانی پائی جاتی ہے۔ جس سے ادبی تحقیق وتدقیق سے اردو میں ادبیات کا مقام پیدا کیا ہے۔ سید علی حیدر نیر نے اردو نظم نگاری میں فضل حق آزاد کا جائزہ لیا ہے جس میں تنقیح قلب امور کا احساس پیدا کیا ہے۔ اور اردو نظم نگاری کی اصلیت سے واقفیت حاصل ہوئی ہے فضل حق آزاد بہار کے عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ علی حیدر نیر کی نگارش ملاحظہ کیجئے:

''اردو نظم نگاری پر فضل حق آزاد کا بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے اردو کے شعر ادب کے ایسے پہلو کی طرف توجہ فرمائی جو عرصہ دراز تک نظر انداز رہا۔ آپ نے وقت کی ضرورت کو محسوس کیا اور غزلوں میں خیالات کا سید گل تیار کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کے گیسوے رسا کو بھی سنوارا۔ نظمیں لکھیں اور خوب لکھیں نظم نگاری میں زبان وبیان، فن اور تکنیک کا پاس رکھا۔ مختلف موضوعات پر طبع آزمائی فرمائی

نظم کا وہ گیسو جو مدت پریشانہ تھا اس کو نہ صرف سنوارا بلکہ گونا گوں خیالات کو شرح وبسط اور نہایت چابک دستی سے پیش کر کے رنگ روپ اور حسن وزیبائش میں یک گونہ اضافہ کیا۔''

(فضل حق آزاد بحیثیت نظم نگار: از سید علی حیدر نیر ص ۴-۵)

پروفیسر سید علی حیدر نیّر نے مختلف موضوعات پر کتابیں قلم بند کی ہیں وہ اکثر و بیشتر تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ جس سے ان کے ادبی شغف اور کینوس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی ذہن نئے آفاق کی تلاش میں ہمہ وقت سر گرداں بہ عمل رہا۔ اس لئے اردو دنیا ان کی ادبی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، تاریخی، مذہبی اور ادبی نظریات وخیالات منفرد اسلوب فکر ہے اور ان کا رموز و نکات اہم معلومات کا خزانہ ہے۔ گویا ان کی ادبی تحقیقات نے اردو زبان وادب کو اک نئے زاویہ آہنگ سے معمور کیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر اختر اورینوی نے علی حیدر نیّر کی کتاب کا تعارف لکھا تو انہوں نے علمی وادبی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نیّر نے اپنی انتھک کوشش کی اور ادب کی اہمیت کو نمایاں کی ہے۔ چنانچہ اختر اورینوی کے جذبہ احساس کو ملاحظہ کیجئے:

''میں پروفیسر سید علی حیدر کے عمل پیہم سے بہت متاثر ہوں ان میں یقین محکم بھی پایا جاتا ہے اور فاتح عالم جذبہ محبت بھی۔ وہ اردو زبان وادب کی پیہم خدمت کر رہے ہیں۔ وہ شاعر ہیں اور مجلسوں کی رونق کا باعث ہوتے ہیں۔ اچھے ناقد بھی ہیں۔ ملک کے معیاری رسالوں میں ان کے تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہیں تحقیق کے کاموں سے بھی دلچسپی ہے۔ میر سوز پر کام مکمل کر رہے ہیں۔ اُردو سے محبت کرنا بڑی آزمائش وابتلا کی بات ہے۔ اس خارزار عشق میں علی حیدر جری ہیں۔ ان میں وفاداری بھی پائی جاتی ہے اور استواری بھی۔'' (نقد ادب (تعارف) از اختر اورینوی ص ۶-۷)

سید علی حیدر نیر کی زندگی کے مشاہدے اور تجربے، علم وفن کے کارنامے، واقعات وحالات، بصیرت وبصارت، سوز وکرب اور تہذیب وتمدن کے موضوعات اور ادبی نظریات وخیالات ایک مخصوص دائرۂ تحقیق وتنقید پر گامزن ہے۔ انہوں نے علمی بصیرت سے ہمارے ''فکر ونظر'' اور ''خبر ونظر'' کے بہت سارے پہلو درخشاں کیے ہیں جس میں روشن خیالی کا تصور پنہاں ہے۔ ان کا جو طرز اظہار ہے اس میں کلاسکی رنگ وآہنگ کے ساتھ جدت کا بھی اک حسین امتزاج ہے۔

پروفیسر علی حیدر نیر نے اپنی کتاب ''نقد ادب'' میں ادبی شعور کو نمایاں کیا ہے۔ جذبہ کلام کا انداز بالکل تحقیقی نوعیت پر قائم ہے۔ شعور میں لاشعوری آہنگ کی پیائش ہے۔ علی حیدر نیر نے اردو ادب کی خدمت تو کی ہے مگر آزادی ہند کے قبل کے نظریے کو بھی نمایاں کیا ہے اور حقائق ومعارف کے آئینے میں آزادی ہند کے بعد کے نظریات اور خیالات کو قلم بند کیا ہے، جو ادبی تناظر ہو لائق تحسین ہے۔ بلاشبہ ہم کہہ سکتے ہیں علی حیدر نیر نے ''نقد ادب'' کے ذریعہ اردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے۔

● ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرہ موبائل: 7766044893

سیّد ایاز احمد روہوی

درسگاہوں میں اردو تحقیق کی موجودہ صورت حال

لغات میں تحقیق کے معنی کھوج، تفتیش، دریافت یا چھان بین کے ہیں۔ تحقیق کا عمل بنی نوع انسان کے بچپن سے تا حیات جاری رہتا ہے۔ اردو اصطلاح میں تحقیق کے معنی سچ یا حقیقت کی دریافت ہے۔ انگریزی اصطلاح میں ریسرچ کے معنی کھوج ہیں۔ ہندی اصطلاح میں کھوج کے معنی کسی مقررہ نشانے کو حاصل کرنے کے لئے اس کا تعاقب کرنا ہے گویا تحقیق یا ریسرچ ایک حقیقتِ پنہاں یا حقیقتِ مبہم کو افشا کرنے کا باضابطہ عمل ہے اور اسی تعریف سے تحقیق کا مقصد بھی صاف ہو جاتا ہے۔ نا معلوم یا کم معلوم کو جاننا یعنی جو حقائق ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہیں انہیں کھوجنا یا پھر جو سامنے تو ہیں مگر دھندلے ہیں ان کی دھند دور کر کے انہیں نمایاں کر دینا۔ انسان کو ہمیشہ نا معلوم کو جاننے کا تجسس رہتا ہے۔ معلوم کرنے میں دوسرے فوائد سے قطع نظر ایک ذہنی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ جہاں تک اردو کی ادبی تحقیق کا تعلق ہے اس کا بھی یہی مقصد ہے کہ جن مصنفین، جن ادوار، کتابوں اور متفرق تخلیقات کے بارے میں کم معلوم ہے ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جائیں۔ ان کے بارے میں اب تک جو کچھ معلوم ہے اس کی جانچ پڑتال کر کے اس کی غلط بیانیوں کی تصحیح کر دی جائے تا کہ غلط مواد کی بنا پر غلط فیصلے صادر نہ کر دیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق، علم کا وہ شعبہ ہے جس میں ایک لائحہ عمل کے تحت نا معلوم حقائق کی کھوج اور معلوم و موجود حقائق کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ مستند نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔ مختصر یہ کہ تحقیقی عرق ریزی کا عمل جاری ہے۔

بہر کیف تحقیقی سند کی پہلی ڈگری پی ایچ ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی) ہے نیز ایم اے اور پی ایچ ڈی کے درمیان ایک ڈگری ایم فل وضع کی گئی ہے لیکن بنیادی اہمیت پی ایچ ڈی کی ہے، اس کے بعد ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی۔ پی ایچ ڈی کے پہلے حصے میں طلبہ کو کچھ درسی امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے جو پی ایچ ڈی کورس ورک کہلاتا ہے۔ دوسرے حصے میں ایک مختصر تحقیقی مقالہ لکھنا پڑتا ہے۔ دیکھنے میں آتا ہے کہ ریسرچ میں داخلہ لینے والوں کی بڑی تعداد وقت گزاری یا پھر ملازمت میں کوئی گنجائش نکلنے کے لئے ریسرچ میں داخلہ لیتی ہے۔ ویسے امیدوار کا معاشی پہلو اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن اس سے قطع نظر تحقیق کا حق ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ ہر تعلیمی سال کے شروع میں تحقیق میں داخلہ لینے والوں کی ایک بڑی تعداد یونیورسٹیوں کا چکر لگاتی ہے۔ پری پی ایچ ڈی ٹسٹ میں کامیابی یا پھر نیٹ (NET) پاس ہونا پی ایچ ڈی (Ph.D) کے داخلہ کے لئے ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو پی ایچ ڈی کے سلسلے میں یو جی سی (UGC) کی پالیسی میں جھول ہی جھول ہے۔ بہتر ہوتا کہ ان انتخاب کے لئے ان سے کہا جاتا کہ جس موضوع پر وہ کام کرنا چاہتے ہیں، اس پر پندرہ بیس صفحوں کا مضمون لکھ کر جمع کریں۔ جن کا مضمون موضوع کی مناسبت سے بہتر ہوتا، ان کا داخلہ لے لیا جاتا مگر ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ داخلہ کے بعد چند مرحلوں سے گزر کر امیدوار حقیقی معنوں میں بے یار و مددگار محسوس کرتا ہے جبکہ درس گاہوں میں پی ایچ ڈی کی تحقیق کے لئے ہر ریسرچ اسکالر کیلئے ایک نگراں مقرر کیا جاتا ہے۔ اب اگر نگراں کے پاس اسکالر کی رہنمائی کے لئے وقت ہے تو یہ خوش آئند

بات ہے تا کہ درس گاہوں یعنی یونیورسٹیوں یا کالجوں کے علاوہ بھی وہ اپنے گھر میں بھی اسکالر کا کام دیکھنے کے لئے وقت نکال سکے۔ اس سلسلے میں موجودہ صورتِ حال مایوس کن ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے سینئر اساتذہ کے پاس فاضل وقت ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے ماتحت ریسرچ اسکالروں کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ بعض اساتذہ ایسے بھی ہیں جنہوں نے ریسرچ اسکالروں کو خواہ مخواہ پریشان کرنا اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک بڑی پریشانی تحقیق کے کام میں نگراں کے بھرپور تعاون نہ دینے کی وجہ سے تھیسس (Thesis) جمع کرنے میں تاخیر نیز جمع ہوجانے کے بعد اس کی جانچ میں یونیورسٹیاں اس قدر تاخیر کرتی ہیں جس کی وجہ سے طلبہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہونے میں لامحالہ تاخیر ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے بعض موقعوں پر طلباء میں بدگمانی پھیل جاتی ہے۔ موجودہ صورتِ حال خوش آئند نہیں ہے کیونکہ تحقیق میں داخلہ لینے والے بہت ہیں اور کام کو مکمل کرنے والے کم۔ جو کرتے ہیں ان میں بھی نصف سے کم ایسے ہوتے ہیں جو تحقیق میں کچھ اضافہ کر سکیں۔ بعض دفعہ تحقیق کے طلبہ یونیورسٹیوں کے ذریعہ غیر ضروری تاخیر کی وجہ سے بددل ہوکر تحقیقی کام ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔ رہنمائی کے فقدان کی وجہ سے درس گاہوں میں تحقیقی کام ایک مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسکالر میں تحقیق کی کسی حد تک صلاحیت ہوتی ہے لیکن اس کے گلے کوئی ایسا موضوع بندھ گیا ہے جس کے ساتھ وہ انصاف نہیں کر سکتا۔ موضوعات کے انتخاب میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کیوں کہ جتنے اچھے موضوع تھے ان پر کام ہو چکا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں موضوعات کی تنگی ہے۔ جب موضوع بہتر اور دلچسپ نیز منفرد نہیں ہوگا تو پھر پی ایچ ڈی ویسی ہی ہوگی اور اگر کتاب منظر عام پر آئی تو قارئین کہاں سے ملیں گے۔ دوسری طرف گائیڈ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔

ریاستِ مغربی بنگال میں یو جی سی قانون کے تحت پی ایچ ڈی کرانے کے اہل گائیڈ کی کمی دوسری ریاستوں کے مقابلے کچھ زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی، وشوا بھارتی یونیورسٹی، بردوان یونیورسٹی اور عالیہ یونیورسٹی سے ریسرچ کرنے والوں کی تعداد کم ہے کیونکہ گائیڈ کی کمی کی وجہ سے سیٹیں محدود ہیں اور جو لوگ خوش قسمتی سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں ان کا وقت دراز ہوتا جاتا ہے۔ اس مایوس کن صورتِ حال میں ریاست کے ریسرچ ورک کے خواہش مند افراد پڑوسی ریاستوں کا رُخ کرتے ہیں جہاں نہ صرف لائق و فائق، فعال اور جذبۂ تعاون سے سرشار اساتذہ موجود ہیں بلکہ ان کی فعالیت اور کام کرانے کی لگن کی وجہ سے غیر ضروری وقت کا زیاں نہیں ہوتا۔

اس مختصر مضمون میں اردو تحقیق کی موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے ایک اور خاص بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ یو جی سی قانون کے تحت ایک قید لگائی گئی ہے کہ جو ریسرچ اسکالر ہوں گے وہ اپنے موضوع کے تعلق سے کم از کم دو تحقیقی مضامین شائع کروائیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ رسالہ یو جی سی کی طرف سے رجسٹرڈ ہو۔ ریسرچ اسکالرس کو سیمینار میں مقالہ پڑھنا یا پھر اس میں شرکت کرنا بھی ضروری ہے۔ اقربا پروری زوروں پر ہے۔ خلوص اور ایمانداری نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق مغربی بنگال میں ملک کی دوسری ریاستوں کی بہ نسبت تحقیقی کام کی رفتار نہ صرف سست ہے بلکہ سیٹیں محدود ہونے کی وجہ سے تحقیق و تدوین کا ماحول ناسازگار ہے جبکہ دوسری ریاستوں میں اس کی رفتار کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف موضوعات پر وہاں تحقیقی کتابوں کا منظر عام

پڑنا معمول کی بات ہے۔ تحقیق وتدوین کے باب میں مغربی بنگال کی درس گاہوں کو اپنے رویے میں تبدیلی لانے نیز ریسرچ کے ضمن میں طلبہ کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ تبھی اپنی ریاست مغربی بنگال میں تحقیقی رجحان میں اضافے کی امید کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی صرف اپنے یہاں اردو میں پی ایچ ڈی کرانے کی اجازت دیتی ہے لیکن ان کے تحت چلنے والے کالجوں کو پی ایچ ڈی کرانے کی اجازت نہیں دیتی جبکہ بیرون ریاست ایسی بات نہیں ہے بلکہ وہاں کالجوں کے اساتذہ جن کے پاس پانچ سال کا تدریسی تجربہ ہوتا ہے وہ ریسرچ کرانے کے اہل ہیں۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے اپنے فعال کارگزار وائس چیئرمین سید محمد شہاب الدین حیدر، ڈاکٹر دبیر احمد، ڈاکٹر عمر غزالی اور سکریٹری محترمہ نزہت زینب نیز دوسرے سرگرم اراکین کی خدمات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تحقیقی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر کے ریسرچ ورک کی کمی کو پاٹنے کی کوشش کی ہے مگر اکاڈمی کو کتابوں کی اشاعت میں اس کے معیار پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بالخصوص ریاستِ مغربی بنگال کی یونیورسٹیوں نیز مجموعی طور پر ہندستان کی درس گاہوں میں اردو تحقیق کی موجودہ صورتِ حال مایوس کن ہے۔

....

● 1/85A، دلکشا اسٹریٹ، کولکاتا۔ 700017 (Mob: 7278415695)

قیوم بدر

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی!

داڑھی اور مونچھ پر پورا پورا اختیار مردوں کا ہے۔ عورتوں کا ان سے دور کا بھی علاقہ نہیں سچ پوچھیں تو داڑھی اور مونچھ عورت و مرد کے درمیان خط فاصل کا درجہ رکھتی ہیں تاہم کچھ لوگ ان سے یکسر عاری ہوتے ہیں جس کے سبب ان کی جنس مشکوک ہو جاتی ہے۔

بہر کیف! چہرے پر داڑھی اور مونچھ جمانا اپنے اپنے مزاج پر منحصر ہے۔ مرزا غالب کے چہرے سے ٹوپی اور داڑھی کے سبب روحانیت ٹپکتی تھی لیکن وہ شراب کے رسیا تھے چنانچہ ولی نہ بن سکے لہٰذا اس پر انہوں نے تاسف کا اظہار کیا ہے:

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

برعکس ایں ہمہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کو مومن بلکہ مردِ مومن کہنا زیادہ بہتر لیکن حیرت انگیز طور پر ان کی داڑھی کے بجائے گھنی مونچھیں تھیں۔ ہمارے ایک عالم (کاغذی عالم) جو خیر سے مسجد کے امام بھی ہیں اپنی علمیت کا اظہار یوں کیا ہے۔ کہ اقبالؔ کو 'علامہ' کہنا سراسر غلط ہے ان کی داڑھی نہیں مونچھیں تھیں حالاں کہ 'علامہ' کوئی سند نہیں لقب ہے جو ان کی علمیت کے اعتراف میں قوم کی طرف سے ملا ہے۔ 'علامہ' کے معنی علم والا ہے۔ جن کے پاس فارسی، انگریزی اور فلسفہ کے علاوہ قانون کی سند بھی ہو وہ یقیناً علامہ کہلانے کا مستحق ہے۔ علاوہ ازیں سرکار انگلشیہ نے انہیں 'سر' اور علماء نے دین اور قرآن کے خداداد علم کے اعتراف میں ''رحمۃ اللہ علیہ'' کے خطاب سے نوازا ہے۔ ایسے میں یہ محاورہ سو فیصد صادق آتا ہے کہ ''میاں کی دوڑ مسجد تک'' شاید امام موصوف کے دل میں یہ بات ہو کہ علم پر صرف داڑھی والوں کا اختیار ہے مونچھ والوں کا نہیں حالاں کہ کسی مذہبی صحیفہ میں اس طرح کی تخصیص نہیں بقول شاعر: جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

حیرت اس بات کی ہے کہ امام صاحب کی نظر اقبال تک ہی محدود رہی۔ مشہور شاعر رضا علی وحشتؔ اور جمیلؔ مظہری کے علاوہ بہتوں کے نام کے ساتھ علامہ کا لاحقہ لگا ہوا ہے جن کی داڑھیاں نہیں تھیں۔ سچ مچ دکان داری کیلئے خوبصورت سائن بورڈ کا ہونا ضروری ہے لیکن اندر مال کی کوالیٹی بھی اچھی ہونی چاہئے ورنہ دکان کا دیوالیہ یقینی ہے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کی مونچھوں پر یہ پہلا اعتراض نہیں۔ اقبالؔ کے ایک واقعہ کا ذکر بھی کرتا چلوں کہ سیالکوٹ میں ایک مولانا ان کے دوست ہوا کرتے تھے۔ روز کا ملنا جلنا تھا۔ ایک دن مولانا نے اقبالؔ کو مخاطب کر کے کہا بھئی آپ کو متعدد مضامین کے علاوہ دین اور قرآن پر بھی دسترس حاصل ہے جس کا شہرہ چہار دانگ عالم میں ہے جس کے سبب بلاشبہ آپ ملک و بیرون ملک کے عالموں میں بہتوں پر بھاری ہیں ایسے میں آپ کو مونچھ کی بجائے داڑھی رکھ لینی چاہیے۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے پاس مختلف ڈگریوں کے علاوہ قانون کی سند بھی تھی نیز اسلامی لاء سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ باپ کی وراثت میں بیٹی کا حصہ بھی نکلتا ہے۔ پہلے آپ کی اپنی جائداد میں سے اپنی بہن کا حق ادا کر دیجیے میں داڑھی رکھ لوں گا۔ اقبال نے آگے لکھا ہے کہ مولانا سے یہ نہ ہو سکا اور میں نے داڑھی نہیں رکھی۔

اردو شعراء میں اقبال کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کے اشعار ہر مکتبۂ فکر کے دانشور خصوصاً پیشہ ور مقرر خطیب و امام اپنی تقریر میں گرمی پیدہ کرنے کی خاطر استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہیں کچھ ان کے اس شعر کے سبب خار کھائے رہتے ہیں۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
یہ کیا سمجھیں گے بیچارے دو رکعت کے امام

داڑھی اور مونچھ کلی طور پر ایک آدمی کا نجی معاملہ ہے۔ اسی طرح زبان و دین کا معاملہ بھی ہے۔ کچھ جیالے ایسے بھی ہیں جو تمام حد بندیوں کو توڑ کر اپنی زبان اور مذہب کے علاوہ دوسری زبان حتیٰ کہ دین پر بھی دسترس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ احترام بھی کرتے ہیں گو وہ اہل ایمان نہیں، انہی ہستیوں میں آنجہانی ہیرالعل چوپڑا بھی تھے۔ وہ محض بیس بائیس برس قبل مشہور زمانہ درسگاہ کلکتہ یونیورسیٹی میں شعبۂ عربی کے صدر تھے۔ ظاہر ہے آنجہانی نہ صرف عربی زبان بلکہ قرآن کی باریکیوں کے علاوہ دین کے شناور بھی تھے۔ چند آیات چند احادیث ان کا سرمایہ نہیں تھا گو ان کی بھی داڑھی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اہل ایمان تھے لہٰذا اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ:

پیڑ جنگل میں بھی اگتا ہے تو پھل دیتا ہے

اس تناظر میں انشاء اللہ انشاء کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے کہ:

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

بہر کیف! کچھ لوگوں کو خواہ مخواہ عیب جوئی کی لت ہوتی ہے۔ کسی کو مونچھ پر اعتراض ہے تو کوئی اپنی فطرت کی تسکین کی خاطر داڑھی میں بھی تنکا تلاش کر لیتا ہے۔ چنانچہ میں نے سرے سے داڑھی ہی نہیں رکھی۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی طرح تو نہیں بلکی پھلکی مونچھ ضرور رکھ لی ہے تاکہ مردانگی کا بھرم قائم رہے اور کسی کو میری جنس سے متعلق مغالطہ نہ ہو۔

....

● جگتدل، شمالی چوبیس پرگنہ (مغربی بنگال)

●ڈاکٹر زبیر عالم عرف لال بابو (سابق ہیڈ ماسٹر، بی بی پاکر مڈل اسکول، دربھنگہ عمر تقریباً ۸۵ ربرس مقام ہرواره، دربھنگہ) کا ۱۰ رمئی ۲۰۱۹ء کو طویل علالت کے بعد ان کی رہائش گاہ چک رحمت بھگو (دربھنگہ) میں بوقت نمازِ مغرب انتقال ہو گیا۔ ۱۱ رمئی ۲۰۱۹ء کو تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ ۲ ربیٹے بدر عالم اور خورشید عالم سماجی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ مرحوم ہومیو پیتھک معالج بھی تھے نیز انھوں نے فارسی میں پی ایچ ڈی کی سند بھی حاصل کی تھی۔

رئیس صدیقی

آج کا غریب ووٹر

بانو آج صبح بھی دیر سے آئی۔

ثمینہ بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے؟ آج کل تم دو تین مہینے سے جب دل چاہتا ہے تب لیٹ ہو جاتی ہو۔''

بانو بولی'' باجی، چناؤ ہونے والے ہیں۔ نیتاؤں کے جلسے جلوس ہوتے رہتے ہیں۔ باہر سے بھی نیتا آتے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں ہم جیسے لوگوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ آج کل ہم لوگوں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔''

ثمینہ نے حیرت سے پوچھا'' اُن کو تم لوگوں کی کیا ضرورت پڑتی ہے؟''

'' باجی ہم لوگ بڑے کام کے ہیں ان نیتاؤں کے لئے۔ بانو نے اپنی اہمیت بتائی۔

'' وہ کیسے؟'' ثمینہ کی رگِ جستجو بھڑ کی۔

'' باجی! جب کوئی نیتا آتا ہے تب ہم جھنڈا لے کر سڑک کنارے کھڑے ہو کر نعرہ لگاتے ہیں۔ جے جے کرتے ہیں۔ جب وہ میدان میں بھاشن دیتے ہیں، تب ہم جھنڈا پکڑے رہتے ہیں یا بھیڑ میں بیٹھ کر نیتا جی کا نام لے کر نعرہ لگاتے رہتے ہیں۔''

بانو نے اپنا کام بتایا۔'' اِس سے تم کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟'' ثمینہ نے پوچھا۔

'' باجی! ہمیں کبھی تین سو، کبھی چار سو تو کبھی پانچ سو روپے ملتے ہیں۔ جب دیر ہو جاتی ہے تو پوڑی سبزی اور حلوہ بھی کھانے کو ملتا ہے۔'' بانو نے فائدے گنائے۔

'' انہیں معلوم رہتا ہے کہ تمہارا نام بانو ہے!'' ثمینہ نے اشاروں میں جاننا چاہا۔

بانو نے اترا کر بتایا۔'' ہاں باجی، وہ سب جانتے ہیں۔ انہیں تو سب کو بتانا ہوتا ہے کہ ہم کون ہیں؟''

تو اس کا مطلب تم اُن ہی لوگوں کو ووٹ دو گی جو تم لوگوں کو پیسے دیتے ہیں۔'' ثمینہ نے دل کی بات جاننی چاہی۔

بانو نے بڑے اعتماد سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔'' نہیں باجی۔ ہم بے وقوف تھوڑی ہیں۔ ہم سمجھ دار ہیں۔ ہم اپنا ووٹ اس کو دیں گے جو گھمنڈی نہ ہو۔ جو ہم غریبوں کا خیال رکھے۔ جو ہم سب کا سچ مچ خیال رکھے۔ صرف نعرہ نہ لگائے۔ بھاشن نہ دے۔ بھاشن اور وعدہ سنتے سنتے بھیجا پک گیا ہے!''

● ۲، راحت کدہ، ۱۴- گرین ویلی انکلیو، ایئر پورٹ روڈ، بھوپال-۴۶۲۰۳۰ (مدھیہ پردیش)

نقشبند قمر نقوی بخاری

موتی

میں نے کالج سے واپس آ کر لباس تبدیل کیا اور فیملی روم میں آیا، جہاں کونے میں ایک جانب ایک شاداب اور گنجان درخت گملے میں لگا کمرے کی زینت بڑھاتا تھا، سرسبز و شاداب پودے گھر کے باہر تو خوبصورت معلوم ہوتے ہی ہیں، لیکن ایسے بھی پودے ہوتے ہیں جو گھر کے اندر سائے میں بھی زندہ رہتے ہیں، اور گھر کی زینت و رونق میں اضافہ بھی کرتے ہیں، اور کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کر کے آکسیجن پھیلاتے رہتے ہیں۔

''موتی......'' میں نے پکارا

اور ''موتی'' پھر سے درخت کی کسی شاخ سے نکلا اور اڑ کر میرے شانے پر آ بیٹھا۔ میں نے اس کو بہت پیار سے پکڑ کر ہاتھ پر بٹھا لیا، سہلایا، اس کے نرم و رنگین پروں پر ہاتھ پھیرتا رہا، اس کا سر سہلایا، پیار کیا، اور میز پر سامنے بٹھا لیا، موتی بہت خوش تھا، اس کی لانبی گردن کے گرد سرخ طوق، سر پر خوبصورت کلغی، لانبی سی سیاہ چونچ، اور نہایت نرم و رنگین پروں سے ملبوس جسم، بہت پیارا اور دلکش تھا۔

''موتی... تم نے دانہ پانی کھایا پیا......؟''

موتی نے جواب تو کوئی نہیں دیا، البتہ سر گھما کر میری طرف دیکھا، شاید یہ بات مشکل سے ہی یقین آئے، لیکن حقیقت ہے، اس ننھی چڑیا کی آنکھوں میں شفقت اور محبت کے جذبات میں واضح طور سے دیکھ سکتا تھا۔ صرف انسان کی آنکھیں ہی اس کے جذبات کی عکاسی نہیں کرتیں، جانوروں کی آنکھوں مین بھی ان کے دلی جذبات جھلکتے ہیں۔ توجہ کے ساتھ دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ملازم نے میرے سامنے شربت سے پُر ایک رنگین گلاس رکھ دیا، ساتھ ایک طشتری اور ننھی سی چمچی، میں نے چمچی میں شربت لے کر طشتری میں ڈالا......

''لو... شربت پی لو موتی...''

موتی نے بڑھ کر طشتری میں چونچ ڈالی اور جیسے شربت کا ایک گھونٹ لیا، جب تک میں وہاں بیٹھ کر شربت پیتا رہا، تب تک موتی بھی ٹھہر ٹھہر کر شربت میں چونچ ڈبوتا اور پیتا رہا، اس کو یہ شربت بہت پسند تھا، جب شربت ختم ہو گیا تو موتی نے چونچ میری طرف بلند کر کے چہچہانا شروع کیا، نجانے وہ کیا کہہ رہا تھا۔

حضرت سلیمانؑ تو جانوروں اور پرندوں کی بولی جانتے اور ان سے گفت و شنید فرما لیتے تھے، قرآن پاک میں ان کا ہدہد سے بات کرنے کا تذکرہ ہے۔ چیونٹیوں کی بات سمجھنے کا ذکر بھی ہے، لیکن میں اس بلبل ہزار داستان کی بات سمجھ تو نہیں سکتا تھا، صرف قیاس ہی کر سکتا تھا۔

مجھے یقین ہے موتی، مجھ سے اپنی سارے دن کی روداد کہہ رہا ہوگا، وہ ہمیشہ مجھ سے بہت باتیں کرتا تھا، اس کی آواز بہت دلکش تھی، جب وہ چہچہاتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے نہایت ملائم اور دل میں اتر جانے والی آواز سے وہ ایک

محبت بھری غزل سنا رہا ہو، یہ نغمہ آفرینی وہ صرف میرے ہی ساتھ نہیں، بلکہ میری محترمہ و معظمہ والدہ صاحبہ کے ساتھ بھی کرتا تھا، کبھی کبھی میری بہنوں سے بھی دیر تک اسی طرح بات کرتا...... میں اس کی چہچہاہٹ سنتا اور مسکراتے ہوئے کبھی 'اچھا' کبھی 'ہاں' کہتا رہتا، شاید وہ خوبصورت پرندہ یقین کر لیتا ہوگا کہ میں نے اس کی بات سمجھ لی ہے۔

موتی...... گھر کے سبھی لوگوں کا عزیز پرندہ تھا۔

کمرے کی ایک کھڑکی موتی کے خیال سے ہی کھلی رہتی تھی، جب اس کا دل چاہتا، موتی پھُر سے اڑ کر کھڑکی کی دہلیز پر جا بیٹھتا، اور ایک لمحہ دیکھ بھال کرنے کے بعد اڑ کر باہر کی کھلی فضا میں پرواز کر جاتا، گھنٹوں غائب رہتا، لیکن سیر تفریح کے بعد یکبارگی ہی کھڑکی کی چوکھٹ پر نمودار ہوتا، ایک لمحہ کمرے کا جائزہ لیتا، اگر محترمہ خالہ جان یا کوئی اور آس پاس ہوتا تو اڑ کر ان کے شانے پر جا بیٹھتا، ذرا دیر ان سے باتیں کرتا رہتا، پھر اڑ کر میز پر جاتا جہاں ایک سفید چینی کی طشتری میں اس کے لئے ضیافت کا سامان رکھا ہوتا تھا، وہ حسب مرضی جو چاہتا کھاتا اور اڑ کر کونے میں گملے میں لگے درخت کی کسی شاخ پر بیٹھ کر ذرا دیر کوئی راگ الاپتا، پھر شاید آرام کرتا۔

ایک شام تو موتی نے کمال کر دیا...... ہم سب ساتھ کے کمرے میں بیٹھے تھے، خالو جان، خالہ جان، میرے دو عدد خالہ زاد بھائی جو اس وقت چھوٹے تھے...عزیز اور رفیق...اور میں...... موتی دوسرے کمرے میں تھا، وہ وہاں سے اڑا اور سیدھا آ کر خالو جان کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا اور چونچ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ خالو جان قبلہ مسکرائے۔

''موتی...آؤ...'' انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور موتی اچک کر ان کے ہاتھ پر آ بیٹھا، انہوں نے اس کو پیار کیا... موتی ان کے ساتھ ضرور مذاق کرتا تھا، اس نے چونچ ان کی داڑھی میں ڈال کر سر کو ہلایا، جیسے کھجلا رہا ہو، خالو جان ہنسے، ان کو موتی کی یہ حرکت اچھی لگتی تھی۔

موتی ہم سب کا پیارا تھا، اور ہم سب موتی کو پیارے تھے۔ وہ جیسے ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا تھا، کبھی کبھی وہ باہر جاتا، اور واپسی میں دیر ہو جاتی تو سب کو فکر ہوتی...... موتی ابھی تک نہیں آیا...... اور اسی وقت موتی کہیں سے وارد ہوتا اور کھڑکی کی دہلیز پر اس کا دلکش سراپا نظر آ جاتا، جہاں سے وہ اڑ کر سیدھا میز پر جاتا اور کچھ نہ کچھ کھاتا، پانی پیتا پھر ذرا دیر اپنا راگ الاپتا، اس کے آنے سے جیسے گھر آباد ہو جاتا تھا۔

موتی ہمارے گھر کی رونق بن گیا تھا۔ اس خاندان کا ایک ممتاز فرد تھا۔ لاکھ ننھا سا پرندہ سہی، لیکن اس کی اپنی ایک انفرادیت تھی، ایک حیثیت تھی، جو اس نے اپنی محبت، نغمہ نوائی، اور یگانگت سے حاصل کی تھی۔

محبت بھی عجیب جذبہ ہے، جو انسانوں میں ہی محدود نہیں، جانور بھی اس سے سرفراز ہیں۔ محبت ایسی فاتح قلوب ہے کہ جس دل میں گھر کر لے اس کو ماہ تاباں بنا دیتی ہے۔

موتی کی کہانی یہ تھی، کہ ایک دن میں شکار سے واپس ہوتے ہوئے ایک درخت کے نیچے سے گذر رہا تھا، ایک بار زمین پر نظر پڑی تو نرم گھاس میں چڑیا کا ایک ننھا سا بچہ پڑا چوں چوں کر رہا تھا، میں اس کو اٹھا لیا...گرم گرم گوشت کا ایک لوتھڑا سا تھا، ابھی اس کے جسم پر روئیں بھی نہیں نکلے تھے، شاید آنکھیں بھی ایک آدھ دن پہلے ہی کھلی تھیں، میں نے اس کو ہتھیلی پر رکھ کر دیکھا، شاید وہ بھوکا بھی تھا، اس لئے کہ اس کا اونڈا تو خالی تھا۔

وہ چونچ اونچی کر کے چوں چوں کرنے لگا، شاید کھانے کو مانگ رہا تھا۔ میں نے درخت کی شاخ کی طرف دیکھا، مجھے گھونسلہ تو نظر نہیں آیا، لیکن درخت پر سناٹا تھا۔۔نجانے اس کے ماں باپ کہاں گئے؟ اور اپنے بچے کو کھلانا پلانا کیوں بھول گئے؟ جب تک کوئی افتاد نہ پڑتے تب تک ماں باپ اپنے بچوں کو بھولتے نہیں، خواہ پرندے ہوں خواہ انسان!

میں نے یہ بھی سوچا، کیا اس کے گھونسلے میں یہی اکیلا بچہ تھا؟ میں کیا کرتا، میں شاخ کو دیکھتا تو رہا لیکن مجھے اوپر کوئی گھونسلہ نظر نہیں آیا۔۔۔ادھر بچہ تھا کہ میری طرف چونچ اٹھا کر کھانے کو مانگ رہا تھا...... میرے بیگ میں بسکٹ بھی تھے اور بہت سے کاجو، پستے اور کشمش بھی، بچے کو دیکھ کر مجھے شبہ سا ہوا کہ وہ بلبل کا بچہ ہے، لیکن ابھی اس کے روئیں نہیں آئے تھے، صحیح نہیں کہا جا سکتا تھا۔

بلبل...... پھل، مختلف اقسام کے بیج، پھول، کلیاں، اور دانہ دنکا کھاتا ہے، کیڑے مکوڑے بھی کھا لیتا ہے۔ نزدیک ہی چرونجی کی جھاڑیاں تھیں، میں نے سوچا چرونجی اس کے لئے بہترین ہوگی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے لئے کیا چیز بہتر ہوگی...... میں نے چرونجی کے پھل ہی توڑے اور ان کو چھلکے سے نکال کر دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا بچے کی چونچ میں رکھا وہ نگل گیا، اور دوبارہ چونچ کھول کر چوں چوں کی، میں ایک اور ٹکڑا کھلا دیا، البتہ مجھے فکر رہی کہیں یہ اس کو نقصان نہ کرے۔ پانی کی بوتل سے اس کے منہ میں ایک قطرہ پانی بھی ٹپکایا، اس کے باوجود اس کا اوٹڈا تو اب بھی خالی ہی تھا۔ میں نے دو تین کشمش کے دانے نکال کر ان کے ننھے ننھے دو تین ٹکڑے اس کو کھلائے، چند چرونجی اور دیئے، اب اس کے اوٹڈے میں کچھ غذا معلوم ہونے لگی۔

میں نے سوچا اب اس کا کیا کروں؟ اس کے ماں باپ نظر آ جاتے تو میں ضرور گھونسلہ بھی ڈھونڈتا اور بچے کو اس میں رکھ دیتا، یوں ہی زمین پر ڈال دینا بھی نامناسب تھا، بیچارہ ذرا دیر میں ہی مر جاتا، یا کوئی جانور کھا لیتا۔

میں نے اس کو مزید دو چار دانے چرونجی، پانچ چھ ٹکڑے کشمش کھلائی، ذرا سا پانی اس کی چونچ میں ٹپکایا، اب اس کے اوٹڈے میں غذا کی ایک مقدار جمع ہوگئی، اور بچے نے چوں چوں کرنا بھی کم کر دیا، میرے بیگ میں اضافی جرابیں تھیں، میں نے ایک نکال کر بچے کو اس میں رکھ دیا اور بات میں لگا لیا...... آدھے گھنٹے بعد میں نے اس کو نکال کر پھر وہی چرونجی دانے اور کشمش کے چند ٹکڑے کھلائے اور پانی کے چند قطرے دیئے۔ وہ بچہ بخیریت گھر پہنچ ہی گیا۔

''بیٹا! تم اس کو کیوں لے آئے...اس کے ماں باپ روئیں گے...'' خالہ جان نے کہا۔

''نہیں خالہ جان...اگر ماں باپ نظر آ جاتے تو میں ضرور اس کا گھونسلہ تلاش کر کے اس میں رکھ دیتا۔''

سب نے اس کا جائزہ لیا، سبھی کو اس سے دلچسپی ہوگئی، اور سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ بلبل کا بچہ ہے۔ اور اس کو بہ آسانی پالا جا سکتا ہے، چنانچہ اب اس کی دیکھ بھال سارے خاندان نے اپنے سر لے لی...... جب وہ چونچ پھیلا کر چوں چوں کرتا تب اس کو امرود کا نرم گودا، چنے کی ابلی دال کے دانے، انگور کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، اسی قسم کی غذائیں دی جانے لگیں اور وہ بچہ نہایت تیزی سے پر پرزے نکالنے لگا۔ لیکن اس حالت میں وہ بہت ہی کریہہ المنظر نظر آتا تھا، تاہم وہ ہم سب سے مانوس ہو گیا، شاید وہ ہمیں کو اپنا ماں باپ سمجھتا ہو......

اب یہ ہوا کہ میری بہنیں اس کو کھانے کی میز پر رکھ دیتیں اور بلاتیں تو وہ اپنی ننھی ننھی ٹانگوں سے اچھلتا ہوا ان کے پاس آتا اور وہ اس کو کسی چیز کا ایک دانہ کھلاتیں، وہ اپنے پر پھیلا کر اور جھٹک کر اپنی خوشی کا اظہار کرتا اور چوں چوں کر کے شاید کوئی راگ الاپتا تھا۔

میری خالہ جان نے اس کا نام ''موتی'' رکھا...... ہم سب کو یہ نام بہت پسند آیا۔

کھانے کی میز پر ہی موتی کے لئے ایک چھوٹی سی میٹ بچھا کر اس پر دو چینی کی پیالیاں رکھی گئیں، ایک میں اس کے لئے کا کن، ساتھ انگور کے دانے، چرونجی اور کشمش رکھی رہتیں، چوسری میں پانی۔ موتی کو ہم نے پنجرے میں کبھی نہیں رکھا، بڑے ہال کے ایک کونے میں ایک تزئینی درخت تھا، جو چار پانچ فٹ بلند اور خوب شاداب اور گھنا تھا۔ میں نے موتی کو ایک شام اس درخت کی ایک شاخ پر بٹھا دیا۔ ایک دو دن اس کو اسی طرح شام کو شاخ پر بٹھایا گیا تو اس کو معلوم ہو گیا کہ یہی اس کا اڈہ ہے، پھر تو وہ جب کھاپی کر ہم لوگوں سے خوب کھیل کر تھک جاتا تو اُڑ کر درخت کی اس شاخ پر جا بیٹھتا اور آنکھیں بند کر کے سو جاتا، کبھی کبھی سر گھما کر اپنی چونچ اپنے پروں میں چھپا لیتا، اور دیر تک سویا رہتا۔

ایک دن میں نے سوچا، موتی بیچارہ گھر میں قید ہے، جنگل میں رہنے والا پرندہ اس کو کھلی فضا بھی تو چاہئے، میں نے اس کو اپنے ہاتھ پر بٹھایا اور گھر سے باہر لایا، ساتھ ہی املی کا ایک درخت تھا، میں نے موتی سے کہا......

''موتی...... جاؤ تفریح کرو، خوب اڑو...... پھر آ جانا...''

اور ہاتھ اٹھا دیا تو موتی پُھر سے اڑ کر درخت پر گیا، وہاں کچھ دیر بیٹھا اطراف کا جائزہ لیتا رہا پھر اڑ کر ایک طرف چلا گیا...... میں دیر تک کھڑا دیکھتا رہا، مجھے گمان تھا اب موتی گیا، اب نہیں آئے گا... میں گھر میں آ گیا... لیکن کمرے کی وہ کھڑکی جو باہر کی طرف املی کے درخت کی جانب تھی کھلی رکھی۔ اس امید پر کہ شاید موتی واپس آئے۔

کئی گھنٹے گذر گئے، سہ پہر سے وقت گذر کر شام کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں اپنے کمرے میں تھا، ایک بار خیال آیا نجانے موتی کہاں گیا ہوگا، میں اٹھ کر بڑے کمرے میں آیا کھڑکی کی چوکھٹ پر موتی بیٹھا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔

''موتی......'' میں نے اس کو آواز دی ''تم آ گئے... آ جاؤ...''

وہ اڑا اور سیدھا میرے شانے پر آ کر بیٹھا، اور دیر تک چہچہا کر اس نے شاید اپنی تفریح کی ساری روداد کہہ سنائی۔ میں چل کر کھانے کی میز تک آیا اور موتی کو ہاتھ میں پکڑ کر میز پر رکھ دیا...

''موتی... کھانا کھالو، تم بھوکے ہو گے...'' موتی بڑھ کر اپنی پیالی کے پاس گیا اور ایک ایک دانہ کھانے لگا۔

شام تو ہو ہی رہی تھی، وہ کھاپی کر کونے والے درخت پر گیا اور اپنی مقررہ جگہ شاخ پر بیٹھ کر اپنے پروں کی نگہداشت میں مصروف ہو گیا، یہ گویا اس کے آرام اور اطمینان کا اظہار تھا۔

یہ سلسلہ بہت دن جاری رہا، موتی کھاپی کر دو پہر سے پہلے کھڑکی سے نکل کر املی کے درخت پر جا بیٹھتا، پھر وہاں سے اڑ کر کسی طرف چلا جاتا... سارا دن غائب رہتا لیکن شام کو واپس پہلے املی پر آتا، دو چار منٹ دیکھ بھال کر کھڑکی کی چوکھٹ پر اترتا، پھر اڑ کر میز پر جاتا، جہاں اس کے کھانے کا سامان موجود ہوتا۔ رات گھر میں ہی بسر کرتا تھا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ وہ دو روز تک واپس گھر نہیں آیا، میں نے اور خالہ جان نے یہی سوچا کہ بس اب وہ گیا، یا ممکن ہے کسی شکرے یا باز نے دبوچ لیا ہو۔ تیسرے دن سہ پہر کو اچانک ہی موتی کھڑکی کی چوکھٹ پر نمودار ہوا، اور فوراً اڑ کر میز پر گیا جہاں اس کی خوراک موجود تھی۔ کھا پی کر وہ بیٹھا تو میں نے اس کو پکڑ کر شانے پر بٹھا لیا، وہ دیر تک خوب ہی چہچہاتا رہا، نجانے کیا کہہ رہا ہوگا...... شاید اپنی سیاحت کی روداد سنا رہا ہو۔

اگلے دن میں تو صبح کالج چلا گیا تھا، خالہ جان نے بتایا کہ موتی صبح ہی نکل گیا تھا...... تین دن وہ نہیں آیا، چوتھے دن آیا تو اس کے ساتھ ایک اور بلبل بھی تھا... یا... تھی۔ دونوں کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھے رہے، موتی کچھ چوں چاں کرتا رہا۔ شاید اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہو... آجاؤ کوئی خطرہ نہیں... اپنا ہی گھر ہے... پھر موتی تو میز پر آ گیا، ساتھی نہیں آیا بلکہ اڑ کر املی کے درخت پر جا بیٹھا... مجبوراً موتی بھی کھانے پینے کے بعد اس کے پاس ہی چلا گیا۔ میں سہ پہر کو کالج سے آیا تو خالہ جان نے یہ قصہ سنایا، میں نے کھڑکی کے پاس آکر دو تین آوازیں دیں...... ایک بار ہی موتی درخت سے اڑ کر کھڑکی میں آیا، پھر اڑ کر میرے شانے پر آ بیٹھا......

''موتی...... تمہارا ساتھی کہاں گیا......؟''

میں نے موتی کو پیار کیا، سر سہلایا، اس کے پروں پر ہاتھ پھیرتا رہا اور وہ بہت ہی آہستگی اور نرمی کے ساتھ ایک دو چوں چاں کر کے شاید اپنی خوشنودی کا اظہار کرتا رہا، پھر اڑ کر املی کے درخت پر چلا گیا۔ اس رات شاید وہ املی کے درخت پر رہا۔ دو تین دن یہی ہوتا رہا، وہ دن میں کسی نہ کسی وقت آتا، کبھی میں موجود ہوتا تو اس سے کھیلتا، باتیں کرتا اور وہ بھی خوب چہچہاتا، لیکن اس کا ساتھی گھر میں نہیں آتا تھا... پھر وہ کھیل کود کر اور کھا پی کر املی کے درخت میں جا بیٹھتا، درخت گھنا تھا، مجھے اس میں نہ موتی نظر آتا نہ اس کا ساتھی۔

ایک دن خالہ جان نے بتایا، وہ اپنے ساتھی کو لے کر آیا، لیکن ساتھی گھر کے اندر نہیں آیا، کھڑکی کی چوکھٹ پر ہی بیٹھا رہا، موتی نے اندر آ کر میز پر اپنی جگہ کھانا پینا کیا، ذرا دیر خالہ جان کے شانے پر بیٹھ کر ان کے بالوں سے کھیلا، اس کا ساتھی کھڑکی کی چوکھٹ پر ہی بیٹھا رہا، آخر موتی اڑا اور دونوں ساتھ ہی املی کے پیڑ پر جا بیٹھے۔

یہ موتی کا آخری دیدار تھا...... اس دن کے بعد موتی نہیں آیا...... میں نے دو تین دن شام کو کھڑکی کے پاس جا کر سر باہر نکال کر اس کو آوازیں دیں، ایک دن باہر جا کر املی کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس کو پکارا، لیکن وہ اس پر موجود نہیں تھا......

موتی اس گھر میں ایک زندہ کھلونا تھا... اور ہم سب کو اس سے بہت محبت ہوگئی تھی، اس کے گھر نہ آنے سے کئی دن ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے گھر کا ایک فرد واپس نہیں آیا...... جیسے گھر میں اس کی جگہ خالی ہو!

میں کئی دن کمرے کے کونے میں رکھے اس درخت کے گملے کے پاس جا کر کھڑا ہوتا رہا جس پر میرا موتی رات بسر کرتا تھا... موتی میرا دوست تھا...... اور میں ہر بار غمگین ہو جاتا تھا! نجانے کیوں!

....

● ۹۴۴۶-ایس، انڈین پولس پلیس، ٹلسا، او کے-۶۱۳۶-۷۴ (امریکہ)

انجم عظیم آبادی (کولکاتا)

اب وقت نہیں رہا

(منی کہانی)

وہ آخر کب تک برداشت کرتی۔ تنگ دستی کے سائے، بچوں کا تاریک مستقبل، پڑوسیوں کے حقارت آمیز جملے، کھانے پینے کی کمی، عید بقرعید پھیکی، سیر و تفریح کے لطف سے نا آشنا، چھوٹا سا گھر وہ بھی کرائے کا، میاں تو اپنی ہی دھن میں مگن رہتے۔ صبح تا شام نہ جانے کتنے انہیں پکارنے آتے کبھی ان سے ملاقات ہوتی، کبھی ان میں سے آنے والا ملاقات نہ ہونے پر لفافہ دے کر چلا جاتا اور وہ جلتی بھنتی رہتی لیکن میاں تھے کہ وہ ان لفافوں کو پا کر پھولے نہیں سماتے اور پھر حکم صادر فرماتے کہ بیگم دیکھو فلاں تاریخ کو مشاعرہ ہے، کپڑوں پر استری کرا دینا۔

یہ سب باتیں تو وہ اس وقت سے سنتی آئی تھی جب اس کے گھنے بال کمر تک پہنچتے تھے اب تو زندگی کی طرح وہ بھی مختصر ہو گئے تھے اور آج بھی وہ انہی باتوں کو سن رہی تھی۔ شروع میں اسے یہ امید تھی کہ اگر ان کا نام روشن ہو گیا تو شاید اس وسیلے سے ہی برے دن بھلے دن میں بدل جائیں لیکن اب یہ امید بھی جاتی رہی۔ آج مدتوں کی جھلاہٹ اس وقت آتش فشاں کی شکل اختیار کر گئی جب اس کے میاں نے حسب معمول ایک مشاعرے کی تاریخ بتا کر پھر وہی کپڑوں کو تیار رکھنے کی ہدایت کی۔ مشاعرہ مشاعرہ میں کہتی ہوں کہ آخر ان مشاعروں نے آپ کو دیا ہی کیا ہے۔ لوگ سب سے پہلے اپنے گھر، اپنی بیوی اور بچوں کی فکر کرتے ہیں۔ ان کے مستقبل کے لئے سوچتے ہیں۔ اور ایک آپ ہیں کہ جو کچھ سوچا اپنے لئے سوچا۔ کبھی گھر کی فکر نہیں کی۔ نہ بچوں پر دھیان دیا۔ آپ نے زندگی کا بڑا حصہ شاعری کی نذر کر دیا۔ اس کے بدلے میں جو کچھ آپ نے پایا میرا یا میرے بچوں کا اس سے کیا بھلا ہوا؟ میری کلائیاں تو تار جیسی سونے کی چوڑیوں سے بھی محروم رہیں۔ شادی میں آپ کے گھر یا میرے میکے سے جو زیورات ملے ناگہانی آفتوں اور مصیبتوں میں بکتے رہتے۔ ارد گرد دیکھتی ہوں اور اپنے گھر کو دیکھتی ہوں تو سب کے سامنے خود کو کمتر محسوس کرتی ہوں لیکن آپ کو اس سے کیا۔ یہ کہتے کہتے اس کی آواز رندھ سی گئی اور پھر اس میں مزید کچھ سننے کی تاب نہ رہی اور وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ کافی دیر تک پشتے پر بیٹھا رہا۔ خود پر سنگ ملامت پھینکتا رہا۔ آج سے واقعی اس کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ خود غرض ہے۔ اسے اپنی بیوی اور بچوں کے لئے پہلے سوچنا چاہئے تھا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس کے بالوں کی سفیدی جیسے کہہ رہی ہو کہ اب وقت نہیں رہا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر اس کے شل درست کئے اطمینان سے سلگائی اور ایک لمبا کش لیا اور گنگناتے ہوئے طرحی مشاعرے کی غزل کے لئے مصرعے سوچنے لگا۔

....

> ”اردو زبان دنیا کی چند بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس میں دوسری زبانوں اور تہذیبوں کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔“ (ادارہ)

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

Maulana Azad National Urdu University

(A Central University established by an Act of Parliament in 1998)

(Accredited with Grade 'A' by NAAC)

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

Admission Notification (2018-19) اعلان برائے داخلہ ۲۰۱۸۔۲۰۱۹

تعلیمی سال 2018-19 کے لیے نظامت فاصلاتی تعلیم کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مندرجہ ذیل فاصلاتی طریقہ تعلیم کے پروگراموں میں داخلے کے لیے آن لائن درخواستیں مطلوب ہیں:

پروگرام کا نام	میعاد	مسلمہ
ایم اے (اردو)، ایم اے (انگریزی)، ایم اے (تاریخ)، ایم اے (ہندی)، ایم اے (عربی)، ایم اے (اسلامک اسٹڈیز)	دو سالہ	یو جی سی، ڈی ای بی، نئی دہلی کے ذریعے منظور شدہ بحوالہ مکتوب F.1-6/2018 (DEB-1) مورخہ 9 راگست 2018
بی اے، بی کام، بی ایس سی (لائف سائنسز)، بی ایس سی (فزیکل سائنسز)	تین سالہ	

ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ پروگرام

پروگرام	میعاد
ڈپلوما ان ٹیچ انگلش	ایک سال
ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن	ایک سال
سرٹیفکیٹ کورس: اہلیت اردو بذریعہ انگریزی	چھ ماہی
سرٹیفکیٹ کورس: فنکشنل انگلش	چھ ماہی

ای پراسپکٹس اور آن لائن درخواست فارم 30 اگست 2018 سے یونیورسٹی ویب سائٹ http://manuu.ac.in/admissions/odl2018 پر دستیاب رہیں گے۔ درخواست 200 روپے کے رجسٹریشن فیس کے ساتھ آن لائن داخل کرنی ہوگی۔ امیدوار مزید تفصیلات کے لیے اسٹوڈنٹ سپورٹ سروسیز ہیلپ لائن 040-23008463 (راست) اور 23008404 (ایکسٹینشن 217) سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ حیدرآباد (شہر)، نئی دہلی، کولکاتا، بنگلور، ممبئی، پٹنہ، دربھنگہ (بہار)، بھوپال، رانچی، امراوتی، سری نگر (جموں و کشمیر)، جموں، لکھنؤ میں واقع یونیورسٹی کے ریجنل/سب ریجنل سنٹرس سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ رابطہ کی تفصیلات http://manuu.ac.in/admissions/odl2018/contactus سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

آن لائن درخواست فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ 30 ستمبر 2018 ہے۔

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

رجسٹرار

نظمیں

ابواللیث جاوید (نئی دہلی)

روشنائی

روشنائی/ ہاں! روشنائی
طباعت میں استعمال ہو تو
ساری دنیا میں علم کی روشنی
پھیلاتی ہے
اور اگر
چہرے پر پوت دی جائے/ تو
روسیاہی کا سبب
بن جاتی ہے
اس کا استعمال نہایت عقلمندی
نہایت ہوشیاری
اور احتیاط سے کریں!

انجم عظیم آبادی (کولکاتا)

اعتراف

اے مرے دوستو! محسنو! ساتھیو!
میں تو کچھ بھی نہ تھا
تم نے توقیر بخشی/ سراہا مجھے
داد و تحسین سے بھی نوازا مجھے
حوصلہ جب ملا/ شعری وجدان کے
پھول کھلتے گئے/ ہاں مضامین نو
مجھ کو ملتے گئے
آج جو کچھ بھی ہوں
مجھ کو احساس ہے
میری شہرت میں
حصہ تمہارا بھی ہے!

قطعات

حلیم صابرؔ (کولکاتا)

تمثیل نو (جولائی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء)

معیاری ماہنامہ ''تمثیل نو'' جو ہے
ہر پیشکش ہے اس کی تعمیری پیش رفت
تازہ شمارہ اس بار بھی ہے خوب
''اکیسویں صدی میں تنقیدی پیش رفت''

بہ شکریہ: ''اخبار مشرق'' کولکاتا، ۲۶ رمئی ۲۰۱۸ء

حلیم صابرؔ (کولکاتا)

تمثیل نو (جولائی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء)

کیوں نہ مسرور ہوں امامؔ اعظم
نخلِ امید ہے ثمر بردار
تازہ ''تمثیل نو'' ہوا جاری
ہے ضخامت وہی، وہی معیار

بہ شکریہ: روزنامہ ''آبشار'' کولکاتا، ۲۷ رمئی ۲۰۱۸ء

اچار یہ جمال احمد جمال [(مروئی والا) عرفات ہوٹل، کولکاتا]

انقلاب اک آگیا ہے مغربی بنگال میں

بیکس و مجبور کے دل میں محبت دیکھیے
آندھی بن کر آئی ممتا کی سیاست دیکھیے
ہوگئی ممتا بنرجی کی حکومت دیکھیے
پوری ہوگی اب یہاں سب کی ضرورت دیکھیے

تیرہ برسوں کی یہ کوشش رنگ لائی آج سے
ممتا کے سر چیف منسٹر کا حسیں اک تاج ہے

اب چمک اٹھے گا قسمت کا ستارہ ہر طرف
دیکھیے مزدور کے دل میں ہے ممتا ہر طرف
مفلس و نادار بھی پائیں گے رستہ ہر طرف
اب یہاں کوئی نہ ہوگا ننگا بھوکا ہر طرف

بند سارے کارخانے اب تو کھولے جائیں گے
شانتی اور امن کے پرچم یہاں لہرائیں گے

انقلاب ایسا ہے آیا صوبۂ بنگال میں
یہ زمیں کیا ہے کہ بھونچال آگیا پاتال میں
آج وہ سب پھنس گئے ہیں پھر سیاسی جال میں
کر رہے تھے قتل جو گذرے ہوئے احوال میں

بے کس و مجبور کی پیدا حمایت ہوگئی
ترنمول کی ہر طرف اک بادشاہت ہوگئی

گھور اندھیرے میں چراغ دل جلانے کے لئے
آیئے اک بار پھر ملنے ملانے کے لئے
ممتا کے دربار میں ہنسنے ہنسانے کے لئے
نغمۂ جمہوریت سننے سنانے کے لئے

تین رنگوں میں نہاں ہے قومی یکجہتی کا راز
اب سیاسی شاخ پر اُلّو نہیں بیٹھا ہے باز

پرچم حق و صداقت کو اٹھانے آگئی
ہر طرف ظلم و ستم کو یہ مٹانے آگئی
مغربی بنگال کو دل سے سجانے آگئی
بے کس و لاچار سے کاندھا ملانے آگئی

یہ دعا ہے عزم و ہمت حوصلہ قائم رہے
آبرو بڑھتی رہے وہ راستہ قائم رہے

لکشمی بائی کی صورت عزم و ہمت میں ہے آج
ٹیگور و نذرل کی دھرتی پر سیاست میں ہے آج
ممتا کا پیغام اُردو کی حمایت میں ہے آج
سونیا گاندھی و منموہن کی سنگت میں ہے آج

شیرنی بنگال کی ممتا بنرجی ہے جمالؔ
آنے والے دَور میں تم دیکھنا اس کا کمال

....

راز سیوانی، پرانا قلعہ (سیوان)، 9546575117

رباعیات

(ڈاکٹر ظفر کمالی کی نذر)

(۱)

سچائی کی تصویر وفا کی تصویر
تہذیب کے گلشن کی فضا کی تصویر
تصویر کے پیچھے کا ہے منظر کچھ اور
دیکھی ہے کہیں تازہ ہوا کی تصویر

(۲)

بادل کے تبسم کی ادا کی تصویر
دریائے ظرافت کی فضا کی تفسیر
خوش فکر خیالات کی پھلواری میں راز
ہر شاخ سخن پر ہے گھٹا کی تحریر

(۳)

پانی سے دھلا صاف ظفر ہے شاید
آئینہ شفاف ظفر ہے شاید
رکھتا ہے ادب پر وہ نگاہیں گہری
گنجینۂ اوصاف ظفر ہے شاید

(۴)

تقریظ کا غماز ظفر ہے شاید
انصاف کی آواز ظفر ہے شاید
افلاک شرافت ہے نظر میں اس کی
شاہین کی پرواز ظفر ہے شاید

(۵)

دل میں جو ہے لب پہ وہی لاتا ہے ظفرؔ
حال اپنا کبھی جگ کا سناتا ہے ظفرؔ
اظہار کے کاغذ پہ رباعی کے قلم سے
جذبات کا اک دریا بہاتا ہے ظفرؔ

(۶)

منثور کی آنکھوں میں ہے تصویر اس کی
منظوم کے ہاتھوں میں ہے تقدیر اس کی
حاصل ہے اسے دولت رشحات قلم وہ
''ڈنک اور نمک دان'' ہیں جاگیر اس کی

پروفیسر سیّد شاہ طلحہ رضوی برق (شاہ ٹولی، داناپور، پٹنہ)

قطعہ تاریخ

بہ ارتحال حضرت مولانا مفتی عبدالواجد نیر قادری دربھنگوی

تھے غم تاج الشریعہ سے ابھی ہم سب نڈھال
مستزاد اس پر یہ صدمہ آپڑا با شدّ و مد

گر گئے افسوس یوں دین متیں کے دو ستون
ہو اگر حکم الٰہی کون کرسکتا ہے رد

حق ہے ''لا یستاخرون'' اور حق ولا یستقدمون''
ٹل نہیں سکتی اجل بے اذن اللہ الصمد

ایک عالم اک مفسر ایک مفتی اٹھ گیا
اک امام باوقار اک مقتدائے معتمد

شاعر خوش فکر، ادیب حامل زریں قلم
اور خطیب ایسا کہ ہو اغیار کو رشک و حسد

حرف و لفظ و املا کی ہر رمز تھی اس پر عیاں
آئینہ زیر و زبر تشدید و پیش و جزم و مد

مخلص و مشفق مرے اے نیّر تابان علم
تا قیامت نور ایماں سے رہے روشن لحد

حسن اخلاق کریمانہ ہے لوح دل پہ نقش
ہیں نظر میں شکل نورانی کے پیارے خال و خد

لب پہ آتی ہے دعا قلب فسردہ سے یہی
قبر پر ان کی نزول رحمت حق تا ابد

صابر و شاکر ہوں اور آباد ان کے جانشیں
مفتی سبحانی نہایت لایق و فایق ولد

دے رہا ہے برق یہ مصرع مجھے سال وصال
''مفتی عبدالواجد آہ اے کنز علم مستند''

۱۴۳۹ھ

....

قطعۂ تاریخ وفات پروفیسر سیّد منظر امام (دھنباد)

قطعۂ سالِ وفات آہ میں کیسے لکھوں
نوکِ قلم پر مرے دوست کا نام آ گیا

یادوں نے اس کی دیا نور کا حلقہ مجھے
بن کے وہ چہرہ کوئی ماہِ تمام آ گیا

کیسے وہ اٹھ کر گیا مجمعِ احباب سے
کس نے بلایا اسے کس کا سلام آ گیا

دور وطن سے رہا پھر بھی دلوں میں مکیں
راز یہ تھا عشق کا برسرِ عام آ گیا

کس کی ہے نوری لحد' سنتے ہی لب پر مرے
''پاک حسب سیّدِ منظر امام'' آ گیا

۱۴۳۹ھ

احسان ثاقب (نوادہ/آسنسول)

پروفیسر سیّد منظر امام مرحوم کی نذر

انقلابِ زیست نے دیکھا ہے ایسا سانحہ
ہٹ گیا خونِ جگر سے زندگی کا رابطہ

ڈھونڈ کر لائیں کہاں سے اب خمارِ زندگی
کھو گیا ہے سو حجابوں میں وقارِ زندگی

تھی نظر زندہ تو لفظوں میں حرارت تھی بہت
سرعتِ ترسیل میں فکری بصیرت تھی بہت

ہر طرف بکھری ہوئی تھی اک حکیمانہ روش
اور تھی جوشِ جنوں میں آگہی کی اک تپش

تھی بہت اُسلوب میں اظہارِ نو کی تمکنت
شاعری میں ساحری افسانے میں افسانیت

آپ کا زورِ صحافت تھا بہت ہی پُروقار
جم کے رہ جاتا تھا قلمی پاسداری کا حصار

تھے وہ کالج کے محقق اور نظریہ ساز بھی
درس میں رکھتے تھے اپنا اک الگ انداز بھی

اک قیامت ٹوٹی ہے ایسی نئی افتاد کی
آنکھ نم ہے آج ہر اک صاحبِ دھتباد کی

کون سا رشتہ ہے تیرا موت سے اے زندگی
بیٹھے بیٹھے کس طرح اک شخص کو نیند آگئی

اے امام اعظم، شمائل اور سارے ہم نوا
صبر کیجئے صبر میں ہی ہے خدا کی ہر رضا

آپ تھے بے شک بہت ہی معتبر منظر امام
اللہ بخشے آپ کو جنت میں اک اعلیٰ مقام

ڈاکٹر محمد امین عامر (ہوڑہ، مغربی بنگال)

خراجِ عقیدت بہ پروفیسر سلیمان خورشید

حیف کہ ڈوب گیا علم کا تاباں خورشید
وہ جو دنیائے ادب میں تھا فروزاں خورشید

بحرِ تحقیق و تفتیش میں تھا غوطہ زن
دُرِّ نایاب سے بھر لاتا تھا داماں خورشید

علمِ تاریخ کے میدان کا وہ شاہسوار
تھا اسی راہ میں پیہم رواں دواں خورشید

علم و دانش کے کھلائے گُل زیبا جس نے
تھا زمانے میں وہ مانندِ گلستاں خورشید

پیکرِ علم و ہنر، دیدہ ور و دانشور
حاملِ فکر و نظر صاحبِ دوراں خورشید

محفلِ علم و ادب میں سدا رونق افروز
اور مقامِ بزم کا سخن کا بھی سخنداں خورشید

خادمِ علم و ادب اور محبِّ اردو
جس پہ بے لوث رہا عمر بھر قرباں خورشید

صاحبِ مرتبت و فخرِ زماں، نازشِ بخت
ذی حشم، ذی خرد اور تھا ذیشاں خورشید

حسنِ اخلاق و مروّت کا اسے پیکر کہئے
وہ جو معروف تھا با نامِ سلیماں خورشید

کیوں نہ گلہائے عقیدت کریں ہم اس پہ نثار
قوم و ملّت کا تھا سرمایۂ نازاں خورشید

بخش دے اس کو خدا، ہے یہ دعائے عامر
نیک خو، نیک طبع، نیک تھا انساں خورشید

امتیاز بن عزیز، دھنباد (جھارکھنڈ)

''آہ! سید منظر امام......''

افسوس! وہ حیات کے پیکر نہیں رہے
معمار تھے ادب کے وہ رہبر نہیں رہے
آنکھیں چھلک پڑی ہیں، یہ کہتے ہوئے عزیزؔ
افسوس! آج شہر میں منظرؔ نہیں رہے

....

ہم سب کو چھوڑ چھاڑ کے کیسے چلا گیا
وہ کشتیٔ حیات سے کیسے اتر گیا
معمول کے خلاف نظر آیا میرا یار
چپ چاپ آنکھ بند کئے وہ گزر گیا

....

یہ لوگ کہہ رہے ہیں یہاں کس کو اب تلاش
سب کے قریب تھا جو وہی سب سے دُور ہے
وہ لوگ لیں سبق اب اُن کی موت سے
اس زندگی پہ آج جسے بھی غرور ہے
ہیں اشکبار آنکھیں، مغموم ہے ہر اک دل

....

حلیم صابر (کولکاتا)

''بیادِ سید منظر امام''

پیکرِ صدق و صفا منظر امام
ہوگئے ہم سے جدا منظر امام
تھے صحافی بھی فسانہ ساز بھی
شاعرِ شیریں نوا منظر امام
خدمتِ اُردو ادب کی آپ نے
ہے یہ احساں آپ کا منظر امام
درس و تدریس آپ کا وہ مشغلہ
لائقِ تحسین تھا منظر امام
نسلِ نو کو زیورِ تعلیم سے
کرگئے آراستہ منظر امام
ہیں مشاہیرِ ادب جو اُن سے بھی
تھا تعلق آپ کا منظر امام
ڈھونڈنے سے کم ملیں گے شہر میں
آپ جیسے باوفا منظر امام
آپ کی موجودگی سے شہر میں
کیا حسیں ماحول تھا منظر امام
آپ کی شرکت سے اہلِ علم کی
بزم تھی رونق فزا منظر امام
ہے دُعا یہ بخش دے ربِ کریم
آپ کی ساری خطا منظر امام

....

علی ناصر سلمان (ڈپٹی جنرل منیجر، بھارت پٹرولیم کارپوریشن، کرور، تمل ناڈو)

خراجِ عقیدت پروفیسر سیّد منظر امام

ہو نہ پائے کبھی جدا منظر — آپ اور علم کی فضا منظر
آپ کے ساتھ ساتھ چلتی تھی — فہم و ادراک کی ضیا منظر
جانے کتنے گھروں میں جلتا تھا — آپ کے علم کا دیا منظر
حسنِ اخلاق کا نمونہ تھی — آپ کی ہر کوئی ادا منظر
بیٹھا صحبت میں آپ کی جو بھی — گرویدہ ہو کے پھر اٹھا منظر
جگمگاتا تھا ''فاطمہ منزل'' — ایسی پُر نور تھی فضا منظر
میری قسمت چمک گئی اُس دن — آ کے جب آپ سے ملا منظر
ڈھونڈتا ہر طرف ہے سناٹا — کھو گئی آپ کی صدا منظر
دونوں اک دوسرے سے راضی تھے — آپ اور آپ کا خدا منظر
منتظر دل ہے آپ سے ملنے — ڈھونڈوں اب آپ کو کہاں منظر
اب نہ دھنباد ہے نہ دربھنگہ — خلد ہے دائمی پتہ منظر

ڈھونڈو سلمانؔ عمر بھر لیکن
مل نہ پائے گا دوسرا منظر

....

ڈاکٹر احمد معراج (کولکاتا)

آہ! وہ سیّد منظر امام

بارگاہِ علم کے منظر امام استاد تھے — اک ادیب نامور تھے وہ سخن ایجاد تھے
آپ کی ذاتِ گرامی لائق تحسین تھی — آپ کی سرگرمیوں سے شہرِ فن آباد تھے

....

اٹھ گئے بزمِ جہاں سے آہ! وہ منظر امام — جن کو کرتی ہے عقیدت کی جبیں جھک کر سلام
آپ تھے شاعر، صحافی اور افسانہ نگار — شہر علم وفن میں سب کرتے تھے جن کا احترام

....

چل دیئے جو آپ دنیا چھوڑ کر سوئے عدم — کر گئے ہیں چاہنے والوں کو اپنے محوِ غم
آپ کے دم سے تھا قائم سلسلہ تخلیق کا — مدتوں رویا کریں گے آپ کو لوح و قلم

....

ڈاکٹر امام اعظم

شیشے کا گھر

(پروفیسر سید منظر امام کی رحلت پر)

زندگی خواب ہے!
آنکھوں میں سجی رہتی ہے
ایک احساس ہے
اس دل میں بسی رہتی ہے
جذبۂ پاک ہے، جس کے دم سے
ہم بھی رشتوں کے دھاگے میں بندھے رہتے ہیں
موت اک تلخ حقیقت ہے جو
جب بھی آتی ہے
شمعِ جاں کو بجھا جاتی ہے
توڑ جاتی ہے رشتوں کے دھاگے
یادوں کا سلسلہ رہ جاتا ہے بس!
آشنا چہرہ / ماضی کے دھندلکے میں کھو جاتا ہے
جسم بے جان ہو کر / قبر کی گود میں سو جاتا ہے
کتنی ارمانوں کی قبریں ہیں یہاں
کرب، اذیت، کلفت، خواب پریشاں
بکھری داستانوں کی طرح
کبھی دھندلے اور کبھی ہو جاتے ہیں روشن
کوئی کیسے بھلا سکتا ہے انھیں
کہ جو تشنہ لبی کے درمیاں آبِ رواں تھے
رونقِ محفلِ علم و ادب تھے
درس و تدریس کے حوالے سے
ایک اک لفظ ان کا روشن تھا
سب کے ہمدرد وہ منظر امام
ایسے سوئے کہ پھر اٹھے ہی نہیں
ان کے جانے کا یقیں کیسے کریں
دل و دماغ لرز اُٹھتے ہیں
آبدیدہ ہے واسع پور بلکہ پورا دھنباد
جیسے وہ کہہ رہا ہو
تیرگی شب کی بڑھتی جاتی ہے مگر
سحر کا خواب بننے والا نہیں
وہ کہ جو عزمِ جواں رکھتا تھا
فکر میں بھی اڑان ہوتی تھی
تھا تخیل بھی مائلِ پرواز
وہ صحافی بھی تھے، سخنور بھی
دونوں فن میں کمال رکھتے تھے
اعلیٰ فکر و خیال رکھتے تھے
عہدِ حاضر کے جبر و قدر کا بھی ان کو احساس تھا
وہ جیسے دور، بہت دور ابھی جانا تھا
موت کی نیند وہ سو جائیں گے
ہم نے سوچا بھی نہ تھا
زندگی موت کی کشاکش میں
آدمی صرف کھلونا ہے اور کچھ بھی نہیں
جانے کب ہاتھ سے گر جائے گا
کانچ کی طرح ٹوٹ جائے گا
صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے
کوہساروں کی بلندی لرزہ براندام ہے
آنے والے زلزلوں سے بےخبر شیشے کا گھر!

....

ناشاد اورنگ آبادی، پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)

منظوم خراج عقیدت

(بیاد شاہد حسین سوز بانی ملت اکیڈمی، سمستی پور)

ہائے پھر لوٹا اجل نے قافلہ سالار کو
شہرۂ آفاق انساں نامور فنکار کو
حضرت شاہد کی شخصیت زمانہ ساز تھی
کون ہے وہ جو بھلا دے ایسے خدمت گار کو
کوئی اندازہ نہیں ادراک کا افکار کو
کیسے بھولے گا زمانہ علم کے شہکار کو
نام روشن کردیا جس نے سمستی پور کا
گل بداماں کردیا اضلاع کے برگ و خار کو
تھا بہت بے باک اور یکتا بھی اپنے فن میں تھا
افضلیت جس نے دی تھی شاعر و فنکار کو
مرتے دم تک فکر وفن سے واسطہ جس کا رہا
دیکھیں آنکھیں کھول کے ان کے بھی کردار کو
لوگ سرسید کہا کرتے تھے ان کو پیار سے
مثل سرسید بڑھایا علم کے معیار کو
حق کی باتیں کرتے تھے اور حق پہ رہتے تھے سدا
حق پہ رہنے کے لئے کہتے تھے ہر حقدار کو
روح تھے ملت کے اور اردو زباں کے پاسباں
ذہن میں رکھتے نہ تھے ہرگز کبھی اغیار کو
جس میں تھا لکھا ہوا کہ بجھ گیا روشن چراغ
ہم تو پڑھ کر رو دیئے ناشاد اس اخبار کو

ڈاکٹر امتیاز احمد صبا، مہیش پٹی، سمستی پور (بہار)

آہ! شاہد حسین سوز

(بانیٔ ملت اکیڈمی، سمستی پور)

گلشن ملت کا جو تھا باغباں جاتا رہا
غنچہ و گل کا رہا جو نگہباں جاتا رہا

آئینہ در آئینہ تھا جس کے جلووں کا ہجوم
ڈھونڈتی پھرتی ہیں نظریں وہ کہاں جاتا رہا

وہ کہ جس کے در سے تشنہ لب کوئی لوٹا نہیں
ہے سلامت میکدہ پیر مغاں جاتا رہا

یوں تو سب کچھ ہے وہی کچھ بھی نہ بدلا دیکھئے
لیکن وہ منظر پس منظر سماں جاتا رہا

جس کی چھاؤں میں ٹھہر جاتے تھے آکر خاص و عام
غم کی تپتی دھوپ کا وہ سائباں جاتا رہا

رنج و غم میں بھی نہ آیا جس کے ماتھے پر شکن
استقامت کا وہ اک کوہ گراں جاتا رہا

جو سرکتی ریت پر اپنا بنا لے آشیاں
عزم محکم کا وہ اک سوز نہاں جاتا رہا

زیب تن جس کے رہا بس سادگی کا اک لباس
بندگی، طاعت، فراست کا جہاں جاتا رہا

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی (نئی دہلی)

ڈاکٹر امام اعظم کی تازہ ترین تالیف وتدوین پر مشتمل کتاب

''سہرے کی ادبی معنویت'' پر فی البدیہہ منظوم تاثرات

ہے یہ اک سہرے کی ادبی معنویت پر کتاب
مختلف سہروں کا ہے جو خوبصورت انتخاب

اس میں سہرے کی روایت کا ہے دلکش تجزیہ
ہے امام اعظم کی یہ تدوین بیحد کامیاب

ہے مولف کا یہ ادبی کارنامہ دل پذیر
جس کو ارشد مینا نگری کو کیا ہے انتساب

ہیں کئی دانشوروں کے اس میں رشحات قلم
جن میں سہروں کے ہے اسلوب بیاں کا احتساب

سہرے کے فن پر ہے اس میں سیر حاصل تبصرہ
بڑھ گئی ہے جس سے کچھ سہروں کی برقی آب وتاب

....

امانؔ ذخیروی (جموئی، بہار)

گلشنِ شعروادب کا پاسباں ''تمثیلِ نو''

گلشنِ شعر و ادب کا پاسباں 'تمثیلِ نو'
علم و فن کا ایک بحرِ بیکراں 'تمثیلِ نو'

بزمِ اردو کو منور کر رہی اس کی ضیاء
بن چکا ہے آج رشکِ کہکشاں 'تمثیلِ نو'

آج ہے پہچان اس کی سب رسالوں سے جدا
ہے یقیناً اک ادب کا کارواں 'تمثیلِ نو'

کب کوئی روکے گا اس کی تیز تر رفتار کو
بہہ رہا ہے بن کے اک سیلِ رواں 'تمثیلِ نو'

اس میں پوشیدہ ہے اعظم کی نگاہوں کا سرور
ان کے ہے پیہم عمل کی داستاں 'تمثیلِ نو'

بخشتا ہے ذہن و دل کو تقویت شام وسحر
ہے بڑا غم خوار ، بے حد مہرباں 'تمثیلِ نو'

ہے اسے کشمیر سے کنیا کماری تک فروغ
ملک کے ہر گوشے گوشے میں عیاں 'تمثیلِ نو'

اس کی خوشبو ہے سمندر پار بھی پھیلی ہوئی
یوں وطن سے دور بھی ہے گل فشاں 'تمثیلِ نو'

بار ہا میں نے بھی اس کو پڑھ کے دیکھا ہے امانؔ!
روح کو رکھتا ہے بے حد شادماں 'تمثیلِ نو'

احسان ثاقب (نوادہ/آسنسول)

شہر نوادہ کے تناظر میں

فضائے نوادہ کی فطرت عجب ہے
تمدن عجب ہے روایت عجب ہے

یہاں کی روایت میں تہذیب بھی ہے
طریق محبت میں ترتیب بھی ہے

یہاں ربط باہم میں تکریم بھی ہے
نظریات میں رنگ تعظیم بھی ہے

خلیق اس قدر یعنی بھائی سے بڑھ کر
رفیق اس قدر جیسے اپنا برادر

نظر آتے ہیں سب رفیقانہ پیکر
بہت خوش نما ہے نوادہ کا منظر

نوادہ کا اب بال و پر ہی جدا ہے
نئے خواب کا اب نیا ارتقا ہے

نئی فکر کا واسطہ ہے نوادہ
اندھیروں میں جلتا دیا ہے نوادہ

جہاں پہلے اسکول، کالج نہیں تھے
جہاں اوپر اٹھنے کے ناج نہیں تھے

اگر تھے بھی تو اس کی تعداد کم تھی
کہ پرواز کی راہِ ایجاد کم تھی

کہ کیا اہمیت ہے اس علم و ہنر کی
ضرورت ہے کیا زندگی کے سفر کی

حقیقت کو جانا تو پھر ہوش آیا
کہ کچھ کر گزرنے کا پھر جوش آیا

مدارس و اسکول و کالج کھلے پھر
زمینی نظریئے سے آگے بڑھے پھر

ہوئے لڑکیوں کے ارادے بھی روشن
دکھانے لگیں وہ زمانے کو درپن

جو رسم و روایت کو پہچانتی ہیں
غلط کیا صحیح کیا ہے سب جانتی ہیں

پڑے وقت آنچل کو پرچم بنا دیں
یہ شرم و حیا کے قدم ڈگمگا دیں

نسائی علاقے کی تازہ گلستاں
بہت ہیں درخشاں بہت ہیں نمایاں

ترقی کی رفتار گرچہ ہے دھیمی
مگر اس کی وسعت بڑھے گی یقینی

علاقے کی نسبت سے ہوگی سیاست
تو بڑھ جائے گی اس نوادہ کی عظمت

یہاں فکر کرنی پڑے گی سبھی کو
تو ہم دور کردیں گے اس کی کمی کو

یہاں شیریاں مسکرانے لگیں گی
نئی کھیتیاں لہلہانے لگیں گی

یہی سوچ کر آئے اہلِ خرد بھی
تو ملنے لگی ان کو غیبی مدد بھی

یہاں ایک طبقہ جو پسماندہ تھا
پرانے زمانے میں جو جی رہا تھا

کوئی اوپر اٹھنے کا ذریعہ نہیں تھا
وہ اپنے مسائل میں الجھا ہوا تھا

تمدن اور تہذیب سے بے خبر تھے
نہ اہلِ سخن تھے نہ اہلِ نظر تھے

وہ بس جانتے تھے کمانا اور کھانا
یہی زندگی کا تھا اک تانا بانا

مگر اک اُجالا جو تعلیم کا تھا
سماجی حوالے کا جو ارتقا تھا

وہ آنکھوں میں سب کی اترنے لگا تھا
وہ فکری سطح پر ابھرنے لگا تھا

زمینی حقیقت کو سمجھا گیا جب
کہ علمی ضرورت کو جانا گیا جب

جو تہہ داریاں تھیں اجاگر ہوئیں وہ
جو باریکیاں تھیں خوش آور ہوئیں وہ

مدارس، مکاتب، تو اپنی جگہ تھے
کہ عصری مراتب بھی اپنی جگہ تھے

اگر دین و دنیا ہوں دونوں ہی حاصل
تو ہوجائیں گے ہم ترقی میں شامل

نظریہ یہی تھا ارادہ یہی تھا
کہ تدریسی پہلو کا جذبہ یہی تھا

یہ تحریک ہر اک محلّہ میں پہنچی
کہ یوں کہئے پورے نوادہ میں پہنچی

یہ روشن خیالی جو آئی ذہن میں
تو اک جوش پھیلا ہر اک تن بدن میں

محلّہ محلّہ ہوئیں پھر نشستیں
نشستوں میں باندھے گئے کچھ ارادے

یہ طے پایا پہلے کھلے ایک مکتب
مگر بیچ میں لگ گیا ایک عقرب

اس عقرب سے بہتر تھا بچ کر نکلنا
کہ گرنا بھی اور خود ہی آگے بھی بڑھنا

بہت سوچ کر ایک آواز گونجی
بنائیں گے ہم پہلے ''ملّت کمیٹی''

بنی پھر نوادہ میں ملت کمیٹی
ضرورت تھی اب اک نئی رہبری کی

فقط کام کرنے کا یہ اک ڈگر ہو
سیاست کی اس میں نہ ہرگز گزر ہو

یہ تھا سب-ڈویژن مگر ایسا خستہ
کہیں بھی نہیں تھا ترقی کا رستہ

نہیں کے برابر تھی موٹر اور گاڑی
سڑک اس کی رہتی سدا ٹوٹی پھوٹی

نشہ تھا آزادی کا ذہنوں پہ طاری
نہیں لگ رہا تھا کوئی غم بھی بھاری

غلامی کی زنجیر توڑی گئی تھی
سبھوں کے لئے یہ خوشی کی گھڑی تھی

جو ہاتھ آیا اس کو غنیمت ہی سمجھا
ہمیں اوپر اٹھنے کا موقع ملا تھا

فرنگی مگر تھا بہت ہی فریبی
اخوّت، محبت کی بنیاد ڈھا دی

دو قومی نظریہ جگاکر گیا وہ
کہ آپس میں ہم کو لڑاکر گیا وہ

مسلمان، ہندو جب باہم ہوئے تھے
تو ظالم فرنگی کے ہوش اُڑ گئے تھے

یہ سب جانتے ہیں جب گھر پھوٹتا ہے
تو گھر کا ہی بھیدی یہ گھر لوٹتا ہے

ملے گا ہر اک موڑ پر ایسا انساں
کہ کچھ پیسوں میں بیچ دے گا وہ ایماں

ہمیشہ سے یہ کام ہوتا رہا ہے
مگر باغ میں پھول کھلتا رہا ہے

نہ باقی رہے گا یہ نفرت کا عنواں
نہیں کام آئے گا یہ کارِ شیطاں

نوادہ کا جو روپ ہے آج روشن
وہ ہندو مسلماں کا ہے ایک درپن

نہ کل ہم بٹے تھے نہ ہم اب بٹے ہیں
قدم ہم ملاکر ہمیشہ چلے ہیں

سبق ہم دھرم کا پڑھیں اور پڑھائیں
دھرم کو سیاست میں ہرگز نہ لائیں

یہی لوگ دشمن ہیں اپنے وطن کے
محافظ ہی رہزن ہیں اپنے چمن کے

نظر اُن لٹیروں پہ رکھیں ہمیشہ
کہ ہم کو ملے پھر ترقی کا رستہ

اسی شہر کو ہم بنائیں گے جنت
ہمارے لئے ہے یہ شہرِ محبت

مری شاعری کی فطانت تو دیکھیں
فصاحت کی تجدیدِ حکمت تو دیکھیں

ذہن میں عجب سی ہوا بہہ رہی ہے
وہی سن رہا ہوں جو وہ کہہ رہی ہے

مری بے گھری میری قسمت ہے بھائی
غضب کی زمینی حقیقت ہے بھائی

مروئی سے نکلا تو بنگال پہنچا
پریشان ہوکر میں بدحال پہنچا

وہاں کی زمیں نے گلے سے لگایا
مجھے کچھ سنورنے کا نکتہ سکھایا

تکبر، تعصب ذہن سے مٹادیں
محبت کی ہر سمت شمع جلادیں

یہ کینہ یہ بغض و عداوت غلط ہیں
کہ آپس میں لڑنے کی عادت غلط ہیں

رہیں گے اگر ساتھ ہندو مسلماں
تو بڑھتے رہیں گے ترقی کے امکاں

دھرم کی صداقت میں تو ہے بھائی
دھرم چاہتا ہے دلوں کی صفائی

دھرم آدمی کو بناتا ہے انساں
دھرم آستھا اور ایماں کا عنواں

دھرم ہے تو دنیا میں رنگت رہے گی
دھرم ہے تو آپس میں الفت رہے گی

دھرم دشمنی دور کرنے کا ذریعہ
بناؤ اسے مت سیاست کا حربہ

اگر ہندو مسلم جو مل کر رہیں گے
تو ہر موڑ پر ہم ترقی کریں گے

بہت کھوئی حرکت ہے لڑنا جھگڑنا
غلط کام ہے خود کو مسمار کرنا

دھرم کا یہ ہرگز تقاضا نہیں ہے
دھرم میں اہنسا ہے ہنسا نہیں ہے

نظریہ سیاست کا جو ہو ہمارا
مگر ہم سبھی کا وطن ہے نوادہ

یہ شہر محبت ہے اس کو نکھاریں
کہ الجھے ہوئے اس کے گیسو سنواریں

جسے راس آتی نہیں ہے محبت
وہی روز کرتے ہیں گندی سیاست

یہ کمزور کردیتے ہیں کارواں کو
مٹا دیتے ہیں روشنی کے نشاں کو

کبھی بھی ترقی نہیں ہو ہماری
یہی چاہتے ہیں سیاسی مداری

نئے دور میں اب نیا کچھ کریں ہم
اڑا کر دکھا دیں ترقی کا پرچم

بہت ہو چکے ہیں سیاسی تماشے
بہت بج چکے جھوٹے ڈھول اور تاشے

زمیں کو دکھائیں اب ایسا نظارا
کہ علم و ہنر رہ نما ہو ہمارا

قدم جب اٹھائیں تو دیکھے زمانہ
نئی قابلیت کا گونجے فسانہ

یہی ہیں ذرائع یہی ہیں وسائل
کریں ہر کسی کو ہم محنت سے قائل

نہیں کام آئے گا یہ کارِ شیطاں
نہ باقی رہے گا یہ نفرت کا عنواں

نوادہ کو جو روپ ہے آج روشن
وہ ہندو مسلماں کا ہے ایک درپن

نہ کل ہم بٹے تھے نہ اب ہم بٹے ہیں
ملا کر قدم ہم تو آگے بڑھے ہیں

سبق ہم دھرم کا پڑھیں اور پڑھائیں
دھرم کو سیاست میں ہرگز نہ لائیں

یہی لوگ دشمن ہیں اپنے وطن کے
محافظ ہی رہزن ہیں اپنے چمن کے

نظر ان لٹیروں پہ رکھیں ہمیشہ
کہ ہم کو ملے پھر ترقی کا رستہ

اسی شہر کو ہم بنائیں گے جنت
ہمارے لئے ہے یہ شہر محبت

مری شاعری کی ذہانت تو دیکھیں
فصاحت کی تجدید و حکمت تو دیکھیں

ذہن میں عجیب سی ہوا بہہ رہی ہے
وہی لکھ رہا ہوں جو وہ کہہ رہی ہے

زباں رابطے کی ہے اردو اور ہندی
مگر بولی جاتی ہے آپس میں مگدھی

بڑا پیارا میٹھا ہے مگدھی کا لہجہ
اتر جاتا ہے دل میں اس کا تراشا

زباں اپنی تہذیب کا اک نشاں ہے
یہ بول علاقائیت کا جہاں ہے

علاقے کی پہچان ہوتی ہے بولی
قرابت کا رجحان ہوتی ہے بولی

یہ بولی مٹا دیتی ہے فاصلے کو
یہ بولی بڑھا دیتی ہے سلسلے کو

جہاں جائیے ساتھ جاتی ہے بولی
وہاں سچا رستہ دکھاتی ہے بولی

ذرا سی کھنک اجنبیت مٹا دے
ذرا سی لہک دل میں ہلچل مچا دے

یہ بول جو اپنی سی آہٹ سنے گی
تو پل بھر میں اپنے قدم روک لے گی

اگر بول میٹھے تو ماحول میٹھا
دلوں میں بڑھا دے گا الفت کا جذبہ

وہ جذبہ جو گنگا کے پانی سے بڑھ کر
وہ جذبہ جو سچی کہانی سے بڑھ کر

فضا ایسی گر ہر سو چھائی رہے گی
تو ماحول میں خوش نمائی رہے گی

بہاری ہیں ہم باہری ہم نہیں ہیں
کسی سے کسی طور پر کم نہیں ہیں

قلم بھی قدم بھی بڑھانا پڑے گا
زمانے کو یہ رخ دکھانا پڑے گا

یہ دنیا اسی کو ہی پہچانتی ہے
جو پروازِ حکمت کا گر جانتی ہے
پرانے نوادہ کا چہرہ جدا تھا
پرانی روایت سے ہی آشنا تھا
تھا بازار اس کا ذرا کچھ پرانا
خریدار کا ہوتا کم آنا جانا
پڑھائی کے اسکول کالج بھی کم تھے
وسیلے علاج و معالج کے کم تھے
اچانک جو ہوتی بڑی کوئی گھٹنا
اسے جانا پڑتا تھا رانچی یا پٹنہ
یہ تھا سب ڈویژن مگر ایسا خستہ
نہ اچھی سڑک تھی نہ اچھا تھا رستہ
نہیں کے برابر تھی موٹر اور گاڑی
ابھی تک غلامی کی رنگت چڑھی تھی
ذہن پر نشہ ایسا چھایا ہوا تھا
ترنگا ہر اک گھر کی زینت بنا تھا
غلامی کی زنجیر توڑی گئی تھی
سبھوں کے لئے یہ خوشی کی گھڑی تھی
جو ہاتھ آیا اس کو غنیمت ہی جانا
ہمیں آگے بڑھنے کا موقع ملا تھا
فرنگی مگر تھا بہت ہی فریبی
اخوت، محبت کی بنیاد ڈھا دی
دو قومی نظریہ جگاکر گیا وہ
کہ آپس میں ہم کو لڑاکر گیا وہ
مسلماں و ہندو جب باہم ہوئے تھے
تو ظالم فرنگی کے ہوش اڑ گئے تھے
یہ سب جانتے ہیں جب گھر ٹوٹتا ہے
تو گھر کا ہی بھیدی یہ گھر لوٹتا ہے
ملے گا ہر اک موڑ پر ایسا انساں
کہ کچھ پیسوں میں بیچ دے گا وہ ایماں
بچیں ان سے اور دوسروں کو بچائیں
نئی نسل کو ان کا چہرہ دکھائیں
اگر یہ نوادہ ہے ہم سب کا مسکن
تو کرنا پڑے گا ہمیں اس کا منتھن
ہمیشہ سے یہ کام ہوتا رہا ہے
مگر باغ میں پھول کھلتا رہا ہے

(جاری ہے)

غزلیں

مرغوب آثر فاطمی (علی گنج، گیا)

تڑپنا بھی نہیں کیا یاد پیارے
پڑی ہے کون سی افتاد پیارے

تمہارے گاؤں میں رونق بہت تھی
نہ تھا پر ایک گھر آباد پیارے

میں کس کا کون ہوں، ہے کون میرا
ہوا اس فکر سے آزاد پیارے

مفر وابستگی سے چاہتا ہوں
سزا کی ختم ہو میعاد پیارے

مزہ آنے لگا نانِ جویں میں
توکل میں گندھی فریاد پیارے

سلاست سے چھڑا کر اپنا دامن
ہوئی تخلیقیت برباد پیارے

تعصب سے مسلسل معرکے میں
عزائم ہو گئے فولاد پیارے

عزیز از جاں تمہیں نطفے کا نطفہ
غرض کے یار آدم زاد پیارے

پسند آنے لگا پتھر کا بستر
آثر چل جانب بنیاد پیارے

....

احسان ثاقب (نوادہ/آسنسول)

کبھی اس کی انجمن میں کبھی اُس کی انجمن میں
میں کہاں کہاں نہ بھٹکا تری دید کی لگن میں

تجھے ڈال ڈال دیکھا تجھے پات پات ڈھونڈا
تری ذات تو چھپی تھی رگِ گل کے پیرہن میں

میں جہاں جہاں سے گذرا ترا عکس میں نے دیکھا
کبھی جھیل کی سطح پر کبھی چاند کی کرن میں

مری ذات ہے زینتی مرا عشق اضطرابی
نئی کیفیت ملے گی مرے دل کی ہر چبھن میں

کبھی انکشاف مجھ سے کبھی مضمرات تجھ سے
یہی داخلی بصیرت ہے شعورِ فکر و فن میں

کوئی نقش پا ملے گا تو اسی دشت میں ملے گا
کہ ملا ہے ہر کسی کو اسی عزمِ کوہکن میں

کئی رنگ و روپ ابھرے ترے اس قلم سے ثاقب
کبھی سوچ کی قبا میں کبھی فکر کے گگن میں
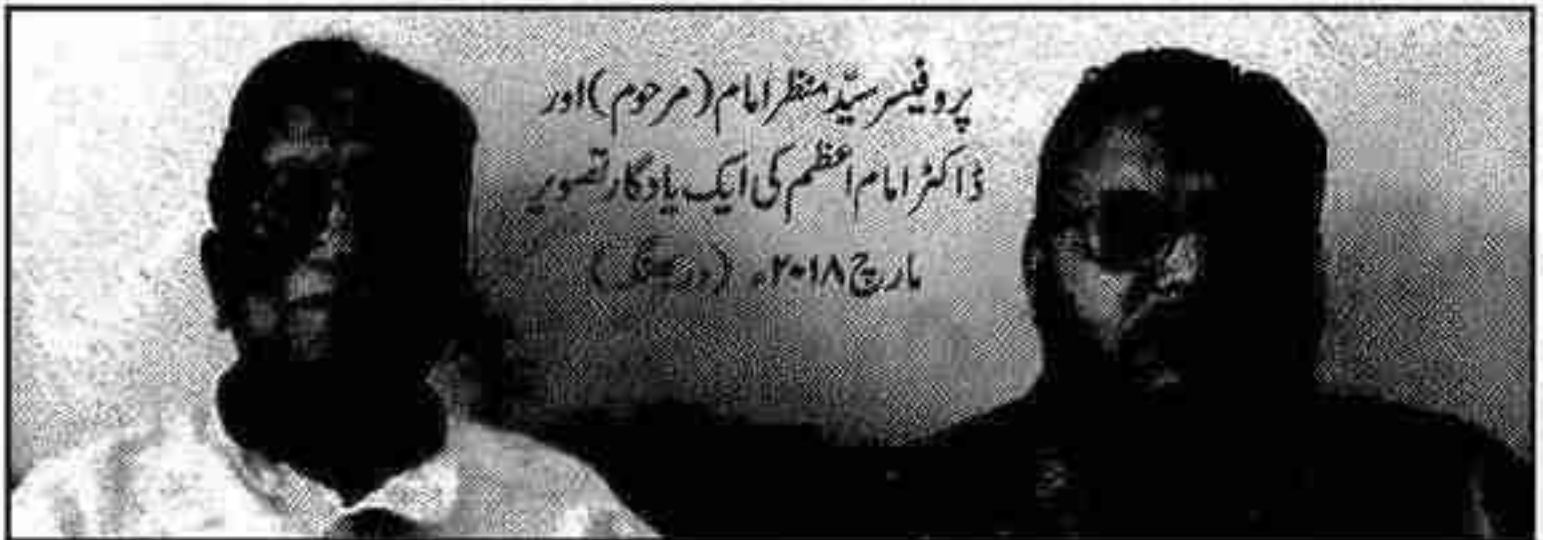
....

ابوالليث جاوید (نئی دہلی)

یہ سراپا ، شراب لکھ دوں کیا
سرخ لب کو گلاب لکھ دوں کیا
چاندنی سے دُھلا ہوا چہرہ
چندے ماہتاب لکھ دوں کیا
چندخوشیوں پہ میری سب چپ ہیں
اپنے غم کا حساب لکھ دوں کیا
ایک پیدل تو بن گیا ہے وزیر
اُس کو عزت مآب لکھ دوں کیا
پیری میں مت کرید چنگاری
داستانِ شباب لکھ دوں کیا
تم خیالوں کی میری ملکہ ہو
تیر نام اپنے خواب لکھ دوں کیا
عشق کم راس آتا ہے جاوید
خود کو خانہ خراب لکھ دوں کیا

علیم صبانویدی (چنئی)

حسرتیں جلنے کی خوگر ہوگئیں
داغ کی سمتیں منور ہوگئیں
یوں ہوا ہے تیرے وعدوں کا زوال
قربتیں مجروح جوہر ہوگئیں
سبز طوفانی ہواؤں کا جلوس
ٹہنیاں بے کیف منظر ہوگئیں
قطرہ قطرہ آسمانی ہوگیا
ساری ندیاں جب سمندر ہوگئیں
صرف لے دے کے جو اپنے پاس تھیں
وہ نگاہیں ان کی نوکر ہوگئیں
ہاتھ میں آئینہ لے کر آج کل
جرأتیں سب کی سکندر ہوگئیں
نیک نامی اور ان منٹ شہرتیں
اب نویدی کا مقدر ہوگئیں

....

ڈاکٹر احمد معراج (کولکاتا)

تجھ کو بھی ہوتی کسی کی آرزو میری طرح
عمر بھر تو بھی بھٹکتا کو بہ کو میری طرح
میں نہ ہوتا تیرے میخانے میں اے ساقی اگر
جام پی کر کون کرتا ہاؤ ہو میری طرح
تیرے عاشق تو بہت ہیں پر کوئی کرتا نہیں
تیرے چہرے کی تلاوت باوضو میری طرح
دوستی تیری اگر ہوتی کسی بدخواہ سے
تو بھی ہو جاتا صنم بے آبرو میری طرح
خاکساری ، انکساری تجھ میں بھی ہوتی اگر
تیری شہرت پھیل جاتی چار سو میری طرح
یوں تو کرتے ہیں سبھی عاشق نمازِ عشق ادا
خونِ دل سے کون کرتا ہے وضو میری طرح
داد ملتی اُن کو بھی معراج اہلِ بزم سے
شعر پڑھتے شاعرانِ خوش گلو میری طرح

ابراہیم اشک (ممبئی)

تیز آندھی سر مقتل ہے ، خبر آئی ہے
شہر کا شہر ہی جنگل ہے ، خبر آئی ہے
کس طرف جائیں گے اب گھر سے نکلنے والے
ہر طرف راہ میں دلدل ہے ، خبر آئی ہے
اپنے ہی خوں میں نہا کر ہے پریشاں دنیا
خواب کوئی نہ مکمل ہے ، خبر آئی ہے
بے گناہوں کو خطا وار کہیں گے کچھ لوگ
موت کے کھیل کی ہلچل ہے ، خبر آئی ہے
کل تلک نام عدالت کا سنا کرتے تھے
اب تو انصاف بھی پیدل ہے ، خبر آئی ہے
ہم تو تغلق کی ہی تاریخ پڑھا کرتے تھے
حکمراں اور بھی پاگل ہے ، خبر آئی ہے
خودکشی کا ہے نیا شوق یہ ، خوشحالی میں
کس آنند کہیں منگل ہے ، خبر آئی ہے
رونے والوں سے کہو 'اشک' وہ پی لیں اپنے
ملک بہہ جائے گا جل تھل ہے ، خبر آئی ہے

محمد نوشاد نورنگ (اندور، مدھیہ پردیش)

ہم بے وقارِ دہر کو عزت سے دیکھئے
ہم برطرف کئے گئے جنت سے دیکھئے
جنت گئی گناہ کی حسرت نہیں گئی
ہم تو بھرے ہیں عشق کی لذت سے دیکھئے
سینے میں روز آتشِ دوزخ دہکتی ہے
پھونکتے ہیں شب و روز ہی فرقت سے دیکھئے
ہر ہر قدم پہ راستہ مانندِ پل صراط
ہم آشنا ہمیشہ قیامت سے دیکھئے
ہم کو نہیں اجازت اظہارِ حالِ دل
خاموش ہیں گھٹن کی اذیت سے دیکھئے
عزت وفا محبت و دولت کسی کو بھی
ملتی ہے اس جہان میں قسمت سے دیکھئے
غلطی کسی کی بھی ہو ہمیں ملتی ہے سزا
کرتی سلوک دنیا عداوت سے دیکھئے
نورنگ ہر بشر کے ہی ہم خیر خواہ ہیں
ہم کو تو غم گسار کی نسبت سے دیکھئے

پروفیسر شاکر خلیق (دربھنگہ)

وقت کی رفتار گرچہ تیز ہے
حوصلے سے دل مرا لبریز ہے
پیش خیمہ ہے بڑے طوفان کا
خامشی بھی اس کی معنی خیز ہے
اب رگ و پے میں سرایت کر گئی
اس کی ہر اک بات زہر آمیز ہے
ہے مکدر آج دنیا کی فضا
ہر طرف اب فتنۂ چنگیز ہے
کس نے پھیلایا سیاست کا یہ زہر
اب کہاں افرنگی و انگریز ہے
اہل دانش کو ہے عبرت کا سبق
غافلوں کے واسطے مہمیز ہے
سانس لینا بھی بہت مشکل ہوا
ہائے شاکر کیسی رُستا خیز ہے

پروفیسر منصور عمر (دربھنگہ)

لائے ہیں تارے توڑ کے ہم آسمان سے
نکلے ہیں تیرے شہر میں پھر آن بان سے
تم ہو سفید پوش مگر ماجرا ہے کیا؟
آتی ہے بو لہو کی تمہارے مکان سے
مجرم جو تھا وہ حاکم و منصف کا ہوا دوست
جو بے قصور تھا وہ گیا اپنی جان سے
سوچا گیا کہ کیوں نہ اُس کی جڑ ہی کاٹ دیں
ڈرنے لگے تھے حکمراں اُس کی اٹھان سے
فاتح کو بھی سفر کی صعوبت نے کھالیا
نکلا تھا لوہا لینے وہ سارے جہان سے
طوفاں اگر اٹھا ہے تو تیار ہم بھی ہیں
ٹکرا کے لوٹ جائے گا وہ اس چٹان سے
منصورؔ گھر چکے ہیں حوادث میں ہم بھی
کچھ دعائیں گزرے سب امن و امان سے

....

رونق افروز (کولکاتا)

ہو کے خاموش کسی کونے میں بیٹھا ہوگا
سامنے بت کوئی مجھ سا لئے تکتا ہوگا
اس کو بس دیکھنا اے چاند نگاہیں بھر کر
وہ سمندر کی طرح طے ہے کہ گہرا ہوگا
خام چہرے پہ کوئی تبصرہ کرنا نہ کبھی
مجھ سے جو چھوٹ گیا تھا وہی روزہ ہوگا
وہ کسی اور کے کہنے پہ نہیں آ سکتا
ان سنا کرتا ملے گا تمہیں، بہرا ہوگا
میری یادوں کے کئی پتلوں کو قیدی کرکے
اُس پہ دِن رات اُسی پگلے کا پہرا ہوگا
جیسے ہی اس کی طرح کوئی ملے تو یاروں
غور سے دیکھنا وہ ہو بہو صحرا ہوگا
سچ ہے رونق کو اسی نام سے بولے کوئی
تو یقیناً وہ میرے شہر میں آیا ہوگا

مصطفےٰ اکبر (کولکاتا)

بھر کے لے آیا جو آنکھوں میں لبِ یار کا رنگ
رخ ہر گل پہ نظر آنے لگا پیار کا رنگ
پھر چلی بادِ بہاری کہ مچل اٹھا ہے دل
پھر بہار آئی ہے گلگوں ہوا گلزار کا رنگ
سات رنگوں میں وہی رنگ بہت اچھا ہے
جس سے مل جائے مرے یار کے رخسار کا رنگ
کیا کشش ہے کہ دبے پاؤں چلی آتی ہے!
میرے شعروں میں تری شوخیِ گفتار کا رنگ
اور مہکے گی ابھی حسنِ دل آرا کی بہار!
اور نکھرے گا ابھی گلشنِ اشعار کا رنگ
ہر کوئی جھوم اٹھے، رقص کرے، گائے بہار
اب کے کچھ ایسے جمے رنگوں کے تہوار کا رنگ

....

مصداق اعظمی (اعظم گڑھ)

تری تحریر سے شکوہ نہیں ہے
مجھے تقدیر سے شکوہ نہیں ہے
تقی صاحب سے تو شکوہ ہے لیکن
جنابِ میؔر سے شکوہ نہیں ہے
وہ تیرا غم ہو یا زہر ہلاہل
ہمیں ناشر سے شکوہ نہیں ہے
ہوا تو یہ بھی ہے پیوست دل میں
مگر اس تیر سے شکوہ نہیں ہے
حکومت کو بھلا کیوں اہلِ دیں گی
کسی تعمیر سے شکوہ نہیں ہے
وہی مصداؔق مرنا چاہتا ہے
جسے شمشیر سے شکوہ نہیں ہے

....

قطعات

حلیم صاؔبر (کولکاتا)

"Proximal Warmth"

شعری مجموعہ 'قربتوں کی دھوپ'
ہے بہت خوب امام اعظم کا
سیّد احمد کریمی صاحب نے
کیا انگریزی ترجمہ عمدہ

بہ شکریہ: ''اخبار مشرق'' کولکاتا، ۱۱/۱ اکتوبر ۲۰۱۸ء

حلیم صاؔبر (کولکاتا)

''ڈاکٹر امام اعظم کی بازآفرینی''

مناظر عاشق ہرگانوی نے تنقیدی
لکھے جو عمدہ مضامین امام اعظم پر
کتابی شکل میں محفوظ ہو گئے وہ سب
جو قارئین کے حق میں ہے تحفہ بہتر

بہ شکریہ: ''اخبار مشرق'' کولکاتا، ۱۱/۱ اکتوبر ۲۰۱۸ء

انجینئر ہارون شامی (لکھنؤ)

نہ کوئی ربط، نہ رشتہ، نہ سلسلہ ہے کوئی
مگر سنا ہے مجھے اب بھی چاہتا ہے کوئی
وہ خواب جس کو کبھی ہم نے مل کے دیکھا تھا
سنا ہے اب بھی وہی خواب دیکھتا ہے کوئی
سزا ملی ہے جسے وہ تو ایک مہرہ ہے
گناہ گار پسِ غیب دوسرا ہے کوئی
جہاں بھی جاؤ وہی خواب ڈسنے لگتا ہے
کہ اپنے سائے سے ڈر ڈر کے بھاگتا ہے کوئی
یہ روشنی جو اچانک فضا میں پھیل گئی
ستارہ ٹوٹ کے شاید کہیں گرا ہے کوئی
بچھڑنے والوں کو ملتے ہوئے بھی دیکھا ہے
ہوا ہے یہ بھی مل کے بچھڑ گیا ہے کوئی
یہی تو فرق ہے شاؔمی جنون و چاہت میں
کہ کوئی بھول گیا، راہ دیکھتا ہے کوئی

....

محسن باعشن حسرت (کولکاتا)

سمندر میں ہمیشہ مجھ کو آندھی آزماتی ہے
مگر ہر بار میرے حوصلوں سے ہار جاتی ہے
تھکا ہارا کبھی سو جاتا ہوں بستر پہ گرتے ہی
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ماں لوری سناتی ہے
خدا کو اُس گھڑی شدّت سے وہ بھی یاد کرتا ہے
کسی کافر کی جب کشتی بھنور میں ڈگمگاتی ہے
نہ جانے کیسا رشتہ ہے کبھی شہروں سے دلّی کا
"کوئی بھی شہر جلتا ہے تو دلّی مسکراتی ہے"
کبھی ہوتا نہیں تکلیف کا احساس بھی مجھ کو
مری جانب مری ماں دیکھ کر جب مسکراتی ہے
ٹپکتا ہے کہاں آنکھوں سے اک قطرہ بھی آنسو کا
مگر تقدیر ہے جو خون کے آنسو رُلاتی ہے
عجب سا اک معمہ ہے یہ میری زندگی حسرتؔ
کبھی مجھ کو رُلاتی ہے، کبھی ہر پل ہنساتی ہے

....

ڈاکٹر احسان عالم (دربھنگہ)

مٹانا دل سے کدورت بہت ضروری ہے
جلانا شمعِ محبت بہت ضروری ہے
سنانا نغمۂ وحدت بہت ضروری ہے
مٹانا نقشِ عداوت بہت ضروری ہے
مفادِ ملک میں طاقت لگائیں ہم اپنی
بچانا دیش کی عزت بہت ضروری ہے
محبتوں سے کریں زندگی بسر باہم
سجانا گلشنِ بھارت بہت ضروری ہے
رہے نہ کوئی پریشاں نہ غم زدہ کوئی
ہر ایک گھر میں مسرّت بہت ضروری ہے
نہ دیکھے کوئی کسی کو کبھی حقارت سے
سبھوں کی سب کریں عزت بہت ضروری ہے
عداوتوں کا نہیں سلسلہ رہے احسانؔ
بسانا پیار کی جنت بہت ضروری ہے

ڈاکٹر ارمان نجمی (پٹنہ)

بے گناہی کی سزا بھی رسن و دار ہے کیا
میرا عادل بھی غنیموں کا طرف دار ہے کیا
لب کشائی سے بھی کیوں خوفزدہ ہوں اب تک
پوچھتا رہتا ہوں خود سے مرا کردار ہے کیا
اس کے سائے کا سکوں کر نہ دے معذور کہیں
دیکھ تو لیجئے پہلے پس دیوار ہے کیا
جنس غیرت کی سجائے ہوئے دوکان ہیں ہم
رات کے پردے میں بھی گرمی بازار ہے کیا
کھل کے کہنے کے بھی آداب سخن ہوتے ہیں
استعارہ ہی فقط صورت اظہار ہے کیا
اپنے دہشت زدہ ماحول کی چیخیں سنئے
خون میں ڈوبی ہوئی سرخی اخبار ہے کیا
ہیچ آفت نہ رسد گوشہ تنہائی را
اب یہ ملفوظہ ہمیں باعث آزار ہے کیا
ایک نقطے سے بدل سکتا ہے لفظوں کا مزاج
غین کو عین بنانا کوئی دشوار ہے کیا

کرشن پرویز (کھراڑ، پنجاب)

لوگ پھیلائے جال اردو کا
خوب کھاتے ہیں مال اردو کا
ہر زباں کی وہ بات کرتے ہیں
نام لیں کیا مجال اردو کا
کرتے پیدا زبان کے جھگڑے
کرتے جینا محال اردو کا
سب تلے ہیں اسے مٹانے پر
کون کرتا خیال اردو کا
اب تو شاعر کمال کرتے ہیں
نام ہندی کا مال اردو کا
کوئی کیسے اسے بھلا پائے
کام ہے بے مثال اردو کا
اک لڑی میں پرودیا سب کو
سب نے دیکھا کمال اردو کا
ہم نے پرویز خود مٹا ڈالا
جو تھا جاہ و جلال اردو کا

قطعات

انجم عظیم آبادی (کولکاتا)

''گیسوئے اسلوب''

شامل اس میں ہیں مضامینِ نفیس
ہے امام اعظم کی کوشش کامیاب
اُظم کے جو پارکھی ہیں دیں گے داد
'گیسوئے اسلوب' ہے عمدہ کتاب

بہ شکریہ: ''اخبار مشرق'' کولکاتا، ۲ر ستمبر ۲۰۱۸ء

حلیم صابر (کولکاتا)

''گیسوئے اسلوب''

ہے امام اعظم کا روشن ذہن و دل
ناقدانہ طرز بھی کیا خوب ہے
بول اٹھے پڑھ کر ادب کے قارئین
عمدہ کاوش 'گیسوئے اسلوب' ہے

بہ شکریہ: ''اخبار مشرق'' کولکاتا، ۲ر ستمبر ۲۰۱۸ء

سلطان شمسی (برداہا، مدھوبنی)

لوح و محفوظ کی تحریر مٹے گی کیسے
"حق کی آواز ہے باطل سے دبے گی کیسے"

لوگ کوشاں ہیں مٹانے کو مٹانے دو انہیں
عزم کی لو ہے ہواؤں سے بجھے گی کیسے

مہرباں گر نہ ہو شبنم تو بتاؤ آخر
جو گلستاں کی کلی ہے وہ کھلے گی کیسے

آج نفرت کی جو دیوار ہے آنگن میں کھڑی
آخرش دوستو دیوار ہٹے گی کیسے

رات کتنی ہی نہیں تیرگی چھٹتی ہی نہیں
صبح ہونے کو ہے ظلمت یہ چھٹے گی کیسے

جب کہ شمسی پہ کرم میرے خدا ہے تیرا
سر سے دستار طرح داری اٹھے گی کیسے

....

حیدر وارثی (دربھنگہ)

زمیں پہ آیا وہی ایک مہرباں کی طرح
"جسے سنبھال کے رکھا تھا ہم نے جاں کی طرح"
وہی ہے سارے خلائق کا پالنے والا
اُسی نے پالا ہے ہم سب کو ایک ماں کی طرح
وہ جگنوؤں سا خیابار ہے چہار طرف
ملا تھا کل جو مجھے دھواں دھواں کی طرح
وہ خلوتوں میں ہمیشہ اداس رہتا ہے
نظر جو آیا ہمیں آج شادماں کی طرح
شعاع تند نہ ہوتی ضرر رساں ہرگز
اگر وہ آتا نظر کاش! سائباں کی طرح
کیا ہے نظرِ تصرف نے مجھ کو کار آمد
میں کل تلک تو رہا سعیِ رائیگاں کی طرح
اسی کی سمت تو رہتا ہے ہر کس و ناکس
جو اپنے آپ میں ہے میرِ کارواں کی طرح
ملی ہے جس کو محبت زمین والوں کی
وہ دیکھتا ہے کہاں کسی کو آسماں کی طرح
نہیں ہے اُس کے سوا کوئی دوسرا حیدر
میں جس کے سامنے رہتا ہوں ناتواں کی طرح

....

نظر اپنی اپنی

(تبصرے کے لئے دو کتابیں بھیجنا لازمی ہے۔)

● **نام کتاب: کلیات امجد نجمی شاعر: کرامت علی کرامت ص: ۷۰۴ قیمت: ۴۲۵ روپے**
رابطہ: رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک-۷۵۳۰۰۱ (اڈیشہ) مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ڈاکٹر کرامت علی کرامت عمر کے ۸۳ ویں پڑاؤ میں ہیں لیکن آج بھی بیحد فعال ہیں۔ ان دنوں ترتیب کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور گم شدہ کو اعتبار بخشنے اور نئی نسل سے آشنا کرانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی نئی کتاب امجد نجمی کے شعری کلام کی کلیات ہے۔ جس کی اشاعت اڈیشہ اردو اکاڈمی سے ہوئی ہے۔

امجد نجمی کا تعلق اڈیشہ سے رہا ہے لیکن وہ اردو کے معروف اور مشہور شاعر اور صحافی تھے۔ ان کی شاعری میں کائنات اور انسانی زندگی کے بہت سے بنیادی مسائل کا بیدار شعور ملتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ انسان اور انسان کے درمیان کے تعلق کی نوعیت و حقیقت، فرد کی زندگی کے نشیب و فراز جیسے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی فکر ان کے شاعرانہ شعور کا لاینفک جز رہی ہے اور ان کا وجدان پر اسرار کیمیاوی عمل کے ذریعے فکر، جذبہ اور احساس کے پیچیدہ عناصر کو ایک ناقابل تقسیم وحدت میں تبدیل کرتا رہا ہے۔ اس وحدت اور جذبات، ذہنی افکار اور احساس کی تیزی کے اظہار کا وسیلہ انہوں نے نظم اور غزل کو بنایا تھا۔ ان دونوں صنف شاعری میں ان کی دروں بینی اور مشاہدۂ ذوقی کی گہرائی کو دیکھا جاسکتا ہے۔ امجد نجمی اپنی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میں شہر کٹک کے مشہور محلہ بخشی بازار میں، جہاں اس وقت میرا آبائی مکان ہے، ۲۹ر اکتوبر ۱۸۹۹ء کو بروز اتوار کتم عدم سے عالم شہود میں آیا نہیں، بلکہ لایا گیا۔ کیونکہ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ مجھ پراگندہ طبع اور آشفتہ مزاج بندہ عاصی کی آفرینش سے قدرت کے پیش نظر کون سا ایسا زریں مقصد تھا تو اکثر ''نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا'' کی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہوں۔'' مزید تفصیل مظہر امام بتاتے ہیں:

''آج کے دور میں جب لوگ مجموعۂ کلام پہلے چھپواتے ہیں، شعر بعد میں کہتے ہیں، ایک ایسے بزرگ شاعر کا مختصر سا مجموعہ پہلی بار منصۂ شہود پر آرہا ہے، جس نے اپنی عمر عزیز کا تین چوتھائی سے زیادہ حصہ شعر و ادب کی بے لوث خدمت میں صرف کیا ہے اور جس کا شعری سرمایہ امتداد زمانہ کے باوجود اب بھی اتنا محفوظ ہے کہ بہ آسانی کم از کم چار ضخیم مجموعے مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ اس شاعر کا نام امجد نجمی ہے۔......''

امجد نجمی کی شاعری پر علامہ نیاز فتح پوری کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے:

''میں کبھی اس کی توقع نہیں کرسکتا تھا کہ سرزمین اڑیسہ سے کبھی کوئی ایسا شاعر ابھر سکتا ہے جس کو اگر شمالی ہند کی صف شعراء میں بٹھادیا جائے تو اس کی آواز سن کر ہم ''تو زخاصگان مائی'' کہنے پر مجبور ہوں۔''

کرامت علی کرامت اپنے طویل مقدمہ میں انکشاف کرتے ہیں:

''تخلیقی ادب کے پہلو بہ پہلو ڈرامہ نگاری سے بھی امجد نجمی کو بڑا ذہنی لگاؤ تھا۔ انہوں نے اڑیسہ اور

آندھرا میں اردو اسٹیج کو سنوارنے میں سب سے اہم حصہ لیا۔ انہوں نے کٹک، خردہ روڈ، بھدرک، شالی مار (کلکتہ)، وشاکھا پٹنم، کڈپہ وغیرہ مقامات پر آغا حشر کے ڈراموں کے علاوہ خود ان کے لکھے گئے چار ڈرامے اسٹیج کر کے خراج تحسین وصول کیا۔"

''کلیات امجد نجمی'' میں ڈاکٹر سید مشیر عالم کی گفتنی، اکابر کے خطوط، امجد نجمی کے نام، صدائے اڑیسہ کے ''نجمی نمبر'' کے لئے ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب کا پیغام، مسیحی راؤت رائے کا اظہار خیال'' مالک رام کا تعارف، کرامت علی کرامت کا مقدمہ، مظہر امام اور سید حرمت الاکرام کے تعارف مناظر عاشق ہرگانوی کا ان کی غزل گوئی پر مضمون، امجد نجمی مشاہیر کی نظر میں اور امجد نجمی کے انتقال پر تعزیت نامے اور منظوم نذرانۂ عقیدت کے ساتھ امجد نجمی کا تمام کلام اس'' کلیات'' میں ذوق کی آبیاری کر رہے ہیں۔

● **نام کتاب: شارب ردولوی: ادبی سفر کے پچاس سال مرتب: ڈاکٹر حسن مثنیٰ ص: ۳۲۷ قیمت: ۳۰۰ روپے**
رابطہ: حامی بک ڈپو، ۱۲۵ مچھلی کمان، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۲ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ڈاکٹر حسن مثنیٰ اب ہمارے بیچ نہیں رہے۔ وہ ریاست جھارکھنڈ کے ایک کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ اپنی زندگی میں ہی انہوں نے کتاب ''شارب ردولوی: ادبی سفر کے پچاس سال'' کے عنوان سے شائع کرائی تھی۔ ترقی پسند ناقدوں میں ڈاکٹر شارب ردولوی بے حد اونچے مقام پر ہیں۔ وسیع مطالعہ اور اہم نظریات کے پیش نظر ان کے تصورات اور تنقیدی اصول و مباحث کی تفہیم دور رس پہلو لئے ہوتی ہے۔ تجزیے سے وہ مکمل نقش پیش کرتے ہیں اور ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ سائنٹفک طرز پر فن کو پرکھنے کے ساتھ پرانی قدروں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح پرانی روش میں تغیر پیدا کر کے شارب ردولوی نئی روشنی سامنے لائے ہیں اور اہم پہلو پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ساتھ ہی شخصیت، اصناف اور تہذیب و زبان کے نئے تصور کے حوالے سے متن کے ثقافتی مزاج کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں متانت، استدلال اور وضاحت ہوتی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب سات حصے میں منقسم ہے۔ حالات و کوائف کی تفصیل الگ سے ہے۔ حسن مثنیٰ نے ''اعتراف'' میں لکھا ہے کہ شارب ردولوی پر مضامین لکھوانے میں انہیں کتنی دشواری ہوئی ہے اور مصلحت کوشی کی وجہ سے ان کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے۔ وہ بتاتے ہیں:

''جب میں اس کام کو تکمیل کی منزلوں سے ہمکنار کرانے پر آمادہ ہوا اور Dead-Line قریب آنے پر مضامین کے لئے تقاضے شروع کئے تو اپنوں نے خطوط کا جواب دینا یا میل پر حال احوال جاننا تو دور فون پر آواز سننا بھی بند کر دیا۔ تقاضے رائیگاں گئے۔"

ان سب کے باوجود'' تاثر نہ کہ تنقید'' کے تحت حفیظ نعمانی، عارف نقوی، محمد مثنیٰ رضوی، حسن عباس فطرت، شہزادانجم، فاروق ارگلی، احمد ابراہیم علوی، پرویز احمد اعظمی اور ارشاد امروہوی کے مضامین شامل ہیں۔

''شارب ردولوی بحیثیت ناقد'' کے عنوان سے احتشام حسین، اعجاز حسین، سید محمد عقیل رضوی، وہاب اشرفی، فضل امام رضوی، علی احمد فاطمی، علیم اللہ حالی، احمد سجاد، خالد اشرف، مولا بخش، مشتاق صدف، منور حسن کمال، سید محمد

ارشد رضوی، عرشیہ جبیں، سید الفت حسین، ریشماں پروین اور حسن مثنیٰ کے مقالے ہیں۔ ''مرثیہ کی تنقید'' کے زیرِ عنوان اعجاز حسین، حسن عباس، وسیم حیدر ہاشمی، ریحان حسن اور نشاں زیدی نے مضامین لکھے ہیں۔ ''اندازِ بیاں یوں بھی'' کے تحت فاروق صدیقی، وِدیا ساگر آنند، اخلاق احمد آہن اور محسن رضا رضوی کے مضامین شامل ہیں۔ ''ادبی مکالمے'' دو ہیں۔ حسن مثنیٰ کا انٹرویو شارب ردولوی سے براہ راست ہے لیکن عرشیہ جبیں نے شارب ردولوی سے متعلق گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی سے سوالات کے جواب لئے ہیں۔ ''خاکے'' کے عنوان سے مجتبیٰ حسین، شاہنواز قریشی، نصرت ظہیر اور اسد رضا نے حکیم التنقید اور نستعلیق شخصیت کے مالک شارب ردولوی کا خاکہ کھینچا ہے۔ ''چند یادگار تصویریں'' کے تحت سولہ رنگین تصویریں شامل ہیں۔

سبھی مضامین محبت، عقیدت اور تنقیدی زاویۂ نظر سے لکھے گئے ہیں جن کا پیمانہ ایماندار اور غیر جانبدار ہے۔ اس طرح شارب ردولوی کی شناخت بھرپور طور پر سامنے آتی ہے۔

....

● نام کتاب: علی امام کے افسانے   مصنف: علی امام   ص: ۳۶۸   قیمت: ۳۵۰ روپے
رابطہ: تیسری منزل، اکبر ہاؤس، دریاپور، سبزی باغ، پٹنہ-۴   مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

۱۹۶۰ء کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نسل سامنے آئی اس میں علی امام اس نہج سے منفرد ہیں کہ انہوں نے مٹنے اور کھونے کے ساتھ نفی سے رشتہ قائم رکھا ہے۔ اسی لئے افسانوی کردار کے رشتوں کی ڈور الجھی ہوئی نظر آتی ہے جس میں عجیب سی شکستگی اور کشمکش ہے۔ آج یعنی گزشتہ پچاس ساٹھ سال سے مادیت کے اصول نے زندگی کو بے مقصد بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے میں تجزیاتی طور پر اپنی پہچان کھونا ایک ہولناک ابتدائیہ ہے جس کی سچائی علی امام کے افسانوں میں ملتی ہے۔ عمل، ردِ عمل، بصیرت اور وجدانی عنصر وہ اعتبار ہیں، مثبت رویے پر ایسا یقین ہے اور فطرت کے ساتھ جبلت کی ایسی نرماہٹ ہے جس سے سوچ اور فکر اثر انداز ہو کر علی امام کے افسانے بنتے ہیں۔ ان میں طرزِ حیات ہے، بے محابا فطری گفتگو ہے اور لفظیات و محاورات کا آئینہ ہیں جو اعمال و اقوال اور مفروضات سے آزاد ہو کر تازہ کار ہیں اور سماجی و ثقافتی شعور کے عصری منظر نامہ کو مخصوص سمت اور معیار عطا کرتے ہیں۔ سچائی کے حوالے سے اظہار کی اسی نشاندہی میں علی امام کی تخلیق کاری ہے۔ فکری جدت سے کام لے کر انہوں نے اپنے تمام افسانے زیرِ مطالعہ کتاب میں شامل کر لئے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''نہیں'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا جس میں ''ہوا اور آہنی کیل''، ''بیچ کا آدمی''، ''رپورٹ''، ''آگ اپنے اندر کی''، ''کتا اور کھوپڑی''، ''دق زدہ لہریں''، ''رنگ بدلتی ہوائیں''، ''سلسلہ''، ''پرانے کمرے میں تنہا آدمی''، ''سوانح حیات''، ''کثافت''، ''ملبے کے نیچے دبا ہوا ہاتھ''، ''ہوں''، ''نہیں نمبر ۳''، ''نہیں آگ''، ''نہیں ایک نسبی سلسلہ''، ''کہانی لکھی نہیں گئی'' اور ''نہیں اپنا ڈرامہ'' جیسے افسانے شامل تھے۔ علی امام کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''مت بھید'' دس سال بعد ۱۹۹۵ء میں منظرِ امام پر آیا تھا۔ اس میں درج ذیل افسانے تھے: ''مت''، ''خون رسی لکیریں''، ''پنچ اینڈ ونیش''، ''حادثے''، ''پگھلتی زمین پر گزرتی ہوائیں''، ''نہیں کوئی جگہ نہیں''، ''اماں''، ''بات ایک راز کی''، ''نہیں کوئی چہرہ''، ''باردار''، ''اذان''، ''ایک

نمبر کے آدمی کا پروفائل''،'' کالک نوچ لو'، کھڑی فصلوں کے نام ایک آوارہ خط''،'' تمیں نمبر صفر' اور'' گول بند' اور علی امام کا تیسرا مجموعہ'' ہاں! میں یہاں ہوں'' ۲۰۱۸ء میں تیار ہوا۔ اس میں شامل افسانوں کے نام ہیں:'' ہاں! میں یہاں ہوں''،'' سانس لیتی ہوائیں''،'' نیم کے حصے کی ہوا''،'' تم کو جانوں کہ خود کو پہچانوں''، شیشے کی زبان''، ''نیستی''،'' پپومیاں میٹھو''،'' کانکی نارا''،''نئی''،'' کوئی پتہ نہیں''،'' دو تفریق دو''،'' ثانیہ''،''عکس عکس''،''سریلی آواز''،'' گھٹن''،'' چنا مسالہ''،'' ننھے سے منسلک لمحے''،'' نہیں الف ہاں الف''،'' وداع''،'' غلامی آپ کو مبارک ہو''،'' اکائی''،'' برادری کی ناک'' (ایک بابی ڈرامہ)،'' آہٹ''،'' سائے سراب کے'' اور'' اکڑوں لڑھکا ہوا''۔

کتاب'' علی امام کے افسانے'' میں درج بالا تینوں کتابیں یکجا ہیں۔ سبھی افسانوں کو پڑھنے کے بعد علی امام کے وسیع کینوس کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ زندگی کے اتار چڑھاؤ کو انہوں نے کتنے موثر اور نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ اس مجموعہ کے پیش لفظ میں ڈاکٹر ارتضٰی کریم نے صحیح نشاندہی کی ہے:

'' ان کی کہانیاں بے جہت و بے سمت نہیں ہیں۔ ان کے یہاں منظر کشی، کردار نگاری اور پلاٹ بھی ہے۔ مقصد اور موضوع کے اعتبار سے ہم آہنگی بھی ہے۔ ان میں تازگی بھی ہے اور وہ تمام عناصر بھی جو افسانہ کے لئے ضروری ہیں یا جو افسانہ کو ارتقا سے ہم کنار کرتے ہیں۔''

ڈھیر سارے افسانوں کا یہ مجموعہ تپتے چہروں کو اپنی گرفت میں لے کر چہار طرفی ضرب کا احساس دلاتا ہے۔

....

● **نام کتاب: عربی ادبیات کے اردو تراجم   مصنف: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی   ص: ۲۴۰   قیمت: ۳۲۵ روپے**
رابطہ: اجرا، وایا: ریام فیکٹری، ضلع: مدھوبنی، بہار-۸۴۷۲۳۷   مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

کسی قوم کے کردار کی عکاسی خصوصی طور پر اس کے ادبی فن پاروں کے ذریعہ ہوتی ہے جن کے خالق وہ لوگ ہوتے ہیں جن میں عمیق فکری صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ایسے ادب سے واقفیت کے لئے اور تشہیر کے لئے دوسرے ملکوں کے اور زبانوں کے تراجم کو غیر مشروط طور پر اپنایا جاتا ہے۔

عربی زبان اور ادب فنی اور جمالیاتی قدروں سے مالا مال ہیں۔ اس طرح زندگی سے ہم آہنگ ہو کر نئے تجربات اور معلومات کے ذریعہ سماجی نظام میں معین و مددگار رہیں۔ اور اتنا وقیع سرمایہ اس زبان میں ملتا ہے کہ سماجی زندگی کی بھرپور عکاسی کے ساتھ تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی عربی زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے ذہنی رجحان میں گہرائی اور صداقت ملتی ہے۔ وہ انفرادی شعور کے ذریعہ اصلیت کو جاننے سمجھنے کی شاعرانہ کوشش کرتے ہیں جس میں دلکشی ہوتی ہے، عصری آگہی کی اسلوبیت ہوتی ہے اور عوامل و محرکات کا انتقاد و احتساب ہوتا ہے۔ ابرار احمد اجراوی کی نئی کتاب'' عربی ادبیات کے اردو تراجم'' تحقیق و تنقید کے تقاضے پوری کرتی ہے۔ الفاظ کے بین السطور سے رعنائی سامنے آتی ہے اور لفظی ندرت سے جوڑنے اور بیان کرنے کے پس پردہ حقیقت سامنے آتی ہے۔ معروضی، غیر جانبداری اور ربط باہمی کی ایسی کتاب عربی ادبیات کے حوالے سے اردو میں شاید نہیں تھی۔ ابرار احمد اجراوی نے قومی یکجہتی کے پیش نظر، ذہنی و قلبی اتحاد و اتفاق کے لئے اور لسانی کردار پر

روشنی ڈالنے کے لئے تراجم کی نشاندہی کر کے اور ران کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لے کر تقاضات اور ضروریات کو پورا کرنے کی سعی کی ہے۔جس میں وقت کا تقاضہ ہے اور اخوت کا نیا مفہوم ہے۔

زیر مطالعہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ترجمہ کا فن اور خصائص و امتیازات، ترجمہ! تصور و تناظر، ترجمہ! تعریف اور تقسیم کے عنوان کے تحت بھر پور مواد شامل ہے۔ دوسرے باب میں عربی اردو ترجمہ نگاری: سمت و رفتار، عربی اردو ترجموں کی روایت اور عربی اردو ترجمہ نویسی: آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد جیسے فکر و خیال کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور تیسرے باب میں ''عربی ادبیات کے اردو تراجم'' کے تحت شعری تراجم، قدیم دواوین اور جدید دواوین کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد نثری تراجم کو احاطۂ تحریر میں لیا گیا ہے جس میں ''سیرت و سوانح''، ''خودنوشت''، ''داستان''، ''حکایت''، ناول، ناولٹ، ڈرامہ، قصہ، افسانہ، سفرنامہ، تنقید، ادبی تاریخ اور بلاغت، انشائیہ، خطبیات، خطوط، کارٹون اور لطائف کی امتیازی خصوصیت کی آئینہ داری کی گئی ہے۔ اس طرح ابرار اجراوی نے اظہار کو دریافت کیا ہے۔ تہذیبی و روایاتی شناخت کو شائستگی بخشی ہے اور احساس و ادراک کو حالات کے نقوش سے مثبت کر کے ہزار رنگ کی جہتیں عطا کی ہیں۔ ابرار احمد اجراوی نے عرق ریزی اور دیدہ وری سے کام لے کر جو منظرنامہ پیش کیا ہے اس میں افکار و نظریات کے نئے افق ہیں اور منثور و منظوم ادبیات کی تفصیلی جانکاری ہے۔ اس تعارفی و تنقیدی جائزہ سے بہت بڑے سرمایہ کی توضیح سامنے آتی ہے اور عربی ادب و فن کے خصائص و امتیازات کے اہداف کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس میں ترجیح و تفریق نہیں ہے بلکہ ترجمے کی نشاندہی کے تناظر میں بنیادی اور بیشتر خصوصیات کا محاسبہ ہے۔ عربی ادب شناسی کی یہ کتاب علمی تشنگی کی سیرابی کرتی ہے اور وسیع تر ادراک و اظہار کا حصہ بنتی ہے۔

....

● **نام کتاب: بوجھ سکھی رے بوجھ شاعر: فراغ روہوی ص: ۲۰۰ قیمت: ۲۰۰ روپے**

رابطہ: گلستان پبلی کیشنز، ۶۷ر مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کولکاتا-۷۳ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

فراغ روہوی زندگی کے نظریہ پر یقین رکھنے والے تخلیقی جوہر کے عکاس شاعر ہیں۔ ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے خالق ہیں اور شعر و ادب کے تغیر پذیر اور گرد و پیش سے آگاہ منظر اور پس منظر کی توسیع کے محرک شاعر ہیں اور ادیب بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی شعری اور نثری کاوشوں سے نئے مباحث اور نئے تناظر سے روشناس کرایا ہے اور احتساب کی پُر پیچ راہوں کو استوار کیا ہے۔

فراغ روہوی کی نئی کتاب ان کی کہہ مکرنیوں کا مجموعہ ہے۔ جس سے ان کا نیا ذہن سامنے آیا ہے۔ حالاں کہ کہہ مکرنی کی ایجاد گوناگوں شخصیت کے مالک امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ لیکن اس کی جدید کاری حالیہ برسوں میں ہوئی ہے۔ یعنی ۱۹۹۷ء سے ''کوہسار جرنل'' کے ذریعہ اس کی اشاعت سامنے آئی ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ش م عارف ماہر آروی، فیضی سنبل پوری، شارق جمال، شاہد جمیل، ساحر شیوی، نادم بلخی، صابر آفاقی، حکیم منظور، یونس احمر، نذیر فتح پوری، احسان ثاقب، محسن باعشن حسرت، منصور عمر، انجم عظیم آبادی، نور پیکر، نسیم اختر، ساگر جاپدانوی، ضمیر یوسف،

شمس افتخاری، گوہر شیخ پوروی، اشراق حمزہ پوری، شیمم انجم وارثی، نسیم عزیزی، احمد کمال حشمی، اشعر اورینوی اور مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ کے ساتھ فراغ روہوی نے اس صنف سخن میں نئی دریافتیں کی ہیں۔

فراغ روہوی کی کہہ مکرنیوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں اطلاق وانطباق ہیں اور جذبات واحساسات کی صداقتیں ہیں ساتھ ہی فکر و تجسس بھی ہے، غنائی کیفیت اور زندگی کی آگہی ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہہ مکرنی کی طینت کا خمیر نفاست ولطافت اور شیرینی سے تیار ہوا ہے۔ نسوانی لب ولہجہ کی یہ شاعری اگر چہ لوک گیتوں کی روایت تک پہنچتی ہے لیکن اس میں دو سہیلیاں ایک دوسرے سے پہیلیاں بجھاتی ہیں۔ کہہ مکرنی کے پہلے دو مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ تیسرے مصرعے کا آخری لفظ یا قافیہ پہیلی کا کلیدی لفظ ہوتا ہے۔ پہیلی کا حل اس کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔ پہلی سکھی جب تین مصرع کہہ لیتی ہے تو دوسری سکھی پہیلی کا جواب نصف مصرع میں دیتی ہے جو صحیح جواب نہیں ہوتا۔ اس طرح ہر بار دوسری سکھی غلط جواب دے کر اپنی بات تسلیم کرانا چاہتی ہے لیکن پہلی سکھی ''نا سکھی'' کہہ کر دوسرے نصف مصرعے میں صحیح حل بتا دیتی ہے۔

فراغ روہوی نے فکری جستجو اور جذباتی رچاؤ سے کام لے کر کہہ مکرنیاں کہی ہیں اور اپنی خلاقی کا ثبوت پیش کیا ہے:

بابل گھر غائب نقشے میں/ ہے ریموٹ اسی کے قبضے میں/ بندھن میں کیسی آزادی/ کا سکھی! اغوا؟/ نا سکھی! شادی

....

بن بولے دل میں بس جائے/ پھر وہ جیون بھر تڑپائے/ اس کے آگے سب لاچار/ کا سکھی: ساجن؟/ نا سکھی: پیار

....

بکھر جائے روٹین پہ جھاڑو/ تھم جائے رفتار کا جادو/ رک جائے ہر گھڑی کی ٹک ٹک/ کاری: تماشا؟/ ناری: ٹریفک

فراغ روہوی نے ہر طرح کے موضوعات کو دروں بینی کا حصہ بنایا ہے اور اختراعی ذہن سے کام لیتے ہوئے معنی خیز ہیئتی تجربے کئے ہیں۔ ساتھ ہی فکر انگیز مثالیں پیش کی ہیں۔

....

● نام کتاب: شاد شناسی مرتب: انجینئر فیروز مظفر ص: ۵۲۰ قیمت: ۶۰۰ روپے
رابطہ: ڈی-۴۰، پہلی منزل، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی-۲۵ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

انجینئر فیروز مظفر کی یہ بارہویں کتاب ہے۔ اپنے پیشے سے الگ وہ اردو کے آدمی ہیں اور ان کے اظہار خیال کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ادب میں واقعات و کیفیات سے وہ نئے نئے زاویے تلاش کرتے رہتے ہیں اور رونما رویوں کو سنوارتے رہتے ہیں۔ جذبات واحساسات، تجربات وخیالات اور واقعات ومسائل کے دامن کو وسیع کرتے رہتے ہیں، ساتھ ہی شخصیت شناسی کو اعتماد ووقار بخشتے رہتے ہیں۔

شاد عارفی پر فیروز مظفر کی یہ ترتیب وتہذیب پہچان کے اعتبار سے منفرد ہے۔ شاد عارفی کے تیور، بانکپن اور شعریت وشخصیت کی وسعت وتہہ داری کا بھرپور نقش قائم کرنے میں فیروز مظفر کامیاب ہیں۔ اس کتاب میں ان کا مقدمہ (صفحہ ۹ سے ۵۰ تک) بے حد اہم ہے۔ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہونے والے اور ۱۹۶۴ء میں انتقال کرنے والے

متین وفطین اورذکی وفہیم شاد کے ہر پہلو پر انہوں نے بھرپور طور پر لکھا ہے اوران کے تخلیقی افق کی گہرائی وگیرائی سے عکاسی کی ہے۔

زیر مطالعہ کتاب کے دیگر لکھنے والوں میں بالترتیب ضیا احمد بدایونی، سیدہ جعفر، مظفر حنفی، محمد زماں آزردہ، ماجد الباقری، سلیم اختر، محمد نعمان خان، عروج زیدی، مناظر عاشق ہرگانوی، شان بھارتی، محبوب راہی، زینت اللہ جاوید، سید صفدر، ممتاز الحق، نصرت جہاں، محفوظ الحسن، فراز حامدی، فاروق جائسی، افضل مصباحی، شریف احمد قریشی، اسد اللہ، یحییٰ نشیط، خضر حیات ناگپوری، نذیر فتح پوری، امام اعظم، سعدیہ پروین، امتیاز احمد راشد، معراج احمد معراج، فوزیہ خانم، ضیاء فاطمہ، طاہرہ اختر، رؤف خیر اور ساجد امجد کے مضامین کے ساتھ رشید احمد صدیقی، مسعود حسین، نجم آفندی، فراق گورکھپوری، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، عبدالماجد دریابادی، نورالحسن ہاشمی، وزیر آغا، محمد حسن، ظ. انصاری، قمر رئیس، خلیق انجم، عرش ملسیانی، نازش پرتاپ گڑھی، وارث کرمانی، رضا نقوی واہی، قاضی سلیم، مہدی نظمی، خواجہ عبدالغفور، بشیر بدر، احتشام اختر، بشر نواز، کرامت علی کرامت، عبدالمغنی، مخمور سعیدی، گوپی چند نارنگ، امتیاز علی عرشی، گیان چند جین، احمد ندیم قاسمی، سلام مچھلی شہری، راہی معصوم رضا، صہبا لکھنوی، ابر احسنی گنوری، شفا گوالیاری، شفق رام پوری، کوثر چاند پوری، مظہر امام، حرمت الاکرام، شہرت بخاری، عمیق حنفی، سلیمان اریب، ندا فاضلی، احمد جمال پاشا، فضل تابش، شمیم احمد، ظفر ادیب، فرقت کاکوروی، مسعود اشعر، شمیم حنفی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے تاثرات شاد عارفی پر ہیں۔

فیروز مظفر نے اپنے نفس مسیحائی سے زندگی بخشی اور ادب شناس یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ شاد عارفی کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے وہ اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> "انہوں نے اپنے عہد اور اپنے ماحول کی تمام کمزوریوں اور ناہمواریوں کو، معاشرے میں رائج بدنظمیوں اور بے اعتدالیوں، ناانصافیوں اور خودغرضیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے خواہ وہ معاشرتی ہوں، سیاسی نوعیت کی ہوں یا مذہب سے متعلق ہوں۔"

شاد عارفی کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ قدیم الفاظ کو نئے استعارے، تشبیہ اور علامت کا لباس پہناتے تھے اور انوکھے طریقے سے استعمال کرتے تھے تاکہ نشتر چبھو سکیں اور معنویت کو اجاگر کر سکیں۔ ڈرامائی، مکالماتی اور تمثیلی انداز بھی ان کی شاعری کی ایک خصوصیت ہے۔ فیروز مظفر نے شاد شناسی کا بڑا ڈول ڈالا ہے جس میں وہ سو فی صد سے زیادہ کامیاب ہیں۔

● **نام کتاب: گوش برآواز مرتب: مشتاق دربھنگوی ص: ۱۷۶ قیمت: ۲۰۰ روپے**
رابطہ: اخبار مشرق، ۱۲ درگاہ روڈ، کولکاتا-۱۷ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ایک درجن کتابوں کے خالق مشتاق دربھنگوی نیا سوچتے ہیں اور کرگزرنے کی ہمت وصلاحیت رکھتے ہیں۔ جدید وقدیم جداگانہ نوعیت کا کام وہ تاریخی تناظر میں کرتے ہیں تاکہ سمندر کوزے میں سما جائے اور اردو کے بکھرے موتی اختراعی رنگ میں چمک دمک دکھلاتے رہیں۔

مشتاق دربھنگوی بنیادی طور پر صحافی ہیں لیکن ان کی سوچ کی مصوری عالمی کینوس سے منور ہے۔ وہ عرق بینی سے کام لیتے ہیں اور سنگریزوں کو بھی گوہر اور رہ گذر کو کہکشاں میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ انفرادیت سے بھرپور اور اجتماعیت سے معمور مشتاق دربھنگوی کی نئی کتاب ''گوش برآواز'' میں ۲۷۶۴ شعراء و شاعرات کا تعارف نادر تصویر، پتہ، موبائل نمبر اور ای۔میل کے ساتھ ہے۔ تعارف کرانے کا انداز اس کتاب میں اس لئے جداگانہ ہے کہ شعراء کے ہی اپنے شعر سے وجود کی وابستگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح پونے تین ہزار شعراء کے اتنے ہی اشعار کے نمونے شامل ہیں۔ ایسی بے نظیر، بے مثال اور سخن کی خوشبو پھیلانے والی عالمی ڈائرکٹری کا کارنامہ صرف مشتاق دربھنگوی ہی انجام دے سکتے تھے۔ اس کتاب میں فنی رموز و نکات کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور معاصر شعرا کی کاوش کو اعتماد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اور یہ بڑی بات ہے۔ معتبر اور محفوظ حیثیت کی ایسی کتاب شاذ و نادر ہی وجود میں آتی ہے جس سے اردو کا وقار قائم ہے اور فیض اٹھانے کی روشنی سامنے آتی رہتی ہے۔ نگاہ دوررس اور حق شناسی کی متقاضی اس کتاب میں آشنا نمونے اس طرح ہیں۔ تصویر کے ساتھ دیگر تحریر دیکھئے:

Imam Azam امام اعظم

Gangwara, Saramohanpur, Darbhanga-846007, Bihar (India)

Mob: 8902496545, 9431085816 E-mail: imamazam96@gmail.com

اسے جنون ہے لفظوں سے کھیلنے کا بہت ہماری سادہ سی لیکن زباں نہ سمجھے گا

ایک اور مثال دیکھئے:

Shazia Akbar شازیہ اکبر

Govt. Teachers Training College, H-9, Islamabad (Pakistan)

Mob: +92,3325219290 E-mail: shaziaakbar63@gmail.com

کچھ تو نے بگاڑا ہے مجھے پیار میں اپنے کچھ میں بھی زمانے کی مثالوں سے جدا ہوں

مشتاق دربھنگوی کی کتاب کی آفاقیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں دنیا بھر کے شعرا شامل ہیں:

Akif Ghani عاکف غنی

15, Ruede La Park, 95190 Goussain Ville, France

Mob: 0033658360695 E-mail: akifghani@hotmail.com

غم نہ کر عاکف غنی یہ وقت بدلے گا ضرور آج ہے نامہرباں کل مہرباں ہوجائے گا

چونکہ عالمی ڈائرکٹری ہے اس لئے اس میں سرزمین کی قید نہیں ہے:

(Dr.) Munawar Ahmed Kanday (ڈاکٹر) منور احمد کنڈے

15, Forsythia C1, Telford, TF29TA, England (U.K.)

Mob: 0044-7778267318 E-mail: herbalcollege@hotmail.com

سبزہ زاروں نے خزاؤں سے محبت کرلی   ایسی حالت میں کہاں باغ کا مالی جائے
شناسائی کی قدر و قیمت بڑھانے والی یہ کتاب جانکاری بھری ہے۔جس سے بار بار استفادہ کیا جائے گا۔

....

● نام کتاب:کلام بیدی   مرتب:نارنگ ساقی   ص:۴۳۸   قیمت:محبان اردو کو ہدیہ محبت
رابطہ:ایل-۴، کناٹ سرکس، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱   مبصر:پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی، ساتھ ہی مواد کے اعتبار سے بالکل اچھوتی کتاب ہے جسے نارنگ ساقی نے ترتیب دی ہے۔اس میں حروف تہجی اشعار ہیں، مقبول عام اشعار ہیں، کلام بیدی کا انتخاب ہے اور انگلش، ہندی، اردو ڈکشنری ہے۔تہجی حصے کو دیوناگری میں بھی لیپ ودھ کیا گیا ہے۔

حصہ اول میں ۲۵۹ منتخب اردو اشعار (Verses) دیئے گئے ہیں اس میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے علاوہ دیگر اردو شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔مثلاً ''الفت'' کے تحت بیدی سحر کے ساتھ مجروح سلطانپوری، منخشب چارجوئی، ظہیر دہلوی، حسرت موہانی، شان الحق حقی اور افضل پشاوری کے اشعار ہیں۔اسی طرح انتظار، انسان، آئینہ، آہ، بدن، تمنا، چراغ، حُسن، حسین، خدا، دل، دعا، رقیب، زندگی، زلف ساقی، صورت، طوفان، عشق، غم، قیامت، گیسو، لب، محبت، نشیمن، وفا، ہجر اور یاد جیسے عنوان کے تحت اشعار ہیں۔اسی ترتیب سے مقبول عام اشعار کو حصہ دوم بنایا گیا ہے۔جس میں اشعار کی تعداد ۲۶۶ ہیں۔کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے کلام کا انتخاب صفحہ ۱۵۶ سے ۲۰۵ تک ہے۔اس کے بعد حروف تہجی کے تحت صفحہ ۲۰۹ سے ۴۳۸ تک انگلش، ہندی اور اردو ڈکشنری ہے۔جس سے اس کی قدر و قیمت اور محنت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ پوری کتاب عملی رویے، تخلیقی و ترجیحی حسیت، فکری جدت اور ہم آہنگی کی وحدت کو سامنے لاتی ہے۔ایسی کتابوں کا کردار استفادہ کرنے کے لئے ہوتا ہے اور زبان و بیان کے تشخص کی جانکاری کے لئے ہوتا ہے۔نارنگ ساقی کی اس خصوصیت سے آگاہی کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔

....

● نام کتاب:نقد و مقال   مصنف:ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن   ص:۲۸۰   قیمت:۱۷۳ روپے
رابطہ: پرنسپل، ایس کے اے ایچ ملت کالج، باشانگر، داونگیرے-۵۷۷۰۰۱ (کرناٹک)
مبصر:پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ڈاکٹر داؤد محسن بے حد فعال شخصیت کا نام ہے۔انہوں نے افسانے لکھے ہیں، شاعری کی ہے، تراجم کئے ہیں اور تحقیق و تنقید کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ان کی تنقید و تحقیق میں اثر انگیزی ہے، لسانی ساخت کی تلاش ہے، فن پارے کے جمالیاتی عناصر کا مطالعہ ہے اور نئے تصور کے حوالے سے ثقافتی مزاج کو پرکھنے کا اپنا انداز ہے۔انہوں نے روایات کا بھی احاطہ کیا ہے اور تجزیاتی تنقید کی بھی وضاحت کی ہے۔ان کی فکر انگیز مباحث میں فکری بیداری کے ساتھ ادب اور فن کی پرکھ دیکھی جاسکتی ہے۔

زیر مطالعہ کتاب میں الگ الگ نظریات و رجحانات سے وابستہ اصناف و شخصیات کی افہام و تفہیم ہے۔ مبادیات اور اساسی پہلو سے آشنائی ہے اور نفسیاتی عمل کو جاننے پرکھنے کی کوشش ہے۔ سبھی ۲۲ مضامین توجہ طلب ہیں۔

آزاد غزل معنویت اور روایت، اکیسویں صدی میں اردو غزل، تنقید کا بدلتا ہوا منظر نامہ، اردو کے غیر مسلم تنقید نگار، اردو تلمیحات کا حکائی پس منظر، اردو ناول: رجحانات و میلانات، لیلیٰ کے خطوط، علامہ اقبال اور تسل نو، مولانا ابوالکلام آزاد: صحافت کے آئینے میں، ہندوستانی لسانیات کا تجزیہ، شمس الرحمٰن فاروقی کے انٹرویو: ایک جائزہ، موازنہ انیس و دبیر کا محاکمہ، رومانی اور انقلابی شاعر: مجاز، جوش کی شاعری میں لفظ و معنی کا عدم توازن، سوشلزم کا شیدائی: کیفی اعظمی، ندا فاضلی اور ان کا فن، اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، حمید سہروردی کا افسانوی رنگ، سلام بن رزاق کے افسانہ 'دوسرا قتل' کا تنقیدی جائزہ، کرناٹک میں جدید نظم کی صورت حال، 'کنڑا اور اردو زبان میں سماجی مسائل' اور 'کنڑا وچن اور سنت شری بسویشور'۔

آزاد غزل کی معنویت، ہیئت اور ساخت پر مدلل بحث کرتے ہوئے اور اس کی مقبولیت کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے آخر میں ڈاکٹر داؤد محسن اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

> ''آج حال یہ ہے کہ آزاد غزل عروج پر پہنچتے پہنچتے پستی کی طرف آچکی ہے۔ وجدانی، جمالیاتی، تخیلی یا معنوی لحاظ سے نشاط و غم کو اس صنف سخن نے نفسیاتی کیفیات و تجربات کا شعور خالص تو عطا کیا لیکن منطقی تسلسل یا عقلی تسلسل برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے اس صنف کی آفاقیت کم ہوگئی۔''

ڈاکٹر داؤد محسن نے ''اردو تلمیحات کا حکائی پس منظر'' جیسے مضمون میں ترسیل کی نئی جہت تلاش کرتے ہوئے اپنے وسیع مطالعہ اور ادب پر دسترس کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ادب کی تفہیم کی یہ جہت فنی اقدار کے تعین میں مددگار ہے۔ طرز نقد کے اس پہلو سے اثرات کی آگہی سامنے آئی ہے۔ تاریخی انداز میں حکایاتی حقیقت نگاری کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''تاریخی واقعات'' سیاسی مسائل، تہذیبی و سماجی پہلو، دیومالائی واقعات، مذہبی معرکوں، تاریخ ساز ہستیوں اور مذہبی بزرگوں کے کارناموں، قرآن مجید کی آیات، احادیث، اقوال، علم نجوم و موسیقی کی اصطلاحات، داستانوی یا مثالی کرداروں کے کارناموں کو سننا انسانی فطرت میں شامل ہوگیا۔ قصہ کہانیوں سے پرے جب ہم لفظ ''حکایت'' سنتے ہیں تو ہمارا ذہن شیخ سعدی کی گلستان یا مولانا روم کی مثنویات کی طرف بے ساختہ چلا جاتا ہے۔ فن میں اخلاقی، اصلاحی اور مذہبی و ثقافتی پہلو نمایاں ہیں جبکہ ہمارے شعر و ادب میں جو قصے کہانیاں ہیں ان کے پس پردہ حکائی پہلو پائے جاتے ہیں۔''

دیگر سبھی مضامین مدھم روشنی ضرور بکھیرتے ہیں جن میں دریافت ہے، صحت مند تنقید ہے، مدلل تحقیق ہے اور نئی فکر کی توسیع ہے۔ ڈاکٹر داؤد محسن متعدل اور متوازن طریق اپناتے ہیں تاکہ اثرات کی تفہیم کا منظر اور پس منظر نمایاں ہوسکے ساتھ ہی مفصل پہلوؤں کی جہتیں سامنے آسکیں۔

....

● **نام کتاب: ساحرلدھیانوی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ مصنف: ڈاکٹر محمد عبدالمعروف ص: ۳۷۲**
قیمت: ۴۰۰ روپئے رابطہ: چمن سرائے، سنبھل (یوپی) مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

جذباتی اور ذکی الحس شاعر ساحرلدھیانوی پر بہت لکھا گیا ہے۔ان پرنئی کتاب ڈاکٹر محمد عبدالمعروف نے اردو کو دی ہے۔اس کتاب میں درج ذیل عنوان سے مواد ہے:

ساحرلدھیانوی: تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے، ساحر کی سحر طرازی اور کوزۂ معروف جیلانی، ''ترقی پسند تحریک کا اجمالی جائزہ، تحریک کا سیاسی، سماجی و ادبی پس منظر''، آغاز وارتقا، اردو شاعری پر تحریک کے اثرات، ساحر لدھیانوی کے سوانحی کوائف اور شخصیت (سوانح کے تحت وطن، خاندان، ولادت اور پرورش، تعلیم، ادبی ذوق کی نشوونما، معاشقے، عقائد، معاش، ترقی پسند تحریک سے وابستگی، فلمی زندگی، تخلیقات، اعزازات، وفات)، شخصیت و سیرت (اس کے تحت قد وقامت و شباہت، ملبوسات، ماند و بود، طرز گفتگو، دوست واحباب، مزاج میں نفاست، پسند و ناپسند، حساس و گداز دل، بے تعصبی و مذہبی رواداری، اعلیٰ ظرفی و خودداری، سادگی و بے لوثی، ماں کے اطاعت شعار، منکسر و رحم دل، شوخی و بذلہ سنجی، مطالعہ و شاعری سے رغبت، خوش اخلاق و مہمان نواز، منشیات کا استعمال، گانے و موسیقی کا شوق، ساحر کی سیرت و شخصیت کا تنقیدی جائزہ)، ساحر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ (اس کے تحت ساحر کی شاعری، اہم نظموں کا تعارف و تنقیدی مطالعہ، ساحر کی فلمی گیت نگاری، منتخب گیتوں کا تجزیاتی مطالعہ)، ساحر کی غزل گوئی (اس کے تحت غزلیہ شاعری، اشاریہ غزلیات، غزلوں میں سیاسی و معاشرتی مسائل اور ترقی پسند عناصر، ساحر کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ) اور ''ماحصل'' کے تحت اہم معاصرین سے تقابل، اکابرین کی آرا، فلمی کلام کی ادبی وقعت اور مجموعی قدر و قیمت جیسے عنوان سے مجموعی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا ہے۔

ساحرلدھیانوی پر تحقیقی و تنقیدی معیار کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں ان پر کوئی بھی گوشہ یا پہلو تشنہ نہیں ہے۔ نازصدیقی، انور ظہیر انصاری، سلیمان اطہر جاوید، مخمور سعیدی، اطہر جاوید اور مناظر عاشق ہرگانوی کی کتابیں ساحر لدھیانوی پر ضرور ہیں لیکن ان میں تجزیاتی مطالعہ کا انداز الگ الگ ہے اسی لئے مکمل ساحرلدھیانوی ایک جگہ نہیں آئے ہیں۔ڈاکٹر محمد عبدالمعروف تنقیدی روشنی ڈال کر شخصیت اور فن کی جولانیاں دکھانے میں ہر نہج سے کامیاب ہیں۔وہ زندگی کے عکاس ناقد ہیں، صحت مند تنقیدی شعور رکھتے ہیں ان کے ادبی افکار تفہیم و تحسین کا مطالعہ پیش کرتے ہیں اور جمالیاتی پہلو تلاش کرتے ہیں۔اس طرح وہ اعتدال و توازن سے کام لیتے ہیں اور ساحرلدھیانوی کے حوالے سے سماجی، تہذیبی، فلمی اور ادب کے رشتے سے نقش بھری مثال پیش کرتے ہیں۔ساحر کی ترجیحات پر روشنی ڈالتے ہوئے تپش آمیز تنقیدی رائے دیکھئے: ''ساحر نے فلمی گیتوں کے علاوہ نظمیں اور غزلیں بھی لکھیں جن میں استحصال، غلامی، افلاس، سماج میں پھیلی نفرت اور تعصب کے موضوعات شامل تھے، ساحر نے بعض دوسرے ترقی پسندوں کی طرح نعرہ بازی کو ہی اپنا ہتھیار نہیں بنایا بلکہ ان کے ہاں جذبات کا غلبہ اور معتدل و شائستہ لب ولہجہ بھی نظر آتا ہے۔انہوں نے جذبات واحساسات کی ترسیل کے لئے ادب کی صالح اقدار اور روایات کو ترجیح دی۔''

ڈاکٹر محمد عبدالمعروف نے تفصیل بتائی ہے کہ ساحر سگریٹ، بیڑی اور شراب پیتے تھے:

''قیام لاہور میں جن دنوں 'ادب لطیف' کے ایڈیٹر تھے، تب انہیں سگریٹ پینے کا شوق ہوا۔ دھیرے دھیرے وہ اس کے عادی ہو گئے، مگر گھر میں بیڑی پیتے تھے۔ فلمی دنیا میں داخل ہونے کے بعد سگریٹ نوشی میں اضافہ ہوا۔ قیام بمبئی کے ابتدائی زمانے میں وہ شراب سے پرہیز کرتے تھے۔ بعد میں انہیں 'لو بلڈ پریشر' کی شکایت ہو گئی۔ فیملی ڈاکٹر آر پی کپور کے کہنے پر کبھی کبھار تھوڑی مقدار میں برانڈی قسم کی شراب کا استعمال کرنے لگے، اس سے ان کے مرض میں کچھ افاقہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد شراب پینے لگے اور پھر وہ ام الخبائث یعنی شراب کے عادی بن گئے۔''

تنقیدی عناصر کے ساتھ عبدالمعروف کی یہ کتاب دلچسپ اور جانکاری بھری ہے۔

....

● نام کتاب: تعلیم اور تعلیمی تصورات مصنف: ڈاکٹر احسان عالم ص: ۱۴۴

قیمت: ۹۸ روپے رابطہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

چند اہم ماہر تعلیم کے تعلیمی نظریات پر مبنی ڈاکٹر احسان عالم کی زیر مطالعہ کتاب میں تعلیم سے متعلق فکر کی وضاحت ہے۔ اصول و قوانین کا امتیاز ہے اور جدید علوم کے حصول کے جذبے کی کارفرمائی ہے۔ ساتھ ہی حرکیت و تصوریت کے امتزاجی عوامل کی انفرادیت ہے۔ معاشرہ اور سماج کی تشکیل کے لئے، نسوانی حقوق کو ممتاز بنانے کے لئے اور انسانیت، اخلاقیات اور روحانیت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے صحت مند تعلیم ضروری ہے۔ احسان عالم نے عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھ کر تعلیم اور تعلیمی تصورات پر کتاب لکھی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے آج کے دور میں نفسیاتی حقیقتیں تعلیم سے ہی سامنے آتی ہیں۔ اس طرح اسرار و رموز اور نشیب و فراز کی گرم بازاری کو سمجھا جا سکتا ہے۔ احسان عالم نے اصلاح معاشرہ کے لئے، ثقافت اور تہذیب سے آشنائی کے لئے اور نصابی طلباء کی ضرورتوں اور دلچسپیوں کے لئے تعلیم حاصل کرنے اور دینے کا رجحان اپنی کتاب کے ذریعہ عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

نظریۂ تعلیم، راجہ رام موہن رائے اور تعلیم، سرسید احمد خاں کے تعلیمی تصورات، مولانا الطاف حسین حالی کے تعلیمی نظریات، بدرالدین طیب جی کے تعلیمی نظریات، اکبرالہ آبادی کے تعلیمی نظریات، علامہ شبلی نعمانی کا تعلیمی تصور، رابندر ناتھ ٹیگور کا فلسفۂ تعلیم، گاندھی جی کا تعلیمی فلسفہ، علامہ اقبال کا نظریۂ تعلیم، مولانا ابوالکلام آزاد کا نظریۂ تعلیم، ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعلیمی تصور، ڈاکٹر سید عابد حسین کے تعلیمی نظریات، مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے تعلیمی نظریات، اور ہندوستان کے چند اہم تعلیمی ادارے۔

مذہبی تعلیم، اسلامی تعلیم، مغربی تعلیم اور ہندوستانی تعلیم کے لیل و نہار پر یہ سبھی مضامین حالات کی قوت سے نبرد آزما ہونے کے لئے اصلاحی اور اجتماعی حیثیت کے حامل ہیں۔ علم اور تعلیم کی ٹکنالوجی اور سائنس کی کیمیا دراصل نظام زندگی کی دانش و حکمت ہے، جس سے کردار بنتا ہے اور ضابطۂ حیات کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر احسان عالم نے ماہر تعلیم کے نظریات پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور منطقی و منصفانہ رویے کی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے تعلیم کے تین

نظریے کواہم مانا ہےاوراس کی اساس اور خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ان کے خیال میں اسلامی نظریۂ تعلیم، اشترا کی نظریۂ تعلیم اور جمہوری نظریۂ تعلیم سے شخصیت کو اجتماعی مادی مفاد حاصل ہوتا ہےاور زندگی کی قدروں کواستحکام ملتا ہے۔انہوں نے اصول پرستی، تنگ نظری، قومی خودغرضی اور اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی کوحق وانصاف کے منافی قرار دیتے ہوئے جمہوری نظریۂ تعلیم کی خوبیوں کواجاگر کیا ہے:

''افراد کی آزادی اور شخصیت کو پروان چڑھانے کے لئے آزادی کی فضا، ہمہ گیر لازمی اور مفت ابتدائی تعلیم کا نظم، مساوات اور آگے بڑھنے کے لئے یکساں مواقع اور صلاحیت اور محنت کے لحاظ سے ترقی کرنے کی پوری گنجائش۔''

ڈاکٹر احسان عالم نے اس کتاب میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، فورٹ ولیم کالج، مدرسہ عالیہ کلکتہ، دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ کالج، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی جیسے تعلیمی اداروں کی عملی صورت کواجاگر کیا ہے، مقاصد پر روشنی ڈالی ہےاور تعلیمی نیک نیتی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ڈاکٹر احسان عالم بنیادی طور پر سائنس کے معلم ہیں۔ڈگری کے لحاظ سے ایم ایس سی، پی جی ڈی سی اے، ڈی سی اے اور بی ایڈ ہیں۔ایل ایل بی بھی ہیں لیکن اردو سے والہانہ عشق کرتے ہیں اسی لئے اردو میں بھی ایم اے اور پی ایچ ڈی کر چکے ہیں اور اردو میں تنقید لکھتے ہیں۔ تعلیم اور تعلیمی تصورات پر ان کی کتاب بے حد اہم ہے جس سے بار بار استفادہ کیا جائے گا۔

....

● نام کتاب: دیرینہ خواب کی تعبیر مصنف: انور آفاقی ص: ۹۶ قیمت: ۱۵۰ روپے
رابطہ: ہدیٰ منزل، راج ٹولی بھیگو، دربھنگہ-۴ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

تحریر کی خوشبو اور تصویر کی دلکشی سے مزین یہ سفرنامہ آفاقی نوعیت کا اس لئے ہے کہ اس میں بہت کچھ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔شاید تحریر، تصویر اور کشمیر کی وجہ سے ایسا ہے۔جی ہاں، یہ سفرنامۂ کشمیر ہے۔

معروف افسانہ نگار اور ناول نویس وحشی سعید ہر سال اپنے رسالہ ''نگینہ انٹرنیشنل'' کے تحت سری نگر میں پروگرام کرتے ہیں۔گذشتہ سال انہوں نے ''دربھنگہ ٹائمس'' اور ''تحقیق'' کے مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر کو بھی مدعو کیا تھا۔انھوں نے انور آفاقی اور انتخاب ہاشمی صاحبان کو بھی اپنا ہم سفر بنالیا اور دربھنگہ سے پٹنہ، پٹنہ سے دہلی اور دہلی سے سری نگر تک ان تینوں نے یادگار اور قیمتی دن رات گذارے۔اسی کی تفصیل انور آفاقی نے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے اور ۷۰ تصویروں سے کتاب کو قابل دید بھی بنایا ہے۔یہ تصویریں پوسٹ کارڈ سائز میں ہیں اسی لئے واضح اور نمایاں ہیں۔پیش لفظ میں ڈاکٹر منصور خوشتر لکھتے ہیں:

''یہ سفرنامہ ایسی خوبصورت یادوں کا گلدستہ ہے جو لفظوں کی صورت میں ہمیشہ ادب کے گلشن کو خوشبوؤں سے معطر کرتا رہے گا۔انور آفاقی صاحب نے نہ صرف کشمیر کی خوشگوار یادوں کو اس سفرنامے میں محفوظ کردیا ہے بلکہ دربھنگہ سے پٹنہ، پٹنہ سے دہلی کے سفر کی تمام جزئیات کو بھی اس خوبصورتی سے لفظوں کو جامہ پہنایا ہے کہ سفرنامہ پڑھتے ہوئے ایک عام قاری بھی خود کو مصنف کا ہم سفر تصور کرسکتا ہے۔''

ڈاکٹر احسان عالم نے کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''کشمیر کا دل کہلانے والے سری نگر، وہاں کی حسین ڈل جھیل، خوبصورت باغات مثلاً شالیمار باغ، نشاط باغ، نسیم باغ اور چشمہ شاہی باغ کی ہریالی اور وہاں کے رنگ برنگے پھولوں کی کیاریوں کا تذکرہ دلکش انداز میں کر کے انور آفاقی نے قارئین کے احساس و جذبات کو جھنجھوڑ دیا ہے۔''

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد اس سفرنامہ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''گل مرگ میں برف سے شغف ہو یا کشمیر کے قدرتی حسن پر فریفتگی کا بیان ہو، وہاں کی دکانیں ہوں یا کرافٹ اور قدیم تجارتی اشیاء کی بازیافت کا ذکر ہو، ادبی تقریب کے پروقار اہتمام سے مسرور ہو جانا ہو یا پروگرام میں اخلاقی ہنرمندی کے مظاہرے ہوں، شکارا کی بناوٹ اور اس کے استعمال کا ذکر......
مصنف نے ہر جا اپنی نگاہوں کو مقدم رکھا ہے اور اپنے احساسات کو فطری انداز میں بیان کیا ہے۔''

اس سفر میں دہلی سے سری نگر تک انہیں ہم سفر کی شکل میں کرکٹ اسٹار دھونی ملے۔ ایک اقتباس دیکھئے:

''اچانک منصور نے آواز لگائی اور اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ پیچھے دیکھئے ایم ایس دھونی کھڑا ہے۔ سارے مسافر پہلے ہی فلائٹ میں جا چکے تھے۔ دھونی کے ساتھ ہم چند مسافر چلتے ہوئے فلائٹ میں داخل ہوئے۔ چلتے چلتے فوٹو گرافی بھی ہوتی رہی۔ اتفاق سے ہماری سیٹ بھی دھونی سے پیچھے تھی۔''

انور آفاقی نے مغل بادشاہوں کو محبوب سری نگر کے بارے میں بتایا ہے:

''وہی سری نگر جو جموں اور کشمیر کا دل ہے۔ سری نگر کو پہلی مرتبہ بدھ مت کے پیروؤں نے آباد کیا، ہندو راجاؤں نے حکومتیں کیں۔ اشوک اعظم جو بدھ مذہب اختیار کر چکا تھا کے دور میں شہر خوب پھولا پھلا۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے دور حکومت میں یہ مغل سلطنت کا حصہ بنا۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے سری نگر شہر کی جاگیر گلاب سنگھ نامی شخص کو سونپ دی۔''

انور آفاقی نے اس سفرنامہ میں وحشی سعید، نور شاہ، حامدی کاشمیری، الطاف انجم، اشرف آثاری، فاروق نازکی، حفیظ مسعودی، شفیقہ پروین، سید شجاعت بخاری، محمد زماں آزردہ، جسٹس بشیر احمد، زبیر قریشی، محمد امین بٹ، اقبال لون، راجہ یوسف، سلیم سالک، طارق شبنم، شوکت احمد وغیرہ سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس سے قبل دہلی میں وہ غلام نبی کمار سے مل چکے تھے اور پٹنہ میں شمیم قاسمی سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ ادبی سفر میں درج بالا فنکاروں سے ملنا فرحت بخش ہے۔ انور آفاقی نے سری نگر اور گل مرگ کو جس طرح دیکھا تھا ہو بہو اس کی نقشہ کشی کی ہے جس میں وہ کامیاب ہیں۔ یہ دلچسپ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

....

- **نام کتاب: پیامِ صبا شاعر: کامران غنی صبا ص: ۱۲۸ قیمت: ۲۰۰ روپے رابطہ: معرفت حکیم سید شاہ علیم الدین بلخی ندوی، عالم گنج، مین روڈ، گلزار باغ، پٹنہ-۷ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور**

کامران غنی صبا تازہ کار شاعر ہیں، صحافی بھی ہیں اور دونوں میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر

میں گھر کا مزاج اور اطراف واکناف کا ماحول رہا ہے، جس کی خوشبو پھیلانے میں وہ کامیاب ہیں۔

کامران غنی صبا کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے، لفظیات کا مقناطیسی رچاؤ ہے اور معنیات کا بیکراں سمندر ہے۔ یہ سبھی کیفیات مل کر جہتیں تلاش کرتی ہیں۔

''پیامِ صبا'' میں ۶ حمد، نعت اور منقبت، ۲۰ نظمیں اور ۲۹ غزلیں شامل ہیں۔ ساتھ ہی ان کی شاعری اور خصوصیت سے نظم نگاری پر اقبال واجد، عبدالرافع، منصور خوشتر، نسترن احسن فتیحی، احسان عالم، سیدہ تسکین مرتضیٰ، انوارالحسن وسطوی، حسیب اعجاز عاشر، سیدہ زہرہ عمرات اور سلمان فیصل کے مضامین سے کامران غنی کی حساسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سماج میں ردوقبول کی کش مکش پر روشنی پڑتی ہے اور زوال پذیر معاشرے سے وابستگی کا مطالعہ سامنے آتا ہے۔ کامران غنی کی نظموں میں مجھے 'آزاد ہونا ہے' کو کافی مقبولیت ملی ہے۔ فلیپ پر اور سرورق نمبر چار پر مقصود الٰہی شیخ، منصور خوشتر اور سلمیٰ بخی کی رائے کے ساتھ دیگر لکھنے والوں نے قرأت، تفہیم، فلسفیانہ آہنگ، ایمانی علامت اور عاقبت اندیشی پر استدلالی صراحت کی ہے، مقصود الٰہی شیخ کی رائے اس طرح ہے:

> ''بڑی گہرائی ہے، جوگی رنگ جھلک رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ترک دنیا کی خواہش تو ہے مگر یاسیت نہیں اور نہ ہی قنوطیت دکھائی دیتی ہے۔ جہاں اگلی سطور میں بے نامی اور انکساری کا جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے، لگتا ہے دنیا سے کنارہ کشی کی خواہش ہے پر نہیں ہے۔ یہی اس کا حسن ہے، سندرتا اور دل کو چھوتی خوبصورت اچھائی ہے۔ کہنے کو کہا جا رہا ہے کہ یہ جگ تیاگ دینے کو جی چاہتا ہے مگر اس کا درس نہیں دیا جا رہا بلکہ بے غرض (Selfiess) ہونے اور اس میں بھی جھوٹی نمائش کی نیم فطری جبلت سے چھٹکارے کی جہد ہے۔ سارے عالم میں چھائی حسن ورعنائی اور اس کی نمائش سے بے نیازی ہے۔ عارفانہ تڑپ ہے تمنا ہے۔ شاعر کتنا جھک کر اونچا اٹھتا ہے وہی اس نظم کا کمال ہے۔ یوں مرکزی خیال امر ہو جاتا ہے۔''

کامران صبا کی نظموں میں خواہش کا اعلانیہ ہے۔ سماجی محرکات پر گہری نظر، تاریخی شعور کا ادراک، زمان و مکان کا نیا پہلو اور اسلوب کا اچھوتا پن انفرادیت بخشتا ہے ساتھ ہی ان کی نظمیں حسن کاری اور اظہار پر قدرت کی اچھی مثال ہیں۔

کامران غنی صبا کی غزلوں میں الفاظ اور استعارات کی وجہ سے ذہنی ارتقا کا مطالعہ متوجہ کرتا ہے۔ فن کے جمالیاتی پہلوؤں پر بھی ان کی نگاہ رہتی ہے اور فکر کی تازہ کاری کی نمائندگی بھی ملتی ہے:

یہ بات سچ ہے میں اپنوں کے بیچ میں ہوں مگر — مرے خلاف کوئی درمیاں سے بولتا ہے

......

خواب ہو، دل ہو، اُمیدیں ہوں کہ آئینہ صبا — ٹوٹنے والی کسی شئے کی حفاظت کیسی

......

چاہتے سب ہیں زمانے میں تغیر آئے — کوئی تیار نہیں خود کو بدلنے کے لئے

......

مصلحت کی قباؤں میں جرأت تری — میری عریاں سرِ عام بیبا کیاں

کامران غنی صبا نے حقیقت کی تلاش کی ہے اور اپنی شاعری کے ذریعہ گہرائی اور بصیرت کو راہ دی ہے۔

● نام کتاب: نیرنگِ قلم مصنف: انوارالحسن وسطوی ص: ۲۲۴ قیمت: ۲۲۵ روپے
رابطہ: حسن منزل، آشیانہ کالونی، روڈ نمبر ۲، حاجی پور-۸۴۴۱۰۱ (ویشالی) مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع شدہ اس تنقیدی کتاب میں انوارالحسن وسطوی کے ۱۵ر مضامین اور ۱۵ر کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ 'حرفِ چند' کے عنوان سے ڈاکٹر ریحان غنی اور 'نیرنگِ قلم' اور نثر وسطوی کا رنگ و آہنگ' کے تحت بدر محمدی نے جائزہ پیش کیا ہے۔ 'حرفِ آغاز' کے عنوان سے خود انوارالحسن وسطوی لکھتے ہیں:

''راقم السطور کے تحریر کردہ ادبی و تاثراتی مضامین کے مداح جہاں بہت سارے نامور ناقدین ادب رہے ہیں وہیں کتابوں پر لکھے میرے تبصروں میں کئی حضرات کو ایک کمی کھٹکتی ہے وہ یہ کہ کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں اس کے مندرجات کی خامیوں اور غلطیوں کی جانب نشاندہی کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ لوگوں کی یہ شکایت بجا ہے لیکن اس تعلق سے میرا موقف یہ ہے کہ گلستاں کی سیر پھولوں کے حسن، رنگینی اور خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے لئے کرتا ہوں، کانٹوں کی تلاش کیلئے نہیں کرتا۔''

انوارالحسن وسطوی کی تنقیدی اور تبصراتی تحریروں کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر ریحان غنی رموز و نکات سے واقف کراتے ہیں:

''انوارالحسن وسطوی کا مطالعہ بہت ہی وسیع ہے۔ وہ کسی بھی کتاب کا سرسری مطالعہ نہیں کرتے بلکہ اس کی گہرائی میں جاتے ہیں، مصنف اور مضمون نگار کی نفسیات کو بھی سامنے رکھتے ہیں اور جب انہیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ غور و فکر سے انہوں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان سے قارئین کو کچھ فائدہ ہوسکتا ہے تو پھر وہ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں اور قلم کی نیرنگی اور اس کا حسن غالب آنے لگتا ہے۔''

بدر محمدی کی رائے بھی قابل توجہ ہے: ''انہوں نے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو بیان کی صداقت اور قطعیت کے متقاضی ہیں۔ ان کے زیادہ تر مضامین شخصی نوعیت کے ہیں۔ وسطوی نے نہ صرف مصنف کتاب بلکہ اس پر لکھنے والوں سے متعلق معلومات بھی دستیاب کراتی ہیں۔ 'نیرنگ قلم' کے مضامین کی شروعات ذکر اسلاف سے ہوتی ہے اور اختتام نوواردوں کی حوصلہ افزائی پر۔ گویا اس میں کلاسیکیت بھی ہے اور جدیدیت بھی، ماضی بھی ہے اور حال بھی نیز مستقبل کا پیش خیمہ بھی۔''

'نیرنگِ قلم' میں مغفور احمد اعجازی، مظفر عالم ضیا عظیم آبادی، متین عمادی، رضیہ شبنم، طارق جمیلی، ناوک حمزہ پوری، مناظر عاشق ہرگانوی، فاروق احمد صدیقی، اظہر نیر، عبدالمنان طرزی، شوکت حیات، مولانا ابوالکلام قاسمی، اشک امرتسری، منیر سیفی اور طارق متین پر الگ الگ زاویئے سے مضامین ہیں۔ ان میں شاعری، انشائیہ، علم زبان، طنز و مزاح، تنقید، شخصیت، علمائے کرام کی خدمات وغیرہ اصناف و موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان میں ادبی موشگافی ہے، سیاسی نشیب و فراز ہے، تہذیبی سرگرمی ہے، مذہبی صورت حال ہے، فکر کی سنجیدگی ہے، اخلاقی ردعمل ہے اور خود بینی کی کشادہ قلبی ہے۔ ایسی ہی خوبیاں انوارالحسن وسطوی کے تبصرے میں بھی ہیں۔ اکبر رضا جمشید، ممتاز احمد خاں، توقیر عالم، مفتی محمد ثناءالہدیٰ قاسمی، نسیم اختر، ہمایوں اشرف، ممتاز فرخ، مشتاق احمد مشتاق، شفیع الزماں، وسیم رضا،

ثریا جہاں، فرحانہ ظہیر، شیراز حمیدی، منصور خوشتر اور کامران غنی صبا کی کتابوں پر تبصرے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد ان متنوع کتابوں کے مطالعہ کی خواہش ضرور جاگتی ہے۔ انوار الحسن وسطوی برجستہ اور سلیس لکھتے ہیں، محبت اور انسیت سے لکھتے ہیں، نزاکت سے تفصیلی مطالعہ پیش کرتے ہیں اور ادب کے حوالے سے ترفع، توسع اور تجمل عطا کرتے ہیں۔

....

● نام کتاب: نقوشِ حیات مصنف: محمد شکیل استھانوی ص: ۲۲۸ قیمت: ۳۰۰ روپے

ناشر: اردو سکشن، بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ-۱۵ (بہار) مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

محمد شکیل استھانوی اس دیار سے تعلق رکھتے ہیں جہاں کی مٹی سے سید سلیمان ندوی اور مناظر احسن گیلانی جیسی شخصیتیں روشن چراغ بن کر سامنے آئیں۔ محمد شکیل استھانوی کی نصف درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیرِ مطالعہ کتاب ''نقوش حیات'' میں ۲۹ رخاکے ہیں جو ادبی، سماجی، سیاسی اور مذہبی شخصیتوں پر ہیں۔ رضوان احمد، طلحہ رضوی برق، بہار حسین آبادی، شاہد رام نگری، شمس عظیم آبادی، مطیع الرحمٰن، شیخ میاں انصاری، مولانا مظہر الحق، سید محمد ولی رحمانی، محمد قاسم قاسمی، بلال احمد قادری، محمد شفیع عالم، سید عبدالرافع، سید فصیح احمد، ارشد القادری، سید نظام الدین، عبدالمتین سہروردی، سید محمد رضا کریم، ابو معالم خاں اعظمی، منیر عالم، ولی محمد، سید محمد عمر فرید، شمس الہدیٰ استھانوی، سید محمد اجمل فرید، محمود عالم، محمد جعفر اور گرو سہائے پرساد۔ ان میں سے بیشتر شخصیتیں مولانا، مفتی، حافظ، صوفی اور مولوی کے ساتھ حاجی، ڈاکٹر اور پروفیسر ہیں۔ علم و فضل کے رفتگاں و قائماں یہ حضرات معاشرہ میں اپنی حیات کے نقوش قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔ ان کی فکر، اثر انگیزی، نفع بخش مقاصد، خوش آئند اخلاقی پہلو اور پائیدار ادب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حالات کے تناظر میں ان سب نے خلوص و محبت، رواداری اور احترام انسانیت کی باتیں بتائی ہیں جن کا احترام کیا گیا ہے۔ ہمہ گیر مسلمہ حقیقت شناس ایسی شخصیتوں کو محمد شکیل استھانوی نے دیکھا ہے، پرکھا ہے اور علم دوستی کو قریب سے محسوس کیا ہے اور اپنی سوچ کے دائرے سے ان کا خاکہ لکھا ہے تاکہ بیانیہ وحدت سامنے آسکے، کرداری صلاحیت سے واقفیت ہو سکے، ربط و تعلق کے نمایاں واسطہ کا عکس حقیقت بن سکے اور ان سب کا نمایاں پہلو اجاگر ہو سکے۔

محمد شکیل استھانوی کے کبھی مضامین امتیازی خصوصیت کے حامل ہیں اور سچائی کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ بعض مضامین انکشافی بھی ہیں۔ ڈاکٹر رضوان احمد کے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کانپور کی ظلم و ناانصافی والی فضا رضوان احمد کو راس نہیں آئی، اس لئے وہ کانپور اپنے وطن ''موئی'' لوٹ آئے اور ان کا داخلہ گاؤں سے ۹ رمیل کے فاصلے پر رام سنہی گھاٹ کے ہائی اسکول میں کرادیا گیا۔ اس اسکول میں اردو کے بجائے سنسکرت پڑھائی جاتی تھی۔ انہوں نے سنسکرت پڑھی اور انہیں تلسی داس کی رام چرتر مانس، رحیم خان خاناں، کبیر اور میرابائی کو بھی پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔''

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سکریٹری مولانا سید محمد ولی رحمانی کا خاکہ کھینچتے ہوئے محمد شکیل استھانوی الفاظ کا دریا بہاتے ہیں:

''قائد ملت، مصلح امت، قاطع بدعت، حامل سنت، نائب امیر شریعت، شیخ طریقت، فصیح اللسان، سحر البیان، مفکر اسلام، حضرت الحاج سید شاہ مولانا محمد ولی رحمانی صاحب دامت برکاتہم امیر شریعت سابع منتخب کیے گئے۔''

صحافی محمد شفیع عالم کا حلیہ محمد شکیل استھانوی اس طرح کھینچتے ہیں:

''سر پر عمامہ، چہرے پر لمبی داڑھی، لمبا کرتا، نصف ساق تک لنگی، جسم دبلا پتلا، دراز قد، رنگ سانولا، متشرع صورت، خاکسارانہ سیرت، گفتگو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے لبریز، تبلیغی جماعت کے سرگرم کارکن اور محلہ جامن گلی (سبزی باغ، پٹنہ) کے فعال امیر جماعت۔''

محمد شکیل استھانوی کے سبھی مضامین الفاظ کو وسعت بخشتے ہیں اور شخصیت کی نفسیاتی، مذہبی، ادبی اور واقعاتی زندگی کو اعتبار بخشتے ہیں جس میں تہذیب اور ثقافت کی شناخت اور انفرادیت ہے۔

....

● نام کتاب: سید سہیل واسطی: اضطرابِ فکر کے آئینے میں مرتبہ: سہانا پروین ص: ۱۲۸ قیمت: ۲۰۰ روپے
رابطہ: معرفت اختر علی، جہانگیری محلہ، نزد ریلوے وال، آسنسول مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

سہیل واسطی اردو کے فراموش شدہ شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ وہ صحافی بھی تھے۔ ان کی تحریر میں بصیرت ملتی ہے، خود احتسابی ملتی ہے اور خیر اندیشی و شفافیت ملتی ہے... لیکن ان کی تحریروں کا محاسبہ بہت کم ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد موصوف کے بھائی رضوان واسطی کی کوششوں سے ان کی نظموں کا مجموعہ ''سطح آئینہ'' ۱۹۸۶ء میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے شائع کیا۔ پھر رضوان واسطی نے ہی اپنے توسط سے ان کی غزلوں کا مجموعہ ''کرنیں سہیل کی'' ۲۰۰۹ء میں شائع کرایا اور ڈاکٹر عشرت بیتاب نے ۲۰۱۷ء میں سہیل واسطی کے افسانوں کا مجموعہ ''سید سہیل واسطی کے افسانے'' شائع کر کے ان کے نظریات و خیالات کو عام کرنے کی کوشش کی اور ۲۰۱۸ء میں سہانا پروین نے سہیل واسطی کی شخصیت اور ان کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ منظوم خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں محبوب انور، احسان ثاقب اور معراج احمد معراج جیسے علم زبان کے قافلہ سالار شاعر شامل ہیں۔ مضامین لکھنے والوں میں رضوان واسطی، عشرت بیتاب، معصوم شرقی، احسان ثاقب، محبوب انور، طیب واسطی اور حفیظ بیتاب جیسے نقش امتیاز ثبت کرنیوالے قلم کاروں کے نام ہیں۔ ان سب کی ناقدانہ بصیرت اور تجزیاتی جوہر سے سہل واسطی کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ قربت و کشش کا اندازہ ہوتا ہے اور پاس و لحاظ کی جھلکیاں سامنے آتی ہیں۔ خودداری، بے نیازی اور عزو وقار زندگی بھر سہیل واسطی کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ ان کی آواز نئی تھی۔ وہ بازیابی چاہتے تھے لیکن اردو ادب کا میدان خاردار تھا۔ مجھ سے سہیل واسطی کی ملاقات جمشید پور میں ہوئی تھی تب جدیدیت کی لہر اردو میں آچکی تھی اور سہیل واسطی کا لہجہ ایٹمی بننے لگا تھا، لیکن بے توجہی کی تفصیل وہ مجھے بتانے لگے اور عمومی دلچسپی کا روشن جمال حاصل کرنے کے لئے وہ رسالہ ''آئندہ'' نکالنے کے لئے سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے اور میرے توسط سے تعاون چاہا۔ تب میں نے سلام سندیلوی، رضا نقوی واہی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ سے ان کا رابطہ کرایا جس کی تفصیل طوالانی ہے۔

سہانا پروین نے اپنی کتاب میں جن ناقدوں اور قلم کاروں کے مضامین شامل کیے ہیں ان سب نے اعتراف کیا ہے کہ سہیل واسطی کے موضوعات کا دائرہ وسیع تھا، ترقی پسند ادب سے ان کی وابستگی تھی بنگال کے افسانوی ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے، عام راستوں سے الگ ہٹ کر چلنا انہیں پسند تھا۔ پوری زندگی آزمائشوں اور دشواریوں سے معمور تھی۔ ان کی شاعری تین دہائیوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں سماجی حقیقت اور زندگی کے نشیب وفراز کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں رومانیت، شعریت، جدت اور وسعت کے ساتھ فن پر ماہرانہ گرفت ملتی ہے۔ سماجی مسائل کی تصویر کشی اس خوبصورتی سے کرتے تھے کہ فنکاری ممتاز مقام پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ اردو ادب کے علاوہ انگریزی ادب، سماجیات، نفسیات، سیاسیات، تاریخ اور علم طب سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔

سہیل واسطی ذہین تھے اور بھرپور تخلیقی صلاحیت کے مالک تھے۔ وہ بہت اونچائی تک بلند مقام تک جاسکتے تھے لیکن بقول ڈاکٹر معصوم شرقی ''پیسہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ گوپال مل کا جھکاؤ سرمایہ داروں کی طرف ہوتے ہی سہیل واسطی نے کھل کر ان کا ساتھ دیا۔ گویا پیسے کے لالچ نے انہیں ادبی پلیٹ فارم بدلنے پر مجبور کر دیا۔ سہیل واسطی کے حوالے سے سہانا پروین کی کتاب دلچسپ اور شخصیت شناس ہے۔

....

● نام کتاب: چراغ غزل مرتب: طاہر بیگ دہلوی ص: ۴۰۰ قیمت: ۴۰۰ روپے

رابطہ: ۷۔۳۷ رمولانا شوکت علی اسٹریٹ، کولکاتا ۷۳ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

اردو غزلوں کا انتخاب اکثر و بیشتر شائع ہوتا رہتا ہے، جس سے غزل کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ۲۰۱۸ء میں تازہ ترین انتخاب طاہر بیگ دہلوی کا منظر عام پر آیا ہے۔ یہ انتخاب تین حصے میں منقسم ہے۔ ''بیرون ہند کے شعراء''، ''بیرون بنگال کے شعراء'' اور ''بنگال کے شعراء''۔

''بیرون ہند کے شعراء'' کے تحت فیض احمد فیض، قتیل شفائی، ناصر کاظمی، احمد فراز، مظفر وارثی، شکیب جلالی، محسن نقوی اور پروین شاکر کے نام ہیں۔ ''بیرون بنگال کے شعراء'' میں عزیز بانو، داراب وفا، بشیر بدر، مظفر حنفی، شہریار، ندا فاضلی، عرفان صدیقی، سلطان اختر، لطف الرحمٰن، شجاع خاور، شہپر رسول اور طارق متین کو شامل کیا گیا ہے اور ''بنگال کے شعراء'' میں پرویز شاہدی، علقمہ شبلی، ناظم سلطان پوری، قیصر شمیم، وکیل اختر، اعزاز افضل، نصر غزالی، شہود عالم آفاقی، احمد رئیس، منور رانا، شہناز نبی اور فراغ روہوی کے نام ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اردو بنگال اور بیرون بنگال کی ہی زبان نہیں ہے بلکہ چار دانگ عالم میں یہ اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ ہندوستان، پاکستان کے ساتھ برطانیہ، جرمنی، کنیڈا، ترکی، نارڈک ممالک، ناروے، ہالینڈ، جاپان، اسپین، آسٹریلیا، امریکہ، سعودی عرب اور قطر وغیرہ ممالک میں بھی اردو پھل پھول رہی ہے اور وہاں بھی غزل گو شعراء موجود ہیں۔ طاہر بیگ دہلوی نے ''بیرون ہند کے شعراء'' کے عنوان سے جتنے نام شامل کیے ہیں وہ بھی پاکستان کے ہیں۔ دیگر ممالک کے شعراء نظر انداز کیے گئے ہیں۔ پاکستان کے شعراء میں بھی وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، کشور

ناہید، فہمیدہ ریاض، ادا جعفری وغیرہ کی کمی کھٹکتی ہے۔ اسی طرح بیرون بنگال کے شعراء میں فراق گورکھپوری، مجروح سلطان پوری، معین احسن جذبی، جمیل مظہری، باقر مہدی، بانی، بلراج کومل، مظہر امام، پرکاش فکری، حامدی کاشمیری، خلیل الرحمٰن اعظمی، زیب غوری، محمد علوی، مغنی تبسم وغیرہ کے بغیر یہ شمولیت نامکمل ہے۔ اسی طرح بنگال کے شعراء میں ف.س. اعجاز، وحشت کلکتوی، سالک لکھنوی، ابراہیم ہوش، رضا مظہری، عباس علی خاں بیخود، حرمت الاکرام، صالحہ بیگم مخفی، رونق نعیم، ظہیر ناشاد، عین رشید، انجم عظیم آبادی، معصوم شرقی، محسن باعشن حسرت، نوشاد مومن، ضمیر یوسف وغیرہ کی شمولیت ضروری تھی۔ طاہر بیگ دہلوی ابھی نوجوان ہیں۔ ۱۹۷۰ء کی ان کی پیدائش ہے۔ ادبی سفر انہوں نے ۲۰۱۱ء سے شروع کیا ہے۔ پانچ چھ سال میں انہوں نے جتنا سمجھا اور جانا ہے اس لحاظ سے انتخاب تیار کیا ہے۔ یہ ان کی پسند ہے۔ اس میں سبھی شاعروں کی سوانح ہے، تصویر ہے اور نو نو غزلیں ہیں۔ یہ غزلیں آفاقی حیثیت کی حامل ہیں۔ ان میں جذبات اور دھڑکن کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

....

● نام کتاب: مجاز کی شاعری اور اس کی میراث: ایک بازدید مرتبہ: ڈاکٹر نصرت جہاں ص: ۲۶۴
قیمت: ۳۰۰ روپے رابطہ: ۵ے رفیئرس لین، کولکاتا-۷۳ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ڈاکٹر نصرت جہاں اردو کی تیسری آواز کی توانا ناقد ہیں جن کے یہاں توازن اور رکھ رکھاؤ ہے۔ نئے پن کی تلاش کی آہٹ ہے اور خالص تنقیدی اصول وضوابط اور رموز کے عمل در عمل سے وجود پذیر عناصر وعوامل ہیں۔ ترقی پسند ادبی تحریک سے وہ متاثر ہیں۔ اسی سلسلے میں ان کی ترتیب دی ہوئی کتاب ''مجاز کی شاعری اور اس کی میراث: ایک بازدید'' ہے۔ اس میں مجاز کی شخصیت اور ان کے فن پر، ان کی عظمت اور بلندی پر ۲۸ مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین سے وقت کے محسوسات کی شدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جذبے اور عمل کی قوت سے واقفیت ہوتی ہے اور امکانات پر اظہار خیال سامنے آتا ہے۔ یہ سبھی مضامین ماحول کے اثرات کا بھی سراغ لگاتے ہیں اور مختلف النوع ردعمل کے اضطراب کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اپنے ۲۸ صفحہ کے پیش لفظ میں ڈاکٹر نصرت جہاں نے مجاز پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور ان کے نئے شعور، نئی حسیت، بے چہرگی، محرومی اور نئے دیدۂ تر پر کھل کر بحث کی ہے۔ ساتھ ہی عصری سماجی حقائق کے نئے اعلان نامہ کو بھی اجاگر کیا ہے کہ مجاز شائستگی دیدۂ تر چاہتے تھے۔ سرور آگیں بانکپن پر روشنی ڈالتے ہوئے نصرت جہاں یہ بھی بتاتی ہیں: ''مجاز منٹو کی طرح لیجنڈ تو نہیں کہلا سکے لیکن تقریباً ۴۴ برسوں پر مشتمل زندگی اور تقریباً ۲۵ برسوں پر مشتمل ان کی حیات شاعری نے آہنگ، شب تاب، اور ساز نو، جیسے مختصر مجموعے تخلیق کیے۔ وہ انہیں ہر بار پڑھنے، سمجھنے، محسوس کرنے اور انہیں زمانۂ حال کے قاری سے بھی بھرپور داد وتحسین حاصل کرکے ایک نابغۂ روزگار فن کار کہلانے کے مستحق بتانے کے لیے کافی ہے۔''

نصرت جہاں نے مجاز کے تخلیقی شعور کا تجزیہ کرتے وقت تہذیب اور روایت کی پاسداری کے ساتھ انکشافی باتیں بھی کہی ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''مجاز کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ نہ تو محض عشق و رومان کے شاعر ہیں اور نہ ہی محض انقلاب کے

ترجمان۔ان کی شاعری نہ تو محض مردوں کے احساسات وجذبات پر مبنی ہے۔کیوں کہ مجاز نے پہلی بار عورتوں کو صنف نازک کے روپ میں نہیں بلکہ شجاعت و بہادری کا پیکر اور جہد زندگی میں علم برداری کرنے اور روایتی معشوق کے برعکس عاشق کی تیمار دار کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔''

اس کتاب میں بالترتیب شارب ردولوی، محمد زماں آزردہ، مناظر عاشق ہرگانوی، محمد نعمان خاں، ابوذر ہاشمی، خالد اشرف، خواجہ نسیم احمد، انور ظہیر انصاری، امام اعظم، اسلم جمشید پوری، محمد طاہر، فرحت آرا کہکشاں، شبانہ نسرین، دیوان حنان خان، مقصود دانش، نصرت جہاں، دبیر احمد، محمد کاظم، عمر غزالی، شکیل احمد خان، ترنم مشتاق، عبدالحفیظ، غزالہ فاطمہ، عزیزہ عزیز، محمد زہیب عالم، محمد سلیم انور اور زہرہ بانو کے مضامین مجاز کو بھرپور طور پر سمجھنے میں مددگار ہیں۔ اشاریہ ''مجاز شناسی'' بھی اہم ہے کہ مجاز پر گیارہ کتابوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔بیس کتابوں میں مجاز پر مضامین تلاش کئے گئے ہیں۔گیارہ رسائل میں مجاز پر مضامین کو دریافت کیا گیا ہے اور تین رسائل کے ''مجاز نمبر'' کا حوالہ ہے۔

ڈاکٹر نصرت جہاں نے بھی اٹھائیس مضامین کا جائزہ لیا ہے اور انفرادیت بیان کی ہے۔ان مضامین میں ثابت کیا گیا ہے کہ مجاز نے سماجی بے رحمی کو تازیانہ لگانے کا کام کیا ہے کہ مجاز کا ایقان تھا کہ پورا نظام ہی عدم مساوات پر قائم ہے اور اس کے تمام اصول وضابطے کھوکھلے اور مردہ ہو چکے ہوں تو بہتر ہے کہ انہیں نوچ کر پھینک دیا جائے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ زندگی کے مصائب ومسائل، دلی کرب اور ذہنی اضطراب حرص وطمع کی وجہ سے ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے مثبت رویے کی سب سے قوی صورت تگ ودو اور جہد وعمل کا وہ لامتناہی سلسلہ ہے جو ان کی نظموں اور غزلوں میں رواں دواں ہے۔ڈاکٹر نصرت جہاں کی یہ کتاب مجاز شناسی میں ہر طرح سے معاون ہے۔

....

- **نام کتاب: مغربی بنگال میں اردو کا ایک اہم مرکز مٹیابرج مصنف: شاہد اقبال ص: ۳۲۰ قیمت: ۲۲۰ روپے**
رابطہ: مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا-۱۶ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

زمانے کے شکست وریخت کے باوجود مغربی بنگال عہد قدیم سے اردو کا گہوارہ رہا ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمل اور واجد علی شاہ کی شخصیت کی وجہ سے اردو زبان، ادب اور تہذیب کو فروغ ملا۔اسباب کا ایک طلسمی جہان ہے جہاں علم وفن کی ترسیل ہوتی رہی ہے، ساتھ ہی احساسات وجذبات اور افکار وخیالات کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ اردو زبان وادب کی تاریخ میں مغربی بنگال کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔یہاں کی سرگرمیاں آج بھی تیز تر ہیں جن سے روشناسی، دیدہ ریزی اور کلچر کی تفہیم سامنے آتی رہتی ہے۔اس کے لئے بہت سے اداروں نے شروع سے فکری رجحانات پر توجہ دی ہے۔آج مغربی بنگال اردو اکاڈمی فعالی کا ثبوت دے رہی ہے۔تخلیقی حسیت کا جواز پیدا کر کے نئے پرانے قلم کاروں سے کتابیں لکھوا کر ادبی فضا کو مستحکم کر رہی ہے۔اس طرح ادبی کے ساتھ تہذیبی، ثقافتی اور مادی تعاون بہم پہنچا رہی ہے اور اردو کے سرمائے میں اضافہ کا باعث بن رہی ہے۔

مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے تعاون سے ایسی ہی ایک اہم کتاب شاہد اقبال نے مٹیابرج کے حوالے سے لکھی ہے، جس میں وقت کے تغیر پذیر ادبی واقعات ہیں اور ظہور پذیر مدوجزر کی تفصیل ہے۔شاہد اقبال نے تلاش و

جستجو سے کام لے کر تقریباً تمام جہتوں کو خوب تر بنایا ہے۔ تازہ فکر اور شگفتہ احساس کو راہ دے کر عقل وشعور کی بالیدگی سے عہد اور ماحول کی ترجمانی کی ہے۔ زمینی خوشبو کو کلیہ بنا کر دبستان مٹیابرج کا آئینہ خانہ سجایا ہے اور لفظوں کی بازیگری سے صناعی پیدا کی ہے۔ یہ شوخ وشنگ صداقت کا ماحصل پس منظر اور پیش منظر کی اثر آفرینی رکھتا ہے۔ جس سے گیسوئے اردو کی درازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہد اقبال کی یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ مٹیابرج کی ادبی تاریخ پر تحقیق کرتے وقت انہوں نے مٹیابرج کے جغرافیائی حدود اور محل وقوع، ورود واجد علی شاہ سے قبل کا مٹیابرج، واجد علی شاہ کا سفر کلکتہ، بادشاہ کی علالت اور ملکہ و دیگر افراد کا سفر لندن، ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت اور بادشاہ کی نظر بندی، نظر بندی کا خاتمہ اور مٹیابرج میں مستقل قیام، بادشاہ کی علم دوستی، واجد علی شاہ کا سراپا، بادشاہ کا انتقال اور مٹیابرج کی تباہی، آخری تاج دار اودھ برجیس قدر، واجد علی شاہ اختر کے بعد مٹیابرج کے اہم اردو قلم کار، مٹیابرج میں شعر گوئی، نظم، غزل، نعتیہ قصیدہ، دیگر مذہبی اصناف سخن، حمد، نعت، منقبت، صومیہ قصائد، مرثیہ، سلام، نوحہ، ماتم، رباعی، مثنوی، ماہیا، ثلاثی، قطعات، قطعات سال وفات، منظوم طنز ومزاح، شاعری برائے اطفال، مٹیابرج میں اردو نثر کے ابتدائی نمونے، ناول، افسانہ، ڈرامہ نگاری، تھیٹر، تنقید وتحقیق، ترجمہ، صحافت، مکتوب نگاری، انشائیہ نگاری، مقالہ نگاری، رپورتاژ نگاری، نثر نگاری برائے اطفال، کالجوں میں اردو تدریس، فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت اردو کی تدریس، اردو ذریعۂ تعلیم والے سکنڈری / ہائر سکنڈری اسکول، مٹیابرج کے منظور شدہ اردو میڈیم پرائمری اسکول، مٹیابرج کے غیر منظور شدہ اردو میڈیم پرائمری اسکول، کتب خانے، دار المطالعے اور ادبی انجمنیں، ادارے اور تنظیمیں کے عنوان سے اعلیٰ وارفع مواد پیش کیا ہے۔ یہ ایسے آثار ونقوش ہیں اور لائق مطالعہ مبادیات ہیں جو دلائل وشواہد کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں۔ شاہد اقبال نے تحقیق سے وضاحت کی ہے کہ مٹیابرج کو عام طور پر گارڈن ریچ بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے "عرض اول" کے تحت جوش ملیح آبادی کے دو اشعار پیش کئے ہیں:

یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں	اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بار بار	آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا

ایسی بھرپور، جامع اور تاریخ ساز کتاب کبھی کبھی وجود میں آتی ہے۔ شاہد اقبال کا یہ کارنامہ ہی ہے۔ جس سے بار بار استفادہ کیا جائے گا۔

● **نام کتاب: متاع گراں بہا پروفیسر احمد سجاد تالیف: ڈاکٹر مظفر مہدی ص: ۸۴۷ قیمت: ۱۰۰۰ روپے**
رابطہ: مرکز ادب وسائنس، ۲-کے/۳، بریاتو ہاؤسنگ کالونی، رانچی-۴ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ڈاکٹر مظفر مہدی امریکہ میں رہتے ہیں لیکن ان کی عقیدت پروفیسر احمد سجاد سے اس حد تک ہے کہ ان کے فکر وفن پر علم وادب کا ایسا نور انہوں نے بکھیرا ہے جو ہر لحاظ سے یادگار ہے۔ احمد سجاد حرکت وعمل کا نام ہے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر، علم وادب سے ہوئی ہے۔ ان کے بطون میں تاریخ، تمدن، مذہب، اخلاق، معاشرت اور تعلیم وتعلم کا وسیع مفہوم عیاں اور نہاں ہے۔ اصول واقدار کو سامنے رکھ کر استقامت اور مستقیمی کی راہیں متعین کی ہیں

اورنظریاتی ادب کے ذریعہ پیش قدمی کو اڑان بخشی ہے۔ ان کی تحریروں میں تفہیم وتنقید ملتی ہے، پرکھنے کا الگ معیار ملتا ہے اور تشریح کی فکری جہت ملتی ہے۔ ان کا نظریہ زندگی کو تقویت دینے والا ہے جس کی متوازن سچائی میں طرب آشنا روشنی کے دریچے دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر مظفر مہدی ناقد ہیں۔ وہ طرز اظہار کی جدیدیت کے شناور ہیں۔ ادبی موقف اور اس پر عمل پیرا ہو کر ردعمل کو برتنے کے وجودی تجربے سے وہ مالا مال ہیں۔ ترتیبی ہنرمندی انہیں خوب آتی ہے۔ تنقید اور ترتیب کی قبل کی کتابیں حوصلہ بخش رہی ہیں اسی لئے روشن فکر سے کام لے کر پیش نظر قابل قدر تالیف انہوں نے اردو کو دی ہے۔ بھاری بھرکم اور ضخیم کتاب کے ذریعہ مظفر مہدی نے اپنے خلوص کا حق ادا کر دیا ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر مظفر مہدی کے ''معروضات'' کے علاوہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ''اکابرین نقد ونظر'' کے تحت امتیاز علی عرشی، اسلوب احمد انصاری، جمیل الدین عالی، گوپی چند نارنگ، عبدالمغنی اور ابوالکلام قاسمی کے مضامین ہیں۔ ''ارباب نقد وتحقیق'' کے عنوان سے منظر اعجاز، کوثر مظہری، عطا عابدی، ایم کمال الدین، عبدالقیوم ابدالی، حسن مثنیٰ، قیام نیر، انوری بیگم، محمد امین عامر، رونق شہری اور تنویر اختر رومانی نے احمد سجاد کی کتاب ''تنقید وتنقیح'' کا جائزہ لیا ہے۔ ''علم وعمل کا سنگم'' کے زیرعنوان محمد منصور عالم، محمود شیخ، ارمان نجمی، ظفر حبیب، سید احمد قادری، احمد بدر، شمیم احمد باروی، شکیل احمد، محمد اسلم غازی، جمال مصطفیٰ، مظفر مہدی، شریف احسن مظہری، عشرت بیتاب، احمد ریاض، معراج احمد معراج اور ارشاد احمد نے احمد سجاد کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ''جہان تازہ اور افکار تازہ'' کے تحت عبدالمنان طرزی، قدوس جاوید، مناظر عاشق ہرگانوی، ظفر حبیب، منظر حسین، ریحان غنی، کہکشاں پروین، مولا بخش، امام اعظم، آفتاب احمد آفاقی، محمود الحسن الہ آبادی، ضیاء الرحمٰن فلاحی مدنی، محمد انظر ندوی، وکیل احمد رضوی، محمد طلحہ ندوی اور ساحر داؤدنگری نے احمد سجاد کے افکار ونظریات سے بحث کی ہے۔ ''زرم دم گفتگو'' ۹ رانٹرویو پر مشتمل ہے فضل من اللہ، انور کمال، ممتاز احمد خاں، عبدالعزیز، امتیاز احمد، وقاص احمد، محمد مکمل حسین اور ''مجلس مذاکرہ'' کے تحت سوالنامہ کے جواب اور مصاحبہ ہیں۔ ''سفر ہے شرط'' کے عنوان کے ذریعہ علیم صبا نویدی، ظفر حبیب، محمود الحسن الہ آبادی، منظر حسین اور شکیل احمد سلفی نے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ''ملی تعلیمی ایجنڈا'' بھی ایک عنوان ہے جس میں محمود الحسن الہ آبادی اور احتشام الحق نے ملی تعلیمی ایجنڈا سے بحث کی ہے۔ ''بندۂ مومن کا ہاتھ'' احمد سجاد کی کتاب ہے جس کے تناظر میں خورشید احمد نعمانی، سہیل انجم، محمود الحسن الہ آبادی، محمد علاء الدین ندوی، ظفر احمد اثری، سید عبدالباری، جمشید قمر اور عالمگیر ساحل نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ ''کہتی ہے تجھے خلق خدا غائبانہ کیا'' کے تحت احمد سجاد کی مختلف جہات پر علی حیدر ملک، سید محفوظ الحسن، اسلم بدر، قمر جہاں، ابوالفہیم، وحید علی خاں، ابوالکلام رحمانی، عشرت آرا سلطانہ اور ''ہماری زبان'' میں شائع شدہ تبصرہ ہے اور ''درون خانہ'' کے تحت عبدالمعز شمس، طارق سجاد، رفعت سجاد، غزالہ پروین، فیصل سجاد، عمران انصاری، یوسف انصاری اور مظفر مہدی کے ذریعہ شخصیت شناسی کی گئی ہے۔ اس کتاب میں بلیک اینڈ وہائٹ ۵۳ رتصویریں بھی ہیں۔ پوری کتاب گلیز کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔

● نام رسالہ: دربھنگہ ٹائمز مدیر: ڈاکٹر منصور خوشتر ص: ۳۲۰ قیمت: ۲۵۰ روپے
رابطہ: شوکت علی ہاؤس، پرانی منصفی، لال باغ، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۴ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

دربھنگہ فی الوقت اردو کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کتابیں شائع ہو رہی ہیں، نشستیں ہو رہی ہیں، انعام و اعزاز کی بہار آئی ہوئی ہے اور ''تمثیل نو''، ''جہان اردو''، ''دربھنگہ ٹائمز'' اور ''تحقیق'' جیسے رسائل نکل رہے ہیں جن کی گونج عالمی سطح پر ہے۔ ڈاکٹر منصور خوشتر اس لحاظ سے فعال ہیں کہ وہ دربھنگہ آنے والے ہر ادبی فرد کی پذیرائی کرتے ہیں اور مؤخرالذکر دو رسائل کے مالک و مدیر ہیں۔ ویسے وہ شاعر بھی ہیں۔ ''دربھنگہ ٹائمز'' کا جنوری ۲۰۱۹ء کا شمارہ مشمولات کی وجہ سے یادگار تو ہے ہی، استفادہ کرنے والا شمارہ بھی ہے۔ اداریہ میں انہوں نے نسائی تنقید پر گفتگو کی ہے۔ اس طرف ناقدوں کی توجہ کم رہی ہے۔ منصور خوشتر سوال اٹھاتے ہیں: ''نسائی تنقید کی تھیوری میں عورتوں کے جذبات اور احساسات ان کی جنسی سوچ اور مروجہ سماجی حیثیت کی ترجمانی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ نسائی تنقید کی مبادیات آج اکیسویں صدی میں سانس لے رہی ہے اور دو دہائی گذرنے کو ہے لیکن باطنی احساس کے تحقیقی شعور کا کتنا حصہ منصۂ شہود پر آیا ہے؟ دائرے کا سقم کتنا پھیلا ہے۔ کتنی خاتون تنقید نگار کو اعتبار ملا ہے؟ اور کس حد تک نسائی نقاد ریزہ ریزہ حیات اور قطرہ قطرہ سمندر کو مشق کی کسوٹی پر جانچ پرکھ کر مجسم بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔''

سلگتے ہوئے سوال میں نسائی تنقید کی پوری کائنات معانی کا جہاں چاہتی ہے۔ اس شمارہ میں حمد و نعت کے ساتھ خراج عقیدت کے طور پر سلیم آغا قزلباش پر مضمون ہے۔ سلیم آغا انشائیہ نگار، افسانہ نگار اور تنقید نگار تھے۔ صحافت ان کے گھر میں چہل قدمی کرتی تھی کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے صاحبزادے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد دبستان سرگودھا نے دم توڑ دیا ہے۔ 'دربھنگہ ٹائمز' میں مضامین کا حصہ بے حد اہم ہے۔ مضامین کے عنوانات ملاحظہ کریں: ''حفظ اللسان خالق باری اور محمود شیرانی، مستعار شاعری: مظہر امام کے حوالہ سے، خواب سراب: ایک فریب شکستہ فوق متنی المیہ ناول، اردو شاعری میں خواتین پر تشدد اور استحصال، سکندر احمد کی افسانوی تنقید، بیگ احساس کے افسانے، گلوں کی خوشبو، انٹرویو نگاری: فن اور روایت، جدید عربی ناولوں کے اردو تراجم، ورق گمشدہ کا شاعر: پرویز مانوس، اقبال کے فلسفۂ خودی کا مصدر اول، اردو شاعری میں نظریۂ کفر و الحاد، عشق و انسانیت کی شاعرہ: مینو بخشی، کلکتہ کا ادبی ماحول بیسویں صدی میں، عجب رنگ خورشید کی شاعری، کیفی اعظمی: سوانح اور نظم نگاری، ادب اطفال کے معمار: اسماعیل میرٹھی، تانیثیت اور بہار کی اردو شاعرات (فہرست میں یہی عنوان ہے لیکن اندرونی صفحات پر مضمون 'رضا نقوی واہی: شخصیت اور شاعری' کے عنوان سے ہے) قمر رئیس کی پریم چند شناسی، حیدر علی آتش: ایک مطالعہ، جابر حسین کی افسانہ نگاری، اردو کا منفرد افسانہ نگار: محمد حسن، ذوقی ادب کے آئینے میں، اردو میں ناولٹ نگاری، شفق کی افسانہ نگاری، عطا عابدی کی نظمیں، آزادی کے بعد اردو خونوشت نگاری، آپ بیتی ایک تعارف، اور اردو کے تین غیر مسلم افسانہ نگار''۔

یہ ایسے مضامین ہیں جن میں معنی خیزی ہے، گفتہ صداقت کی حسن آفرینی ہے اور ادبی شناخت کی یکراں گہرائی ہے۔ افسانوں کی تعداد ۹ ہے۔ تین مائکرو فکشن بھی ہیں۔ نور شاہ سے انٹرویو بھی ہے۔ فکاہیہ ہے۔ ''سلف پبلسٹی اور خودنمائی کے دور میں کیا جینوئن فنکار حاشئے پر چلے جائیں گے'' کے عنوان کے تحت مباحثہ ہے جس میں گیارہ قلمکاروں

نے حصہ لیا ہے۔ ۸؍ افسانوی نظمیں ہیں۔ ۵ شاعروں کی نظمیں ہیں، ۱۳؍ شاعرات کی غزلیں ہیں۔ ۲ کتابوں پر منظوم تبصرے، شمارہ کتابوں اور ایک رسالے پر تبصرہ کے ساتھ ''خیال آباد'' کے عنوان سے ۲۵ مشاہیر کے خطوط گذشتہ شمارہ پر ہیں اور آخر میں جشن المنصور ۲۰۱۸ء کی روداد، ساہتیہ کار ادبی سنگم ایوارڈ کی تفصیل ہے۔ اس سلسلے میں ۱۴ بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ تمام مواد میں ادبی نقطۂ نظر، تنقیدی نظریہ اور عصری عہد کی عکاسی ملتی ہے۔

....

● **نام کتاب: کاروانِ اردو مرتبہ: ڈاکٹر وصیہ عرفانہ ص: ۷۲ قیمت: درج نہیں**
رابطہ: ڈسٹرکٹ اردو سیل، کلکٹریٹ، سمستی پور (بہار) مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

اس کتاب کی ترتیب و تزئین ڈاکٹر وصیہ عرفانہ کی ہے جبکہ سرپرست اعلیٰ امتیاز احمد کریمی ہیں۔ فروغ اردو سیمینار میں پڑھے گئے مقالے اس کتاب میں شامل ہیں۔ ''عرضِ مرتب'' کے تحت ڈاکٹر وصیہ عرفانہ بتاتی ہیں:

''کتابچہ کی ترتیب میں یکسانیت اور یک رنگی سے بچنے کے لئے ہر مضمون کے بعد کسی ایک شاعر کی غزلیں یا نظم ترتیب دی گئی ہے۔ کتابچہ کے آخر میں اردو عوام کی سہولت کے پیش نظر مختلف طرح کے سندوں یعنی سند ذات، سند رہائش اور سند آمدنی کے اردو فارم اور خاص خاص افسران کے فون نمبر درج کئے گئے ہیں نیز فروغ اردو سیمینار کے تعلق سے ہندی اردو اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کی کترنیں شامل کی گئی ہیں تا کہ وقت ضرورت سند رہے۔''

سند عطا کرنے والی اس کتاب میں ''قابل فخر زبان اردو'' (ڈی ایم)، ''انقلاب کی زبان'' (بال مکند پرساد)، ''سمستی پور: ایک تعارف'' (وصیہ عرفانہ)، ''اردو زبان اور اس کا فروغ'' (قاری محمد شاہد)، ''فروغ اردو میں غیر مسلم ادیب و شاعر کا حصہ'' (وصیہ عرفانہ)، ''اردو زبان کی موجودہ صورت حال اور اس کی بقا'' (ڈاکٹر مہتاب عالم خان)، ''سمستی پور کا ایک درخشاں ستارہ: قیصر صدیقی'' (ابوالفرح تنویر احمد)، ''اردو زبان اور ہماری ذمہ داریاں'' (طارق الزماں)، ''اردو زبان و ادب'' (محمد منظور عالم)، ''پرائمری سطح پر اردو کا فروغ'' (عصمت آرا)، ''اردو اور سماج'' (محمد منیب)، ''اردو زبان کا فروغ'' (ابران فیضی) جیسے مضامین کے ساتھ واصف جمال، ناشاد اورنگ آبادی، اصغر ساحل، شیدا بگھونوی، کیف احمد کیفی، نثار احمد نثار، اسرار دانش، پروین کمار چنو، راجیش ورما اور اجیت کمار سنگھ کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ''صلائے عام ہے'' کے عنوان سے امتیاز احمد کریمی نے دو اہم موضوع پر نکتے پیش کئے ہیں۔ اردو کی شناخت اور پہچان قائم رکھنے پر زور دیا ہے۔ آج اردو آبادی داخلی اور خارجی سطح پر خطرے سے دوچار ہے، اس سے آگاہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ سب سے دو موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اولاً اردو آبادی کا فرد ہونے کی حیثیت سے، دوسرے اردو عملے ہونے کے طور پر آپ کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ سب سے پہلے تو میں یہ بتانا چاہوں گا کہ فروغ اردو سیمینار کا اہتمام کرنے کا بنیادی مقصد جہاں ایک طرف اردو ادب کی آبیاری اور اس کا فروغ ہے وہیں اردو زبان کی ترقی و ترویج بھی اس کا نصب العین ہے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ، فروغ

اردو سیمینار، کے توسط سے اردو آبادی میں مادری زبان کے تئیں بیداری اور احساس ذمہ داری پیدا کرنا چاہتا ہے۔ انہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اردو زبان اردو آبادی کی بقا اور فنا کا سوال ہے۔ کسی بھی قوم کے لئے لسانی امتیاز ضروری ہے۔''

تاریخی روشنی میں حوالے کے ساتھ امتیاز احمد کریمی نے لسانی وراثت اور اپنی مادری زبان کے تحفظ و ترویج کے لئے ماحول سازی پر زور دیا ہے۔ سنجیدہ اور مخلصانہ سعی پیہم پر توجہ مبذول کرنے کے لئے کہا ہے۔ انہوں نے دوسرے نکتے کے بارے میں لکھا ہے کہ بعض دفتروں میں اردو کے عملے دیگر کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں اور اردو کی پہلو تہی کرتے ہیں تا کہ رزق رسانی میں اضافہ ہو سکے۔ ساتھ ہی اردو میں کام کی کمی کی وجہ سے اردو ملازمین پر دیگر ذمہ داریاں لاد دی جاتی ہیں۔ امتیاز احمد کریمی اردو ڈائرکٹوریٹ کے سربراہ ہیں اس لئے ان کی باتیں سچی ہیں اور کڑوی بھی ہیں۔

ڈاکٹر وصیہ عرفانہ نے ''کاروانِ اردو'' ترتیب دیتے وقت اردو زبان اور اردو کے ذریعہ تہذیب و ثقافت کی حفاظت اور آبیاری پر زور دینے والے مضامین شائع کئے ہیں جس سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

● نام کتاب: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (نعتیہ کلام) شاعر: ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل ص: ۳۲۸
قیمت: ۱۹۹ روپے اشاعت: ۲۰۱۷ء ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی-۶ مبصر: ابواللیث جاوید (دہلی)

زیر تبصرہ مجموعہ ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل کی چھٹی تصنیف ہے۔ اس کتاب سے قبل 'ایوان نعت'، 'الحمد للہ'، 'سمعنا و اطعنا'، 'وجدان کے پھول' اور 'تنقیدات خوشدل' شائع ہو چکی ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعہ ۷۰ حمد باری تعالیٰ، ۲۸ مناجات، ۱۲۹ نعت پاک، ۴ سلام، ۷ منقبت، ۷ دعائیہ نظمیں اور ۳ متفرقات پر مشتمل ہے۔ صفحہ ۱۶ پر اس کتاب کی طباعت کے موقع پر کہا گیا ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کا قطعہ تاریخ شامل ہے جس کے آخری مصرع ''گل گشت سال طبع اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' سے سال ۱۴۳۸ھ نکلتا ہے۔ سرورق کے فلیپ کے اندرونی حصہ پر بھی ڈاکٹر موصوف کی ایک نظم درج ہے جسے 'نذر ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل' کا عنوان دیا گیا ہے۔ ان اشعار کے ذریعہ ڈاکٹر موصوف نے مصنف کے لئے اپنی شفقتوں اور محبتوں کا اظہار کیا ہے۔

صفحہ ۱۰۰ تک پھیلی ہوئی ۷۰ حمدیہ شاعری شاعر موصوف کے دلی جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ اللہ پاک کی وحدانیت اور اُس کی یکتائی کا اظہار خوبصورت پیرائے میں کیا ہے مگر ایک ہی مضمون کو بار بار اشعار میں ڈھالا گیا ہے جو کھٹکتا ضرور ہے۔ چند مثالیں:

زمیں سے تا بہ فلک اختیار ہے تیرا
ثنا کا لفظ بھی پروردگار ہے تیرا

زمیں سے تا بہ فلک ہر نشاں نشاں تیرا
ہے کائنات کا اک ایک کارواں تیرا

کون ہے جو پتھروں کے درمیاں کیڑے کو بھی
رزق میں ہر اک کے سن برکت، بتا دیتا ہے کون

پتھروں میں رزق کیڑے کو بتا دیتا ہے کون
جتنی ہیں مخلوق ان سب کو غذا دیتا ہے کون

میرے ہر شعر کا مضمون عنایت تیری رات دن میری زباں پر ہوں قصیدے تیرے
ذہن میں جتنے ہیں مضمون وہ سب تیرے ہیں ہے تری حمد کا ہر شعر حوالے تیرے

اللہ کی حمد وثنا کی کوئی انتہا نہیں۔اس کا شعری اظہار شاعر کی تخیلی پرواز پر منحصر ہوتا ہے،اس کے مشاہدات و احساسات ہی محرک بھی ہوتے ہیں۔اللہ پاک کی ذات بے کراں ولامحدود ہے اس لئے اُس کی حمد وثنا کی بھی کوئی قید نہیں ہوسکتی۔مضمون کا Repeat ہونا قدرتی ہے۔لیکن زیادہ Repeatation عیب مانا جائے گا۔

مناجات کا سلسلہ بھی صفحہ ۱۰۳ ر سے ۱۳۶ تک پھیلا ہوا ہے۔مناجات میں اپنی کم مائیگی اور اپنے گناہوں کا اقرار ہے اور عفوو درگذر کردینے کی التجا ہے۔آنے والی نسلوں کی دینی لاعلمی اور بے عملی کی اصلاح کی دعائیں ہیں اور دیگر سماجی برائیوں کو دور کردینے کی دعائیں بھی ہیں۔یہ ساری باتیں ایک حساس دل کے اندیشوں کو ظاہر کرتی ہیں۔

صفحہ ۱۳۸ ر سے ۲۹۶ تک نعت پاک کے لئے مختص ہے۔انیس اشعار کی نعت شریف جس کا مطلع ہے:

زمیں ہی نہیں آشنائے محمدؐ فلک بھی ہے محوِ ثنائے محمدؐ

شاعر کے عقیدت مندانہ اور پاکیزہ جذبات کی مظہر ہے۔دیگر تمام نعت پاک میں یہ جذبات برتے گئے ہیں اور بہت کامیابی سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔حضورؐ کی محبت کی دولت کی آرزو ہر مسلمان کے دل میں ہونی چاہئے۔اللہ پاک نے اپنے کلام پاک میں بار بار کہا ہے:اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول یعنی اللہ پاک کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ایسا کہیں نہیں ہے کہ صرف اللہ اپنی اطاعت کا حکم کرتا ہو۔معلوم ہوا کہ وہی شخص اللہ کا ہوگا جو رسول پاک کی محبت سے سرشار ہوگا۔اس لئے ہر مومن کو حضورؐ کی سنت کی پیروی ضروری قرار پاتی ہے۔

صفحہ ۲۹۹ ر سے ۳۰۴ ر تک سلام ہے جو شاعر کے دلی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔صفحہ ۳۱۴ سے ۳۲۲ تک ۷ دعائیہ نظمیں ہیں جن میں ۶ نظمیں علامہ اقبال سے متاثر ہوکر کہی گئی ہیں۔یہ نظمیں متاثر کرتی ہیں اور اس مجموعہ کے شاعر کے ملی جذبوں کو سامنے لاتی ہیں۔متفرقات کے تحت 'تعلیمات قرآن'، 'ترانہ ملی' اور 'داعی قرآن' نظمیں ہیں۔تینوں نظمیں معیاری ہیں اور ان سے قارئین کو اچھا پیغام بھی جاتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ مجموعۂ کلام پاکیزہ اور پُروقار ہے۔اس کا مطالعہ یقیناً دینی جذبات اور معاشرتی اصلاح کے تفکر کو جلا بخشے گا۔اس کی پذیرائی ہر طبقۂ فکر کے لوگوں میں ہونی چاہئے۔

....

- **نام کتاب:ڈاکٹر امام اعظم کی بازآفرینی (تنقیدی جائزے) مصنف:پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اشاعت:۲۰۱۸ء قیمت:۱۵۰ روپے ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی-۶ مبصر:ابواللیث جاوید (نئی دہلی)**

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے ڈاکٹر امام اعظم کی چند کتابوں،ان کے لکھے ہوئے ادبی خطوط اور مضامین کو یکجا کرکے اپنا تنقیدی جائزہ،'ڈاکٹر امام اعظم کی بازآفرینی' کی شکل میں پیش کیا ہے۔اس میں شامل ۷ ر مضامین ڈاکٹر امام اعظم کی تخلیقی جہت کا تعین کرتے ہیں۔ڈاکٹر امام اعظم کی خوش فکر شاعری پر گفتگو ان کے شعری مجموعہ 'قربتوں کی دھوپ' کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔غزلیہ شاعری ہو یا نظمیہ یہی مجموعہ پیش نظر رکھا گیا ہے اور ڈاکٹر موصوف کی

شاعرانہ صلاحیتوں کا تعین کیا گیا ہے۔ اُسی طرح ان کی شاعری میں تخلیقی پیکریت کو تلاش کرنے کی کوشش ان کے شعری مجموعہ 'نیلم کی آواز' کے حوالے سے کی گئی ہے۔ ان کی منطقی تنقید پر بحث مختلف اہل قلم شخصیات پر لکھے گئے ان کے مضامین کو بنیاد بنا کر کی گئی ہے۔ اس طرح یہ کام پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے 'سمندر منتھن' کر کے امرت نکالنے جیسا اہم کام کر دیا ہے۔ تاریخی حقائق کی بازیافت کے لئے محمد الیاس رحمانی کی عہد ساز تخلیق 'عہد اسلامیہ میں دربھنگہ' کو بنیاد بنایا گیا ہے اور ڈاکٹر امام اعظم کی کوششوں کو سراہا گیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں کثرت میں وحدت کی پرکھ ان کی کتاب 'اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب: کثرت میں وحدت کا اظہار' کا سہارا لے کر کی گئی ہے۔ نظیر صدیقی کے خطوط کی معنویت اور مظہر امام کے نام اہل قلم حضرات کے خطوط کا مجموعہ 'نصف ملاقات' دو مضامین کا محرک بنا ہے جس کے ذریعہ مکتوب اور مکتوب الیہ کے خیالات اور موجودہ و ماضی کی روشوں پر اچھی بحث کی گئی ہے۔ ان خطوط سے بہت سے ادبی، سیاسی اور سماجی حقائق، مکتوب نگار کا سیاسی اور ادبی موقف بھی ظاہر ہوتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس الیکٹرونک کے سیاہ دور میں مکتوب نگاری کا فن دم توڑ چکا ہے۔ ایک قیمتی اور کارآمد ادبی صنف آنے والی نسلوں کو نصیب نہیں ہوگی۔ 'نئے علاقے میں' ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ یافتہ ہندی کے شاعر ارون کمل کی کتاب کا اردو میں ترجمہ ڈاکٹر امام اعظم کا کارنامہ ہے۔ ایک صفحہ میں پھیلے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ اقبال انصاری کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب 'اقبال انصاری فکشن کا سنگ میل' کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ 'ہندوستانی فلمیں اور اردو'، 'ہندوستانی ادب کے معمار: عبدالغفور شہباز (مونوگراف)'، 'فاطمی کمیٹی رپورٹ' کتابوں کا مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اول الذکر دونوں کتابوں پر اپنی آرا مختصر ایک ایک صفحہ پر اور فاطمی کمیٹی رپورٹ پر تفصیل سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اظہار خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی حالیہ کتاب ''گیسوئے اسلوب' پر ایک صفحہ کا نوٹ ہے۔ اسی طرح ''نقوش علی نگر: تبصرے اور تجزیئے'' پر ایک ایک صفحہ کے نوٹ لگائے گئے ہیں۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے ۲۱ خطوط، جو انہوں نے ڈاکٹر امام اعظم کو لکھے ہیں، صفحہ ۵۲ سے صفحہ ۸۴ تک شامل کیا گیا ہے۔ ان خطوط کی معنویت خواہ اہمیت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا ہے۔ خطوط پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعہ بہت سے ادبی مسائل، ادبی شعبدہ گریاں اور ادبی چپقلش کا علم ہوتا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ یہ خطوط ۱۹۸۷ء سے ۲۰۱۸ء پر محیط ہیں۔ مزید صفحہ ۸۱ سے ۸۴ تک تین خطوط شامل ہیں جو تمثیل نو کے تین شمارہ سے متعلق ہیں۔ اخیر میں صفحہ ۸۵ سے ۹۲ تک 'تمثیل نو' کے گیارہ شماروں پر تبصرے ہیں۔ یہ تبصرے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ صفحہ ۹۳ سے ۹۶ تک بلیک اینڈ وہائٹ ۱۲ تصاویر سے مزین ہیں۔ اس مجموعہ کا مطالعہ دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ ہر اردو کے تشنہ کام کو اس کا مطالعہ آسودگی بخشے گا۔

- **نام کتاب: گیسوئے اسلوب (ادبی مضامین)   مصنف: ڈاکٹر امام اعظم   اشاعت: ۲۰۱۸ء   ص: ۲۸۸**
قیمت: ۳۵۰ روپے   ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶   مبصر: ابواللیث جاوید (نئی دہلی)

'گیسوئے اسلوب' ۴۳؍مضامین پر مشتمل ڈاکٹر امام اعظم کی بیسویں کتاب ہے۔ان تمام ۴۳ مضامین میں ۱۴؍اردو شاعری، ۴؍اردو افسانوں، ۲؍اردو ناولوں، ۲؍اردو ڈراموں، ۴؍اردو تنقید اور ۷؍ادیگر سے متعلق ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اردو ادب کی تمام مروجہ اصناف کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔اردو شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے فیض احمد فیض کی شاعری میں روایت اور جدت طرازی کی تلاش کی ہے۔سردار جعفری کی غزلوں میں ترقی پسندیدیت، مجاز کے یہاں گہری رومانیت، شاد عارفی کا استادانہ رنگ و آہنگ، مظہر امام کا سوز و گداز، لطف الرحمٰن کی غزلوں میں جدید غزل کی معنویت، وسیم بریلوی کی غزلوں کی رومانیت، منصور عمر کی شاعری میں خوش فکری اور سراج دہلوی کی دوہا نگاری میں بے تکلف جذباتی فضا کے تحت بھکتی رس، شرنگار رس، پریم رس اور برہا رس کے گہرے رنگ کی بازیافت کی ہے۔ڈاکٹر موصوف بذات خود ایک اچھے شاعر ہیں اس لئے انہیں اردو شاعری کے مختلف فارموں میں کچھ نئی اور انوکھی شئے کی تلاش رہتی ہے۔اردو شاعری کے تعلق سے تمام کے تمام مضامین بہت محنت سے لکھے گئے ہیں اور کوئی نہ کوئی نیا نکتہ ضرور دریافت کیا گیا ہے خواہ وہ اسلوبیاتی نہج ہو یا شاعرانہ تفکر۔تمام مضامین اس اعتبار سے معلوماتی ہیں۔اردو افسانوی ادب میں منٹو کے افسانوں کی سماجی معنویت، بیدی کے یہاں ہندوستانی تہذیب کی ترجمانی، ابواللیث جاوید کے منفرد افسانوی اسلوب اور یٰسین احمد کے افسانوں میں کرب آمیز زندگی کی عکاسی کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ان تمام افسانہ نگاروں کے یہاں ایک سماجی زوال کا اندیشہ ملتا ہے وہ قدر مشترک ہے۔جس سے یہ بات نکل کر آتی ہے کہ ان تخلیق کاروں کی سوچ وفکر کے لہجے یکساں ہیں اور سبھی کو اپنی تہذیبی وراثت، ملکی وقار اور سماجی سربلندی کی فکر لاحق ہے۔اردو ناول نگاری کے حوالہ سے سید محمد اشرف کے ناول 'آخری سواریاں' اور صدیق عالم کے 'چارنک کی کشتی' کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ان دونوں ناولوں میں بدلتے سماجی رویوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔'آخری سواریاں' میں قومی یکجہتی، تہذیبی ہم آہنگی اور بدلتی سماجی صورت حال کو موضوع بنایا گیا ہے تو 'چارنک کی کشتی' شہر کلکتہ کی دوامی جگرسوزی اور مختلف طبقات کے تہذیبی اختلاط سے پیدا نئی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے اور ساتھ ہی صدیق عالم کے 'نئے ڈکشن' نثری نظم کے انداز میں لکھا گیا اردو کا شاید پہلا ناول ہونے کا اعلانیہ بھی ہے۔ڈاکٹر امام اعظم نے ان دونوں اردو کے ناولوں کو اپنے مضمون کے لئے انتخاب کر کے اپنی وسعت النظری کا ثبوت دیا ہے۔اسی طرح اردو ڈرامہ اور سفرنامہ کے حوالے سے ظہیر انور کے سفرنامہ 'ایک عرض تمنا'، اقبال جاوید کی کتاب 'آغا حشر کاشمیری: حیات اور ڈرامہ نگاری' اور جاوید دانش کے ڈراموں کے حوالے سے مقناطیسی شخصیت کو اپنے مضامین کے گھیرے میں لیا ہے۔ان تینوں تخلیق کاروں کی کاوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ان تمام مضامین کے علاوہ کچھ اور بھی اہم مضامین اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں جن میں 'علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں'، 'ہندوستانی فلمیں اور اردو'، 'اردو صحافت'، 'اردو وکی پیڈیا'، 'مولانا آزاد کے فکر و عمل'، 'آزاد غزل کا ہیئتی تجربہ'، 'سید احتشام حسین کے چار خطوط'، 'نظام صدیقی اور ابوالکلام قاسمی کی تنقیدیں، مناظر عاشق ہرگانوی کی داستانی طرز تحریر، سید تقی عابدی کا شاہکار: دیوانِ رباعیاتِ انیس، حقانی القاسمی کا تنقیدی وژن وغیرہ۔ان تمام پر تفصیلی مضامین لکھے گئے ہیں جو ان موضوعات کے نئے گوشوں کو قاری کے سامنے لانے میں کامیاب بھی ہیں۔

ان تمام مضامین کی فہرست میں ایک اور اہم مضمون بھی شامل ہے جو ڈاکٹر امام اعظم کی کولکاتا کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت سے گہری محبت ظاہر کرتا ہے۔ یہ مضمون صفحہ ۱۵ ر سے ۳۶ ر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں کولکاتا کی مکمل تاریخ سموئی ہوئی ہے۔ کولکاتا یوں تو ایک قدیم ترین شہر ہے مگر ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی انگریزوں سے شکست کے بعد یہاں انگریزوں کی سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی اور تب سے ہی مختلف شعبۂ ہائے زندگی کی سرگرمیوں کو ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ برطانوی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی یہاں مختلف النسل کی قوموں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آس پاس کی ریاستوں جیسے بہار، یوپی، اڈیشہ سے روزگار کی تلاش میں لوگوں کی ایک بھیڑ اکٹھا ہو گئی۔ کولکاتا کو برطانیہ حکومت کی راجدھانی کا درجہ حاصل رہا اس لئے یہ شہر ملک میں ایک نمایاں مقام کا حامل ہو گیا۔ صنعتی، اقتصادی، تجارتی مرکز کی حیثیت سے یہ شہر اہم ہو گیا اور لوگوں کو یہاں خاطر خواہ روزگار کے مواقع میسر ہو گئے۔ اس شہر میں ہر طبقہ کے لوگوں کو ان کے استطاعت کے مطابق زندگی کی سہولتیں میسر ہو گئیں۔ اس لئے اسے غریب پرور شہر کے نام سے بھی موسوم کیا گیا۔ ایک فرانسیسی ادیب Dminique Lapierre نے اسے پہلی بار City of Joy کہا۔ یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ اسے آج بھی شہر نشاط کہا جاتا ہے۔ یہاں علم و ادب کے میدان میں بے حد نمایاں اور عالمی شہرت یافتہ شخصیتوں نے جنم لیا اور پوری دنیا میں ملک کا نام روشن ہو گیا جس میں راجہ رام موہن رائے، ایشور چندر ودیا ساگر، سوامی وویکا نند، رابندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذرالاسلام، بنکم چندر چٹرجی، سرت چند چٹو پادھیائے، امرتیہ سین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات کی خدمت سے پورا ملک واقف ہے۔ اسی طرح اردو زبان و ادب کی بھی آبیاری بڑی دل سوزی سے کی گی ہے۔ مرزا غالب اور داغ دہلوی جیسے نابغۂ روزگار شعراء بھی اس شہر کے مداحوں میں رہے ہیں۔ مشرقی علوم کا مرکز مدرسہ عالیہ ۱۷۸۰ء میں عالم وجود میں آیا اور تشنگان علم و ادب کے ذوق کی سیرابی کرتا رہا۔ یہاں سے نامور عالم دین، دانشور، شعراء، ادباء پیدا ہوئے اور ہر چہار سو علم و آگہی کی روشنی پھیلائی گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد جسے جید عالم بھی اسی سرزمین کے سپوت ہیں اور ان کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا میدان عمل بھی رہا۔ ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا جہاں سے جدید اردو نثر کی بنیاد پڑی۔ یہ ہندوستان میں اردو ادب کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں قدم ثابت ہوا۔ اردو، ہندی، بنگلہ اور انگریزی زبانوں کی صحافت کے بھی نقطۂ آغاز کے طور پر کولکاتا شہر کو ہی دیکھا جاتا ہے۔ 'بنگال گزٹ' (انگریزی ۱۷۸۰ء)، 'سماچار درپن' (بنگلہ ۱۸۱۸ء)، 'جام جہاں نما' (اردو ۱۸۲۲ء) کولکاتا سے ہی شائع ہوا۔ اسی طرح ہفتہ وار اور روزناموں کی بھی ایک کثیر تعداد ہے جو اسی شہر سے شائع ہوئے اور یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ فنون لطیفہ میں موسیقی و رقص، مصوری، سنگ تراشی وغیرہ کا بے پناہ فروغ اسی شہر سے ہوا ہے۔ ربندر سنگیت اور نذرل گیتی بنگال کے ہر خاص و عام کے گھروں میں گونجتے ہیں۔ تعلیمی اداروں بشمول ہائی اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ شہر ذہنی طور پر بیدار ہے۔ اس مضمون میں یہاں کی اسپورٹس سرگرمیاں خصوصاً فٹ بال اور کرکٹ، سنیما ہاؤسز، تفریح گاہوں، ریستوراں اور ہوٹلز، لائبریریوں، تھیٹر ہاؤسز، فلم انڈسٹریز، تیوہاروں کی گہما گہمی، بازار، ہاٹ، بندرگاہوں، مسجدوں، مندروں وغیرہ کا بہت تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا

ہے۔اس مضمون پر تحقیقی مقالہ کا گمان ہوتا ہے۔ڈاکٹر امام اعظم کی ہر شعبہ میں محنت اور تحقیق کر کے تفصیلات لکھنا کاروارد۔اس مضمون میں جو تفصیل دستیاب ہیں شاید شہر کولکاتا کے حوالے سے کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتیں۔

ڈاکٹر موصوف نے کولکاتا کے تعلق سے ایک نظم 'یہی کولکاتا ہے' کے عنوان سے لکھی ہے جو ان کے شعری مجموعہ 'نیلم کی آواز' میں شامل ہے۔شہر کولکاتا کے حوالے سے ڈاکٹر موصوف نے اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''مغربی بنگال میں اردو کی پیش رفت تشفی بخش ہے۔جس سے متاثر ہو کر میں نے منظوم ادبی تاریخ 'یہی کولکاتا ہے' لکھی ہے۔اس میں میری فکری وابستگی کے ساتھ ساتھ میرے جذبات بھی شامل ہیں کہ چھ سال سے زائد عرصے سے میں کولکاتا میں مقیم ہوں اور تعلیمی ادارے کے ساتھ اردو کے ہر شعبہ سے وابستہ ہوں۔اس توانا پس منظر میں طویل نظم 'یہی کولکاتا ہے' کی تخلیق میرے ان صادق جذبوں کے بیان سے مملو ہے،جن کا سرا اس شہر نشاط سے عقیدت اور محبت سے جاملتا ہے۔......''

اس مضمون کے علاوہ مغربی بنگال میں اردو صحافت کی پیش رفت پر بھی بہت تفصیلی اور معلوماتی مضمون شامل ہے جو اس مجموعہ کی اضافی افادیت ہے۔

زیر تبصرہ ادبی مضامین کا مجموعہ ڈاکٹر امام اعظم کی باریک بینی اور ژرف نگاہی کا عکاس ہے۔اس کی قدر و قیمت تحقیق کرنے والے طلبا اور اردو تنقید سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ایمانداری سے کرنی چاہئے۔

....

● نام کتاب: نقوش علی نگر: تبصرے اور تجزیئے مرتب: ڈاکٹر امام اعظم اشاعت: ۲۰۱۸ء ص: ۴۸ قیمت: ۵۰ روپے ناشر: الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ-۷ مبصر: ابواللیث جاوید (نئی دہلی)

زیر تبصرہ کتاب 'نقوش علی نگر' مؤلف غلام فرید پر نوازش کریم کے طویل تبصرہ اور غلام فرید کے جواب تبصرہ پر پروفیسر ایم صدرالدین، راز سیوانی اور ڈاکٹر امام اعظم کے تجزیئے پر مبنی ہے۔'نقوش علی نگر' غلام فرید کی تصنیف ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی جو ۲۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ تذکرہ ضلع دربھنگہ کی مردم خیز بستی علی نگر کی علمی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں سے متعلق ہے جس میں اس بستی کی قدیم وجدید تاریخ کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب کا زیادہ حصہ علی نگر کی دینی، مذہبی اور ادبی رجحانات کے لئے مختص کئے گئے ہیں اور میرے خیال سے یہی حصہ زیادہ اہم و جاندار بھی ہے۔اس کے علاوہ یہاں بسنے والوں کے مذہبی رجحانات، مسلکی انداز اور سماجی رسومات کا بھی مدلل بیان ملتا ہے۔تبصرہ نگار نوازش کریم نے اپنے تبصرہ میں سماجی رسومات، عقائد اور روزمرہ کی عام زندگی کو ہی ہدف بنایا ہے۔ تقسیم وطن کے سانحہ کے بعد علماء و ادباء کی ہجرت، تعلیمی پس ماندگی اور محرم کی تقریبات کی علتیں، محفل میلاد اور جائداد کی خرید و فروخت کے بعد عام لوگوں کی بدحالی کا ذکر کیا ہے۔تبصرہ میں زیادہ زور مذہبی عقائد کی پامالی پر دیا گیا ہے۔ اس تبصرہ سے عام قاری کے سامنے علی نگر والوں کی ضعیف الاعتقادی سامنے آئی ہے۔اس کے علاوہ وہاں کے لوگوں کی سیاسی، علمی اور سماجی بدحالی کی وجہ انہیں تمام برائیوں کو بتایا گیا ہے۔اس تبصرہ کو پڑھ کر یقیناً ''نقوش علی نگر'' کے مطالعہ کی خواہش شدت سے سر اٹھاتی ہے۔

جواب تبصرہ میں ''نقوش علی نگر'' کے مصنف غلام فرید نے تمام اعتراضات کا جواب بہت ہی خوبصورتی سے دے دیا ہے۔ پروفیسر ایم صدر الدین، راز سیوانی اور ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے تجزیوں میں مصنف کے موقف کی تائید کی ہے اور کتاب ہٰذا کو ایک کارآمد تاریخ علی نگر بتایا ہے۔ میرے خیال سے دونوں نگارشات یعنی نوازش کریم کا تبصرہ اور مصنف غلام فرید کا جواب تبصرہ نے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ کردیا ہے اور پڑھے لکھے طبقہ میں اس کتاب کے مطالعہ کا شوق پیدا کردیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اصل کتاب 'نقوش علی نگر' کا یقیناً عکس ثانی بن گیا ہے اور اس کے مطالعہ سے بھی بستی علی نگر کی تصویر مرتب ہو جاتی ہے۔ باذوق حضرات کو 'نقوش علی نگر' اور اس کتابچہ کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہوں جو ہر اعتبار سے پڑھنے والوں کے لئے سودمند ثابت ہوگا۔

....

● نام کتاب: پرورش مصنفہ: آفرین حسین ص: ۱۱۸ قیمت: ۱۷۵ روپے اشاعت: ۲۰۱۸ء
ناشر: قاری احمر فاؤنڈیشن، کولکاتا-۱۳ مبصر: ابواللیث جاوید (نئی دہلی)

زیر تبصرہ مجموعۂ مضامین 'پرورش' آفرین حسین کے چھپن (۵۶) مضامین پر مشتمل ایک خوبصورت کتاب ہے۔ آفرین حسین اردو صحافت سے متعلق ہیں اور بچوں کی نفسیات سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ ان کی یہ تمام تحریریں روزنامہ 'اخبار مشرق' کے ہفتہ وار 'گلدستہ' میں شائع ہو چکی ہیں اور اس کے لئے انہیں داد و تحسین بھی مل چکی ہے۔ ان تمام ۵۶ مضامین کا مرکزی خیال اولاد اور والدین کے رشتے سے ہے۔ جن کا خاص مقصد سماج اور معاشرے کی اصلاح ہے۔ موجودہ دور خصوصیت کے ساتھ اخلاقی انحطاط کا دور ہے جس میں انسانی قدروں کی پامالی بہت تیزی سے ہو رہی ہے جس کا ادراک حساس طبقہ کو ہو جاتا ہے اور اسی طبقہ سے آفرین حسین کا بھی تعلق ہے۔ ان تمام مضامین میں اصلاح معاشرہ کا تصور صاف صاف نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی والدین کی اپنی اولاد کی ترقی، تحفظ، خوش حال مستقبل اور تعلیمی برتری کا جذبہ صاف طور پر عیاں ہوتا ہے۔ سماج کے کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کیلئے ہمدردی، شفقت اور حمایت کا صادق جذبہ بھی بعض مضمون کا خاص انداز ہے جس سے آفرین حسین کی انسان دوستی اور خدمتِ خلق کے پاکیزہ جذبہ کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تمام تحریریں اسی طرح کی سماجی، ملی اور معاشرتی تنزلی کو دور کرنے کے اندیشوں سے پُر ہیں۔ واقعات اور حادثات کے زیر اثر پیدا ہونے والے حالات پر ان کی گہری نظر ہے اور اس میں بغیر شرکت غیرے اصلاح کرنے کا بھی جذبہ نظر آتا ہے۔ ماں جیسے پاکیزہ رشتہ کی حرمت کا بہت خیال رکھا گیا ہے اور اولاد کو ماں کی اہمیت کا احساس دلانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ مضامین کے چند عنوانات جیسے 'ماں کی اہمیت کو سمجھیں اور ان کی آنکھیں کبھی نم نہ ہونے دیں'، 'ماں کی عدم موجودگی کا احساس دل کو چھلنی کر دیتا ہے'، 'بچے ماں کا خیال رکھیں'، 'ماں بگڑے بچوں کو سدھارنے کا کام پیار سے کرتی ہے'، 'ماں کی ممتا انمول ہوتی ہے' وغیرہ اولاد کو ماں کی ہستی کی اہمیت سمجھانے کے لئے نہایت اہم ہیں۔ ماں کے حوالے سے کم و بیش چودہ مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں جو ماں کی قدر و قیمت کا اولاد کو احساس دلانے کے لئے کافی ہیں۔ بقیہ مضامین صرف اور

صرف اولاد اور والدین کے حوالے سے کہیں مضمون کی شکل میں تو کہیں تمثیل کے انداز میں لکھے گئے ہیں جن سے مصنفہ کی بلند خیالی، شریف النفسی، معاشرتی بگاڑ کے اصلاح کا بے لوث جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔

تمام مضامین انہیں جذبوں کے تحت لکھے گئے ہیں جو سبق آموز ہیں اور اصلاحی بھی۔ ان مضامین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پس ماندہ، معذور اور کمزور طبقہ سے تعلق رکھنے والے بچوں کی مدد اور ان کی بہتری کی فکر مصنفہ کے دل میں بے پناہ ہے اور اس کے لئے وہ کچھ ٹھوس اقدام کرنے کی بھی متمنی ہیں۔ میں ان کے ان جذبوں کی قدر کرتا ہوں اور ان کی ان کاموں میں خاطر خواہ کامیابی کی بھی تمنا کرتا ہوں۔ مجموعہ میں شامل تمام مضامین والدین اور اولاد دونوں کی صحیح رہنمائی کرنے میں کامیاب ہیں۔ زیرِ تبصرہ مجموعہ کا مطالعہ ہر مکتب فکر کے قاری کے لئے فائدہ بخش ہوگا۔

اس مجموعہ کے مطالعہ کے لئے میں ہر پڑھے لکھے لوگوں کو سفارش کرتا ہوں۔ اس کتاب کی اہمیت کے مدنظر ہر طبقہ میں اس کی پذیرائی ہونی چاہئے اور اس کی مصنفہ کی صالح فکر کی داد دینی چاہئے۔ کتاب کی کمپوزنگ، طباعت، گٹ اپ خوبصورت ہے اور قیمت واجبی۔

....

- **نام کتاب: پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں (شعری مجموعہ) شاعر: ڈاکٹر حنیف ترین ص: ۳۲۸ قیمت: ۳۰۰ روپئے اشاعت: ۲۰۱۶ء ناشر حنیف ترین مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵**

زیر تبصرہ ڈاکٹر حنیف ترین کا شعری مجموعہ ہے جس میں ۵۴ نظمیں، ۲۱ غزل نما اور ۱۳ ر غزلیں شامل ہیں۔ ان ۵۴ نظموں کو بھی عشق رنگ میں ۱۲، یادرنگ میں ۶، ہجر رنگ میں ۹، خواب رنگ میں ۸، دھنک رنگ میں ۱۲، یادرنگ میں ۹ا تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ اس مجموعہ کی نئی جدت ہے کہ مذکورہ بالا رنگوں کی مناسبت سے شروع کے صفحات پر جینت پرمار کے آرٹ کے نمونے شامل کئے گئے ہیں اور اہلِ قلم حضرات کی آراء بھی درج ہیں۔ مثال کے طور پر 'عشق رنگ' پر ابرار کرت پوری، 'یادرنگ' پر اطہر فاروقی، 'ہجر رنگ' پر نعمان قیصر، 'خواب رنگ' پر خالد اعظمی اور 'دھنک رنگ' پر حقانی القاسمی کی آراء شامل ہیں۔ جینت پرمار کے آرٹ کے نمونے نہایت خوبصورت اور عنوانات کی مناسبت سے بنائے گئے ہیں۔ اس قسم کی پیشکش بالکل نئی اور اچھوتی ہے جس سے صاحب کتاب ڈاکٹر حنیف ترین کی جمالیاتی حس کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ ویسے یہ احساس اس مجموعہ کے ورق ورق سے عیاں ہے۔

مجموعہ کا آغاز نظام صدیقی کے پیش لفظ بہ عنوان 'نئے عہد کی نظمیہ تخلیقیت کا سدا بہار دل افروز سخن ور' سے ہوتا ہے۔ اس پیش لفظ میں ڈاکٹر حنیف ترین کی اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد جدید تاریخی تناظر میں تخلیقیت کے رجحان کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی نظموں کی تخلیق میں جن تکنیک کا سہارا لیا ہے اُن پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ حنیف ترین کی نظموں کی تقسیم 'عشق رنگ'، 'یادرنگ'، 'ہجر رنگ'، 'خواب رنگ' اور 'دھنک رنگ' کی ساختیات پر بحث کرتے ہوئے نظام صدیقی نے ان کی (حنیف ترین کی) نئے علامات، نئے استعارات اور نئے اشارات کے استعمال کرنے پر کھل کر داد و تحسین سے نوازا ہے اور یہ سند عطا کی ہے کہ — "...... بغاوت پسند شیر سے آگے وجودیاتی اور عرفانیاتی طور پر از سر نو پیدائش (Rebirth) کی منزل سے گذر رہا ہے۔ اس میں بیک وقت

روحانی غسل کے بعد بظاہر از سر نو طفل (Rechild) جیسی تخلیقی معصومیت اور بہ باطن معراجی ہوش مندی اور صعودی و عمودی آگہی و عرفان کا بیکراں تجلی اعظم طلوع ہوتا ہے۔ حنیف ترین تازہ حسین و زریں نظموں کی کتاب 'پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں' اُس خورشید آسا صداقت کا آفتاب نشاں ہے۔ فی زمانہ ہندوستان میں نئے عہد کا نظمیہ تخلیقیت کا ہفت سیارہ (Fleiad) صلاح الدین پرویز، گلزار، عنبر بہرائچی، جینت پرمار، عذرا پروین، خلیل مامون اور ڈاکٹر حنیف ترین رخشندہ ترین ہیں......"

کتاب کی ابتدا حمد اور نعت شریف سے ہوتی ہے۔ ان کے بعد ہی نظم 'پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں' شامل ہے۔ پھر شروع ہوتا ہے رنگوں کا سلسلہ جس میں 'عشق رنگ' حنیف ترین کے شعر:

جنوں کے رنگ سے ہی عشق فیض یاب ہوا　　　اور اس مزے میں مجھے درد بے حساب ہوا

اور جینت پرمار کی خوبصورت پینٹنگ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی پوری طاقت رکھتی ہے۔ اس رنگ کی ۱۲ر نظمیں ہیں جن کی تخلیق نئی معنویت کے ساتھ ہوئی ہے اور شعر کے عشق کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ہر نظم عشق کی نئی تعریف (Definition) ہے جن میں شاعر کا کمالِ فن صاف نظر آتا ہے۔ 'یاد رنگ' اس شعر:

چوٹ کا دل پہ اثر ہو تو قلم چلتا ہے　　　یاد بے سایہ شجر ہو تو قلم چلتا ہے　(حنیف ترین)

اطہر فاروقی کی رائے اور جینت پرمار کی پینٹنگ سے مزین ہے۔ اس حصہ میں یاد کے تعلق سے ۶ر نظمیں شامل ہیں جن کے ذریعہ یادوں کے حوالے سے اس حصہ کی ۶ نظموں میں یادوں کی ۶ قوس قزح بکھیری گئی ہیں۔ ان نظموں کی یہ خوبی ہے کہ قارئین کو یادوں کی وادیوں کی سیر نصیب ہو جاتی ہے۔ ان خوابوں کی سیر مسرت آگیں بھی ہے اور طرب آشنا بھی۔

'ہجر رنگ' کی ابتدا حنیف ترین کے شعر: 'یہ کچھ گونج ہے جو نیند چاٹ جاتی ہے/ یہ کون چیختا پھرتا ہے کو بہ کو مجھ میں' نعمان قیصر کی آراء اور جینت پرمار کی پینٹنگ سے ہوتی ہے۔ ہجر و وصال اُردو شاعری کا اہم موضوع رہا ہے مگر اس مجموعہ میں شامل ۹ نظمیں ہجر کے تصور کے ۹ مختلف شیڈز ظاہر کرتی ہیں۔ ان نظموں کا کمال یہ ہے کہ خوبصورت اور خوب سیرت الفاظ کی مالا پروئی گئی ہے جس سے ہجر کی خوشبو آتی ہے اور پڑھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔ اس کے بعد خوابوں کا 'خواب رنگ' سلسلہ حنیف ترین کے شعر: 'خواب سی بے خوابیوں کی راہ پر/ میں گذر کر پا گیا پائندگی' خالد اعظمی کی آراء اور جینت پرمار کی خوبصورت پینٹنگ سے شروع ہوتا ہے جو خواب اور حقیقت کی دنیا سے متعارف کراتا ہے۔ ۸ خوبصورت نظمیں کیسے کیسے انوکھے جہانوں کا سیر کرا دیتی ہیں۔ خوابوں کی طلسماتی دنیا ہماری اور آپ کی منتظر رہتی ہے اور پڑھنے والا تمام دنیاوی کلفتوں کو بھول کر خیالی حسین دنیا میں محو ہو جاتا ہے۔ رنگوں کا آخری پڑاؤ 'دھنک رنگ' پر آتا ہے جہاں حنیف ترین کا شعر کہ: 'دیمک بن کر دل کے ورق کھا جاتا ہے/ یوں فکری سرطان کا رشتہ ہوتا ہے' اور حقانی القاسمی کی پُر مغز آراء، جینت پرمار کی حسین پینٹنگ ہمیں اپنے جادوئی شکنجے میں جکڑ لیتی ہے اور یہ باور کراتی ہے کہ ہم آگہی کی چمک کے ساتھ بھیڑ میں بھی تنہا سے ہیں۔ خود کو ثابت کرنے کی کوشش میں اندر کا درد بھی باہر آ چکا ہے۔ زندگی کتنی انمول اور کتنی عارضی سی ہے۔ ان ۱۹ر نظموں کے مطالعہ سے زندگی کی حوصلہ مندی،

غیرت مندی اور دردمندی کا احساس جاگ اُٹھتا ہے۔ احساسِ سود و زیاں کی یلغار بھی ہوتی ہے اور پھر سے تازہ دم ہو کر کھڑے ہو جانے کا حوصلہ بھی نصیب ہوتا ہے۔

اکیس غزل نما اور تیرہ غزلوں کی دھنک قارئین کو اُردو شاعری کی کلاسیکی اور جدید شاعری کی لذت سے روشناس کراتی ہیں۔ غزل نما رنگ کا تعارف ظہیر غازی پوری اور 'غزل رنگ' کا ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے لکھا ہے۔ مظہر امام نے جہاں غزل کو چند پابندیوں سے آزاد کر کے آزاد غزلیں کہیں وہیں ظہیر غازی پوری نے غزل نما کی وکالت کی اور ایک نسل ہی اس کی حمایت میں کھڑی کردی۔ آزاد غزل اور غزل نما دونوں غزل کی صنف میں معتبر شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ حنیف ترین کے اس مجموعہ میں اکیس غزل نما اور ۱۳ ر غزلیں شامل ہیں۔ غزل نما کی ساخت بالکل غزل کی سی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ردیف اور قافیہ کی پابندی کے ساتھ ہر شعر مختلف بحر میں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آزاد غزل کے اشعار ویسے نہیں ہوتے۔ ایک شعر کے دونوں مصرعے مختلف بحروں میں ہوتے ہیں حالانکہ ردیف اور قافیہ ایک ہی ہوتا۔ زیر تبصرہ مجموعہ میں آزاد غزلیں نہیں ہیں بلکہ غزل نما ہی شامل ہیں۔ اس غزل میں بھی غزل کا وہی حسن برقرار رہتا ہے جو غزل کو غزل بناتا ہے۔ حنیف ترین غزل کے حسن، تازگی، نزاکت اور شگفتگی کو غزل نما میں بھی برتنے میں کامیاب ہیں۔ مثلاً:

ہجر کا سویرا ہے/ دور تک اندھیرا ہے/ اس قدر قریب آ جا پھر دوئی نہ رہ جائے/ زندگی کا اب ہر پل، تیرا اور میرا ہے/ جو قلم کی زد میں آئے، زمیں آسمان ستارے، ہوئی دیدنی نظارے/ یہ میں کس کو لکھ رہا ہوں؟ یہ ہے کون حسن یکتا، جو سما گیا سخن میں/ اُسے ڈھونڈنے چلے ہو تو یہ بات یاد رکھو/ وہ جو حاصل غزل ہے نہیں حرف شعلہ زن میں

حنیف ترین نے غزل کی اس تبدیلی کو صالح تبدیلی سمجھا ہے اور اسے اپنی شاعری میں بخوبی برتا بھی ہے۔ کہتے ہیں:

جو دائروں میں بند ہیں اُن سے یہ کہہ دو حنیف
ہے شاعری بس شاعری، پابند کیا آزاد کیا

غزلوں میں بھی حنیف ترین نے کلاسیکی رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ جدید لب و لہجہ، نئے پیکر، نئے استعارے، نئی علامتیں برتنے کا التزام کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں غم حیات کے ساتھ زندگی کی نئی ترنگیں بھی ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں مثلاً:

ساتھ اپنے وہ ہر کہکشاں لے گیا　　میرے ہاتھوں میں بس پھلجھڑی رہ گئی
کیا نہیں تھا تری زندگی میں حنیف　　پھر بھی کیا ڈھونڈتی زندگی رہ گئی

پیش نظر مجموعہ حنیف ترین کے خوبصورت کلام کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ اس مجموعہ میں شریک ان کی نظمیہ شاعری نہایت خوبصورت اور دل کو چھونے والی شاعری ہے۔ زندگی کے مختلف رنگوں سے مزین یہ نظمیں قارئین کو تصوراتی جہاں کی دور دور تک کی سیر کرا دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے زندگی کی دھوپ چھاؤں کا

بخوبی ادراک ہو جاتا ہے۔غزلیں بھی معیاری اور قابل قدر ہیں۔اس مجموعہ کا مطالعہ ذہن کو فرحت اور تازگی بخشتا ہے۔مجموعہ صوری اور معنوی اعتبار سے بھی نہایت خوبصورت ہے۔اس کی پذیرائی سنجیدہ قارئین کے ذریعہ یقینی ہے۔

....

● نام کتاب:شمیم انجم وارثی:شخصیت اور فن مرتب:ڈاکٹر اقبال حسین ص:۲۶۴ قیمت:۳۰۰روپے اشاعت:۲۰۱۷ء ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی-۶ مبصر:ابواللیث جاوید،نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

زیر تبصرہ کتاب وقار قادری کے دس مضامین جس میں ایک مضمون مغربی بنگال میں اردو زبان وادب کی ترویج و شاعت سے متعلق ہے اور بقیہ ۹ مضامین معروف شاعر شمیم انجم وارثی کی شعر گوئی کی مختلف جہتوں سے متعلق پر مشتمل ہے۔ان کے علاوہ ۶ مضامین دیگر ناقدین ادب کے ہیں جنہوں نے شمیم انجم وارثی کی شاعرانہ عظمت کے تعین کی کوششیں کی ہیں۔اس طرح یہ کتاب پندرہ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے اور کتاب کا پانچواں باب منظوم خراج تحسین کا ہے۔کتاب کے آخری حصہ پر شمیم انجم وارثی کے کوائف ہیں جس سے اچھی خاصی معلومات فراہم کی گئی ہے۔وقار قادری جھارکھنڈ کے مشہور و معروف شاعر اور ادیب تھے جنہوں نے اپنے ہم عصر شعراء جیسے شہر یار،مظہر امام،صدیق مجیبی وغیرہ کی شعری روایت کی بازیافت کی ہے۔

وقار قادری نے شمیم انجم وارثی کی شعری جہات کو اپنے ۹ مضامین کے ذریعہ متعین کیا ہے۔جس میں شخصیت، نعتیہ شاعری،دوہا نگاری،غزلیہ شاعری،جاپانی صنف شاعری،گیت نگاری،ماہیا نگاری،رباعی گوئی اور بچوں کے لئے نظم نگاری کا بہت ہی خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا ہے۔وقار قادری نے اپنی مکمل جادو بیانی کے ذریعہ شمیم انجم وارثی کے شاعرانہ وقار اور شخصی عظمت کو دنیا کے سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے۔باب اول میں صرف ایک مضمون بہ عنوان ’’مغربی بنگال میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت‘‘ ہے جس میں مغربی بنگال میں چودہویں صدی میں عیسوی سے تا حال کا اس زبان کی ترویج واشاعت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔اس مضمون کے ذریعہ اردو زبان کے مختلف ادوار کا خوبصورت بیان ہے۔باب دوم فن اور شخصیت سے متعلق ہے،جس کے ذریعہ شمیم انجم وارثی کی شعری کاوشوں کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔جس میں جاپانی شاعری کے حوالے سے اس کی مختلف صنف سخن جیسے کاتا اوتا،تنکا،رینگا،چوکا،سیڈوکا،ہائیکو،سین ریو وغیرہ پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور شمیم انجم وارثی کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔اس مضمون سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ شمیم انجم وارثی میں شعری تخلیقی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں اور وہ اردو شاعری کی مختلف اصناف کے علاوہ دوسری عالمی زبانوں کی اصناف پر بھی برابر کی قدرت رکھتے تھے۔دیگر مضامین میں ان کی غزلیہ،نعتیہ،رباعی،گیت اور ماہیا کی شاعری پر بحث کی گئی ہے اور ان کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔باب سوم مختلف ناقدین کے چھ مضامین پر مشتمل ہے جن میں ڈاکٹر فراز حامدی،ڈاکٹر محبوب راہی،حلیم صبا نویدی،ڈاکٹر رؤف خیر،ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور حلیم صابر قابل ذکر ہیں۔ڈاکٹر فراز حامدی نے شمیم انجم وارثی کے مجموعہ کلام ’چاہت چاہت مسکان‘ پر گفتگو کی ہے اور ان کی جاپانی صنف شاعری کے مختلف فارم

پر اردو میں مشق سخن کرنے کو موضوع بنایا ہے اور اس کتاب سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ مضمون کے اخیر میں اس طرح کا نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"......شمیم انجم وارثی ایک ذہین و فطین حوصلہ مند اور دور اندیش شخصیت کے مالک ہیں اور اپنے منفرد اور نمایاں کارناموں کے سبب عالمی سطح پر اپنی پہچان رکھتے ہیں......۔"

ڈاکٹر محبوب راہی نے ان کے مجموعہ 'جنگل جنگل مور' کو زیر بحث لایا ہے جو ادب اطفال سے متعلق ہے۔ اس مجموعہ میں شامل چند نظموں کا مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور رقمطراز ہیں کہ:

"......وہ ادب الاطفال کی تخلیق میں سرگرم رہے نیز اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا نسبتاً بڑا حصہ بچوں کی شاعری کے لئے وقف کرتے رہے تو دنیوی شہرت کے ساتھ ساتھ اخروی نعمتوں سے بھی سرفراز ہوں گے کہ میرے نزدیک بچوں کی ذہن سازی کے لئے کارآمد ادب کی تخلیق کسی بڑے سے بڑے کار ثواب سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

علیم صبا نویدی اور ڈاکٹر رؤف خیر نے ان کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیا ہے اور اسے ان کے لئے باعث نجات کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ان کی دوہا نگاری کا جائزہ لیا ہے اور یہ فیصلہ سنایا ہے کہ:

"......شمیم انجم وارثی نے دوہا میں تجربہ کر کے نیا آفتاب طلوع کیا ہے جس کی شدت میں نظر سوز فضائیں ہیں اور حیات نو کے افق کی تابناکی ہے۔"

حلیم صابر نے اپنے مضمون شمیم انجم وارثی کی شاعرانہ صلاحیت کا جائزہ لیا ہے اور انہیں عوامی مشاعروں اور ادبی جرائد و رسائل میں یکساں مقبول شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مختلف شعری اصناف میں کہے گئے اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے اور اخیر میں یہ بھی کہتے نظر آتے ہیں کہ:

"......تجربوں کا سفر تمام عمر جاری رہتا ہے اور شمیم انجم وارثی کا بھی یہ سفر جاری ہے......۔"

پانچواں باب ناقدین کی گرانقدر آرا پر مبنی ہے جس میں ۲۲ / اہل قلم حضرات کے تصورات شامل کئے گئے ہیں۔

ناقدین کے مضامین اور پھر ان کی آراء کو شامل کر کے شاعر موصوف نے اپنی شاعری کے حوالے سے سرٹیفکیٹ دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، یہ ان کی اپنی ہی شاعرانہ صلاحیتوں کے منفی پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر کوئی شاعر اپنی تخلیقات سے خود مطمئن ہے اور اسے خود پر پورا اعتماد ہے تو نہ تو ایسے مضامین، نہ تو ایسی آراء اور نہ ہی کسی تقریظی کلمات کی ضرورت ہے۔ ان کی شاعری میں خود کو ثابت کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اسی طرح سے کتاب کے شروعاتی صفحات پر صفحہ ۷ سے ۲۲ تک جو مختلف تصاویر شامل کی گئی ہیں وہ بھی ان کی خودنمائی کے جذبے کو آشکار کرتی ہیں جس سے پرہیز کیا جائے تو بہتر ہے۔

اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر اقبال حسین قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے ایک جینوئین شاعر کے کلام کو ترتیب دیا ہے۔ ایسا کر کے انہوں نے اپنی خوش فکری کا ثبوت دیا ہے۔ وقار قادری کی 'تیسری آنکھ' بھی ان کی مرتب کردہ کتاب ہے اور ۲۰۱۴ میں شائع ہوئی۔ جھارکھنڈ کی ادبی دنیا پر ان کی اچھی تحقیق ہے اور 'سخنوران جھارکھنڈ (۲۰۱۲ء)

ان کی معروف کتاب ہے۔ 'شمیم انجم وارثی-شخصیت اور فن' قابل قدر مجموعہ ہے۔ ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہونی چاہئے۔

....

● **نام کتاب: تنقیدات خوشدل (ادبی مضامین) مصنف: ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل ص: ۲۳۹ قیمت: ۵۰۰ روپے اشاعت: ۲۰۱۶ء ناشر: خود مصنف مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵**

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل کے ۲۲/ ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اردو شاعری کے حوالے سے علامہ اقبال، سہیل غازی پوری، مظفر حنفی، ناوک حمزہ پوری، ابرار کرت پوری، حافظ کرناٹکی، رفیق شاہین، فاخر جلال پوری، نادم بلخی، عبدالرؤف خوشتر، عقیل ہاشمی، چندر بھان خیال، اسلم بدر، بی ایس جین جوہر، صدیق مجیبی اور گوہر جمالی کے فن کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے اسی طرح افسانوی ادب میں سعادت حسن منٹو کی فحش نگاری پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس ضمن میں منٹو کے وہ بیانات Quote کئے ہیں جو انہوں نے اپنے مختلف مضامین میں دئے ہیں اور فحش نگاری کے سلسلہ میں اپنے موقف کو واضح کیا ہے۔ اردو فکشن کے علاوہ کسی بھی نثری صنف پر کوئی مضمون نہیں ہے۔ اس مضمون کے علاوہ کتاب میں شامل تمام مضامین اردو شاعری سے متعلق ہیں۔ 'اردو شاعری کے مختلف اصناف پر ایک طائرانہ نظر' ایک اچھا معلوماتی مضمون ہے اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ اس مضمون کے شروع کے پیراگراف میں علامہ ناوک حمزہ پوری کی کتاب 'ترسیل سخن' کا ذکر خیر آیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مضمون اسی کتاب سے استفادہ ہے۔ اس مضمون میں شاعری کی تمام تر اصناف پر گفتگو کی گئی ہے اور ان کی تراکیب بتائی گئی ہیں۔ اگر ان تمام اصناف سخن پر گفتگو کے بعد مثالیں بھی پیش کی جاتیں تو یہ مضمون اور اہم اور معتبر ہو جاتا۔ ایک مضمون 'ایک تنقیدی جائزے کا تنقیدی جائزہ' ہے۔ اس کے عنوان نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ مطالعہ سے پتہ چلا کہ ڈاکٹر رؤف خیر کی تصنیف 'بچشم خیر' کا ایک مضمون 'ناوک نے تیرے......' اس مضمون کا محرک ہے۔ یہ مضمون ایک ادبی چشمک کی بھی غمازی کرتا ہے۔ مضمون کے آخری حصہ کا یہ جملہ — ''خیر صاحب آپ تو خیر سے کالج کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ پکی سیاہی میں آپ نے اپنی علمی بصیرت کی دھاک جمانے کے لئے بغیر کسی تحقیق کے حضرت ناوک (جو مڈل اسکول کے صدر مدرس ہو کر وظیفہ یاب ہو چکے ہیں) کو غلط ثابت کرنے کی ناکام کوشش میں اپنے قد کو بہت چھوٹا کر ڈالا...... '' اس بات کا بین ثبوت ہے۔

'علامہ اقبال کی شاعری میں قرآنی تعلیمات کی عکس ریزی' ایک اچھا مضمون ہے۔ علامہ کی شاعری کا جائزہ قرآن پاک اور احادیث نبویؐ کے حوالے سے لیا گیا ہے اور علامہ کے اشعار کو مثال کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ علامہ کی پوری شاعری کا سرچشمہ کلام اللہ اور حدیث نبویؐ ہی ہے اس لئے ان کی شاعری میں آفاقیت باقی ہے۔ علامہ اقبال عالمی شہرت یافتہ شاعر، مفکر، مدبر، فلسفی ہیں جن کی شاعری نے تاریخ اسلام کے زریں باب کو دنیائے اسلام کے سامنے رکھنے میں کامیاب ہوئی۔ ان کے افکار کو پوری دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا اور ان کے کلام کے ترجمے دنیا کی ہر بڑی زبان میں کئے گئے ہیں۔ کم و بیش ان کے کلام کے حوالے سے دو ہزار سے زائد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کے فن کا احاطہ کرنا میرے خیال سے ممکن نہیں ہے۔

دیگر شعراء کرام میں ڈاکٹر مظفر حنفی، ناوک حمزہ پوری، ابرار کرت پوری، حافظ کرناٹکی، رفیق شاہین، فاخر جلال پوری، نادم بلخی، عبدالرؤف خوشتر، عقیل ہاشمی، چندر بھان خیال، اسلم بدر، بی ایس جین جوہر، صدیق مجیبی اور گوہر جمالی کی شاعری پر اظہار خیال مضمون کی صورت میں کیا گیا ہے۔ تمام مضامین کے مطالعہ سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ان تمام حضرات کی شاعرانہ عظمت کو اپنی نجی عقیدت واحترام کے زیر اثر بیان کیا گیا ہے۔ جس سے فن پر ناقدانہ رویہ عنقا ہوتا نظر آتا ہے۔ ذاتی عقیدت واحترام کا جذبہ اپنی جگہ مسلّم ہے مگر کسی کے فن کو پرکھتے وقت اسے خیالات پر حاوی نہیں ہونا چاہئے۔ پھر تنقید کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا۔ مذکورہ بالا شعراء کی فنی صلاحیتوں کو بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا ہے اور بہت سے پوشیدہ حقائق بھی بیان کئے گئے جو نہایت اہم بھی ہیں۔

مضامین 'لفظ ارم تحقیق کی روشنی میں' اور 'قرآن امن عالم کا محافظ' نہایت معلوماتی اور قابل ستائش ہیں۔ قرآن پاک کے امن عالم کے پیغام کو بہت خوبصورت پیرائے میں حوالوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جو حدیث نبویؐ کا بھی سرچشمہ ہیں۔ یہ مضمون محنت اور عقیدت سے لکھا گیا ہے۔ امن عالم کے دشمن طبقہ کے لئے یہ مضمون یقیناً تازیانے کا کام کرسکتا ہے۔ اسی طرح لفظ 'ارم' کی تشریح بھی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ یہ دونوں مضامین اس مجموعہ میں اہم ہیں اور اسے قابل مطالعہ بھی بناتے ہیں۔ اردو ادب کے طلباء، طالبات کے لئے یہ مجموعہ اردو شاعری کے حوالے سے نفع بخش ہے۔ اسے مطالعہ میں رکھا جانا چاہئے۔

....

● نام کتاب: اردو ناولوں میں عورتوں کے مسائل (مقالات) مرتب: ڈاکٹر نوشاد عالم ص: ۱۹۲
قیمت: ۲۵۰ روپے اشاعت: ۲۰۱۸ء ناشر: رام نگر لین فورم آف ریولیوشن فار کیبوٹیو ایجوکیشن فورس، کولکاتا-۷۰۰۰۲۴ مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

'اردو ناولوں میں عورتوں کے مسائل' اُن مقالات کا مجموعہ ہے جنہیں مختلف مقالہ نگاروں نے آر این ایل فورس، کولکاتا میں منعقدہ سیمینار مورخہ ۳۰ رجنوری ۲۰۱۶ء کے اجلاس میں پڑھے تھے۔ ان مقالات کو ڈاکٹر نوشاد عالم نے ترتیب دے کر کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ Women Empowerment (نسوانی توانائی) کے اس ماحول کی مناسبت سے یہ سیمینار بہت موزوں وقت پر منعقد کیا گیا۔ غور طلب یہ بھی ہے کہ اس سیمینار میں کل ۱۴ رمقالات پڑھے گئے جس میں ۶ رمقالات خواتین دانشوروں کے تھے۔ عورتوں کے مسائل اردو کی ناول نگاری کے شروعاتی دور کے ہی ناولوں میں جگہ پا چکے تھے اور اُن کی سماجی، تعلیمی، اخلاقی پس ماندگیوں کا ذکر کثرت سے کیا گیا تھا اور ساتھ ہی ان کے حل کو بھی پیش کیا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'مراۃ العروس' کو اردو کا اولین ناول تسلیم کیا جاتا ہے اور یہیں سے یعنی ۱۸۶۹ء سے اردو ناول نگاری کا آغاز ہوا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کا وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا انحطاطی دور تھا۔ یہ مظلوم طبقہ اپنے وجود کے لئے جدوجہد میں مصروف تھا۔ ایسے منحوس وقت میں عورتوں کی آزمائش ہو رہی تھی۔ اس امر کا ذکر اُس وقت کے لکھے گئے تمام ناولوں میں آیا اور ایک سماجی اندیشہ ظاہر کیا گیا۔ سیمینار میں پڑھے گئے تمام چودہ مقالات میں انیسویں صدی سے لے کر اکیسویں صدی تک میں لکھے گئے اُن تمام

ناولوں کو احاطۂ بحث میں لایا گیا ہے جن میں خواتین کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ انیسویں صدی کے ناول نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری اور رشید النساء کے ناولوں میں خصوصیت کے ساتھ عورتوں کے متفرق مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں پریم چند سے لے کر مشرف عالم ذوقی تک کے اُن ناولوں کو سامنے رکھ کر گفتگو کی گئی ہے جن میں عورتوں کے مسائل ہی موضوع ہیں۔

تمام مقالہ نگاروں کا اجمالاً جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے شائستہ فاخری کے ناول 'صدائے عندلیب بر شاخِ شب' میں عورت مرد کے جنسی رشتہ، ڈاکٹر امام اعظم نے صدیق عالم کے ناول 'چارنک کی کشتی' میں عورتوں کے استحصال کی کہانی، ڈاکٹر نصرت جہاں نے اُردو کی اکثر ناول نگار اور افسانہ نگار خواتین کی تخلیقات میں عورتوں پر ظلم و استبداد، جنسی استحصال وغیرہ مسائل کا جائزہ، ڈاکٹر ترنم مشتاق نے پریم چند کے چار اہم ناولوں میں عورت، انجم رومان نے راجندر سنگھ بیدی کے ناول 'ایک چادر میلی سی' میں عورتوں پر مردوں کی بالادستی، ڈاکٹر شبنم پروین نے عصمت چغتائی کے ناول 'معصومہ' میں عورت کے کرب، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے رشید النساء کے 'اصلاح النساء' میں عورت کی معصومیت، ڈاکٹر ریحانہ فاطمہ نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'مراۃ العروس' میں عورتوں کی توہم پرستی، تعلیم سے بے گانگی، احمد جاوید نے مشرف عالم ذوقی کے ناول 'نالۂ شب گیر' میں اکیسویں صدی کے ہندوستان میں عورت اور اس کے مسائل کی شدت، ڈاکٹر شارقہ شفتین نے شہناز فاطمی کے ناول 'بولتی آنکھیں' شوہر اور بیوی کے رشتوں، شاہد اقبال نے 'انیسویں صدی کے چھ نمائندہ ناولوں میں عورتوں کے مسائل، سید ایاز احمد روہوی نے راشد الخیری کے ناول 'بنات النعش' کی تعلیم نسواں کی مہم، فاطمہ خاتون نے جیلانی بانو کے ناول 'ایوان غزل' میں جاگیرداروں کے تعیش، ارشاد شفق نے جمیلہ ہاشمی کے ناول 'تلاش بہاراں'، 'راہی'، 'چہرہ بہ چہرہ'، 'روبرو' اور 'آتش رفتہ' میں عورتوں کے عزم، ہمت اور خود کو منوانے کے جذبوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان تمام مقالات سے عورتوں کے تئیں صالح جذبے اور ہمدردی کی لہریں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور سماجی گروہ بندیوں پر شدید اندیشہ کا بھی علم ہوتا ہے۔ سبھی مقالے محنت سے لکھے گئے ہیں اور عورتوں کے مختلف سماجی، سیاسی، تعلیمی، تہذیبی اخلاقی مسائل کی نشاندہی بڑی کامیابی سے کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نصرت جہاں کا مقالہ اس اعتبار سے اہم بن گیا ہے کہ انہوں نے کسی ایک خاتون ناول نگار کے ناول کو ہی سامنے نہیں رکھا ہے بلکہ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ترنم ریاض، شائستہ فاخری، شہناز فاطمی، ناصرہ شرما، ثروت خاں، ساجدہ زیدی کے ناولوں میں Women Empowerment اور Women Reform کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ ان کے علاوہ ریوتی سرن شرما کا 'سفر بے منزل'، غضنفر کا 'کینچلی'، شموئل احمد کا 'ندی' اور مشرف عالم ذوقی کا 'لے سانس بھی آہستہ' پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

یہ مجموعہ عورتوں کے مسائل کے حوالے سے نہایت مدلل اور کارآمد ہے۔ تانیثی ادب اور Women Empowerment کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس مجموعہ کا مطالعہ لازمی ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نوشاد عالم مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ادبی حلقوں میں اس کی بھرپور پذیرائی ہونی چاہئے۔

....

● نام کتاب: وہ ایک پل (افسانے اور مضامین) مصنف: سلطان شاہد اشاعت: ۲۰۱۷ء ص: ۱۶۰
قیمت: ۱۶۰ روپے ناشر: عفان پبلی کیشنز، کولکاتا مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی-۲۵

سلطان شاہد کا افسانوی مجموعہ 'وہ ایک پل' ۲۱ ر افسانوں اور ۷ مضامین پر مشتمل ہے۔ اپنی افسانہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ صرف پندرہ سال کی عمر میں ان کا ایک افسانہ 'کافی ہاؤس میں' دسمبر ۱۹۵۷ء میں رسالہ 'بیسویں صدی' میں شائع ہوا تھا اور یہ بھی کہ انہوں نے دیہاتی زندگی کا تجربہ نہیں کیا ہے، پہاڑی علاقوں کی سیر نہیں کی ہے اس لئے ان کے افسانوں میں گاؤں کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو نہیں ملتی۔ جو کچھ کسی افسانے میں قدرتی مناظر اور آبشاروں کا ذکر ہے وہ تمام کے تمام تصوراتی اور تخیلاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کسی تخلیق کار کا اس طرح کا اقرار قطعی ضروری نہیں ہے کیونکہ شاعر ہو یا افسانہ نگار، اس کی قوت تخیل ہی کسی تخلیق کا باعث بنتی ہے۔ اس مجموعہ میں شامل تمام افسانے افسانہ نگار کی زندگی کے تجربات و مشاہدات کے بیانیہ ہیں، زیادہ تر افسانہ مختصر اور دلکشی سے عاری ہیں۔ زبان نہایت سادہ اور کہیں کہیں تو صحافتی نوٹ جیسے نظر آتے ہیں۔ چونکہ سلطان شاہد اردو صحافت سے بھی جڑے رہے ہیں اس لئے چند افسانے نیوز رپورٹنگ معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'شتر مرغ کا خواب' اور 'کاش ایسا ہوتا' خالصتاً صحافت کے رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ افسانے 'تیمم'، 'معصومیت' اور 'کال گرل' بہت مختصر افسانے ہیں۔ انہیں افسانہ کے زمرے میں نہیں رکھا جانا چاہئے۔

مجموعی طور پر تمام افسانے نہایت سادہ اور اوسط درجے کے ہیں۔ اس مجموعہ میں آخری افسانہ 'لوٹ آؤ شاہدہ' شامل ہے جو افسانہ نگار نے اپنی مرحومہ اہلیہ کو مخاطب کرتے ہوا لکھا ہے۔ یہ تحریر ایک جذباتی نوٹ ہے اسے افسانہ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح 'گلدستۂ مضامین' کے عنوان کے تحت سات مضامین بھی شامل ہیں۔ کسی افسانوی مجموعہ میں مضامین کی شمولیت میں نے پہلی دفعہ تجربہ کیا ہے جو میرے خیال سے ایک جدت ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس مجموعہ میں مضامین شامل نہ کئے جاتے اور افسانوں میں بھی سیاسی، سماجی اور علمی مسئلہ کو مرکزی خیال بنایا جاتا۔

....

● کتاب کا نام: مظہر امام (شخصیات سیریز) مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ص: 192 قیمت: 208 روپے
ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ مبصر: ایم نصر اللہ نصر، ہوڑہ (موبائل: 9339976034)

کتابوں کی ترتیب کو عام طور پر آسان کام سمجھا جاتا ہے اور لگتا بھی ہے۔ لوگوں سے کسی خاص موضوع یا شخصیت پر ان کے لکھے ہوئے مضامین کو حاصل کر کے یکجا کر لیجیے یا پھر لکھوا لیجیے اور ایک مقدمے کے ساتھ اسے کتابی شکل دے ڈالیے کتاب مکمل۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ کام اتنا آسان نہیں۔ پہلے تو موضوع کا انتخاب ہی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ بعد ازاں مضامین کا یکجا کرنا یا لکھوانا کسی پتھریلی رہ گزر کا سفر طے کرنے سے کم نہیں۔ ایک ایک مضمون کی بازیافت اور دستیابی میں پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ آج کل پاؤں میں چھالے تو نہیں پڑتے مگر وقت کی زیاں کاری اور ملتجیانہ عمل سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ وہ کام ڈاکٹر امام اعظم نے بڑی محنت اور مشقت سے کیا ہے اور مظہر امام کی شخصیت اور شاعری نیز مظہر شناسی کیلئے اچھے مواد کا انتظام واہتمام کردیا ہے۔ جس کے لئے وہ واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی شخصیت کئی جہتوں میں منقسم ہے۔ ہر چند کہ ان کا تعلق درس و تدریس تھا مگر جولائی ۲۰۰۵ء سے وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں اور ایک بہترین منتظم کار کا کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ شاعر' ادیب' ناقد' صحافی' محقق اور مرتب کے علاوہ ایک نہایت مخلص انسان ہیں۔ ان کی اب تک تقریباً دو درجن کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور کئی ابھی منتظر اشاعت ہیں۔ ادبی رسالہ 'تمثیل نو' ان کی ادارت میں ایک عرصے سے شائع ہو رہا ہے جس کی مقبولیت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔

کتاب ''مظہر امام'' مظہر امام پر ایک مونوگراف ہے جو اتر پردیش اردو اکادمی کی فرمائش اور گزارش پر ترتیب دی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں اکادمی کے سکریٹری جناب ایس۔ رضوان کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''زیر نظر کتاب 'مظہر امام' ڈاکٹر امام اعظم نے بڑے کم وقت میں اور بڑی محنت و جانفشانی سے ترتیب دی ہے۔ اس میں شامل وقیع مضامین میں مظہر امام کی شخصیت اور کارناموں کو وسیع تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو اکادمی ڈاکٹر امام اعظم کی شکر گزار ہے۔'' (حرفے چند ص:۴)

اس میں شک نہیں کہ اس میں شامل مشاہیر قلم کاروں کے مضامین' مرتب کا مقدمہ' مظہر امام کے نام موقر اہل ادب کے خطوط' انٹرویوز اور انتخاب کلام کسی گنج گرانمایہ سے کم نہیں۔ ان کے مطالعے سے مظہر امام کی ادبی شخصیت کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر امام اعظم کا مقدمہ ''مظہر امام شخصیت اور فن'' اس قدر وقیع اور معلوماتی ہے کہ پورا سوانحی خاکہ مجدد تا لحد قاری کے مطالعے میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ جس میں تاریخی پس منظر کے ساتھ خاندانی انتساب بھی شامل ہے۔ ان کے جدِ امجد شیخ المشائخ مولانا مدار بخش ساکن صوبہ پنجاب (غیر منقسم ہندوستان) سے لے کر مظہر امام تک کے سفر حیات اور حالات زندگی قلم بند ہیں۔ ایک خاندانی شجرہ ہے جو نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔ مقدمے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''مظہر امام ان تخلیق کاروں میں سے ایک ہیں جن کی شخصیت اور فن کاری دونوں متاثر کن ہے۔ ان کی شخصیت کے مختلف گوشے اردو شعر و ادب کی توانا روایت کی ترویج سے آراستہ ہیں۔ ان میں ایک طرح کی سنجیدگی' متانت اور زبان سے والہانہ عشق کی حد تک وارفتگی شامل ہے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے ذاتی کشف و وجدان کے علاوہ اپنے آبا و اجداد سے حاصل شدہ علمی و تربیتی جواہر شامل ہیں جو صوفیائے پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جدامجد شیخ المشائخ مولانا مدار بخش غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے شہر انبالہ (موجودہ ہریانہ) میں ایک جید عالم اور راہِ سلوک کے برگزیدہ بزرگ تھے۔ ان کے صاحبزادے پیر بخش فوج میں ڈاکٹر تھے جن کی شادی سیالکوٹ کے کشمیری خاندان میں ہوئی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد ان کا تبادلہ ضلع بکسر (بہار) میں ہوا تو ریٹائر ہونے کے بعد وہ وہیں بس گئے۔''

یہ سلسلہ دراز ہے اور سید امیر علی سے ہوتے ہوئے مظہر امام تک پہنچتا ہے۔ خاندان کے دیگر افراد کا بھی تذکرہ موجود ہے۔ مظہر امام اور متعلا کے ساتھ ان کی تعلیم اور تربیت کا بھی خوبصورت اور معلوماتی اشارے درج ہیں۔ گھرانے میں صوم و صلوٰۃ کی پابندی کا بھی انکشاف ہے۔ شاعری کے آغاز و ارتقا کا بھی خوبصورت اور دلچسپ ذکر

موجود ہے۔مظہر امام کی ملازمت اور صحافتی زندگی کا بھی تذکرہ درج ہے۔دراصل یہ مقدمہ ایک مختصر مگر جامع مظہر امام شناسی کا مرقع ہے۔یہ مقدمہ تقریباً ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے جس سے قاری کے علم میں خصوصی اضافہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مظہر امام پر آل احمد سرور، پروفیسر ظفر احمد نظامی، ابوالکلام قاسمی، مناظر عاشق ہرگانوی، مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر انتظار حسین اور ڈاکٹر امام اعظم کے پُر مغز اور معلومات سے بھرے مضامین بھی شامل ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے کافی اہم ہیں جن میں مظہر امام کی رمز شناسی، خاکہ نگاری، احتجاج پسندی، کج کلاہی، تنقیدی بصیرت اور دیگر صلاحیتوں کا خوبصورت احاطہ کیا گیا ہے۔دلیپ کمار سے انٹرویو اور آزاد غزل پر تنقیدی تبصرہ بھی ان کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔پروفیسر ظفر احمد نظامی نے مظہر امام کا قلمی خاکہ کچھ یوں پیش کیا ہے ملاحظہ کریں:

''کتابی چہرہ، بدن اکہرا، لمبی ناک، انداز پرتپاک۔ ہر دم نغمہ سنج، مرنجاں مرنج۔بڑے بڑے کان، خوش بختی کی پہچان۔وسیع پیشانی، ذہانت کی نشانی۔سر پر خفیف سے بال، ذہن غرقِ فکر و خیال، یہ ہیں شاعر باکمال، ادیب بے مثال، شریعت سخن کے مجتہد، آزاد غزل کے موجد، انفرادیت کے حامل، اپنے اصول پر عامل، مقبول خاص و عام یعنی جناب مظہر امام۔''

اس خاکہ نگاری سے ان کی شخصیت کھل کر اجاگر ہوتی ہے۔ان کی مکمل شبیہ قاری کے ذہن و دل پر عکس ریز ہو جاتی ہے۔جس نے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو دونوں کے سامنے مظہر امام کی تصویر جلوہ نما ہو جاتی ہے۔ان کی علمی و ادبی شخصیت کا خاکہ کچھ یوں پیش کیا ہے:

''مظہر امام ۵/مارچ ۱۹۳۰ء کو مونگیر میں پیدا ہوئے، بھاگ متی پر شیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، درخشندہ مستقبل کا مظہر ہوئی۔غالب و حافظ سے جام پیا، اردو و فارسی میں ایم۔اے کیا۔طلائی تمغوں کو سینے سے سجایا، کامیابی کا بگل بجایا۔ادبی دنیا سے یاری کی، برسوں افسانہ نگاری کی۔پھر لیلائے شاعری کے حسن میں کھو گئے، ہمیشہ کے لیے اسی کے ہو گئے۔بعد ازاں آوازوں کی دنیا سے دل لگایا آل انڈیا ریڈیو کو اپنایا۔سری نگر دوردرشن کے سربراہ ہوئے، اہل دل صاحب نگاہ ہوئے۔تین دہائیوں تک محکمہ کی شان رہے، دنیائے شعر و ادب کی جان رہے۔''

اس مختصر خاکہ نگاری نے مظہر امام کی پوری شخصیت اور ادبی زندگی کے علاوہ ملازمت اور پیشے سے بھی تعارف کرا دیا ہے۔مظہر امام ستمبر ۱۹۵۱ء تا دسمبر ۱۹۵۸ء کلکتہ میں درس و تدریس اور صحافت سے وابستہ رہے۔کتاب کے دیگر مضامین بھی کچھ کم معلوماتی نہیں۔پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے مضمون ''مظہر امام: الفاظ کے رمز شناس'' میں ان کی مرصع سازی، لفظی پیکر تراشی اور معنی آفرینی کی مدبرانہ جستجو کی ہے۔ان کے درد و داغ، سوز و ساز اور شاعری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔''آتی جاتی لہروں'' کے حوالے سے بھی بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔ان کے تنقیدی مضامین کو ایک رچا ہوا ذوق اور شگفتہ اسلوب کا حامل ٹھہرایا ہے۔کلاسیکی سرمائے اور فکر و فن کے نئے میلانات کو بھی تلاش کیا ہے۔ان کی شخصیت میں شائستگی، ذوق سلیم اور دردمندی کے اوصاف بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔ان کے شعری مجموعے

''زخم تمنا''، ''رشتہ گونگے سفر کا'' اور پچھلے موسم کا پھول'' میں غزل کی آبرو اور کشمیر کی فردوسی فضا کی رنگینی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ان غزلوں کا مقام اور مرتبہ بھی طے کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''مظہر امام کی غزلوں میں مجھے روایت کی پاسداری کے ساتھ نئے احساس اور عرفان کی جلوہ گری ملتی ہے۔ یہ نیا احساس حسن کے نت نئے کرشموں اور عشق کے نت نئے آداب کی عکاسی میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور زندگی اور اس کی فتح و شکست، امید و بیم، حوصلوں اور حسرتوں، زخموں اور الجھنوں کی آئینہ بندی میں بھی۔''

مختصر یہ کہ اس کتاب کی ترتیب و تشکیل میں ڈاکٹر امام اعظم نے واقعی کافی محنت کی ہے اور جس کے بھی مضمون کا انتخاب کیا ہے وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ اس سے ان کی دور اندیشی اور ادب شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ چاہتے تو اور بھی غیر معیاری مضامین سے کتاب کی ضخامت میں اضافہ کر سکتے تھے مگر انہوں نے خود کو سستی شہرت سے محفوظ رکھا ہے اور سہل پسند ہونے سے بچایا بھی ہے۔ اس کے لئے وہ قابلِ صد مبارکباد ہیں۔

....

- **کتاب کا نام: نیرنگ جنوں   افسانہ نگار: شہناز رحمٰن   صفحات: 224   قیمت: 250 روپے**
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶   مبصر: ایم نصر اللہ نصر (9339976034)

شہناز رحمٰن کا تعلق نئی نسل کی خواتین افسانہ نگاروں سے ہے جن میں وہ اپنا مقام مستحکم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ موصوف نے 2007ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور اردو زبان کو ترجیح دی۔ یہیں سے گریجویشن اور ماسٹر ڈگری کی تعلیم بھی حاصل کی اور اب اسی یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہی ہیں۔ ہر چند کہ وہ ہندی اور انگریزی سے اچھی طرح واقفیت رکھتی ہیں لیکن اردو ان کا پسندیدہ مضمون ہے۔ اردو میں افسانے اور مضامین لکھتی ہیں۔ ان کی اطلاع کے مطابق وہ دسویں جماعت سے ہی افسانہ نگاری کر رہی ہیں۔ ان کے افسانے اور مضامین ملک اور بیرون ملک کے بیشتر معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ حال ہی میں ان کو ساہتیہ اکادمی دہلی سے 'یوا لیکھک سمان' ملا ہے جو شال، میمنٹو کے علاوہ 50000 پچاس ہزار نقد انعام پر مشتمل ہے، جس کے لئے عالمی سطح پر ان کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہی ہو گیا تھا۔ پہلا افسانہ راشد الخیری نے 'نصیر اور خدیجہ' کے عنوان سے لکھا جو 'مخزن' میں 1903 میں شائع ہوا۔ (ایک تحقیق کے مطابق اردو کی پہلی کہانی ''نشہ کی پہلی ترنگ'' ہے جسے سجاد حیدر یلدرم نے لکھی تھی اور 1900 میں شائع ہوئی تھی) دوسرا افسانہ علی محمود نے 'چھاؤں' کے نام سے لکھا جو 1904 میں مخزن میں ہی شائع ہوا۔ تیسرا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' پریم چند نے رقم کیا۔ یہ افسانہ بھی 1907 میں 'مخزن' کی زینت بنا۔ مرزا حامد بیگ کی اس تحقیق میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہلے اردو کے دس افسانہ نگاروں میں 12 برسوں تک کوئی خاتون افسانہ نگار نظر نہیں آتیں لیکن 1915 میں ایک ساتھ چار نسائی آوازوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ جن میں عباسی بیگم، نذر سجاد حیدر، آصف جہاں اور انجمن آرا کے نام شامل ہیں۔ ان میں عباسی بیگم کو اولیت حاصل ہے۔ عشرت ناہید کی تحقیق کے مطابق عباسی بیگم کا پہلا افسانہ ''گرفتارِ قفس''، ''تہذیب نسواں''

میں شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار ہندستان کا پہلا ہفتہ واری زنانہ اخبار تھا جسے مشہور ڈراما نگار امتیاز علی تاج کی والدہ نے 1898 میں جاری کیا تھا۔ اولین خواتین افسانہ نگاروں میں مذکورہ چار ناموں کے علاوہ امت الوحی' مسز عبدالقادر' حجاب امتیاز علی' رشیدۃ النسا' صغریٰ ہمایوں مرزا' صالحہ عابد حسین' ذکیہ مشہدی' خاتون اکرم' زبیدہ زریں' آمنہ نازلی' سحاب قزلباس' زبیدہ سلطان' سعیدہ عبدل' ممتاز شیریں' قرۃ العین حیدر' جیلانی بانو' واجدہ تبسم' بانو قدسیہ' جمیلہ ہاشمی' مسرور جہاں' خالدہ حسین' عائشہ صدیقی' ترنم ریاض' نگار عظیم' ثروت جہاں' ڈاکٹر اشرف جہاں' پروفیسر قمر جہاں سے لے کر شہناز رحمٰن تک ایک طویل فہرست ہے جن کے افسانوں میں رومان کے علاوہ اصلاح نسواں و معاشرے کی اونچ نیچ' سماجی حقیقت نگاری' آزادی نسواں کی مانگ' عورتوں کے تعلیمی ونفسیاتی مسائل' عصمت کے لٹیروں سے نجات' تقسیم ہند کے برے اثرات' ہجرت اور غریب الوطنی کے مسائل اور وہ سب کچھ ان کے افسانوں کا مرکزی خیال و پلاٹ بنا جو ان سے پہلے مرد افسانہ نگاروں کی تحویل میں تھا۔ نسائی افسانہ نگاری کے تعلق سے شاذیہ کمال لکھتی ہیں:

> ''گرچہ اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں خواتین افسانہ نگاروں نے کوئی بہت قابل ذکر افسانے نہیں دیے مگر یہ (ان کے افسانے) اردو افسانہ نگاری کے لئے دستک کی حیثیت (ضرور) رکھتے ہیں جنھوں نے اردو ادب میں (خواتین کے لئے) افسانہ نگاری کی راہیں ہموار کردیں اور آنے والا دور اس کی تاریخ کا روشن دور بن کر ابھرا۔'' (شاعر مارچ 2018 ص 46)

شہناز رحمٰن بھی خواتین افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑی ہیں اور اپنا مقام و مرتبہ مستحکم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ ان کا اول افسانوی مجموعہ ''نیرنگ جنوں'' 2016 میں منظرِ عام پر آیا تھا جس میں ان کے ۲۳ منتخب افسانے شامل ہیں جن کے نام کچھ یوں ہیں۔ ستیہ وان' خونچکاں' طائر بے نوا' باگ ڈور' انجانی تشنگی' نیرنگ جنوں' شگافوں کے پیچھے' نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' مکمل نامکمل' اندھیروں کا علاج' افسانہ' بے خوابیاں جوان ہیں جس سمت دیکھئے راج محل' ساغر ہو صراحی ہو' وہ ایک لمحہ' غرور شب' عجیب سکھ' ذکیہ تاب زریں' کاتب تقدیر' انمول' کپوت' اپنا کہیں جسے اور اداسی کا سبب۔ ان افسانوں میں سماج اور معاشرے کی ایسی ایسی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جن پر سے بہت کم پردے اٹھائے گئے ہیں۔ چونکہ وہ ابھی ریسرچ اسکالر ہیں اس لئے ان کے بیشتر افسانوں میں اسکول' کالج اور یونیورسیٹیوں کا ماحول اور وہاں کے مسائل عکس ریز ہیں۔ کالج اور یونیورسیٹیوں میں جو عام طور پر کھیل کھیلے جاتے ہیں عشق و محبت کے حسین سپنے سجائے جاتے ہیں' آبرو اور عصمتیں جس طرح سے تار تار ہوتی ہیں' ناکام محبت جس طرح رسوا سر بازار ہوتی ہے اور خواب ادھورے رہ جاتے ہیں' عشق کا جنون ذہانت و آگہی کو جس طرح شرمسار کرتا ہے ان کی احاطہ بندی موصوفہ نے خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں ایسے بھی افسانے ہیں جو بالغ ذہنوں کی تخلیق کہلا سکتے ہیں۔ ملکی اور سیاسی مسائل کا بھی محاسبہ اچھا ہے۔ ان کے افسانوں میں طوالت اور اختصار دونوں ہیں لیکن قاری جب افسانہ شروع کرتا ہے تو ختم کیے بغیر کتاب کو نہیں رکھتا۔ قاری کو گرفت میں رکھنے کی صلاحیت ان میں خوب ہے۔ کہیں کہیں پیچیدگیاں بھی ہیں لیکن شاید یہ افسانہ نگاری کی کوئی نئی تکنیک ہو جس سے قاری ناواقف ہے۔ ان کے افسانوں میں فلش بیک کا بھی اہتمام ہے۔ موضوعات کا انتخاب نیا نہیں لیکن عمدہ ضرور ہے۔ پیشکش

اچھی ہے۔منظر نگاری بھی خوب ہے۔انداز بیانیہ ہے۔پلاٹ اور کردار نگاری کی بھی تعریف کی جاسکتی ہے لیکن قاری کی مانگ کچھ اس سے زیادہ ہے۔وہ چونکنا چاہتا ہے۔وہ تجسس کا ماحول زیادہ پسند کرتا ہے۔وہ شب تاب میں بجلی کی تڑپ اور چمک دیکھنا چاہتا ہے۔یہ کمی کھلتی ہے۔ویسے اکابرین ادب نے ان کے افسانوں کو پڑھا اور پرکھا ہے نیز اچھی رائے بھی دی ہے۔چند کی آرا ملاحظہ فرمائیں:

- ''آپ (شہناز رحمٰن) کے اندر ٹیلنٹ ہے۔کہانیوں کی پیشکش کا انداز انتہائی تخلیقی ہے۔کوئی جملہ غیر ضروری نہیں بلکہ زبان کے مناسب استعمال سے افسانوں میں مزید تہہ داری اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ (پیغام آفاقی)
- ''شہناز رحمٰن اس ستارے کا نام ہے جو اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ادب کے افق پر طلوع ہوا اور آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔شہناز کے یہاں موضوع کا تنوع ہے۔ان کے افسانے روح کی تشنگی کے افسانے ہیں جو دلچسپ ہیں اور فکر انگیز بھی۔'' (شموئل احمد)
- ''شہناز رحمٰن نے بہت خوبصورت اور انمول افسانے لکھے ہیں۔بعض افسانوں کو پڑھ کر بار بار ذہن سوال کرتا ہے کہ اتنی کم عمری میں کیسے کیسے پیچیدہ مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت اس کے اندر موجود ہے۔'' (پروفیسر تمکین خان)

مذکورہ دلائل کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شہناز رحمٰن افسانہ نگاری کی وادیِ پر خار میں نو وارد ضرور ہیں مگر خاروں سے کترا کر اور کہیں کہیں الجھ کر چلنے کا مجاز رکھتی ہیں۔وہ اس وادی میں اپنا ایک چھوٹا مگر قابلِ رشک آشیانہ تعمیر کرنا چاہتی ہیں جس کی مستحکم بنیاد انھوں نے رکھ دی ہے۔وہ اپنے آشیانے کے آس پاس گل بوٹے بھی کھلانا چاہتی ہیں۔چنار کے سائے کا بھی خواب دیکھا ہے۔آبشار کی گزرگاہ کا تصور بھی ذہن میں بسا رکھا ہے۔وہ پرندوں کی چہچہاہٹ بھی سننا پسند کرتی ہیں مگر درد و کرب کے نغموں سے انھیں بیر نہیں۔ان کی افسانہ نگاری میں امراؤ جان کی سسکتی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں، عصمت دری کے واقعات و حادثات بھی عکس ریز ہیں۔خاموش محبت کے قصے بھی ہیں اور سیاست کی بازی گری کی کہانیاں بھی دل کو لہولہان کرتی ہیں۔ان کے افسانے نئی نسل کی بے راہ روی اور فریب خوردگی نیز جوانی کی بھول کے بھیانک نتائج کا اظہار یہ بھی ہے۔

ٹائٹل کہانی ''نیرنگِ جنوں'' کا پلاٹ کوئی نیا نہیں ہے مگر اس کی بنت کاری پر شہناز نے کافی توجہ دی ہے۔ امیروں کی رکھیل اور ناجائز اولاد کے قصے کوئی نئے نہیں لیکن جس خوش اسلوبی سے ان رشتوں کی کڑیوں کو محفوظ رکھا گیا ہے اس کی داد دینی پڑے گی۔اس افسانے سے متعلق شموئل صاحب فرماتے ہیں:

> ''افسانہ نیرنگ جنوں پڑھ کر لطف آیا بہت نازک نکتہ ہے جسے آپ نے انتہائی چابک دستی سے پیش کیا اور نبھایا ہے۔عنوان بھی معنی خیز ہے۔مجھے کہیں بھی کوئی کمی نظر نہیں آئی۔''

شہناز رحمٰن کا اسلوب اور انداز بیان بہت خوب ہے۔وہ خوبصورت جملے گڑھنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ لفظوں کی مرصع سازی بھی انھیں خوب آتی ہے،مثال دیکھیں:

''خواب جل کر راکھ ہو گئے' چشم تمنا بجھ گئی' سرخ حنا پیلا پڑ گیا' بارش کی بوندیں ذروں سے ٹکرا کر شور مچاتی رہیں' شہر دل ویران ہو گیا۔'' (افسانہ خونچکاں ص:۳۱)

''ارے نہ پوچھو بابو ڑھیا والے مرجا صاحب آئے کے بتائے دہن کہ اریطہ مالکن ناٹک میں ناچنے والی لڑکی ہوئیں پھر ہم سے پوچھن۔ ہم مجبور ہو کے کل سبی بتائے دہن۔'' (ستیہ وان ص:۳۰)

''اسے چوڑیوں کی کھنک سے چڑ ہے۔ پازیب کی جھنکار سن کر وہ دور بھاگ جاتا ہے' گھنیری زلفوں کی لمس سے اسے نفرت ہے' نازک لبوں کے بوسے اور مخروطی انگلیوں کی گدگداہٹ سے اس کی تشنگی پوری نہیں ہوتی۔ گداز جسموں کا آغوش اسے پسند نہیں۔ ساون کی چنچل ہوا میں نسوانی آوازوں کی مدھر گیت سے اس کے کان کے پردے پھٹنے لگتے ہیں، وہ کانوں کو بند کر لیتا ہے۔'' (خونچکاں ص:۳۳)

''چمن کے دل کے علاقے میں صرف اس کی محبت آباد تھی۔ وہ بھی حسن کا پارکھ تھا۔ عشق اس کے روم روم میں بسا تھا جس میں تقدس تھا' یکسوئی تھی' ایثار کا جذبہ تھا' بوالہوسی اور جسم پرستی کی دور دور تک آہٹ بھی نہ تھی۔'' (طائر بے نوا ص:۴۲)

ان جملوں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شہناز کے اندر مشاقیت اور مشاہدات کی کمی نہیں۔ وہ کافی تجربہ کار ہیں۔ ان کا مطالعہ گہرا اور بسیط ہے۔ زبان پر دسترس بھی ہے۔ الفاظ کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت ان میں موجود ہے۔ خیالستان کی وادیوں سے خوبصورت شگوفے توڑ کے لانے میں وہ مہارت رکھتی ہیں۔ وہ ذائقے دار کھانے پروسنے کے ہنر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے خامہ تفکر میں استقلال اور انضباط دونوں موجود ہیں۔ اس کم عمری میں اتنی پختگی قابلِ تحسین اور قابلِ رشک بھی ہے۔ خدا کرے انھیں کسی کی نظر نہ لگے۔ لیکن یہ سفر ابھی نامکمل ہے۔ آگے احتیاط لازمی ہے۔

شہناز رحمٰن کے افسانوں میں پلاٹ' کردار نگاری' منظر نگاری' بنت کاری اور خیالات کی پاسداری معمول کے مطابق ہیں جو افسانہ نگاری کے تقاضے کو پورے کرتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شہناز رحمٰن کچھ کر دکھانے کے لئے کوشاں ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار اور موضوعات میں تنوع کا رنگ جھلکتا ہے۔ دلت اور پست طبقے کو بھی انھوں نے موضوع بحث بنایا ہے۔ متوسط کلاس کے مسائل سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن' کچھ اور چاہئے مرے بیان کے لئے' والی بات ابھی باقی ہے۔ اگر رفتار جنوں یہی رہی تو بہت جلد وہ مقام اور مرتبہ بھی حاصل ہو جائے گا جس کی وہ متمنی ہیں۔

....

- **کتاب کا نام: تجزیے (ناول' ناولٹ اور افسانوں کے تجزیے) تجزیہ نگار: ڈاکٹر اسلم جمشید پوری ص:328**
  قیمت:350 روپے ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز' نئی دہلی مبصر: ایم نصر اللہ نصر (9339976034)

تجزیہ یا تبصرہ نگاری ایک اہم کام ہے۔ اس کے لئے عرق ریزی' دیدہ ریزی اور وقت کی زیاں کاری کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نیز عمیق اور بسیط مطالعے کی بھی طلب ہوتی ہے۔ اصناف ادب سے خاصی واقفیت بھی لازمی

ہے۔شعور کی پختگی کا بھی مطالبہ ہوتا ہے۔تحریری صلاحیت بھی ضروری ہے۔منصفانہ رویہ کا بھی تقاضا ہوتا ہے۔ان سبھوں کی پاسداری کے بعد ہی کوئی اچھا اور انصاف پسند تجزیہ صفحۂ قرطاس پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔اس میں جانب داری یا احباب پرستی کی گنجائش نہیں۔رقابت اور مخاصمت سے بھی گریز لازمی ہے۔

اسلم جمشید پوری ٹاٹا نگر جمشید پور کے باشی ہیں۔یونیورسٹی میں اردو کے استاد بھی ہیں۔بڑے قلم کار ہیں۔ سمیناروں میں اکثر نظر آتے ہیں۔ان کی اب تک درجنوں کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔جن کے نام کچھ اس طرح ہیں: فکشن کے پانچ رنگ' لینڈرا' افق کی مسکراہٹ' اردو فکشن تنقید و تجزیہ' اردو افسانہ' چند اہم افسانہ نگار' جدید اردو افسانہ بولتی قدریں (ترتیب)' کولاژ' عیدگاہ سے واپسی' تحریک آزادی' احمد ندیم قاسمی کے نمائندہ افسانے' آدھا گاؤں اور تجزیے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قلیل مدت میں موصوف نے اتنی ساری کتابیں لکھ کر اپنی زود گوئی اور تیز گامی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔تجزیہ نگاری کے تعلق سے موصوف فرماتے ہیں:

"تجزیہ مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے۔بعض تجزیہ نگار افسانے کی تلخیص ضرور بیان کرتے ہیں اس کے بعد افسانے کے مختلف حصوں' مکالموں' کرداروں اور اسلوب کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ قاری کو پہلے کہانی کا اختصار سے علم ہونا ضروری ہے۔ورنہ تجزیہ نگار جن اہم نکات کی طرف اشارے کرے گا قاری ان تک پہنچ نہیں پائے گا۔بعض تجزیہ نگار کہانی کی تلخیص تو بیان کرتے ہیں وہ کہانی کی ابتدا سے اقتباس در اقتباس اس کی وضاحت کرتے چلے جاتے ہیں یعنی جیسے جیسے افسانہ آگے بڑھتا ہے تجزیہ نگار اپنی آرا بھی پیش کرتا رہتا ہے اس طرح کہانی کا اختصار بھی شامل ہو جاتا ہے اور قاری ساتھ ساتھ سمجھتا جاتا ہے۔کچھ دوسرے تجزیہ نگار ایسے بھی ہیں جو تلخیص کے بغیر افسانے کے بعض حصوں سے اپنی بات شروع کرتے ہیں اور افسانے کے مرکزی خیال سے دیگر خیال اور کرداروں کا انسلاک یا بے تعلقی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔کچھ تو تقابلی طریقہ کار بھی اپناتے ہیں اور تجزیہ کرتے وقت اس عہد' اس موضوع اور اس سے ملتے جلتے قصہ پن والے افسانوں' ناولوں کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔" (تجزیے: ص ۱۲)

تجزیہ نگاری کے لئے مذکورہ تمام فارمولے کارآمد ہیں۔کہیں کہیں تو تجزیہ نگار سبھی فارمولوں کے امتزاج و اختلاط سے بھی کام لیتا ہے۔جیسا کہ اسلم جمشید پوری نے اپنی تجزیہ نگاری کے بارے میں اشارہ کیا ہے کہ ان کا اصول کوئی بندھا ٹکا نہیں ہے۔بلکہ کچھ روایتی اور کچھ انحرافی بھی ہوتا ہے۔لیکن تجزیہ پر تجزیہ یا تبصرہ کیسے کیا جائے اس کا اصول کیا ہونا چاہئے اس نکتے پر کسی نے اپنا اظہار خیال نہیں کیا ہے۔یہی معاملہ اور مرحلہ میرے سامنے بھی درپیش ہیں۔"تجزیے" چونکہ تبصرہ اور تنقید کا مجموعہ ہے اس میں ناول اور افسانوں کا تاثراتی اور تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے اس پر مزید تبصرہ کرنا کافی مشکل کام لگتا ہے۔اس لئے کہ میرے سامنے نہ وہ ناول کے متن ہیں اور نہ افسانے۔ایسے جو تھوڑا بہت پڑھا ہے اور جس طرح تجزیہ نگار نے پڑھوایا ہے اسی کی روشنی میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

اس کتاب میں آٹھ ناول' امراؤ جان ادا' ساتواں آنگن' بہت دیر کر دی' چاند گہن' چاندنی بیگم' عزازیل' آخری

سواریاں‘ لیمی نیٹیڈ گرل اور تین ناولٹ ’لندن کی ایک رات‘ بیانات اور اوڑھنی کے علاوہ 29 افسانوں کا محاسبہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ بیشک یہ ایک بڑا اور اہم کام ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب ادب کا اچھا خاصا مطالعہ رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں علمی اور تنقیدی شعور کی فراوانی بھی ہے۔ لکھنے کا انداز اور اسلوب بھی عمدہ ہے۔ محاسبہ کرنے کا سلیقہ بھی خوب ہے۔ ایسا کرنے میں وہ اپنی رائے قاری پر تھوپنے کے عادی نہیں بلکہ دلیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ دوسروں کی آرا سے اتفاق بھی کرتے ہیں اور کہیں کہیں اعتراض بھی کرتے ہیں لیکن اس کا جواز بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ ہوا میں بات کرنے کے عادی نہیں۔ ان کی باتوں میں دم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہے۔ وہ تجربے کی روشنی میں ہی بات کرتے ہیں۔

زیرِ مطالعہ کتاب میں بھی انھوں نے اپنے علم و دانش کا خوب خوب مظاہرہ کیا ہے۔ امراؤ جان ادا سے متعلق ان کا خیال ہے کہ:

> ”امراؤ جان ادا کا کردار ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے لیکن ناول کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنوی تہذیب ناول میں ایک کردار کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی تہذیب ہے جو وقت کے دھارے کے ساتھ مل کر ناول کو بہالے جاتی ہے۔ اس تہذیب کا حال یہ تھا کہ طوائف کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا کام جنسی تسکین کی فراہمی نہیں تھا بلکہ وہ ادب و تہذیب کی دلدادہ‘ فنونِ لطیفہ کی ماہر‘ سلیقہ و طریقہ کا نمونہ اور رکھ رکھاؤ کی مثال ہوا کرتی تھی۔ سماج میں اس کی موجودگی باعث افتخار تھا۔“ (ص: ۲۰)

یہ خیال درست ہے کہ اس ناول میں صرف ایک طوائف کا کردار اور اس کی دکھ بھری کہانی ہی دکھائی نہیں پڑتی بلکہ اس ناول میں لکھنؤ کی پوری تہذیب اور سماجی و معاشرتی حالات کی عکس ریزی بھی نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی مرزا ہادی حسن رسوا کا اسلوب اور ناول نگاری کے فن سے واقفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ساتواں آنگن (صالحہ عابد حسین) کی خوبصورت معاشرتی ناول ہے جس کے بارے میں اسلم صاحب کی رائے ہے کہ اس ناول میں صالحہ نے اس حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے کہ عورت بچپن‘ لڑکپن‘ اسکول اور کالج کا کیمپس والا آنگن‘ باپ کا آنگن‘ پیا کا آنگن‘ بیٹے آنگن اور بہو کا آنگن سے ہوتے ہوئے اپنی زندگی کے آخری آنگن تک آتے آتے اسے کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ انبساط و نشاط‘ درد و کرب اور مسائل در مسائل کی پرخار راہوں کا سفر بڑا کرب انگیز ہوتا ہے۔ بیشک یہ ناول جزئیات‘ واقعات‘ حادثات‘ تصادمات‘ نوک جھونک‘ غم و خوشی‘ آنسو و ہنسی کا ایک مرقع ہے جس کا خوبصورت محاسبہ اس کتاب میں موجود ہے۔

دیگر ناولوں پر بھی موصوف نے اچھا تنقیدی تبصرہ کیا ہے جو قارئین کو نئے مفاہیم سے آگاہ کرتا ہے۔ افسانوں کا بھی محاسبہ کافی عرق ریزی اور گہرے مطالعے کے بعد کیا گیا ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ افسانہ نگاری کے ہنر سے بھی وہ اچھی واقفیت رکھتے ہیں اور کیوں نہ رکھیں وہ خود بھی ایک اچھے اور منجھے ہوئے فکشن نگار جو ہیں۔ ان کے یہاں تنقیدی صلاحیت بھی ہے اور تبصرہ کرنے کا ہنر بھی انھیں خوب آتا ہے۔ منٹو کی کہانی ”کھول دو“ پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''کھول دو' ایک مختصر کہانی ہے لیکن اپنی اثر آفرینی میں یہ کہانی اس قدر وسعت اختیار کر جاتی ہے کہ یہ ایک سچا اور دلدوز واقعہ لگتا ہے۔ منٹو کی یہ کہانی صرف دو لفظوں 'کھول' اور 'دو' پر ٹکی ہوئی ہے۔ پوری کہانی سے صرف ان دو لفظوں کو نکال دیا جائے تو کہانی خود بخود مر جائے گی۔''

پشاور ایکسپریس (کرشن چندر) کا محاسبہ بھی خوب ہے۔ ہندو مسلم کے منفی نظریات و منافرت کی بھرپور عکاسی اس افسانے میں کی گئی ہے۔ جس کا تجزیہ بھی سلیقے سے کیا گیا ہے۔

موصوف کا یہ مختصر انکشاف ان کی دور اندیشی' کہانی کے فن سے شناسائی اور علمی لیاقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ چونکہ تبصرہ پر زیادہ تبصرے کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے تضیع اوقات سے گریز اور لفاظی سے پرہیز کے ساتھ انھیں بہت بہت مبارکباد۔

....

- **کتاب کا نام: مہکی مہکی رات (شعری مجموعہ) شاعرہ: سیدہ نفیس بانو شمع ص: 240 قیمت: 200 روپے زیر اہتمام: آبشار پبلی کیشنز، دہلی (9213737821) مبصر: ایم نصر اللہ نصر (9339976034)**

سیدہ نفیس بانو شمع سے متعلق حقانی القاسمی رقم طراز ہیں:

''نفیس بانو شمع کی گلاب احساس شاعری کی پتیوں میں وہ خوشبوئیں بسی ہوئی ہیں جو انسان کے ذہنی خلاؤں کو آکسیجن عطا کر سکتی ہیں۔ ملال و ہجر و وصال کے رنگوں سے انہوں نے اپنے تخلیقی در و دیوار کو سجایا ہے۔ اس میں وہی کومل نازک نسائی جذبات ہیں جو گداختگی دل سے جنم لیتے ہیں۔'' (تقریظ)

اس مختصر مگر جامع تخصیص میں وہ ساری باتیں پنہاں ہیں جن سے متعلق آگے گفتگو کی جائے گی۔ عام طور پر نسائی شاعری کو اردو ادب میں وہ مقام نہیں دیا گیا ہے جس کی وہ حقدار ہے۔ انہیں کئی لحاظ سے مردوں سے کمتر گردانا گیا ہے۔ کچھ حد تک تو یہ باتیں درست لگتی ہیں کہ ان کی شاعری میں وہ پختگی اور مشاقیت نہیں جن کی بنیاد پر انہیں اردو کی معیاری شاعری میں جگہ مل سکے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ نسائی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسے کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیشتر شاعرات نے اپنی غزلیہ اور نظمیہ شاعری سے اہل ادب کو نہ صرف چونکایا ہے بلکہ شعرائے عظام کی صفوں میں اپنی مستحکم جگہ بھی بنالی ہیں۔ نام گنوانے کی ضرورت نہیں کہ یہ مسئلہ یہیں الجھ کر رہ جائے گا کہ فلاں کا نام کیوں نہیں لیا۔ قارئین اس معاملے کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

نفیس بانو شمع ایک کہنہ مشق شاعرہ ہیں جن کے چار شعری مجموعے 'کائنات بھر سناٹا' جان کونین' 'کچھ درد کے صحراسے' اور مہکی مہکی رات منظر عام پر آکر داد و تحسین و پذیرائی کی اسناد حاصل کر چکے ہیں۔ ۱۹۸۵ میں شاعری کا آغاز کرنے والی شاعرہ کے محض ۳۳ برسوں میں چار شعری مجموعوں کا منظر عام پر آنا ان کی زود گوئی کو درشاتا ہے۔ انہوں نے اس کے بارے میں کہا ہے ''یہ کتابیں نہیں میرے زخموں کا تعارف ہیں' میری ذات کا اظہار ہیں' میرے اندر بوند بوند اترتی آگ کی شعاعیں ہیں اور میرے لہولہان وجود کا آئینہ ہیں۔'' جس کا اظہار ایک شعر میں موصوفہ نے کچھ اس طرح کیا ہے:

تو نے دیکھے تو بہت ہوں گے اُمڈتے ساگر
میری آنکھوں سے کبھی پوچھ کہ دریا کیا ہے

مذکورہ شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمع نے بے شک شمع کی طرح زندگی جل جل اور پگھل پگھل کر گزاری ہے۔ کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ان کی شاعری میں کتنا کرب اور درد پنہاں ہے جو بیشک حقیقت کا اظہار بھی ہے۔ دل میں ہنسنے کی آرزو ہے مگر لب اس کی اجازت نہیں دیتے۔ آنکھوں میں نمی ہے مگر اس پر پلکوں کے پہرے لگے ہوئے ہیں۔ صدائے غم کے اظہار پر حالات کی پابندی لگی ہوئی ہے۔ محراب دل غموں کے چراغوں سے سجے ہوئے ہیں۔ رہ گزار حیات میں کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ زندگی کا چمن اداس ہے مگر جینے کی تمنا اب بھی باقی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ظاہر میں تو ہر لفظ گلِ تر کی طرح ہے ــــ تاثیر میں چبھتے ہوئے پتھر کی طرح ہے
آرائشیں میری ہیں فقط تیری بدولت ــــ ہر زخم میرے جسم پہ زیور کی طرح ہے
تمہارا داد ملا ہے تو اب کمی کیا ہے ــــ سمجھ میں آگیا میری کہ زندگی کیا ہے
جسے وہ دیکھ لے پل میں حسین ہو جائے ــــ نگاہِ یار سے پوچھو کہ دلکشی کیا ہے
غریب خانے میں آیا کوئی تو یہ جانا ــــ اندھرا چیز ہے کیا اور روشنی کیا ہے

سیدہ نفیس بانو شمع کو ذہین، فطین اور زیرک تخلیق کار کہا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی شاعری میں توارد یا نقالی نہیں ہے بلکہ تخلیقیت اور تشکیلیت کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔ وہ حمدیہ، نعتیہ اور غزلیہ اشعار کہنے کا مجاز رکھتی ہیں۔ ان کے فکری و فنی کمال کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ قدرت نے انہیں شاعرانہ اوصاف سے متصف کیا ہے جس کی بنیاد پر وہ اچھے اچھے اشعار اپنے ذہن و فکر کے ٹکسال سے نکال لیتی ہیں۔ لہجہ اور اسلوب بھی قابل تحسین ہے۔ ان کے اشعار میں شعریت اور تغزل کا بھر پور اہتمام ہوتا ہے۔ گوشہ نشیں شاعرہ ہونے کے باوجود ان کی شہرت و مقبولیت میں کوئی کمی نہیں۔ منفرد و ممتاز ہیں کہ نہیں لیکن پسندیدہ شاعرہ ضرور ہیں۔ بقول پیغام آفاقی:

''آپ کا بیشتر کلام معیاری ہوتا ہے۔ ان میں چند اس طرح غیر معمولی ہوتے ہیں جیسے کسی بھی اچھے شاعر کے یہاں ہوتے ہیں۔''

کہا گیا ہے کہ شاعر یا فنکار کی تخلیقات میں اس کی زندگی کے تجربات اور حالات ہی عکس ریز ہوتے ہیں۔ عصری حالات بھی زیر بحث آتے ہیں مگر دلی کیفیات کا ردعمل زیادہ ہوتا ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ کریں:

ہم باندھ کر پاؤں میں جنوں محو سفر تھے ــــ یہ آبلے جانیں کہ چبھن کیسی لگی ہے
ان کا تو فقط کام ہے یہ شمع جلانا ــــ پروانہ ہی جانے کہ جلن کیسی لگی ہے
ریل کی سیٹی میں کیسی ہجر کی تمہید تھی ــــ اس کو رخصت کر کے گھر لوٹی تو اندازہ ہوا
شب فراق کبھی مختصر نہیں ہوتی ــــ اجالا ہوتا ہے لیکن سحر نہیں ہوتی

شاعری دراصل روحانی کیفیت کا اظہار ہے۔ اس کا رشتہ روح سے بڑا گہرا ہوتا ہے اور جب یہ روح کی پرخار وادیوں سے ٹہل کر خوشہ گل لے کر آتی ہے تو ایک سکون بخش اور روح افزا احساس جنم لیتا ہے۔ موصوفہ کی بات پر خاتمہ کہ:

''وہ شاعری جوایک ایسی خوشبو کی طرح محترم لمحہ میں میرے اندر منتقل ہوگئی تھی ہر لمحے مجھے معطر رکھتی ہے۔نظر نہیں آتی مگر ہر پل میرے ہمراہ رہتی ہے۔''

یہ اور بات ہے کہ اس خوشبو کو ابھی اور معطر ہونا ہے اور معظم اور منفرد ہونا ہے، جس کے لئے محترمہ بھی کوشاں ہیں:

ترا دیدار کرنا چاہتی ہوں — سمندر پار کرنا چاہتی ہوں
جو نفرت سے مجھے اے شمع دیکھے — اسی سے پیار کرنا چاہتی ہوں

....

● **کتاب کا نام: رعنا (کوثر صدیقی کی اختراعی صنف) مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ص: 70**
قیمت: 100 روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ایم نصر اللہ نصر (9339976034)

اردو شاعری میں تجربے ہوتے آئے ہیں۔ پہلے غزل، پھر آزاد غزل، غزل نما، پابند نظم، نظم معریٰ، آزاد نظم اور نثری نظم۔اس کے بعد اک سطری، دوسطری اور سہ سطری شعری و نثری تخلیقات معرض وجود میں آتی رہی ہیں۔ چونکہ ان کا تذکرہ طویل ہے اس لئے اس کی بحث طاق پر رکھتا ہوں۔ یہاں ایک نئی صنف سخن کے تعلق سے گفتگو مقصود ہے۔اردو شاعری کی بہت مشہور و مقبول صنف رباعی رہی ہے جو چوبیس اوزان و بحر میں لکھی جاتی رہی۔ بعد ازاں اس کی اتنے اوزان تشکیل پائے کہ ان کے تعداد کا شمار مشکل ہے۔ پھر آزاد رباعی اور رباعی نما تخلیقات بھی منظر عام پر آئیں۔اب ایک نئی صنف رباعی پر طبع آزمائی کا سلسلہ جاری ہے۔وہ سہ مصرعی رباعی ہے۔کوثر صدیقی صاحب اس کے موجد ہیں۔انہوں نے پہلے طبع آزمائی کی اور پھر متعدد شعرا سے فرمائش کر کے سہ مصرعی رباعیات لکھوائیں۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اس پر خصوصی توجہ فرمائی اور اسے سنوار سجا کر پیش کیا اور دوسروں کو بھی اس کی جانب توجہ فرمانے کی گزارش کی جس کا بیشتر شعرا نے خیر مقدم کیا جس کے نتیجے میں یہ کتاب تشکیل پائی۔ سہ مصرعی رباعی کے تعلق سے کوثر صدیقی رقم طراز ہیں:

''جس طرح حضرت امیر خسرو نے مردنگ کو بیچ سے کاٹ کر طبلہ ایجاد کیا کچھ ایسی طرز پر راقم الحروف نے رباعی کے مطلع میں سے ایک مصرعہ خارج کر کے تین مصرعی رباعیاں کہنے کا تجربہ کیا جو کامیاب رہا۔ ایک مصرعہ خارج کر دینے کے بعد سہ مصرعی رباعی کی ہیئت ایسی بنی کہ پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ و ہم ردیف رہا اور دوسرا مصرعہ آزاد۔اوزان و بحور منجملہ رباعی کی ہی رہے۔اگر اوزان و بحور رباعی کے استعمال نہ کئے جائیں تو پھر وہ سہ مصرعی رباعی نہیں رہے گی بلکہ ثلاثی میں تبدیل ہو جائے گی۔اس لئے سہ مصرعی رباعی کے لئے رباعی کی تمام پابندیاں لازم ہیں۔''

مذکورہ بیان سے یہ انکشاف ہوا کہ تین سطری رباعی دراصل ثلاثی کی ایک دوسری شکل ہے جس میں رباعی کے بحر و وزن کی پابندی لازمی ہے لیکن اس میں مطلع کے دوسرے مصرعے کو ہی حذف کرنا ہے۔ پہلا اور تیسرا مصرعہ میں قافیہ و ردیف کی پابندی کی جائے گی اور دوسرا اس سے آزاد ہوگا مگر رباعی کی تمام شرطوں کا لحاظ رکھنا لازمی ہوگا۔

مناظر عاشق ہرگانوی نے اس کے نام ''رعنا'' کی تائید و تصدیق کر دی ہے اور ۲۵ رشعرائے عظام سے سہ

مصرعی رباعی لکھوا کر کتابی شکل میں جمع کر دی ہے۔ بیشک اسے ایک بڑا کام کہا جا سکتا ہے۔ علیم صبا نویدی بھی اسی طرح کے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ مقبولیت عام کا سوال اپنی جگہ ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت رہی ہے کہ نئی اصناف کو فوری طور پر قبول عام کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ اگر موجد اس پر قائم رہا اور دوسروں کو اس کے ذوق شوق سے نیز اہمیت و افادیت آشنا کرتا رہا تو بہت جلد اس کو شہرت مل جاتی ہے جیسا کہ نثری نظم کا معاملہ درپیش رہا ہے۔ اگر یہ صرف تجربہ ہو کر رہ گیا تو پھر یہ صنف بہت جلد قصۂ پارینہ کی مثال بن جائے گی۔ سہ مصری رباعی کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

جو ایک ہی رستے پہ چلا کرتے ہیں پہچانے لگتی ہے روش ان کے پیر پتھر انہیں آگاہ کیا کرتے ہیں
(کوثر صدیقی)

تقدیر کی بلچل نے تماشا ڈھایا بے بس ہوا تدبیر کا ہر دروازہ دیوار نے خود اپنا سراپا ڈھایا
(مامون ایمن)

ارماں نہیں غیروں کی شناسائی کا رہتے ہیں مرے ساتھ جو قرطاس و قلم احساس بھی ہوتا نہیں تنہائی کا
(اصغر ویلوری)

انسان کے ادراک سے بالا ہے وہ ہر جا ہے مگر پھر بھی نظر سے اوجھل سچ پوچھئے ہر دل کا اجالا ہے وہ
(علقمہ شبلی)

محبوب خدا تم پہ درود اور سلام تم رحمت عالم ہو سراپا نور اللہ نے بنایا تمہیں نبیوں کا امام
(علیم صابر)

اس زیست سے بیزار نہ ہو جاؤں میں ڈالوں نہ کبھی خود پہ کرم کی نظریں اتنا بھی خود دار نہ ہو جاؤں میں
(ڈاکٹر اسلم حنیف)

سوچیں نہ جسارت کسی انساں میں نہیں ہر چیز پہ قدرت نے عطا کی قدرت کیا شئے ہے جو انسان کے امکاں میں نہیں
(قمر گوالیاری)

احساس کے چہرے پہ اداسی کیوں ہے ہر شخص ہے کیوں خوف زدہ اندر سے اظہار کے ہونٹوں پہ خموشی کیوں ہے
(اسماعیل پرواز)

کس نے تصویر آج مانگی ہے کاش میں کچھ حسین بھی ہوتا کیسی تحریر آج مانگی ہے
(پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی)

ان کے علاوہ احسان ثاقب، رونق شہری، اشرف یعقوبی، عبدالمتین جامی، شارق عدیل، محسن باعشن حسرت، رئیس احمد جعفری، مشرف حسین محضر، حسن نظامی، جمیل حیدر شاد، احمد معراج، شباب للت، حماد انجم، راہی صدیقی اور قاضی فراز احمد کی سہ مصرعی رباعیات شامل کتاب ہیں جو کافی اچھی اور متاثر کن ہیں۔

ان رباعیات کے مطالعے سے کسی قباحت کا احساس نہیں ہوتا۔ باتیں صاف صاف سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ عمدہ

خیالات اور مضامین کی مصرعہ سازی بھی ہوئی ہے لیکن نئی صنف ہونے اور پرانی سے ہٹنے کی وجہ سے کچھ تشنگی کا احساس ضرور رہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عادت تو چہار مصرعی کی بنی ہوئی ہے اس لئے تین کی ورودگی کے بعد چوتھے کے لئے قاری منتظر رہ جاتا ہے۔ اس کے باوجود اگر شعرا کا رجحان اس کی طرف مائل ہوا تو اس کی شہرت و مقبولیت کو کوئی روک نہیں سکتا۔ قابل مبارکباد ہیں کوثر صدیقی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اور وہ تمام شعرا جنہوں نے اس نئی صنف پر طبع آمائی کی ہے۔

● کتاب کا نام: تجزیہ تفہیم تبصرہ مصنف: ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن ص: 148 قیمت: 250 روپے
پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ایم نصر اللہ نصر (9339976034)

تجزیہ تفہیم اور تبصرہ پر مشتمل کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن پر گفتگو آسان کام نہیں۔ چونکہ وہ خود تبصرہ زدہ ہوتی ہیں اور مبصر کو ان پر تبصرہ در تبصرہ کرنا پڑتا ہے۔ جس کے لئے محتاط ہو کر کام کرنا لازمی ہے۔ اس طرح کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کس کے کام کا تجزیہ کیا جائے۔ پہلی بات تو یہ ہوتی ہے کہ مبصر نے تخلیق کار کی تخلیق پر کس حد تک تبصرہ کیا ہے اور کتنا انصاف کیا ہے۔ دوستی احباب پرستی یا جی حضوری کا لحاظ رکھا ہے یا حقیقت گوئی سے کام لیا ہے اس لئے کہ زیادہ تر تبصرے حقیقت گوئی سے بعید ہوتے ہیں۔ تفہیم کے باوجود سری تبصرے کی پاسداری زیادہ ہوتی ہے۔ تنقیدی لہجہ اختیار کرنے سے مبصر گریز کرتا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ متعدد مضامین کے مطالعے کے بعد اس کا اندازہ ہوا ہے کہ مبصر نے صرف توصیف نامہ لکھنے کا بیڑہ اٹھایا ہے لیکن مبالغہ بیانی سے کام نہیں لیا ہے۔ جو تخلیقات جس قدر قابل توصیف ہیں اسی کی حد میں رہ کر کام کیا ہے۔ اس کتاب میں کل سترہ مضامین شامل ہیں جو بیشک پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا پہلا مضمون ''اماوس میں خواب'' کا تجزیہ ہے۔ جس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''حسین (حسین الحق) کا یہ ناول ان کے مشاہدے جذبے اور احساس کا آئینہ ہے۔ اس ناول کا بیانیہ روایتی بیانیہ سے کچھ الگ ہے۔ خواب سے ناول کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کا اختتام بھی خواب ہی پر ہوتا ہے۔ ایک خواب ماضی قریب کے انتشار اور بحرانی کیفیتوں سے گزرتا ہوا حال کے تلاطم خیز منظر نامے کی تشکیل کرتا ہے تو دوسرا خواب ملگجے مستقبل کے دھندلکوں میں گڈمڈ نظر آتا ہے۔''

اس ایک اقتباس میں موصوف نے پورے ناول کا رس نکال کر رکھ دیا ہے۔ یہ ان کی بصیرت اور علمیت کی دلالت کرتا ہے۔ ایک ناول کا مطالعہ کرنا اور چند جملوں میں اس کا اختصاص پیش کر دینا ایک اچھی ذہانت کی مثال ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس ناول کی کہانی کو جستہ جستہ یوں دہرایا اور اس کے مختلف نکات کی طرف انگشت نمائی کی ہے کہ قاری کو مزید اس ناول کی قرأت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ مبصر کی ذہنی بلاغت کی اچھی دلیل ہے۔

دوسرا مضمون ''جنت اور جہنم'' کی تین کہانیوں کا تجزیہ ہے۔ اے۔ خیام کے اس افسانوی مجموعے کی تین کہانیاں 'آشیانہ' 'دوسری منزل' اور 'بڑی حویلی' کا محاسبہ موصوف نے بڑی دیدہ ریزی سے کیا ہے۔ ہر کہانی کو بڑے انہماک

سے پڑھا گیا ہے اور اس کے نتائج کو اخذ کیا گیا ہے۔

کہانی کی روداد کو بڑے سلیقے سے چند اقتباسات میں سمیٹا گیا ہے۔ اس کے ان نکات کی طرف نہایت ہی خوبصورت انداز میں اشارہ کیا گیا ہے جو کہانی کار کا مقصد رہا ہے۔ آشیانہ نئی خوشحال نسل کا بوڑھے والدین سے اس ناروا سلوک کی کہانی ہے جو old age house میں جا کر تمام ہوتی ہے۔ دوسری منزل نامرد اولاد کی بیوی کی کہانی ہے جسے دوسرے مردوں کو اولاد کی نامردی کو چھپانے کے لئے اس کی بیوی کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں موصوف کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''دوسری منزل ایک شریف' بے زبان عورت کی بے زبانی کی بڑی پر کشش اور پر اثر کہانی ہے۔ ایک ماں اپنے بیٹے کی نامردی کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لئے اپنی سیدھی سادی بہو کو اخلاق سوز حرکت اور حرام کاری پر مجبور کرتی ہے۔''

اس کہانی کا تجزیہ کرتے ہوئے راقم لکھتا ہے:

''یہ کہانی فکر کے مختلف دروازے وا کرتی ہے اور مختلف dimension کی حامل ہے اس لئے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ (یہاں ان مختلف ڈائمنشن کی وضاحت ضروری تھی۔)

لیکن فنی اعتبار سے اس کہانی کو کامیاب کہانی گردانا گیا ہے۔ اس کے بیانیہ کو پر کشش اور اثر انگیز بتایا گیا ہے۔ واقعات کی بنت کاری میں ہنرمندی کو تلاش کیا گیا ہے اور زبان و بیان پر قدرت رکھنے کی سند بھی عطا کی گئی ہے۔ تحیر، تجسس اور تحکم کے گہر بھی نکالے گئے ہیں۔ عمدہ کردار نگاری کی توصیف بھی کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مبصر کو افسانہ نگاری کے فن سے اچھی واقفیت ہے۔

عبدالمتین جامی کی کہانی ''رنڈی'' کا بھی محاسبہ قابلِ تعریف ہے اور اس نکتے کی وضاحت ڈھنگ سے کی ہے جس کے لئے کہانی کار نے اس موضوع کا انتخاب کیا تھا۔ دیگر مضامین بھی مطالعے کی دعوت دیتے ہیں جو کافی ذائقے دار بھی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محفوظ الحسن ایک منجھے ہوئے لکھاری ہیں۔ کافی مطالعہ رکھتے ہیں۔ صدر شعبۂ اردو رہ چکے ہیں۔ اب تک ان کی ۲۴ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس لئے ان کے خامۂ گہر بار کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اتنے بڑے بڑے قلم کار اور فنکار پر قلم اٹھا چکے ہیں کہ ان کے تعلق سے مزید کچھ لکھنا اپنی کوتاہ علمی کا ثبوت فراہم کرنے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اللہ ان کی صحت اور ذہنی توانائی کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

....

- **نامِ کتاب: تلاش (اکبرالہ آبادی: حیات و شاعری) مرتبہ: رضیہ پروین اشاعت: ۲۰۱۷، قیمت: ۵۰۰ روپے پتہ: شعبہ اردو، گورنمنٹ گرلز پی جی کالج، رام پور- 244901 یوپی، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ،**

رضیہ پروین درس و تدریس سے وابستہ ہیں، اس طرح زبان و ادب کی آبیاری میں لگی ہوئی ہیں۔ ان کے مضامین کالج میگزین، وسائل و اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ نثر و نظم سے یکساں دلچسپی رکھتی ہیں۔ مطالعہ پسند ہیں

اورادبی رجحان سے بخوبی واقف ہیں۔ ''تلاش'' ان کی پہلی کتاب (ترتیب) ہے جو اکبرآبادی کی حیات وشاعری پر محیط ہے۔مشاہیر ادباء کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

''تلاش'' میں شامل ۲۲ رمضامین اکبرالہ آبادی کی زندگی اور تخلیقات کے متنوع اجاگر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد عزیز الرحمٰن کا مضمون تحت عنوان ''اکبرالہ آبادی کے سنہ ولادت کی تصحیح'' میں تحقیقی نکتہ نگاہ کی کارفرمائی ہے۔انہوں نے اصرار کیا ہے کہ اکبرالہ آبادی رائج سال ولادت ۱۸۴۶ء نظر ثانی کا محتاج ہے۔انہوں نے کئی حوالوں سے ۱۸۴۵ء کو حقیقت مانا ہے۔ یہ معلوماتی مضمون ہے۔ ''اکبر کی علامت سازی'' پروفیسر نیر مسعود کا مضمون ہے۔انہوں نے اکبر کی شاعری میں درآئے علامتوں کا ذکر کیا ہے اور انگریزی زبان کے الفاظ کے استعمال سے نئی فضا سازی کو حوالہ میں رکھا ہے۔ ''اکبرالہ آبادی شخصیت اور فکر'' میں شاہ اجمل فاروق ندوی نے اکبر کے خطوط کی روشنی میں عنوان کو منعکس کیا ہے۔ ڈاکٹر شاداب تبسم نے اکبرالہ آبادی کو بحیثیت مکتوب نگار پیش کیا ہے اور خطوط سے حوالے بھی دیئے ہیں۔ پروفیسر الطاف حسین اعظمی کا مشمولہ مضمون ''اکبرالہ آبادی کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری پر ایک نظر'' میں ان کی شاعرانہ عظمت کو پیش کیا ہے جو یقیناً طنز ومزاح کے حوالے سے اہم ہے۔ ''اردو شاعری میں اکبرالہ آبادی کا مرتبہ'' تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر شمس تبریز خاں نے انہیں مشرقی تہذیب کا دلدادہ بتایا اور تبدیلیوں کے مضر اثرات کو پیش کرنے والا بتایا ہے۔ ''اکبر کی شاعری: انگریزیت کے خلاف صدائے احتجاج'' میں شاہنواز قریشی نے ان کی شاعری سے صدائے احتجاج کو فوکس کیا ہے۔ ان کے حوالے کے طور پر شمس الرحمٰن فاروقی کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ پروفیسر آصفہ زمانی نے مضمون تحت عنوان ''اکبرالہ آبادی اور غیرت قومیت'' میں ان کو ایک مصلح اور ریفارمر کے طور پر ذکر کیا ہے۔ ''اکبر کے کلام میں انگریزی قوافی کا حسن'' تاباں نقوی کا مضمون ہے۔اکبر کے یہاں انگریزی زبان کے الفاظ کو قافیہ بنا کر مزید متاثر کن بنایا گیا ہے۔ ڈیئر، سر، بچ، جج، توپ، ڈنر، بیڈروم، نوٹس، گریجویٹ، لیٹ وغیرہ ان کی شاعری میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا دو مضمون کتاب میں شامل ہے۔ ''اکبر کا ایک شعر'' اور ''اکبرالہ آبادی'' مضامین سے مولانا کا علمی استعداد اور انشاپردازی جھلکتا ہے۔ اول الذکر مضمون مختصر اور ثانی الذکر مضمون سیر حاصل گفتگو پر محیط ہے۔ ''اکبر اور مغرب'' میں نیاز سلطان پوری نے اکبر کی شاعری میں مغرب حوالے سے کارآمد نکات سپرد قلم کئے ہیں۔ ''اقبال اور اکبر'' کے عنوان سے ڈکٹر اکبر حیدر کشمیری کا ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ میں دو قسطوں میں شائع مضمون اہمیت کا حامل ہے۔ اکبر کی شخصیت اور شاعری کو جاننے میں یہ مضمون معاون ہے۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے ''سید اکبر حسین اکبرالہ آبادی'' میں موصوف کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کرکے ان کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایس۔ایم۔عباس رضوی نے اپنے مضمون میں اکبر کی شاعری سے گفتگو کی گئی ہے۔ ان کے مشمولہ مضمون کا عنوان ''اکبر اور نئی علامات'' ہے۔ ''اکبرالہ آبادی کا پیغام محبت'' کے محتویات میں ہندو مسلم اتحاد اور وطن پرستی سے لبریز پیغام محبت کی پیش کاری موجود ہے۔ یہ مضمون اکبر کو نئے انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین کا ۱۹۵۰ء میں اکبرالہ آبادی پر تحریر کردہ وقیع مضمون ''اکبر کا ذہن'' اس ترتیب میں شامل ہے۔ یہ مضمون کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے اور اکبر کی شاعری پر ناقدانہ نگاہ کی غماز ہے۔ ''اکبر

اور ظرافت'' کے عنوان سے مبشر علی صدیقی نے ظرافتی پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب کا آخری مضمون ایمن تنزیل ہے۔جس کا عنوان ''اکبر کے چند لطائف: اشعار کی روشنی میں'' ہے۔اس میں اشعار کی شمولیت سے لطائف کا مزہ دوبالا ہو گیا ہے۔

اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے تحریر کیا ہے۔انہوں نے باریک بینی سے ''تلاش'' کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے محتویات کے ماخذات کو روشن کیا ہے۔انہوں نے مرتبہ کی ادب دوستی کا ذکر خلوص کے ساتھ کیا ہے۔پیش لفظ میں اکبر کے قلق سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اس کاوش کو بزم ادب میں پیش کرنیکا اعلان کیا ہے۔

اکبر حسین اکبر آبادی کی شخصیت اور فن کاری پر یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔اکبر پر مضامین اور کتاب خوب شائع ہوئے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔اس کے باوجود اس کتاب میں مضامین کی نوعیت اور قلم کاروں کی عظمت کے سبب اس کی اہمیت مسلّم ہے۔یہ کتاب مکمل ہے مگر اس کی دوسری جلد جیسا کہ مقدمہ میں ذکر ہوا ہے شائع ہو جائے تو عاشقان اکبر کے لئے عمدہ کاوش ہوگی۔مجھے یقین ہے رضیہ پروین کی یہ پہلی کاوش اعتبار پائے گی اور ان کا حوصلہ مزید کچھ کرنے کے لئے ضرورت پر ہوگا۔

....

● **نامِ کتاب: عملی صحافت مصنف: شکیل افروز، پتہ: 12/48، چتوار بگان لین، کلکتہ-9 اشاعت: ۲۰۱۸**
ناشر: اکسائی پرنٹر اینڈ پبلشر، کلکتہ قیمت: ۸۰۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

شکیل افروز جواں سال معروف صحافی ہیں۔صحافت کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی دلچسپی ہے اور تحقیق و تاریخ کے میدان میں اپنی کاوشوں سے اعتبار رکھتے ہیں۔''اللہ کا گھر'' (تذکرۂ مساجد)، ''کلکتہ کا کمال'' (تاریخی اسناد)، ''شہر کلکتہ کے نواح کے قبرستانوں کی دلچسپ روداد''، ''غالب کلکتہ میں''، ''کلکتہ کے مٹے پرانے بازار''، ''مسلم قبرستان کا تاریخی پس منظر''، ''گرم تتلی (افسانوں کا مجموعہ) کتابیں ان کی ادبی، تاریخی وتحقیقی مزاج ظاہر کرتی ہیں۔صحافت سے وابستہ بنیادی نکات کی معلومات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے زیر مطالعہ کتاب ''عملی صحافت'' اہمیت کا حامل ہے۔

۷ ار عنوانات کے تحت 'عملی صحافت' کو تقریباً تمام زاویے سے اکیرنے کی سعی کی گئی ہے۔ایک کالمی خبر، دو کالمی خبر، تین کالمی خبر، چار کالمی خبر، پریس کانفرنس، اسٹوری، سائڈ اسٹوری، اسپیشل اسٹوری، تفتیشی اسٹوری، فیچر اسٹوری، فولاپ، ادبی رپورٹنگ، ایونٹ رپورٹنگ، پیشگی رپورٹنگ، ترجمہ رپورٹنگ، انٹرویو، کالم نگاری کی شہ سرخی سے خبر سے لے کر تجزیہ وتبصرہ کو واضح کیا گیا ہے۔ان خبروں کی اہمیت اور لکھنے کے طریقہ کار کو بتایا گیا ہے۔'ایک کالمی خبر' کے بارے میں نپی تلی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''کئی اخبارات میں بڑی خبروں کا خلاصہ صفحہ اول پر دیا جاتا ہے جو ایک کالمی ہوتا ہے جبکہ پوری خبریں اندرونی صفحات پر ہوتی ہیں۔جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قارئین کو بڑی خبریں پڑھنے کا موقع نہ ملے تو ایک کالمی ہی پڑھ لیں تاکہ خبروں سے واقف رہے''۔اس طرح معلومات کا احسن طریقہ اپناتے ہیں۔'دو کالمی' کے بارے میں ان کا ماننا ہے کہ یہ ۱۰۰ ار سے ۲۰۰ ر الفاظ میں خبروں کی تفصیل کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔'تین کالمی' خبریں الگ سے ایک ضمنی عنوان کے ساتھ تیار کی جاتی ہے۔اسیط

رح چار کالمی کا دائرہ تھوڑا وسیع ہے۔ اخباروں میں سب سے بڑی خبریں پانچ یا پورے صفحات کی چوڑائی پر پھیلی ہوتی ہیں۔ اس میں مناسب تصویریں بھی لگائی جاتی ہیں۔ اسٹوری کو متعارف کراتے ہوئے انہوں نے اس کی خوبیوں اور طریقہ کار کو نمایاں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ضروری ہے کہ موضوع سے عوام کا قلق ہو، مقصد اصلاح ہو، معلومات ہو اس لئے متعلقہ موضوع پر پوری گرفت ضروری ہے۔ اسٹوری میں متعلقہ سرکاری افسران کے بیانات ہوں تو اسٹوری میں جان آسکتی ہے۔ اگر معاملے سے وابستہ افراد سے رابطہ نہ ہو سکے تو مشہور و معتبر شخصیات سے بیانات لئے جاتے ہیں۔'' اسٹوری کے لئے کالموں کی تعداد متعین نہیں ہے البتہ زیادہ تر اسٹوریاں چار پانچ کالمی ہوتی ہیں۔ اسٹوری کو اور واضح کرنے کے لئے اس کتاب میں جن مطبوعہ اسٹوریوں کو جگہ دی ہے چند ایک کی سرخی ملاحظہ کیجئے جن سے اندازہ ہوگا کہ خبر کا یہ حصہ ہمارے معاشرے کے لئے کتنا اہم ہے: ''وقت آگیا ہے کہ مدرسہ سروس کمیشن کے مسئلے کو حل کیا جائے''، ''وزیر اعلیٰ یا سیاست داں اب حج کمیٹی کے سربراہ نہیں رہیں گے''، ''حاسدوں کو اقلیتی ترقیاتی و مالیاتی کارپوریشن کی ترقی ناقابل برداشت'' وغیرہ ایسی اسٹوری ہیں جن سے اخبار کی معیار بندی کا علم ہوتا رہتا ہے۔ سائڈ اسٹوری/ اسپیشل اسٹوری کے تحت مشمولہ اسٹوری ''بابری مسجد کی شہادت ہندو دہشت گردی کی بدترین مثال'' کا مطالعہ مصنف کی دردمندی اور قوم و ملت کے لئے مثبت افکار کا آئینہ دار ہے۔ ''کرکٹ کی طرح اردو لیکچرار اور پروفیسر کا عہدہ بھی 'فکس' ہوتا ہے''، ''حج سبسیڈی ایک کھلا دھوکہ''، ''صفیں درست کرنے کا وقت یونہی نہ گزر جائے'' اسپیشل اسٹوری کے معیار پر کھری ہیں۔ تفتیشی اسٹوری رقم کرنا گویا سچ کو تلاش کرنا ہے۔ اس کے لئے صحافیوں کو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ عصر پر نگاہ اور دستاویز کے کھنگالنے کا ہنر بھی آنا چاہئے۔ شکیل افروز کا کہنا بالکل درست ہے کہ ''ایک تفتیشی صحافی کے اندر سچ جاننے کا جذبہ اور راز کھولنے کا تجسس ہونا چاہئے۔ اس کے اندر ایک لچک کا مادہ ہو، سوچ مثبت ہو، دل کدورت یا کینہ سے پاک ہو، معلومات زیادہ سے زیادہ مکمل ہوں، تفتیش کی بے پناہ صلاحیت ہو، وہ پختہ عزم، مستحکم ایقان و اخلاق کا مالک ہو۔'' اس سلسلے میں ''ایم ایل جبلی انسٹی ٹیوشن کا اردو میڈیم ہونا ہی گناہ'' کو پڑھئے تو آپ تفتیش کے قائل ہو جائیں گے اور اس طرح کی خبروں کے تمام زاویئے کو بآسانی سمجھ لیں گے۔ ''عالیہ یونیورسٹی: خواب مسلمانوں کا، تعبیر ممتا کی'' سے فیچر اسٹوری کے انداز و مقصد کو ازبر کیا جاسکتا ہے۔ خبروں میں فولواپ تو صحافت کی درسیات کا ایک حصہ ہے۔ اسے واضح کرتے ہوئے جو مثالیں دی گئی ہیں جو تواتر سے ایک خبر کو پورا کرتی ہے۔ ائمہ مساجد کو وظیفہ ملنے کی خبر اس پر بی جے پی کا اعتراض، عدالت کا فیصلہ، ائمہ کے مشاہرے پر روک لگانے سے ہائی کورٹ کا انکار ایسی خبریں ہیں جو ایک بڑی اور اہم خبر کو پورا کرتی ہیں۔

مصنف نے ادبی رپورٹنگ کے طریقے کو واضح کرتے ہوئے اس طرح کی خبروں میں محتاط رہنے اور پوری روداد سے سروکار رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ ادبی رپورٹنگ کی عملی پیش کاری میں نمونے قابل تعریف ہیں۔ واقعات یا معاملات کی رپورٹنگ اخبار میں ہوتی رہتی ہے۔ مصنف نے حج اور کتاب کا ذکر کر کے اس طرح کی رپورٹنگ کو اچھا بنانے کی ترکیب بجھائی ہے۔ اس ضمن میں ''زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا'' عونان سے رپورٹنگ میں ادبی حسن

دکھائی دیتا ہے۔ آئندہ آنے والے پروگرامز اور دیگر معاملے کے لئے پیشگی خبریں کام آتی ہیں۔ مصنف نے ترجمہ کے ذریعے کئے جانے والی رپورٹنگ، انٹرویو اور کالم نویسی کو بھی موضوع بناتے ہوئے ان کی عمدہ پیش کش کے لئے مشورے دیئے ہیں۔

''عملی صحافت'' ایک ایسی کتاب ہے جو صحافت کے بارے میں معلومات کا خزینہ ہے۔ اس میں صحافیوں کی تربیت کا مؤثر مواد موجود ہے۔ تمام خبروں کی پیش کش کو سمجھانے یا بتانے کے لئے نمونے شامل کئے گئے ہیں۔ جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان کا معیار بلند ہے۔ بطور صحافی کام کرنے والے اس سے خوب فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اپنی ملازمتی ذمہ داریوں کو چار چاند لگا سکتے ہیں۔ ایسی کتابیں کم یاب ہیں جس میں صحافت کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہو جہاں ایک ساتھ فکر و عمل موجود ہو۔

اس کتاب کی فلیپ پر عبداللہ سنجر، جمیل احمد اور پرویز حفیظ کی آراء اس کتاب کی اہمیت کا اعتراف ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ پشت پر مدیر ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ ف۔س۔ اعجاز کی رائے مصنف کی محنتِ شاقہ کی دلیل ہے۔ مصنف نے ''انداز بیاں'' میں بے باکی سے یہ سچ لکھا ہے کہ'' ...... فنی اعتبار سے یہ کتاب برسوں کام آتی رہے گی۔ خبروں کا ایسا انتخاب میں انگریزی کتابوں میں دیکھا ہے۔ ابھی تک اردو صحافت میں یہ مروج نہیں ہے۔'' میں اس خیال کی تائید کرتا ہوں۔ کتاب دلکش ہی نہیں دل نشیں بھی ہے۔ طباعت نہایت صاف ستھری اور جلد مضبوط ہے۔ ''اخبارِ مشرق'' سے وابستہ اس صحافی کے لئے نیک تہنیت اور مبارکباد۔ کامل یقین ہے کہ اس کتاب کی خوب خوب پذیرائی ہوگی۔

....

● **نامِ کتاب: ''اشاریہ: تذکرہ شعرائے اتر پردیش'' مرتب و ناشر: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں اشاعت: ۲۰۱۷ء پتہ: غوث منزل، تالاب ملا ارم، رامپور-۲۴۴۹۰۱ (یوپی) قیمت: ۲۰۰ روپے مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ**

علم و ادب کی دنیا میں ایسی شخصیتیں موجود ہیں جن میں سے ایک ہیں ڈاکٹر عرفان عباسی، ڈاکٹر عرفان عباسی (پیدائش: ۱۹۶۴ء، وفات: ۲۰۱۲ء) کی مطبوعہ کتب کی تعداد تقریباً ساٹھ تک پہنچتی ہے اور ان میں زیادہ تر تذکرہ، تاریخ نیز شخصیات کے مطالعے پر محیط ہے۔ ان کا زبردست کارنامہ تذکرہ شعرائے اتر پردیش ہے۔ یہ تذکرہ ۳۲ جلدوں میں ہے جو تقریباً سولہ سو شعراء کے ذکر پر محیط ہے۔ یہ تذکرہ اپنے محتویات کی خوبیوں کے بنا پر تحقیق کے لئے اہمیت کا حامل ہے۔ ان تمام جلدوں میں صفحات کی تعداد گیارہ ہزار سے زیادہ ہے۔ ان تمام جلدوں میں شامل شعراء سے بہ آسانی استفادہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے کڑی محنت کے بعد اس کا اشاریہ ڈاکٹر محمد اطہر خاں نے تیار کیا ہے اور اسے قارئین و محققین کے حوالے کیا ہے۔

اس کتاب میں اشاریہ سے قبل معلومات افزا تحریریں شامل ہیں۔ پیش لفظ میں اس کتاب کو تیار کرنے اور تذکرہ کے مصنف کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس اشاریہ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی کا ترتیب شدہ غیر مطبوعہ ''اشاریہ تذکرہ شعرائے اردو'' سے استفادہ کا حوالہ دیتے ہوئے ادبی دیانت داری کا ثبوت پیش کیا ہے اور ان کی کتابوں کی فہرست روبرو کیا ہے۔ مقدمہ میں تذکرہ نگاری کی تاریخ اور متعدد تذکرے کے حوالے سے

گفتگو کرتے ہوئے ''تذکرہ شعرائے اتر پردیش'' اور اس کے مرتب ڈاکٹر عرفان عباسی کے بارے میں جانکاری فراہم کرتے ہیں۔ مقدمہ بسیط ہے اور اس کتاب کی افادیت کو واضح کرنے میں کامیاب ہے۔ مقدمہ کے بعد ڈاکٹر عرفان عباسی کی مطبوعہ کتب (تاریخ وار) شامل کتاب ہے مزید ڈاکٹر موصوف کی مختلف تنظیموں سے وابستگی اور اعزازات سے ان کی ہمہ جہت شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اداریہ ساز نے سوانحی و ادبی تعارف میں تفصیل سے شخص اور ادبی خدمات کو جگہ دی۔ بلاشبہ ڈاکٹر اطہر مسعود خاں اپنی ادبی کارگزاریوں سے متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ ادب اطفال میں ان کا نام اعتبار پاچکا ہے۔۔ ان کی کتابیں اس ضمن میں بے حد مضبوط ہیں۔ کھلتی کلیاں، جھوٹ کے پیر، سنہری فیصلہ، موم کا دل، غریب شہزادی بچوں کے لئے خلق کی گئی عمدہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے اشاریہ سازی میں بھی اہم کام انجام دیئے ہیں۔ ''نیا دور'' لکھنؤ کا اشاریہ اور دیگر اشاریے نے تحقیق کرنے والوں کے لئے کافی معاون ہیں۔

زیر مطالعہ کتاب ''اشاریہ-تذکرہ شعرائے اتر پردیش'' میں اشاریہ صفحہ نمبر ۶۱ر سے ۱۴۱ر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں شعرائے کرام کے تخلص اور نام بنیاد مانا گیا ہے اور ان شعراء کی شمولیت کس جلد میں ہوئی ہے مزید مطلوبہ جلد کے کس صفحہ نمبر پر انہیں دیکھا جاسکتا ہے، سہولت دی گئی ہے۔ اس سے بہ آسانی ہم شاعر کی تلاش کر سکتے ہیں۔ اگر ایک تخلص والے کئی شعراء ہیں تو ان کا نام بھی درج کردیا گیا ہے تاکہ کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ اگر تخلص اور نام دونوں ملتے ہوں تو نمبر ۱ر اور ۲ر کے ذریعہ الگ کیا گیا ہے۔ مثال کے لئے اختر لکھنوی دونوں شعراء کے نام اختر حسین ہیں اس لئے اشاریہ ساز نے (۱) اور (۲) کے ذریعے واضح کیا ہے۔ ''تذکرہ شعرائے اتر پردیش'' کے اشاریہ کے بعد مرتب نے ''تذکرہ شعرائے ریختی'' (مرتب: ڈاکٹر عرفان عباسی) کا اشاریہ بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ گرچہ یہ مختصر ہے مگر افادیت کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کا یہ کام سراہنے کے قابل ہے۔ اشاریہ سازی مشکل کام ہے۔ کئی طرح کے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، تحقیق کو معیاری بنانے کیلئے تگ و دو کرنی پڑتی ہے اس کے بعد کتابی شکل میں آنے سے اس کے استفادگان بہت سی تحقیقی دشواریوں سے بچ جاتے ہیں۔ پیپر بیک والی یہ کتاب اچھی شائع ہوئی مگر اس کا ٹائٹل املا کی غلطی کا شکار ہوگیا ہے۔ اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس کتاب کا مطالعہ اور اس سے استفادہ سودمند ہے۔

....

● نام کتاب: فکر فردا مصنف: احمد جاوید اشاعت: ۲۰۱۸ء قیمت: ۳۰۰ روپے

رابطہ: ۱۰۱، پہلی منزل، مین روڈ، ذاکر نگر، نئی دہلی-۲۵ مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

احمد جاوید ایک تجربہ کار اور معتبر صحافی ہیں۔ ان کے کالمز کا انداز منفرد ہوتا ہے۔ اداریئے میں سچائی اور بے باکی ہوتی ہے۔ ''مبادیات صحافت واردات''، ''تلخ نوائی''، ''آسماں تہہ خاک''، ''صحرا بھی گلزار لگے'' ان کی وہ کتابیں ہیں جن کے ذریعے ان کی علمی وادبی استعداد و نظریئے کا علم ہوتا ہے۔ انہوں نے مدن جیت سنگھ کی کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا ہے جو ''ساشیا کی کہانی'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔ ''فکر فردا'' ان کے منتخب کالموں کی دسویں

کتاب ہے جواشاعت کے مرحلے کی اول ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ ''......اس ناتواں نے ان (کالموں) کو محفوظ کرنا شروع کیا تو یہ ۲۰۰ سے ۳۰۰ صفحات تک کی ۱۰ ر جلدیں ہو گئیں جن کی ایک ساتھ اشاعت ممکن نہ تھی، مناسب معلوم ہوا کہ پہلے دسویں جلد بلکہ اس کا بھی انتخاب پیش کردو جس کی مشمولات تازہ اور ترتیب و پیشکش نسبتاً آسان تھی۔'' اس طرح 'فکر فردا' کے کالمز ہمیں دنیا جہان کے چنندہ موضوعات کے پہلوؤں سے آشنا کراتے ہیں اور حالات حاضرہ کی سیاسی، ادبی، معاشرتی مسائل پر غور وخوض کے مواقع دیتی ہے۔

''ڈریکولا، فرڈ ننڈ اور دجال''، ''جمہوریت وہ طرز حکومت ہے''، ''ہمارے عہد کا عام آدمی اور ہم''، ''اسرائیل، عرب اور ہندوستان''، ''اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا''، ''......اور جب روم جل رہا تھا''، ''یہ چند جملوں کا سوال نہیں ہے مسٹر مودی''، ''دیوارِ عظیم، چین اور ہم''، ''چین کی دیوار سے شی کی قبرستان تک''، ''ڈائنا سور کی قبر، چنگیز خاں کا مجسمہ اور مودی''، ''جمہوریت کو درپیش خطرات اور ہم''، ''سنا آپ نے ترکی نے اردگان سے کیا کہا؟''، ''راج یوگ یا پتھ یوگ؟''، ''صیہونیت، ہندوتو اور ہندوستان''، ''ہم حاضر ہیں خداوندا ہم حاضر ہیں''، ''اقوام متحدہ بنام اقوام غیر متحدہ''، ''بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی''، ''شیر میسور، کنڑ، کرناٹک اور ہم''، ''یہ ہمارے ضحاک اور ان کے سانپ''، ''رام راج اجودھیا تا سومنات''، ''......اور جو نیشنل ہیرالڈ نہ چلا سکے''، ''نیشنل ہیرالڈ بنام پائنیر''، ''غیروں میں ریشم اپنوں پر فولاد''، ''فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں''، ''اردو صحافت کے دو سو سال''، ''عدالتیں مسلمانوں کا واٹرلو؟''، ''کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک''، ''درد جب حد سے گزر جاتا ہے''، ''آہ! وہ دیدۂ تر آج بہت یاد آیا''، ''قصہ ہمارے روہت ویمولا کا''، ''کسی قوم کو تباہ اس کے دشمن نہیں کرتے''، ''بھارت ماتا کے بیٹوں کا خبطِ زندگی''، ''شام کا مستقبل، روس اور امریکہ؟''، ''پناما پیپرز یعنی بحر الکاہل میں طوفان''، ''سبرامنیم سوامی کی سینہ زوری''، ''جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے''، ''......اور یہ ایک رات کی بیداری''، ''بیٹوں سے آگے بیٹیاں''، ''کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کریں''، ''دہشت گردی کے دو چہرے''، ''خدا کا دین اور داعش کا دین'' ایسے عنوانات ہیں جن پر احمد جاوید کا قلم روانی سے چلا ہے اور حق وصداقت کی آواز بن کر ابھرا ہے۔ ان مضامین میں مسائل پر ہمدردانہ اظہار خیال پر بس نہیں کیا گیا ہے بلکہ حالات وواقعات کے اثرات نیز معاشرے اور حکومت کا رویہ بھی رقم ہوتا ہے۔ مذکورہ کالمز اختصار کے حسن سے مملو ہے۔ زبان وبیان میں روانی اور ایک قسم کا حسن پایا جاتا ہے۔ پڑھتے جائیں اور باتیں ذہن میں کھلتی جائیں گی۔

''فرقہ بندی ہے اور کہیں ذاتیں ہیں'' میں نامور صحافی غلام سرور کی خدمات کے حوالے سے اردو معاشرے کا سچ بیان ہوا ہے، اور عنوان بھی ان کے خطاب کا ایک مصرعہ بنا ہے جو ''کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں'' سے مکمل ہوتا ہے۔ ''کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک'' میں مسلمانوں میں فرقہ بندی کے بھیانک نتائج اور معاشرے کے انتشار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ راجستھان اُدے پور میں محمد یوسف کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کے دروازے تک چھوڑ دیا گیا کہ وہ کسی دوسرے فرقے کا تھا۔ ''قصہ ہمارے روہت ویمولا کا'' میں محمد محی الدین شاہد کی جدوجہد، پروفیسرز کے غیر انسانی افکار واعمال اور آخر کار اس نوجوان کی موت کی روداد کو پڑھتے ہوئے دل

کانپ جاتا ہے۔"اور ایک رات کی بیداری"،"بیٹوں سے آگے بیٹیاں"،"دہشت گردی کے دو چہرے"،اردو صحافت کے دو سو سال" وغیرہ ایسے کالمز ہیں جن کے دامن میں فکر فردا بھی ہے اور عصر سے ہم رکاب ہونے کی تیاری کے گر بھی ہیں۔

احمد جاوید کی تحریروں کی خوبی ان کے مثبت افکار و اعمال کے پیش کش میں دیانت داری اور بے باکی ہے۔وہ ماضی، حال اور مستقبل کا خاکہ ذہن میں رکھتے ہیں،صرف گفتگو نہیں کرتے ،دلائل سے اُسے پُر وقار اور معیار عطا کرتے ہیں۔زیادہ تر کالمز جس وقت بھی لکھے گئے ہوں آج بھی مطالعے کے بعد معلومات میں اضافہ کرتے ہیں، غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔'فکر فردا' کا گٹ اپ شاندار ہے۔سائز اور کور کا حسن دل لبھاتا ہے۔اردو میں شائع ہو رہی کتابوں کے عام روش سے منفرد ہے۔

....

● نام کتاب:بر فیلے کنول ناول نگار:لکشمی نرائن مہاپاترا ترجمہ:عبدالمتین جامی اشاعت:۲۰۱۸ء
قیمت:۲۰۰روپے رابطہ:اردو بازار،ڈاکخانہ مدا پور،ضلع کٹک(اڈیشہ) مبصر:ڈاکٹر مجیر احمد آزاد،دربھنگہ

عبدالمتین جامی شاعر کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔صنف رباعی میں انہوں نے تخلیقی ہنر مندی سے کام لیتے ہوئے خود کو اپنی دنیا میں مستحکم کیا ہے۔شاعری کے ساتھ ساتھ وہ تنقید بھی لکھتے ہیں،افسانہ نگاری سے بھی شغف ہے اور ترجمہ نگاری کی جانب راغب ہیں۔انہوں نے 'خاموشیوں کے نقوش' کے نام سے منظوم ترجمہ کیا ہے۔پیش نظر کتاب "بر فیلے کنول" مشہور اڑیا ناول نگار مرحوم لکشمی کانت مہاپاترا کے ناول کا اردو ترجمہ ہے۔

لکشمی نرائن مہاپاترا نے اُڑیا اور انگریزی زبان میں شاعری کی۔اڑیا میں "گراں قدر ادبی ولسانی خدمات کے لئے ان کو کئی بڑے انعامات سے نوازا گیا۔آپ اڑیا کے مشہور و معروف قلم کاروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔اڑیا میں ان کا مشہور ناول "ہیما پدما" ہے۔مذکورہ ترجمہ اسی ناول کا ہے۔اس ناول کی کہانی مقامی اعتبار سے دو جگہوں کی روداد سے مملو ہے۔اس کا اہم کردار (راکیش) یوں تو اڑیسہ کا رہنے والا ہے مگر وہ بغرض تعلیم نوابوں کی نگری "لکھنؤ" آتا ہے۔امام باڑہ کی ایک لڑکی سے عشق ہوتا ہے۔مگر گھریلو حالات و معاملات کے سبب وہ اسے چھوڑ کر اڑیسہ چلا آتا ہے۔پھر کافی عرصے بعد اپنے بیٹے کی تعلیم کے لئے دوبارہ لکھنؤ آتا ہے وہاں اس کا ضمیر اور اس کا عشق (کھویا ہوا عشق) دوبارہ سر اٹھانے لگتا ہے۔وہ اپنی محبوبہ کو تلاش کرتا ہوا اس کی ہم شکل کیبرے ڈانسر تک پہنچتا ہے جس نام ثمینہ ہے۔وہ بتاتی ہے کہ اس کی ماں کا نام حسینہ (راکیش کی محبوبہ) ہے تو وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا ہے اور ندامت کا اظہار بھی کرتا ہے۔مگر اس کی بیٹی اس کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوتی ہے۔وہ اس شخص کے ساتھ رہنے کو ہرگز تیار نہیں ہے جس نے اس کی ماں کے ساتھ بے وفائی کی جبکہ اس کی ماں نے آخر دم تک اس کو یاد کیا۔راکیش واپس ہو جاتا ہے اکیلا،بالکل اکیلا۔

یہ ناول لکھنؤ کی تاریخی عمارتوں اور ماضی کی عظمتوں کی باقیات کو احسن طریقے سے پیش کرنے میں کامیاب ہے۔لکھنؤ کی تہذیب،یہاں کی شام،یہاں کے مشاعرے،یہاں کا پہناوا اور یہاں کے طور طریقے کہانی کے درمیان

میں بیان ہوتے ہوئے ماجرا کو آگے بڑھاتے ہیں۔ دوسری طرف اڑیسہ کا ماحول، وہاں جوانوں کی عادتیں، کھان پان وغیرہ بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ اس ناول میں زبان کی سطح پر ایک قسم کی آسودگی ملتی ہے۔ آپ صفحہ در صفحہ پڑھتے جایئے کہیں رکاوٹ نہیں بلکہ اس میں تخلیقیت کی بو آتی ہے۔ شاعری سے بھی لطف اندوز ہوتے ہوئے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

اس کتاب کا انتساب بھی ناول نگار آنجہانی لکشمی نارائن مہاپاترا کے نام ہے۔ ہارڈ پیپر بیک میں شائع یہ ناول ترجمہ کے حوالے سے خوش آئند قدم ہے۔ شائقین فکشن کو اس ناول کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے کہ اس میں معصومیت، جبر، عشق اور انسانی نفسیات کے ساتھ عصری مسائل بیان ہوئے جو متاثر کرتے ہیں۔

....

● **نام کتاب: شاکر کلکتوی: حیات وفن مصنف: مصطفیٰ اکبر اشاعت: ۲۰۱۶ء قیمت: ۸۶روپے**
ناشر: مغربی بنگال اردو اکاڈمی، رفیع احمد قدوائی روڈ، کولکاتا مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

مصطفیٰ اکبر اپنی گوناگوں ادبی دلچسپیوں کے سبب متعارف ہیں۔ ادب میں کئی جہتوں سے روشناس ہیں۔ شاعری اور نثر نگاری دونوں کے ذریعے اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ادبی صحافت سے عملی طور پر وابستگی ہے۔ ترجمہ نگاری کا شغف بھی ہے۔ انہوں نے جریدہ ''مغربی بنگال'' کو پُر وقار بنانے میں اہم رول نبھایا۔ اس رسالے کا عصمت چغتائی، امیر خسرو، پریم چند نمبر وغیرہ کی خوب پذیرائی ہوئی۔ بزم شاکری کے متحرک رکن رہے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''افکار سے اظہار تک'' ان کی مطالعہ پسندی، تنقیدی زاویہ نگاہ اور تحریری ہنرمندی کا آئینہ ہے۔ اس کتاب کے مضامین متاثر کرتے ہیں۔ مصطفیٰ اکبر سنجیدگی سے ادبی کام انجام دیتے ہیں۔ ان ادبی کارگذاریوں پر محیط ایک مضمون بعنوان ''عصر حاضر کا ایک نمائندہ قلم کار: مصطفیٰ اکبر'' ڈاکٹر امام اعظم نے تحریر کیا ہے جو ان کی کتاب ''گیسوئے اسلوب (مطبوعہ: ۲۰۱۸ء) میں شامل ہے۔ ان کی رائے سے اتفاق ہے کہ ''ان کے یہاں گہرائی و گیرائی بھی ہے نیز زبان پر قدرت بھی۔ ان کی نثر کی طرح ان کی شاعری بھی دل کو چھوتی ہے۔ ان کا اپنا اسلوب ہے۔''

شاکر کلکتوی کے حوالے سے زیر مطالعہ مونوگراف مشمولات کے اعتبار سے تحقیقی وتنقیدی مطالعے کی یکجائی سے تعبیر ہے۔ جناب مصطفیٰ اکبر نے اردو غزل کے نمائندہ شاعر شاکر کلکتوی کو مکمل طور پر پیش کرنے کی سعی میں ان کے حیات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ استاذ الشعراء کی حیات نو کوئی ذیلی عنوانات کے تحت قاری کے روبرو کیا گیا ہے۔ آبا و اجداد، ولادت، تعلیم وتربیت، شادی، اقامت کا ذکر کرتے ہوئے انکی شکل وشباہت اور ذریعہ معاش کی معلومات پروتے ہیں۔ آغاز شاعری وتلمیذ میں محقق نے مظفر حسین شاطر، مولانا اکمل حسین اکمل اور بعدہٗ وحشت کلکتوی سے اصلاح سخن لینے کو مدلل کیا ہے۔ شاکر کلکتوی کے اہم اسفار ڈھاکہ اور چاٹگام کا ذکر کر کے وہاں ان کی پذیرائی اور متعدد شعراء سے ملاقات کو بیان کیا ہے۔

مونوگراف کے مصنف مصطفیٰ اکبر نے شاکر کلکتوی شاگرد وحشت کلکتوی کے جانشین ہونے کے مسئلہ کو

بڑی باریکی سے پیش کیا ہے اور مختلف اخبارات اور شعراء کے بیان کو کوڈ کر کے یہ واضح کیا ہے کہ شاکر کلکتوی ہی جانشین علامہ رضا علی وحشت ہیں اور اسے ارباب ادب قبول بھی کیا ہے۔

شاکر کلکتوی کے خدمات اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے ماہنامہ 'شمس' جاری کیا۔ بزم شاکری کے قیام کے ساتھ اس بینر تلے اشاعتی سلسلہ شروع کیا اور یہاں سے کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ مصنف نے مکاتیب وحشت، شاہکار قصیدے، پری خانۂ الفت کا خاص ذکر کیا ہے۔ شاکر کلکتوی کا حلقۂ تلامذہ وسیع ہے۔ شاگردوں میں نامور شعراء کا تعارف اور نمونۂ کلام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاکر نے بطریق احسن شعراء کی تربیت کی۔ ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مصنف کی رائے معتدل اور قابل لحاظ ہے کہ شاکر اردو غزل کے وہ خوش فکر اور خوش بیان شاعر ہیں جنہوں نے اپنے شعور فکر اور خلوص اظہار سے غزل میں وہ کمال فن عطا کیا جس کی مثال وحشت کے بعد ان کے معاصرین میں بہت کم نظر آتی ہے۔ ان کی پوری شاعری دل کی شاعری ہے۔'' مصطفیٰ اکبر نے شاکر کلکتوی کی شاعری کے مختلف جہات سے بحث کرتے ہوئے انہیں اردو شاعری کا نابغۂ عصر شمار کیا ہے۔ انہوں نے غزل، قصیدہ اور نظم سے ان کی وابستگی کا اظہار کیا ہے اور غزل میں ان کے فکری و فنی کمالات کو اجاگر کیا ہے۔

انتخاب کلام معیاری اور ان کا نمائندہ شاعری کا نمونہ ہے۔ ۱۹ر غزلیں، ۱۹ر کی تعداد میں قصائد بموقع وداع ماہ صیام، ۶ر نعت پاک، ۴ر سلام بحضور سید الشہداءؑ حضرت امام حسینؑ، ۲ر منقبت اور دیگر منظومات جن کی تعداد ۵ر ہے اس مونوگراف میں شامل ہے۔

سید طاہر علی شاکر کلکتوی کو جاننے کے لئے یہ مونوگراف دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کو جاننے کے لئے ہر ممکنہ مواد اختصار کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہے۔ مصنف نے بڑی محنت اور تحقیق سے شاکر کلکتوی کی بازیافت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب کی چھپائی اچھی ہے۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی اشاعتی اسکیم قابل ستائش ہے کہ یہاں سے مغربی بنگال کے ادباء و شعراء پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ دوسرے صوبے کے اکاڈمیوں کو بھی اس طرح کا کام کرنا چاہئے۔ یقین ہے اس کتاب سے شاکر شناسی کا نیا باب وا ہوگا اور مصطفیٰ اکبر کی کوشش سراہی جائے گی۔

....

- نام کتاب: دل کے آنگن میں (شعری مجموعہ) شاعر: نجم عثمانی، منکوریہ، واسع پور، دھنباد (جھارکھنڈ)

اشاعت اول: ۲۰۱۷ء قیمت: ۷۰ روپے مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

نجم عثمانی کہنہ مشق بزرگ شاعر ہیں۔ شعری اظہاریہ پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ جدید ادب کے رجحانات و میلانات کو پسند کرتے ہیں۔ ''شب خون'' میں ان کی شاعری کو اہتمام سے جگہ ملتی تھی۔ جدیدیت ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ روایات سے منکر ہو جائے۔ نجم الہدیٰ نجم عثمانی نے اردو کی عظیم شعری روایت سے استفادہ کیا اور فکری طور پر اپنا انفراد قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''شمار نفس'' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ ''احساس آئینہ'' کے نام سے دوسرا شعری مجموعہ ۲۰۱۵ء میں منظر عام پر آیا۔

''کالی دھرتی کی غزلیں'' ان کا مشترکہ شعری مجموعہ ہے۔ ہندو پاک کے معتبر ادبی رسائل میں ان کی تخلیقات کی جلوہ گری ہوتی رہی ہے۔

زیر نگاہ یہ مجموعہ عام مجموعہ کلام سے منفرد ہے۔ اس میں پانچ نعت پاک کے بعد نظمیں اور متفرقات میں قطعات، اشعار، دوہے اور عقیدتیں (تعزیت کے لئے لکھی گئی منظومات) شامل ہیں۔ نعتیہ کلام میں حب رسولؐ اور اسلام کی عظمت کا درس اس پروقار انداز میں پیش ہوا ہے کہ شاعری کا حسن نکھر گیا ہے۔ ایک شعر پڑھتا ہوں:

وہ آگئے جہاں میں تو روشن جہاں ہوا　　　　ہر نقش پائے ختم رسل کہکشاں ہوا

''دل کے آنگن میں'' کی نظمیں روح عصر کی نمائندہ ہیں۔ آج کی زندگی کی کثافتیں، عالمی مسائل، فرد کا بکھراؤ، آج کے انسان کی نفسیات شاعری میں پرہنر جانتے ہیں۔ نظم ''سچائی'' بطور مثال پیش ہے:

''جسموں کی بن باس میں / روحیں قید ہوئی ہیں / تاریکی کے غار میں / سورج دفن ہوا ہے / سچائی کی کوکھ میں / کڑواز ہر بھرا ہے / زہریلی مرطوب ہوا میں / دم گھٹتا ہے / وقت کے ٹوٹے آئینے میں / ریزہ ریزہ عکس ہوا ہے''

اردو کی جدید نظمیہ شاعری میں جن موضوعات کو اہمیت سے برتا گیا ہے ان میں زندگی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ چوں کہ نجم عثمانی کی نگاہ بسیط ہے، سنجیدگی سے عصر کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں۔ فرد اور معاشرے کی رفتر افتاد پر پینی نگاہ ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے احساسات کو حسین ترین الفاظ کا جامہ عطا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے زندگی کا ہر رنگ ان کی آنکھوں میں ہویدا ہے۔ نظم ''زندگی'' ملاحظہ کریں:

''ہوا ہے سخت مخالف / فضا ہے دشمن جاں / بچھے ہیں راہ میں کانٹے / کڑی ہے دھوپ بہت / نہ راہبر کوئی آگے / نہ کارواں پیچھے / ردائے زخم بدن پر ہے / دل میں عزم سفر''

آنے والی نسلیں جب پوچھیں گی، ان کا مرنا کوئی حادثہ نہیں، نئے سال کی دعا، کامیاب آدمی، دوپہر کا کھانا، سیاست جاری ہے وغیرہ نظمیں معنوی ہمہ داری رکھتی ہیں۔ ان نظموں سے شاعر کا تجربہ کار اور مشاق ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس مجموعہ کلام میں پدم شری ڈاکٹر کلیم عاجز کا مضمون ''فن آشنا شاعر: نجم عثمانی'' اور ''گفتگو'' کے عنوان سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریر شامل ہے۔ ڈاکٹر کلیم عاجز نے نجم عثمانی کی بے ساختگی کا اظہار کیا ہے جس میں صفائی، اعتماد اور رفتار ہے۔ ڈاکٹر ہرگانوی مانتے ہیں کہ ان کی ''نظموں میں گہرائی بشدت اور ہمہ گیر انسانی وسماجی اثر و نفوذ کی تمنا ہے۔'' کتاب کے آخر میں حلیم صابر (فنی ریاضت کے حامل نجم عثمانی)، ڈاکٹر عشرت بیتاب (نجم عثمانی کی شاعرانہ عظمت) اور ڈاکٹر حسن نظامی (بعنوان ایک تاثر) کی تحریریں نجم عثمانی کو بطور شاعر اعتراف واقرار کا آئینہ ہے۔

''دل کے آنگن میں'' شعری مجموعہ ایک باکمال شاعر کے جذبات واحساسات سے شناسائی کا موقع عنایت کرتا ہے۔ اس میں آج کی شاعری اور زندگی کی رمق دمق ہے۔ کتاب کی طباعت اچھی ہے اور گوور سادگی میں حسن کا نمائندہ ہے۔ یقین ہے یہ مجموعہ نجم عثمانی صاحب کے مرتبہ کے تعین میں کارگر ہوگا۔

....

● نام کتاب: ہوا کے ہاتھ (شعری مجموعہ) شاعر: احمد نثار اشاعت: ۲۰۱۶ء قیمت: ۱۰۷ روپے
رابطہ: کڈس کیمپس اسکول، محمد علی روڈ، پوسٹ: بی پالی ٹیکنک، دھنباد (جھارکھنڈ) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

احمد نثار اپنی شاعری سے متاثر کرتے ہیں۔ واللیل (۲۰۰۶ء) اور ''برگ امید'' (۲۰۱۵ء) مجموعے نے ان کو وقار بخشا اور سنجیدہ قارئین کے حلقے میں ان کی شاعری کو پسند کیا گیا۔ ''ہوا کے ہاتھ'' شعری مجموعے میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ احمد نثار کی غزلیں تجربات و مشاہدات کا حسین ترین اظہاریہ ہیں۔ غزل موضوعاتی تنوع کیلئے مشہور ہے اور اس کو برتنے کا انداز نیز شعری چابکدستی کسی بھی شاعر کو کامیابی کی منزل عطا کرتے نے میں معاون ہے۔ احمد نثار نے عصری معاملات و واقعات سے اثر لیا ہے تو شاعری میں روایت کی مضبوط کڑی کے خود کو علیحدہ کرنے کی جگت نہیں کی ہے۔ اس لئے عصری موضوعات میں بھی حسن ہے اور رنگ تغزل میں بھی کمال پیدا کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ موضوعات کو برتنے کا حسین انداز ان کی شاعری میں موجود ہے۔ آج کی زندگی کا کرب والم اگر شعری قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو اس کی صورت گری درج ذیل اشعار سے ہوجاتی ہے۔ احمد نثار کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

علاقے برف بن کر شرار جلنے لگے — کمک لئے کشمیر سے نکل آئے
کہیں شہر میں کچھ ہوا ہی نہیں — اثاثے گھروں کے بکھرتے رہے
جان لے تم کو زمانہ تو پشیماں ہوجائے — تم نے سیکھا ہے فقط شہر میں سازش کرنا
یہاں تو ملبے کا ڈھیر ہے اب — یہیں مرا تھا مکان سائیں
یہاں تو ملبے کا ڈھیر ہے اب — یہیں مرا تھا مکان سائیں
بلا کی چیز بنائی گئی محبت کو — بچا ہے کون فرشتہ ترے نشانے سے
لاان میں سب کے ہے پودا تو لگا زر آور — پھول کھلتا نہیں شہروں میں محبت والا
دریا سے ملے گا نہ سمندر سے ملے گا — جو رزق ملے گا وہ مقدر سے ملے گا
کہ تخت و تاج کس کو چاہئے — مرے بچے کھلونا چاہتے تھے

ان نظموں میں اثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ چونکاتے ہیں اور اپنے جذبات کو بیان کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں:

میں چاہتا ہوں/ وہ مجھ کو/ پرت در پرت کھولے/ اور/ کچھ نہ بولے (نظم ''کاش'')
جب مٹی کی خوشبو/ سانسوں کو معطر کرنے لگے/ تب سمجھو/ مٹی کو/ مٹی سے/ نسبت ہوگئی ہے (نظم ''رابطہ'')

....

● نام کتاب: آپ کے منہ میں مصنف: ابوالکلام رحمانی اشاعت: ۲۰۱۷ء قیمت: ۸۸ روپے
ناشر: مغربی بنگال اردو اکاڈمی، 75/2A، رفیع احمد قدوائی روڈ، کلکتہ-16 مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ابوالکلام رحمانی پانچ دہائیوں سے ادب و صحافت کے گیسو سنوارنے میں منہمک ہیں۔ ان کے انشائیوں کا پہلا

مجموعہ ''اس حمام میں'' شائع ہوا۔۱۹۸۰ء میں انشائیوں کا دوسرا مجموعہ ''ماڈرقصۂ دودرویش'' اور زیرتبصرہ انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ''آپ کے منہ میں'' انشائیہ نگاری سے ان کی گہری وابستگی کی تمثال ہے۔''تذکرہ مشاہیر ادب شیخ پورہ (تحقیقی مقالہ،مطبوعہ: ۲۰۰۵ء)،''تعارف اور تجزیہ'' (ادبی مضامین کا مجموعہ مطبوعہ ۲۰۰۶ء)،''تذکرہ مشاہیر ادب مشرقی مگدھ'' (تحقیقی مقالہ)،''میزان'' (ناولٹ،مطبوعہ ۲۰۱۶ء) وغیرہ کتابیں ان کی ادبی کارگزاریوں کو منعکس کرتی ہیں۔انہوں نے کئی روزناموں کے لئے انشائیے لکھے بطور خاص ''آبشار'' کلکتہ میں ایک باضابطہ کالم ''تکلف برطرف'' کے لئے خامہ فرسائی کی۔اس طرح صنف انشائیہ کو رفتار عطا کرنے والے ادباء میں ان کو اعتبار حاصل ہے۔''آپ کے منہ میں'' ان کے ۲۲/انشائیوں کا مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں شامل انشائیوں کے عنوانات ایک نظر میں توجہ حاصل کر لیتے ہیں۔''میاں جھبسو ممبر پارلیامنٹ کیسے بنے''،''روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر''،''ڈنڈا اور ڈھل''،''جیوتی بابو چلے گئے''،''آپ کے منہ میں''،''تیرو تیشہ''،''کہت کبیرا''،''آنا وجود میں ایک نئی سیاسی پارٹی کا''،''دھاکڑ کی عید''،''میں نے بھی قربانی کی''،''میں نے پی ایچ ڈی کی''،''تصین بوا''،''علامہ بوتل بیلاپوری''،''میں بھی ایوارڈ یافتہ ہوا''،''چوں چوں کا مربہ''،''شبراتی ماما''،''قصہ میرے پروفیسر بننے کا''،''انشاءاللہ''،''آسان نہیں صاحب اقتدار ہونا''،''بلائے بے درماں''،''اپنے منہ میاں مٹھو''،''مجھے بھی بڑا غرور ہے'' انشائیے نے اپنے عنوان سے بھی مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔انشائیہ ہماری کمزوریوں،غلطیوں اور بے سبب عادتوں کی طرف مزاحیہ انداز میں اشارہ کرتا ہے۔معاشرتی ناہمواریوں اور دوسری برائیوں کو موضوع بنانے کے لئے موزوں ترین صنف اگر کوئی ہے تو انشائیہ ہے۔ابوالکلام رحمانی نے سیدھے طور پر ہماری خامیوں پر چوٹ کرتے ہیں۔

انشائیہ ''آپ کے منہ میں'' تکیہ کلام کے کمال کو محسوس کیجئے۔''میں بھی قربانی کی'' میں بکرا بازار اور صاحب استطاعت نہیں ہونے کے باوجود قربانی کرنے کی خواہش اور انجام ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔''اردو ادب میں طبلہ اور ڈگڈگی کا مقام'' کے موضوع پر خوشامدی پسند طالب علم کا پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کرنا ''میں نے پی ایچ ڈی کی'' کا موضوع ہے۔حقیقت بیانی کا یہ شاندار نمونہ ہے۔اس انشائیہ کے جملے دم دار،متاثر کن اور غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔اسی طرح ''میں بھی ایوارڈ یافتہ ہوا'' میں آج کی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔انہوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''......اس کے بعد تو میرے پاس اعزاز واکرام اور انعام وایوارڈ کے ڈھیر لگ گئے ۔جسے میں نے پگڑی باندھی اس نے مجھے پگڑی باندھی، جسے میں نے ٹوپی پہنائی اس نے مجھے ٹوپی پہنائی، جسے میں نے گچھا اُڑھایا اسے مجھے گچھا اُڑھایا، جسے میں ایوارڈ سے نوازا اس نے مجھے ایوارڈ سے نوازا'' پروفیسر بننے کا طریقہ،بحالی کے نخرے اور پیروی نیز اقربا پروری کو خوبصورتی سے برتا گیا ہے۔''قصہ میرے پروفیسر بننے کا'' میں۔''اپنے منہ میاں مٹھو'' میں اردو شعر وادب کی صورت حال اور خود ساختہ عظیم،عظیم تر ادباء بننے کا مزاحیہ انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔''انشاءاللہ'' کا مطالعہ آپ کو خندہ زن ہونے پر مجبور کر دے گا۔

ابوالکلام رحمانی ہمارے معاشرے کا مطالعہ اس باریک بینی سے کرتے ہیں کہ ہماری چھوٹی چھوٹی خامیاں بھی ان کے سامنے ہوتی ہیں۔بڑے مسائل اور عصری بے راہ روی پر ان کا شگفتہ قلم روانی سے چلتا ہے اور وہ عام

خامیاں انشائیہ کے قالب میں خوش اسلوبی سے ڈھل جاتا ہے۔قاری اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بہت سارے قارئین تو شرمندہ بھی ہوتے ہوں گے اور بہتوں کے لئے لمحہ فکریہ ہوتا ہے۔

انشائیہ کے اس مجموعے کی اشاعت کے لئے مغربی بنگال اردو اکاڈمی مبارکباد کی مستحق ہے۔ایک اچھے اور سچے انشائیہ نگار کے طور پر ابوالکلام رحمانی کی پیش کش قابل رشک ہے۔یقین ہے اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

....

● **نام کتاب:مغربی بنگال میں اردو کا ایک اہم مرکز''کلکتہ'' مصنف:مقصود دانش ص:۲۸۰**
اشاعت:۲۰۱۷ء ناشر:مغربی بنگال اردو اکاڈمی،کلکتہ-۱۶ مبصر:ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جگندل)

اردو ادب کی ترویج و اشاعت اور ترقی میں ہندوستان کے دوسرے شہروں کے ساتھ ساتھ کلکتہ بھی ہمیشہ سے فعال رہا ہے۔کلکتہ کی ادبی خدمات کے تعلق سے ۲۸۰ صفحات کے اس کتاب میں کل گیارہ مضامین شامل ہیں اس کے علاوہ نزہت زینب ،سکریٹری مغربی بنگال اردو اکاڈمی کا اکاڈمی کے تئیں کارکردگی کا مختصر ذکر''اپنی بات'' کے عنوان سے اس کتاب میں شامل ہے اس کے علاوہ''پیش لفظ'' کے عنوان سے مقصود دانش کا ایک تاثراتی مضمون بھی شامل ہے۔موصوف نے کتاب کا''انتساب''ان اساتذہ کے نام معنون کیا ہے جن کی شفقت اور علمی و ادبی رہنمائی مشعل راہ ثابت ہوئی۔

اردو نثر کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جدید نثر کے آغاز کا سہرا کلکتے کو جاتا ہے جب ۱۸۰۰ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی رہنمائی میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔۵۴ سالہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات نے اردو نثر کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا جس کا اثر آج بھی دیکھ رہا ہے۔شعراء کی ایک بڑی تعداد کلکتے میں موجود رہنے کے باوجود نثر کے فروغ میں کمی نہیں ہے۔نثر نگاروں کی بھی اچھی خاصی تعداد یہاں موجود ہے۔ان میں ایک نام مقصود دانش کا بھی ہے۔مقصود دانش بہت ہی نکھر کر اور معتبر ادب لکھتے ہیں۔''مغربی بنگال میں اردو ایک اہم مرکز''کلکتہ'' نثری فروغ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔جس میں کل گیارہ مضامین شامل ہیں۔موصوف نے ان گیارہ مضامین میں ادب کے الگ الگ اصناف کے تعلق سے مضمون قلم بند کیا ہے۔ساتھ ہی کتاب میں شامل مضمون کلکتہ میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش'' کے عنوان سے اردو زبان کے کلکتے میں فروغ کا ذکر بھی نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔اس کے علاوہ کتاب میں شامل تمام مضامین انفرادی معلومات فراہم کرتے ہیں۔

کتاب میں شامل گیارہ مضامین ہیں۔۔۔''کلکتہ میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش،کلکتہ میں اردو نثر نگاری کا آغاز و ارتقاء،''کلکتہ میں اردو تحقیق و تنقید،''کلکتہ میں خواتین نثر نگار'';''کلکتہ میں اردو شاعری کا آغاز و ارتقاء،کلکتہ میں اردو ناول کا منظر نامہ'';''کلکتہ میں اردو افسانے کا آغاز و ارتقاء'';''کلکتہ میں ظرافت نگاری'';''کلکتہ میں اردو ڈراما نگاری'';''کلکتہ میں اسٹیج ڈراما''،اور''کلکتہ میں ادبی رسائل و جرائد شامل ہیں۔

ان گیارہ مضامین میں کچھ طویل مضامین بھی ہیں اور کچھ مختصر لیکن اتنی بات تو ضرور ہے کہ موصوف کی یہ کتاب ادب میں ادبی خدمات کے حوالے سے ایک سنگ میل ثابت ہوگی۔موصوف نے''کلکتہ میں اردو زبان کے ابتدائی

نقوش'' کے عنوان سے بہت ہی معلوماتی فراہم کیا ہے۔اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی زبردست معلومات فراہم کرتے ہیں۔نئی نسل کے لئے یہ کتاب مشعل راہ ثابت ہوگی۔خاص طور سے محقق کے لئے رہنمائی کا کام کرے گی۔میرے خیال میں موصوف نے تمام اصناف کو اس کتاب میں شامل کرلیا ہے جس سے کلکتہ کی ادبی خدمات کی واضح تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

مختصر یہ کہ ادب میں مغربی بنگال کے حوالے سے کلکتہ کی ادبی خدمات مختلف اصناف کے حوالے سے کارآمد ثابت ہوگی۔کتاب کی طباعت سے لے کر کاغذ عمدہ ہے۔امید ہے قاری اسے پسند فرمائیں گے۔

● **نام کتاب: ہمارے ہاتھ سے گر کر جو آئینہ ٹوٹا (مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ) مصنف: قیوم بدر ص: ۱۱۲ قیمت: ۹۰ روپے اشاعت: ۲۰۱۷ء ناشر: مغربی بنگال اردو اکاڈمی کولکاتا-۱۶ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جگتدل، نارتھ ۲۴ پرگنہ)**

نثری اردو ادب میں مختلف اصناف کے ساتھ خاکوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔خاکے کسی انسان کی شکل وشباہت اور زندگی کے طور طریقے کو پیش کرتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ان خاکوں میں اگر مزاحیہ جملے ڈال دیئے جائیں تو وہ اور پر لطف ہوجاتے ہیں۔مزاحیہ خاکہ نگاروں کی اردو ادب میں بہت کمی ہے۔یوں کہہ لیجئے کہ خاکہ نگار تو مل جائیں گے مگر مزاحیہ خاکہ نگار خال خال ہی نظر آتے ہیں لیکن مغربی بنگال کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں ایک مزاحیہ خاکہ نگار قیوم بدر کے نام سے مکیں ہیں جہاں تک میری ناقص خیال کا تعلق ہے کہ قیوم بدر مغربی بنگال کے پہلے مزاحیہ خاکہ نگار ہیں۔مزاحیہ خاکہ لکھنے کے لئے ظرافت کا عنصر ہونا مصنف کے اندر ضروری ہوتا ہے۔ایسی ظرافت قیوم بدر کے یہاں پائی جاتی ہے چونکہ قیوم بدر جنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا بعد میں طنز و مزاح کی جانب ملتفت ہوئے اور اسی کے ہوکر رہ گئے لیکن لگا ہے بہ گاہے چھوٹے چھوٹے افسانے بھی لکھتے ہیں لیکن ان کی تعداد طنزیہ ومزاحیہ مضامین کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ادھر کچھ دنوں سے موصوف نے مزاحیہ خاکہ لکھنے کا مزاج بنالیا ہے اور طمطراق کے ساتھ مزاحیہ خاکے بھی لکھ رہے ہیں جو اخبارات ورسائل کی زینت بھی بن رہے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''ہمارے ہاتھ سے گر کر جو آئینہ ٹوٹا'' مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ہے جس میں کل ۲۵ مزاحیہ خاکے ہیں اور ''اپنی بات'' کے عنوان سے مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے سکریٹری نزہت زینب کا اکاڈمی کے تئیں کاموں کے متعلق سے مختصر آرا ''پیش لفظ'' کے عنوان سے تین صفحات پر مشتمل قیوم بدر کا مضمون شامل ہے۔اس کتاب کا انتساب انھوں نے اپنے عزیز دوست ومشہور شاعر رئیس الدین رئیس مرحوم علی گڑھ کے نام معنون کیا ہے۔پیش لفظ کا مطالعہ یہ باور کراتا ہے کہ قیوم بدر اَسّی کے دہائی سے لکھ رہے ہیں اور خوب لکھ رہے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ طنز ومزاح پر ان کی اب تک چار کتابیں ''دخل در معقولات''، ''ہم قبرستان سے بول رہے ہیں''، ''ناریل کے پیڑ سے لٹکا سیب'' اور ''خس کم'' منصۂ شہود پر آکر قاری سے داد وتحسین وصول کر چکی ہیں۔ان کی پانچویں کتاب مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ''ہمارے ہاتھ سے گر کر جو آئینہ ٹوٹا'' ادب کے قاری کے لئے ایک نیا تحفہ ہے۔اَسّی کے دہائی سے ان کے مضامین تواتر کے ساتھ اخبارات ورسائل میں شائع ہونے لگے اور مشاہیر ادب کی جانب سے حوصلہ افزائی بھی ہونے لگی

جس سے ان کے قلم کی جولانی اور بڑھتی ہی گئی۔ ملاحظہ کیجئے" ۱۹۷۶ میں پہلا مزاحیہ مضمون" نام کیا رکھیں" لکھا جس کی خوب خوب پذیرائی ہوئی۔ مشہور شاعر مرحوم وحید عرشی اور مشہور آرٹسٹ وادب نواز مرحوم عبدالوہاب محسنی کی بھر پور ہمت افزائی نے مجھے طنز و مزاح کی جانب ملتفت کیا۔"

قیوم بدر کے خاکے زندگی کی تلخ سچائیوں اور یادوں کا مرقع ہوتے ہیں جنہیں محفوظ کرنا انہوں نے ضروری سمجھا، کتاب میں شامل ۲۵ خاکوں میں" میرے استاد: حشم الرمضان صاحب، اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا......!"،" رئیسوں میں رئیس: رئیس الدین رئیس"،" ادب کا مرد مومن۔ نوشاد مومن"،" صابر اقبال۔ ایک بھاری بھرکم شخصیت"،" خورشید اقبال: سائنس اور ادب کا پل"،" میرا پہلا قاری: الیاس وارثی"،" اردو ادب پر حشمت اللہ صاحب کی پولیسانہ نظر"، " ہوئے تم دوست جن کے.....!"،" جاوید دانش کی حماقتیں"،" استادوں کے استاد حضرت قیصر شمیم"،" منور رانا: ایک نڈر اور بیباک فنکار"،" ریت اڑانے والا: زماں قاسمی"،" بلال حسن کی بلالی شخصیت"،" ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ"،" یاد جب آتی ہے تیری.....!"،" شرر راستی کی راست گوئی"،" رؤف خوشتر کی شوخیاں"،" ڈاکٹر منصور عالم کے نسخے"،" شاعر با کمال: احمد کمال"،" منور شیدا: ایک زندہ دل انسان"،" ف.س. اعجاز کا نمبر"،" کلیجہ چاہئے پتھر کا دوستی کے لئے"،" ڈاکٹر اقبال جاوید: ڈرامہ کا آدمی ہیں، ڈرامہ باز نہیں"،" سائنس اور ادب کا سنگم: عبدالودود انصاری" شامل ہیں۔" رئیسوں میں رئیس: رئیس الدین رئیس" سے یہ جملہ دیکھیں:

> " سر سید احمد خان سے متعلق یہ لطیفہ عام ہے کہ ایک بار موصوف دوستوں کی محفل میں شریفہ کھا رہے تھے اور بے خیالی سے بیج ادھر اُدھر پھینک رہے تھے جس پر دوستوں نے انہیں ٹوکا کہ بھئی بیج ادھر اُدھر کیوں پھینک رہے ہیں؟ سر سید نے برجستہ جواب دیا علی گڑھ میں شریفوں کی کمی ہے بیج بو رہا ہوں۔"

یقیناً رئیس الدین سر سید کی اسی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ دیگر مضامین میں بھی اسی طرح کا حسن ہے جو خاکے کو مزاحیہ خاکہ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ کتاب کی طباعت اور چھپائی اچھی ہے۔ قاری اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

....

● نام کتاب: حرف حرف آئینہ مصنف: معراج احمد معراج ص: ۱۷۶ اشاعت: ۲۰۱۷ء
ناشر: مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا۔ ۷۰۰۰۱۶ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جگتدل)

" حرف حرف آئینہ" معراج احمد معراج کی نثری کتاب ہے، جس کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے شائع کیا ہے۔ کتاب میں کل ۱۷۶ صفحات ہیں۔ اس کتاب کا انتساب انہوں نے" بنگال کے تین بلند و روشن مینار سالک لکھنوی، ڈاکٹر اعزاز افضل، اور رونق نعیم کے نام معنون کیا ہے، جن کی فکر و نظر کی کرنوں سے شعر و ادب کی دنیا تا قیامت منور رہے گی۔ اس کتاب میں شامل مضامین کو انہوں نے مختلف باب میں بانٹ دیا ہے۔" حرف آغاز" کے تعلق سے معراج احمد معراج کا مضمون شامل ہے، جس میں انہوں نے اپنے اولین مضامین کا مجموعہ کے ساتھ دوسرے مضامین کا مجموعہ کے تئیں اپنی بات رکھی ہے۔

اس کتاب میں شامل مضامین کو انہوں نے کل ۸ ابواب میں تقسیم کیا ہے جن میں باب شعر و سخن، باب افسانہ

نگار، باب نقدو تبصرہ، باب بلاغت، باب تجزیہ، باب شخصیات، بابِ تحقیق وتنقید، متفرقات کے ساتھ حوالہ جات اور کوائف نامے کو بھی شامل کیا ہے۔ ''باب شعر وسخن'' میں موصوف نے علقمہ شبلی، ساحرلدھیانوی، رونق نعیم، اختر مدھوپوری، شیمم انجم وارثی، عظیم الدین عظیم، امان اللہ ساغر اور حافظ کرناٹکی کی فنکارانہ اور شاعرانہ صلاحیت پر گفتگو کی ہے۔ ''باب افسانہ نگاری'' کے تحت پریم چند، سلام بن رزاق اور ڈاکٹر عشرت بیتاب کی افسانہ نگاری کا مختصراً لیکن خوبصورت جائزہ لیا ہے۔ باب نقدو تبصرہ کے تحت آنند لہر، بی۔ ایس۔ جین جوہر اور ڈاکٹر اسلم حبیب اور ڈاکٹر سیفی سرونجی کی کتابوں پر خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ ''باب بلاغت'' کے تحت، شاعری میں استعارہ سازی کے موضوع پر معلوماتی گفتگو کی ہے۔ ''باب تجزیہ'' میں موصوف نے پرویز شاہدی کی نظم بے چہرگی، پروفیسر عنوان چشتی کی ایک غزل، ڈاکٹر مشتاق اعظمی کا افسانہ 'تشنہ لبی'، اور اشتیاق سعید کا افسانہ 'جواب' کا فنکارانہ طریقے سے جائزہ لیا ہے۔ ''باب شخصیات'' کے تحت موصوف نے وقار قادری، نذیر فتح پوری، نذیر احمد یوسفی، محبوب انور اور ڈاکٹر احمد سجاد کا مختصراً مگر جامع احاطہ کیا ہے۔ ''باب تحقیق'' کے تحت موصوف نے علامہ اقبال کو ایک سچے محب وطن، دور حاضر کے شعراء اور آسنسول میں شاعری کا اچھا منظرنامہ پیش کیا ہے اور متفرقات کے تحت موصوف نے شارق عدیل اور اختر شاہ جہاں پوری کی شاعری کا جائزہ نہایت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ مختصر یہ کہ ''حرف حرف آئینہ'' یقیناً مختلف ابواب کے تحت آئینہ سازی کا کام کر رہا ہے۔ ''مختلف موضوعات'' کے تحت معلومات میں اضافہ کر رہا ہے۔ قاری کے لئے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوگی۔ کتاب کی طباعت اچھی ہے۔

....

● نام کتاب: سرسید سے شہر یار تک مصنف: پروفیسر انور ظہیر انصاری اشاعت: جنوری ۲۰۱۸ء
قیمت: ۳۰۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی -۶ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جگتدل)

''سرسید سے شہر یار تک'' پروفیسر انور ظہیر انصاری کا تیسرا تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے دو اور مجموعے ''شعور ادب'' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں اور ''اردو کا شعری اثاثہ اور نئے وارث'' کے نام سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوکر قاری کے ادبی ذوق کی تشنگی بجھا چکے ہیں۔ اس کتاب کا انتساب موصوف نے اپنے بھائی جان پروفیسر نورالحق انصاری، سابق صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے نام کیا ہے۔ ساتھ ہی چھوٹی بہن فرحت جہاں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں کل ۱۳ مضامین شامل ہیں جو بہت ہی جامع اور مبسوط ہے۔ موصوف نے سرسید سے لیکر شہر یار تک کے بیشتر علمی وادبی ہستیوں کی علمی وادبی خدمات کا دلائل کیساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین ''سرسید تحریک کا جائزہ، ڈاکٹر سر محمد اقبال، سوانح وطن دوستی، اور نظم ہمارا دیس، ''ڈاکٹر سر محمد اقبال کی نظمیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ''، ''جہد آزادی، عصر حسیت، اور چکبست لکھنوی، ''تلوک چند محروم کی قومی شاعری''، مولانا آزاد اور تصور عشق، مولانا آزاد کی صحافتی زندگی، پروفیسر رشید احمد صدیقی سے متعلق اختلافی بحث پر چند باتیں، جدید غزل رشید احمد صدیقی، 'سعادت حسن منٹو: فحش نگاریا حقیقت پسند'، 'سعادت حسن منٹو کی مستقل شعاری اور ان کے فکری ابعاد، وارث علوی کا شعور، اور شہر یار کی فلمی شاعری شامل ہیں یوں سمجھ لیجئے کہ اس کتاب میں شامل علمی وادبی شخصیات کو

موصوف نے چھوٹا 'س' اور بڑا 'ش' کے درمیان سمیٹ دیا ہے اور ان کی تخلیقی ،فکری وفنی ابعاد کو دلائل کیساتھ ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور سعادت حسن منٹو پر اس کتاب میں دو دو مضامین شامل ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان شخصیات پر دو مضامین لکھ دینے پر ان کی فنی صلاحیت کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ کئی ایک پہلو ہیں جن کے لئے صفحات در صفحات درکار ہوگی۔ بہر حال موصوف نہایت ہی سلیقگی کے ساتھ اور خوبصورت اسلوب کے ساتھ مضامین کو ترتیب دیا ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین یقیناً انفرادیت کے حامل ہیں اور مطالعے کے بعد نئے در وا کرتے ہیں۔ مولانا آزاد کے تعلق سے لکھا گیا مضمون ''مولانا آزاد اور تصور حسن و عشق'' میں موصوف نے ''غبار خاطر'' سے اقتباس اخذ کیا ہے جس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا کے یہاں حسن و عشق کا تصور کی معنویت رکھتا تھا۔ ملاحظہ کیجئے:

''جب کبھی قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی ہے تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی آدمی کے لئے سزا کیسے ہو سکتی ہے۔'' (اقتباس از غبار خاطر)

اس اقتباس کے ذریعہ موصوف نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا کے یہاں تنہائی زندگی کا حسن تھی اور اسی سے ان کی فکر کو رفعت و تازگی اور ان کے دل کو وسعت و قوت حاصل ہوا تھا۔

اس کے علاوہ دیگر تمام مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ قاری کے لئے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے۔ کتاب کی طباعت، گیٹ اپ کے حساب سے قیمت کچھ بھی نہیں ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب مواد سے بھری پڑی ہے۔ امید ہے قاری اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

● **نام کتاب: ''مناظر عاشق ہرگانوی: ادب کا کولمبس'' مصنف: ڈاکٹر نذیر فتح پوری اشاعت: ۲۰۱۸ء**
قیمت: ۲۰۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جگتدل)

ادب میں کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بغیر ان کے ذکر کے ادب کی تاریخ مکمل نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی عظیم شخصیات میں ایک نام ڈاکٹر پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی کی شخصیت ایسی ہے کہ ادب انہیں جھک کر سلام کرتا ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے وہ جاگتے سوتے ادب تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کی تعداد دو سو سے تجاوز کر چکی ہیں اور تخلیق کا یہ سفر اسی رفتار سے اپنی پٹری پر رواں دواں ہیں، مناظر عاشق ہرگانوی ایک فی البدیہ ادیب ہیں، وہ کسی بھی موضوع پر لکھنے کے لئے سوچتے نہیں ہیں بلکہ قلم اٹھاتے ہیں اور لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ شاید ہی کوئی اسی صنف باقی ہو جس پر مناظر عاشق ہرگانوی نے طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ ان کی شخصیت ہشت پہلو صلاحیت کی مالک ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر محبوب راہی نے انہیں ادب کا کولمبس کہا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی: ادب کا کولمبس'' ڈاکٹر نذیر فتح پوری کی تخلیق ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر نذیر فتح پوری کا ''گفت باہمی'' کے علاوہ سولہ مضامین شامل ہیں جن میں ''مناظر عاشق ہرگانوی سے ملاقات، مناظر

عاشق ہرگانوی: سفرناموں کا مسافر"مناظر عاشق ہرگانوی: بکھری اکائیاں اور اظہار کا نیا طریقہ"، "مناظر عاشق ہرگانوی: کی شادشناسی"، "مناظر عاشق ہرگانوی کی نئی کتاب: نیویارک میں اردو غزل"، "مناظر عاشق ہرگانوی اور غزل زندہ باد"، "مناظر عاشق ہرگانوی کی ایک غزل"، "مناظر عاشق ہرگانوی کی شین مظفر پوری سے آشنائی، مناظر عاشق ہرگانوی کے فکروفن پر تین کتابیں"، "مناظر عاشق ہرگانوی کی تیس سال پرانی کتاب"۔ مناظر عاشق ہرگانوی کی نظر میں منوراحمد کی غزل، مناظر عاشق ہرگانوی پر عبدالمنان طرزی کی توشیحی نظم، مناظر عاشق ہرگانوی پر منصور خوشتر کی کتاب، مناظر عاشق ہرگانوی بنام نذیر فتح پوری کے ساتھ آخر صفحہ شامل ہے۔

کتاب میں شامل مضامین کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مناظر عاشق ہرگانوی نے ادب کے کسی بھی موضوع کو نہیں چھوڑا ہے چاہے وہ تنقیدی مضامین کا معاملہ ہو، افسانہ نگاری، خودنوشت، مکتوب نگاری، تجزیہ نگاری، فنی وفکری نقطہ نگاری وغیرہ کی باتیں ہوں، تمام موضوعات کو مناظر صاحب نے نہایت ہی خوبصورتی سے برتا ہے۔ نذیر فتح پوری نے درج بالا عنوانات کے تحت مناظر عاشق ہرگانوی کی بے پناہ صلاحیت کا اعتراف بھی کیا ہے اور برجستہ اس کا اظہار بھی۔ مضامین کے مطالعے سے معلومات کے نئے درواہوتے ہیں، ادب کے تئیں مزید دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ مناظر عاشق ہرگانوی نے دوسو سے زائد کتابیں تخلیق کی ہیں تو عام طور سے یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ زیادہ لکھنے سے کوئی قلم کار بڑا نہیں ہو جاتا۔ نذیر فتح پوری نے اسے ایک مفروضے سے تعبیر کیا ہے بالکل صحیح ہے۔ زیادہ وہی لکھتا ہے جو زیادہ پڑھتا ہے اور صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ بلاشبہ مناظر عاشق ہرگانوی ایک مکمل صلاحیت کے مالک ہیں اور ان کے قلم سے الفاظ ٹپکتے ہیں جس میں سلاست، روانی اور ندرت اور موضوع کا تنوع صاف صاف نظر آتا ہے۔

نذیر فتح پوری یقیناً قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ادب کے ایک بڑے سپاہی پر قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے اور خراج تحسین پیش کرنے کا ایک اچھا سبیل نکالا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کے مطالعے، مناظر عاشق ہرگانوی کے فن افسانہ نگار، مکتوب نگاری، ناقدانہ، تجزیہ نگاری، پارکھ نظر رکھنے کی صلاحیت کی غمازی کرتے ہیں جس کے مطالعے سے یقیناً لکھنے والے کو حوصلہ ملے گا اور قاری کو تسکین کا سامان فراہم ہوگا۔ ہرحال میں نئی کتاب ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور ادب کے کولمبس کے تئیں معلومات فراہم کرے گی۔ طباعت خوبصورت ہے۔ کورپیج جاذب نظر ہے۔ کتاب میں شامل مواد، طباعت کے حساب سے قیمت زیادہ نہیں، امید ہے قاری اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

....

- **نام کتاب: "سایہ دار دھوپ" مصنف: ڈاکٹر حسن نظامی اشاعت: ۲۰۱۷ء قیمت: ۲۵۰ روپے**
  ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جالندل)

"سایہ دار دھوپ" ڈاکٹر حسن نظامی کی تیسری کتاب اور پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کی دو کتابیں "جھارکھنڈ کے جدید غزل گوشعراء کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ" اور "غلام مرتضیٰ راہی: حیات اور کارنامے" شائع ہو چکے ہیں۔ "غلام مرتضیٰ راہی: حیات اور کارنامے" ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی

ہے۔ کتاب کا انتساب انہوں نے محترم شخصیات والدہ محترمہ عائشہ خاتون، والد جناب شمس الدین، بڑے ماموں جناب عین الہدیٰ، چھوٹے ماموں جناب اختر امام اور خسر جناب علی حسین انصاری کے نام معنون کیا ہے۔ کتاب کے صفحہ نمبر ۴ پر موصوف نے ایک نثری نظم جھارکھنڈ کے معروف افسانہ نگار غیاث احمد گدی کے نام بطور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جو بہت ہی عمدہ ہے۔ نظم کے چند سطریں ملاحظہ کیجئے:

ہر ایک شئے کو فنا ہے یہاں/ مگر پھر بھی/ کچھ ایسے لوگ ہیں/ جو دائمی حیات بھی رکھتے ہیں بطریق غیاث/ یہ فلسفہ بھی ہے اپنی جگہ اٹل/ لیکن/ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں.....مگر وہ شخص ہے تو/ جس کی زندگی گزری/ نظارہ کرتے ہوئے/ "دھوپ سارا دن" / یعنی/ ثبات تیرے بھی غم کو یہاں نصیب ہوا/ تمہاری فکر و نظر پر ہے یہ عقیدہ میرا/ کبھی بھی موت کی پرچھائیں چھو نہیں سکتی

کتاب کے صفحہ نمبر ۵ پر شاعر کا کوائف درج ہے جس کے مطالعے سے شاعر کا شغل پیشہ، تصانیف وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ اس کتاب میں کل ۱۱۸ غزلیں ہیں، ایک حمد پاک اور ایک نعت پاک ہے۔ اس کے علاوہ "اپنی بات" سے موصوف کا ایک چھوٹا مضمون، "حسن نظامی کی شاعری" کے حوالے سے جناب اسلم بدر کا ایک وقیع مضمون شامل ہے۔ بلا شبہ یہ کتاب شاعری کے شائقین کیلئے ذوق تسکین کا سبب بنے گی۔ موصوف کو بچپن سے ہی شعر و شاعری سے گہرا لگاؤ پیدا ہو چکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کا ادبی ذہن بیدار ہوا تو صفحہ قرطاس پر ان کے ذوق جمال کی تخلیقات سامنے آنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا مجموعہ منظر عام پر آ گیا۔ ملاحظہ کیجئے:

"مجھ میں ادبی ذوق درجہ نہم سے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ میں اپنے ہیڈ ماسٹر جناب سعید خان صاحب سے ٹیوشن کی خاطر ان کے گھر جایا کرتا تھا، سرہانے معیاری پرچوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ میں ان کی عدم موجودگی میں ان پرچوں کی ورق گردانی کیا کرتا تھا۔ نئے نئے الفاظ اور جملوں کی تراکیب نے مطالعے کی طرف راغب کیا۔" (اپنی بات صفحہ:۹)

حسن نظامی کی شاعری نامساعد حالات، جبر کے خلاف بغاوت و احتجاج، حالات سے برد آزما ہونے کا اعلان ہے۔ ان کی شاعری میں عزم مستحکم بھی ہے۔ حالات سے لڑنے کا بھرپور حوصلہ بھی، اس کے علاوہ انہوں نے سماج کے عام اور سادہ لوح موضوعات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ وہ ایک مبلغ کا بھی کام کرتے ہیں اور مصلح کا بھی۔ دیکھئے:

نیند بھی آدھی موت ہوا کرتی ہے   موت سے پہلے مرنے والے جاگو

موصوف حالات کے برعکس چلنے پر یقین رکھتے ہیں۔ لفظوں کا تکرار ان کی شاعری میں بھرپور نظر آتا ہے۔ ایک شعر دیکھئے:

جس نے مجھ کو بچایا گرنے سے   گھر کی دہلیز کا وہ پتھر تھا

ان کی شاعری میں سادگی اور ان کا لب و لہجہ نہایت ہی نرم ہے جو ان کے خیال کو عرفان عطا کرتا ہے۔ اس کتاب میں بہت سارے اشعار ہیں جو قاری کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

دل کی دہلیز سے باہر نہیں ہونے دیتا / کوئی ہے جو تجھے بے گھر نہیں ہونے دیتا
لوٹ آتی ہے ہنسی لب پہ مرے شام ڈھلے / مجھ کو مغموم وہ دن بھر نہیں ہونے دیتا
ایک ٹکڑا خوشی کا تھا کیا ہوا / جانے کس شخص نے لاپتہ کردیا
کسی کا غم ہو نم ہو جاتی ہیں آنکھیں / کھلا کے جھیل میں پانی بہت ہے
آنکھوں میں شوق دید کا منظر اتار دے / جو بھی تھکن ہے جسم سے باہر اتار دے

اس طرح کے اور بھی بہت سارے اشعار ہیں جو ان کی شاعری کو عظمت عطا کرتے ہیں۔ یقیناً اردو ادب کے قاری کتاب کی پذیرائی کریں گے۔ کتاب کی ابتدائی اندرونی فلیپ پر پروفیسر مناظر عشق ہرگانوی کا تاثر شامل ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''حسن نظامی کی غزلوں میں جذبے کی سچائی، لسانیاتی صداقت، واقعاتی حقیقت، کیفیاتی سچائی اور خلوص اظہار کے ساتھ شعریت کے تقاضے ہر دکھتے ہیں۔''

کتاب کی آخری اندرونی فلیپ پر ڈاکٹر رونق شہری کا تاثر درج ہے۔ وہ عرض کرتے ہیں:

''ان کی شاعری میں بے جا ابہام اور ژولیدگی نہیں ہے اس لئے بھی کہ انہوں نے اپنے گردو پیش کے ماحول سے شاعری کا خمیر تیار کیا ہے۔''

اور کتاب کے آخری فلیپ پر سید احمد شمیم کے چند جملے ان کی شاعری کے حوالے سے درج ہے۔ سید احمد شمیم عرض کرتے ہیں:

''حسن نظامی شعر کہتے ہیں اور ڈھب کے شعر کہتے ہیں ان کے لہجے میں بے تکلفی اور کبھی کبھی نکیلا پن بھی محسوس ہوتا ہے۔ دل اور ذہن کے سائے سائے سفر کرتے ہیں۔''

....

- **نام کتاب: ''سہیل واسطی کے افسانے'' مصنف: ڈاکٹر عشرت بیتاب اشاعت: ۲۰۱۷ء قیمت: ۲۵۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جگتدل)**

مغربی بنگال کے اردو افسانوی دنیا میں ڈاکٹر عشرت بیتاب ایک محترم نام ہے۔ انہوں نے اردو افسانوں سے اپنا قلبی لگاؤ اس طرح پیدا کرلیا ہے کہ رات و دن صرف اردو افسانے کے فروغ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگاروں کی بازیافت بھی ان کا ایک انوکھا شیوہ ہے جنہیں اردو ادب نے فراموش کردیا ہے یا حالات کے گرد کے نیچے دب کر رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر عشرت بیتاب کا قلم ایسے نایاب ہیروں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے۔ مغربی بنگال میں اردو افسانے کے تعلق سے کئی ایک کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ساتھ ہی کئی ایک افسانوں کے مجموعے بھی منظر عام آ کر قاری سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر عشرت بیتاب کا ادبی سفر ابھی بھی جاری و ساری ہے۔ ''سہیل واسطی کے افسانے'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سہیل واسطی حالات کی ستم ظریفی اور خاص طور سے بیماری کی وجہ سے اپنی عمر کی نصف سنچری بھی نہ دیکھ سکے اور مالک حقیقی سے جا ملے لیکن ۴۹ رسال کی عمر میں

ہی انہوں نے اردو ادب کو عمدہ اور قابل فہم افسانے دے کر اس کے دامن کو مالا مال کر دیا۔

ڈاکٹر عشرت بیتاب نے ان کے بکھرے ہوئے افسانوں کو یکجا کر کے کتابی شکل دے کر انہیں بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا انتساب انہوں نے شعر کی شکل میں سید انظار الحق واسطی کے نام معنون کیا ہے۔ صفحہ نمبر ۲۴ پر سہیل واسطی کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں سہیل واسطی کے کل ۱۸ افسانے شامل ہیں اور سہیل واسطی۔ ''اردو افسانوی ادب کا ایک اہم پڑاو'' کے عنوان سے مقدمہ لکھا ہے جو بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔

مقدمے میں ڈاکٹر عشرت بیتاب نے سہیل واسطی کو افسانہ نگار کے علاوہ ان کی شاعرانہ صلاحیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی انہیں مقالہ نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے بھی متعارف کرانے کی سعی کی ہے، موصوف نے اپنے مقدمے میں سہیل واسطی کے ایک شعر کو لکھا ہے:

حشر برپا ہوگیا تو کون کس کا آشنا — دوست ہو یا محبت رسم دنیا ہی تو ہے

اپنے ہی نفس کے پھندے میں گرفتار بھی ہے — وہی انسان اصولوں سے بیزار بھی ہے

سہیل واسطی نے اپنے افسانوں میں زندگی کی تلخیوں اس کے انتشار و اضطراب سے فراز حاصل نہ کر کے اس سے انکھیلیاں کرتے رہے اور افسانے تخلیق کرتے رہے۔ ان کے افسانے ترقی پسند تحریک کے منشور کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ عشرت بیتاب نے مقدمے میں ان تمام باتوں کا بھرپور ذکر کیا ہے۔ کتاب میں شامل ۱۸ افسانوں میں شانتی پیدا ہوئی، رجعت، وایا چانڈیل، پوسٹر کے پیچھے، پش بٹن اور پلک، مو پھو جو محفوظ بن گیا، اسموک اسکرین، نرگوں میں گھرا آدمی وغیرہ شامل ہیں۔

افسانہ ''شانتی پیدا ہوئی'' بہت ہی زبردست دل کو چھو لینے والا افسانہ ہے۔ جس میں افسانہ نگار گرچہ کہ ترقی پسندی کے ماننے والوں میں تھے لیکن اس افسانے میں انہوں نے جدیدیت کے رنگ کو نہایت ہی خوبصورتی سے سمویا ہے کہ انہیں اردو افسانے کی روایت میں جدیدیت کا پیامبر کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عشرت بیتاب نے ہر افسانے سے چند سطریں نکال کر کتاب کے الگ الگ صفحات پر درج کیا ہے جس کو پڑھ کر قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ سہیل واسطی کا افسانوی فن پر گرفت کتنا مضبوط تھا۔ ملاحظہ کیجیے:

''ایک بوجھل احساس کے زیر اثر میری نگاہیں زمین پر ٹک گئیں، یونہی اندازے سے یہی ''بڑا ہاؤس'' میں داخل ہوگیا اور سیلز مین سے دریافت کیا۔ ''پولسن مکھن ہے آپ کے پاس؟ (شانتی پیدا ہوئی)

''تم غریب ہو؟'' طلعت لفظ ''غریب کے معنی تم کو معلوم ہیں؟ غریب اسے کہتے ہیں جو آٹھ گھنٹے محنت کرتا ہے اور پھر بھی پیٹ بھر کر کھا نہیں سکتا۔ غریب اسے کہتے ہیں جس کی بیوی راج محلوں کے سامنے فٹ پاتھ پر بچے جنتی ہے۔ غریب اسے کہتے ہیں جو بنجر زمین سے اناج اگا کر انبار لگا دیتا ہے اور اس کے بال بچوں کو قحط نگل جاتا ہے۔ غریب اسے کہتے ہیں۔'' (رجعت)

اس طرح کے اور بھی افسانوں کے اقتباس ہیں جو سہیل واسطی کو کامیاب افسانہ نگار ہونے کی وکالت کرتا ہے۔ ڈاکٹر عشرت بیتاب کا یہ قدم قابل تحسین ہے۔ طباعت و کاغذ وغیرہ عمدہ ہے۔

● نام کتاب: ''کربِ جاں'' مصنف: غضنفر اشاعت: ۲۰۱۶ء قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جکندل)

اردو ادب میں غضنفر کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ کربِ جاں سے قبل ان کی تقریباً ۲۲ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جس میں ڈراما، تنقید، ناول، افسانوی مجموعے، خاکے وغیرہ شامل ہیں، ان ۲۲ کتابوں میں دو کتابیں، دویہ بانی (ناول) اور کہانی انکل (ناول) ہندی زبان میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ چار کتابیں زیرِ طبع ہیں جس میں شبلی نعمانی کی تنقیدی نظریات (تحقیقی مقالہ)، سخن غنچہ (بچوں کا ادب)، جذبہ طریقہ تدریس (درس و تدریس) اور خوش رنگ چہرے (خاکوں کا مجموعہ) شامل ہیں۔ غضنفر ایک مشاق ادیب ہیں اور ادب پر انکی گرفت کافی مضبوط ہے۔ انہوں نے انتساب مولوی میر حسن، پنڈت دیا شنکر نسیم اور استاد محترم خلیل الرحمن اعظمی کے نام معنون کیا ہے۔ انہوں نے مثنوی کربِ جاں کو پندرہ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان پندرہ حصوں میں 'روداد قصہ گو کی زندگی کا'، مدعا کربِ جاں بیان کرنے کا، آغاز کربِ جاں کے قصے کا، داستان اساس قصے کی، داستان ان کے قیام کے اسباب کی، داستان ان کے دم سے سماں بدلنے کی، داستان بدلے ہوئے سامع کے ردِ عمل کی، داستان منتھن اور چنتن مشق کی، داستان خیمے سے نکلی ہوئی روشنی کی، داستان ٹھٹھکتے ہوئے قدموں کے روانی کی، جس کے دم سے ہستی ہنوز باقی ہے، داستان اس وجود کی، داستان ایک خوف کے اسباب کی، داستان ہائے اندیشہ دور دراز کی، داستان صف بے زبانی کے کردار کی، اور آخر میں ڈاکٹر واحد نظیر کا منظوم خراج تحسین بہ عنوان ''تاریخ تکمیل مثنوی کربِ جاں'' پر مشتمل ہے۔ ''کچھ نثری باتیں'' کے عنوان سے موصوف کا مختصر مثنوی کربِ جاں کی تخلیق کے تئیں اظہار ہے، بعد از مطالعہ یہ ظاہر ہوا کہ موصوف کے اندر برسوں سے ایک دباؤ باہر اور اندر سے پڑتا رہا اور اس دباؤ نے موصوف کو ایک ایسے کرب سے دوچار کیا کہ وہ کرب ''کربِ جاں'' بن گیا اور اس کربِ جاں کے اظہار کیلئے غزل، نظم، افسانہ، اور ناول مناسب نہیں لگا، نتیجے میں مثنوی نے انہیں اپنے اندر پناہ دی اور ''کربِ جاں'' مثنوی کی صورت میں وجود میں آگیا۔ ملاحظہ کیجئے:۔

برسوں کے ایک دباؤ مسلسل مجھ پر باہر اور اندر دونوں طرف سے پڑتا رہا، اس دباؤ نے مجھے ایک ایسے کرب سے دوچار کیا کہ وہ کرب، کربِ جاں بن گیا، اس کرب کے انعکاس کیلئے میں نے کوششیں شروع کر دیں مگر غزل متحمل نہ ہو سکی، نظم معذور رہی، افسانے کا دامن بھی تنگ ثابت ہوا، ناول بھی اپنے کینوس میں لے نہ سکا، مجھے اس کرب سے نجات نہ مل سکی۔ انعکاس کی فکر ستاتی رہی کہ سینے کا کرب مسلسل ضرب لگاتا رہا اور دل خون ہوتا رہا۔

''اچانک ایک دن مجھ پر کشف کی سی کیفیت طاری ہوئی اور میری طبیعت وجد میں آگئی۔ ایک سوتا پھوٹ پڑا، اندر کا کرب باہر آنے لگا جیسے کوئی پھوڑا پوری طرح پک کر پھوٹ پڑا ہو۔ محسوس ہوا کہ جس سانچے میں درد ڈھلنے لگا ہے اس میں سمو چکا کرب سما سکتا ہے تو سانچے کو سنوارنے کی بھی فکر ہوئی اور اس فکر نے میرے کرب میں فن بھی ملانا شروع کر دیا، اس طرح کربِ جاں مثنوی کے روپ میں باہر آگیا۔'' (کچھ نثری باتیں)

اس کے علاوہ ایک حمد باری تعالیٰ، مناجات باری تعالیٰ، اور مدح رسول شامل ہیں۔ یقیناً مثنوی کرب جاں کو جس عنوان سے الگ الگ حصوں میں موصوف نے بانٹا ہے اس کے مطالعے سے وہ حالت منظر نظروں کے سامنے ابھر آتا ہے۔ علاوہ ازیں ''مثنوی کرب جاں'' کے تعلق سے مشاہیر ادب کے مضامین مختلف عنوان سے اس کتاب میں شامل ہیں جس میں ''کرب جاں'' اپنے عہد کی روداد از پروفیسر شمیم حنفی، شہر آشوب کی شاعری کی ایک نئی مثال از پروفیسر عتیق اللہ، پھیلتا جاتا ہے اک قطرہ سمندر کی طرح از پروفیسر انیس الرحمٰن، قصہ کرب جاں کا از پروفیسر خالد محمود، نشاط وجود سے کرب جاں تک از پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، کرب جاں ایک ادبی شخصیت کی تکمیل از ڈاکٹر صفدر امام قادری، اور مثنوی کرب جاں فکری وفنی جہتیں از ڈاکٹر واحد نظیر ہیں۔

ان فاضل مشاہیر ادب نے غضنفر کی مثنوی کرب جاں کے حوالے سے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ جوان کی فکری وفنی صلاحیتوں کا غماز ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''غضنفر کی مثنوی کا فکری کینوس نسبتاً بہت بڑا ہے انہوں نے اردو مثنوی کی کلاسیکی روایت کے تقریباً تمام عناصر کو اپنے ذہن میں رکھا ہے۔'' (پروفیسر شمیم حنفی)

''غضنفر کی مثنوی بے حد رواں دواں ہے جیسے ان کے اندر کی آتما اس کے رگ وپے میں سمٹ آئی ہو۔''
(پروفیسر عتیق اللہ)

''مثنوی کرب جاں ہمارا نوحہ ہے، شہر آشوب کی ایک دوسری ہے سماجی شعور اور سیاسی آگہی کا اشاریہ ہے اور یہ سب ایک ایسے انداز میں جہاں روایت کی پیروی بھی کی گئی ہے اور اس سے انحراف بھی۔''
(پروفیسر انیس الرحمٰن)

''کرب جاں'' ایک حزینہ مثنوی ہے جسے غضنفر اپنے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر کہتے ہیں۔ یہ مثنوی عہد حاضر کے ہندوستان کی تشویشناک صورت حال پر فکر انگیز منظوم تبصرہ ہے۔ (پروفیسر خالد محمود)

''زیر نظر مثنوی میں غضنفر نے دور حاضر کے انتشار اور انسانی کرب کو پیش کیا ہے اور سر راہ اپنی زندگی کے نشیب وفراز دوستوں اور اساتذہ کے تذکرے اور تلخ وشیریں تجربات کو بھی سمیٹ لیا ہے۔''
(پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی)

''کرب جاں غضنفر کے اس اسلوبیاتی طلسم خانے کا غالباً پہلا پڑاو ہے۔ مثنوی کی روایت اور مخصوص آداب کو انہوں نے بہت حد تک اپنے لئے رہنما اصول کے طور پر پیش نظر رکھا تھا۔ (ڈاکٹر صفدر امام قادری)

مثنوی کرب جاں ایک ایسا شعری دستاویز ہے جس میں کئی قوموں کی تہذیبی تاریخ محفوظ ہوگئی ہے۔ اس کے اندرون میں کرب وطن بھی ہے۔ کرب جہاں بھی اور کرب زماں بھی۔'' (ڈاکٹر واحد نظیر)

کتاب کے آخر میں مصنف کی کتابوں کی ایک تفصیل فہرست شامل ہے۔

المختصر کتاب اردو مثنوی کی دنیا میں ایک خوش آئند قدم ثابت ہوگی۔ کتاب خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات اور طباعت بھی بہت عمدہ ہے۔

● **نام کتاب:"خودشناسی کی لکیر" شاعر:قربان آتش اشاعت:۲۰۱۷ء ص:۱۲۸ قیمت:۲۵۰روپے**
رابطہ:کھتاڑی محلہ،آرہ،بھوجپور۸۰۲۳۰۱(بہار) مبصر:ڈاکٹرمحمد علی حسین شائق (جگندل)

شاعری ہر عہد میں سر اٹھا کر زندہ رہی ہے۔نثر نگاروں کی بھی حوصلہ افزائی جاری ہے تاکہ نثر بھی زندہ رہے۔ وجہ ہے کہ زیادہ تر ادیب شاعری کی جانب ملتفت ہو رہے ہیں۔نثر کی طرف کم۔کہا جاتا ہے نثر لکھنے کے لئے پڑھنا پڑتا ہے، یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن شاعری کیلئے بھی تجربہ اور مطالعے کی ضرورت پڑتی ہے۔یہ ضرور ہے کہ شعر کو معیار میں ڈھالنے کے لئے مطالع کی ضرورت پڑتی ہے۔ساتھ ہی مشاقی کی بھی کیونکہ مشق ہی انسان کو مکمل کرتا ہے۔زیر تبصرہ کتاب "خودشناسی کی لکیر" قربان آتش کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔کتاب کا انتساب انہوں نے اپنے والد محترم کے نام منسوب کیا ہے اور خراج عقیدت کے طور پر ایک بہت ہی عمدہ شعر نذر کیا ہے دیکھئے۔

ہر گھڑی میرے ساتھ رہتی ہے ان کی تصویر میری آنکھوں میں

اس کتاب میں کل ۱۰۰ غزلیں اور ایک حمد شامل ہیں۔

"چند الفاظ اپنی شاعری کے متعلق" کے عنوان سے اپنی تخلیقی سفر کے تعلق سے اظہار خیال کیا ہے۔موصوف کا یہ شعری مجموعہ ان کی تخلیقی سفر جو ۱۹۷۵ء کے آس پاس شروع ہوا تھا اور اب بھی جاری و ساری ہے کے درمیان کی شاعری کا احاطہ کرتا ہے۔شاعری محض جذبات کے اظہار کا نام نہیں بلکہ ایک فنکار شاعری کے ذریعہ اپنے محسوسات، تجربات اور خیلات کا اظہار کرتا ہے۔اس بات کا اقرار موصوف بھی کرتے ہیں۔ملاحظہ کیجئے:

'شاعری محض جذبات کی ترجمانی نہیں بلکہ اس کے سہارے ایک فنکار اپنے حیات اور تخیلات، ولولوں اور امنگوں اپنے تجربات زندگی کو ایک تعمیری اور صحت مند صورت پیش کرتا ہے۔"

(چند الفاظ اپنی شاعری کے متعلق ص-۵)

قربان آتش کی شاعری میں ان تمام چیزوں کی جھلک آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ان کی غزلیں موجودہ سماجی صورت حال اور زندگی کی گوں نہ گوں صورتوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ان کی شاعری میں بدلتے منظرنامے کا المیہ نظر آتا ہے وہیں زمانے پر طنز کے تیر برساتی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں تعجب بھی ہے تو بے یقینی صورت حال سے جھوجھتا انسان کی حالت کا ذکر بھی ملتا ہے۔ان کی شاعری میں حیرتی کے اظہار کیساتھ ساتھ خود اعتمادی کا جذبہ بھی کارفرماں نظر آتا ہے۔یقین جانئے اب زمانہ جن حالات سے گزر رہا ہے۔لوگوں کا مزاج جس تیز رفتاری کے ساتھ بدل رہا ہے،انسان کی جگہ مشینیں جس طرح استعمال کی جانے لگی ہیں اس سے ایک بے یقینی کی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ایسے بھی انسان ذہنی طور پر زندہ رہ کر بھی بے چینی کا شکار ہو رہا ہے ایسی صورت حال میں ذہنی تفریح کیلئے اسے ایسے اشعار کی ضرورت ہے جو ذہنی دباؤ کو کم کر سکے اور داخلی طور پر اسے حوصلہ بخش سکے۔موصوف کی شاعری میں اس طرح کی جھلک پوری طرح سے دیکھائی دیتی ہے۔انسان خود سے کتنا پریشان ہے ملاحظہ کیجئے:

میں کسی سے بات اپنی اندرونی کیا کہوں میرے جیون میں ہے کتنی بے سکونی کیا کہوں

انسان کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اسے حیرانی میں ڈال دیتے ہیں۔غیر یقینی صورت حال کا نتیجہ ہے

کہ انسان رونما ہونے والے واقعات سے حیران وششدر رہ جاتا ہے۔ دیکھئے ان اشعار کو:

سرد موسم تھا ہوا میں کوئی چنگاری نہ تھی   جل گئی میری پوشاک اونی کیا کہوں

اب نہ شیشے کا مکاں اپنا بناؤ اے دوست   جانے کب پھینک دے پتھر کوئی باہر سے پھر

آج کی غزل عہد حاضر کے حالات کا متقاضی ہے۔ اس سے الگ ہٹ کر شاعری ممکن نہیں ہے۔ دیکھئے ان اشعار کو:

موسم جو اختیار کئے جارہا ہے روپ   نقشہ بدل نہ ڈالے کہیں تخت و تاج کا

جس نے درخت کاٹا ہے رسم و رواج کا   دشمن وہی ہے اصل میں اپنے سماج کا

جانے کہاں کہاں بوئے گا دور مشینی اور بھی   پھیلتی ہی جارہی ہے بے یقینی اور بھی

مختصر یہ کہ غزل ایک ایسا فن ہے جس نے اپنے اندر تمام موضوعات کو جگہ دے کر اپنے کینوس کو وسیع کر دیا ہے کہ ہر فنکار اپنے خیالات، اپنی محسوسات، اور تجربات کے اظہار کیلئے اسی کو ذریعہ بناتا ہے۔ قربان آتش نے بھی یہی کیا ہے اور اپنے محسوسات، خیالات، تجربات اور مشاہدات کو نہایت ہی سہل پسند انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ان کی شاعری گنجلک پن سے دور ہے، غیر ضروری باتوں سے احتراز کیا ہے۔ زبان صاف ستھری ہے، اشعار میں روانی ہے۔ کتاب کا گیٹ اپ اچھا ہے۔ پرنٹنگ اور کاغذ وغیرہ اچھا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب قاری کو پسند آئے گی۔

....

● **نام کتاب: ''دفینہ پہاڑ کا'' شاعر: معراج احمد معراج ص: ۱۱۲ قیمت: ۷۰روپے اشاعت: ۲۰۱۶ء**
ناشر: مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا۔ ۷۰۰۰۱۶ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جگتدل)

اردو شاعری کے وسیع کینوس میں غزل کا مقام سب سے اوّل ہے۔ غزل نے ہر عہد میں اپنا لوہا منوایا ہے اور تمام شعری اصناف میں سر فہرست رہی ہے۔ ابتداء سے لیکر تادم تحریر غزل اب بھی اسی آب و تاب سے افق ادب پر چمک رہی ہے اور زیادہ تر شعراء کو اپنا اسیر کرتی رہی ہے کیونکہ غزل میں وہ لذت اور چاشنی ہے کہ بغیر اس کے کوئی بھی شاعر خود کو کامیاب نہیں سمجھتا ہے۔ آج جبکہ بیسویں صدی کا عہد ختم ہو چکا ہے۔ اکیسویں صدی اپنی دوسری دہائی مکمل کرنے جارہی ہے پھر بھی غزل کی رمق وہی ہے اور اکثر و بیشتر شعراء کرام اس کے گیسو کے اسیر ہوتے جارہے ہیں۔ ان ہی میں ایک نام معراج احمد معراج کا بھی ہے۔ معراج احمد معراج کا تعلق کالے ہیرے کا شہر آسنسول سے ہے، موصوف کے بارے میں یہ کہنا بالکل ٹھیک ہوگا کہ وہ خالص شاعر ہیں اور انہوں نے غزل کو ہی تخلیق کا ذریعہ بنایا ہے۔

''دفینہ پہاڑ کا'' ان کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے چار شعری مجموعے ''تسخیر حریف''، پہلا شعری مجموعہ، ''منزل شوق''، ''دو بالہجہ''، اور ''صدائے روح'' منصۂ شہود پر آ کر شہرت و دوام تک پہنچ چکے ہیں۔ ''دفینہ پہاڑ کا'' ان کا پانچواں مجموعہ ہے جس میں تازہ غزلیات شامل ہیں۔ یہ تمام غزلیں ملک کے مختلف معتبر و مقتدر اخبارات و رسائل کی زینت بن چکی ہیں۔ شعری مجموعوں کے علاوہ موصوف کی تحقیق و تنقید پر مبنی ایک کتاب ''لفظوں کا کاروبار'' بھی منظر عام پر آ کر داد و تحسین وصول کر چکا ہے۔

دراصل ادب کو ادب کی طرح اگر لکھا جاتا ہے تو یقیناً قاری اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ معراج احمد معراج ادب کو ادب کی طرح پرکھتے ہیں۔ انہیں ادبی خدمات کے لئے مختلف اداروں کے ذریعہ انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ ''دفینہ پہاڑ کا'' کے بعد ان کا چھٹا شعری مجموعہ ''خود آشنائی'' بھی بہت جلد منظر عام پر آنے والا ہے۔

بہر حال ''دفینہ پہاڑ کا'' میں کل ۱۰۰ غزلیں، ایک حمد، اور دو نعتیں شامل ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معراج احمد معراج سہل ممتنع کی شاعری کرتے ہیں۔ چھوٹی بحروں میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں جو ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ان کے اشعار میں الجھاؤ نہیں ہوتا ہے۔ قاری کے لئے ترسیل کا کوئی مسئلہ ہی نہیں چھوڑتے ہیں۔ ان کی زبان کافی سہل ہوتی ہے کہ ایک عام قاری بھی ان کے اشعار کو پڑھ کر اس کے مفاہیم تک پہنچ سکتا ہے۔ حمد باری تعالیٰ کے یہ شعر دیکھیں:

یہ کائنات ہے رقصاں ترے اشارے پر — ترا ہی راج ہے ذرے پر اور تارے پر
ترے کرم نے ابراہیمؑ کو بقا بخشی — چمن کھلا دیا نمرود کے شرارے پر
ترے کرم سے ہمیں پھر اڑان حاصل ہو — اگر چہ کاٹ دیئے وقت نے ہمارے پر

کتنی سہل زبان میں معراج احمد معراج نے بڑی بات کہہ دی ہے۔ ساتھ ہی پڑھنے میں نثر کے تسلسل کا لطف بھی ملتا ہے۔ دو نعتیں بھی شامل ہیں۔ نعت کے اشعار بہت خوب ہیں۔ نعت کی روح مزید بھر دی جائے تو اس کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ غزل کے حوالے سے یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ معراج احمد معراج غزلوں کے اشعار کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لفظوں کے التزام ہی وہ ہمیشہ چاک و چوبند رہتے ہیں۔ ان کے اشعار کے مطالعے سے رومانیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ خود اعتمادی کا بھی، اخلاقی پستی کا اظہار بھی ان کے اشعار میں ملتا ہے۔ جس پر وہ کاری ضرب لگاتے ہیں تو متکبر پر زبردست وار بھی کرتے ہیں۔ دیکھئے:

ابھرا ہے یوں جزیرہ سمندر کے درمیان — جیسے کہ بہہ رہا ہو سفینہ پہاڑ کا
میں برگ نہیں ہوں کہ ہوا مجھ کو اڑائے — پنچھی ہوں مری قوت پرواز ہے پر میں

معراج احمد معراج تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے کہ اگر انسان صحیح تعلیم حاصل کر لیتا ہے تو ہندو مسلم کے جھگڑے سے بہت دور ہو جاتا ہے اسی لئے وہ کہتے ہیں:

درس گاہوں کی کچھ کمی سی ہے — یہاں دیر و حرم زیادہ ہے
جن کی دستار اچھالی جاتی تھی — اب وہی محترم زیادہ ہیں

معراج احمد معراج چھوٹی بحر میں خوبصورت شعر کہہ جاتے ہیں جس میں گہرا معنی چھپا رہتا ہے۔ چھوٹی بحر میں شعر کہنا بہت مشکل فن ہے۔ شاعر کو اپنی بات بھی رکھنی ہوتی ہے اور اوزان و بحور کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے لیکن معراج احمد معراج اس معاملے میں بہت مشاق ہیں اور چھوٹی بحر پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے:

سر بلندی کے استعارے ہیں — ہم جہاں ہیں وہیں منارے ہیں
زیر کر آئی ہیں سمندر کو — کشتیاں جو ابھی کنارے ہیں

جو بھی خوش رنگ چیز ہوتی ہے ہر نظر کو عزیز ہوتی ہے
جس نے اردو ادب پڑھا اس کو گفتگو کی تمیز ہوتی ہے

اس طرح کے اور بھی بہت سے اشعار ہیں جس کے اندر شگفتگی، شستگی، اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ معراج احمد معراج کی شاعری یقیناً اردو ادب کے لئے ایک خزینہ ثابت ہوگی اور ان سے بہت ساری توقعات وابستہ ہیں۔ سرورق جاذب نظر ہے۔ کاغذ اور طباعت بھی اچھی ہے۔ امید ہے قاری اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

● نام کتاب: "اردو شاعری میں تاج محل" مرتب: افتخار الزماں قیمت: ۵۰۰ روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، A-170، گراؤنڈ فلور، سوریہ اپارٹمنٹ، دہلی-95 مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جگتدل)

"اردو شاعری میں تاج محل" افتخار الزماں کی ترتیب دی ہوئی کتاب ہے جس کا انتساب انہوں نے اپنے والدین کے نام کیا ہے۔ فہرست کتاب کے پہلے غلام محمد بخشی کا ایک قطع پیش کیا ہے۔ موصوف نے حرف آغاز کے عنوان سے اپنا ایک مضمون شامل کیا ہے اس کے علاوہ دیگر ادباء کے مضامین بعنوان "منظر پس منظر" از ڈاکٹر عتیق انور صدیقی، 'تعارف' از حقانی القاسمی، "تاج محل" دل تاج محلی، "تاج محل۔ ایک تعارف از ڈاکٹر محمد عثمان غنی، "تاج محل کی تعمیر" از ایواشتانانا جاپان ٹوکیو، "تاج محل شعراء بنگالہ کی نظروں میں" از محمد افضل خان کو شامل کیا ہے۔ علاوہ ازیں ۱۳۹ شعراء کرام کے منظومات کو بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ تاج محل ایک انفرادی محبت کی علامت ہے جس کو شاہ جہاں نے اپنی اہلیہ ممتاز محل کی یاد میں تعمیر کروایا ہے جہاں سینکڑوں کی بھیڑ آج بھی اس کے دیدار کیلئے جمع ہوتی ہے اور محبت کی اس نشانی کو دیکھ کر رشک کرتی ہے۔ تاج محل کی خوبصورتی اور حسن و جمال کو دیکھ کر آفریں آفریں کی صدائیں بلند کرتی ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ لگتی ہے کہ تاج محل کے تعمیر کی پوری کہانی موجود ہے۔ ہندوستان تہذیب وثقافت اور فن تعمیرات کے معاملے میں شروع سے ہی منفرد رہا ہے۔

یہاں کی تہذیب وثقافت اور فن تعمیرات نے دنیا کے مختلف حصوں کے سیاحوں، طلباء، طالبات کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ایواشتانانا، جاپان کی رہنے والی ایک خاتون نے یہاں کی تہذیب وثقافت اور فن تعمیرات سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ ان کے قدم ہندوستان آنے سے نہیں رک پائے۔ ملاحظہ کیجئے:

> "میں نے پندرہ سال کی عمر میں ہائی اسکول پاس کیا۔ پھر اس کے بعد ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز سے اردو میں بی۔ اے کیا۔ B.A. میں اردو پڑھتے وقت میں نے تاج محل کی تصویر دیکھی، اس سے میں بہت متاثر ہوئی اور میں نے سوچا کہ تاج محل کے بارے میں اور زیادہ معلومات حاصل کروں۔ وہاں میرے استاد نے مجھے بتایا کہ ہندوستان جاکر دیکھو تب ہی پوری معلومات حاصل کر پاؤ گی۔ اس لئے میں ہندوستان آگئی۔ مجھے ہندوستانیوں کی تہذیب پسند آئی۔ مثلاً فن تعمیر، فلم، مہندی اور کھانا وغیرہ۔" (تاج محل کی تعمیر صفحہ-۴۸)

ایوا ستانا نانے تاج محل کے حوالے سے تاج محل کا نقشہ، زمین کا انتخاب اور اس کے اسباب، تاج محل کی اینٹ اور اس کی تیاری، تہہ خانہ، مچان، تاج محل کا سنگ مرمر، تاج کی پیائش، چبوترہ، مینار، سنگ سرخ کا چبوترہ، کلس، سنگ مرمر کی جالی، چوبینہ اور قیمتی پتھر سے لیکر دیگر معلومات فراہم کیا ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے مختلف ادبا کے بارے میں معلوماتی مضامین کو شامل کر کے کتاب کی اہمیت کو بلاشبہ بڑھا دیا ہے۔

ایسی بات نہیں ہے کہ شعراء ادب نے چند اشعار پر ہی اکتفا کیا ہے بلکہ تاج محل کی خوبصورتی پر صفحات در صفحات سیاہ کر دیا ہے۔ لیکن اسکے حسن میں کہیں سے کمی نظر نہیں آتی ہے۔

ابرار ہمیر پوری تاج محل کے تعلق سے عرض کرتے ہیں:

شاہ جہاں نے تاج محل کیا بنوا دیا　　دنیا کو عاشقی کا سلیقہ سکھا دیا

وہیں ابراہیم اشک، ممبئی عرض کرتے ہیں:

سنگ مرمر پہ محبت کی غزل ہم دم　　کتنا دلکش یہ حسین تاج محل ہے ہم دم
لوگ کہتے ہیں حسین خواب کی تعبیر جسے　　دل پہ رکھی ہوئی عشق کی بنیاد ہے
رہ گئی درد کی خاموش عمارت بن کر　　اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کی وہ یاد ہے یہ

دوسری طرف اسد رضا کے اس خیال کو دیکھئے:

نگاہوں میں جب تک محبت رہے گی　　جہاں میں تری تاج عظمت رہے گی
ہزاروں برس بیت جائے بھلے ہی　　ترے حسن میں پھر بھی ندرت رہے گی

اتنا ہی نہیں نوبل انعام یافتہ، گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی تاج محل اور ممتاز محل کے حوالے سے بنام شاہ جہاں ایک طویل نظم بنگلہ میں لکھی ہے۔ جس کا اردو ترجمہ فراق گورکھ پوری نے کیا ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔

'تعارف' کے عنوان سے حقانی القاسمی نے اس کتاب کے حوالے سے لکھا ہے:۔

''اردو شاعری میں تاج محل'' ایک ایسا متنا طیسی موضوع ہے اور اس قدر اچھوتا کہ شاید ہی کوئی نظر ہوگی جو اس کے حسن سے مسحور نہیں ہوگی۔ پتھر پہ نگاہ عشق کے جادو کا اثر کون نہ دیکھنا چاہے گا۔

کتاب کے اندرونی فلیپ پر مرتب کا سوانحی کوائف موجود ہے، کتاب کی طباعت اور کاغذ دونوں ہی عمدہ ہے، کتاب میں شامل تمام مضامین معلوماتی ہیں اور منظومات میں حسن ہے۔ لطافت اور ندرت بھی ہے جو قاری کو مطالعے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ امید ہے ادبی حلقوں میں یہ بات ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

- **نام کتاب: مظہر امام کا اکلوتا افسانہ: تجزیہ　مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی　قیمت: ۵۰ روپے**
اشاعت: ۲۰۱۸ء ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶　مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (جگتدل)

تحقیق یقیناً ایک جاں گسل کام ہے۔ ایسے میں اگر کوئی محقق نایاب چیز کی تلاش کر کے صفحۂ بیض پر لانے کی جسارت کرتا ہے تو اس کا یہ عمل لائق تحسین ہے۔ مظہر امام کے جس اکلوتے افسانے کی بات کہی جا رہی ہے اس کی نوعیت کچھ اسی طرح کی ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی کا ''مظہر امام کا اکلوتا افسانہ: تجزیہ'' ایک ایسی کتاب ہے جس

کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تجزیہ نگاری کیا ہوتی ہے اور کسی بھی افسانے کے تجزیے کا اسکیل کیا ہونا چاہئے۔

کتاب کا انتساب موصوف نے ڈاکٹر امام اعظم، ریجنل ڈائرکٹر مانو، کولکاتا اور مدیر اعزازی ''تمثیل نو'' دربھنگہ کے نام معنون کیا ہے جنھوں نے ستر سال بعد مظہر امام کا اکلوتا افسانہ دریافت کیا۔ چونکہ ڈاکٹر امام اعظم نے مظہر امام پر ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے لہٰذا انہوں نے بہت ہی تگ و دو کے بعد اس افسانے کو حاصل کیا۔ ''گفتنی'' کے عنوان سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا مختصر مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے مظہر امام کا اکلوتا افسانہ ''آخر اس درد کی دوا کیا ہے'' کے تعلق سے افسانے کے اندر موجود مواد کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

> ''ستر سال کے بعد مظہر امام کا گمشدہ افسانہ ''آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟'' ڈاکٹر امام اعظم کی تحقیق سے دریافت ہوا ہے جس کا مطالعہ زندگی، عشق اور محبت کا ایسا عمل سامنے لاتا ہے جس میں رعنائی اور لطافت ضرور ہے لیکن یاسیت اور محرومی کا احساس زیادہ ہے۔ خواہشیں انگڑائی لیتی ہیں لیکن دم توڑ دیتی ہیں......'' (صفحہ نمبر ۵)

''افسانہ'' ''آخر اس درد کی دوا کیا ہے'' کا تجزیہ کے عنوان سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ اس افسانے کا تجزیہ کیا ہے کہ پڑھنے کے بعد اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی بھی افسانے کے تجزیہ کا معیار کیا ہونا چاہئے۔ موصوف نے افسانے کے ہر بنت پر نظر ڈالی ہے اور اس کو تجزیہ کے کٹہرے میں دیکھا ہے اور اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس ایک افسانے کا تجزیہ ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسلئے محسوس کیا جاسکتا ہے کہ کس فنکارانہ طریقے سے موصوف نے اس افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔ دراصل یہ افسانہ مظہر امام کی ذاتی زندگی کا اظہار ہے۔ جو جوانی کی سنسان وادی میں محبت کو اصوات تک لے جانے میں پوری طرح ناکام رہے۔ ملاحظہ کیجئے:

> ''مظہر امام جوانی کی سنسان وادی میں محبت کو اصوات تک لے جانے میں ناکام رہے ہیں اور یہی اس افسانہ کی خوبصورتی ہے۔ بہیانہ خواہشیں فردوس گمشدہ کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ یہ بھی اس افسانہ کا حسن ہے اور طالب و مطلوب الگ الگ ذات میں نفس کے تابع ہیں۔ یہ بھی اس افسانہ کی شرف کامیابی ہے۔ اس اکلوتے افسانہ پر مظہر امام کو داد دینی پڑتی ہے کہ وہ تخلیقی فنکار تھے اور مجرد رغبت سے اپنی تحریر کو فضیلت کے برگ و بار تک لے جانے کا ہنر جانتے تھے۔'' (صفحہ نمبر ۴۸)

ساتھ ہی افسانے کا مکمل اقتباس اس کتاب میں شامل ہے۔ کتاب کے آخر میں مظہر امام کی تصاویر ہیں جو پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر امام اعظم کے ساتھ لی گئی ہیں۔ کتاب کے بالکل آخری فلیپ پر مناظر عاشق ہرگانوی کی خدمات کے اعتراف میں جو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں اس کی تفصیل بھی درج ہے۔ بحیثیت مجموعی پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے یہ ثابت کر دیا کہ کسی ایک افسانے پر بھی تجزیہ کر کے ایک کتاب شائع کی جاسکتی ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر امام اعظم بھی قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے مظہر امام کے گمشدہ اکلوتا افسانہ کی بازیافت کی۔ یقیناً یہ کتاب قاری کے لئے ایک قیمتی تحفہ ثابت ہوگی۔ طباعت اور کاغذ دونوں ہی بہت عمدہ ہیں۔

• Name of the Book: Proximal Warmth Poet: Dr. Imam Azam Translated by: Syed Mahmood Ahmad Karimi Year: 2018 Price: Rs. 250/- Publisher: Educational Publishing House, Delhi - 06 Reviewer: Dr. Md Ali Hussain Shaiq (Jagatdal)

The art of translation is undoubtedly very difficult. It needs whole hearted inclination of the mind. Especially translating from Urdu to English is also too much tough. But I would like to appreciate the endeavour of Syed Mahmood Ahmad Karimi that he took the task of translation of Amatory Verses (Gazlen) of Dr. Imam Azam by the name "Qurbaton Ki Dhoop" (in Urdu) Whose translation was named as proximal warmth.

The book under review bears translator's note. Besides under the heading of forward, there is a compact and authentic article of Nazeer Siddiqui From Islambad. Apart from this under the heading "Poet gifted with newly mellowed thoughts fascinating fragnance" by Dr. Hafizullah Newalpuri in which he has estimated the poetic excellence of Dr. Imam Azam in the field of Amatory Verses (Ghazls), Free Verses (Nazm) and others.

Under the haeading of "Battered legend" Dr.Imam Azam has penned the purpose of writing poetry.

On one flap of the book, there is a short article written by Manzar Shahab of Jamshedpur in regard to the poetry of Dr. Imam Azam. He speaks about Imam Azam's poetry in the words such as:

> "Dr. Imam Azam has suffered afflictions in life. He has undergone up's and down's of life. He has been victim of conditions prevalent in environs. He has also been affected by international bickering and occurences.His poetry conatains diverse reflections of his life."

On the other flap there are opinions of Dr. Manazir Aashique Harganvi of Bhagalpur and Mohammed Salim from New Jessy, USA both of them undoubtedly taken the poetry of Dr. Imam Azam as the poetry of glimpses of fresh experience and energy, poetry of emotional greatness and graspingness. Above all the book bears one hymn, one encomium, 32 Amatory Verses, 2 Free Verses and 14 others Verses.

Undoubtedly the verses are of high quality and bears par excellence although the poems have been written is urdu dialect but was translated in english by Syed Mahmood Ahamd Karimi is also no less in value. At some places the translation is so cheering and heart touching that desires to read again and again. An example may be taken from the verse "Fear of Mirror".

"Since thousand years / People keep on saying these matter / When there was no glass / People there reflection in water / Could see, it is heard / Now mirrior is available / But nobody is there to see his face in mirror"

How flow is there in the translation however the book is of great value for readers. Both printing and paper are good and attractive. Do hope, the readers would appreciate it and it would be an enhancement in the world of translation.

....

● نامِ کتاب: البیلی غزلیں شاعر: حشمت کمال پاشا اشاعت: ۲۰۱۵ء ص: ۹۶
قیمت: ۲۵۰ روپے ناشر: پاشا پبلی کیشنز، کلکتہ مبصر: اشرف احمد جعفری، کولکاتا

حشمت کمال پاشا، بچوں کی حیثیت سے بنگال میں وہی مقام رکھتے ہیں جو بیرونِ بنگال شفیع الدین نیر کو حاصل ہے۔ اسی ادبِ اطفال پر کام کرتے ہوئے پاشا نے کئی کتابیں منظرِ عام پر لادی ہیں۔ 'البیلی غزلیں' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب اپنے مواد کے اعتبار سے کئی معنوں میں قابل ذکر ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ بچوں کے لئے لکھی گئی غزلوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل نظموں کے مجموعے ہی شائع ہوتے رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان غزلوں میں بچہ خود متکلم ہے شاعر نہیں۔ تیسری بات یہ کہ ان ۴۶ غزلوں کے متکلم کی اکثریت ایسے شریر بچوں کی ہے جن کے لئے لکھنا، پڑھنا اور امتحان دینا ایک مصیبت ہے۔ چوتھی بات یہ کہ ہر غزل ایک ہی صفحے پر مکمل ہے اور پانچویں بات یہ کہ متعدد غزلیں غالب کی طرح پر کہی گئی ہیں۔ ویسے کتاب میں ایک پابند حمد، ایک آزاد حمد، دو حمدیہ قطعات، ایک نعت، دو نعتیہ قطعات اور ایک دعا بھی شامل ہیں۔

نثر کے حصے میں فلیپ پر اعزاز افضل، ظہیر غازیپوری اور کرامت علی کرامت کی مختصر آراء چھپی ہیں تو اندرونِ صفحات پر انتساب، شناس نامہ اور فہرستِ مشمولات کے علاوہ خلیل مامون، علیم اللہ حالی اور راقم لکھنوی کی تقاریظ شامل ہیں جبکہ پشتِ کتاب پر فیروز عابد کی رائے بھی مندرج ہے۔

غزلوں کی زبان جیسی کہ ادبِ اطفال کے لئے سہل ہونا چاہئے، تو ہے۔ اظہار ترسیل کے مسائل سے پاک، الفاظ بہ اعتبارِ معانی آسان اور باتیں عام فہم ہیں، مثلاً:

بارش میں اب تو موج منانے کا وقت ہے پانی برس رہا ہے نہانے کا وقت ہے

نہ ممی کی جھڑکی نہ پاپا کا غصہ　　مرا لڈو کھانے کو جی چاہتا ہے
چوری کرنے کا ملا موقع جو یہ اکزام میں　　تو سمجھو کہ ڈوبتی کشتی کو ساحل مل گیا

غالب کی طرح پر چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

۱- کاش ہر دعا کرے کوئی　　(ابنِ مریم ہوا کرے کوئی)
۲- چھٹی کی اب خبر نہیں آتی　　(کوئی امید بر نہیں آتی)
۳- تو یہ ہکلا کے بولتا کیا ہے　　(یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے)

اسی طرح بعض غزلیں مومن، اقبال اور حسرت کی طرح پر اور بعض فلمی گانوں کی دُھن میں بھی ہیں جیسے:

۱- بچپنے کی یادوں کا منظر سہانا یاد ہے　　(چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے)
۲- آتا ہے یاد مجھ کو بچپن کا وہ زمانہ　　(آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ)
۳- ہم کو نانا جب نکھٹو کہہ گئے　　(دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے)

لیکن ایسی بات نہیں کہ پاشا کے بچے صرف شرارت پر آمادہ رہتے ہیں بلکہ ان کے یہاں شرافت بھی ملتی ہے، جیسے:

دنیا میں ہر کسی سے محبت کریں گے ہم　　توفیق دے خدا تو عبادت کریں گے ہم
علم کے جو بھی طلب گار نظر آتے ہیں　　ان کے چہرے گل و گلزار نظر آتے ہیں

ان خوبیوں کے ساتھ بعض اشعار سوال بھی پیدا کر دیتے ہیں جیسے سندر اور پیارا جیسے ہندی لفظوں کے درمیان واوٗ عطف کیوں جب کہ لفظ اور ہونے پر مصرع بے وزن بھی نہیں ہوتا؟ (ص: ۲۷) بندگی کو اللہ تعالیٰ پر فوقیت کیوں دی گئی؟ (ص: ۳۰) کیا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ شاعر کی بات سمجھ نہ پائے تو زمانہ کی فہم بھی ناکام ہو جائے؟ (ص: ۳۹)، وہ کیا چیز ہے جسے شاعر جب نہ گھٹا پاتا ہے نہ بڑھا تو اُس کی طبیعت میں الجھن پیدا ہونے لگتی ہے؟ (ص: ۵۵)

خیال کے ساتھ زبان کے معاملے میں بھی کہیں کہیں گستاخی پرسش پیدا ہوتی ہے کہ ''ہم'' کے ساتھ ''یاد ہے'' ٹھیک ہوگا (ص: ۳۴) ''یہ الماری کا تالا'' نہ کہ اس الماری کا تالا (ص: ۳۸)۔ ثانی کی مصرعۂ اولیٰ میں ''ہیں'' اور ثانی میں ''ہے'' کہنا شتر گربہ نہیں؟ (ص: ۴۴)، کیا ''ہیں'' کی رعایت سے ''جس'' کی جگہ جن اور ''اس'' کی جگہ ان کا محل نہیں تھا (ص: ۴۵)، گڈی کو اُڑانا فصیح ہے؟ (ص: ۴۵)، اندھا کوئی ہمیں بھلا راہِ وفا دکھائیں کیوں'' میں کیا قافیہ کی پابندی زبان کی پابندی پر مقدم ہے؟ (ص: ۶۲)، اسی طرح ''چلو ہم نصیبن بوا کے چلیں گھر + بوا کو ستانے کو جی چاہتا ہے'' کیا یہاں ''بوا کو'' کی جگہ ''انہیں پھر'' لکھ کر ''بوا'' اور ''کو'' کی تکرار سے بچا نہیں جا سکتا تھا؟ (ص: ۶۰) اور پھر آخر میں درج ذیل مصرعوں کے افاعیل بھی جاننے کی خواہش ہے:

ع اک نسخۂ کیمیا ہے صلی علیٰ محمدؐ　ع جب کبھی فرصت ملے بچوں کو اکٹھا کر کے　ع امتحان گاہ میں ہے ٹیچر کی نظر کتنی تیز　ع کام جو کرتے ہیں غلط انہیں ہم گھر بلائیں کیوں　ع گل کے ہمراہ یہ، جو سب خار نظر آتے ہیں

کیا ہی بہتر ہوتا کہ پروف ریڈنگ خوب دھیان سے کی جاتی تا کہ ایسے بے تکے سوالات پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

● نامِ کتاب: جاوید نہال: حیات وادبی خدمات (مونوگراف) مصنف: ڈاکٹر محمد منصور عالم اشاعت: ۲۰۱۵ء
ص: ۱۴۴ قیمت: ۹۶ روپے ناشر: مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ مبصر: اشرف احمد جعفری، کولکاتا

مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے جب سے مونوگراف کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے، بہت ساری کتابیں قارئین کی معلومات میں اضافے کا سبب بن رہی ہیں۔ ایسے ہی مونوگرافوں میں جاوید نہال صاحب کا مونوگراف بھی شامل ہے جسے ڈاکٹر محمد منصور عالم نے قلم بند کیا ہے۔

جاوید نہال کی شخصیت صحیح معنوں میں ہشت پہلو تھی یعنی معلم، افسانہ نگار، خاکہ نگار، ناقد، محقق، صحافی، مترجم اور بچوں کے ادیب۔ مصنف نے مرحوم کے ہر پہلو کا جائزہ بڑی دلجمعی کے ساتھ تفصیل سے لیا ہے اگرچہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ مونوگراف لکھ رہے ہیں لہٰذا اختصار واجب ہے تاہم مرحوم سے متعلق اتنی ساری باتیں رقم کردی ہیں کہ نہال صاحب کا تقریباً مکمل خاکہ سامنے آجاتا ہے اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ صاحب کتاب نے وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دیا ہے بلکہ مرحوم کے تعلق سے ذاتی مشاہدات کی بنیاد پر ایسی باتیں بھی قلم بند کردی ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتیں حالانکہ اس سے پہلے ماہنامہ سمط کلکتہ اور پندرہ روزہ مغربی بنگال کلکتہ کا جاوید نہال نمبر اور سالانہ مجلّہ پرواز کلکتہ کا گوشہ بھی منصۂ شہود پر آچکا ہے لیکن مذکورہ کتاب چوں کہ ساری مطبوعات کا نچوڑ ہے لہٰذا ان سے بہتر ہے۔ پھر بھی کتاب میں بعض باتیں ایسی درآئی ہیں کہ جن سے بے اعتنائی نہیں برتی جاسکتی۔ مثلاً خاندانی پس منظر میں جاوید نہال کے آبائی وطن کا ذکر نہیں نہ ہی ان کے والد کے ذریعۂ معاش کا تذکرہ ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ پیدائش بھی نہیں اور نہ ہی یہ واضح کیا گیا ہے کہ اوگانواں کہاں واقع ہے۔ نہال صاحب ۱۹۳۸ء کے دوران کم عمری میں اپنے والد کے ساتھ کلکتہ چلے آئے لیکن تاریخ پیدائش ندارد ہونے کے سبب اس کم عمری کی وضاحت نہیں ہوسکی۔ صفحہ ۱۳ پر لکھا ہے:

''بنگال کا اردو ادب (۱۹۰۰ء تا ۱۸۹۹ء) گویا صرف ایک سال کا ذکر۔''

صفحہ ۱۵ پر جہاں جاوید نہال کی اہلیہ کا تذکرہ ہے وہاں ہر جگہ نہ جانے کیوں ان کیلئے صیغۂ ماضی بعید کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً ''صوم وصلوٰۃ کی پابند خاتون تھیں۔'' ''ملنسار واقع ہوئی تھیں'' جبکہ وہ آج بھی بقیدِ حیات ہیں۔

صفحہ ۲۳ پر نکاتِ ۲ کی ضمنی سرخی ''انیسویں صدی میں بنگال کا ادب'' مندرج ہے جس میں اگرچہ ادب سے پہلے اردو کا لفظ سہواً چھوٹ گیا ہے تاہم جب بھی بنگال میں مذکورہ زمانے کے اردو ادب کا ذکر ہوگا تو فورٹ ولیم کالج کا ذکر ناگزیر ہوگا لہٰذا مصنف کا یہ کہنا کہ ''اس سے قبل اس موضوع سے متعلق اردو میں کوئی کام نہیں ہوا تھا'' صفحہ ۲۳ یا صفحہ ۵۸ پر صاف لفظوں میں یہ لکھنا کہ ''پہلی بار کسی نے بنگال کے اردو نثر نگاروں بالخصوص فورٹ ولیم کالج کی ادبی اور نثری خدمات پر قلم اٹھایا تھا۔'' تو سید محمد کی 'ارباب نثر اردو' اور عتیق صدیقی کی 'گلکرسٹ اور اس کا عہد' جیسی کتابوں کی یاد دلا کر کچھ سوچنے پر مجبور کردیتا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۵۸ ہی پر جب یہ عبارت نظر آتی ہے کہ ''یہ بنگال میں تحقیق کی خشتِ اول ثابت ہوئی'' تو حکیم حبیب الرحمٰن کی ثلاثۂ غسالہ، سید اقبال عظیم کی مشرقی بنگال میں اردو اور وفا راشدی کی بنگال میں اردو کی تاریخی حیثیت سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہوجاتی ہے۔ مصنف کا صرف اتنا کہہ دینا کہ ''یہ کتابیں (جن میں

اول الذکر دو کتابوں کا حوالہ نہیں)'' جاوید نہال کی کتاب سے کم درجہ رکھتی ہیں۔'' ص:۵۹۔ کچھ مناسب نہیں کیونکہ خود نہال صاحب کی کتاب کے تعلق سے عبیدہ بیگم نے تو بہت بعد میں ان کی تحقیقی لغزشیں واضح کیں، ان سے کہیں پہلے ماہنامہ ''آیات'' کلکتہ کے دوسرے شمارے میں انیس رفیع نے اس کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ ص:۷۰ پر لکھتے ہیں:

> ''بنگال میں بچوں کے لئے لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنوائی جا سکتی ہے۔ علقمہ شبلی، مشتاق اعظمی، شفیع نشاط، حشمت کمال پاشا اور جاوید نہال کے علاوہ کوئی نام ذہن میں نہیں آتا جس نے نہایت دلچسپی سے اس ادب کی طرف توجہ فرمائی ہو۔''

حالانکہ عاصم شہواز شبلی کی کتاب ''مغربی بنگال میں بچوں کا اردو ادب'' آج بھی مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے سیل ڈپو میں بہ آسانی دستیاب ہے۔ جس کی محض فہرست ہی پر ایک نظر ڈال لیتے تو یہ دعویٰ کرنے سے بچ جاتے۔ دوسری بات یہ کہ شفیع نشاط صحافی تھے۔ شاعر کا نام شفیع تمنا ہے۔ ص:۳۴ پر لکھتے ہیں: ''ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'پھول رانی' منظر عام پر آیا ہے جو انہیں بہترین افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرنے کے لئے کافی ہے۔'' لیکن ٹھیک دوسرے ہی صفحہ یعنی ۳۵ پر لکھتے ہیں ''افسانے اس پائے کے نہ تھے کہ ان کا مجموعہ تیار کیا جائے'' اور دلیل میں انیس رفیع کی رائے کا حوالہ بھی دے دیتے ہیں کہ یہ افسانے ''لذتِ کام و دہن کے لئے تو خوب تھے مگر حسن اور جمالیاتی شان سے محروم۔'' ص:۳۶

صفحہ ۳۸ پر نقشِ جاوید کا جائزہ ہے۔ جس میں اول تو کتاب کی تاریخ اشاعت ندارد ہے، دوم اسے نہال صاحب کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ لکھا ہے جبکہ یہ تیسرا ہے۔ صفحہ ۳۵ پر افسانہ الگ الگ راستے کی جائے اشاعت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں ''اجالا سنڈے ایڈیشن ۱۹۴۸ء'' دلچسپ بات یہ ہے کہ ہفت روزہ اجالا ماضی میں پیر کے دن شائع ہوتا تھا۔ افسانے کا صحیح حوالہ یوں ہے: ''اجالا ویکلی سوموار ۱۹/اپریل ۱۹۴۸ء''۔ اسی صفحے پر لکھتے ہیں ''جاوید نہال کی افسانہ نگاری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔'' حالانکہ ظفر اوگانوی کی طرح جاوید نہال بھی جدید طرز کے علامتی افسانوں کے بعد جب بیانیہ کی طرف لوٹ آئے تو ان کی افسانہ نگاری کا گویا تیسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔

کتاب میں زبان سے متعلق بھی کہیں کہیں کچھ لغزشیں ہو گئی ہیں مثلاً مضامین بھی لکھی گئی ص:۲۴، انتخاب نظر جاوید نہال پر پڑی ص:۲۷، برسہا برس کے مشق ص:۴۱، اسی طرح ص:۴۸ پر لکھتے ہیں ''جن شخصیتوں پر موصوف نے قلم اٹھایا ہے.... الخ اور بطور مثال 'بنگال میں غزل کا مزاج' لکھتے ہیں یعنی ''شخصیتوں'' کی جگہ موضوعات لکھنے کی ضرورت تھی۔ آخر میں کتابیات کی فہرست پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اول تو بنیادی کتابوں کے نام پہلے ہوتے پھر امدادی کتابوں کے۔ دوم ان کتابوں کے نہ تو سال طباعت درج ہیں نہ جائے اشاعت۔ یہی حال رسالوں کے سلسلے میں بھی ہے، نہ تاریخ اشاعت نہ مدیروں کے نام۔ یہاں تک کہ اس بات کی وضاحت بھی نہیں ملتی کہ آیا رسالہ ماہنامہ ہے، سہ ماہی ہے یا کچھ اور۔ اسی طرح فہرست میں بحیثیت راقم ایک نام رچرڈ ڈاینگک بھی نظر آتا ہے جس کی کتاب ہے 'ادبی تحقیق کا فن'، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رائٹر نے کتاب اردو میں لکھی ہے یا کسی اور زبان میں۔ بالفرض کتاب ترجمہ ہے تو اس کا اصل نام کیا ہے اور مترجم کون ہے۔ بہر کیف کتاب اچھی ہے۔

• نامِ کتاب: نگارشاتِ محفوظ مصنف: سید محفوظ عالم اشاعت: ۲۰۱۸ء قیمت: ۹۰ روپے
ناشر: خوشنما اردو آرٹ، کلکتہ-۱۴ مبصر: اشرف احمد جعفری، کولکاتا

سیّد محفوظ عالم، کریم سٹی کالج میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں، اس لحاظ سے فی الحال ان کی اقامت جمشید پور میں ہے تاہم اس سے قبل ان کی زندگی کلکتے کی مختلف فضاؤں میں بسر ہوتی رہی ہے چنانچہ انہوں نے یہاں رہ کر جن ادبی، سماجی اور تعلیمی شخصیات کو جاننے اور پہچاننے کے ردِعمل کے تحت ذاتی طور پر اپنے ذہن میں جو تاثرات مرتب کئے ہیں انہیں اپنے مضامین میں محفوظ کردیا ہے۔

کتاب میں مصنف کی اپنی بات کے علاوہ پروفیسر عبدالمنان، نورالہدیٰ اور معتمدِ بزمِ نثار کی تقاریظ کے ساتھ خود مصنف کے کل ۱۶؍ادبی مضامین شامل ہیں جن کا تعلق بجز شائق مظفر پوری، قاضی نذرالاسلام، احمد الیاس، محبّ الرحمٰن کوثر اور ساحر لدھیانوی کے باقی سب بنگال کے ادباء و شعراء، صحافی اور سماجی کارکنان شامل ہیں۔ ان مضامین کی صرف ادب ہی نہیں، تاریخی اہمیت بھی اس بنا پر بیان کی جاسکتی ہے کہ ان میں سے بعض ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن پر اس سے قبل نہ تو کسی نے کچھ لکھا ہے اور نہ ہی مزید کی امید ہے مثلاً حسن عرفی اور عطاءالرحمٰن وغیرہ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ حضرات اس لائق ہی نہیں کہ ان پر کچھ لکھا جائے بلکہ لوگوں نے دراصل ان کی طرف اس طرح توجہ ہی نہیں کی جس طرح مصنف نے مبذول کر کے اپنا فریضہ ادا کیا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اس کتاب میں موجود اہلِ قلم کے تعلق سے کچھ لکھنا چاہے گا تو اسے ان لوگوں کے کارناموں کے علاوہ بالخصوص شخصیت کے ضمن میں بھی اچھا خاصا مواد حاصل ہو جائے گا کیوں کہ کسی کی شخصیت پر فرسٹ ہینڈ نالج کی صورت میں وہی خامہ فرسائی کرسکتا ہے جس نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، پرکھا اور جانا ہو۔ اس سلسلے میں مولانا اسحاق، اقبال کرشن، سید منیر نیازی اور محبّ الرحمٰن کوثر پر مضامین بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ کتاب میں موجود مواد کے ساتھ مصنف کی زبان اور طرزِ بیان بھی قابلِ تعریف ہے کہ کہیں بھی نہ صرف ترسیل کا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے نہ ہی ادبی لحاظ سے بدمزگی پیدا ہوتی ہے۔ مزید برآں خود مصنف کو سمجھنے کے لئے کتاب کی تقاریظ کافی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

مختصر یہ کہ کتاب خاص طور پر ان لوگوں کو یقیناً بہت دلچسپ لگے گی جنہیں کتاب کی مذکورہ شخصیات سے ذرا بھی واقفیت ہوگی اسی لئے کم سے کم ایسے لوگوں کو تو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔

• نامِ کتاب: مظفر حیدری (مونوگراف) مصنف: رفیق انجم اشاعت: ۲۰۱۶ء ص: ۱۶۴
قیمت: ۹۴ روپے ناشر: مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا-۱۶ مبصر: اشرف احمد جعفری، کولکاتا

مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے 'ساہتیہ اکاڈمی کی روش پر چلتے ہوئے جب سے مختلف ادبی شخصیات پر مونوگراف شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے تو اس اسکیم کے تحت بنگال کے نامور شعراء و ادباء پر متعدد کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مظفر حیدری پر مونوگراف بھی ہے۔ یہ کتاب مشہور اہلِ قلم رفیق انجم نے لکھی ہے۔

کتاب کے پہلے حصے "مختصر حالاتِ زندگی" کے ذیل میں مصنف نے اگرچہ مظفر حیدری کا واحد شعری مجموعہ

'جام جم' میں موجود جمیل مظہری، پرویز شاہدی، کرشن چندر اور سعید اکبرآبادی کی تقاریظ شامل کتاب کردی ہیں لیکن دوسرے حصے 'فن' کے تحت خود شاعر کو بحیثیت غزل گو، نظم نگار، رباعی گو اور نوحہ نگار کے طور پر پیش کیا ہے۔

مظہر حیدری کا ادبی مقام، کم سے کم بنگال کی سطح پر تو اس لحاظ سے مسلم ہے کہ یہاں کا ادبی مورخ انہیں نظر انداز کر ہی نہیں سکتا، تاہم بجز ناظر الحسین کے باقاعدہ طور پر کسی نے ان پر جم کر کوئی مضمون نہیں لکھا۔ اس پس منظر کے پیش نظر رفیق انجم کا یہ مونوگراف مظہر حیدری پر اولین کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی تیاری میں انہوں نے شاعر کے گھر والوں سے بہ نفس نفیس مل کر اس کی حیات و شخصیت کے تعلق سے جتنی باتیں یکجا کردی ہیں وہ فی الحال اور کہیں نہیں ملتیں۔ اسی طرح شاعر کی شاعری کے چاروں خاص ابعاد، یعنی غزل، نظم، رباعی اور نوحہ نگاری کا بھی جس طرح جائزہ اور تجزیہ پیش کیا ہے وہ ان کی تنقیدی بصیرت پر دال ہے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ:

> ''مظہر حیدری نے کسی کا لہجہ قبول نہیں کیا بلکہ اپنی حسیات سے خلق کردہ کائنات میں اپنے محسوسات کو بہت ہی مہارت سے الفاظ کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ارتقاء کے قائل تھے لیکن وہ صحت مند روایات کے منکر بھی نہیں تھے۔'' (ص:۲۴)

شاعر کے جملہ مزاج شعری کا احاطہ کرنے کے لئے کافی ہے تاہم شاعر کی نظم نگاری کے متعلق مصنف کا یہ کہنا بھی قابلِ ذکر ہے کہ:

> ''ان کی نظمیہ شاعری کے مطالعہ سے یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ نہ صرف انہیں اپنے سماج میں پھیلے ہوئے مختلف طرز کے مظالم کا ادراک تھا بلکہ عصری آگہی بھی ان کے کلام کی ایک ممتاز صنف کے طور پر قائم رہی ہے۔'' (ص:۳۰)

اسی طرح رباعیات اور نوحوں کے ضمن میں بھی ان کا یہ خیال ایک مشترکہ حیثیت رکھتا ہے کہ شاعر نے ''اپنی ذات کے نہاں خانے سے اظہار کا ایسا راستہ دکھایا کہ اس کی اپنی الگ اہمیت اور معنویت پیدا ہوگئی۔''

آخر میں مصنف نے نمونۂ کلام کے طور پر شاعر کی ہر صنفِ سخن کی بھرپور مثالیں پیش کر کے کتاب کو کارآمد اور لائق مطالعہ بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی بھی بجا طور پر شکریہ کی مستحق ہے کہ اس کی سعیٔ جمیل ہی کے سبب اتنی مفید کتاب منظر عام پر آسکی۔

....

● نام رسالہ: دستک (ششماہی) مدیر: ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی ناشر: شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونی ورسٹی، وارانسی

مبصر: ابرار احمد اجراوی (مدھوبنی، بہار موبائل: 8651708079)

بنارس ہندو یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو ہندستان کے جامعاتی شعبہائے اردو میں اپنی ایک علاحدہ شناخت رکھتا ہے۔ یونی ورسٹی کے ابتدائی ایام میں عربی، فارسی اور اردو تینوں مشرقی زبانوں کا ایک ہی مشترکہ شعبہ تھا، مگر بعد میں تینوں شعبوں کو مستقل کر دیا گیا اور یہ تینوں الگ الگ راہوں پر اپنا سفر طے کرنے لگے۔ اردو کو بھی ۱۹۷۳ء میں ایک شعبہ کی حیثیت سے اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع ملا۔ یہ اس شعبہ کے لیے باعث رشک و فخر ہے کہ اردو شعر و ادب

کے بڑے بڑے نام اس سے منسلک رہے۔ فائز بنارسی، مولوی مہیش پرساد، مسیح الزماں نصرت، امرت لال عشرت، حکم چند نیر، حنیف نقوی اور ظفر احمد صدیقی جیسی معتبر و مستند شخصیات اس شعبہ کی زلفوں کو آراستہ کر چکی ہیں۔ یہاں تعلیمی اور نصابی سرگرمیاں تو سدا جاری رہیں، اساتذہ اور صدور شعبہ بھی آتے اور اپنی مدت کار مکمل کر کے جاتے رہے، مگر شعبہ کا کوئی تحریری ترجمان منصۂ شہود پر نہیں آسکا۔ جب سے صحن شعبہ میں مجاہد اردو ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے قدم پڑے ہیں، یہ ترقی اور شہرت کے بام عروج پر پہنچتا جا رہا ہے۔ شعبہ کے زیر اہتمام سیمینار، کانفرنس، ادبی جلسوں اور بحث و مباحثہ کا انعقاد اس کا ثبوت ہیں۔ ششماہی رسالہ 'دستک' جو ایک ریسرچ جرنل ہے، وہ بھی آفاقی صاحب، ان کے معاونین اور اساتذۂ شعبہ کی جد و جہد کا ثمرہ ہے۔ گرچہ پہلا شمارہ نقش اول ہے، مگر اپنے مواد و مشمولات اور حسن ترتیب کی وجہ سے ہمیں خاصا متاثر کرتا ہے اور ادبی حلقوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتا ہے۔

عام طور پر کسی بھی رسالہ یا مجلّہ کے پہلے شمارے میں جو پیغامات اور تبریکی کلمات پر مبنی رسمی تحریریں ہوتی ہیں، اس سے یہ رسالہ بھی معری نہیں ہے۔ نائب صدر جمہوریہ ہند سے لے کر یونیورسٹی کے رئیس الجامعہ اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس تک کے انگریزی اور ہندی رسم الخط والے پیغامات سے یہ رسالہ بھی مزین ہے۔ پیغامات اور اداریہ کے بعد رسالہ کے مشمولات کا نمبر آتا ہے۔ جس کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ تحقیق کے عنوان سے ہے، جس میں نئے پرانے مضامین و مقالات کو جگہ دی گئی ہے۔ اور یہ سب مبادیات تحقیق و اصول تحقیق اور جامعات میں مفید طریق تحقیق کے مسائل و منہاج پر مرکوز و منحصر ہیں۔ کچھ اصول تحقیق کے بارے میں (رشید حسن خاں)، قدیم دواوین کی ترتیب کے مسائل (تنویر احمد علوی)، ادبی تحقیق اور حقائق (خلیق انجم)، جامعاتی تحقیق - مراحل اور طریق کار (حنیف نقوی)، اردو تحقیق کے مسائل (فضل حق قریشی)، اردو پر فارسی کے اثرات (پروفیسر ظفر احمد صدیقی)، داستان امیر حمزہ میں عربی زبان سے استفادے کی بعض صورتیں (پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی)، رومی اور اقبال (ڈاکٹر مرزا عبدالباقی بیگ) اور فسانۂ آزاد کے فارسی مصادر (ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی) جیسے وقیع اور کارآمد مضامین سے یہ گوشہ منور ہے۔

دوسرا حصہ تنقید کے عنوان سے موسوم ہے۔ اس حصہ میں بھی قدیم و جدید قلم کاروں کی کہکشاں تیار کی گئی ہے اور نظری و عملی تنقید دونوں قسم کی تحریریں شامل ہیں۔ اس حصہ میں گوشۂ تحقیق کی بہ نسبت مضامین کم ہیں، مگر جو کچھ ہے وہ منتخب اور نادر الوجود ہے۔ عملی تنقید کیا ہے؟ (پروفیسر ابوذر عثمانی)، پاپولر کلچر اور ادب (پروفیسر عتیق اللہ)، اردو ادب میں ہیرو کا تصور (ڈاکٹر محمد اشتیاق) اور غیاث احمد گدی کے دو کردار اساس افسانے (جمشید قمر) جیسے مضامین اس حصہ کی زینت بنے ہیں۔ تیسرا حصہ 'شعبۂ اردو بنارس ہندو یونی ورسٹی: تاریخ، تہذیب اور ادبی روایت' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ عنوان سے ہی اس حصہ کے حدود و قیود کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس حصہ میں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ اساتذہ کی نگارشات شامل ہیں۔ مدیر رسالہ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، امرت لال عشرت، عبدالسمیع، ڈاکٹر راجیش مشرا، ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر قاسم انصاری، ڈاکٹر مشرف علی اور رشی کمار کی مختلف و متنوع تحریروں میں شعبہ کا ماضی و حال منعکس ہوتا ہے۔ ان تحریروں کا محور و مرکز شعبہ سے وابستہ اہم افراد و اشخاص کا تعارف، شعبہ کی ادبی اور علمی خدمات اور شعبہ کی موجودہ ادبی سرگرمیاں ہیں۔

مجموعی طور پر یہ شمارہ ایک ریسرچ جرنل کی تمام خصوصیات وامتیازات کا حامل ہے اور ایک خاص سلیقہ سے انھی تحریروں کو نمایاں طور پر شامل کیا گیا ہے، جن سے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کو آئے دن علم وتحقیق کی دنیا میں رابطہ اور واسطہ پڑتا ہے۔ تحقیق وتنقید کے گوشے میں شامل تمام تحریریں اور مضامین ومقالات ہمارے لیے تحقیق وتدوین کی وسیع کائنات میں گائیڈ اور مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ یہ مضامین ہمیں رسالہ کے جہان پرواز کا بھی پتہ دیتا ہے اور اس کی روشنی میں رسالہ کی ترجیحات واولیات کا چہرہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مجلس ادارت اور قومی وبین الاقوامی مجلس مشاورت میں ایسے افراد شامل ہیں، جو علم وادب کی دنیا میں اتھارٹی کی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان مثل آفتاب وماہتاب شخصیتوں کی کسی رسالے میں شمولیت ہی اس کی کامیابی اور مقبولیت کی ضامن ہے۔ ہر رسالہ کے اجرا واشاعت کا مقصد اور منشور ہوتا ہے، اس رسالے کے کیا عزائم ومقاصد ہیں، مدیر کا جو اداریہ ہے، اس کا یہ اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''دستک ایک جامعاتی اور اکادمیائی ادبی رسالہ کے طور پر وجود میں آیا ہے۔ اس کا واضح مقصد نئی نسلوں میں اردو شعر وادب سے دلچسپی اور اعلیٰ مذاق پیدا کرنا، کلاسیکی شعر وادب کے پہلو بہ پہلو معاصر ادبی رویوں، ادب کے بدلتے تقاضوں، بالخصوص یونی ورسٹی اور اعلیٰ درجات کے طلبا میں تحقیق وتنقید اور تخلیق سے شغف، تحقیق کی مبادیات، مسائل اور طریقہ کار سے واقف کرانا ہماری ترجیحات میں شامل ہیں۔''

بنارس ہندو یونی ورسٹی کا سن قیام ۱۹۱۶ء ہے، اس حساب سے ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزرنے کے بعد یہاں کے شعبۂ اردو سے یہ رسالہ نکل رہا ہے۔ گویا یہ یونی ورسٹی کی صد سالہ تقاریب کی ایک یادگار بھی ہے۔ منتظم ومدیر میں ہمت مردانہ نہ ہو تو رسالوں کی حیات وممات کا عرصہ کافی مختصر ہو جاتا ہے، مگر مدیر محترم کی علمی وادبی سرگرمیوں سے اردو کا حلقہ واقف ہے، اس لیے امید ہے کہ یہ رسالہ بھی طویل العمر ہوگا اور رسالوں کے ذخیرہ میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگا اور پابندی سے شائع ہوتا رہے گا۔ اور اپنے تحقیقی وتنقیدی مزاج ومنہاج اور معیار سے کوئی سمجھوتہ بھی نہیں کرے گا۔

....

- **نام کتاب: اردو ناول کا ارتقا: نذیر احمد سے ترقی پسند تحریک تک مؤلف: ڈاکٹر عالمگیر شبنم ص: ۲۰۸**
  قیمت: ۳۰۰؍ روپے ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی مبصر: ابرار احمد اجراوی (مدھوبنی، بہار)

ڈاکٹر عالمگیر شبنم ایک متحرک وفعال اور سرگرم شخصیت کا نام ہے۔ گرم دم جستجو ان کی شناخت ہے۔ انھیں درس وتدریس کے ساتھ انتظام وانصرام کا بھی ملکہ حاصل ہے، مگر وہ تنقید وتحقیق کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ وہ قدیم طرز وفکر کے مدرسہ ومکتب کے پروردہ ہیں، مگر انھوں نے اپنے قدموں میں کوئی ایسی آہنی زنجیر نہیں ڈالی ہے، جو انھیں دوسری سمتوں سے آنے والے باد بہاری کے خوشبودار جھونکوں سے استفادہ اور اپنے مشام جاں کو معطر کرنے کی راہ روک دے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تعمیری اخلاقی موضوعات کے حامل افسانے بھی لکھتے ہیں اور موقع بموقع تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی، کبھی تبصرہ بھی کر لیتے ہیں، ان کی اسی تحریری مشاقی کا ثبوت

زیر نظر کتاب ''اردو ناول کا ارتقا: نذیر احمد سے ترقی پسند تحریک تک'' ہے۔اس کتاب میں انھوں نے ایک مخصوص عہد میں تخلیق پذیر اردو ناولوں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں مؤلف کا پیش لفظ ہے۔اس کے بعد ان کے استاد پروفیسر رئیس انور اور ڈاکٹر مشتاق احمد کی مختصر تقریظی رائے شامل ہے۔سید محمود احمد کریمی نے بھی بزبان انگریزی اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔پروفیسر عبدالمنان طرزی اور رفیق انجم کی منظومات بھی شامل ہیں، مگر ان کا تعلق اس کتاب سے نہیں، مصنف کی دوسری حصولیابی سے ہے۔ویسے موضوع سے متعلق کتاب مندرجہ ذیل عناوین پر مبنی ہے۔ناول کا فن، ڈپٹی نذیر احمد، رشیدۃ النساء، مولانا حالی، شاد عظیم آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، محمد علی طیب، سجاد حسین، راشد الخیری، مرزا محمد سعید، علی عباس حسینی، مرزا عباس حسین ہوش، مرزا ہادی رسوا، پریم چند، ترقی پسند تحریک، سجاد ظہیر، عزیز احمد، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور۔اخیر میں خلاصۃ الکتاب بھی ہے اور 'پھر' میں اور میرا خانوادہ' اور چند خانگی تصویریں۔

ان عناوین سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مؤلف نے ایک قدیم موضوع و مضمون کو نئے تاب و تاب اور عصری حسیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔کوئی موضوع فی نفسہ قدیم یا جدید نہیں ہوتا، اس کا انداز پیش کش اور طرز تحریر اس کو قدیم یا جدید کے خانوں میں منقسم کرتا ہے۔ہر عہد کی ضروریات اور تقاضوں کی حد بندی ایک بشری تقاضا اور فطری جبلت ہے۔عالمگیر شبنم صاحب نے اسی جذبے سے سرشار ہو کر یہ کتاب لکھی ہے، اردو ناول کے زمانۂ سنگ بنیاد اور عرصۂ ترقی پسند تحریک کے درمیان لگ بھگ سو سال کی مدت ہے، سو سال کے دورانیے اور اس میں تخلیق شدہ تمام ناولوں کا احاطہ کرنا ایک بہت مشکل کام ہے اور ناموں کے ہجوم میں اگر کچھ تسامح ہو جائے تو یہ بعید نہیں۔اس کا اعتراف مؤلف کو بھی ہے اور اسی لیے تقریظ لکھتے ہوئے ناقد و ادیب ڈاکٹر مشتاق احمد نے لکھا ہے:

> ''اگرچہ یہ موضوع پیش پا افتادہ ہے کہ اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن ہر ایک صاحب فکر و نظر کا اپنا ایک الگ زاویہ نگاہ ہوتا ہے اور وہ اپنے طور پر کسی فن کے متعلق اپنی انفرادی رائے رکھتا ہے۔اس کتاب کے مشمولات کے مطالعہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر عالمگیر شبنم نے اردو ناول نگاری کے بحر ذخار میں غوطہ زن ہو کر گوہر آبدار حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔البتہ حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی اور قرۃ العین حیدر کے فکر و فن سے گریز کھٹکتی ہے۔ممکن ہے کہ مصنف اس کمی کا ازالہ دوسرے ایڈیشن میں [یا] دوسری جلد میں کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔''

فلیپ پر شاعر و ناقد اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم کی مختصر مگر باوزن رائے پر مشتمل تحریر ثبت ہے، جس میں انھوں نے مصنف کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے لیے ادبی سرمایہ اور مشعل راہ ثابت ہوگا:

> ''موضوع اگرچہ فرسودہ اس معنی میں ہے کہ ڈاکٹر موصوف کے بیان کردہ مضامین کے سبھی ناول اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں لیکن انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ نئے احساس اور نئی تکنیک کے تقاضے کے

تحت ان سبھی ناولوں میں تازہ کاری موجود ہے جو حوالہ جاتی ہے اور جن میں تجربات کے نئے لوازمات کی عکاسی ملتی ہے۔"

کتاب کی پشت پر ہندستان کے مشہور ادیب و ناقد اور ہمہ جہت فن کار پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے مدحیہ کلمات درج ہیں، جس میں انھوں نے اپنے منفرد انداز میں اس کتاب کا استقبال کیا ہے اور مؤلف کی خدمت میں تہنیت و تبریک پیش کی ہے:

"ایک لمبے عہد کی حیات نو کی معنوی اکائی کو جس طرح ڈاکٹر عالمگیر شبنم نے تلاش کیا ہے اس میں فرسودگی اور افتادگی اور رست روی کے ساتھ آزادی کی خوشی، زندگی کی تیز رفتاری، سیاست و مذہب کی کشمکش، سماج کی زبوں حالی، اخلاق و آداب اور رسم و روایات کی جکڑ بندی شامل ہیں۔ ساتھ ہی زمانے کے تغیرات کو یقین و اعتماد کو موصوف نے تنقیدی بصیرت سے اجاگر کر کے فطری پن کے ساتھ واضح کیا ہے۔"

مؤلف نے کہیں طوالت تو کہیں اختصار کے ساتھ، سادہ و شگفتہ زبان میں اپنے موضوع کا محاکمہ کیا ہے۔ ان کا انداز نقد تاثراتی ہے۔ وہ نہ جارح ہوتے ہیں، نہ کہیں حد سے زیادہ روادار۔ بلکہ تنقیدی توازن و اعتدال کا دامن تھامے رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دعوی کے استدلال میں براہین و دلائل کے طور پر ان تنقید نگاروں کے اقتباس اور رائے پیش کی ہے، جو ناول کی تنقید کے باب میں اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ان کی ایک کتاب "ابتدائی ناولوں میں اصلاح کی لہر" شائع ہو کر ادبی حلقوں میں سرخ رو ہو چکی ہے۔ اور ابھی کئی کتابیں اور پروجیکٹ ان کے زیر غور ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب بھی اپنے موضوع و مشمول کی معنویت کی وجہ سے قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں کام یاب ہوگی اور طلبہ و اسکالرس حسب صلاحیت اخذ و استفادہ کریں گے۔

....

● **نام کتاب: ۱۰۱ خواتین تنقید نگار (اکیسویں صدی اور ہندوستان کے حوالے سے) مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اشاعت: ۲۰۱۹ء قیمت: ۳۵۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی (مدھوبنی)**

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ادب کی لیجنڈری شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں ہفت اقلیم کو عبور کرلیا ہے۔ ادب و شاعری کی دنیا کے وہ سند باد ہیں، شعر گوئی ہو کہ نثر نگاری، تنقید ہو کہ تحقیق ہر میدان میں ان کے تالیفی نقوش ثبت ہیں۔ ادب میں انھوں نے اپنی شناخت متعدد جہتوں سے قائم کی ہے، شاعر، ناقد، ناول نگار، افسانہ نویس، مکتوب نگار، محقق و مدون اور مرتب ان کی مسلم ادبی جہتیں ہیں۔ وہ جہان ادب میں فرسودہ راہوں پر بھی نہیں چلتے، اپنی ادبی خانقاہ میں انہماک و انشغال کے ساتھ کتب بینی میں مصروف رہتے ہیں، رسائل کی ورق گردانی کرتے اور زبان و ادب کی نئی راہوں اور دشاؤں کا پتہ نشان لگاتے رہتے ہیں۔ وہ ہر روز نئے نئے خاکوں کو تصور کی دنیا سے حقیقت کا روپ بخشتے ہیں اور اپنی بصیرت و طبیعت سے اس میں رنگ بھرتے رہتے ہیں۔

اکیسویں صدی انقلاب کی صدی ہے، اس صدی میں ٹکنالوجی کا سکہ چلتا ہے، تخلیق کے ساتھ تنقیدی اجتہاد کے امکانات بھی روشن ہوتے رہتے ہیں۔ تنقید میں نو واردوں کا اتنا انہماک ہے کہ رواں صدی میں تنقید بھی ایک نثری

صنف کے طور پر متعارف ہو رہی ہے، مگر تنقید کے ساتھ ذرا انصاف نہیں ہوا ہے، ہماری روایت پسندی اور تساہلی و کسل مندی کی وجہ سے یہ اب تک حالی وشبلی اور آزاد کی قدیم روش سے باہر قدم نکال نہیں سکی ہے۔ اس وقت جو تنقید لکھی جارہی ہے، اس میں یک رخی ہے، ثقالت ونقاہت ہے اور وہ اکابر تنقید کے طویل و مدید اقتباسات سے گراں بار ہوتی ہے۔ اس کا اپنا کوئی چہرہ نہیں ہے۔ تنقید میں نئے گوشوں کی گرد صاف کرنا، نئی بیرونی ہواؤں کا استقبال کرنا اور اس کو تحریر کے قالب میں ڈھال کر باذوق قارئین کے ذہنوں میں اتارنا یہ الگ کام ہے، جو محنت وریاضت کا متقاضی ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی ان ہی مصنفین و مؤلفین کے زمرے میں آتے ہیں، جو ہر دم نئے موضوعات و مضامین کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ مرد اساس معاشرے میں خواتین تنقید نگاروں کی تلاش وجستجو اور ان کے تالیفی تنقیدی کارناموں کو کھنگالنا، دل گردے کا کام ہے۔ تانیثیت کے علم بردار اور فیمنزم کے حامی بھی خواتین ناقدین و مؤلفین کے تخلیقی وتنقیدی کارناموں کی تعیین قدر سے انجانے خوف کا شکار رہتے ہیں۔

زیر نظر کتاب ''۱۰۱ خواتین تنقید نگار'' ہرگانوی صاحب کی اسی سند بادی جد و جہد کا ثمرہ ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں ہندستان کی ان خواتین ناقدین کی کتابوں کا تعارف کرایا ہے، جو ان کے تنقیدی سروکار اور ناقدانہ خدو خال سے بحث کرتی ہیں۔ کتاب کے صفحات میں جن خواتین تنقید نگاروں کی تنقیدی کاوشوں سے بحث کی گئی ہے، وہ بالترتیب یہ ہیں۔ آصفہ شاکر، آمنہ آفرین، ارجمند آرا، اسود گوہر، اشرف جہاں، افسانہ پروین، افسانہ خاتون، افشاں ملک، اقلیمہ، انجم آرا، انجم سحر، انوری بیگم، انیس النسا بیگم، بانو سرتاج، بلقیس بیگم، تسنیم فاطمہ، ثروت خان، ثریا جمال مظہری، ثریا جہاں، ثمینہ بیگم، جاویدہ حبیب، جمیلہ بی بی، حسن آرا، حلیمہ فردوس، خالدہ بیگم، خالدہ خاتون، خالدہ ناز، درخشاں زریں، درشہوار بیگ، رابعہ بصری، رابعہ مبین، رابعہ مشتاق، رابعہ نسیم، راحت سلطانہ، رضوانہ ارم، رضیہ حامد، رفیعہ شبنم عابدی، روبینہ نسرین، ریحانہ سلطانہ، زرنگار یاسمین، زیبا محمود، سلطانہ خوشنود جبیں، سمیہ تسکین، سنبل نگار، سیدہ جعفر، شاذیہ عمیر، شاہجہاں بیگم، شاہین پروین، شائستہ انجم نوری، شبانہ آفرین جاوید، شبانہ سجاد علی شیخ، شبانہ نسرین، شکیلہ بانو، شکیلہ نگار، شمشاد جلیل شمشاد، شمع افروز زیدی، شہناز رحمن، شہناز نبی، شیخ طاہرہ عبدالشکور، شیریں حسنین، شیریں زباں خانم، شیفتہ پروین، صابرہ خاتون حنا، صابرہ محسن، صوفیہ شیریں، طلعت جہاں، عائشہ سلطانہ، عرش منیر، عرش جبیں، عشرت آرا سلطانہ، عطیہ رئیس، عمرانہ خاتون، فرحانہ ظہیر، فرحت آرا کہکشاں، فرحت زیبا، فرزانہ نسیم، فریدہ انور، قمر جہاں، کوثر جمال، کوثر جہاں، کہکشاں تبسم، لیلی طونیا، مسرت جہاں، مہ جبیں، میمونہ علی چوگلے، نازنین خان، ناہیدہ سلطانہ، نجم النسا، نزہت پروین، نصرت جبیں، نصرت جہاں، نصرت فاطمہ، نکہت جہاں، نگار عظیم، نوری خاتون، نینا جوگن، وسیم بیگم، یاسمین اختر۔

مناظر عاشق ہرگانوی ذہین وفطین اور عبقری ناقد ہیں، وہ تنقیدی اسرار و ابعاد سے واقف اور اس کی راہوں کے نشیب وفراز کے شناسا ہیں، اس لیے انھوں نے ان خواتین تنقید نگاروں کی تنقیدی نگارشات کی تعیین قدر میں انہماک کے ساتھ انکشاف ذات کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے فہرست میں الفبائی ترتیب رکھ کر تقدیم وتاخیر کے مسئلہ پر ہی بند باندھ دیا ہے۔ انھوں نے تنقیدی کتابوں کے رد وقبول میں اپنی پسند وپسند کو بھی بالائے طاق رکھا ہے، ممکنہ

حد تک ہندستان کی ان تمام خواتین ناقدین کا اشاریہ تیار کر دیا ہے جو اس میدان میں اپنی موجودگی درج کرا رہی ہیں۔ نہ کسی خاتون ناقد کا قد بڑھانے کی کوشش کی ہے، نہ کسی کا قد تراشنے کی کی کوشش کی ہے اور صرف ایک ایک تنقیدی کتاب کے ارد گرد ہی اپنی بحث کا دائرہ محدود رکھا ہے۔ انھوں نے تنقید کی دنیا کے بڑے ناموں کا بھی اسی سادگی اور صفائی سے ذکر کیا ہے، جس طرح کسی ہم عصر اور جواں سال خاتون ناقد کا تذکرہ کیا ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر جیسی ذہین، معتبر اور مقتدر خاتون تنقید نگار کو بھی اس معاملے میں زیادہ اونچا نہیں اٹھایا ہے اور ان کی بھی صرف ایک کتاب سے تنقیدی مباحثہ کیا ہے، ان کے انداز نقد و بحث سے کہیں یہ مترشح نہیں ہوتا کہ وہ دنیائے تنقید کی ایک **لیجنڈری** خاتون ناقد کے تنقیدی کارنامے پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں بھی عدل و انصاف کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے، جس میں ہرگانوی کو بطور نمونہ اور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

مصنف نے اپنے مقدمہ 'گفتنی' میں تنقید کی معاصر صورت حال کے ساتھ تنقیدی دبستانوں کا بھی مختصر تعارف کرایا ہے اور قدیم و جدید تنقیدی دبستانوں کی نام شماری کی ہے، تاکہ قاری ان جہات کو بھی مرکز مطالعہ بنا سکے۔ کسی تنقیدی مکتب فکر پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ صرف اشارے کیے ہیں۔ بقیہ قارئین اور ناقدین کے ذوق و شوق پر چھوڑ دیا ہے مگر آج کل تنقید کی دنیا میں جو یکسانیت در آئی ہے، اس پر نارنگ صاحب کے حوالے سے شکوہ کناں بھی ہیں:

> ''اب بہ استثنائے چند یکسانیت کا شکار ہو چکا ہے اور نئی پیڑھی کے ادیب اس الجھن کا شکار ہیں کہ نئے موضوعات نہیں ملتے۔ اگر وہ اپنے سماجی ڈسکورس اور زندگی کے مسائل سے جوڑیں تو ہر سطح پر اتنے موضوعات ملتے ہیں ہے کوئی کمی نہیں ہے۔ اس تصادم اور آگہی میں ہمارا دانشور اور اہل قلم طبقہ شریک ہے اور اردو کی تنقیدی فکر اکیسویں صدی میں اس کے لئے جواب دہ ہے۔'' (گفتنی، ص:۸)

انھوں نے اکیسویں صدی کی خواتین تنقید نگاروں کی تحریری کاوشوں کا جائزہ لیا ہے، موضوع وسیع و بسیط ہے، اس کی وسعت اور بے کرانی اور انداز ترتیب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''جب میں نے خواتین تنقید نگاروں کی شناخت کا کام شروع کیا تو کشادگی کا احساس شدت سے ہوا۔ پیش نظر کتاب کو لکھنے کے لئے میں نے ان خواتین ناقدوں کو شامل نہیں کیا ہے جنھوں نے تنقیدی کتابیں مرتب کی ہیں۔ ایسی خواتین تنقید نگاروں پر بھی توجہ نہیں دی ہے جو رسائل میں چھپ رہی ہیں لیکن ان کی کتابیں ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں۔ میں نے صرف ان خواتین تنقید نگاروں کو ذہنی اور حسیاتی عمل میں ساتھ لیا ہے جن کی اکیسویں صدی میں کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔'' (ایضاً:۱۶-۱۵)

صرف ایک ہی کتاب کو اپنی میزان نقد پر کیوں رکھا اور پرکھا ہے، اس کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بعض ناقدوں کی کئی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن میں نے اعتدال برقرار رکھنے کے لئے سبھی کی ایک ایک کتابوں کی انفرادیت کا جائزہ لیا ہے۔'' (ص:۱۶)

ہرگانوی صاحب خود عصر حاضر کے ایک دیدہ ور اور وسیع النظر نقاد ہیں اور قدیم و جدید تنقیدی نظریات اور ان کی کنہیات سے اچھی طرح واقف بھی ہیں۔ ایسے میں ان کی طرف سے غیر سنجیدہ لفاظی اور بے جا عبارت آرائی کا

سوال پیدا کرنا ہرگانوی کی ناقدانہ صلاحیت سے تصادم کی کیفیت پیدا کرنا ہے۔انھوں نے صرف مدح وستائش کے اظہار کا وطیرہ نہیں اپنایا ہے، بلکہ ان خواتین کی تنقیدی نگارشات کے نقص وضعف کو بھی نشان زد کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''دو ایک خاتون تنقید نگار کی ایسی بھی کتابیں ہیں جو جلد بازی اور کچھ کچے علم کی شکار ہوگئی ہیں۔ جائزہ لیتے وقت میں نے نشاندہی کردی ہے۔'' (ص:۱۶)

یہ کتاب اپنے موضوع پر اچھوتی اور منفرد کتاب ہے۔ ہرگانوی صاحب نے دریا کے سکون و جمود کو ایک پتھر سے تحریک وتموج عطا کی ہے۔امید ہے کہ دوسرے ناقدین و محققین تحریک پاکر اس میدان میں آئیں گے اور اس ہرگانوی متن کی تشریح وتوسیع کریں گے۔ کتاب بہت ہی عمدہ اور دیدہ زیب ٹائٹل پر شائع ہوئی ہے۔اور قیمت بھی گرانی کے دور میں زیادہ نہیں رکھی گئی ہے۔

نام کتاب:صدائے گوہر مصنف:ڈاکٹر محمد گوہر (اداریوں اور مضامین کا مجموعہ) ص:۲۹۴، قیمت:۱۵۵ روپے

اشاعت:۲۰۱۸ء ناشر:النگار پرنٹرس، پٹنہ مبصر:ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی (مدھوبنی، بہار)

اردو کے مشہور اخبار روزنامہ تاثیر کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر گوہر دنیائے صحافت کا اہم اور معتبر نام ہے۔وہ اعلی تعلیم یافتہ جوان ہیں،انھوں نے ملک کی اعلی تعلیم گاہوں سے مختلف پیشہ ورانہ کورسز کی تعلیم حاصل کی ہے،ایم بی اے،ایم سی اے،بی ایڈ،ایم اے ان ایجوکیشن،ایم ٹیک،جرنلزم قسم کی تمام پیشہ ورانہ ڈگریوں کا تاج ان کے سر پر ہے،مگر انھوں نے ان پیشوں کی زلفوں میں الجھنے کے بجائے میدان صحافت کو اپنی خدمات کا مرکز منتخب کیا ہے۔حالاں کہ وہ سائنس کے آدمی ہیں اور اس کی مختلف شاخوں پر عبور رکھتے ہیں،جس کا وہ اپنے سائنسی مضامین میں اظہار کرتے رہتے ہیں،مگر جب سے انھوں نے روزنامہ تاثیر کی بنیاد ڈالی ہے،وہ قومی وعالمی امور پر بھی بے باکانہ اپنے خیالات و محسوسات کا اظہار کرتے ہیں۔نہ صرف ملکی اور قومی معاملات تعلیمی،معاشی،سماجی اور سیاسی امور پر تجزیاتی مضامین لکھتے ہیں،بلکہ حساس عالمی سیاسی امور واحوال پر بھی ان کی گہری اور عمیق نظر ہے۔انھوں نے روزنامہ تاثیر کے صفحات پر جو مضامین اور اداریے کی روشنی بکھیری ہے،اب اسی کو دوستوں اور عقیدت مندوں کے اصرار پر کتابی شکل عطا کردی ہے اور اس کو'صدائے گوہر' کے نام سے شائع کیا ہے۔یہ مضامین مختلف قومی وعالمی اور مذہبی وقومی امور ومعاملات کے محور پر گردش کرتے ہیں۔اور ان تمام مضامین و اداریوں کے بین السطور میں ایک پیغام چھپا ہے، جو ہمیں جھنجھوڑتے ہیں،بیدار کرتے ہیں اور خواب غفلت کی چادر کو چاک کرتے ہیں۔یہ سارے مضامین صفحہ دو صفحہ کے رقبے سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہیں،مگر ان کا معنوی دائرہ بہت وسیع ہے۔یہ مضامین واداریے ان عنوانات پر سپرد تحریر کیے ہیں۔نیا سال،توقعات اور امکانات،۲۰۱۸ء انتخابات کا سال،خطرے میں شہریت،مہاراشٹر کا نسلی تشدد،وزیر داخلہ کی یقین دہانی،۳ طلاق بل التوا کا شکار،لالو یادو کی سزا کا مطلب،سسکتی ہوئی معیشت،سمندر میں رہ کر بھی پیاسا،تپش کو پہلا مفتی محمد سعید ایوارڈ،قبل از وقت انتخاب؟اے ٹی ایس چیف کا مشورہ،صدر جمہوریہ کا بہار دورہ،خطرے میں جمہوریت،سپریم تنازعہ اور اس کا حل،یہ کیسی مسکراہٹ،تنازعہ ابھی باقی ہے،ویسٹ بنگال بنام

بیسٹ بنگال، پدماوت سے پابندی ہٹی، حج سبسڈی کا خاتمہ، یوم جمہوریہ اور مودی حکومت، لرزہ براندام سرکاریں، چیف جسٹس کا مواخذہ، پھر بھی یوم جمہوریہ مبارک، غلطی تو ایک بہانہ ہے، پی ایم مودی کے من کی بات، معصوم شرفی اسیر کی رحلت، جنگ کے ماحول میں کون کس کے ساتھ، گھر گھر کی کہانی، کاس گنج کا اصلی قصوروار کون؟، مایوس کن بجٹ، ضمنی انتخابی نتائج کا پیغام، ایک اور ورلڈ کپ، خواتین کی امامت، ایک طرف کتے کی نازبرداری دوسری طرف گائے؟، این ڈی اے میں انتشار، پکوڑوں کی سیاست، لالو کی نئی ٹیم، مالدیپ میں ہنگامی حالات، پی ایم مودی کو فلسطینی اعزاز، مصالحت یا خودسپردگی؟، بہار کا ضمنی انتخاب، آر ایس ایس سربراہ کا بیان، جنگ یا مذاکرات، ایک اور بینک گھوٹالہ، کاویری پر تاریخی فیصلہ، بھارت۔ایران سمجھوتہ، دولت مشترکہ اجلاس، روزگار کے گھٹتے مواقع، ہم کہاں جارہے ہیں؟ ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ، جموں میں نیا فتنہ، وعدوں کی بہار، نوجوانوں کیلئے پیغام، ایسی بھی کیا جلدی تھی؟، این ڈی اے میں بکھراؤ، کہاں گیا ۹ بچوں کا قاتل؟، اوروں پہ کرم، اقلیتوں پہ ستم؟، مانجھی کی گھر واپسی، بہار کانگریس میں بھگدڑ، ملک کے مستقبل کا مستقبل، یہ کیسی ہندستانیت، دھمکی نہیں اعتراف شکست، یوم خواتین اور ہماری ذمہ داریاں، کانگریس کی واپسی کا دعوی، سری لنکا میں فساد، ہندستانی کرکٹ کا نقصان، راجیہ سبھا انتخاب، کھلونے دے کر بہلایا گیا ہے، خطرے کی گھنٹی؟، پارلیمانی تعطل کب تک، ایک اور مسلم پرسنل لا بورڈ، یوپی میں پھر طاقت آزمائی، ٹیم انڈیا کا نیا ہیرو، یوم بہار کا پیغام، ٹوٹتا در کتا اتحاد، عام آدمی پارٹی کو راحت، ہار میں جیت کا پہلو، سی اے کا سیاہ باب، کون بگاڑ رہا ہے ماحول؟، جلوس پر پابندی ضروری، انا کے آندولن کا انت، سی بی ایس ای پیپر لیک، قابل تقلید پہل، امن کے دو ہندستانی سپاہی، بھارت بند اور حکومت، انصاف کی خاطر، دین بچاؤ دیش بچاؤ کانفرنس، سلمان خان کو سزا، قصور اپنا نکل آیا... یہ انداز گفتگو کیا ہے؟ انسانیت ابھی زندہ ہے، ایک اور بھارت بند؟ اور نہیں بس اور نہیں، دلتوں کی منہ بھرائی، آصفہ کو انصاف کی امید، کانگریس کا مڈنائٹ کینڈل مارچ، امبیڈکر جینتی اور تحفظ آئین، سپریم کورٹ امید کی آخری کرن، جسٹس فار آصفہ، تو آخر ذمہ دار کون؟ کیش لیس اے ٹی ایم، مذہب کی بنیاد پر شہریت، مایا کوڈنانی بھی بری، عمر کی تحدید غلط، چیف جسٹس کا مواخذہ، انسان اور حیوان میں فرق، بیٹوں پر نظر رکھنے کی ضرورت، سلمان خورشید کا بیان، جسٹس جوزف کا قصور کیا؟ اتحاد کی راہ پر کوریا، تاریخی لال قلعہ کا سودا؟، بھیس بدلنے والے غضب ڈھارہے ہیں، لالو کی ایمس سے چھٹی، نشانے پر اے ایم یو، شانتی جوشی کا شکریہ، نماز جمعہ میں رخنہ اندازی، مجرموں کی حمایت کیوں؟ سڑک پر عبادت نہیں؟ مساجد پر قبضہ اور نماز تنازعہ، تحریک مواخذہ پر سیاست، جوہری معاہدہ اور امریکہ، اب سبنل پر بھی اعتراض، ممتا کی پیش گوئی، امریکہ کی داداگیری، کرناٹک میں سیاسی ڈرامابازی، کرناٹک کا ناٹک، راج بھون کے بعد سپریم کورٹ، حکومت سازی کے دعوے، سپریم کورٹ کو سلام، بڑے کام کا اتحاد، کنگ میکر سے کنگ تک، آرک بشپ کا متنازعہ خط، جے این یو کا متنازعہ کورس، اپوزیشن اتحاد کا مظاہرہ، کمارسوامی کو اعتماد کا ووٹ، روایتی کھیلوں کی اہمیت، مودی حکومت کے ۴ سال، مودی کا ڈائیلاگ مشن، بھارت کی خارجہ پالیسی، ای وی ایم پر اٹھتے سوال۔ اخیر میں کچھ تصویریں ہیں جن میں مصنف کی صحافتی زندگی کے مختلف گوشوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

عناوین سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کتاب سیاسی، معاشرتی اور سماجی موضوعات کے محور پر گردش کرتی ہے۔ مگران موضوعات کی پیش کش کے انداز میں جدت اور ندرت ہے اور مضامین سہل و سادہ زبان میں لکھے گئے ہیں، جو ایک عام قاری کی سمجھ سے بھی بالاتر نہیں ہے۔ یہ مضامین مختصر ہیں اور مخصوص احوال و اوقات کا زائیدہ ہیں، مگر اس میں ایک عہد اور اکیسویں کا ایک عشرہ بولتا ہے۔ جن مسائل اور موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے، اس میں زمانے کی سانسیں دھڑکتی محسوس ہوتی ہیں۔ چند مضامین تو ہر زمانہ میں دہرانے اور مکرر اشاعت کے مرحلے سے گزارے جاسکتے ہیں کہ وقت کا پہیہ ایک حالت پر نہیں رہتا، وہ گھومتا رہتا ہے۔ بعض مضامین پر ادبی رنگ بھی غالب ہے۔ عناوین بھی زبان و ادب کی چاشنی کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ انداز گفتگو کیا ہے کے عنوان سے ناصحانہ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''ملک میں پہلے بھی سیاسی مسابقت اور چپقلش ہوتی تھی اور سیاسی رہنما مخالف پارٹیوں کے رہنماؤں کو ہدف تنقید بناتے تھے۔ مگر اس طرح کے نازیبا الفاظ کا استعمال کبھی نہیں کرتے تھے۔ وہ بولتے وقت محتاط رہا کرتے تھے اور کبھی کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے کہ بعد میں اگر اس سے سامنا ہو تو آنکھ ملانا بھی مشکل ہو جائے۔'' (ص:۱۹۲)

کتاب کے آغاز میں رسمی تحریریں بھی شامل ہیں۔ مختار احمد فردین، اشرف استھانوی نے ڈاکٹر گوہر کی ادب و صحافت سے دلچسپی، ان کے صحافتی سفر اور ان کے صحافتی کارناموں کو نمایاں کیا ہے اور ان کا اعتراف کرنے کی تلقین کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کا ادب و صحافت کی دنیا میں استقبال کیا جائے گا اور مصنف نے اس کتاب کے مضامین میں جس دردمندی اور دل سوزی کا اظہار کیا ہے، اس کو رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔

....

● **نام کتاب: سہرے کی ادبی معنویت مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ص: ۳۲۰ اشاعت: ۲۰۱۹ء قیمت ۳۵۰ روپے**
رابطہ: ادبستان، محلہ: گنگوارہ، پوسٹ: سارا موہن پور، ضلع: دربھنگہ: 846007 مبصر: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، مدھوبنی (بہار)

سہرا خوانی مرثیہ خوانی کی ضد ہے اور ہر شئے اپنی ضد سے متعارف ہوتی ہے۔ جہاں غم والم کی ترجمانی اور میدان کربلا کی اذیت ناک داستان کی ترجمانی کے لیے مرثیوں کی گود میں شعرا نے پناہ لی ہے، وہیں خوشی و مسرت سے عبارت شادی خانہ آبادی پر سہرا دل ربا نغمے بکھیرتا اور ہمیں عیش و نشاط کا احساس کراتا رہا ہے۔ اولین ہندوی شاعر امیر خسرو سے عہد زریں غالب و ذوق تک سہرے ہماری ادبی روایت اور شعری وراثت کا حصہ رہے ہیں، ہمارے ادبی سفر میں سہروں نے طویل مسافت طے کی ہے۔ یہ منظوم سہرے ادبی معرکہ آرائی کا وسیلہ بھی بنے ہیں، شعرا کی باہمی چشمک کو سہروں نے کم توانائی فراہم نہیں کی ہے۔ اہم ادبی دبستانوں سے اس صنف کا گہرا علاقہ رہا ہے، مشہور دبستانہائے اردو دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد، رام پور اور کلکتہ کے بام و در سہرے کی غنائیت ریزی اور موسیقیت انگیزی کے گواہ ہیں۔ مگر اس کو ایک مستقل صنف سخن کے طور پر اکیسویں صدی میں بھی ادب گلوب پر شناخت کا چہرہ عطا نہیں کیا جاسکا کہ یہ صنف سخن آمد سے زیادہ آورد پر ارتکاز کرتی ہے اور اس میں رفیقوں، حبیبوں اور قرابت داروں کی نام شماری اور مدح و ستائش کی غیر معلنہ پابندی، فن کاروں کے لیے تک بندی یا بھرتی کے مصرعوں کی تخلیق پر منتج

ہوتی ہے، پھر بھی سہرا مقبول عام و خاص وسیلۂ اظہار تھا اور ہے اور اتنا مقبول و محبوب ہے کہ ہر کہ و مہ شاعر سہرا نویسی کو اپنا ادبی وظیفہ گردانتا ہے۔ بعد میں سہرے کو شیوع و فروغ ملا اور جب اس نشاطیہ صنف نے زور پکڑا، تو بڑے بڑے شعرا اس صنف کے بال و پر سنوارنے لگے، مگر یہ صنف ادبی لمس اور فنی بحث سے ہنوز بعید تھی۔ معروف شاعر، ادیب اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم نے تقریباً پندرہ سالہ کدو کاوش کے بعد سہرے کی ادبی معنویت کے ابعاد و اکناف کو ادبی بساط پر پیش کرنے کی جدو جہد کی ہے اور اس ضخیم کتاب میں اس قدیم صنف کا بصری مرقع پیش کر دیا ہے۔ زیر نظر کتاب، صرف کتاب برائے کتاب کے شوق کی زائیدہ نہیں، بلکہ یہ موضوع کی مخفی جہات کو منکشف کرنے کی سعی بھی ہے۔

یہ کتاب اصل میں اس سلسلے کی توسیع ہے، جس کا ڈول ڈاکٹر امام اعظم نے ۲۰۰۷ء میں ڈالا تھا، جب انھوں نے ادبی سرمستی کے عالم میں اردو جریدہ 'تمثیل نو' کا ایک شمارہ اس صنف کے لیے مختص و مرتکز کیا تھا اور یک سالہ شب و روز کی تگ و دو کے بعد 'تمثیل نو' کا مشترکہ شمارہ (اکتوبر ۲۰۰۷ - جون ۲۰۰۸ء) پیش کیا تھا، جس کا ادبی دنیا میں پر جوش استقبال کیا گیا تھا اور ادب نواز اقران و احباب نے دل کھول کر اس کی پذیرائی کی تھی۔ یہ مجلاتی پیشکش اپنے طرز کا منفرد ادبی کارنامہ تھا، اسی کارنامے کی دین یہ کتاب ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہ رسالہ تھا، یہ بھر پور کتاب ہے۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا ہے۔ وہ بسم اللہ تھی، یہ تمت ہے۔ وہ خشت اول تھی اور یہ بھی خشت اول ہے۔

یوں تو یہ کتاب ۱۲؍ مضامین، دیباچہ اور ایک ادبی مصاحبہ پر مشتمل ہے، مگر اس کا جو مقدمہ ہے، وہ کتاب کے تمام مشمولات پر مقدم ہے اور بجائے خود ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقدمہ بھرتی کا نہیں ہے، یہ کتاب کا مغز اور خلاصہ ہے اور یہ سہرے کی ابتدا و ارتقا اور اردو میں سہرا نویسی کی پوری تاریخ کا احاطہ کرتا ہے۔ انھوں نے اس میں نظم عروسی اور تہنیتی نظموں کے مجموعوں کی تاریخ کا مرقع تیار کر دیا ہے۔ اور اس میں شمال و جنوب کے تمام اہم سہرا نگاروں کو نمائندگی دی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے ادبی دبستانوں سے زیادہ بہار میں سہرا نویسی کی سمت و رفتار پر انھوں نے فوکس کیا ہے اور دسمبر ۱۹۴۵ء سے لے کر تا حال یعنی ۲۰۱۸ء تک کی عروسی نظموں اور سہرا نویسوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے تقدیم و تاخیر کا بغیر لحاظ رکھے تمام سہروں کا اشاریہ تیار کر دیا ہے۔ سہروں کی تلاش اور ان کے شان نزول کی تحقیق و تصدیق میں کتنی عرق ریزی مرتب نے کی ہوگی، اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ و محاکمہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ سہرا نگاروں کے چہروں سے گم نامی کا نقاب و حجاب اتارنے میں ان کی مشقت کا اک ذرا سا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کسی بھی معلوم سہرا نگار کو محروم نہیں کیا ہے۔ سہروں کی تلاش و تحقیق کی مہم انھوں نے تحریر اور خط و کتابت سے لے کر سوشل میڈیا: واٹس ایپ اور فیس بک تک پر چلائی ہے۔ موضوع کی بھٹی میں کندن بننے کے بعد ہی انھوں نے اس کتاب کو حتمی شکل عطا کی ہے۔ 'قطرے پہ گہر ہونے تک' کی پوری کرب انگیز داستان انھوں نے اپنے مقدمہ 'میں پیام نشاط لایا ہوں' میں مرقوم کر دی ہے۔

مقدمہ، دیباچہ، مضامین اور مصاحبہ کے بعد اصل موضوع سے مرتب نے ہم کلامی کی ہے اور خورد و کلاں اور اکابر و اصاغر کی لفظی تفریق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سہروں کو الفبائی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ کل ۲۳۵ شعرا کے ہاں انھوں نے سہرا نویسی کی روایت کی توسیع و تمدید کی ہے۔ احباب، رشتہ داروں اور رفیقوں کی بجایا بے جا فرمائش

پر سہرا اور تہنیتی نظمیں لکھی جاتی رہی ہیں اور انھیں غیر اہم گردانتے ہوئے کہیں کاغذ کے کسی کٹے پھٹے ٹکڑے، یا کسی دستی رومال پر بھی لکھنے اور پیش کرنے کا رواج رہا ہے، اس لیے سہروں کی تلاش دواوین اور مطبوعہ شعری مجموعوں میں نہیں، گھر کے کاغذات اور ردی کے ٹوکروں میں بھی کرنی پڑی ہوگی۔ اب امام اعظم صاحب کو اس دشت میں کس کس طوفان کا سامنا کرنا پڑا، کس کس دریائے شور کو عبور کرنا پڑا اور اس باب میں کتنے صحراؤں کی خاک انھیں چھاننی پڑی اور کتنے در یا گھر کی دہلیز پر پیشانی رگڑنی پڑی، اس کا اظہار انھوں نے اشارے کنایے میں بھی مقدمہ میں نہیں کیا ہے، یہی ان کا ادبی انہماک اور ان کا تخلیقی خلوص ہے، جو اس کتاب کو مقبولیت کی معراج طے کرائے گا۔

ابتدائے کتاب میں مضامین کے جو پھول ٹانکے گئے ہیں، وہ بھی موضوع و مشمول کے اعتبار سے دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں اور سہرا نویسی کی ادبی و صنفی معنویت و کیفیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر سید طلحہ رضوی برق، پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر مجید بیدار، اسلم حنیف، احسان ثاقب وغیرہ کے مضامین سہرا نگاری کے منجمد بحر میں سنگ گراں کے شور کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس سنگ باری سے جو لہریں اٹھ کر ادب ساحل سے ٹکرائیں گی، اس سے سہرے کے خد و خال کا غبار مزید دور ہوگا اور عروس سہرا کا چہرہ ادبی منظر نامے پر اپنی تابانی کے جلوے بکھیرے گا۔ شاہد جمیل کا دیباچہ مدحیہ نہیں، مکمل تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں انھوں نے ایک ناقد کی طرح کتاب میں شامل تمام تحریروں کا معروضی تحلیل و تجزیہ کیا ہے اور سہرے کی طویل العمری کا نقشہ کھینچنے کے ساتھ اس کی صنفی حیثیت کو استحکام عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مرتب موصوف زائد از درجن کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں، تحقیق و تدوین کی وادی میں بھی اپنے تلووں کو انھوں نے لہولہان کیا ہے، ترتیب و ایڈیٹنگ میں آبلہ پائی کا شوق بے پایاں بھی انھیں ودیعت ہوا ہے، اس لیے ادبی حلقوں کو اس کتاب کی تحقیق و ترتیب پر تہنیت و مبارک باد پیش کرنے میں کسی تعصب یا تحفظ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ مواد کی پیش کش شاعرانہ ہے، اور انداز تحریر ادبی ہے۔ مہذب، شائستہ اور ادبی اسلوب کا نمونہ۔ سہرے کے لیے شعر میں تو کوئی مخصوص زمین نہیں ہے، مگر نثر میں امام اعظم نے ایسی زمین تیار کر دی ہے، جس پر سہروں کا خزاں رسیدہ باغ لہلہا اٹھے گا۔ اس کتاب میں کیا کچھ انھوں نے پیش کیا ہے اور وہ علمی و ادبی دنیا سے کتنی آرزوئیں وابستہ رکھتے ہیں، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماحصل کے طور پر لکھا ہے:

> ''سہرا شعبۂ زندگی کے ایک اہم موقع کی ترجمانی کا ذریعہ رہا ہے، اسلئے اسکی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اگر اس پر کام نہیں ہوا ہے تو اس سلسلے میں باضابطہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔'' (ص: ۴۰)

دیباچہ میں شاہد جمیل نے جو کچھ لکھا ہے وہ مرتب کی اس کوہ کنی کو خراج تحسین بھی ہے اور محققین کے لیے ترغیب انگیز بھی:

> ''ڈاکٹر امام اعظم کی اس کتاب کی اشاعت کے بعد اغلب ہے کہ سہرے کی صنفی و ادبی شناخت کا جواز خود پیدا ہوتا جائے گا اور ادب کے محققین اس بحر ذخار کی غواصی کو یقینی بنائیں گے تاکہ جو قیمتی ہیرے یہاں وہاں گرے پڑے ہیں وہ سامنے آسکیں۔''

دیدہ زیب ٹائٹل اور عمدہ سرورق کے ساتھ کتاب شائع ہوئی ہے۔ کاغذ ہمیشہ کی طرح معیاری استعمال ہوا ہے۔ قیمت میں بھی عام آدمی کا خیال رکھا گیا ہے۔

سہرا کے استحکام و فروغ کے لیے مرتب نے اپنے مقدمہ میں جو دعا مانگی ہے، اس کو اثر دکھانے میں وقت لگے گا کہ بقول مومنؔ 'آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ'، مگر مجھے امید ہے کہ یہ کتاب صنف سہرا کو ادب عالیہ میں نہیں تو ادب آلیہ میں ایک صنف کی حیثیت عطا کرنے میں خشت اول ثابت ہوگی۔

....

● **کتاب کا نام: رہنمائے تحقیق مصنف: ڈاکٹر عبدالقدوس/ڈاکٹر عبداللہ صابر اشاعت: ۲۰۱۶ء صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۳۰۰ روپے ناشر: الہدیٰ پبلی کیشنز، دہلی-۶ مبصر: شاہد اقبال (کولکاتا)**

تحقیق حقائق کی تلاش اور پیشکش کا نام ہے۔ علمی و ادبی تحقیق سے مراد یونیورسٹیوں کے مختلف کورسز کے لیے تحقیقی مقالہ قلم بند کرنے کے لیے موضوع کی مناسبت سے حقائق کی تلاش و جستجو کرتے ہوئے اسے دلائل اور سیاق و سباق کے ساتھ مقالہ میں شامل کرنا ہے۔ چوں کہ ان دنوں یونیورسٹیوں میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کورسز میں Research Methodology نصاب کا لازمی حصہ قرار دے دیا گیا ہے، اس لیے اس موضوع پر رہنما (Guide Books) کتب کی ضرورت ہر زبان میں محسوس کی جارہی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ تنقید کے حوالے سے اب تک قلم کاروں نے کئی معیاری کتابیں اردو طلباء کو دی ہیں لیکن تحقیق پر اردو میں کوئی مبسوط اور مبنی بر نصاب کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ عام طور پر طلباء پروفیسر گیان چند جین کی اہم کتاب "تحقیق کا فن" سے استفادہ کرتے نظر آتے تھے۔ اس کمی کو دور کرنے کا ارادہ ڈاکٹر عبدالقدوس (انچارج، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس) نے کیا اور اپنے معاون ڈاکٹر عبداللہ صابر کے ساتھ مل کر زیرِ نظر کتاب "رہنمائے تحقیق" لکھ ڈالی جو Research Methodology کے نصاب کے عین مطابق ہے۔ اس کتاب کے اسلوب کے متعلق فاضل مصنف لکھتے ہیں:

> "اس کتاب میں تحقیق کے طلباء کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے تحقیق کے تمام ضروری مباحث کے ساتھ خاکہ نگاری سے لے کر شفوی امتحان (Viva) تک کے تمام مراحل کو بالاستیعاب وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ طلبا کی لسانی صلاحیت کا لحاظ کرتے ہوئے اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ الفاظ کی سادگی کے ساتھ ایسا آسان طرزِ تحریر اختیار کیا جائے کہ عام طالب علم بھی بآسانی اس سے مستفید ہو سکیں۔" (سرگذشتِ کتاب ص:۲۵)

کتاب کو ۸ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر باب کئی ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں "تحقیق کیا ہے؟"، "اقسامِ تحقیق"، "تحقیق کے بنیادی عناصر"، "محقق کی خصوصیات یا لوازم تحقیق" اور "محقق طلباء کی صلاحیتوں کو جانچنے کی شرطیں"، باب دوم میں "موضوع کا انتخاب"، "انتخاب موضوع کے امدادی وسائل"، "اچھے موضوع کی خوبیاں"، "تحقیقی خاکہ کی تیاری" اور "مصادر، مراجع، مآخذ کی تحدید"، باب سوم میں "متعلقہ مواد کی جمع آوری، تحقیقی مواد کے حصول کے ذرائع، خود تیار کردہ مواد کے مصادر"، "مشاہداتی طریقہ"، "انٹرویو"، "سوال نامہ"، "جائزہ"، "تجربہ"،

''آزمائش''، ''مطالعہ احوال/کیس اسٹڈی''، ''خودتیار کردہ مواد کو زیر عمل لانا''، ''نمونہ بندی'' اور ''مواد کی چھان پھٹک'' جب کہ باب چہارم میں ''مقالہ کی تسوید وتحریر''، ''رموزواوقاف''، ''مقالہ کی حوالہ بندی''، ''مقالہ کی آخری شکل وہیئت''، ''صفحہ اول کی کمپوزنگ اور تصحیح'' اور ''شفوی/ زبانی امتحان (Viva)'' وغیرہ ذیلی موضوعات پر فاضل مصنّفین نے کھل کر بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں تحقیق وتدوین کے اردو وانگریزی اصطلاحات بھی شامل کتب کرکے طلبا،کو بیک جگہ زیادہ سے زیادہ کارآمد مواد پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں مصنّفین بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ کتاب پیپر بیک شائع ہوئی ہے۔ دبیز کاغذ اور صاف ستھری طباعت سے مزین ہے۔

● کتاب کا نام: شاہد جمیل: ذکروفکر مرتب: شان بھارتی اشاعت: ۲۰۱۸ء صفحات: ۱۴۴
قیمت: ۲۵۰؍روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: شاہد اقبال (کولکاتا)

شاہد جمیل معاصر اردو شعروادب کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ آپ کی معیاری شعری تخلیقات اور تنقیدی مضامین ملک وبیرون ملک کے جن متقدر رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں، ان میں سے ایک سہ ماہی ''رنگ'' (دھنباد، جھارکھنڈ) بھی شامل ہے۔ ''رنگ'' کا ۵۳؍واں شمارہ ''شاہد جمیل نمبر'' تھا جس میں ملک کے نامور قلم کاروں نے موصوف کی شخصیت اور فن کا منظوم ومنثور تجزیہ کیا تھا۔ اس نمبر کی مشمولات کے حوالے سے جو مضامین لکھے گئے ان کو اور اس نمبر میں شامل چند اہم مضامین کو یکجا کر کے زیر نظر کتاب محترم شان بھارتی (مدیر سہ ماہی ''رنگ'' دھنباد) نے ترتیب دی ہے۔ جس کے باب اول میں شاہد جمیل کی شاعری اور تنقید پر ۱۹؍مضامین ''شاہد جمیل: 'غزل نما' کے موجد (ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)، ''میٹرو چینل (کراچی) سے غزل نما پر مذاکرہ'' (ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)، ''شاہد جمیل کی غزل: نو بہ نو تجربات کی آماجگاہ'' (ڈاکٹر محبوب راہی)، ''شاہد جمیل کی تخلیقی قلمرو میں غزل کا حوالہ'' (عشرت ظفر)، ''شاہد جمیل کی تخلیقی آگہی: ایک نئی کائنات'' (محبوب انور)، ''شاہد جمیل کی نئی غزلیہ شاعری'' (ڈاکٹر مظفر حسن عالی)، ''مفہوم مودب سے کھڑے ہیں پس الفاظ'' (ڈاکٹر رونق شہری)، ''شاہد جمیل کی کتاب 'سوما ہے': ایک مطالعہ'' (ڈاکٹر فراز حامدی)، ''شاہد جمیل: سب سے جدا لہجے کا شاعر'' (ڈاکٹر سیفی سرونجی)، ''پسِ الفاظ: معنوی گہرائی کی تفہیم میں نصاب کا حکم'' (ڈاکٹر الیاس صدیقی)، ''پسِ الفاظ: منصفانہ تجزیاتی تنقیدی بصیرت کا ادراک'' (اسرار احمد قاسمی)، ''شاہد جمیل کی شاعری میں رنگوں کا آہنگ'' (احتشام الحق)، ''شاہد جمیل کی کہہ مکرنیاں: جدید دور کی ذہنی عکاسی'' (ڈاکٹر مشتاق انجم)، ''شاہد جمیل کی کہہ مکرنیاں: ایک نیا منظر نامہ'' (ڈاکٹر افضال عاقل) اور ''پسِ الفاظ کے پانچ مضامین: ایک جائزہ'' (شارق عدیل) کے علاوہ پروفیسر عبدالمنان طرزی کی ایک توشیحی نظم، شاہد جمیل کے تنقیدی مضامین پر مبنی کتاب ''پسِ الفاظ'' کے متعلق پروفیسر عبدالمنان طرزی کے منظوم تبصرہ نیز باب دوم میں ''زاویے'' کے عنوان سے ۱۲؍قلم کاروں ڈاکٹر وزیر آغا، خوشونت سنگھ، ندا فاضلی، افتخار امام صدیقی، شاہد عزیز، ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن، حقانی القاسمی، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، پروفیسر محمد منصور عالم، معراج احمد معراج، اشرف احمد جعفری اور منظور پروانہ کی مختصر آرا شامل ہیں۔ جناب شان بھارتی کتاب کی اشاعت کے متعلق اپنی رائے پیش کرتے ہیں :

"رنگ" نے ۲۲۴ صفحات پر مشتمل اپنا ۵۳ رواں شمارہ 'شاہد جمیل نمبر' کے طور پر شائع کیا تھا۔ میری خواہش ہوئی کہ ان مضامین کو (جو ان کی ادبی خدمات سے متعلق تھے)، یکجا کر کے ایک کتاب ترتیب دے دی جائے۔ سو وہ کام آج پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے۔ انھوں نے غزل سے لے کر کہہ مکرنی تک اور کہہ مکرنی سے دوہے تک کا سفر بڑی شان سے طے کیا ہے۔ اس لمبی مسافت میں انھوں نے کہیں آرام نہیں کیا بلکہ نئے تجربات کئے ہیں۔ ان کا ایک تجربہ غزل پر بہت کارآمد رہا اور ایک نئی صنفِ سخن 'غزل نما' کا وجود عمل میں آیا۔ آج وہ غزل نما کے موجد تسلیم کئے جا چکے ہیں۔" (عرضِ مرتب ص:۱۳-۱۴)

کتاب مجلد ہے اور دبیز کاغذ و چمکدار طباعت اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ سرورق / گرد پوش پر شاہد جمیل کی تصویر اور فلیپ پر ان کی چار کتابوں "خوابوں کے ہم سائے" (شعری مجموعہ)، "سوما ہے"، "عکس اندر عکس" (کہہ مکرنیاں)، "پسِ الفاظ" (تنقیدی مضامین) اور ان کی شاعری / تنقید پر لکھی گئی دو کتابوں "شاہد جمیل: شخص اور شاعر" (مرتب: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی) اور "شاہد جمیل: منظوم" (شاعر: پروفیسر عبدالمنان طرزی) جاذبِ نظر ہیں۔ امید قوی ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

....

● **کتاب کا نام: پروفیسر نجم الہدیٰ: ناقد و شاعر مصنفہ: ڈاکٹر ثریا جہاں اشاعت: ۲۰۱۸ء صفحات: ۲۳۲ قیمت: ۳۰۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: شاہد اقبال (کولکاتا)**

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایسی بے شمار شخصیتیں ملتی ہیں جنھوں نے ایک سے زیادہ خطہ ہائے زمین میں اردو زبان و ادب کی آبیاری کی۔ ولی دکنی، انشاء اللہ خاں انشاء، میر تقی میرؔ، محمد رفیع سودا وغیرہ سے آگے بڑھتے ہوئے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ بیشتر قلم کار یا پھر واجد علی شاہ اخترؔ اور ان کی تقلید میں لکھنؤ کے اس وقت کے بیشتر ثقہ اہلِ قلم حضرات جن میں مرزا فتح الدولہ برق، سیّد حیدر علی نظم طباطبائی اور عبدالحلیم شررؔ وغیرہ شامل ہیں کی مثالیں سامنے رکھیں، ان حقیقی محبانِ اردو نے اپنی زبان اور اس کے ادب کو امتدادِ زمانہ کے تحت ہجرت پر مجبور ہونے کے باوجود فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہ ان بزرگوں کی ہی دین تھی کہ اردو زبان کا دائرہ برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں پھیل گیا تھا۔ آزادی اور تقسیم ہند کے فوراً بعد سیاسی ہجرت نے بھی شعرا و ادبا کو زمین کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جا کر ادب کی تخلیق و ترویج کا موقع فراہم کیا۔ اس کے بعد بہت سے اہلِ قلم ایسے بھی گزرے ہیں جو اپنے پیشے کے تقاضوں کے تحت ہجرت پر مجبور ہوئے تاہم انھوں نے بھی دوسرے علاقے میں جا کر اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمات انجام دیں۔ ایسے ہی قلم کاروں میں سے ایک پروفیسر نجم الہدیٰ بھی ہیں جنھوں نے پہلے ایل ایس کالج، مظفر پور (بہار) کے شعبۂ اردو میں طویل عرصہ تک خدمات انجام دیں۔ بعدۂ مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو، عربی اور فارسی کی صدارت بھی لمبی مدت تک کرتے رہے۔ واضح ہو کہ موصوف نے تمل ناڈو جیسے علاقے میں اردو زبان و ادب کے فروغ کا بیڑا اٹھا اور اس کام میں بہت حد تک انھیں کامیابی بھی ملی جہاں عام لوگوں میں اردو سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''پروفیسر نجم الہدیٰ کی علمی، ادبی اور لسانی دانشوری نے ملک کی دو اہم ریاستوں کو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے سیراب وشاداب کیا ہے۔ ایک تو ریاست بہار ہے اور دوسری ریاست اردو بیلٹ (Belt) سے دور تمل ناڈو ہے۔...... نجم الہدیٰ صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ملک کی قدیم ترین مدراس یونیورسٹی میں اردو زبان وادب کو مقبول تر بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ تمل ناڈو کی سنگلاخ سرزمین کو اردو زبان وادب کی نشوونما کے لیے سازگار بنادیا......'' (تقریظ کتاب ''پروفیسر نجم الہدیٰ: ناقد وشاعر'' ص:۹)

پروفیسر نجم الہدیٰ ان اہم علمی وادبی کاوشوں کا احاطہ ڈاکٹر ثریا جہاں نے اپنی زیرِ تبصرہ کتاب میں کیا ہے، جو دراصل ان کے مقالے ''پروفیسر نجم الہدیٰ: حیات اور ادبی خدمات'' پر مبنی ہے۔ محترمہ نے ایل ایس کالج، مظفر پور کے تب کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کا یہ مقالہ جمع کیا تھا جس کے عوض انھیں پی ایچ ڈی کی سند سے نوازا گیا۔ اس مقالہ کو کراچی، پاکستان کے دو پبلشرز نے کتابی صورت میں شائع کیا جس کی چند ہی کاپیاں مصنفہ کے ہاتھوں لگیں۔ اس لیے انھیں اس کتاب کو ہندوستان سے شائع کرایا تاکہ یہاں کے قارئین بھی اس سے استفادہ کریں۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصۂ اول میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی 'تقریظ' اور مصنفہ کی 'پیش لفظ' کے علاوہ شخصیت اور سوانح، تنقید نگاری، شاعری کا مطالعہ، دیگر نثری تحریریں اور ماحصل جیسے عناوین کے تحت پروفیسر نجم الہدیٰ کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے بحث کی گئی ہے۔ حصۂ دوم میں پروفیسر نجم الہدیٰ کا نمونۂ کلام ''حمد (۵)''، ''نعت (۷)''، ''تمہید (۵)''، ''نظمیں'' (۲۵)، ''غزلیں'' (۲۱) نیز متفرقات کے تحت کل ۸ر نمونہ ہائے کلام شامل کئے گئے ہیں جن سے کتاب کی وقعت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ امید قوی ہے کہ مداحانِ پروفیسر نجم الہدیٰ کے لیے یہ کتاب ایک بیش بہا تحفہ ثابت ہوگی۔

- **کتاب کا نام: ہندوستانی فلموں کا اردو سے رشتہ مصنف: ڈاکٹر منور راہی اشاعت: ۲۰۱۸ء ص: ۱۶۰ قیمت: ۲۰۰ روپے پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر احسان عالم (دربھنگہ)**

پیش نظر کتاب ''ہندوستانی فلموں کا اردو سے رشتہ'' ڈاکٹر منور راہی کی ایک عمدہ تخلیق ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے فلموں کے حوالے سے بہت سی اہم باتیں پیش کی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے فلموں سے متعلق بہت سی جانکاریاں سمونے کی کوشش کی ہیں۔ کتاب کے انتساب نہایت خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے ذہن ودل کے پردے پر رقص کرنے والی اس شہزادی کے نام جسے دنیا اردو کے نام سے جانتی ہے۔''

اپنا پیش لفظ ''دل کے پردے پر'' کے عنوان سے ڈاکٹر منور راہی نے تحریر کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پیش نظر کتاب ان کے تحقیقی مقالہ پر محیط ہے۔ اپنے پیش لفظ میں کتاب کا تعارف کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے اس کتاب میں ہندوستانی فلموں کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جس سے اخلاقیات، سماجی اقدار، مشرقی تہذیب وتمدن ابھر کر سامنے آئے کیونکہ مذکورہ خصوصیات ہر زمانے میں نئی نسل کی ذہنی آبیاری اور کردار سازی کے لئے لازمی اور مفید ہے۔ مثال کے طور پر ''ہندوستانی

فلموں میں اردو اور اردو شاعری'' اس عنوان کے تحت مادری زبان (اردو) کی اہمیت وافادیت کے ساتھ ساتھ ادب سے زندگی کا تعلق واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔''

اردو ادب کی تین نامور ہستیوں ڈاکٹر ہمایوں اشرف، رہبر چندن پٹوی اور ڈاکٹر عطا عابدی نے کتاب کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف لکھتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر منور راہی کی یہ تصنیف قاری کے لیے اردو اور فلم کے حوالے سے محض بعض اطلاعات کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ فلمی دنیا سے وابستہ افراد کا اردو سے فطری لگاؤ اور دلچسپی کے تعلق سے دستاویزی حیثیت کی حامل بھی ہے۔''

معروف شعر رہبر چندن پٹوی تحریر کرتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر راہی نے اپنی اس تحقیقی کتاب میں ہندوستانی فلموں کی مقبولیت کے اسباب میں اردو زبان کو اہم قرار دیا ہے اور مختلف زاویے سے ہندوستانی فلموں کی مقبولیت کے پہلو کا انکشاف کیا ہے جو لائق تحسین ہے۔''

ڈاکٹر عطا عابدی اپنے تاثرات میں فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر منور راہی فلم اور زبان کی معنویت وافادیت سے واقف ہیں۔ انہیں اس بات کا علم ہے کہ کسی اظہار بیان کے لئے زبان کی ضرورت ناگزیر پہلو رکھتی ہے اور موثر و دل نشیں اظہار واقعہ کے لئے اردو جیسی شیریں زبان کی قدر ضروری ہے۔''

کتاب میں چار طویل مضامین ''ہندوستانی فلموں میں اردو اور اردو شاعری، فلموں کے گیت اور اردو، فلموں کے مکالمے اور اردو، اردو صحافت اور فلم'' شامل ہیں۔

اپنے پہلے مضمون ''ہندوستانی فلموں میں اردو اور اردو شاعری'' میں منور راہی فرماتے ہیں کہ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوستانی سینما کو اردو نے اپنی آواز دی۔ ڈائیلاگ، مکالمے اور گیت سبھوں کی زبان اردو تھی۔ پہلی ہندوستانی متکلم فلم ''عالم آرا'' ۱۹۳۱ء میں ریلیز ہوئی۔ یہ پوری طرح اردو فلم تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اردو زبان کی طاقت ہندوستانی بول چال کی زبان میں پوشیدہ ہے۔

دوسرا مضمون ''فلموں کے گیت اور اردو'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے ذریعہ فلمی گیت اور گانوں سے متعلق بہت سی جانکاریاں فراہم کی گئی ہیں۔ جذبات بیان کرنے میں اردو الفاظ سے مزین نغمے بے حد کامیاب رہے ہیں۔ اردو شاعری کے دونوں دبستانوں کے شعرا اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ فلم انڈسٹری سے منسلک ہوتے ہیں۔ ان حالات میں یہاں اردو کا بول بالا یقینی ہے۔

تیسرا مضمون ''فلموں کے مکالمے اور اردو'' ہے۔ ڈاکٹر منور راہی فرماتے ہیں کہ:

''مکالمے کی وجہ سے سینما دیکھنے والوں کی بھیڑ امڈتی ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری جان پڑتا ہے کہ

ہندوستانی فلموں کے مکالمے بہر حال اردو زبان میں ہوتے رہے ہیں۔اب تک کی بڑی فلمیں، ایوارڈ یافتہ فلمیں کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہیں تو اس میں اردو میں لکھے گئے مکالمے کی کلیدی حیثیت رہی ہے۔"

آخری مضمون "اردو صحافت اور فلم" کے عنوان سے ہے۔اردو صحافت نے اخبارات، رسائل و جرائد کے ذریعہ فلموں کا تعارف قارئین اور عام لوگوں سے کرایا۔اس لئے اردو صحافت کا فلموں کی دنیا میں ایک بڑا کردار رہا ہے۔

کتاب کے بیک کور پر ابو بکر عباد (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) کی مختصر لیکن مدلل اور پر مغز رائے ہے۔اس طرح یہ کتاب ادبی دنیا کے لئے ایک حسین تحفہ ہے۔

- **کتاب کا نام: اردو کی عصری صدائیں مصنف: غلام نبی کمار اشاعت: ۲۰۱۸ء، ص: ۳۶۰ قیمت: ۳۰۰ روپے پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر احسان عالم (دربھنگہ)**

کشمیر کی حسین وادیوں میں اپنی زندگی کے خوشگوار لمحات گزارنے والے نوجوان ادیب، ناقد اور محقق غلام نبی کمار کا شمار آج ملک کے معتبر قلمکاروں میں ہونے لگا ہے۔غلام نبی کمار نے اردو تنقید کے میدان میں مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم بڑھاتے ہوئے مختلف رسائل و جرائد کے ذریعہ مختلف اصناف ادب کی کتابوں پر تبصرے کرتے ہوئے تخلیق کے معنوی حسن اور بیانات کی پاکیزگی کو قارئین کے سامنے پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

غلام نبی کمار کی پیش نظر کتاب "اردو کی عصری صدائیں" تحقیقی و تنقیدی مضامین سے آراستہ کی گئی ہیں۔ان کی اس گلدستہ نما کتاب میں ۷۵ مضامین ہیں۔۳۶۸ صفحات پر مبنی اس کتاب میں مطالعہ کے لئے بہت کچھ ہے۔ الگ الگ صنف سے ذوق رکھنے والوں کے لئے مختلف قسم کے مواد بھرے پڑے ہیں۔کتاب کے دائیں فلیپ ہر حقانی القاسمی صاحب کے تاثرات ہیں جب کہ بائیں فلیپ پر ڈاکٹر مشتاق عالم قادری (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) کے تاثرات ہیں۔بیک کور پر پروفیسر عبدالستار ردلوی نے اپنی عمدہ رائے قائم کی ہے۔

کتاب کی شروعات پروفیسر صادق (سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) کے تقریظ سے ہوئی ہے۔اس میں انہوں نے غلام نبی کمار کی شخصیت اور ان کی تحریروں کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔وہ فرماتے ہیں:

> "غلام نبی کمار نوجوان ہیں، حوصلہ مند ہیں، ان میں وہ نوجوانانہ جوش و جذبہ بھی بدرجۂ اتم موجود ہے جو انہیں یقیناً بہت آگے لے جائے گا۔گذشتہ چند ہی برسوں میں انہوں نے ایک سو سے زیادہ کتابوں پر تبصرے لکھے ہیں۔"

غلام نبی کمار اپنے "پیش لفظ" میں کتاب "اردو کی عصری صدائیں" سے متعلق مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اردو کی عصری صدائیں" میں مختلف موضوعات اور اصناف کی کتابوں پر پچھتر تبصرے نما مضامین شامل ہیں جو رواں صدی کی شائع شدہ کتابوں پر تحریر کئے گئے ہیں اور ان کتابوں کے قلم کار اور ادیب و شاعر حضرات بھی اسی عہد کے ہیں۔اس کتاب کے تمام مضامین ہندوستان کے مؤقر رسائل اور اخبارات میں مختلف اوقات میں شائع ہو چکے ہیں۔"

کتاب کے چند اہم مضامین ''مناظر عاشق ہرگانوی کی تنقیدی نظر: ابن صفی کے اداریے پر، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کے کے مقالات کا تجریاتی مطالعہ، پروفیسر ارتضی کریم کی فکشن وشعری تنقید، پروفیسر مجید بیدار کی نظر میں کارآمد ادب، ڈاکٹر قمر جہاں کی تانیثی تنقید، ظہیر غازی پوری: غزل اور فن غزل، ناوک حمزہ پوری کا دست جنوں، ڈاکٹر عباس رضا نیر کی رثائی تنقیدیں، شوکت پردیسی کی مضمون نگاری، دیپک بدکی: اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار، خورشید حیات: لفظ تم بولتے کیوں ہو؟، ابرار احمد اجراوی: ادب امکان کے امکانات، ڈاکٹر منصور خوشتر: اردو ناول کا رسیا، انور آفاقی: لمسوں کی خوشبو کا آئینہ دار شاعر، ڈاکٹر قیام نیر: بحیثیت افسانہ نگار، سلمان عبدالصمد: لفظوں کا لہو: ایک جائزہ، انوار الحسن وسطوی کا فن پارہ: نقوش قلم وغیرہ کافی متاثر کرتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں رواں صدی کی ادبی صحافت عنوان کے تحت ''دربھنگہ ٹائمز، اردو جرنل پٹنہ، آبشار، تریاق، ثالث، شمع حیات، تحقیق، دسترس، صدف وغیرہ پر غلام نبی کمار نے طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ اس طرح یہ کتاب دستاویزی حیثیت کی حامل بن گئی ہے۔ کتاب کی اشاعت پر دل کی عمیق گہرائیوں سے غلام نبی کمار کو مبارک باد۔

....

● **کتاب کا نام: مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاک ٹکٹ کی اعزازیابی مصنف: ایڈوکیٹ صفی الرحمٰن راعین ص: ۱۹۲ اشاعت: ۲۰۱۸ء قیمت: ۲۵۰ روپے پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مبصر: ڈاکٹر احسان عالم (دربھنگہ)**

پیش نظر کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاک ٹکٹ کی اعزازیابی'' ایڈوکیٹ صفی الرحمٰن کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں کل ۲۹ مضامین شامل ہیں۔ تمام مضامین پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی شخصیت اور ادبی خدمات کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ پہلا مضمون ڈاک ٹکٹ کی اعزازیابی سے متعلق ہے۔ دوسرا مضمون کافی اہم ہے جو ''مناظر عاشق ہرگانوی: عالمی امن کے علمبردار'' کے عنوان سے اس کتاب میں شامل ہے۔ اپنے پہلے مضمون میں صفی الرحمٰن راعین لکھتے ہیں کہ :

> ''ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ۲۱ ویں صدی کی عہد ساز شخصیت ہیں۔ آپ وطن میں اور عالمی سطح پر امن چاہتے ہیں۔ جن کی جگہ معاشی خوشحالی اور نفرت کی جگہ بھائی چارگی اور محبت کا پیغام آپ دنیا کو دینا چاہتے ہیں۔ ایٹمی جنگ اور کیمیکل وار کی جگہ ہر تحریک، سفید تحریک اور تعلیمی تحریک کے لئے ہم متحرک ہوں۔ آنسوؤں اور چیخوں کی جگہ خوشیاں اور مسکراہٹ ہو۔ یہ ان کی تمنا ہے۔''

تیسرا اہم عنوان ''دہشت گردی سے متنفر شخصیت'' ہے۔ یہ عنوان اپنے آپ میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کے بہت سے ادیبوں نے دہشت گردی کے خلاف اپنی صدائیں بلند کی ان میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا نام بھی کافی نمایاں ہے۔

اس کتاب کے بقیہ مضامین ''فسادات کو بھوگنے والے فنکار، نیویارک میں اردو غزل کے ناقد، اردو ادبی صحافت کے مینار، ''کوہسار جرنل'' کے مالک و مدیر، شادی کی فکر انگیزی کے شیدائی، اپنی کتابوں کا اعتراف کرنے والے، مدھوکر گنگادھر کے ریڈیو ناول کے مترجم، پریمی رومانی کی ناقدانہ جہات کے مصور، لسانی لغت کا تاریخی کارنامہ انجام

دینے والے، شین مظفر پوری سے آشنائی کا اظہار، سید ظفر ہاشمی کے نابغہ ہونے کے معترف، نعتیہ مجموعہ میں عشق نبی کی خوشبو پھیلانے والے، اننگ پردیس کے مورخ، ''عضویاتی غزلیں'' کے تنہا شاعر، ''سلسلے اجالوں کے'' پھیلانے والے، افسانچہ نگار کی حیثیت سے، سماجی استحصال کے افسانہ نگار، ادبی سمندر، تاثرات کے دائرہ میں، پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دلانے والے پروفیسر، اردو شاعری میں فکری اساس کے صورت گر، ظرافت نگار کی حیثیت سے، درس و تدریسی ویژن کے مالک، تنقیدی شعور کے ناقد، طرز آپ کی طرز بیانی کے شاہد، ''شبنمی لمس کے بعد'' کے انوکھے ناول'' ہیں۔ کئی مضامین مناظر عاشق ہرگانوی کے حوالے سے کافی عمدہ ہیں۔

کتاب کا ایک معیاری مضمون'' مناظر عاشق ہرگانوی: اردو ادبی صحافت کے مینار'' ہے۔ اس میں کتاب کے مصنف نے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی ادبی خدمات کا جائزہ ایک صحافی کی حیثیت سے لیا ہے۔ مختلف ادبی رسائل نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی ادبی اور صحافتی خدمات پر خصوصی شمارے شائع کئے ہیں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے بھی ان کا خیال ہے کہ کام اردو کے لئے ہونا چاہئے۔ اردو کی مستقبل کا معاملہ سامنے ضرور ہونا چاہئے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ایک رسالہ'' کوہسار جرنل'' نکالتے ہیں۔ اس سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ:

> ''کوہسار جرنل صوری اور معنوی دونوں صورتوں میں دلکش، خوشنما اور خوب تر ہے۔ اس میں معیار سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ ایک معیاری ادبی رسالہ ہے جو ادبی خدمات، مزاج، معیار اور مقبولیت کے اعتبار سے تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ تجرباتی شعری اصناف کی ترسیل کی وجہ سے اس نے اپنا منفرد مقام بنایا ہے۔ اہل ذوق و اہل علم مطالعہ کے بعد اس کے گرویدہ ہوتے رہے ہیں۔''

اس طرح یہ کتاب پروفیسر مناظر عاشق ہرگاوی کے ادبی خدمات پر اچھی کتاب ہے۔ کتاب کی پرنٹنگ اور کمپوزنگ عمدہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔

....

- **کتاب کا نام: مناظر عاشق ہرگانوی کی ادبی فن کاری مصنف: ایڈوکیٹ صفی الرحمٰن راعین اشاعت: ۲۰۱۷ء ص: ۱۹۲ قیمت: ۳۰۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مبصر: ڈاکٹر احسان عالم (دربھنگہ)**

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ایک معتبر اور توانا شخصیت ہیں جنہوں نے اردو ادب میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ آپ کی شخصیت کافی مقبول و محترم ہے۔ اردو کی شاید بہت کم ایسی صنف ہو جس میں آپ نے طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ آپ کو شخصیت کا ایک اہم پہلو کسی سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے کا منفرد انداز بھی ہے۔ ایسا انداز جس کی وجہ سے ہر بڑا چھوٹا، سینئر جونیئر آپ کو اپنا دوست تصور کرنے لگتا ہے۔ آپ کی اسی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے صفی الرحمٰن راعین نے پیش نظر کتاب'' مناظر عاشق ہرگانوی کی ادبی فنکاری'' تخلیق کی ہے۔

کتاب'' مناظر عاشق کی ادبی فنکاری'' میں ۲۲ رمضامین ہیں۔ جس میں ۱۶ رمضامین اردو میں، ۳ رانگریزی میں اور ۳ رہندی میں ہیں یعنی مصنف نے اس کتاب کو گنگا جمنی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

مصنف صفی الرحمن نے اپنا پیش لفظ" مناظر ویژن.....اور مشن" کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔انہوں نے مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کی شخصیت کو پیش کرنے کے لئے بہت سے خوبصورت جملوں اور اشعار کا استعمال کیا ہے۔ پیش لفظ کا مطالعہ بغور کرنے کے بعد کتاب کی خوبیوں اور موضوعات کی وسعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ Morning shows the days. کے مصداق ان کا یہ پیش لفظ کافی اہم ہے۔کتاب کا پہلا مضمون" مناظر عاشق ہرگانوی :عہد ساز شخصیت" ہے۔اس میں مصنف نے مناظر عاشق ہرگانوی کی شخصیت کو بڑی چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ واقعی ان کی شخصیت ایسی ہے جو تعریف کے لائق ہے۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تخلیقات میں سادگی، شگفتگی، تخلیقی بیداری ہر جا نظر آتی ہے۔ان ساری خوبیوں کا اعتراف بھی صفی الرحمن راعین نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے۔

دوسرا مضمون" مناظر عاشق ہرگانوی اور تنقیدی زاویے" ہے۔پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ایک معروف ناقد ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تنقید پر ان کی تقریباً ایک سو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔"تنقیدی زاویے" بھی تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔اس میں عصر حاضر کے مسائل اور ادبی تقاضوں کو پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا ایک معیاری مضمون" مناظر عاشق ہرگانوی :ظرافت نگار" ہے۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی دلچسپی طنز و مزاح سے بھی ہے۔اس سلسلہ میں ان کی اہم کتاب" ادب میں گھوسٹ ازم" ہے جو کافی مقبول ہوئی۔

" مناظر عاشق ہرگانوی کی شاعری کا تنوع" نے اس کتاب کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ایک کثیر الجہات شاعر ہیں۔آپ نے نظمیں، غزلیں، گیت، دوہے، ریختا، ہائیکو، کہمن ، کہہ مکرنی، غزالہ، غزل نما، آزاد غزل، نعت اور حمد جیسی اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے اور سب میں کامیاب بھی رہے ہیں۔شعری سلسلہ کا ایک عمدہ مضمون" مناظر عاشق ہرگانوی کی شاعری میں مقصدیت" ہے۔کسی فنکار کے کسی بھی فن کا ایک مقصد ہوتا ہے۔وہ سماج اور ملک وملت کو کوئی نہ کوئی پیغام اپنے فن کے ذریعہ دینا چاہتا ہے۔ یہ خوبی ڈاکٹر مناظر عاشق کی شاعری میں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔آپ ادبی بصیرت کے ساتھ ساتھ ادب کی مقصدیت اور افادیت پر پوارا زور صرف کرتے نظر آتے ہیں۔

" مناظر عاشق ہرگانوی :افسانچہ کے عکاس" کے عنوان سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی پیش کردہ ایک اور صنف افسانچہ نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔افسانچہ بھی ایک مقبول اور پسندیدہ صنف ہے۔افسانچہ، افسانے کا ہیئتی تجربہ ہے۔ان کے علاوہ دیگر مضامین مثلاً" مناظر عاشق ہرگانوی اور ندا فاضلی سے وابستگی، مناظر عاشق ہرگانوی اور کوکن کا فردوسی ساحر، مناظر عاشق ہرگانوی کی منصور عمر شناسی، مناظر عاشق ہرگانوی کی تنقید میں مہر زریں کا فن، مناظر عاشق ہرگانوی اور" سناٹوں کا شور" وغیرہ کافی متاثر کرتے ہیں۔صفی الرحمن راعین کی یہ کتاب جو ۱۹۲ صفحات پر محیط ہے کافی معلوماتی ہے۔جس میں عمیق افکار کی جلوہ گری ملتی ہے اور ناقدانہ بصیرت دیکھی جا سکتی ہے۔

....

- کتاب کا نام :ایجادات (مجموعۂ حالیہ) موجد و مصنف :مبین صدیقی اشاعت :۲۰۱۸ء، ص :۲۷۶ قیمت :۵۰۰ روپے ناشر :ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مبصر :ڈاکٹر احسان عالم (دربھنگہ)

مبین صدیقی کی تصنیفات کا سلسلہ ۱۹۹۸ء میں شروع ہوا۔ ''حالیہ'' کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور پذیرائی کے مراحل سے گزر چکے ہیں۔ حالیوں کا پہلا مجموعہ ''سائنٹسٹ'' (۱۹۹۸ء)، دوسرا مجموعہ ''سحر مبین'' (۲۰۰۴ء) اور موجودہ مجموعہ ''ایجادات'' ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ ایک تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اکسیر'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اکسیر'' پر ۲۰۱۲ء میں بہار اردو اکیڈمی کی جانب سے پروفیسر عبدالمغنی ایوارڈ مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ کئی کتابیں کمپوزنگ اور اشاعتی مراحل سے گزر رہی ہیں۔ نزد مستقبل میں ان کی اشاعت متوقع ہیں۔

تقریباً ۳۰ سال قبل دنیائے فکشن میں ایک نئے اسلوب اور ایک نئی صنف ''حالیہ'' کی بنیاد پڑی۔ سلسلہ چلتا رہا۔ اب وہ گھڑی آ گئی ہے جب مبین صدیقی صاحب کی کاوش کو لوگ سراہنے لگے ہیں۔ پیش نظر کتاب ''ایجادات'' کا انتساب بھی مصنف نے بڑے انفرادی انداز میں تحریر کیا ہے۔

۲۷۶ صفحات پر محیط اس کتاب میں مبین صدیقی نے اپنے پیش لفظ کے بعد ''حالیہ'' کو مختلف عنوانات کے تحت سجایا ہے۔ حصہ اول میں مختصر اور مختصر ترین ''حالیہ'' ہیں جن کے چند اہم مضامین التجا، علم کی گارنٹی (دونوں مضامین بچوں کے لئے ہیں) اے مصور، سائنٹسٹ، اگر فردوس برروئے زمیں است، کھنڈر کھنڈر روشنی، اوقات نمبر ایک، رنگ ہائے کیف، عجیب الخلوق، ایجادات ہیں۔ حصہ دوم میں طویل اور طویل ترین حالیے ہیں جن کے عنوانات سحر مبین، رت جگے، خوش آمدید بطن گیتی سے، حصہ سوم کے تحت حالیہ کی شعریات اور حالیہ کی ایجاد سے متعلق گفتگو ہے۔ کتاب کے آخری صفحات پر مشاہیر کی آراء شامل اشاعت ہے۔ آخری صفحہ پر مصنف کا تعارف ہے۔ اپنے پیش لفظ ''کلمۂ تشکر'' میں مبین صدیقی اپنے شائستہ اور شگفتہ لہجے میں فرماتے ہیں:

> ''ایجادات'' میں نئے حالیوں کے علاوہ ''سحر مبین'' کے تمام حالیوں کا مقدمہ ''حالیہ کی شعریات'' کو ترمیمات سے گزار کر نئے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ حالیہ کی ایجاد و اختراع کے بیان میں ایک نیا مقدمہ ''حالیہ کی ایجاد'' بھی شاملِ ''ایجادات'' ہے۔ اب، خاکسار کی دعا ہے کہ اس نئی صنف ''حالیہ'' کے ذریعہ نہ صرف ہم فخر و انبساط حاصل کر سکیں بلکہ کافی و شافی طور پر بصیرت و رہنمائی اور حکمت و دانائی بھی ہمارے شاملِ حال ہو جائے۔''

''حالیہ'' کے مطالعہ سے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ اس میں شاعری اور فکشن کا سنگم اس حسین طور پر ہوا ہے کہ یہ خود ایک نئی صنف معلوم پڑتی ہے۔ موجد صنف نے اسے ''حالیہ'' نام دیا ہے۔ اس کی انفرادیت کو دیکھتے ہوئے اسے ایک نئی صنف مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

''حالیہ'' میں موجودہ دور کا تصور ہے۔ اس کا لگاؤ ماضی اور مستقبل سے ہو سکتا ہے لیکن جو بھی گفتگو ہوگی وہ حال میں ہی ہوگی۔ موجد حالیہ نے اپنے جذبات و احساسات کو اس نئی صنف کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ایک مختصر ترین حالیہ ''رنگ ہائے کیف'' ہے، اسے پیش کرتے ہوئے میں اپنے خیالات کی ترجمانی کرنا چاہتا ہوں:

''نیک تار یکی میں اس نے پھولوں کو دیکھا، بڑھ کران کی سمت اس نے جو ہاتھ پھیلائے تو نیم تاریکی نے روشنِ تیز تر کی جانب اپنے قدم بڑھا دئے اور پھولوں سے سسکنے کی صدائیں ابھرنے لگیں!''

اس مختصر ''حالیہ'' میں روشنی، اندھیرا، پھول سب ایک کردار ہے جو آپس میں مل کر ایک خاص قسم کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ایک دوسرا حالیہ ''عجیب المخلوق'' کے عنوان سے ہے۔اس میں وقفہ کے ساتھ کچھ پلاٹ اور مکالمے ہیں۔اس کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ چند ایسے حالیے بھی ہیں جنہیں اسٹیج پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔اس طرح یہ حالیہ بھی نئی صنف کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔اس میں تاریکی، سمندر، روشنی، شعلے الگ الگ کردار کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔مبین صدیقی صاحب کی اس نئی صنف ''حالیہ'' کی پذیرائی بہت سے ادیبوں اور دانشوروں نے کی ہے۔

مختصر طور پر راقم الحروف کے مطالعہ کی روشنی میں ایسا معلوم پڑتا ہے کہ مبین صدیقی کی یہ صنف ''حالیہ'' جو فی الحال ''ایجادات'' کی شکل میں ہے شعری، افسانوی اور ڈرامائی تینوں صنفوں کی خوبیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں لیکن تمام باتیں حال میں بیان کی گئی ہیں خواہ ان کا تعلق ماضی کا مستقبل سے کیوں نہ ہو۔ان کی یہ صنف توجہ اور مطالعہ طلب ہے۔

....

- **کتاب کا نام: درسگاہ اسلامی: فکر و نظر کی بستی مؤلف: ڈاکٹر عبدالودود قاسمی اشاعت: ۲۰۱۸ء ص: ۴۰۰ قیمت: ۳۰۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر احسان عالم (دربھنگہ)**

''درسگاہ اسلامی: فکر و نظر کی بستی'' ۴۰۰ صفحات پر محیط ہے جسے ڈاکٹر عبدالودود قاسمی نے ترتیب دیا ہے۔کتاب کے شروعات میں حمد پاک، نعت پاک، پیش لفظ کے علاوہ چند اہم شخصیتوں کے ذریعہ تحریر کئے گئے تاثرات ہیں۔ صفحہ ۴۹ر سے ۷۱ر تک چند نامور ہستیوں مثلاً حضرت مولانا محمد یوسفؒ، ڈاکٹر عبدالوہاب، پروفیسر وہاب اشرفی، ڈاکٹر خلیق انجم، مولانا و قاضی محمد قاسم مظفر پوری، حضرت الحاج ماسٹر محمد قاسم، حضرت مولانا محمود الحسن گرولوی، مولانا محمد اشفاق سلفی، جناب نیر الزماں، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، مولانا محمد اشرف علی، ڈاکٹر محمد شمیم احمد، مولانا محمد عالم قاسمی، جناب عبدالقیوم انصاری، ماسٹر اسد احمد، ڈاکٹر محمد رحمت اللہ اور ڈاکٹر عبدالسلام خاں صاحبان کے پیغامات ہیں۔

''درسگاہ اسلامی: فکر و نظر کی بستی'' کو ڈاکٹر عبدالودود قاسمی نے چھ ابواب میں تقسیم کیا۔باب اول میں درسگاہ اسلامی ابتدا، تا حال ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے۔کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات سے متعلق مواد کو حاصل کرنے میں ڈاکٹر عبدالودود قاسمی نے بڑی عرق ریزی کی ہے۔باب دوم میں درسگاہ اسلامی اور مدرسہ تجوید القرآن ماضی کے جھروکوں سے دستاویزوں کے عکس اور نقوش پیش کئے گئے ہیں۔باب سوم میں اکابر اور چند ابنائے قدیم کے مضامین ہیں۔باب چہارم میں سپاس نامے، باب پنجم میں سکریٹری رپورٹ ہے۔باب ششم میں چند اہم اہل علم و دانشوران کے تاثرات سے اس کتاب کو سجایا سنوارا گیا ہے۔

کتاب کے زیادہ تر مشمولات ڈاکٹر عبدالودود قاسمی کے اپنے رشحات قلم ہیں۔وہ اس ادارے سے لمبے عرصے تک وابستہ رہے ہیں۔پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہو کر ادارہ کی ترقی کے لئے کوشاں رہے ہیں۔درسگاہ اسلامی کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبدالودود قاسمی تحریر کرتے ہیں کہ ''درسگاہ اسلامی قیام کے روز اول سے آج اپنی اصلی

روح کے ساتھ تعلیمی مشن پر قائم ہے، جہاں بچوں کو معمولی فیس لے کر اسلامی ماحول میں سی بی ایس ای نصاب کے تحت تعلیم سے آراستہ کیا جا رہا ہے، درسگاہ کا ماضی کافی تابناک رہا ہے۔"

درسگاہ اسلامی پرانی منصفی ۱۹۶۹ء سے اب تک محدود وسائل و ذرائع اور منفرد نظام کے تحت چل رہا ہے۔ اس طویل عرصہ میں درسگاہ نے بہت سے نشیب و فراز کے مراحل طے کئے ہیں۔ جن لوگوں نے درسگاہ کو قریب سے نہیں دیکھا یا اس کے بارے میں بہت زیادہ جانکاری نہیں رکھتے ہیں۔ ان کے لئے یہ کتاب درسگاہ کو سمجھنے اور جاننے میں کافی معاون ثابت ہوگی۔

آج ملک و ملت کو بہت سے مسائل درپیش ہیں۔ نوجوان اور نئی نسل بے راہ روی اور بدعملی کے شکار ہیں۔ باصلاحیت اور تعلیم یافتہ طبقہ جس طرح بے کار اور بے روزگار ہے ان سبھی گوشوں پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ عبدالودود قاسمی نے اس درسگاہ کی تاریخ رقم کر کے اہل علم، تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص درس و تدریس سے وابستہ اساتذہ کرام، منتظمین اور طلبہ و طالبات کے سامنے ایک دینی اور انقلابی تحریک پیش کی ہے۔ بلاشبہ اپنے آپ میں یہ ایک مثالی کارنامہ ہے۔ اس تاریخی اور دستاویزی کتاب کے مرتب ڈاکٹر عبدالودود قاسمی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ابو نصر فاروق صارم عظیم آبادی کے دو شعر کے ساتھ اپنی تحریر ختم کرتا ہوں:

درس گاہِ منصفی خورشید علم و آگہی — حکم سے خالق کے یہ ایک شمع روشن ہوگئی
جن کے ہاتھوں میں ہے اب اس گل بدن کی آبرو — فرض ہے ان کا رہے ہر حال میں یہ سرخ رو

....

- **کتاب کا نام: "نقد و لفی" مصنف: "جمال اُویسی" اشاعت: ۲۰۱۸ء ص: ۲۸۸ قیمت: ۵۰۰/روپے**
رابطہ: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی مبصر: ڈاکٹر احسان عالم (دربھنگہ)

سرزمین دربھنگہ نے بہت سے ناقدین ادب، ادبا و شعرا کو جنم دیا ہے۔ ان میں ایک اہم نقاد اور شاعر ڈاکٹر جمال اویسی ہیں۔ ۱۹۷۷ء سے وہ نظمیں اور غزلیں لکھتے آرہے ہیں۔ تنقیدی مضامین لکھتے رہنے کے سبب انہیں نقاد بھی سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کتاب میں ۴۲ مضامین ہیں جن میں سے چند شخصیت پر ہیں تو چند اردو ادب کی مختلف اصناف پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ڈاکٹر جمال اُویسی کی شاعری ہو یا نثر ایک منفرد حیثیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنی تحریر میں بھرتی کے لئے کوئی جملے یا اقتباسات استعمال نہیں کیا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین تنقیدی ہوں یا تحقیقی ایک الگ معیار رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اویسی کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ گنتی کی کتابیں لکھنے کی ہوڑ میں شامل نہیں ہیں۔ کتابیں کم ہوں لیکن معیار سے سمجھوتہ نہیں کرتے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اردو ادب کو کچھ دیا جائے۔ ایسی چیزیں تحریر کی جائیں جو حوالے کے طور پر آنے والی نسلوں کے لئے سودمند ہو سکیں۔

کتاب کا پہلا مضمون "چند خیالات مرزا غالب کی شاعری کے ضمن میں" ہے۔ غالب ایک مخصوص نقطۂ نظر کے شاعر ہیں۔ ان کے اشعار کی روشنی میں انسانی زندگی کے بہت سارے معاملات سامنے آجاتے ہیں جن کے

تجربہ سے ایک عقل مند آدمی واقعی کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اجتبیٰ رضوی ملت کالج کے پرنسپل اور ایل این ایم یو کے پرووائس چانسلر رہ چکے تھے۔ ان پرڈاکٹر جمال اویسی نے ایک طویل مضمون تحریر کیا ہے۔ ان کی نظموں، غزلوں اور رباعیات کے حوالے سے موصوف نے گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر جمال اویسی نے ''ن م راشد کے تعلق سے چند باتیں'' کے عنوان سے ایک پرمغز مضمون پیش کیا ہے۔ ''اختر الایمان کی نظمیں'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔ اختر الایمان اردو نظموں کا ایک بڑا اور معتبر نام ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے جمال اویسی فرماتے ہیں:

''اختر الایمان کی شاعری پر لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس طرح کہ اردو کی نظمیہ روایت کو سامنے رکھتے ہوئے اختر الایمان کی نظموں کی ہیئت، پیکر، فکر و معانی سے ایک عمومی بحث کر لیجیے بات بن جائے گی لیکن اختر الایمان کی نظموں پر سنبھل کر کوئی رائے دینا، کوئی نتیجہ خیز گفتگو کرنا انتہائی مشکل کام ہے کیونکہ اختر الایمان کی نظموں کو اس طرح نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ بھی دیگر نظم نگاروں کی طرح ایک نظم نگار ہیں۔''

''ن م راشد کے تعلق سے چند باتیں، میراجی ایک اجنبی مسافر، اختر الایمان کی نظمیں، اختر الایمان کی شاعری سے ایک بحث، وزیر آغا کی غزلیں، جدید اردو ادب کا اینگری ینگ مین مظہر امام، سید امین اشرف بہ حیثیت غزل گو، شہریار بہ حیثیت غزل گو، محمود ایاز کی شاعری، عرفان صدیقی کی غزل، زبیر رضوی کش مکش اور کشاکش کے درمیان، معاصر اردو غزل: نئے تنقیدی تناظر، مابعد جدید غزل کے پیش رو، آج کی بڑی شاعری کیا ہے؟ نئی شاعری کا مزاج، اردو غزل ۱۹۸۰ء کے بعد، اردو تنقید: ایک بازدید، وزیر آغا: ایک سربرآوردہ نقاد، محمد حسن کے تنقیدی افکار، پروفیسر محمد حسن کے تعلق سے چند باتیں، پروفیسر وہاب اشرفی میری نظر میں، ابوالکلام قاسمی کی تنقید نگاری، تنقید اور ادب کا رشتہ، ناول کو سمجھنے کی ایک کوشش'' وغیرہ اس کتاب میں شامل ایسے مضامین ہیں جسے پڑھنا چاہئے۔ یہ سارے مضامین کافی معلومات افزا ہیں۔

....

- **کتاب کا نام: حسن رہبر ایک منفرد افسانہ نگار مرتب: ڈاکٹر احسان عالم قیمت: ۳۰۰ روپے ص: ۲۰۸ اشاعت: ۲۰۱۸ء پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مبصر: صفی الرحمن رائی، دربھنگہ**

حسن رہبر مشہور افسانہ نگار ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ان کے افسانوی مجموعے ''ایک پل کا فاصلہ، چسکا، آگے راستہ بند ہے اور افسانچوں کا مجموعہ ہر بوند سمندر ہے'' ناقدوں کی تبصرات و تاثرات شامل ہیں۔ اس میں ۳۵/ ناقدان ادب کے جائزے بہت خوب، بہت عمدہ اور بے حد دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں جسے ناقد ڈاکٹر احسان عالم نے دیرینہ تجربات، مشاہدات اور باریک بینی کی ہنرمندی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ ممتاز افسانہ نگار کا پہلا افسانہ ''ٹھوکر'' شائع ہوا تھا۔ ایک پل کا فاصلہ میں ۱۸، چسکا میں ۲۱، آگے راستہ بند ہے میں ۱۲۳ افسانے اور ہر بوند سمندر میں ۹۵/ افسانچے عصری تقاضات کے آئینے میں بے حد پرکشش اور جاذب نظر انداز میں پیش کئے گئے ہیں جس میں عصری سماجی عکاسی اور انسانی نفسیات کی تصویر کشی ملتی ہیں جو فنی تکنیک سے پرکشش اور معیاری ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر احسان عالم نے ادبی فنی صلاحیت سے عصری پیغامات سے لبریز افکار اور خلوص کے ساتھ انسانیت کے حق میں بیداری کے جذبات کو اس کتاب کے صفحات پر پیش کیا ہے۔اس سے افسانہ نگار حسن رہبر کے محسوسات اور خیالات فنی جوہر کے ساتھ کردار کی شکل میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔وہ منفرد اسلوب اور طرز بیان سے مختلف موضوعات میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے تجربے و تکنیک سے دلکش بنادیتے ہیں۔

زیرنظر کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر احمد حسن دانش، ڈاکٹر احسان عالم، ایڈوکیٹ صفی الرحمٰن راعین، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر عطا عابدی، پروفیسر اسد الزماں وغیرہ نامور فنکاروں کے تبصرے و تاثرات کے ذریعہ ڈاکٹر احسان عالم افسانہ نگار کے افسانوں کی خوبیوں اور خصوصیات کو منور کرتے ہیں۔ پروفیسر حامد چھپردی، آذر ابراہیم، ڈاکٹر رضوان احمد، ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے افسانوں کو مختلف جہتوں سے اجاگر کیا ہے جو افسانے کی فنکارانہ خوبیوں سے وابستہ ہیں۔

زیرنظر کتاب کو ڈاکٹر احسان عالم نے بیتے لمحے، گزری باتیں، موج ادب کی ہنگامہ آرائیاں، تخلیقی جائزے کا فنی و جمالیاتی پہلو کے تین اہم ابواب میں سجایا ہے تاکہ افسانوں کا کوئی پہلو اور فکر وفن کا کوئی زاویہ رہ نہ جائے اور نہ ہی کسی قلم کار کا جائزہ رہ جائے۔ خواتین قلمکاروں میں ڈاکٹر قمر جہاں، ڈاکٹر خالدہ ناز اور راشدہ خاتون نے اپنے جائزے میں لکھا ہے کہ کبھی افسانوں میں افسانہ نگار نے کہانی پن کا دامن ہاتھوں سے جانے نہیں دیا ہے۔افسانوں میں پلاٹ کی ساخت، کرداروں کا عمل اور سماج میں ان کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ افسانہ نگار فنی نکات سے پوری طرح واقف ہیں۔ قاری کی دلچسپی افسانے کے نقطۂ عروج تک یکساں طور پر برقرار رہتی ہے۔ ڈاکٹر احسان عالم کی خوش نما مرتب شدہ پیش نظر کتاب سے یہ پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ افسانوں کی تخلیق کے ذریعہ عصری سماج کی تمام بدنظمیوں کی جگہ انسانی اقدار سے آراستہ سماج کی تشکیل ہو۔جس سے سماج و ملک کی ترقی ہو۔ زبان و بیان کی روانی اور شگفتگی پیش نظر کتاب کی نمایاں خوبی ہے جو ڈاکٹر احسان عالم کے مطالعہ کی وسعت و گیرائی اور قوت خامہ فرسائی کا ماحصل ہے۔

....

● **نام کتاب: سوز و سازِ حیات مصنف: ڈاکٹر عبدالوہاب اشاعت: ۲۰۱۹ء قیمت: ۳۰۰ روپے**
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر احمد معراج، کولکاتا

''سوز و سازِ حیات'' ڈاکٹر عبدالوہاب کی خودنوشت سوانح عمری ہے جس میں ان کی زندگی کے قوس قزح کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب ایک ماہر سرجن، انسانیت نواز اور دوراندیش شخص تھے۔ ساری زندگی خدمت خلق کو اپنا اولین فریضہ سمجھتے رہے۔ قوم وملت کی خاطر اسکول، شفاخانہ، لائبریری وغیرہ قائم کیا۔ شہر کے معروف سماجی، ملّی و علمی اداروں سے ان کا انسلاک رہا۔ غرض کہ اپنی زندگی انہوں نے قوم کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی۔

''سوز و سازِ حیات'' میں ڈاکٹر عبدالوہاب کی متحرک اور قابلِ تقلید زندگی کے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ بقول ڈاکٹر امام اعظم ''یہ رسمی اور روایتی انداز کی کتاب نہیں بلکہ خلوص و سچائی کی وابستگی

کا شناخت نامہ بھی ہے۔'' سوانح نگار نے واقعاتِ حیات کو مختلف عنوانات کے تحت قلم بند کیا ہے جس سے قارئین کو کتاب کے مطالعہ اور اس کی تفہیم میں کافی مدد ملے گی۔ کتاب میں موجود بعض عنوانات ایسے ہیں جو قارئین کو نہ صرف پہلی نظر میں چونکاتے ہیں بلکہ ان کے دل میں کتاب پڑھنے کی للک بھی پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر صفحہ کو پڑھنے کے بعد قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کچھ عنوانات یہ ہیں:

ڈاکٹر جو اسکول کا ٹیچر بھی تھا، داستان مشروط شادی کی، آخری شرط کا دھماکہ، ایماندار رشوت خور، ڈاکٹر بکریاں بیچتے ہیں، لچھے دار لکھنوی ڈاکٹر، ڈاکٹر کی بیماریاں وغیرہ۔

کہا جاتا ہے کہ سفر باعث ظفر ہوتا ہے۔ اس سے انسان کے تجربات و مشاہدات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مختلف علاقوں کے رسم و رواج، معاشی نظام، لوگوں کے اخلاق، عادات و اطوار، ان کی ذہنیت وغیرہ کا حقیقی علم سفر سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب کی وسیع النظری میں ان کے اسفار کا بھی بڑا دخل رہا ہوگا۔ اس کتاب میں جس محبت و احترام سے انہوں نے اپنے محسنین کو یاد کیا ہے وہ ان کے اچھے انسان ہونے پر دال ہے۔ اپنے کرم فرما مرحوم حسنین سید کا ذکر اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ آپ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے:

''میرے دل و دماغ، مزاج وطبع میں مکمل طور پر تبدیلی کا سہرا جناب مرحوم حسنین سید کے سر جاتا ہے۔ میری روح کی گہرائیوں میں دین اسلام کی جڑیں اتارنے میں سب سے اہم رول اسی مردِ مومن کا ہے......''

''سوز و سازِ حیات'' ایک دستاویزی حیثیت کی حامل کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالوہاب کی شخصیت کتنی تہہ دار تھی۔ آخری باب میں موصوف کے بچوں اور احباب کے تاثرات موجود ہیں جن سے ان کی شخصیت کی دل آویزی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ طرزِ تحریر شگفتہ ہے۔ جزئیات نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی ہے جس سے کتاب کی معنویت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور اچھی کوالیٹی کا کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔ کتاب کی پشت پر ڈاکٹر عبدالوہاب کی نورانی تصویر موجود ہے جو آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی ہے۔

میری خوش نصیبی ہے کہ انتقال سے چند روز قبل دربھنگہ میں ان سے میری ملاقات ڈاکٹر امام اعظم اور جناب اسلم بدر کی کرم فرمائیوں کی وجہ سے ممکن ہو پائی۔ اللہ ڈاکٹر صاحب کو غریق رحمت کرے، آمین! کتاب کی اشاعت پر جناب اسلم بدر اور تمام اہلِ خانہ و احباب کو مبارک پیش کرتا ہوں۔

....

- **نام کتاب: دکھتی رگوں کی زبان شاعر: عقیل گیاوی اشاعت: ۲۰۱۷ء قیمت: ۱۰۷ روپے ص: ۱۶۰**
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر احمد معراج، کولکاتا، موبائل: 9681318473

''دکھتی رگوں کی زبان'' عقیل گیاوی کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ان کی پانچ دہائیوں کی ریاضت کا ثمرہ ہے۔ عقیل گیاوی کے تخلیقی سفر کا آغاز ۱۹۶۶ء میں ہوا جو تا حال جاری ہے۔ ان کی جائے پیدائش بکھورا، ضلع اورنگ آباد اور جائے عمل دھنباد ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں حمد، مناجات، نعت، غزلیں اور رباعیات شامل ہیں۔ غزلیں زیادہ

تعداد میں موجود ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی تو کی ہے لیکن خصوصی طور پر وہ زلفِ غزل کا اسیر ہے۔ عقیل گیاوی نے صرف پرائمری سطح تک تعلیم حاصل کی ہے لیکن کلام کی قرأت سے ان کے مطالعہ کی وسعت اور فنی پختگی کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ کسی مفکر نے ٹھیک ہی کہا:

Examination is not real test of knowledge.

عقیل گیاوی کی شاعری ذات اور کائنات کے مسائل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے یعنی ان کی شاعری میں انفرادی اور اجتماعی شعور کا خوبصورت امتزاج دیکھا جا سکتا ہے۔ کلام کے مطالعہ سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ شعوری طور پر وہ کسی ازم سے منسلک نہیں ہیں۔ ''دھکتی رگوں کی زبان'' کی ترتیب و تہذیب کا کام احمد نثار نے بخوبی انجام دیا ہے جس کیلئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ احمد نثار کا ایک مضمون بعنوان ''عقیل گیاوی: نرم لب ولہجہ کا شاعر'' اس مجموعہ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کی پشت پر بھی ان کی رائے تحریر ہے۔ صفحہ نمبر ۱۱ پر وہ یوں رقم طراز ہیں:

'ایک لمبی تخلیقی کاوش کے بعد عقیل گیاوی اپنا پہلا مجموعہ اردو دنیا کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔
مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ انہیں اپنے عہد کا ایک ممتاز شاعر تسلیم کرانے میں کامیاب ہوگا۔''

کتاب کی پشت پر احمد نثار کی رائے کچھ یوں ہے:

''عقیل گیاوی اردو شاعری کے حوالے سے ایک معتبر و معروف نام ہے۔ دورِ حاضر کے ممتاز شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے اور یہ مقام انہوں نے اپنی تخلیقی انفرادیت سے پیدا کیا ہے......۔''

مذکورہ بالا تحریروں میں تضاد کا پہلو موجود ہے۔ کسی بھی شاعر کو اس کے پہلے شعری مجموعہ کی اشاعت کے وقت یا فوراً بعد ممتاز یا معتبر گردانا میری نظر میں قطعی درست نہیں۔ کسی بھی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین جلد بازی میں کرنا مناسب نہیں۔ اس کے لئے ایک وقت درکار ہوتا ہے۔ کتاب کی طباعت اور کاغذ دونوں عمدہ ہیں۔ مجموعے کا نام اور سرورق پہلی نظر میں اپنی جانب متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے اس لئے اس کی قیمت صرف ۱۰۷ روپئے ہے جو بالکل مناسب ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر جناب عقیل گیاوی اور مرتب جناب احمد نثار کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ قوی امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس شعری مجموعہ کی پذیرائی ہوگی۔ نمونۂ کلام:

شہر جاؤں گا تو یہ اکثر رُلائے گا مجھے
گاؤں کا شاداب منظر یاد آئے گا مجھے

وہ کسی شئے کی حقیقت کو نہیں مانتا ہے
اونچے پربت کی جسامت کو نہیں مانتا ہے

پاس آتا ہے، مگر آ کے بکھر جاتا ہے
خواب آنکھوں کی رفاقت کو نہیں مانتا ہے

بکھرتے ٹوٹتے قصرِ وجود کی تہہ میں
تلاش کرتے رہو انبساط کی خوشبو

کسی خرابے میں زندگی ہے ابھی
مجھ کو تنہائی ڈس رہی ہے ابھی

کیسے وحشی ہوا کی نذر کروں
لَو میں دیپک کی روشنی ہے ابھی

....

راہ و رسم

● **ابواللیث جاوید (نئی دہلی)**: 'تمثیل نو' کا جولائی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء کا شمارہ سامنے ہے۔ اس بار کا موضوع 'اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت' ہے جو نہایت ہی اہم ہے۔ اردو تنقید کے حوالے سے محترم نظام صدیقی، نقشبند قمر نقوی اور ڈاکٹر عابد معز صاحبان کے گوشے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ان حضرات کی اردو خدمات بہت قیمتی ہیں جنہیں عام اردو کا قاری شاید نہیں جانتا ہے۔ آپ نے ان خدامِ اردو کی ادبی زندگی کی جو تفصیلات ہمارے لئے مہیا کرائی ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ اردو زبان و ادب انہیں بیش بہا ہستیوں کی وجہ سے زندہ اور پائندہ ہے۔ اردو ادب کی عالی شان عمارت آج جو دنیا کے سامنے کھڑی ہے وہ انہیں معمار ادب کی مرہون منت ہے۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ آمین! اس بار مضامین بھی مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں جن کی تعداد پچیس تک پہنچتی ہے۔ یہ مضامین اردو شاعری، ناول نگاری، افسانہ نگاری، تنقید، غیر مسلم ادیب و شاعر، ترجمہ، انشائیہ، سائنس گویا تمام اصناف ادب کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایسے مضامین ادب کے طلباء کیلئے یقیناً مفید ثابت ہوں گے۔ افسانے معیاری اور سبق آموز ہیں۔ شعری حصہ بھی معیاری ہے۔ حسب روایت اس بار اے رکتابوں پر تبصرے شامل ہیں جو اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔ اسی طرح اداریہ 'مجھے کچھ کہنا ہے' باسٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس میں ادبی سرگرمیاں اور ادبی ہستیوں کے سانحۂ ارتحال کا مدلل ذکر ہے۔ اداریہ اگر الگ کر دیا جائے تو ایک کتابچہ کی شکل میں ہوگا۔ یہ امتیاز صرف 'تمثیل نو' کو ہی حاصل ہے۔

....

● **پروفیسر عبدالمنان (کولکاتا)**: "تمثیل نو" کا شمارہ جولائی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء نظر نواز ہوا جو ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں حمد و نعت کے علاوہ اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت اور مختلف کارآمد گوشوں کی رمق اندازی اور تزئین کاری نئی شان لئے ہوئے ہے۔ اس سراب زدگی اور بے مہری کے زمانے میں اردو کے بیشتر جریدے چراغ سحری ہوتے جا رہے ہیں اور امید و ناامیدی کے دوراہوں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم نے 'تمثیل نو' کو ضخیم بنا کر اور نقش و نگار کے لئے تصویروں اور پر معنی تبصروں کا زیور پہنا کر اس ادا کے ساتھ ادب کی محفل میں لا کھڑا کیا ہے جس کی ثنا خوانی کے لئے قلمِ فکر کی تازگی تابندہ کرن پیدا کرتی ہے۔ اس میں نقد و نظر کے علاوہ منظوم و منثور خیالوں کا ایسا وافر سرمایہ ہے جو تازہ دمی کا ثبوت بھی دیتا ہے اور تجزیہ و تبصرہ کا در بھی کھولتا ہے۔ 'تمثیل نو' کی ادبی صحافت پر قابل ذکر لوگوں کے خیالات مثلاً شارب ردولوی، ابواللیث جاوید، نظام صدیقی، مناظر عاشق ہرگانوی، مجتبیٰ حسین اور حلیم صابر وغیرہ لائق ستائش ہیں۔ دربھنگہ کی ادبی حیثیت کی نمائندگی میں 'تمثیل نو' کا کردار ڈاکٹر امام اعظم کی فراخ دلی کا بیّن ثبوت ہے۔ انہوں نے صحافتی تاریخ اور ادبی سرگرمیوں کا جیسا پر معنی نقشہ کھینچا ہے اس نے تاریخ ادب کا ایک نیا باب روشن کیا ہے۔ امام اعظم کا قلم اس قدر رواں ہے کہ وہ ان گوشوں پر بھی زور آزمائی کا ثبوت دیتے ہیں جن پر لوگوں کی کم نظر جاتی ہے۔ اس شمارہ میں تین گوشے قابل ذکر ہیں: گوشۂ نظام صدیقی میں امام اعظم، مناظر عاشق ہرگانوی اور اجے مالوی کی نگارشات تنقیدی بھی ہیں اور تحقیقی بھی۔ گوشۂ عابد معز میں چار مضامین میں امام اعظم،

مناظر عاشق ہرگانوی اور مجیر احمد آزاد کا تجزیاتی نکتہ فنکار کی رمق اندازی پر روشنی ڈالتا ہے۔اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت نہ صرف تجزیاتی عمل کا ایک وافر نمونہ ہے بلکہ اکیسویں صدی میں اردو ادب کی سمت و رفتار پر روشنی ڈالتا ہے۔مختصر یہ کہ اس شمارے میں بکھرے مواد خیالوں کو ایک واضح سمت عطا کرتے ہیں۔

....

● **پروفیسر رئیس انور (دربھنگہ):**

اک طرفہ تماشا ہے'اعظم' کی طبیعت بھی ہے مشق سخن جاری اور'مانو' کی مشقت بھی

بھائی اعظم صاحب! آپ آدمی ہیں یا جن یا جنوں کو اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔ایک پاؤں کولکاتا میں اور دوسرا دربھنگہ میں۔'تمثیل نو' کی اشاعت پھر سیمینار یا مشاعرے میں شرکت کی خبر، نئی کتاب کے چھپنے کی اطلاع اور'مانو' کولکاتا کے دفتر میں کسی تقریب کی آگاہی۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کی میٹنگ میں حاضری اور پھر'مانو' کے علاقائی مرکز کے کاموں میں مشغول۔بھئی، آپ جن ہوں یا جن کی کرشماتی قوت کے مالک۔اس سلسلۂ فتوحات اور مطبوعات کی نئی کڑی پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ (''تمثیل نو گروپ'' واٹس اپ، مورخہ ۱۰؍جولائی ۲۰۱۸ء)

....

● **ڈاکٹر نگار عظیم (نئی دہلی):** مارچ ۲۰۰۱ء سے منظر عام پر آنے والا'تمثیل نو'دربھنگہ اپنے ۱۷؍برس پورے کرچکا ہے۔اردو رسائل کی موجودہ صورتحال دیکھتے ہوئے یہ ایک کامیاب سفر ہے۔بلاشبہ ڈاکٹر امام اعظم کا یہ حوصلہ قابل ستائش ہے۔آہستہ آہستہ اس کی ضخامت بھی بڑھی اور موضوعات کے تنوع نے بھی رسالے کی کامیابی میں اہم رول ادا کیا۔اولین شمارے سے موجودہ شمارے تک'تمثیل نو' کے حوالے سے جو نثری مضامین، تبصرے، آرا، کالم اور منظومات منظر عام پر آئے ان پر مشتمل ایک کتاب'تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش' جسے ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی نے ترتیب دی ہے ۲۰۱۷ء میں منظر عام پر آچکی ہے۔اسے ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔اس میں مرتب کا مبسوط مقدمہ نیز گزشتہ تمام شماروں کے مشمولات کا جامع اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے۔یہ ایک بڑا اچیومنٹ ہے۔'تمثیل نو' کا ہر شمارہ منفرد نوعیت کا حامل رہا۔گزشتہ شمارہ'اردو ادب میں وحدت الوجودی اور وحدت الشہودی عناصر' پر مبنی تھا۔آپ سوچ سکتے ہیں یہ شمارہ کس قدر اہم ہوگا۔موجودہ شمارہ بھی'اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت' اپنی نوعیت کا منفرد شمارہ ہے۔نظام صدیقی، نقشبند قمر نقوی اور ڈاکٹر عابد معز پر گوشے شامل ہیں۔اس کے علاوہ بہت اہم مضامین، افسانے، افسانچے، نظمیں، غزلیں، تبصرے، تجزیئے، خطوط وغیرہ وغیرہ...... ہر ادیب کی پسند کا کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔میری خوش بختی ہے کہ پہلے شمارے سے موجودہ شمارے تک میری رسائی رہی کیونکہ امام اعظم جیسا مدیر آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔وہ مجھ تک رسالہ پہنچانا بھی اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتی جاتی ہوں کیونکہ بغیر کوئی رائے دئے، بغیر کوئی قیمت دئے سارے رسالے ہضم کرجاتی ہوں۔لیکن مجھے شبہ نہیں پکا یقین ہے کہ یا تو امام اعظم پر بزرگوں کا سایہ ہے یا جنات کا ورنہ اس قدر حوصلے سے اتنے مشکل کام کرنا کسی نارمل انسان کے بس کی بات نہیں۔آپ کو اندازہ نہیں آپ ادب کی کتنی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔یہ رسالہ آپ کا جنون ہے۔خدا آپ کو سلامت رکھے۔میری دعائیں اور نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

● **منیر سیفی (پٹنہ)**: 'تمثیل نو' ج:۷، ش:۳۱ پیش نظر ہے۔ آپ کی گونا گوں مصروفیات اور پھر اتنا صحت مند رسالہ؟ حیرت ہوتی ہے۔ جہاں 'نیویارک شہر کی سیر' اور 'تہذیبوں کا گڑھ علی گڑھ' معلوماتی تحریریں ہیں وہیں آپ کا 'رپورتاژ' اور ڈاکٹر نذیر فتح پوری کی 'روداد' دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ تینوں گوشے اچھے لگے۔ نظام صدیقی سربرآوردہ ادیب و ناقد ہیں۔ موصوف سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات (۱۹۸۵ء) کا شرف مجھے حاصل ہے۔ میرے شعری مجموعہ 'اجنبی صدا' (۱۹۸۵ء) پر انہوں نے گرانقدر رائے قلم بند کی تھی۔ مضامین، افسانے، شعری تخلیقات کے ساتھ تبصرے بھی متوازن ہیں۔ لکھنے کو تو پیش نظر 'تمثیل نو' پر صفحات کے صفحات سیاہ کئے جاسکتے ہیں لیکن جدید ترین ٹکنالوجی کے عہد میں، قاری پر مزید بار ڈالنا مناسب نہیں ہوگا۔

....

● **احسان ثاقب (نوادہ)**: ''تمثیل نو'' کا ۳۱ رواں شمارہ دیکھا اور پڑھا۔ ۴۱۶ رصفحات پر مشتمل اس رسالے میں تحریری افادیت اور معنویت کے کم وبیش تمام رنگ موجود ہیں۔ تین گوشے ایسے ہیں جو اردو کی باوقار زندگی کے تعلق سے بیحد معلوماتی اور حوصلہ بخش ہیں۔ نظام صدیقی، نقشبند قمر نقوی اور ڈاکٹر عابد معز کی شخصی، علمی اور ادبی جتنے خاکے پیش کئے گئے ہیں وہ سب کے سب پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ آپ کی صحافتی کوششوں میں جو علمی اور اخلاقی ظرف ہے اس کو دیکھ کر ہرکوئی آپ کی قلم دوستی سے متاثر ہو جاتا ہے۔ 'تمثیل نو' کے گذشتہ ۱۷ رشمارے آپ کے ذہنی پھیلاؤ کے ثبوت ہیں۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' میں آپ کی یہ عبارت: ''زیر مطالعہ شمارے میں بھی میں نے انفرادی پہچان برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے تخلیقی حسیت، مجموعی تخلیقی صورت سے ابھرتی ہے جس میں تہذیب، کلچر اور ثقافت سے وابستگی کے ساتھ کئی گوشے کو بھی قارئین محسوس کریں گے۔'' بہ حیثیت قاری میں آپ کے اُن گوشوں کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ ادبی وثقافتی خبریں ۳۷ رصفحات پر پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں پوری اردو دنیا کی خوش آئند باتیں شامل ہیں۔ انہیں پڑھ کر آنکھیں چمک اٹھتی ہیں لیکن صفحہ ۳۷ سے جب وفیات کا کالم شروع ہوتا ہے تو ۶۳ چہروں کے آخری سفر کی روداد پڑھ کر آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

چہروں کے بیچ میں کوئی چہرہ کہاں ہے اب　　　مٹی سے اٹھ کے آئے تھے مٹی میں مل گئے

موضوع کے اعتبار سے زیر نظر شمارے میں ''اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت'' بہت ہی اہم موضوع ہے۔ تین بڑے قلم کاروں نے اپنے اپنے طور پر اس پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون کافی اہمیت کا حامل ہے اور مدلل ہے۔ مضامین کے کالم میں جھوں نے فی زمانہ اپنے قلم کا اچھا اثر چھوڑا ہے۔ ''آتش نوائی کا سراغ'' پروفیسر عبدالمنان کی فکر آفاقی حیثیت رکھتی ہے۔ عشرت بیتاب کا قلمی وقار بھی بلندی کی طرف ہے۔ افسانے اور افسانچے محنت سے لکھے گئے ہیں۔ شعری حصہ میں نظمیں شمع فروزاں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ غزلوں میں مجھے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا یہ شعر پسند آیا:

وہ فن کار ہے اک بصیرت شعار و بصارت شعور　　　کہ پیش جبیں آستانے کو لاتا ہے وحشت سعید

اور جناب ناشاد اورنگ آبادی کی غزل کا یہ شعر متاثر کرتا ہے:

شناسا ہو کے بھی اس کو سمجھ نہیں پایا　　　مرے لئے تو وہ اب بھی ہے اجنبی اے دوست

''نظر اپنی اپنی'' کے تحت کم و بیش ۲۷ر کتابوں، رسالوں پر تبصرے شامل ہیں۔ اس ضمن میں بھی 'تمثیل نو' کی اپنی الگ انفرادیت ہے۔ 'راہ و رسم' کا سلسلہ حسب دستور اپنے رنگ پر قائم ہے۔ سترہ سال سے 'تمثیل نو' مسلسل شائع ہو رہا ہے اور اس کے ہر شمارے کی نوعیت امکان کی حد تک تسلی بخش ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ سے دریافت کروں کہ انگنت مصروفیتوں میں گھرے رہنے کے باوجود اردو ادب کے لئے ایسے فنی محاسن کہاں سے اور کیسے تلاش کر لیتے ہیں جبکہ ہر شخص جانتا ہے کہ آج کے اس بے حس دور میں کوئی گھاٹے کا سودا اگر ہے تو یہی ہے — آپ چونکہ ہر وقت اپنے دل کا دریچہ کھلا رکھتے ہیں اس لئے اشرف آزاد کی غزل کا یہ شعر نذر کر رہا ہوں:

مقتل ہو، کوئے دار ہو یا کوچۂ حبیب ہم نے بھی فرار کا رستہ چنا نہ تھا

....

● **انجم عظیم آبادی (کولکاتا)**: ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ مطالعے میں رہا، نظام صدیقی، نقشبند قمر نقوی اور ڈاکٹر عابد معز پر گوشہ نے رسالے کو مزید باوزن بنایا ہے۔ ادبی و ثقافتی خبروں کے لئے ۴۷ صفحات اور وفیات کے لئے ۲۹ صفحات دونوں ملا کر ۷۶ صفحات جو دو ماہناموں کی ضخامت ہو سکتی ہے، ان عنوانات یا کالموں کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں ان کالموں کو قائم رکھنا ہی چاہئے۔ شیدا چینی کے انتقال کی خبر صرف 'تمثیل نو' ہی میں پڑھنے کو ملی تھی اور میں نے شیدا پر مضمون لکھا اور اخبارات میں اس کی اشاعت ہوئی۔ ورنہ لاعلم رہتا۔ ''تہذیبوں کا گڑھ علی گڑھ'' (قیوم بدر) اور ڈاکٹر امام اعظم کی لکھی رپورتاژ اگرتلہ (تریپورہ) میں گزارے ہوئے دو روز'' دونوں سفر نامے اچھے لگے۔ ابواللیث جاوید کا افسانہ 'کیسے سمجھاؤں' عصری کج رویوں کو اجاگر کرتا ہے۔ شکیل افروز کا افسانہ 'ایک ایڈز' بیداری اور مغربی سوچ کے پس منظر میں عمدہ ہے۔ عشرت بیتاب کا افسانہ ''بلی اور نوخیز'' انسانی نیچر اور غیر محرم کی غیرت نیز اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا آئینہ دار ہے۔ پروفیسر توقیر عالم نے اپنے مضمون میں صحیح لکھا ہے کہ ''غالب نے اردو غزل کو سوچنا سکھایا''۔ ڈاکٹر عابد معز کے طنز میں اردو'' (مناظر عاشق ہرگانوی) میں ڈاکٹر معز نے تفریحی اردو اور ماڈرن اردو کا جو استعمال کیا ہے وہ اردو کی زبوں حالی کا نتیجہ ہے کیوں کہ اردو زبان کچھ کی کچھ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ نظم ''شہزادہ'' کے تناظر میں احسان ثاقب کی اچھی کوشش ہے۔ سرورق عمدہ اور اداریہ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' زیر نظر شمارے کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔

....

● **ڈاکٹر نسیم احمد نسیم (بیتیا، مغربی چمپارن)**: آج ڈاک سے 'تمثیل نو' دربھنگہ کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ رسالے کے مدیر اور معروف شاعر و نقاد ڈاکٹر امام اعظم نے اس کا اجرا آج سے ۱۷ر سال قبل ۲۰۰۱ء میں کیا تھا تب سے لے کر آج تک اس کے مدیر نے نہ صرف اس کے معیار کو برقرار رکھا بلکہ اس دوران انہوں نے کئی خاص نمبرات اور خصوصی گوشے بھی شائع کئے جنہیں اردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ تازہ شمارہ بھی دیگر مشمولات کے علاوہ تین گوشوں پر مشتمل ہے۔ یعنی اس میں نظام صدیقی، عابد معز اور نقشبند قمر نقوی جیسے مشاہیر کی حیات اور ان کے کارنامے پر معیاری اور محنت سے لکھے گئے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ۲۱ ویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت کے تحت تین مضامین شائع کئے گئے ہیں جو کہ اپنے آپ میں نہ صرف اہم بلکہ حد درجہ معلوماتی بھی ہیں۔ امید ہے ۴۱۶ر صفحات پر مشتمل یہ خاص شمارہ ادبی حلقے میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور یقیناً اسے ڈاکٹر امام اعظم کے سابقہ کارناموں میں ایک باوقار اضافہ تصور کیا جائے گا۔

● **صابر علی سیوانی (حیدرآباد)**: ''تمثیل نو'' کی صحافتی اور ادبی خدمات قابل ستائش ہیں۔ خدا آپ کے اس ادبی خدمت کے جذبے کو تاحیات برقرار رکھے۔ خدا کرے آپ یوں ہی ''تمثیل نو'' کے خصوصی شمارے نکالتے رہیں۔ صحافتی موضوعات پر مشتمل تمثیل نو کا شمارہ چند ماہ قبل موصول ہوا تھا۔ مضامین بڑی خوبصورتی سے شمارے میں ترتیب دئے گئے ہیں۔ اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

....

● **ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم (جمشید پور)**: ''تمثیل نو'' دربھنگہ، ''اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت'' باصرہ نواز ہوا۔ مبارکباد کہ ''تمثیل نو'' کا ہر شمارہ عالمی ادب کی ایک اہم ضرورت اور اعلیٰ تعلیم کے نصاب کے معیار و میزان کا احاطہ کرتا ہے۔ 'مجھے کچھ کہنا ہے' کے عنوان سے ادب و ثقافت، آرٹ اور کلچر، غرض کہ ادب و سماج کے تمام تر شعبہ جات میں رونما ہونے والی سرگرمیوں کو جس حسن و خوبی کے ساتھ آپ نے حمد و نعت، سفرنامے، روداد، رپورتاژ، گوشۂ نظام صدیقی، گوشۂ ڈاکٹر عابد معز، گوشۂ نقشبند قمر نقوی، مضامین، افسانے، افسانچے، نظمیں، غزلیں، نظر اپنی اپنی، تجزیہ، منظوم تبصرہ، بالخصوص 'اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت' سونے پر سہاگہ کا کام کر رہا ہے۔ میں سمجھتی ہوں ''تمثیل نو'' کے تمام تر شمارے بیک وقت کئی ادبی دبستانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ادبی گلوبل ولیج کی اس سے عمدہ مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ صد افسوس کہ عدیم الفرصتی کے باعث میں 'اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت' کے عنوان سے کوئی مقالہ قلمبند نہ کر سکی، معذرت خواہ ہوں اور ممنون کرم ہوں کہ آپ پابندی سے اس معیاری رسالے کے مطالعے کے مواقع فراہم کرا رہے ہیں کہ ''تمثیل نو'' کا مطالعہ ادبی سیرابی و تسکین کا باعث ہے۔

● **ڈاکٹر شہاب منظر واجدی** (عمر تقریباً ۵۲ سال) کا انتقال بی بی پاکڑ دربھنگہ میں ۲؍ستمبر ۲۰۱۸ء کی شب حرکت قلب بند ہو جانے سے ہو گیا۔ جسد خاکی کو دوسرے روز صبح ان کے آبائی گاؤں رامپور، سمستی پور لے جایا گیا جہاں بعد نماز ظہر نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ڈاکٹر منظر واجدی کا خاندان لمبے عرصے سے محلہ بی بی پاکڑ، لہریاسرائے، دربھنگہ میں مقیم ہے۔ مرحوم نالندہ میڈیکل کالج میں معاون کے طور پر کام کر رہے تھے۔

....

● اردو کے سچے خادم، معروف پرنٹر اور پبلشر **نعمان فاروقی** کا انتقال ۲۶؍ستمبر ۲۰۱۸ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب ہولی فیملی ہسپتال، نئی دہلی میں ہو گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۳؍بیٹیاں شامل ہیں۔ تدفین باٹلہ ہاؤس قبرستان میں ہوئی۔ جنازہ میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے جن میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے ذمہ داران اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ کے علاوہ اردو کے صحافیوں، شاعروں اور سماجی کارکنان بھی شامل تھے۔ مرحوم نے تقریباً ۱۶؍سال بھارت آفسیٹ پریس، گلی قاسم جان، بلی ماران (دہلی) کو اپنی نگرانی میں بحسن و خوبی چلایا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ کے پی اے ظفر نواز ہاشمی مرحوم کے ہم زلف ہیں۔ وہ بیحد خلیق، ملنسار اور مرنجامرنج شخصیت کے حامل تھے۔ خاکسار کا رسالہ ''تمثیل نو'' کے کئی شمارے اور کئی کتابیں انھوں نے بڑے اہتمام سے شائع کیں۔

ڈاکٹر امین عامر (ہوڑہ، موبائل: 9883057511)

اردو جریدہ ''تمثیل نو'' (۲۰۱۷-۲۰۱۸ء)

''تمثیلِ نو'' مجلّہ مرے پیشِ نظر ہے
ہے دو ہزار سترہ سے اٹھارہ تک محیط
اکسویں صدی میں ہے اردو کا حال کیا
موضوعِ سخن ہے یہ مجلّے کا دوستو!
اوّل امام اعظم[1] کا پڑھئے اداریہ
پھر تھام کر جگر پڑھیں ''وفیاتِ مشاہیر''
حمدِ خدا میں دیکھئے اشعار امتیاز[2]
نعتِ نبیؐ بھی جھوم کر پڑھئے امان[3] کی
''نیو یارک شہر کی سیر'' سے بھی لطف اٹھایئے
''تہذیبوں کا گڑھ'' کہئے علی گڑھ کو بھائی جان
نذیر[6] کا مکتوب امام اعظم کے ہے نام
دو روز اگرتلہ میں اعظم نے گزارے
اکسویں صدی میں ہے اردو کی پیش رفت
اردو تنقید کے نئے افق بہار میں
ہے لائقِ مطالعہ یہ مضمونِ قادری[8]
یہ بھی رواں صدی میں کہ پیشِ نظر رہے
موضوع پہ ابرار[9] کی ہے خوب کیا تحریر
ہے اس کے بعد مختصر سوانحی خاکہ
اصلاً کسی مقالہ کا ہے یہ جو ترجمہ
نظام اور تنقید کا ہے نیا منظر نامہ
نئے عہد کی تخلیقیت کے ہیں دانائے راز
دکتر اجے[11] مالوی کی ہے تحریر خوب
اردو تنقید کے ہیں اہم ستون بھی نظام
خواجہ معزالدین کا بھی سوانحی خاکہ
''عابد معز کے طنز میں اردو'' بھی دیکھئے
''عابد معز: جن کو میں نے جانا ہے'' جناب
یہ ''آئینہ گری کا فن، عابد کے مضامین''
''عابد معز کی نادرہ کاری'' کی بات ہو

شجرِ ادب کا تازہ و شیریں یہ ثمر ہے
بالاختصاص علم و دانش پہ ہے بسیط
تنقید کے میدان میں کیا پیش رفت ہوا
سنجیدہ مطالعہ کا تقاضا ہے ساتھیو!
اک داستانِ ادب و ثقافت ہے برملا
اور کیجئے دعا کہ انہیں بخش دے قدیر
گویا کہ مناجات ہیں باعجز اور نیاز
اور پیش کیجئے سند اپنے ایمان کی
اور حافظ[4] شائق کے بھی ساتھ سیر کیجئے
قیوم بدر[5] کے ہے قلم کی یہ داستان
روداد کی ہے شکل میں نثری کوئی کلام
جی بھر کے سیر سے تو وہ محظوظ خوب ہوئے
تنقید کے عنواں سے مناظر[7] کی ہے گرفت
اکسویں صدی میں ہے کیا اس دیار میں
پڑھئے و داد دیجئے بھی آں جناب کی
''دربھنگہ کی تنقیدی کائنات'' پہ رہے
شہرِ دربھنگہ کے ادب کی ہے اک تصویر
ناقد اور ممتاز دانشور نظام کا
دیبا[10] سلام نے اسے اردو میں ہے کیا
گویا مناظر کے بقلم ہے یہ جوہر نامہ
ناقد اور بیشور نظام صاحب اعزاز
کہ صدیقی صاحب سے ہے یہ بہتر منسوب
خالق اس انشاء کے ہیں بھائی ادب کے امام
ادارہ کی جانب سے ہے ''تمثیل'' میں چھپا
پروفیسر مناظر عاشق کے حوالے سے پڑھئے
اسعد فیصل[12] کی ہے یہ تحریر لاجواب
ہے گفتگو مجیر[13] کی اس پہ بہت ثمین
ان کی ''شگفتہ افسانہ نگاری'' کی بات ہو

اس گلستاں میں اعظم نے ہیں پھول کھلائے
قمر نقوی کا بھی پڑھئے ''سوانحی خاکہ''
اور اس کے بعد نقشبند سے مصاحبہ
''حماسہ چھٹی جلد'' پر بھی ایک نظر ہو
قمر نقوی کے بھی ناولوں کا اختصاص
''آتش نوائی کا سراغ'' لینے چلے ہیں
''غالب کی غزل گوئی'' بھلا کیوں نہ ہم پڑھیں
''ثوبان فاروقی'' کا بھی کیجیے مطالعہ
انوار الحسن[17] وسطوی کی یہ تحریر ہے
''ہمہ جہت شخصیت کے ہیں مالک (جو) قاسمی''
عشرت[18] کے اس مضمون سے ہیں گو بھی بیتاب
''کنڈوم کلچر اور ناول میں ثقافتی
ہے ''نالۂ شب گیر کے حوالے سے'' مضمون
مجیب[19] صاحب کی ہے گرانقدر یہ تحریر
''انسان دوست ادیب: علی باقر'' تھے جناب
''حسرت موہانی بحیثیت مجاہدِ آزادی''
''شاعر کا نیا آئینہ: ''احساسِ آئینہ''
اس پہ سلیم[22] انصاری کی ہے خوب گفتگو
''غیر مسلم ادیب و شاعر کا بھی حصہ''
اس سلسلے میں وصیہ[23] عرفانہ کو بھی پڑھئے
سید محمود احمد کریمی پہ مطالعہ
''اشرف یعقوبی کا شعری آہنگ'' بھی پڑھئے
کیا ابتدائی ''مانو'' کا بھی دور رہا ہے
مشتاق احمد[25] پنیل کا اس پہ ہے تجزیہ
اور ''شاعری میں سہیل اختر کی نئے لہجے
اقبال انصاری کے افسانوں کا نمایاں
''اک نابغہ: مناظر عاشق ہرگانوی''
''اقبال کے افسانوں میں عورت کا تصور''
''حلیم صبا نویدی کی افسانہ نگاری''
''شاکر خلیق بحیثیت شاعر (و) نثر نگار''
عنواں ہے ''بیگ احساس کی افسانہ نگاری''

ایسے کہ سارے گلشن کو بھی خوب مہکائے
''تمثیلِ نو'' ادارہ کی جانب سے نوشتہ
مناظرِ عاشق کے وسیلہ سے ہے عمدہ
کیجیے صلاح[14] الدین کی تعریف اگر ہو
عنوان پہ آزاد کا مضمون ہے کیا خاص
عبدالمنان[15] واہ کیا عزیمت والے ہیں
توقیر[16] عالم صاحب کو بھی خوب داد دیں
جو ''اک چراغ شہر میں تھا'' اب نہ وہ رہا
جو لائقِ توصیف بھی اور بے نظیر ہے
''مفتی ہدیٰ'' کے نام سے ہیں نیک آدمی
عش عش کر اٹھے دیکھ کر تحریر آفتاب
ڈسکورس'' لکھتے، پڑھتے، سنتے جایئے بھائی
جس میں سراسر دیکھئے تہذیب کا ہے خون
جس میں سماج کی ہے بہت بدنما تصویر
سرور کریم[20] کا یہ نوشتہ ہے کامیاب
ہے آفتاب[21] کے بقلم خوب یہ کہانی
نجم عثمانی کا یہ ہے شعری آبگینہ
اس نے جگا دیا ہے گو احساس کا جادو
''فروغِ اردو'' میں بھی ان کا ثبت ہے قصہ
اور جان و دل سے حوصلہ ان کا بڑھایئے
از حیث ''ترجمہ کی مشین'' ہے ابرار کا
اور بدر محمدی[24] کو بھی شاباشی دیجئے
اس کے ''ابھرتے نقوش'' کا منظر بھی کیسا ہے
کیا خوب ہے موصوف کے یہ اثر خامہ کا
کی ہے تلاش'' خوب جناب ایم نصر اللہ[26] نے
ہے پہلو بہت دیکھئے باشندۂ جہاں[27]
احسان[28] کا مطالعہ ہے اس پہ بخصوصی
سلطانہ[29] کا بھی خوب ہے مضمون تفکر
صفیہ[30] کی اس پہ دیکھئے بہتر قلم کاری
اشرف[31] ہدیٰ کا اس پہ ہے تحریر آبدار
کہ لائقِ تحسین ہے انشائے حسینی[32]

اور ''پچھلی پیت کے کارنے کا نقش و عکس''
''انشائیہ کی ہے پہچان'' کیا اے حضور
''مجاہدِ رفتار و گفتار آزادی''
مضمونِ مدثر رشید[۳۵] ہے جو بعنوان
''اک منفرد اسلوب کے مالک علی میاں''
جو کچھ سماجی اور گھریلو مسائل ہیں
عکاسی ان کی خوب کی ہے آفرین[۳۷] نے
اب سلور جوبلی ماہنامہ سائنس کی پڑھیے
افسانوں کی باری میں ''اب کیسے سمجھاؤں''
سنئے ابواللیث[۳۹] اور عشرت بیتاب سے
اور بھی افسانے ''ایک، بیچے اسٹیل کے''
رئیس[۴۲] صدیقی بھی افسانوں کی دنیا میں
''رقیہ ممو سے سیکھتا تو'' یہ بھی آئینہ
دیکھئے روئے زیبا ان آئینوں میں بھائی
ہے اس کے بعد نظموں اور غزلوں کا سلسلہ
''نظر اپنی اپنی'' پڑھیے تبصرے بھی آپ
اور بعنوان ''راہ و رسم'' پڑھیے بھی خطوط
مضمونِ تجزیاتی بھی پڑھئے سہیل کا
تمثیلِ نو کہ ''ادبی صحافت کا نقش ہے''
''تمثیلِ نو'' منسوب جس سے اعظم کا ہے نام
یہ ہے بفضلِ ایزدی منظوم تبصرہ

حیران ہے نقاشیٔ محسن[۳۳] پہ ہر اک شخص
بلال[۳۴] نے کرائی ہے پڑھیے اسے ضرور
تھے ہند کے بیباک رہبر حسرت موہانی
حسرت کی زندگی کا یہ ہے خوب ترجماں
تحریرِ محمد[۳۶] سے یہ ہے خوب تر عیاں
اردو افسانوں میں ان کے عکس شامل ہیں
اور تالیاں بجائی ہوں گی قارئین نے
اور انجم[۳۸] کی تحریر سے بھی لطف اٹھایئے
''مبلّی اور نوخیز'' کا افسانہ سناؤں
بیٹھ جائیں باخاموشی اور آداب سے
سنئے حنیف[۴۰] سید اور شکیل افروز[۴۱] سے
''عرضِ من'' ''قرض کا جال'' کے آئینہ میں
اور ''وزارت خزانہ کی چالاک وزیر'' کا
خوبرو آتے ہیں نظر رئیس صدیقی
کہ جن کے خالق ہیں معروف شعراء اور ادباء
اہلِ نظر کی رائیں ہیں کیا قیمتی اور ٹاپ
گویا نظروں میں ہے یہ اک سلسلۂ شموط
''تمثیلِ نو'' مجلے کا ہے خوب جائزہ
نقش و نگار اس پہ مشاہیر نے کئے
آرستگی میں اس کی ہے شامل نبوغ امام
اس رب کا شکریہ ہے کہ جس نے قلم دیا

بس ہے ادب نوازوں کی خدمت میں التجا
اس عامر[۴۳] آثم کے لئے کیجئے دعا

حواشی: ۱-ڈاکٹر امام اعظم، ۲-ڈاکٹر امتیاز احمد صبا، ۳-امان ذخیروی، ۴-پروفیسر حافظ شائق احمد یحییٰ، ۵-قیوم بدر، ۶-نذیر فتح پوری ۷-پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ۸-ڈاکٹر سید احمد قادری، ۹-ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، ۱۰-دیبا سلام، ۱۱-ڈاکٹر اے جے مالوی ۱۲-اسعد فیصل فاروقی، ۱۳-ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ۱۴-ڈاکٹر ایم صلاح الدین، ۱۵-پروفیسر عبدالمنان، ۱۶-پروفیسر توقیر عالم ۱۷-انوار الحسن وسطوی، ۱۸-ڈاکٹر عشرت بیتاب، ۱۹-ابرار مجیب، ۲۰-ڈاکٹر سرور کریم، ۲۱-ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، ۲۲-سلیم انصاری، ۲۳-ڈاکٹر وصیہ عرفانہ، ۲۴-بدر محمدی، ۲۵-پروفیسر مشتاق احمد آئی پٹیل، ۲۶-ایم نصر اللہ نصر، ۲۷-مسرت جہاں ۲۸-ڈاکٹر احسان عالم، ۲۹-صغیرا سلطانہ، ۳۰-صفیہ سلطانہ، ۳۱-محمد اشرف الہدیٰ، ۳۲-محمد وصی اللہ حسینی ، ۳۳-محسن خان، ۳۴-بلال احمد ڈار، ۳۵-مدثر رشید، ۳۶-محمد وصی اعظم، ۳۷-شائقہ آفرین، ۳۸-سہیل انجم، ۳۹-ابواللیث جاوید، ۴۰-حنیف سید، ۴۱-شکیل افروز، ۴۲-رئیس صدیقی، ۴۳-ڈاکٹر محمد امین عامر!

ڈاکٹر عارف حسن وسطوی (7654443036)

''تمثیل نو'' جولائی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء: ایک مطالعہ

معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ کا تازہ شمارہ (جولائی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء) کے مطالعہ سے شرف یاب ہونے کا موقع ملا۔ بلاشبہ یہ شمارہ بھی اپنے دیگر شماروں کی طرح بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ۴۱۶؍صفحات پر مشتمل یہ شمارہ ''اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت'' کے عنوان سے معنون ہے۔ جس کے تحت پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر سید احمد قادری اور ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کی معلومات افزا تحریروں کو شمارہ میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں تین اہم ادبی شخصیتوں نظام صدیقی (الہ آباد) ڈاکٹر عابد معز (حیدرآباد) اور نقشبند قمر نقوی (امریکہ) پر گوشے شامل ہیں۔ نظام صدیقی کے گوشے میں دیا سلام ایڈوکیٹ (الہ آباد) کی تحریر ''مختصر سوانحی خاکہ'' کے علاوہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر اے جے مالوی اور ڈاکٹر امام اعظم کی تحریریں شامل ہیں۔ گوشہ ڈاکٹر عابد معز میں ''ادارہ'' کی جانب سے موصوف کا سوانحی خاکہ درج ہے جبکہ ان پر مضامین لکھنے والوں میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، اسعد فیصل فاروقی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد اور ڈاکٹر امام اعظم کے نام شامل ہیں۔ گوشہ نقشبند قمر نقوی میں موصوف کا مختصر سوانحی خاکہ بھی منجانب ''ادارہ'' ہی تحریر ہے۔ اس کے علاوہ اس گوشے میں نقشبند قمر نقوی سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا مصاحبہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ بعدہٗ ڈاکٹر ایم صلاح الدین اور ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کی تحریروں سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بلاشبہ ان تینوں گوشوں کی شمولیت سے رسالہ کی اہمیت میں چار چاند لگ گیا ہے۔

''تمثیل نو'' کے اس تازہ شمارہ کا آغاز بھی حسب سابق رسالہ کے مدیر اعزازی ڈاکٹر امام اعظم کے اداریہ بعنوان ''مجھے کچھ کہنا ہے'' سے ہوا ہے۔ اس اداریہ کی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں اس میں شمارے کے مشمولات پر روشنی ڈالی گئی ہے وہیں گذشتہ ایک سال کی علمی، ادبی و سماجی سرگرمیوں سے متعلق خبروں کا ایک بڑا ذخیرہ یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کے مطالعہ سے اردو شعر و ادب کے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کُل ۶۵؍مشاہیر کی وفیات کی بھی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ اس فہرست میں میرے ضلع ویشالی سے تعلق رکھنے والی دو اہم ادبی شخصیت پروفیسر ثوبان فاروقی اور پروفیسر ناصر رضا خاں جلالی کی وفات کی خبر بھی پوری وضاحت کے ساتھ درج ہے۔ یہ دونوں شخصیتیں اس ضلع کے لئے آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتی تھیں۔ کم معروف اور غیر معروف مرحومین میں میرے دادا جان محمد داؤد حسن وسطوی (وثیقہ نویس) اور مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کے برادر کلاں ماسٹر محمد ضیاء الہدیٰ رحمانی کی وفات کی خبر کو بھی شمارے میں جگہ دے کر مدیر اعزازی نے اپنی وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا ہے، جس کے لئے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

وفیات کے بعد اس شمارے میں ڈاکٹر امتیاز احمد صبا کی ''حمد باری تعالیٰ'' اور امان ذخیروی کی ''نعت شریف'' کے مطالعہ سے قاری محظوظ ہوتا ہے۔ شمارے میں دو سفرنامے ''نیویارک شہر کی سیر'' (پروفیسر حافظ شائق احمد یحیٰی) اور

"تہذیبوں کا گڑھ علی گڑھ" (قیوم بدر) بھی ہمیں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ "روداد" کے تحت ڈاکٹر امام اعظم کے نام ڈاکٹر نذیر فتح پوری کا مکتوب اور ڈاکٹر امام اعظم کی رپورتاژ "اگرتلہ میں گزارے ہوئے دو روز" شمارے کی نیرنگیوں میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پیش نظر شمارے میں مضامین کی تعداد ۲۵ رہے جن میں "آتش نوائی کا سراغ" (پروفیسر عبدالمنان)، "غالب کی غزل گوئی" (پروفیسر توقیر عالم)، "پروفیسر ثوبان فاروقی: شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا" (انوار الحسن وسطوی)، "ہمہ جہت شخصیت کے مالک: مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی" (ڈاکٹر عشرت بیتاب)، "حسرت موہانی: بحیثیت مجاہد آزادی" (ڈاکٹر آفتاب اشرف)، "فروغِ اردو میں غیر مسلم ادیب و شاعر کا حصہ" (ڈاکٹر وصیہ عرفانہ)، "ترجمہ کی مشین" (ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی)، "اشرف یعقوبی کا شعری آہنگ" (بدر محمدی)، "اقبال انصاری کے افسانوں کا نمایاں پہلو" (مسرت جہاں)، "مناظر عاشق ہرگانوی: ایک نابغہ" (ڈاکٹر احسان عالم)، "علیم صبا نویدی کی افسانہ نگاری" (صفیہ سلطانہ)، "پروفیسر شاکر خلیق بحیثیت شاعر و نثر نگار" (محمد اشرف الہدیٰ) اور "منفرد اسلوب کے مالک: علی میاں ندوی" (محمد وصی اعظم) بہت اہم اور قابل مطالعہ مضامین ہیں۔ مضامین کے علاوہ شمارے میں ۴ر افسانے، ۴ر افسانچے، ۲۰ر نظمیں اور ۲۵ر غزلیں بھی شامل ہیں۔ نظموں کی فہرست میں ڈاکٹر مجیب اختر کی اہلیہ فلذہ مجیب کی رحلت سے متاثر ہو کر لکھے پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق دانا پوری اور ڈاکٹر اسلم جاوداں (پٹنہ) کے قطعات نے متاثر کیا۔

"نظر اپنی اپنی" کے عنوان سے مناظر عاشق ہرگانوی، ابواللیث جاوید، نسیم محمد جان، مجیر احمد آزاد، ایم صلاح الدین، ایم نصر اللہ نصر، محمد علی حسین شائق، اشرف احمد جعفری، عبدالحیٔ، مشتاق احمد حامی، عدیلہ نسیم، اوینا ش امن، احسان عالم، احمد معراج اور ڈاکٹر امام اعظم کے ذریعہ کل اے ر کتابوں پر لکھے تبصرے عمدہ اور دلچسپ ہیں۔ ان تبصروں کے مطالعہ سے کتاب اور صاحبِ کتاب کے تعلق سے بہت اہم معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ "راہ و رسم" عنوان کے تحت مختلف ادبی شخصیات مثلاً پروفیسر شارب ردولوی، ابواللیث جاوید، نظام صدیقی، پروفیسر عبدالمنان، احسان ثاقب، پروفیسر ایم کمال الدین، ڈاکٹر ایم نسیم اعظم، شارق عدیل، صابر فخر الدین، قیوم بدر، کرشن پرویز، عصمت آرا کے گرامی نامے شامل ہیں جن کے مطالعہ سے گذشتہ شمارے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کی مرتبہ کتاب "تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش" پر جن مشاہیر اہلِ قلم کے تاثرات کو شامل کیا گیا ہے ان کے نام ہیں جمیل انجم، مجتبیٰ حسین، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، اقبال انصاری، پروفیسر عبدالمنان، پروفیسر اعجاز علی ارشد، مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، انوار الحسن وسطوی، حلیم صابر، اسلم چشتی اور محمد عارف اقبال۔

رسالہ کا اختتام "تمثیل نو" کے گذشتہ شمارہ (جولائی ۲۰۱۶ء تا جون ۲۰۱۷ء) کے تعلق سے ڈاکٹر امین عامر کی طویل نظم سے ہوا ہے، جسے مذکورہ شمارہ پر منظوم تبصرہ کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "تمثیل نو" کا یہ تازہ شمارہ بھی حسب سابق شماروں کی طرح دستاویزی حیثیت کا حامل ہے جو شائقین ادب کے علاوہ ریسرچ اسکالرز حضرات کے لئے بھی قابل استفادہ ہے۔ اس ضخیم شمارے کی قیمت صرف ۲۰۰ر روپے ہے جسے محلہ گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، دربھنگہ-۷ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مدیر رسالہ سے رابطہ کا نمبر 9431085816 ہے۔ ●●

یکم جنوری ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر امام اعظم اور ڈاکٹر زہرہ شمائل کے ولیمہ مسنونہ کے موقع پر کاشانۂ فاروقی، گنگوارہ، دربھنگہ میں
(دائیں سے) جناب مظہر امام، پروفیسر منظر شہاب، پروفیسر سید منظر امام اور جناب حسن امام درد

۷-۸؍ جولائی ۲۰۱۸ء کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام منعقدہ قومی سیمینار بعنوان ''شانتی رنجن بھٹاچاریہ: حیات وفن'' کے اختتام
کے بعد اکاڈمی کے لان میں دائیں سے جناب قمر اشرف، ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر، جناب پرویز اختر، جناب مقصود دانش، محترمہ شگفتہ یاسمین غزل،
ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، جناب ضمیر احمد مظفر، جناب ارم انصاری اور پروفیسر رئیس انور

۲؍ ستمبر ۲۰۱۸ء کو ادبستان، محلہ گنگوارہ، دربھنگہ میں الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب
''نقوشِ علی نگر: تبصرے اور تجزیے'' کی رونمائی کرتے ہوئے ڈاکٹر مجیب اختر (سکریٹری فخرالدین علی احمد ٹیچرس ٹریننگ کالج، دربھنگہ)
دیگر افراد میں صاحب کتاب کے علاوہ جناب کریم اللہ حیاتی، مولانا محمد مستقیم قاسمی اور مولانا عبدالصمد

۲۷؍ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب ''مظہر امام کا
اکلوتا افسانہ: تجزیہ'' کی کاپی اجاریہ جمال احمد جمال کو پیش کرتے ہوئے
ڈاکٹر امام اعظم۔ ساتھ میں موجود ہیں جناب قمرالدین ملک اور ڈاکٹر احمد معراج

۵؍ مئی ۲۰۱۹ء کو کتاب ''سہرے کی ادبی معنویت'' کا اجراء
کرتے ہوئے جناب بلال حسن (صدر، بزم شہر نشاط)
اور ڈاکٹر امام اعظم (مرتب، کتاب ہذا)

BIHURD00640/04/1/2005-T.C. ISSN-2249-636X **Rs. 200/-**
Monthly **TAMSEEL-E-NAU** **JULY : 2018-JUNE : 2019**
Vol-18, Issue : 70-73
Mobile : 08902496545
09431085816
E-Mail : imamazam96@gmail.com, imamazam96@yahoo.com
Hony **Editor : Dr. Imam Azam,** Gangwara, Darbhanga-846007 (Bihar)

۱۹۵۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی ایک یادگار تصویر میں (پیچھے) جناب مظہر شہاب، جناب کلام حیدری و دیگر (بیٹھے ہوئے) علامہ جمیل مظہری، پروفیسر اختر اورینوی، ڈاکٹر محمد مطیع الرحمن اور ڈاکٹر صدر الدین فضا

۵ راگست ۲۰۱۸ء کو اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ کے زیر اہتمام ڈان باسکو اسکول، دربھنگہ میں منعقدہ فروغ اردو سیمینار کے بعد ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب "گیسوئے اسلوب" کی رونمائی کرتے ہوئے جناب شفیع مشہدی، میجر بلبیر سنگھ، پروفیسر شاکر خلیق، جناب امتیاز احمد کریمی، ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر عبدالمنان طرزی، مبین انصاری، پروفیسر انیس صدری، ڈاکٹر مجیب اختر اور جناب اسلم جاوداں۔

۲۷-۲۹ر دسمبر ۲۰۱۸ء کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد میں منعقدہ ریجنل ڈائرکٹرز/ ریجنل سینٹر انچارج / اسب ریجنل سینٹر انچارج کی میٹنگ کے دوسرے دن ۲۸ر دسمبر ۲۰۱۸ء کو لی گئی تصویر میں عزت مآب شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے ساتھ نظامت فاصلاتی تعلیم کے انچارج ڈائرکٹر پی ایف رحمن، ڈاکٹر شاہد پرویز (دہلی)، ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ (بنگلور)، ڈاکٹر محمد احسن (بھوپال)، ڈاکٹر حسن الدین حیدر (پٹنہ)، ڈاکٹر اعجاز اشرف (سری نگر)، ڈاکٹر طارق امام (رانچی)، ڈاکٹر فیروز حیدر رضوی (امراوتی)، ڈاکٹر ارشد اقبال (دربھنگہ)، ڈاکٹر آفتاب عالم بیگ (حیدر آباد)، ڈاکٹر عمر فاروق اعظم (حیدر آباد) وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

Design & Printed By : Screener, Kolkata-16, Mob. 9331094800, 9163292801